نقوش

محمد طفیل نمبر



الرحمن
الرحيم

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلیفون ۵۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

محمد طفیل نمبر

جلد دوم

شمارہ نمبر ۱۳۵

جولائی ۱۹۸۶ء

بانی
محمد طفیل

مدیر
جاوید طفیل

ادارۂ فروغ اردو ○ لاہور

قیمت جلد اول و دوم: ۲۰۰ روپے

ترتیب جلد دوم

چند کرم فرما (انتخاب)

محمد طفیل

محمد طفیل اور ان کے خاکے

انتظاریہ

انتخاب

(رسائل، اخبارات، تعزیتی تقریبات، منظوم نذرانہ ہائے عقیدت، ۵ جولائی ۱۹۸۶ء کے بعد)

منظومات

قطعات تاریخ

مادہ ہائے تاریخ وفات

اشاریۂ نقوش

○

جاوید طفیل ایڈیٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا


چند کرم فرما

چند کرم فرما

(انتخاب)

محمد طفیل

رُونمائی

بہ سلسلہ خاکہ نویسی، میں نے پہلا جُملہ مارچ ۱۹۵۳ء میں لکھا تھا۔
آج بیس برس کے بعد، جب میں نے اپنے مضامین کا جائزہ لیا تو ان میں سے صرف چند ہی خاکے ایسے نکلے جنہیں "قابلِ برداشت" کہا جاسکتا ہے بہ عنوان نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی، حکیم یوسف حسن اور سعادت حسن منٹو!

چند مضامین ایسے نکلے جنہیں "قدرے برداشت" کیا جاسکتا ہے۔
مثال کے طور پر جگر مرادآبادی، شوکت تھانوی اور شاہد احمد دہلوی!

چند مضامین ایسے بھی نکلے جنہیں "قطعی ناقابلِ برداشت" سمجھا جاسکتا ہے
جیسے احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور اور شکیلہ اختر!

ان کے علاوہ میرے جتنے خاکے ہیں وُہ قابلِ ذکر بھی نہیں۔ اسی لیے اُن میں سے کسی کا نام بھی نہ لُوں گا۔ ویسے جہاں تک "ذاتی روابط کی بنا پر" اُن شخصیتوں سے ذہنی قُرب کا تعلق ہے وُہ عشق اپنی جگہ، یہاں تو مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی تحریروں کے سلسلے میں کتنا سچ بول سکتا ہُوں!

○ محمد طفیل

○ محمد طفیل نمبر کی مناسبت سے جناب محمد طفیل مرحوم کا خاکہ بھی اس انتخاب میں شامل ہے۔
(ادارہ)

منٹو صاحب

اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ منٹو صاحب کی زندگی میں
اور دوسرا حصہ ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔

(۱)

اس وقت سر میں شدید درد ہے، نہ جانے یہ جی کیوں چاہتا ہے کہ درد بڑھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت منٹو پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ درد کی نوعیت نہ بدل جائے، اس لیے کہ میں نے منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے عموماً سر کی بجائے دل میں درد محسوس کیا ہے۔ میرے علاوہ اور بھی کئی ایک اسی اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ بعضوں کے دل میں ان کے اندازِ بیان کی رنگینی اور چٹ پٹے پن سے درد ہوتا ہوگا۔ بعضوں کے دل میں ان کی تحریروں کے تاثر اور اس کے بھرپور وار سے درد ہوتا ہے۔ میرا شمار کن میں ہے؟ یہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا، اس لیے کہ میں اس وقت منٹو کے فن کی بجائے ان کی شخصیت پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ منٹو کے فن پہ لکھنے کا حق ہمیشہ کی طرح نقادانِ کرام کو سونپتا ہوں، ورنہ وہ محاورہ صادق آئے گا کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات!

ایک دن انارکلی میں ایک صاحب کو افسانوی انداز میں پیدل چلتے دیکھا تو ذہن میں آیا کہ اسے منٹو ہونا چاہیے۔ یہ خیال اس لیے بھی ذہن میں آسکتا تھا کہ منٹو صاحب بمبئی سے لاہور آچکے تھے۔ چند دنوں بعد ایک صاحب ہمارے دفتر کے سامنے سے سائیکل پر گزرے، سائیکل بالکل نئی تھی۔ صاحبِ سائیکل نے ہمارے دفتر کے اندر کچھ اس نئے انداز سے دیکھا کہ ذہن میں پھر آیا کہ وہ منٹو گیا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ برادرم احمد ندیم قاسمی آئے اور انھوں نے بتایا کہ میں آپ کے پاس ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا لیکن راستے میں منٹو صاحب مل گئے تھے اس لیے آدھ گھنٹہ اُن سے باتوں میں گزر گیا۔

کچھ دنوں بعد جب پھر ندیم صاحب آئے تو ان کے ہمراہ ایک اور صاحب بھی تھے، وہی جن کو میں نے انارکلی میں دیکھا تھا یا دفتر کے سامنے سائیکل پر گزرتے دیکھا تھا۔

ندیم صاحب نے تعارف کرایا:

"آپ سعادت حسن منٹو ہیں۔"

اور میری طرف اشارہ کر کے :

"آپ طفیل صاحب ہیں۔"

منٹو صاحب میں سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ موجود ہوں تو دوسرا لاکھ کوشش کرے وہ کسی کو بولنے نہیں دیں گے۔ باتیں ان کی دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔

وہ میرے پاس پہلی مرتبہ آئے تھے اور آتے ہی انھوں نے باتیں شروع کر دی تھیں اس لیے مجھے موقع ہی نہ مل سکا کہ پانی وانی کے لیے پوچھتا۔ پھر بھی میں نے ان کے مسلسل بیان میں یہ بات چھوڑ دی :

"منٹو صاحب! چائے پئیں گے۔"

منٹو صاحب اس وقت نان اسٹاپ موڈ میں تھے۔ اس لیے انہیں میری مروت بھی ناگوار گزری اور جھٹ بولے :

"ہٹاؤ یار! اس وقت چائے سے زیادہ گرم باتیں ہو رہی ہیں۔"

باتوں کا تسلسل تو ٹوٹ ہی چکا تھا اس لیے کسی اور کی طرف چل نکلے اور ندیم صاحب سے کہا :

"حیدرآباد دکن میں کئی ایک کو یہ فکر تھی اور ہے کہ میری شادی عصمت سے ہونی چاہیے تھی۔ نہ جانے یہ لوگ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں! جب یہ بات میری بیوی نے سنی تو وہ کباب ہو گئی، اس لیے کہ دونوں کی آپس میں بڑی دوستی ہے۔ پھر حق زوجیت پر بھی آنچ آ رہی تھی، اس لیے اس کا کباب ہونا برحق تھا ——" پھر ——" ارے یار! مجھے کا کیا پوچھتے ہو۔ ؏

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

بڑے ٹھاٹ سے دن گزارے ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی تھی۔ بڑی قدر تھی۔ ہر کوئی منٹو منٹو کرتا تھا۔ مملکتِ خداداد میں آئے تو پبلشروں کے پاس خود جانا پڑا کہ بھئی! ہماری کتاب چھاپ لو۔ کئی بار جی چاہا کہ بیچ سڑک کھڑا ہو کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاؤں، پھر سوچتا ہوں کہ لوگ مجھے پاگل کہیں گے۔"

اس تذکرے پر منٹو صاحب ذرا افسردہ ہو گئے اور شاید افسردگی ہی دُور کرنے کے لیے انہوں نے اپنا خوبصورت سگریٹ کیس نکالا، ایک سگریٹ ندیم صاحب کو دیا ایک خود اپنے باریک باریک لبوں پر اٹکایا۔ جیب سے ماچس نکال ہی رہے تھے کہ ایک دم میری موجودگی کا خیال آیا اور بولے :

"بھئی معاف کرنا!"

اور سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیا۔

ندیم صاحب نے مشکل کشائی کی اور کہا :

"یہ نہیں پیتے!"

منٹو صاحب پینے کے لفظ کو لے اُڑے :

"ہائے کمبخت تُو نے پی ہی نہیں

سگریٹ پینا کیا ہوتا ہے۔ پینا تو وہ ہوتا ہے۔"

پھر ندیم صاحب سے پوچھا :

"قاسمی صاحب! آپ نے میرا مضمون "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" پڑھا ہے ؟"

ندیم صاحب نے حسبِ عادت " جی ہاں" کہا۔

" چھوڑیار! وہ مضمون کیا ہے ، بکواس ہے۔"

منٹو صاحب کی یہ عادت ہے کہ اگر ان کی کسی چیز کی تعریف کی جائے تو وہ عموماً یہی جواب دیتے ہیں ، یا صرف اتنا کہہ دیں گے :

" بس ٹھیک ہے !"

پھر خود ہی اُسی مضمون کی تعریف شروع کر دیں گے اور وُہ بھی حوالے دے دے کر۔ مثلاً اس میں وہ فقرہ بڑا اچھا تھا کہ :

" صبح کا وقت تھا، عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔ لیکن اس کا منہ دُوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا :

"یہ اُلٹے رُخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟"

اس نے گھُور کر مجھے دیکھا اور کہا :

" دیکھتے نہیں ہو !"

میں نے دیکھا پنکھے کا رُخ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی تصویر کی طرف تھا۔"

پھر انہیں کوئی دُوسرا پیراگراف یاد آگیا تو وہ بھی سُنا دیا :

" ایک دم شور برپا ہو گیا کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل لیے چلّا رہے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں اخبار بِک رہے تھے تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں ۔ دہلی میں جُوتا چل گیا ، لکھنؤ میں فلاں کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا پاکستان کے ایک نجومی کی پیشگوئی : کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔"

(اس وقت انھوں نے یہ فقرے بغیر کسی ربط کے سنائے تھے۔ یہاں ان کی کتاب سے نقل کر دیئے گئے ہیں)

اس کے بعد بھی رُکے کہاں ۔ کہنے لگے " آج کل عجیب مُوڈ ہے۔ افسانہ لکھنا چاہتا ہُوں تو مضمون ہو جاتا ہے"

اگر مضمون لکھنا چاہوں گا تو ڈرامہ ہو جائے گا۔"

نہ جانے اس وقت مجھے بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا اور پھٹ سے بول پڑا :

"اگر آپ نے بیک وقت ڈرامہ ، افسانہ اور مضمون لکھنا چاہا تو آپ سوالیہ نشان بن کر رہ جائیں گے۔"

اس فقرے پر منٹو صاحب محظوظ ہوئے اور کہا :

"اچھا ہے ، اچھا ہے ۔"

چونکہ انھیں اپنے پر کوئی چبھتی ہوئی بات گوارا نہیں ہوتی ، اس لیے ذرا سوچ کر بول ہی پڑے :

"بات تو آپ نے اچھی کہی ہے ، بدقسمتی سے میری اور آپ کی بے تکلفی نہیں ۔ اس لیے جواب ارسال کرنے سے معذور ہوں۔"

ندیم صاحب سمجھ گئے کہ یہ اس وقت کس قسم کا جواب دے سکتے ہیں ۔ اس لیے انھوں نے مسکرا کر کہا :

"آپ انہیں کوئی جواب نہ دیں ، یہ ذرا اور قسم کے آدمی ہیں۔"

اور قسم سے اس وقت نہ جانے ان کی مراد کیا تھی ۔ لیکن منٹو صاحب کی باتوں کا رُخ قسموں کی طرف چل نکلا اور کہا :

"آپ نے میرا مضمون 'ناک کی قسمیں' پڑھا ہوگا ۔ وہ ، وہ ، ہاں وہی

آئی جوان کی ناک تو آ تی چلی گئی

مَیں نے اس مضمون میں ناک کی قسمیں گنوائی ہیں ۔ اس مضمون میں ایک شعر بھی کوٹ کیا ہے جو مجھے ناک کی مناسبت سے بڑا پسند ہے ۔ وہ کیا ہے تنکا بھئی وہ تنکا ۔ ہاں !

ناک میں نیم کا فقط تنکا

شوخی چالاکی اقتضا سن کا

اس کے بعد انھوں نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے ، موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے دیکھ کر ندیم صاحب سے پُوچھا :

"آپ یہاں بیٹھیں گے ؟"

ندیم صاحب نے اپنا تکیہ کلام دُہرا دیا :

"جی ہاں !"

تو آپ کھڑے ہو گئے اور کہا :

"اچھا بھئی ! میں چلتا ہوں !"

پھر تو ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں ، قریب قریب روز ۔ عموماً ان کی ملاقاتوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مسلسل ملاقاتیں بخشیں گے ۔ کبھی کبھی اچانک ناپید ہو جائیں گے ۔ بات صرف اتنی ہوگی کہ ملاقاتوں کا رُخ کسی اور کی طرف مڑ جائے گا

ان کا یُوں روپوش رہنا چند دنوں کا یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہوگا۔ تانگے سے اُترتے ہی دوسرے السلام علیکم کے ساتھ ملاقات پھینک دیں گے۔ پھر یہ کہیں گے :

"دس روپے یا پندرہ روپے دوائی کے لیے دینا۔"

جو دینے پڑتے ہیں۔ لوگ دوائی اس لیے پیتے ہیں کہ صحت یاب ہوں۔ لیکن یہ دوائی اس لیے پیتے ہیں کہ صحت اور خراب ہو۔ ان کی دوائی کا نام شراب ہے۔ پہلے یہ دوائی کو پیتے ہوں گے اب تو دوائی انھیں پی چکی، اور کسی دن بیٹھے بٹھاتے ہم یہ سُن لیں گے کہ منٹو صاحب کا انتقال ہوگیا۔

یہ سب جانتے ہیں کہ منٹو اردو کا ممتاز افسانہ نگار ہے جو ان کی اس حیثیت سے منکر ہیں، مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں۔ لیکن ایک بار ایسا بھی ہُوا کہ منٹو صاحب نے ایک افسانہ مجھے نقوش کے لیے دیا، جس کا نام "نطفہ" تھا میں نے وُہ افسانہ پڑھا تو مجھے پسند نہ آیا۔ ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار ان سے کیا۔

منٹو صاحب نے برا نہ مانا بلکہ ایک اور افسانہ لکھ دیا۔ میری نظر میں وُہ بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ جب منٹو صاحب کو دوسرے افسانے کے متعلق بھی میری رائے کا علم ہُوا تو انھوں نے کہا کہ کل ایک اور افسانہ لکھ دُوں گا اور اس وقت تک لکھتا رہوں گا جب تک کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ افسانہ مجھے پسند ہے۔

اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک ایک دن کے وقفے سے دو افسانے دیئے وہ دونوں مجھے بجد پسند آئے۔

ایک کا نام 'موذیل' تھا اور دُوسرے کا نام 'سڑک کے کنارے'۔

مندرجہ بالا واقعہ کے اظہار کا میرے نزدیک سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ اتنا بڑا لکھنے والا اتنے بڑے دِل گُردے کا بھی مالک ہے۔ ہر فن کار کو اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریر بھی بڑی عزیز ہوتی ہے اور وُہ اس کی شان میں ایک حرف بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور پھر منٹو ایسا فن کار، جو فن کار بھی ہے اور مُنہ پھٹ بھی۔ اس وقت انہوں نے نہ مجھے یہ طعنہ دیا کہ مَیں بہت بڑا لیکھک ہوں اور نہ ہی یہ ثابت ہونے دیا کہ منہ پھٹ بھی ہوں۔

ویسے ان کی زبان کے آگے کوئی خندق نہیں۔ کبھی کبھی پی کر آجائیں گے اور کہیں گے :

"کل آپ نے فلاں صاحب کے سامنے کیا بکواس کی تھی، میری جان! میرے اور اس کے تعلقات اور قسم کے ہیں۔ معاف کرنا۔ وہ بھی حرام زادہ میں بھی حرام زادہ، پر آپ کو کیا پڑی تھی کہ وہی بات آپ اس سے بھی کہہ دیں جو میں نے آپ سے چھپا کر کہی تھی، ویسے میں ڈرتا تو نہیں ہُوں، وہ میرا کیا کر لے گا، میری جان! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ معاف کرنا آپ کو پتا نہیں کہ آپ نے بڑی کمینہ حرکت کی۔ جب مَیں نے سُنا تو کباب ہوگیا۔ میری ....."

میں ایسے مواقع پر خاموش رہتا ہُوں یا صرف مسکرا دیا کرتا ہُوں، اس لیے کہ اس وقت ان کی باتوں کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا اور اس وقت منٹو کی بجائے شراب بول رہی ہوتی ہے۔

بعض اوقات جب منٹو اور شراب مل کر بولتے ہیں تو اس وقت منٹو پر بھی پیار آتا ہے اور اس کی باتوں پر

بھی۔ لیکن ایسے مواقع ذرا کم ہی آتے ہیں۔ عموماً وہ پی کر واہی تباہی بکتے ہیں۔ وُہ اپنی انہی باتوں کی بدولت دو بار پاگل خانے جا چکے ہیں۔

پہلی مرتبہ منٹو صاحب راضی خوشی خود ہی گئے تھے۔ دوسری مرتبہ زبردستی ان کے گھر والوں نے بھیجا۔ ان کی دوبارہ واپسی پر میں نے ان سے پُوچھا تھا کہ منٹو صاحب! آپ کس خوشی میں مینٹل ہاسپٹل جاتے اور آتے ہیں۔

کہنے لگے کہ بھئی پہلی مرتبہ تو خود بڑے چاؤ سے گیا تھا کہ وہاں جا کر ذرا شراب چھوڑ آؤں۔ سنا تھا کہ وہاں اس انداز سے علاج کیا جاتا ہے کہ آدمی آسانی کے ساتھ شراب ترک کر دیتا ہے۔ لیکن وہاں جا کر جو طبیعت صاف ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ دُوسری مرتبہ گھر والوں نے زبردستی بھجوا دیا، حالانکہ میں نے ان کی بڑی منت سماجت کی۔ لیکن کسی نے ایک نہ سُنی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ میرا ذہنی معائنہ کرایا جائے، اس لیے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن ڈاکٹروں نے بھی ایک نہ سُنی۔ کل میرے ایک دوست مجھے ملنے آئے تھے، تو میں ان کے ساتھ چلا آیا۔ وُہ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے، ڈھونڈا کریں پاگل کہیں کے!

منٹو صاحب کا مزا اس وقت آتا ہے جب ان سے عریانی یا فحاشی کے موضوع پر گفتگو کی جائے۔ وُہ کہتے ہیں کہ مجھے بڑی حیرت ہے کہ لوگوں نے میرے وہ بے شمار افسانے نظر انداز کر دیئے جن میں جنس کا تذکرہ تک نہیں۔ میں نے جنسی افسانے تو شاید چند ایک ہی لکھے ہیں باقی تو بس افسانے ہیں۔ جن حضرات کو میرے افسانوں میں فحاشی نظر آتی ہے وہی دکان دکان پھرتے ہیں اور پُوچھتے ہیں کہ منٹو کی کوئی نئی کتاب آئی! ان کا خیال ہے کہ میری تحریریں یا تو وہ حضرات پڑھتے ہیں جنھیں میرے فن سے پیار ہے یا "اعتراضئے" پڑھتے ہیں تاکہ مجھے بُرا بھلا کہہ سکیں۔ میں بھی وقت آنے پر ہر ایک کا قرضہ چکا دیتا ہُوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی کتاب کا انتساب یُوں کیا تھا:

"ایڈیٹر دین و دنیا کے نام، جس نے مجھے سب سے زیادہ گالیاں دیں۔"

اب جی چاہتا ہے کہ قبلہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام بھی ایک کتاب معنون کر دوں۔ اس لیے کہ موصوف نے میرے خلاف لکھ لکھ کر میرے افسانوں کی قدر کی ہے۔ اگر میں اپنی زندگی میں ایسا نہ کر سکا، تو بہت ممکن ہے کہ حشر کے دن موصوف دامن گیر ہوں اور مجھے ندامت ہو۔

بھئی! ان محترم ہستیوں کا تذکرہ چھوڑو۔ میرے دوست قاسمی صاحب نے بھی میرے نام ایک کھلی چٹھی لکھ دی میرا بڑا دل چاہا کہ میں بھی بند لفافہ لکھ کر چھپوا دُوں لیکن قاسمی صاحب کی شرافت آڑے آ گئی۔ عسکری نے سیاہ حاشیے پر دیباچہ لکھ دیا تو یار لوگوں نے اڑا دیا کہ مجھ پر عسکری چھایا ہُوا ہے حالانکہ وُہ خود اتنا سیدھا سادا اور بھولا بھالا ہے کہ اپنے اوپر تو چھا نہیں سکا، مجھ پر کیا چھاتا!

پہلے ترقی پسند میری تحریروں کو اُچھالتے تھے اور فخر کرتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ منٹو ہم میں سے نہیں ہے۔ مجھے نہ ان کی پہلی بات پر یقین تھا، نہ موجودہ پر ہے۔ پہلے ترقی پسند کہتے تھے کہ منٹو

ہم میں سے ہے۔ میں کہتا تھا ٹھیک ہے۔ اب مجھے حلقۂ اربابِ ذوق والوں نے اپنا ممبر بنا لیا ہے۔ میں کہتا ہوں ٹھیک ہے۔

مجھ سے کوئی پُوچھے کہ منٹو تم کس جماعت میں سے ہو تو میں عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہُوں، ہر معاملے میں اکیلا ہوں۔ جس دن میرا کوئی ثانی پیدا ہو گیا میں لکھنا چھوڑ دُوں گا۔ ویسے کوئی جماعت میرے نام کو اپنی فہرست میں شامل کر کے فخر کر سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اب منٹو صاحب میں یہ کمزوری راہ پا گئی ہے کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ کل فلاں صاحب ملے تھے اور انہوں نے میرے فلاں افسانے کی بڑی تعریف کی۔

پرسوں کراچی سے ایک صاحب آئے تھے نہ جانے ان کا نام کیا تھا وہ کہتے تھے کہ منٹو صاحب! میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں آپ کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہُوں۔

کل فلاں صاحب نے شیخوپورہ سے دو کنستر گھی کے اس لیے بھجوا دیئے کہ وُہ مجھے بڑا آرٹسٹ سمجھتے ہیں۔

میں نے مال روڈ پر ایک دکاندار کو اپنی دو تصویریں فریم کے لیے دی تھیں۔ کوئی صاحب محبت کے اظہار کے طور پر وہاں سے فریم کے روپے دے کر میری دونوں تصویریں لے گئے۔

میرا یہ سگریٹ کیس گم ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن ایک صاحب اسے لیے ہوئے آ پہنچے اور کہا: منٹو صاحب السلام علیکم! یہ اپنا سگریٹ کیس رکھیئے، مجھے فلاں جگہ پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے ان سے کہا، آپ کو کیسے علم ہُوا کہ میں یہاں رہتا ہُوں۔ وُہ کہنے لگے:

واہ! آپ کو بھلا کون نہیں جانتا۔

اُدھر ممتاز شیریں میرے فن پر کتاب لکھ رہی ہیں، ادھر میرے افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ چھپ رہا ہے۔

ایک دن ایک صاحب نے لکشمی مینشن میں افیون کھا لی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے قے کرانے کے لیے کوئی دوا تجویز کی مگر اس نے دوائی پینے سے انکار کر دیا اور کہا:

میں مرنا چاہتا ہُوں۔

شور جو مچا تو میں بھی پہنچا۔ میں نے کہا:

بھئی! دوا پی لو۔

اس نے کہا: تم کون ہو؟

میں نے کہا: میں منٹو ہوں!

اس نے اسی حالت میں کہا: بڑا اچھا ہُوا کہ میں نے آپ کو مرنے سے پہلے دیکھ لیا۔ میں آپ کو بہت بڑا آرٹسٹ سمجھتا ہوں۔

چنانچہ میں نے اسے حکم دیا کہ تمھیں دوائی پینا ہوگی!

چنانچہ اس نے دوائی پی لی۔

ایک دن میں انار کلی اور مال روڈ کے درمیان بیہوش ہوگیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیا ہُوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ کچھ ایسے معلوم ہُوا کہ کسی نے میری گردن پر کلہاڑا مارا اور میں بیہوش، کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک سائیکلوں کی دکان میں لوہے کی کرسی پر بیٹھا ہُوں۔ ایک ہجوم میرے اردگرد، سب منٹو منٹو کہہ رہے ہیں۔

میں نے کہا: "ماجرا کیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا: "آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟"

"میرے کپڑے کیوں گیلے ہیں!"

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے سٹپٹا کر کہا:

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم لوگوں نے میرا جلوس کس سلسلے میں نکالا ہے۔"

معلوم ہوا کہ میں بیہوش ہوگیا تھا، اس لیے لوگوں نے پانی کے چھینٹے مار مار کے، مجھے ہوش میں لانا چاہا تھا۔ یہ بھی علم ہُوا کہ بعض لوگوں کا خیال تھا مجھے مرگی کا دورہ پڑا ہے، اس لیے مجھے خوب خوب "جوتیاں سُنگھائی" گئیں۔

جب میں نے یہ بات سُنی تو مجھے خطرہ پیدا ہوا۔ ناک کو ہاتھ لگا کے دیکھا کہ کوئی چھوٹی سی جُوتی اس کے اندر تو نہیں رہ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایک دم گھبرا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں سے کہا:

"میں گھر جانا چاہتا ہُوں، تانگہ منگوا دو۔"

تانگہ منگوایا گیا، اب سب مُصر کہ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے، ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے۔ چنانچہ میں اُن لوگوں میں سے تین صاحبان کو ساتھ لے کر گھر کی طرف تانگے پر چل دیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا:

منٹو صاحب! میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے اس ڈرامائی انداز میں ملاقات ہوگئی۔ میں آپ کو دنیا کا بہترین افسانہ نگار مانتا ہُوں۔ میں نے فلاں فلاں مغربی افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے لیکن آپ کے سامنے سب ہیچ ہیں۔

میں نے اُن صاحب سے کہا کہ میں کیا ہوں، بس ایک افسانہ نگار ہُوں۔ اب تو میں افسانہ نگار بھی نہیں ہوں۔ افسانہ نگار اس وقت ہوتا ہُوں جب میرے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے۔ جب میرے ہاتھ میں قلم نہیں ہوتا، اس وقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ اب افسانے کہاں ہیں جنھیں لکھوں۔ افسانے اُدھر رہ گئے۔ جو افسانے اِدھر تھے انھیں بھی مار بھگایا۔ اُدھر یا اُن کے ساتھ کچھ اور کر لیا گیا۔ وہاں ایک سڑک پر کئی افسانے ملتے تھے، یہاں کئی سڑکوں پر ایک افسانہ نہیں ملتا۔ اب یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ سعادت حسن منٹو مال روڈ کے قریب بیہوش ہوگیا اور لوگوں نے اس کی پانی کے چھینٹوں اور جُوتوں سے تواضع کی۔ میری جان! یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ———"

ایک بار کسی صاحب نے ان کے افسانے 'موذیل' کی بات چھیڑ دی۔ منٹو صاحب گویا ہوئے : وہ افسانہ میں نے تھوڑا ہی لکھا ہے وہ تو موذیل نے لکھوایا تھا۔ بھئی! مجھے افسانہ لکھتے وقت کچھ پتا نہیں ہوتا کہ مجھے کیا لکھنا ہے۔ قلم دوات سنبھالتا ہوں تو کاغذ کے اوپر ۸۶ ، لکھ دیتا ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے، افسانہ لکھنا ہے۔ کیا لکھوں، کیا لکھوں، کیا لکھوں! معاً ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً وہ درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ پھر قلم رکھ دیتا ہوں۔ سگریٹ پیتا ہوں، یا پیشاب کرنے چلا جاتا ہوں، یا پان کھانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ واپس آ کر "وہ" سے پوچھتا ہوں کہ بتا اب تو کیا کہتی ہے۔ وہ جو کچھ مجھ سے کہتی جاتی ہے میں لکھتا جاتا ہوں۔ وہ جدھر جاتی ہے میں اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں۔ البتہ میں اسے انکھیوں سے دیکھتا جاتا ہوں کہ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے کیسی ہے۔ اس میں قابلِ غور کون کون سی باتیں ہیں، اس کے سینے کا اُبھار کیسا ہے، وہ جب ہنستی ہے تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں یا نہیں، وہ جب چلتی ہے تو اس کا انداز کیا ہوتا ہے۔ جب وہ مسکراتی ہے تو کہیں دل لوٹ کے تو نہیں لے جاتی۔ یہ مرحلہ میرے لیے نازک ہوتا ہے کہ جب وہ دل لوٹنے پر آتی ہے تو خود لٹتی بھی ہے یا نہیں۔ بس اس کا علم مجھے نہیں ہوتا۔ جب افسانے کا آخری حصّہ آتا ہے تو اُن تمام کرداروں سے پوچھتا ہوں کہ بھئی! اب بتاؤ تمہاری کیا کیا مرضی ہے؟ تم میں سے کس کس کو مار دیا جائے یا تم میں سے کس کس کو کیا کر دیا جائے۔ بعض کردار مرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جاؤ تمہیں زندگی بخشی۔ پھر دوسرے کردار سے مشورہ کرتا ہوں وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر صاد کر دیتا ہوں۔ ان میں سے جو کوئی مرنے کے لیے راضی ہوتا ہے اُسے مار دیتا ہوں یا وہ سالا اور سالی جو کچھ بھی کرنا چاہے، میں اُسے مطلق نہیں روکتا۔ البتہ آخری فقرہ منٹو سوچتا ہے اور افسانہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً موذیل کا پہلا فقرہ "ترلوچن نے پہلی مرتبہ —— چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا" میرا ہے، اور پھر آخری فقرہ "لے جاؤ اپنے اس مذہب کو" میرا ہے، باقی سب کچھ موذیل کا ہے۔

پھر موذیل کے وجود پر بحث ہو گی :

"بمبئی میں ایک یہودن تھی بڑی بڑی رانوں والی، دھڑلے کی عورت، وہ اسکرٹ کے نیچے کچھ نہیں پہنتی تھی۔ افسانہ لکھتے وقت وہ دماغ میں اُبھری۔ اس کا نام بھول گیا تھا تو میں نے سوچا کہ ہمارے فلیٹ کے سامنے بھی تو ایک یہودن رہتی تھی اور اس کا نام موذیل تھا، اُدھر بڑی بڑی رانوں کا تصوّر ذہن میں اُبھرا، اِدھر موذیل کا نام، تو بس افسانہ ہو گیا۔ میرا اس میں کون سا کمال ہے۔ اگر کوئی کمال ہے تو موذیل کا ہے —— آ ——"

ویسے اس سلسلے میں منٹو صاحب نے جو کچھ تحریری طور پر فرمایا ہے وہ بھی سن لیجیے۔ مزے کی باتیں ہیں :

"اب آپ کو کیا بتاؤں کہ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ یہ بڑی الجھن کی بات ہے۔ اگر میں 'کس طرح' کو پیشِ نظر رکھوں تو یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں، کاغذ قلم

پکڑتا ہوں اور بسم اللہ کر کے افسانہ لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میری تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں، میں اُن سے باتیں بھی کرتا ہوں، اُن کی تمام باہم لڑائیوں کا فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ اپنے لیے ’سلاد‘ بھی تیار کرتا ہوں۔ کوئی ملنے والا آجائے تو اس کی خاطر داری بھی کرتا ہوں، مگر افسانہ لکھے جاتا ہوں۔ میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے یا میں نے غسل نہیں کیا۔۔۔ میں افسانہ نہیں لکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ یوں تو میں نے بیس سے اوپر کتابیں لکھی ہیں لیکن مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ یہ کون ہے جس نے اس قدر اچھے افسانے لکھے ہیں، جس پر آئے دن مقدمے چلتے رہتے ہیں۔ جب قلم میرے ہاتھ میں نہ ہو تو میں صرف سعادت حسن ہوتا ہوں، جسے نہ اردو آتی ہے، نہ فارسی، نہ انگریزی، نہ فرانسیسی۔ بعض اوقات میں بیوی کے کہنے پر قلم یا پنسل اُٹھاتا ہوں اور لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ دماغ بالکل خالی ہوتا ہے۔ لیکن جیب بھری ہوتی ہے۔ خود بخود کوئی افسانہ اُچھل کے باہر آجاتا ہے۔ میں خود کو اس لحاظ سے افسانہ نگار نہیں جیب کترا سمجھتا ہوں، جو اپنی جیب خود ہی کاٹتا ہے اور آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ مجھ ایسا بھی بیوقوف دُنیا میں کوئی اور ہوگا؟“

ایک مرتبہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔ اس کا حال آپ نے منٹو صاحب کی زبانی[1] سنا ہوگا۔ میرے اور اُن کے بیان میں بدیہی فرق یہ ہوگا کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور میرا لکھنے والوں میں شمار ہی نہیں۔ الحمد للہ کہ میرا لکھنے والوں میں شمار نہیں، ورنہ میں بھی بعض اولوالعزم ”ادبا و شعرا“ کی طرح کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ ہر ادیب کے متعلق یہی کہتا کہ فلاں کیا لکھتا ہے، فلاں کی زبان ٹھیک نہیں، فلاں کا مشاہدہ ناقص ہے، فلاں جاہل ہے۔ ایسے اساتذہ کی موجودگی میں کون کسی کے منہ لگے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔

میرا منجھلا بھائی سخت بیمار تھا۔ میں اس کی دوائی کے سلسلے میں ڈاکٹر کے پاس آیا ہوا تھا اور اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا، وہاں یہ پیغام ملا کہ ہاجرہ مسرور آئی ہیں اور آپ کو بلا رہی ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایک خاتون دفتر میں بیٹھی نہ رہے۔ چل کر پہلے ان کی بات سُن لوں۔ پھر دوائی لے جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ابھی آیا۔ میں اپنے بھائی کی بیماری سے سخت پریشان تھا۔ پھر بھی بربنائے تکلف بہن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میں اصرار کر رہا تھا کہ میں آپ کو چائے پلاؤں گا۔ اور وہ کہہ رہی تھیں کہ ہرگز ہرگز نہ پیوں گی اور طفیل کی چائے تو کبھی نہ پیوں گی کہ اتنے میں منٹو صاحب تشریف لے آئے۔ وہ تانگے میں سوار تھے۔ انہوں نے

---

[1] پانچواں مقدمہ

میری طرف اشارہ کر کے آواز دی :

"ذرا ادھر آنا !"

میں ذرا اُدھر گیا۔ منٹو صاحب ذرا اِدھر آئے اور ہمارا آمنا سامنا دفتر اور سڑک کے درمیان درمیان ہوا۔ منٹو صاحب نے کہا کہ ذرا میرے ساتھ آؤ اور میری ضمانت دے دو۔

میں اپنے چند دوستوں کے پاس گیا تھا، اُن میں سے کوئی نہیں ملا۔ اس وقت میرے لیے یہ فیصلہ مشکل تھا کہ یہ اس وقت مجھے اپنا دوست سمجھ کر آئے ہیں یا دشمن سمجھ کر، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ کل پانچ ہزار روپے کی ضمانت ہے۔

میں نے یہ عذر کیا کہ میں تو گھر سے بھائی کی دوا لینے کے لیے آیا ہوں۔ اس لیے آپ یہ کام کسی اور کے سپرد کردیں۔ بہت ممکن ہے کہ میری پانچ ہزار کی ضمانت بھی منظور نہ کی جائے۔

اس پر منٹو صاحب نے کہا کہ آپ آدھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے اور ساتھ ہی کئی سوال جڑ دئے :

"آپ کا ذاتی مکان ہے ؟ آپ کا بینک بیلینس تو اتنا ہوگا ؟"

جب میں نے نفی میں جواب دیا تو کہنے لگے :

"آجاؤ، ہو جائے گی ضمانت، آخر اتنے بڑے ادارے کا مالک پانچ ہزار کی بھی ضمانت نہیں دے سکتا۔"

ہاجرہ بہن نے بھی لقمہ دیا :

"چلے جائیے نا! آخر ہرج ہی کیا ہے !"

چنانچہ دھڑکتے دل کے ساتھ اور گھریلو پریشانیاں لیے منٹو صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے میں نصیر انور اور حنیف رامے موجود تھے۔ اب تانگہ انار کلی سے نسبت روڈ پہنچا اور راستے میں باتیں ہو رہی ہیں :

"کل پولیس تھانے دار میرے وارنٹ لے کر آیا تھا۔ بڑا شریف آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ کل صبح خود تھانے میں اپنے ایک ضمانتی سمیت حاضر ہو جاؤں گا۔ اب آپ جائیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔ چنانچہ انہوں نے میری بات مان لی اور میں رات بھر آرام کرتا رہا۔"

کبھی نصیر انور کہتے ہیں "منٹو صاحب! آپ ایسے افسانے کیوں لکھتے ہیں۔ جن پر مقدمے کی نوبت آئے۔ کبھی میں کہتا کہ منٹو صاحب! اگر آپ کو وقتِ مقررہ پر حاضرِ عدالت ہونا ہے تو مجھ سے ضمانت دلوائیے ورنہ مجھے پریشان نہ کیجئے گا۔"

جس وقت ہم نسبت روڈ سے میکلوڈ روڈ پر پہنچے تو منٹو صاحب نے کہا :

"اگر اس وقت طفیل صاحب بھی نہ ملتے تو بڑی مشکل ہوتی۔"

اس پر نصیر انور نے کہا :

"آپ کی مشکل تو حل ہو گئی۔ اب آپ طفیل صاحب کے لیے مشکل پیدا کر رہے ہیں۔"

اس پر منٹو صاحب ہنسے اور کہا:

"نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ آخر مجھے ایک بار تو کراچی جانا ہی ہے تاکہ یہ ٹنٹا ختم ہو۔"

اب تانگہ میکلوڈ روڈ سے قلعہ گوجر سنگھ کی طرف مُڑا۔ بالآخر تانگہ ڈسٹرکٹ پولیس کے سامنے جا کر رُکا۔ ہم نے دفتر میں جا کر اپنی آمد کی غرض بتائی۔ وہاں میرے بھی ایک جاننے والے مل گئے۔ اُنہوں نے جب یہ سُنا کہ میں ایک ضمانت کے سلسلے میں یہاں آیا ہُوں تو انہوں نے کوشش کی کہ ضمانت جلد سے جلد ہو جائے۔ حالانکہ اس وقت میرا دل یہ چاہتا تھا کہ وُہ کچھ ایسا ہیر پھیر کریں کہ تھانیدار صاحب میری ضمانت ہی قبول نہ کریں۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ میں یہاں محض مروّت کی بنا پر آ گیا ہُوں۔ اس لیے کہ مجھ سے ایک بڑے لکھنے والے کی دلآزاری نہیں دیکھی جاتی تھی۔

چنانچہ صاحب! ضمانت ہو گئی۔ دُوسرے لمحے منٹو صاحب نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ میں کراچی نہ جا سکوں گا اس لیے کہ صحت خراب ہے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھجوا دوں گا۔ اُن کے منہ سے اس وقت یہ فقرہ سُن کر میں حیران رہ گیا۔ اس لیے کہ وہ کراچی نہیں جا رہے تھے۔ حیرانی اس لیے بھی ہُوئی کہ میں نے ان کی صحت اُس دن سے اچھی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس وقت مجھے منٹو صاحب پر بڑا غصّہ آیا، حالانکہ غصّہ مجھے اپنے اوپر آنا چاہیئے تھا۔ بہ فرضِ محال اگر اس وقت مجھے اپنے اوپر غصہ آ بھی جاتا تو کیا ہوتا۔ بالآخر تانگے پر پھر سوار ہُوئے اور تانگے کا رُخ ہمارے دفتر کی طرف کرا دیا گیا۔ راستے میں پاکستان ٹائمز اور امروز کا دفتر آیا تو تانگہ رُکوا دیا گیا۔ اُوپر پہنچے، جس کسی نے سُنا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی ہے تو سب نے یہی کہا کہ منٹو صاحب وقتِ مقررہ پر حاضرِ عدالت نہ ہوں گے۔ منٹو صاحب ان ریمارکس پر ہنستے رہے اور کہتے رہے:

"نہیں یار! کیوں نہ جاؤں گا۔"

حالانکہ وہ اس سے پہلے مجھے کہہ چکے تھے کہ نہیں جاؤں گا۔

بالآخر ایک بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے منٹو صاحب سے کہا:

"اگر میں کل صبح کے لیے دو سیٹیں بُک کرا دُوں، تو کیا آپ اور نصیر انور کراچی چلے جائیں گے؟"

منٹو صاحب نے میری اس پیشکش کو قدرے تکلّف کے ساتھ قبول کر لیا۔ بعد ازاں منٹو صاحب سے گزارش کی گئی کہ آپ گھر تشریف لے جائیں، میں سیٹیں بُک کرانے کا بندوبست کرتا ہُوں۔

چنانچہ پاکستان ٹائمز کے دفتر سے اپنے دفتر تک پیدل آیا۔ اپنی سائیکل سنبھالی۔ سائیکل پر سوار ہُوا تو بھائی کی بیماری اور اس کی دوا پھر یاد آ گئی۔ سائیکل کے پہیے کے ساتھ میرا دماغ بھی گھُومنے لگا۔

سیٹیں بک کرانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ ریزرویشن آفس سے معلوم ہوا کہ چار دن تک کوئی سیٹ خالی نہیں۔ اِدھر دقّت یہ تھی کہ منٹو صاحب کی دوسرے دن عدالت میں حاضری تھی۔ چنانچہ شوکت تھانوی صاحب کے پاس ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ انہوں نے پہلے تو خوب سُست کہا۔ لیکن پھر یہ انتظام کرا دیا کہ اگر ہم کل صبح سات بجے اسٹیشن پہ پہنچ جائیں تو سیٹوں کا انتظام ہو جائے گا۔

میں نے اس کی اطلاع منٹو صاحب کو دے دی اور ان کی بیگم اور ہمشیرہ سے بھی کہا کہ انھیں صبح تک تیار کر دیجئے گا تاکہ میری ذمہ داری ختم ہو۔

رات کو جب گھر پہنچا تو گھر والوں نے شکایت کی کہ بھائی اتنا بیمار ہے اور تمہیں دوا تک پہنچانے کی فرصت نہیں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ لیکن میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ پر آج کیا بیتی ہے۔ رات بھر کبھی بھائی کی بیماری کا خیال آتا رہا، کبھی منٹو صاحب کی کرم فرمائیوں کا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں ایسے مواقع پر بجائے اختر شماری کے زخم شماری کرتا ہوں۔ چنانچہ رات بھر یہ مشغلہ جاری رہا۔ صبح ۵ بجے گھر سے چل نکلا۔ گھر والے میری شب بیداری سے ہی کافی پریشان تھے۔ جب علی الصبح گھر سے نکلا تو وہ اور پریشان ہو گئے۔ اس لیے کہ میں سردیوں میں رات کے گیارہ بجے سے پہلے سونے کا اور صبح ۹ بجے سے پہلے اُٹھنے کا عادی نہ تھا۔

اُن کے استفسار پر میں نے صرف اتنا کہا کہ میرا ایک دوست کراچی جا رہا ہے اسے اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ ابھی آ جاؤں گا۔ اور بھائی کی دوا بھی لاؤں گا۔ جب بھائی دروازے کے باہر پہنچا تو سوچا کہ تانگے میں بیٹھ کر منٹو صاحب کے ہاں پہنچوں۔ پھر خیال آیا میں بہت سویرے جا رہا ہوں، جلدی پہنچ گیا تو منٹو صاحب کو تکلیف ہوگی۔ اُدھر یہ بھی دھڑکا، اگر میں نے جلدی پہنچنے میں ذرا سی غفلت کی تو منٹو صاحب گھر سے بھاگ جائیں گے، پیدل ہی چل نکلا۔ اپنے بجائے ان کی تکلیف کا زیادہ خیال رہا۔

راستے میں کُتّوں نے بھی بھونک کر استقبال کیا۔ سوچتے ہوں گے کہ اس شکل و صورت کا انسان آج اِدھر کیسے! ایک آدھ جگہ بھنگی نے بھی سڑک صاف کرتے ہوئے کہا:

"ہٹ جاؤ بابُو جی!"

اُس وقت بڑا جی چاہا کہ ذرا اس کے پاس رُکوں۔ اس کی خیریت اور اس کے بال بچّوں کا احوال پوچھوں۔ پھر نہ جانے ہمت کیوں نہ ہوئی۔ اس کے باوجود جب منٹو صاحب کے مکان پر پہنچا ہوں تو کافی سویرا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی بیگم نے دروازہ کھولا، منٹو صاحب کو جگایا تو منٹو صاحب آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور السّلامُ علیکم سے استقبال کیا۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک بڑی سی گرم چادر لپٹی ہوئی تھی، جیسے مفلر لپیٹا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نصیر انور بھی آ پہنچے تاکہ منگوایا گیا، ان کی ہمشیرہ، بیگم اور بچیوں نے ہمیں وداع کیا اور خیریت سے واپسی کی دُعا مانگی۔ اسٹیشن پر سیٹوں کا انتظام ہو چکا تھا۔ جب سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تو منٹو صاحب نے شراب کی بوتلوں کو

نکال کر ایسی جگہ رکھ دیا، جہاں ہر آتے جاتے کی نظر پڑتی تھی۔ میں نے منٹو صاحب سے کہا، ایسا نہ کیجئے۔ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی کاپی نکال کر دکھائی کہ میرے پاس شراب کا پرمٹ ہے۔ یہ بات ان کے منہ ہی میں تھی کہ گاڑی چلی چھک چھک چھک۔

دوسرے دن اخبار میں آیا کہ منٹو صاحب عدالت میں حاضر ہو گئے تو جان میں جان آئی۔

ایک وقت منٹو صاحب پر یہ بھی آیا کہ جب وہ ایک دم بیٹھے بٹھائے کہنے لگے :

"ارے بھئی اِسنو تناتن تناتن تناتوم تناتوم" (پتا نہیں کیا الابلا) وہ صاحب منٹو صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ وُہ پریشان کہ ایک دم انہیں کیا ہو گیا۔ اِدھر سے استفسار ہو گا، سنیں۔ منٹو صاحب کہیں گے، ریڈیو!

ارے بھئی! کہاں ہے؟

جواب ملے گا، اِدھر آؤ اور میرے کانوں کے ساتھ اپنے کان لگا دو۔ آ رہی ہے نا آواز! واہ وا کیا گلا پایا ہے کمبخت نے! پھر ہاتھ کے اشاروں سے سُر کے اُتار چڑھاؤ کا ساتھ دیں گے۔ کبھی کبھی اُٹھ بیٹھیں گے اور کبھی کبھی کھڑے کھڑے بیٹھ جائیں گے۔ ساتھ ہی تبصرہ بھی "ہائے ظالم نے مار ڈالا - یا "ظالم" نے مار ڈالا۔ واہ وا، بھئی واہ وا، شاباش، ہائے" اگر اس وقت شرارت سے کسی نے کہہ دیا کہ منٹو صاحب! جو کچھ آپ سُن رہے ہیں وُہ ہمیں سُنائی تو نہیں دیتا اس لیے ہمیں کاغذ پر لکھ کر بتاتے جائیے۔ تو وُہ کاغذ اور قلم سنبھالتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیں گے کہ کانوں میں تیل ڈالا کرو اور سر کی مالش کرایا کرو۔ اور ساتھ ہی لکھنا شروع کر دیں گے۔ پہلے دو تین پنجابی گیت لکھیں گے، پھر کہیں گے :

"اب اردو کے گانے سُنیئے۔"

وُہ بھی تین چار لکھ ڈالیں گے ——— یہ ریڈیو دو تین مہینے تک منٹو صاحب کے کانوں میں بجتا رہا جسے صرف ان کی اکیلی جان سُنتی رہی اور لوگوں کو یہ لکھ کر یا خود سُنا کر سناتے رہے۔ پھر پتہ جانے کیوں ان کے کان کے ریڈیو کے والوز خراب ہو گئے اور ریڈیو بجنا بند ہو گیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کے قریب ان کے گھر گیا تو باہر سے دیکھا کہ منٹو صاحب گا رہے ہیں، کبھی ہاتھوں کو کانوں تک لے جا رہے ہیں اور کبھی سُر کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو نچا رہے ہیں۔ میں باہر کھڑا کافی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر تابہ کے تنگ آ کر آواز دی۔ اُن کا نوکر باہر آیا تو میں نے کہا :

"ذرا منٹو صاحب کو بُلا دیجئے!"

اس نے جا کر منٹو صاحب سے کہا کہ کوئی صاحب آپ کو بُلا رہے ہیں۔ منٹو صاحب نے جواب دیا: "ان سے جا کر کہہ دو، اس وقت منٹو صاحب نہیں آ سکتے، گانا گا رہے ہیں۔"

پھر خود ہی چلے آئے اور دروازہ کے قریب آ کر عینک کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا: "کون ہے؟ اچھا

آپ ہیں، بھئی! معاف کرنا، میں اس وقت گا رہا تھا آؤ تم بھی گانا سنو۔"

میں نے پوچھا: "اور کون کون ہے؟"

کہنے لگے: "کوئی نہیں ہے، گھر ہی کے کچھ لوگ ہیں۔ آؤ، آؤ، آؤ!"

مقدموں کی بھر مار نے اب انھیں سنبھلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب ان سے افسانے نہیں سنبھلتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس عرصے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بحیثیت مجموعی ان کی ناکام تحریریں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانہ بعد میں لکھتا ہوں، مقدمہ پہلے چل جاتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جی چاہتا ہے لکھنا وکھنا چھوڑ دوں اور پاکستان اور ہندوستان سے دور کہیں چلا جاؤں، وہاں بیٹھ کر خوب جی کھول کے افسانے لکھوں۔ اشاعت کے لیے انہیں یہاں بھجوا دوں تاکہ سارے پبلشر اندر ہو جائیں۔ اپنی تو جان چھوٹے۔ میں سفید کو سفید کہنے پر مجبور ہوں۔ حکم ہوتا ہے کہ نہیں سفید کو سیاہ کہو، سیاہ کو سفید کہو۔ اگر سیاہ اور سفید دونوں نظر آ رہے ہوں تو کچھ نہ کہو، چپ رہو، پگھلا ہوا سیسہ نگل لو یا خودکشی کر لو۔ پھر مجھے جو سزائیں ملتی ہیں وہ بھی انگریز بہادر کے زمانے کی۔ میں تو ایک ہی طرح کی سزائیں بھگت بھگت کے بور ہو چکا ہوں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مملکتِ پاکستان میں مجھے اسلامی سزائیں ملتیں تاکہ ورائٹی ہی کی وجہ سے دل کو ڈھارس رہتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ وہی ہے کہ جو تھا۔ انگریز بڑی سیانی قوم ہے۔ وہ یہاں سے اپنا جسم بچا کر لے گئی ہے لیکن اپنی روح چھوڑ گئی ہے۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ ایک ہپ ٹلا (یہ ان کا خاص لفظ ہے) قسم کا افسانہ لکھوں، جس میں سماج اور مملکت کے تمام ناسوروں کو ایک ساتھ چھیڑ دوں۔ خوب خوب نشتر زنی کروں۔ اس کے بعد بھرپور نمک پاشی کروں۔ انجام کار اپنے آپ کو گولی مار دوں اور یہ سمجھ لوں کہ مقصد ادا ہو گیا۔

منٹو صاحب پنجابی بولنے میں بڑی آسانی محسوس کرتے ہیں۔ جب انہیں شبہ ہو جائے کہ مخاطب تو اہلِ زبان ہے، تو ان سے استفسار کریں گے:

"آپ پنجابی سمجھتے ہیں نا؟"

ظاہر ہے کہ مخاطب نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلائے گا اور اردو میں جواب دے گا کہ بول نہیں پاتا، سمجھ تو لیتا ہوں۔

اس پر منٹو صاحب کہیں گے:

"معاف کیجیے گا جب میں اردو بولتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا منہ پک گیا ہے یا پک رہا ہے۔ اُردو بولتے ہوئے میرے جبڑے دُکھنے لگتے ہیں۔ تالو اور زبان کے نیچے جو جگہ ہے وہ مجھے چٹاپ چٹاپ کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے میرے بھائی! معاف کرنا، میں پنجابی ہی میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے اردو سے کوئی بَیر ہے۔ سوچتا ہوں کہ جب لکھتا اُردو میں ہوں تو پنجابی میں باتیں کروں۔ اگر آپ

چاہیں تو میں اُردو میں بھی باتیں کر کے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہُوں۔"

منٹو صاحب عموماً گھر میں ملتے ہیں یا تانگے میں ہوتے ہیں۔ کسی تانگے کی پچھلی سیٹ پر دُور سے کوئی بیمار لیٹا ہوا نظر آئے جو اُلٹے رُخ ٹیک لگا کے لیٹا ہو، تو فوراً کوئی رائے قایم نہ کر لیجئے گا۔ تانگے کے قریب آنے کا انتظار کر لیجئے گا۔ بہت ممکن ہے وہ منٹو صاحب ہوں۔ اگر ان کے دو ایک ہم بوتل و ہم گلاس ساتھ ہوں تو وہ اگلی سیٹ پر بیٹھیں گے اور اپنے اُن قدردانوں سے کہتے جائیں گے کہ میں ایک بہت بڑا افسانہ لکھنا چاہتا ہُوں۔ لیکن ڈرتا ہُوں کہ مقدمہ چل جائے گا۔ اگر مقدمہ نہ چلا تو مجھے دُکھ ہوگا، اس لیے کہ میرے ذہن میں خواہ مخواہ یہ آئے گا کہ اپنی حکومت تو فرائض منصبی سے بھی بیگانہ ہو گئی۔ یا مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ افسانہ بڑا ہی تھرڈ کلاس ہے ورنہ حکومت ضرور ایکشن لیتی۔

منٹو صاحب میں ذاتی طور پر بڑی خُوبیاں ہیں۔ لیکن شراب نے ان میں کئی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں۔ پہلے مجھے اُن پر غصہ آتا تھا اب ترس آتا ہے۔ تو اُن کے فن پر اُن کی تمام کمزوریوں کو نثار کر سکتا ہُوں۔ کسی اور کا حال خدا جانے۔

(۲)

عمر کے آخری دنوں میں مرحوم یہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی ہی میں ان پر کوئی اچھا رسالہ نمبر چھاپ دے۔ اس سلسلے میں اوروں کے پاس بھی گئے ہوں گے میرے پاس بھی آئے اور جو میری اور ان کی اس سلسلے میں گفتگو ہُوئی تھی۔ وہ مندرجہ ذیل ہے:

"یار! منٹو نمبر نکالو۔"

"جی!"

"میں کہتا ہُوں نقوش کا منٹو نمبر نکالو۔"

"آج یہ آپ کیسی باتیں ———"

"تمھارا خیال یہ ہے کہ میں نشے میں ہوں اور بکواس کر رہا ہوں۔"

"آخر اتنی جلدی کیا ہے، چھپ جائے گا!"

"میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ پہلے مر کے دکھاؤں، پھر نمبر چھپے۔"

"مرنے کا نام نہ لیجئے، ابھی آپ کی بڑی ———"

"اب جی کر بھی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہُوں۔"

"اچھا! یہ بتائیے، اس نمبر میں کیا کیا ہوگا؟"

"اب تک مجھے جتنی گالیاں ملی ہیں، وہ سب سے پہلے چھپیں گی اور جتنے بیوقوفوں نے میری تعریف کی ہے وہ سب سے آخر میں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اسکیچ ہوں گے۔ بہر حال تمھیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ نمبر تمھیں میں مرتّب کر دُوں گا۔"

"اگر آپ مُرتّب کر دیں گے تو میں کیا کروں گا؟"

"تم جھک مارنا!"

"اِس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتّب کر لیں اور اسے کتابی صورت میں چھاپ لیں۔"

"میں چاہتا ہُوں نقوش کا منٹو نمبر نکلے۔"

"تو پھر آپ کا اِس نمبر کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ میں کسی کی رائے تک برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تُو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ کیا تو مجھ سے زیادہ قابل ہے؟"

"قابلیت کو چھوڑ یئے، یہ معاملہ ذمہ داری کا ہے۔"

"ذمہ داری کو چھوڑو، یہ معاملہ قابلیت کا ہے۔"

"اس معاملہ میں مجھے آپ کی قابلیت سے انکار ہے۔"

"اچھا تو تم پھر جیسی میری دُرگت بنانی چاہتے ہو میری زندگی ہی میں بنا ڈالو۔"

منٹو کے انتقال کو ادیبوں نے ایک ادبی حادثہ قرار دیا۔ یہ بات ہے بھی ٹھیک، اس لیے کہ اس نے افسانوی ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اُسے کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ نہ اب، نہ جب!

میں نے بھی دوسرے رسالوں کی طرح نقوش کا منٹو نمبر نکالا، جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے دیگر رسائل سے بہتر تسلیم کیا گیا۔ اُس میں مرحوم کی بیس تو غیر مطبوعہ کہانیاں تھیں، دس نمائندہ افسانوں کا انتخاب بھی مرحوم کا اپنا تھا۔ فن پر لکھنے والوں میں ممتاز شیریں، وقار عظیم، محمد حسن عسکری، عابد علی عابد، ابو اللیث صدیقی، عبادت بریلوی اور ممتاز حسین تھے۔

شخصیت پر لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، ابو سعید قریشی، حامد جلال، غلام عباس اور راقم الحروف تھے۔

منٹو نمبر پر تبصرہ کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں۔ ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہُوں۔

جب میں نے منٹو نمبر کے لیے مضامین فراہم کرنے شروع کیے تو قدرت اللہ شہاب کو بھی دعوت دی، جسے انہوں نے منظور کرتے ہوئے یہ لکھا کہ "مضمون جلد بھیج دُوں گا اور وہ ایک خط کی صورت میں ہوگا، جو منٹو آپ کو عالمِ بالا سے لکھیں گے"۔ یہ خیال مجھے پسند آیا، اس لیے کہ اس میں منٹو کی پُوری شخصیت آ سکتی تھی، اور وہ تمام مسائل بھی آ سکتے تھے جو منٹو سے متعلق ہو سکتے تھے۔

جب شہاب صاحب اپنی مصروفیات کی بنا پر وقت نہ نکال سکے تو میں نے اسی انداز میں جو کچھ لکھا اسے یہاں پیش کرتا ہُوں، جو "منٹو کا ایک خط" کے نام سے منٹو نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس خط میں میں نے کوشش کی تھی کہ

منٹو کا اسلوب بھی آسکے۔ کامیابی خدا معلوم !

برادرم، السلام علیکم !

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لیے نیا تھا۔ بہرحال اُس ماحول سے یقیناً بہتر ہے جس میں میں نے ۴۲ برس تک جھک ماری تھی۔ وہاں جب تک رہا سُولی پہ لٹکتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہُوں، نہ صفیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نکہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے، ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا، ابّا! فلاں چیز لا دو، فلاں چیز لا دو۔ تمہیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی فرمائش اپنی تنگ دستی کی بنا پر پُوری نہیں کر پاتا تھا تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔ حتّیٰ کہ بعض منحوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچّی کی سالگرہ تھی اور جیب میں پھُوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں مَیں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان کُش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لیے تھے کہ آپ کے جہنّم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھُلتا رہا۔ نہ صرف گھُلتا رہا بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔

یہاں ہر وقت یہی دُعا کیا کرتا ہُوں کہ یہ زندگی میرے تمام ہمعصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لیے کہ دیاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی۔ جب مجھُی کو وہاں سے آنا پڑا تو نہ جانے وُہ کیوں ٹکے ہوئے ہیں !

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں، جو لاہور میں موجود ہیں اُن سے زبانی کہہ دیں، جو لاہور سے باہر ہیں انہیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچّوں سمیت میرے پاس آجائیں۔ میں نے یہاں ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں اس لیے کسی کو تکلیف نہ ہوگی۔

زمانے نے نہ میری قدر کی اور نہ دوسرے اہلِ قلم کی۔ تمہیں علم ہے اگر ہم لوگ ہی تمہارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم، ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے، مزے میں ہے۔ اکثر قلم کاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح پھُولے بیٹھے ہیں۔ بعض نے تو تمہارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجویات سپردِ قلم کی ہیں کہ جب تک کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا جائے سُنی ہی نہیں جا سکتیں۔ اگر وہ چھپ گئیں تو تمہارے ہاں کے بعض سرپھرے سرِ بازار پٹیں گے۔

بہرحال ہجویات کا وُہ مجموعہ جب بھی شائع ہُوا تمہیں اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا۔ نقوش میں اس پہ تبصرہ

کردینا۔

تمہارے ہاں کے ادیب اور تمہارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف بہن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمہارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدار وطن بھی، تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جاننا، میں شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمہیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جرم میں چلے تھے حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پہ کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے، کبھی وارنٹ نکلے، کبھی گرفتار ہوا، کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیے جاتے، جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو وہاں کون مسخرہ رہے!

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جائیں تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے دور بھاگا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں تو تنقید میں علامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں، تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے ان بے تحاشا لکھے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کر لیں اور میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب جبھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کہے، اُس کا اُلٹا کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تین لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھ لیجئے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں: اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہو گا اور نہ واقعیت کے ساتھ خلوص، جب فن کار کے دل کے ساتھ نقاد کا بھی دل دھڑکے گا تو پھر جو کچھ لکھا جائے گا اُس پر ایمان لانا پڑے گا۔[1]

---

[1] نقادوں کے بارے میں منٹو کے جو خیالات ہیں، مجھے اُن سے اتفاق نہیں، لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترمیم کرنے کا حق بھی نہیں۔

یہاں شرابِ طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجیے شرابِ طہور نوش کریجیے۔ تمہارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی تھی اور اس جگر پاش شراب کے لیے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لیے ذلیل تک ہُوا۔ دوستوں میں میری عزّت نہ رہی۔ جدھر جاتا تھا احباب منہ موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مُڈ بھیڑ ہو جاتی تو وُہ میرے مُنہ پر جھُوٹی قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میری جیب میں دھیلا تک نہیں۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ جیب میں دھیلا چھوڑا اتنے روپے ہیں کہ وُہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں شراب کو خانہ خراب اس لیے کہتا ہُوں کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہُوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں وہ سب ہزاروں برس پُرانی ہیں۔ لیکن ان کم بختوں کا جسم اور بانکپن تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لیے کہ تم اس مسئلے میں نرے چغد واقع ہوئے ہو۔ تمہاری چغدیت کا احترام کرنے کے باوجود یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پُروقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے کہ تمہارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بکواس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اُس کمبخت کے بیہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے جانبر ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہم عصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا، اس لیے بھی کہ میرے مقابلے ہی کا کون تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالبؔ نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا پھبتی باز ہے، کہنے لگا:

"تُو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تُو نے اپنے افسانوں کے عنوان چُنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سُوجھے تو میرے شعروں کو دھر رگڑا اور محسن کشی ایسی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی، اُس میں بجائے میری شکر گزاری کے اظہار کے میری کسی خُوبی کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ اُلٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا اوہ تھا، رنڈی باز تھا، جُوا کھیلتا تھا اور اس کی پاداش میں جیل تک ہو گئی تھی۔" وغیرہ وغیرہ

تمہیں علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالبؔ ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اُس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کیں تو میں نے دل میں کہا: لعنت ہو سعادت حسن منٹو! تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالبؔ ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان، میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں اور پیتے ہی میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری اَنا بیدار ہوتی ہے تو غالبؔ کہتا ہے:

"میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا لیکن میں نے اُسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔"

اور میں اس سے کہتا ہُوں:

"شعر کہنا کون سا کمال ہے مرزا صاحب! میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے۔"

بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

چچا سام کا دبدبہ تو تمہارے ہاں دن دُونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو!

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیے۔ لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں کہ تم اپنی ننھی سی جان خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبرِ بد بھی سُنی ہے کہ اب تو تمہارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں اور تم سب اُلوؤں کی طرح ہاتھ پہ ہاتھ رکھے اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی تن آسانی اچھی نہیں ورنہ پچھتاؤ گے۔ حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُن سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دُعا کرو کہ وُہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آجائیں تاکہ تمہاری جان چھوٹے۔ میں ان سے نمٹ ہی لوں گا۔ فراڈ کو فراڈ ہی پچھاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہُوں تمہارے ہاں میرا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کباب ہوگیا اس لیے کہ جب تک میں رہا سب نے مل جل کر مجھے اپنے ہاں سے دُور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے آگیا ہُوں تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گمشدگی کے اعلانات کیوں کئے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں جو مجھے اپنے ہاں گھُسنے نہیں دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے رُوپوشش ہونے پر خصوصی ماتم کر رہے ہیں ان کا بھی میرے ساتھ یوسفؑ کے بھائیوں ایسا سلوک تھا۔ ان حالات میں تم سب کو اپنے اس منافقانہ رویہ پر شرم آنی چاہیے۔

یہاں میرے کچھ قدردان پیدا ہو گئے ہیں اور پچھلے دنوں اُنھوں نے میرے ذمّہ یہ کام کیا تھا کہ یہاں کے بارے میں اپنی سہ ماہی رپورٹ پیش کردوں۔ یہ فریضہ میرے سپرد اس لیے ہُوا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں، میں نے بھی اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ بڑی ہیپ ٹلّا رپورٹ ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا، اُس کا بھی کچا چٹّھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی نہ منڈوانے کا دستور ہے، وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس لیے اس کی اجازت ہونی چاہیے کہ جس کا دل چاہے داڑھی رکھے جس کا دل چاہے نہ رکھے۔

اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، خالہ جی کا گھر نہ تھا۔

تمھارے ہاں ایسی کوئی کھری بات ذرا سے وزیر اعظم کے سامنے کہہ دیتا تو میری زبان گُدّی سے نکلوادی جاتی۔

اطلاعاً عرض ہے یہاں میری کتاب "گنجے فرشتے" کافی پسند کی گئی ہے۔ ہو سکے تو میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو
۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء

شوکت صاحب

شوکت تھانوی کی شخصیت بڑی دلکش اور پیاری ہے۔

مگر عجیب وغریب بھی۔

قبل اس کے کہ میں زبان کھولوں، کیوں نہ پہلے آپ اُن کی رائے خود اپنے بارے میں سُن لیں۔ اس سے کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو، مجھے یہ فائدہ ضرور پہنچے گا کہ شوکت صاحب مجھ سے ناراض نہ ہوں گے اور آپ بھی مجھے یہ کہہ کر بخش دیں گے کہ جب خود "مابدولت" کی اپنے متعلق یہ رائے ہے تو پھر کسی اور پہ کیا دوش! جبکہ دوسرے رائی کا پہاڑ بنانے کے بھی عادی ہوں۔ میں اپنے اُوپر ہزار تہمتوں کو بہ خوشی قبول کر سکتا ہوں، سوائے اس کے کہ میرا شمار رائی کا پہاڑ بنانے والوں میں ہو۔ مجھے عین خوشی ہوگی کہ میں اس مضمون کے سلسلے میں رائی کی رائی اور پہاڑ کا پہاڑ بنا کر پیش کر سکوں۔

مولانا شوکت تھانوی اپنی ذات کے بارے میں فرماتے ہیں،

"اس[1] سے بڑھ کر اور حماقت کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کو پیش کر دیں۔ اب یہ کہنے والا کوئی بھی نہ ہوگا کہ خدا نے اس کو سچ بولنے کی توفیق عطا کی۔

کوئی کہے گا: "سُن لیا آپ نے، یہ جو آپ کے شوکت تھانوی ہیں اعلیٰ درجے کے جاری واقع ہوئے ہیں۔"

کسی طرف سے آواز بلند ہوگی: "بدمعاشیوں کے سوا اور کچھ کیا ہی نہیں۔"

——— ظرافت کے بارہ میں ان کی رائے معلوم ہو جائے تو مجھے دو لفظ لکھنے میں اور آسانی ہوگی۔

"بچو[2]! یہ شاعر بھی ہیں۔ جب سنجیدہ کلام رو رو کر پڑھتے ہیں تو سُننے والوں کو ہنسی آجاتی ہے۔ خدا کے لیے ان کو سمجھاؤ کہ یہ ترنم سے کلام سنانا چھوڑ دیں۔ اور اگر شاعری ترک کر دیں تو تم سب مل کر یوم نجات مناؤ۔"

بچو! ان کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر اگر تمھیں ہنسی نہ آئے تو اپنے آپ کو سمجھدار سمجھنا۔ اور اگر ہنسی آجائے تو کسی فقیر سے اپنے لیے تعویذ لکھوانے کی کوشش کرنا۔ بعض لوگ شوکت تھانوی کو مزاح نگار

---

[1] مابدولت صفحہ ۱۱، ۱۲

[2] نقوش نمبر ۳۱، ۳۲ صفحہ نمبر ۶

کہتے ہیں اور بعض طنز نگار اور اس قسم کے لوگ بہت کم ہیں جو طنز اور مزاح کا فرق سمجھ سکیں - فرق سمجھتے ہوتے تو نہ انہیں طنز نگار کہتے، اور نہ مزاح نگار"۔

سُن لی آپ نے اُن کی رائے خود اپنے بارے میں، اب اگر میں نے یہ طے بھی کر رکھا ہو کہ شوکت صاحب کے خلاف ہی مضمون لکھوں گا۔ پھر بھی اس سے زیادہ کیا کہوں گا جو خود انھوں نے اپنے متعلق فرما رکھا ہے۔ لہٰذا مجھے اُن کی رائے سے بھٹکنا نہیں چاہیے، ورنہ یہ مضمون دو کوڑی کا نہ رہے گا۔

جہاں تک ان کے مزاح نگار ہونے کا تعلق ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اگر آپ ان کی اس خصوصیت سے بھی منکر ہیں تو یہ بڑی زیادتی ہے۔ آپ کی رائے اپنی جگہ برحق بھی ہو تو میری بات مان لیجئے کہ یہ مزاح نگار ہیں۔ اگر آپ نے میری یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تو میری اور ان کی دل شکنی ہوگی۔ اور دل شکنی کسی صورت بھی اچھائی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ لاکھ کہیں کہ میں مزاح نگار نہیں ہوں۔ لیکن یہی بات اگر آپ نے دُہرا دی تو شوکت صاحب ناراض ہو جائیں گے بفرضِ محال وہ ناراض نہ بھی ہوں، تو بھی یہ سوچیے کہ اگر شوکت صاحب مزاح نگار نہیں ہیں تو پھر آج کون ہے مزاح نگار؟

پاکستان اور بھارت میں مزاح نگاروں کا قحط ہے۔ اگر میری حکومت کی مالی اور سیاسی حالت اچھی ہوتی تو میں اس سے درخواست کرتا کہ وہ دو چار مزاح نگار ضرور امپورٹ کر لے تاکہ ہماری صحتوں پر اچھا اثر پڑے۔ اس لیے کہ ہم تو ایک ہی طرح کی غذا کھاتے کھاتے عاجز آ گئے ہیں۔

یُوں تو ان میں بے شمار خوبیوں کے ساتھ ساتھ اَن گنت بُرائیاں بھی ہیں لیکن سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ بے تحاشا لکھتے ہیں۔ یعنی سب کے سب مزاح نگاروں کا کوٹا یہ اکیلے ہی ختم کر ڈالتے ہیں۔ باقی بیچارے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک صاحب تو اپنی حق تلفی کے اظہار کے طور پر امریکہ میں پڑے ہُوئے ہیں۔ دُوسرے علی گڑھ میں ناسمجھوں میں سمجھ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چند ایک تو کُڑھتے کُڑھتے مر ہی گئے۔ اُن باغیرت حضرات میں عظیم بیگ چغتائی اور فرحت اللہ بیگ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ اب سرحد پار ایک صاحب کنھیا لال کپور ہیں، اُن کا یہ اس لیے کچھ نہیں بگاڑ سکتے کہ وُہ ہندو ہیں۔ اور خدا کو یہی منظور ہے کہ کوئی لاکھ زور لگا لے مگر ہندو اور مسلمان میں سے کسی ایک کو کسی طرح ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ بے تحاشا لکھتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کا موقع انہیں کم ملتا ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ انھیں سوچنے سمجھنے کا موقع کم ہی ملے ورنہ یہ صرف سوچتے ہی رہ جائیں گے اور کچھ بھی نہ لکھیں گے۔ اور پھر یہ ہوگا کہ بڑے زوروں سے آبادی کم ہونا شروع ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس دنیا میں ہمارے لیے قدم قدم پر غم کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ کوئی آدمی بھی تو مطمئن نہیں۔ بڑوں کو قوم کا غم کھا رہا ہے اور چھوٹوں کو اپنا غم۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑے قوم ہی کو کھا رہے ہیں۔ لیکن میں یہ بات سُنی اَن سُنی کر دیتا ہُوں۔

اچھے مزاح نگاروں میں ایک پطرس نامی مزاح نگار گزرے ہیں۔ اُنہیں ایک بُری عادت یہ تھی کہ سوچتے زیادہ تھے

اور لکھتے کم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نصف صدی کی عمر تک پہنچ کر بھی جو کتابچے لکھ سکے وہ بھی شوکت صاحب کی کسی ایک کتاب کی نصف ہے۔ برخلاف اس کے شوکت صاحب کی تصانیف کی تعداد پُوری سینچری نہ سہی نصف سینچری تو ہے۔ بعض لوگوں کے ہاں ہر سال ایک بچّہ کی اوسط ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ہر سال ایک کتاب کی اوسط ہے کچھ لکھنے والے اپنی تصانیف کو ہی اپنی اولاد سمجھتے ہیں۔ اس لیے یہاں یہ نہ پُوچھیے کہ ادیبوں کی "تصانیفی اولاد" کے علاوہ جو اولاد ہوتی ہے وہ کس کھاتے میں جائے گی۔

ان کی شاعری سے میرا ابھی ناک میں دم ہے۔ نہ جانے انہیں اللہ نے ان کی کن بداعمالیوں کی یہ سزا دی کہ شوکت صاحب بھی شعر کہنے لگے۔ شعر موزوں کر لینا ان کا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ تو ہر یو، پی میں پیدا ہونے والے کا حصّہ ہے۔ چونکہ یہ کچھ پڑھے لکھے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی کام کا شعر بھی کہہ نکلتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اتنے بھی پڑھے لکھے نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ یہ شعر و شاعری کے معاملے میں اپنا کوئی ثانی پیدا ہونے ہی نہ دیتے۔ اور اس پر ان کا ترنّم نورٌ علیٰ نور۔ بالکل ایسے سمجھے جیسے کوئی یورپین لیڈی اُردو کی کوئی غزل گانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس پر بھی آپ مشاعروں میں شرکت فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے۔ میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنّم سمیت سُن چکا ہُوں۔ اور میں نے یہ دیکھا کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہُوٹ ہُوئے۔ مجھے چُونکہ ان سے ایک دلآویز قسم کی ذہنی وابستگی ہے۔ اس لیے میں نے ہر بار یہ محسوس کیا ہے کہ بھرے مجمع میں مَیں ہی ہُوٹ ہُوا ہوں اس لیے مجھے خودکشی کر لینی چاہیئے۔ خدا کی شان دیکھیے کہ اب تک نہ شوکت صاحب نے خودکشی کی ہے اور نہ میں نے۔ نہ وہ شعر کہنے سے باز آئے اور نہ میں انہیں اب تک یہ سمجھا سکا کہ حضور شعر وِعر کہنا چھوڑیے، ورنہ ڈر ہے کہ مجھے خودکشی پر راضی ہونا پڑے گا۔

ویسے یہ اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں کہ شاعری میں استاد امام دین اور ترنّم میں پنڈت آنند نرائن مُلّا کو شرمانے لگے ہوں۔ یہ کئی نام کے شاعروں سے اچھا شعر کہتے ہیں۔ پھر بھی اگر یہ شعر نہ کہیں گے تو کون سا شعری ادب ڈوبا جاتا ہے البتّہ مجھے ان کی سنجیدہ شاعری سے مزاحیہ شاعری زیادہ پسند ہے اس لیے کہ یہ سنجیدہ شاعری کرتے وقت خواہ مخواہ اپنے اُوپر متانت طاری کرتے ہیں حالانکہ یہ اکثر اپنی سرشت کے مطابق آدمی کو آدمی کا بچّہ یا آدمچہ کہتے ہی پکڑے گئے ہیں اس پر بھی سنجیدہ شاعری، بات جچتی نہیں۔ ہزل میں یہ رفیع احمد خاں کے مُرید۔ وہ رفیع احمد خاں جن کے شعر سُن کر علامہ اقبال جیسا ٹھوس آدمی پھڑک اُٹھا تھا۔ اگر آپ کی ان سے یاری ہے تو شوکت صاحب سے ان کے اِس نوع کے شعر سُنیے ! مزے آ جائیں گے، دنیا بھی سنور جائے گی اور عاقبت بھی۔ اگر ذرا بھکے تو یہ سمجھ لیجیے کہ دُنیا بھی خراب اور عاقبت بھی نہ جانے خود ان کی عاقبت اور دنیا کا کیا حال ہے اور ہو گا !

مضمون شروع کرنے سے پہلے اگر میں ان کا حُلیہ بیان کر دیتا تو زیادہ مناسب تھا۔ چونکہ اس زمانے میں کوئی بات بھی مناسب طریقے سے نہیں ہو رہی اس لیے یہاں عرض کر دُوں تو کچھ حرج بھی نہ ہو گا۔

ان کا رنگ ہے تو گہر اگندمی (اگر میں ہلکا سیاہ کہوں گا تو ان کی ہو گی سُبکی) قد اچھا خاصا مردوں جیسا ہے

نہ زیادہ اونچا نہ ناٹا، بلکہ خوب صورت قد، ناک کو لمبی کہوں تو بھی غلط، چپٹی کہوں تو بھی غلط۔ اس لیے معاملہ بین بین سمجھئے۔ البتہ ناک ذرا اور شمال جنوب کو پھیلتی تو آپ بے دھڑک چپٹی ناک کا خطاب دے سکتے تھے۔ اب احتیاط لازم، دانت خاصے خوبصورت تھے مگر یہ اس رفتار سے پان کھاتے رہے ہیں کہ آخر کب تک بھلے لگتے رہتے۔ چہرہ پہ عینک، پہلے چہرے پہ مونچھیں بھی ہوتی تھیں درمیان میں غائب ہوگئیں۔ اب پھر اپنا جلوہ دکھانے لگی ہیں۔ ویسے ان کے چہرے کی اس چیز کا کوئی اعتبار نہیں۔ نہ جانے کب غائب ہو جائے اور کب نمودار۔

یہ بلا کی دلفریب اور محبوب شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں بڑے سے بڑا فقرے باز بھی نہیں ٹک سکتا۔ نتیجۃً محفل کی محفل زعفران زار بن جاتی ہے۔ یہ بڑے گنہگار ہیں۔ اگر قدرت نے انھیں بخشا تو اس کا سبب ان کی شخصیت کا یہی رُخ ہوگا۔ بات میں سے بات پیدا کر لیتے ہیں۔ لفظی رعایتوں کا جتنا زیادہ فائدہ اٹھاتے ہُوئے میں نے اُنھیں دیکھا ہے اور کسی کو نہیں دیکھا۔ طرزِ بیان میں بھی بلا کا حسن۔ اب تو ماشاءُ اللہ آپ ایکٹنگ بھی فرمانے لگے ہیں۔ سنا ہے کہ انہوں نے ایکٹنگ بھی خوب کی ہے۔ چشمِ بد دور!

قاضی جی بھی تو ان کی ایکٹنگ کی ایک رنگا رنگ تصویر تھی۔ کاش وہ تصویر مستقل نہ ٹنگی رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہوائی خدا ان کی صلاحیتوں کا کچھ غلط اندازہ لگا رہے ہیں ورنہ وہ اِن کے ذمہ کوئی اور کام کر کے ان کے مزید جوہر دیکھتے۔

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ یہ بلا کی دلفریب مجلسی شخصیت ہیں۔ ان کے قصّے سُنتے جائیے اور ان کی مغفرت کے لیے دُعا مانگتے جائیے۔

سنا ہے کہ یہ پچھلے دنوں مع اپنی بیگم صاحبہ کے کراچی جا رہے تھے۔ جس ڈبہ میں ان کی سیٹ تھی اُس کی ترتیب کچھ یُوں تھی کہ نچلی دونوں سیٹوں میں سے ایک پہ یہ تھے اور ایک پہ ان کی بیگم، بیگم کے اُوپر والی سیٹ ایک بڑے موٹے تازے آدمی کے حصّے میں آئی تھی۔ جب سب اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان ہوئے اور گاڑی چل دی، تو شوکت صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور اُن صاحب کو بڑے غور سے دیکھنے لگے۔ کبھی نیچے سے کبھی اُوپر سے، کبھی سر ہلاتے ہیں اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اور منہ چھت کی طرف اٹھا کر کہتے ہیں:

"سبحان تیری قدرت، خُوب چیز بنائی ہے تُو نے بھی۔"

اس پر وُہ صاحب کھسیانے ہو کر متوجہ ہُوتے اور ان سے پوچھا:

"آپ مجھ سے کچھ فرما رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"ایں۔"

"آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے؟"

"خیریت؟"

"میں اُس سے شادی کروں گا۔"

"ارے صاحب! آپ کی تو بیوی موجود ہے (اور نیچے ہاتھ کر کے) کیا یہ آپ کی بیوی نہیں ہیں ؟"

"ہیں تو ۔"

"پھر ؟"

سوچتا ہوں کہ جب آپ اوپر والی سیٹ سے نیچے اُتریں گے تو گریں گے ضرور۔ نتیجۃً میری بیوی شہید ہو جائے گی۔ اس لیے میں تو آنے والی گھڑی کے خوف سے کانپ رہا ہوں اور اس کا ابھی سے کوئی انتظام بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

روایت ہے کہ اس مکالمے پر ڈبے کا ڈبہ ہنس دیا۔ لیکن کسی نے اس طویل سفر میں اُن صاحب کو نیچے اترتے نہیں دیکھا۔

ایک تو انھیں نئی نئی باتیں سُوجھتی ہیں، پھر باتوں میں بلا کی برجستگی اور بعض اوقات زہر بھی۔

ان کی ہمشیرہ کی جب شادی ہوئی تو رواج کے مطابق لڑکے والوں نے انھیں خوب خوب بنایا۔ کوئی آ کر ان کے کان میں چپکے سے کہتا :

"آج آپ کی ہمشیرہ کی شادی ہے نا ؟"

شوکت صاحب: "جی ہاں !"

اُدھر سے ایک اور صاحب یہ کہتے ہوئے آتے :

"جی، آج آپ کی ــــ"

شوکت صاحب: "جی ہاں !"

بالآخر دُولھا کی بغل سے بھی ایک صاحب نکل آئے اور فرمانے لگے :

"آپ ہی دُولھا کے سالے ہیں نا ؟"

اس پر شوکت صاحب نے اُن حضرت کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُونچی آواز میں کہا : "آج ان صاحب سمیت مجھ سے کئی ایک نے پُوچھا ہے کہ آج آپ کی ہمشیرہ کی شادی ہے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ سب کے سامنے اقرار کر لوں کہ شادی میری ہی ہمشیرہ کی ہے اور ہمارے ہاں رواج یہ ہے کہ جب لڑکی جوان ہو جاتی ہے تو ہم اس کی شادی کر دیتے ہیں۔"

شوکت صاحب کے ان ریمارکس کے بعد جیسے سب کو سانپ سُونگھ گیا۔ پھر کسی کی کیا مجال کہ کوئی ان کے پاس سے گزر جاتے۔ راوی ہیں اس کے شوکت صاحب کے بھائی مولانا ارشد تھانوی صاحب، جو خیر سے ان کے بہنوئی بھی ہیں۔

ایسی باتوں سے ان کی زندگی بھری ہے۔ کہاں تک سُنیے گا، اگر وہ ساری باتیں سُنا بھی دی جائیں تو جو

اصل اور نقل میں فرق ہے وہ تو بہر حال رہے گا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ اتنا دلچسپ، اتنا ہنس مکھ اور ایسا باغ و بہار قسم کا انسان کبھی پریشان حال نہ ہو گا لیکن آپ رہتے ہیں پریشان حال۔ میں اس کی وضاحت نہ کروں گا کہ پریشانیاں انہیں گھیرے رہتی ہیں یا یہ پریشانیوں کو گھیرے رہتے ہیں۔ بہر حال ان دونوں باتوں میں سے ایک نہ ایک بات ضرور ہے۔

ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ بھی ہے کہ یہ بیٹھے بٹھائے ناراض ہو جاتے ہیں۔ نہ ناراض ہونے کا پلاٹ بناتے ہیں اور نہ ہی کوئی اسکیم، نہ ہی دوسرے کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ بے چارا مدافعت ہی میں کچھ کہہ سکے۔ اگر آپ نے اس موقعہ پر کچھ کہہ بھی دیا تو یہ سنتے تھوڑی ہیں۔ بھئی سُنیں بھی کیسے، کوتوالِ شہر کے بیٹے ہیں۔ اس معاملے میں میں اُن کو کم اور والدِ بزرگوار کو زیادہ قصوروار ٹھہراتا ہوں۔ یہ دوست برسوں میں بناتے ہیں قطع تعلق ایک منٹ میں کر لیتے ہیں۔

جو ان کے نئے نئے یار ہوتے ہیں وہ بڑے پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن جنہیں ان کی دیرینہ دوستی کا شرف حاصل ہے وُہ زیادہ پریشان نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ انھیں علم ہے کہ ابھی شوکت صاحب کبھی پھر منہ نہ دیکھنے کا اعلان کر کے گئے ہیں۔ مگر کسی دن خود ہی اسی پیار اور محبت سمیت آ جائیں گے اور اس دن کی ناراضی کا ذکر تک نہ کریں گے۔ پھر ویسی ہی گھُٹے گی۔ وُہی لطیفے ہوں گے۔ وہی شوکت صاحب ہوں گے۔ شوکت صاحب کی ناراضی ایک دم بلب کا فیوز ہونا ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد خود ان کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے گھُپ اندھیرا نہیں رہ سکتا۔ مجھے تو اُن کے رُوٹھنے پر بڑا پیار آتا ہے۔ ایسے لوگ کہاں ملیں گے جن کے رُوٹھنے میں بھی ایک معصومیت ہو۔ اگر ایسے لوگ ملتے ہیں تو مجھے کیوں نہیں ملتے۔ اگر آپ کو ایسی کسی شخصیت کا علم ہو تو مجھے اُس کا سراغ دیجئے۔ میں اُس سے دوستی کر دوں گا۔

اب فرسٹ کلاس قسم کے بُزدل ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں۔ اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رُلانے پر بھی قادر ہوتے اور پھر آپ شوکت تھانوی نہ ہوتے، علامہ راشد الخیری ہوتے۔

ذرا بادل گرجے، بجلی چمکے، پھر دیکھئے آپ کا مزا۔ نادری حکم کے ماتحت تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کرا دیں گے۔ اس کے بعد خود اُٹھیں گے، چٹخنیاں دیکھیں گے کہ کہیں کوئی چٹخنی کھُلی تو نہیں رہ گئی۔ پہلے خود اُٹھنے کے بجائے دوسروں کو اس لیے حکم دیں گے مبادا بجلی اندر گھُس کر تبادلۂ خیالات کر ڈالے۔ پُورے اطمینان کے بعد پھر لحاف لے کر پڑ رہیں گے خواہ دن کے بارہ ہی کیوں نہ بجے ہوں۔

آپ خدا سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ سانپ سے۔ سانپ سے ڈرتے تو سبھی ہیں لیکن آپ تو سانپ کے ذکر تک سے ڈرتے ہیں۔ جس رات سونے سے پہلے سانپ کا ذکر آ جائے تو پھر طے کہ اُس رات آپ کو نیند نہیں آ سکتی۔ بلکہ لیٹے لیٹے ہر لمحہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اب آیا سانپ کہ اب، اب کمرے کے فلاں کونے سے نکل رہا ہے اب میری

چارپائی کے نیچے پہنچا۔ اب چارپائی پر چڑھ رہا ہے۔ اب میرے بستر پر اور اب — اب — اسی اب میں رات کو صبح کر دیں گے۔

اگر رات کو کہیں کھٹکا ہو، تو یہ خود تھوڑی اُٹھیں گے، اُلٹا بیگم سے کہیں گے: "سُنتی ہو، ذرا اُٹھ کے دیکھنا، کیا بات ہے، مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے۔" اور جب بیگم اُٹھ کر دیکھیں گی اور اُنھیں بتائیں گی کہ بلی تھی، تب ان کی گھگی بندھنا بند ہو گی اور لحاف ہی میں پڑے پڑے پھُولی ہوئی سانسوں سے کہیں گے — ہوں اوں — اس کے بعد خاموشی —— تھوڑی دیر تک تو ڈاکو کے چلے جانے کا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد سونے کی کوشش کریں گے، صرف کوشش!

یہ بات کہنے والی تو نہیں لیکن آپ سُن لیں کہ یہ خدا کے بنائے ہوئے بُتوں کی بڑی پُوجا کرتے ہیں۔ کامیابیوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں۔ لیکن آپ ہیں "زبان ساز"، "بات ساز"، "مزاح ساز"۔ اس لیے اپنے مقاصد میں کامیاب ہی ہوتے ہوں گے۔ اس کا علم نہیں کہ خود بُت اُن سے دلچسپیاں لیتے ہیں یا یہ بُتوں سے۔ اس ضمن میں ایک قصہ یہ خود لکھ کر چھپوا چکے ہیں۔ اس لیے اسے دُہرا دینے میں کیا حرج ہو گا۔

"اب وہ ہمارے یہاں مہمان ہو گئیں۔ ایک ہفتہ، دو ہفتے، تین ہفتے، ایک مہینہ، دو مہینے، تین مہینے اور ایک دن یہ کہہ کر کہ جب میں بھائی صاحب کہتی ہُوں تو پھر پردہ کیسا! سامنے آ گئیں۔ نہایت حسین و جمیل، نہایت تمیزدار، نہایت خوش مذاق، اس لیے ہم پر یا بیوی پر ان کا اس قدر جم کر رہنا ہرگز بار نہ تھا۔ آخر ہم کو ایک دن یہی بات لے ڈُوبی۔ اُدھر سے پسندیدہ نظریں، اِدھر سے ان کی پذیرائی، شیطان نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر اس قدر بھینچا کہ دونوں ایک ہو گئے۔"[1]

میں تو اس کو بھی کردار کی ایک بڑائی سمجھتا ہُوں کہ یہ جھُوٹے تقدس کے قائل نہیں۔ اپنی لغزشوں پہ نازاں ہیں۔ بلکہ وُہ سادہ سے الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ بھئی! میں آپ جیسا انسان ہُوں آپ میں اور مجھ میں فرق اتنا ہے کہ آپ جھُوٹے تقدس کی آڑ میں وُہ کچھ نہیں کہتے جو آپ ہیں۔ میں تو ایک کھُلی ہوئی کتاب ہُوں جہاں سے چاہے پڑھ لو۔ اور ایک انسان کی زندگی میں اور میری زندگی میں کوئی فرق نہ پاؤ گے۔"

آپ بڑے مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ کسی زمانے میں تو چہرے پہ داڑھی بھی تھی البتہ آپ عام قسم کے مولویوں کی طرح تنگ نظر نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ روزے کے کم اور افطاری کے زیادہ قائل ہیں۔

آخر انسان ہیں، اس لیے بھُول چُوک بھی ہو جاتی ہے۔ اس بھُول کی پاداش میں آپ نے پچھلے برس ایک روزہ رکھا تھا، روزہ کیا تھا قیامت ڈھا دی تھی۔ اوّل تو آپ دفتر نہ گئے۔ بارہ بجے تک تو ٹمپریچر بھی ٹھیک تھا۔ پھر لگے بیگم سے لڑنے۔ کبھی بچّوں کو مارتے۔ بیگم نے بچّوں کو چھپا دیا اور خود بھی کوشش کرنے لگیں کہ کہیں چھپ جائیں۔

---

[1] ما بدولت صفحہ ۱۴۸

جب انہوں نے دیکھا کہ گھر کا آدمی سامنے نہیں آ رہا تو اُنھوں نے اِس موقعہ کو غنیمت جانا۔ پہلے تو کمرے میں بچھے ہُوئے قالین اُٹھاتے، پھر کرسیاں ایک طرف رکھ کر پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے لاتے رہے اور کمرہ دھوتے رہے۔ کوئی پون گھنٹے تک یہ شغل جاری رکھا۔ جب فرش خُوب ٹھنڈا ہو گیا تو آپ لنگوٹ کس کر ٹھنڈے فرش پر لیٹ رہے تاکہ ٹھنڈک پہنچے۔ پھر بار بار گھڑی کی طرف دیکھتے اور گھڑی کمبخت تھی کہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی حتّٰی کہ ان کی نیم بے ہوشی کے وقت افطاری ہُوئی، تب انھوں نے ہاتھ اٹھا کر خدا کے حضور دُعا مانگی کہ تو جسے توفیق دے وہی روزہ رکھ سکتا ہے۔ آج مجھ سے فاش غلطی ہُوئی آیندہ کبھی نہ ہو گی۔ لہٰذا تو میری اِس لغزش کو معاف فرما، تُو نے سب گنہ گاروں کے گناہ بخشے ہیں، ایک میرا بھی سہی! ——— ایک میرا بھی!

بچوں کی طرح یہ ضد بھی کرتے ہیں اور بڑوں کا سا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ بعض اوقات یہ کسی معمولی سی بات پر اڑ جائیں گے اور دُنیا جہان ایک کر کے اس بات کو منوا کے رہیں گے۔ کبھی کبھی بڑی بات کو بھی ہنس کر ٹال جائیں گے۔ یہ ایک انسانی کمزوری اور ایک انسانی ہی خُوبی ہے۔ سُنا ہے کہ یہ کمزوروں کے معاملے میں اَڑ جاتے ہیں اور شہزوروں کے معاملے میں ہنس دیتے ہیں۔ ہنسنا تو ان کی فطرت ہے۔ لیکن دبنا ان کی فطرت نہیں۔

کمزوریاں سب میں ہوتی ہیں۔ لیکن نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ شوکت صاحب جب اپنی کمزوری کا ذکر کرتے ہیں تو اُسے ایک عجیب ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں، اور اِس پلاٹ میں اتنے ایچ پیچ ہوتے ہیں کہ آپ کی نگاہ اُس پلاٹ کے ہر رُخ کو نہیں دیکھ پاتی، اُلٹی آپ کو ان سے ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ ایسے موقعوں پر دل میں کہتے ہوں گے کہ دیکھا کیسا بیوقوف بنایا۔ یقین کیجئے کہ یہ اِس طرح اپنے سب کے سب دوستوں کو بیوقوف بنا چکے ہوں گے۔ ایسے بیوقوفوں میں میرا نام سرِ فہرست لکھا جا سکتا ہے۔

ان کی ایک چھوڑ، دو بیویاں ہیں۔ اس طرح اُنھوں نے شادی کے معاملے میں اسلام کی آدھی رعایت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وُہ تو اب تک پوری رعایت سے فائدہ اٹھا چکے ہوتے بشرطیکہ ان دو ہی بیویوں نے انہیں کچھ کس کے نہ رکھ دیا ہوتا اب یہ ہر لمحہ سوچتے ہیں کہ ادھر اسلامی احکامات کی تکمیل ضروری ہے اِدھر بیویوں کی شہ زوریاں ہیں، کروں تو کیا کروں ——— جس دن شاہ ابنِ سعود کے انتقال کی خبر کے ساتھ اُنہوں نے یہ پڑھا ہو گا کہ موصوف بیویوں کے علاوہ ڈیڑھ سو کے قریب لونڈیاں بھی چھوڑ مرے، تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ لوٹ گیا ہو گا۔

اِس ترقی یافتہ دور میں کوئی یہ کہہ دے کہ شاہ ابنِ سعود نے اِس ضمن میں جو کچھ کیا تھا وُہ انسانیت کے سراسر خلاف تھا تو اسلام پر حرف آتا ہے، اور اُس حدیث کا بھی خیال آتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر مسلمان کو اچھائیوں سے یاد کرنا چاہیے۔ تو مجھے بحیثیت مسلمان کے اس مسئلے میں گنگ ہونا چاہیے لہٰذا مجھے گنگ سمجھئے۔

میں نے آج سے بارہ برس پہلے جیسے شوکت صاحب کو دیکھا تھا، ویسے ہی یہ آج بھی جوان ہیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم نے جیسا انہیں آج سے بیس برس پہلے دیکھا تھا ویسے ہی آج بھی ہیں، تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے اور

سوچتا ہوں کہ یہ آج کے بیس برس بعد بھی جب حسبِ سابق ہوں گے اور ہم بُوڑھے، تو انہیں برخوردار کہتے ہوئے کیسا عجیب لگے گا۔

آپ بڑا رواں لکھتے ہیں، بغیر ایک لفظ یا ایک نقطہ کاٹے لکھتے ہی جاتے ہیں۔ پھر خط اتنا پاکیزہ کہ اُسے پڑھنے کے بجائے چُومنے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی لکھنے والے کا اتنا صاف اور خوشخط مسودہ نہیں دیکھا۔ یہ عام طور پر لکھنے سے کنّی کتراتے ہیں۔ اور جب لکھنے پر آتے ہیں تو دو تین دن سے لے کر ہفتہ بھر تک ایک ناول لکھ ڈالتے ہیں۔ ان کا ایک واقعہ تو مجھے آج بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے لکھنؤ سے خط لکھا کہ لکھنؤ آ جاؤ، میں نے ایک ناول لکھا ہے وہ آ کر لے جاؤ۔ ساتھ ہی آم کھا جاؤ۔ جب بھی میرے سامنے کبھی آموں کا ذکر آیا ہے تو میں پھسل پڑا ہوں۔ میری یہی پھسلن مجھے لکھنؤ لے گئی۔ پہنچتے ہی جب میں نے ناول کا مطالبہ کیا کہ لائیے ناول، تو کہنے لگے جب جانے لگو تو لے لینا۔ چنانچہ وُہ دن بھی آ گیا جب میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں کل لاہور جا رہا ہوں۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد اُنھوں نے قلم، دوات اور کاغذ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہُوئے کہا کہ لکھو ناول۔ تو میں سمجھا مذاق کر رہے ہیں۔ جب میں متواتر چار پانچ گھنٹے لکھتا رہا اور یہ زبانی لکھواتے رہے تو مجھے یقین ہُوا کہ یہ مذاق نہیں تھا۔ آخر میں کہاں تک لکھتا، لکھتے لکھتے ہاتھ دُکھنے لگے تو میں نے ان سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اُس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ لیکن یہ ایک صاحب کو جا کر پکڑ لاتے اور اُن سے لکھنے کو کہا۔ وہ بے چارے بھی آنکھیں ملتے ملتے لکھتے رہے۔ جب وُہ بھی تین چار گھنٹے کے بعد آؤٹ ہو گئے تو پھر میری باری آئی۔ چنانچہ اسی طرح رات بھر شوکت صاحب لکھواتے رہے اور ہم لکھتے رہے اور جب صبح ان کا نوکر چائے لے کر آیا تو ڈھائی سو صفحات کا ناول ختم تھا۔ اس ناول کا نام "بیوی" ہے۔

اس ناول میں اور ان کے دُوسرے ناولوں میں معیار کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ یہ اتنی بڑی خُوبی ہے کہ آج اردو کے کسی بھی لکھنے والے کو نصیب نہیں۔ وہی پلاٹ میں ربط ہے۔ وہ پیاری پیاری سی رواں زبان ہے۔ وہی شگفتگی ہے جو ان کے دوسرے ناولوں میں ہے۔

آپ کو عجیب عجیب شرارتیں سُوجھتی ہیں اور آئے دن سُوجھتی ہیں۔ ایک بار ارشد تھانوی صاحب نے بتایا کہ اُنھوں نے ایک مرتبہ مجھ سے خوب انتقام لیا۔ قصّہ یہ تھا کہ میں ان سے بڑا تھا، اس لیے میں انہیں ہر وقت ڈانٹا کرتا تھا۔ کبھی کہتا کہ تم پڑھنے لکھنے کے بجائے کھیل کُود میں زیادہ وقت ضائع کرتے ہو۔ کبھی پُوچھتا کل رات تم اتنی دیر تک کہاں رہے۔ کبھی ڈانٹ پلاتا کہ خبردار جو کبھی پھر ایسے بال بنائے۔ میری انہی باتوں سے شوکت مجھ سے چڑے ہوئے تھے۔

فلاں سنہ کی بات ہے کہ میں لکھنؤ سے بھوپال جا رہا تھا۔ یہ حضرت مجھے گاڑی پر چھوڑنے آئے۔ میں باہر

پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ اور یہ میرا بستر بچھانے کے بعد قریب بیٹھے ہُوئے ایک صاحب سے کہہ گئے کہ باہر جو فلاں صاحب ٹہل رہے ہیں۔ ان کا دماغ خراب ہے۔ اس لیے بھوپال کے اسٹیشن تک ان کا خیال رکھنا۔ ایک تو ان کے قریب نہ آئیے گا، دوسرے انھیں کھڑکی کی طرف نہ جانے دیجئے گا مبادا چھلانگ لگادیں۔ ویسے تو ان کا علاج معالجہ کرایا گیا ہے اور پہلے سے کافی افاقہ بھی ہے۔ پھر بھی اُس عارضہ کے بعد یہ اُن کا پہلا سفر ہے لہٰذا اُن کا پورا پورا خیال رکھیئے گا، اور ان کی کسی حرکت پر بُرا بھی نہ مانیے گا۔ اور ذرا دُور ہٹ کے بیٹھ جائیے گا مبادا تھپڑ وپڑ رسید کردیں۔

جب گاڑی چلنے کا وقت آیا تو میں ڈبّہ میں آکر بیٹھا۔ سب مجھ سے کافی کافی فاصلے پہ ہو کر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ میں خاموش رہا، پھر ذرا بڑھ کے جو میں ایک صاحب کے ہاتھ سے اخبار لینے لگا تو وُہ یہ سمجھے کہ یہ لگا ہے تھپڑ مارنے۔ لہٰذا اُنھوں نے مجھے بڑے زور سے ڈانٹ دیا۔ خبردار جو ہاتھ بڑھایا۔ میں سمجھا کہ یہ صاحب پاگل ہیں لہٰذا خاموش ہوگیا۔

پھر دو ایک اسٹیشن گزرنے کے بعد میں بکس میں سے کتاب نکالنے کے لیے اُٹھا تو دو ایک آدمیوں نے آکر مجھے تھام لیا اور کہا کہ "خبردار جو اپنی جگہ سے ہلے"۔ میں بڑا پریشان ہُوا کہ یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے۔ نہ جانے یہ سب کے سب چور ہیں، ڈاکو ہیں یا پاگل ہیں۔ میں اُن سے لاکھ کہتا کہ بھئی آپ لوگ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں تو وہ مجھے جواب میں یہی کہتے کہ بس خاموشی سے سو جاؤ یا چُپ چاپ بیٹھے رہو، خبردار جو کوئی حرکت کی۔

آخر میں گھنٹوں چُپ چاپ بیٹھا رہا اور وہ سب کے سب میری طرف ٹکٹکی باندھے میری تمام حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ یُوں مہاتما بدھ بنے بنے مَیں کافی پریشان ہو چکا تھا اس لیے سوچا کہ ذرا سر ہی کھڑکی سے باہر نکال دیکھوں۔ اِدھر میں نے سر باہر نکالا اُدھر دو تین آدمی مجھ پر جھپٹے کہ جیسے مَیں چھلانگ لگانے ہی والا تھا۔ جب اُنھیں یقین ہوگیا کہ مَیں اب چھلانگ نہیں لگاؤں گا تو وہ اپنی اپنی جگہ پہ آکر بیٹھے۔

آخر جب مَیں نے اُن سے رونی سی صُورت بنا کر کہا کہ "آپ حضرات مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں" تو ان میں سے ایک صاحب بولے:

"ہمیں سب معلوم ہے۔"

"آخر کیا معلوم ہے؟"

وہ صاحب "کہ آپ پاگل ہیں۔"

"میں پاگل ہُوں؟"

"جی ہاں!"

"بھئی! یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

"اُنھی صاحب نے جو آپ کو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے۔"

آپ کو اپنی ظاہری آن بان کا بڑا شوق ہے۔ اچھا سے اچھا کپڑا پہننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر طرف ان کی عزت اور شہرت ہے۔ اگرچہ عزت اور شہرت نہیں بھی ہے تو بھی یہ چاہتے ہیں کہ وہاں بھی مجھے اُسی نظر سے دیکھا جائے اور لوگ میری ہر بات پر آمنا وصدقنا کہیں، اور واہ واہ کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ یہ بڑے خوش قسمت ہیں کہ انھیں زندگی میں اچھے اچھے چانس ملے اور انھوں نے خوب ٹھاٹھ سے زندگی گزاری، ورنہ آج کل کے ادیبوں کی جو حالت ہے وہ خدا کسی کو نہ دکھائے، بس ذرا سے احساس کمتری کے شکار ہیں۔

اب ان کا ایک اور قصہ سُن لیجئے اور اس کے بعد مجھے اجازت دیکھئے گا۔

ایک دن ہمارے دفتر میں ایک شاعر تشریف لے آئے اور ان کی تفریح کا سامان بن گئے۔ وہ بھی صرف شاعر ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس عقل کم اور شعر زیادہ تھے۔ چنانچہ خُوب بنے، اور انھیں اس کا مطلق احساس نہ ہُوا کہ "بنائی" ہو رہی ہے۔ انھوں نے آتے ہی شوکت صاحب سے مخاطب ہو کر پُوچھا:

"آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"جی ہاں، پرسوں رات ہیرا منڈی میں ملاقات ہُوئی تھی؟"[1]

"جی، وُہ میں نہ تھا، کوئی اور صاحب ہوں گے، میرا نام تو قربان الدین شہید ہے۔"

"واہ وا نام کی مناسبت سے کیا عمدہ تخلص چُنا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ شعر بھی کہتے ہیں۔"

"جی ہاں جھک مارتا ہوں۔"

"تو پھر جھک ماریئے، فی کس ایک غزل ہو جائے۔"

چنانچہ وُہ صاحب شروع ہو گئے۔ غزل پر غزل، ہر غزل کے بعد شوکت صاحب ساتھ ساتھ کہتے جائیں یہ ہُوئی فلاں صاحب کی، اب یہ ہوئی فلاں کی۔ جب ان کی اپنی باری آنے کو تھی کہنے لگے، "دیکھیے شہید صاحب! میرے نام پر دو غزلہ ہو جائے۔" یہ سنتے ہی ہم میں سے ایک صاحب مارے ہنسی کے وہاں سے ٹلنے لگے تو انھوں نے کہا: "بھئی! مت جاؤ، شہید صاحب غزل نہیں سنائیں گے۔"

سب اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی تو شوکت صاحب نے ان سے پُوچھا: "اپنا دیوان چھپوا ڈالیں۔"

اس پر شہید صاحب نے کمال بے نیازی سے کہا: "میں تیار ہُوں بشرطیکہ کوئی پبلشر تیار ہو جائے۔"

شوکت صاحب نے کہا:

"واہ تیار کیوں نہیں ہوں گے، میں اپنی کتابیں پانچ سو روپے فی کتاب کے حساب سے چھپواتا ہُوں۔"

---

[1] لاہور میں طوائفوں کا بازار

شہید صاحب نے کہا:

"میں تو تین سو پر بھی تیار ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر مجھے تین سو بھی مل جائیں تو مجھے عذر نہ ہوگا۔"

شوکت صاحب نے بڑی حیرت سے کہا:

"پھر آپ کی کتاب کبھی بھی نہ چھپے گی۔ میں تو ایک کتاب کا مسودہ تیار کرکے پبلشر کے پاس جاتا ہوں تو پانچسو روپے اپنی گرہ سے دے کر آتا ہوں، آپ اُلٹے پبلشر سے مانگتے ہیں یعنی! سبحان اللہ۔"

"اچھا یہ بات ہے تو پھر میری کتاب واقعی نہ چھپے گی۔ میری تو کل تنخواہ تین سو روپے ہے اور یہ رقم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو لاکر بیگم کی ہتھیلی پر رکھنی پڑتی ہے۔"

"دیکھیے شہید صاحب! یہ تو کتاب نہ چھپوانے کے بہانے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو کتاب ضرور چھپ سکتی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ جب تنخواہ ملے تو گھر جاکر بجائے تین سو کے دو سو دیجئے اور بیگم سے کہئے اب کے میری پچھلے رُخ ترقی ہوگئی ہے، اسی طرح پانچ مہینے تک بیوی کو بیوقوف بناکر اور اپنا مجموعہ چھپوا کر عقلمندی کا ثبوت دیجئے۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ہوگئی۔ شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ اگر میرا مجموعہ نہ چھپا تو اردو ادب یتیم ہو جائے گا۔ یہی سبب تھا کہ انھوں نے ایک لمبے سکوت کو ایک بہت ہی لمبی "ہوں" سے توڑا۔ اور شوکت صاحب نے دھیرے سے پھر پوچھ لیا:

"آپ ایک غزل میں کتنے شعر کہتے ہیں اور پھر اُن میں سے کتنے شعر انتخاب کرتے ہیں؟"

جی میں عموماً انیس شعر کہتا ہوں اور ان میں سے سات منتخب شعر کہتا ہوں۔

اس پر شوکت صاحب نے جھٹ کہا:

"جبھی! — میں بھی کہوں بات کیا ہے۔ اب میں کل سات شعر کہتا ہوں اور اُن میں سے انیس شعر رکھتا ہوں۔"

اس پر تمام بیٹھے ہوئے حضرات مارے ہنسی کے اُٹھ اُٹھ کر بھاگنے لگے۔ اور شہید صاحب اِن سے پوچھ رہے تھے:

"کیا مطلب؟"

جگر صاحب

ٹھیک ٹھیک دوپہر تھی، وہ بھی لکھنؤ کی۔ میں خُوب مزے سے سویا ہُوا تھا اس لیے کہ پنکھا اور پسینہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اہلِ لکھنؤ کی طرح نہ دھوپ میں لطافت تھی نہ نزاکت، نہ جانے اللہ میاں نے دھوپ کے سلسلے میں لکھنؤ والوں کے شاعرانہ مزاج کا خیال کیوں نہیں رکھا۔ دھوپ کے ساتھ تُو بھی سونے پر سہاگہ، حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ وہاں کے رہنے والوں کے مذاق کے مطابق ہلکی سی دُھوپ ہوتی، جسے اہلِ مذاق پیار میں "دھوپیہ" کہتے۔

لکھنؤ کی سرزمین ہی ایسی ہے کہ وہاں آپ کو قدم قدم پر شاعر ملیں گے۔ بعض دانشوروں کا خیال یہ ہے کہ وہاں سب سوتے اور جاگتے میں شعر ہی کہتے اور شعر ہی سنتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر مُجھ پر بھی یہ اثر ہوا کہ سوتے ہی سوتے شعر سُنے۔ اگر میں کہوں کہ میں نے سوتے سوتے صرف شعر ہی سُنے تو یہ کفرانِ نعمت ہوگا۔ میں نے شعر باترنم سُنے۔ اُن میں سے ایک شعر میں آپ کو بلا ترنم سناتا ہُوں:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

مَیں بیدار ہونے کے مُوڈ میں نہ تھا، لیکن اس شعر کے ساتھ جو ترنم تھا اُس نے کُچھ کُچھ آنکھیں کھول دیں۔ پھر دُوسرا شعر نیم بیداری کی حالت میں آدھا سُنا آدھا اُونگھ گیا۔ تیسرے شعر نے خاصا چونکایا۔ رفتہ رفتہ نیند غائب تھی اور میں بیدار۔ پہلے خیال آیا کہ شوکت تھانوی صاحب اپنے اشعار جگر صاحب کی لَے میں پڑھ رہے ہیں (اس لیے کہ ان دنوں میرا قیام شوکت صاحب کے ہاں تھا) لیکن اس بات کا فیصلہ جلد ہی کر لینا پڑا کہ اشعار جگر صاحب ہی کے ہیں، ورنہ یہ اشعار جگر صاحب کے علاوہ کون کہہ سکتا تھا، خاص انہی کے رنگ کے اشعار تھے۔

کیوں محوِ نشاطِ عیش و طرب تکلیفِ توجہ فرمائیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے آوازِ شکستِ جام نہیں

آتا ہے جو بزمِ جاناں میں پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

میں ذرا کھنکارا تو پاؤں میں لپٹی ہُوئی آواز آئی:

"کون ہے ؟"

ساتھ ہی زیرِ زبان شعر کو بھی پُورا نہ کیا :

"پینے کو تو سب پی (پیتے ہیں جگر —)"

تک ہی معاملہ رُک گیا کہ اتنے میں شوکت صاحب نے آواز دی :

"بھئی طفیل! جاگ رہے ہو۔ اِدھر آؤ تمھیں ایک چیز دکھائیں۔"

میں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں آیا تو چیز کی بجائے جگر صاحب کو دیکھا۔ اور اِس وقت کون ہے والی بات بھی سمجھ میں آئی۔ اس لیے کہ جگر صاحب کے ہاتھ میں جوتا تھا، اور شوکت صاحب بجائے سہمنے کے خوش تھے۔ اس وقت جگر صاحب بجائے شعروں کے فی البدیہہ نثر کہہ رہے تھے کہ "حیدر آباد دکن میں ان سے بہتر جُوتے نہ مل سکے۔ یہ دو جوڑے لایا ہوں۔ ان میں سے ایک اپنی پسند کا رکھ لیں۔ دُوسرا فلاں صاحب کو دینا ہے ان کی بھی فرمائش تھی، اور فلاں صاحب سے اِس جُوتے کا ذکر نہ کرنا ورنہ ان کی دل شکنی ہوگی۔ جُوتے خریدتے وقت اُن کا خیال ہی ذہن سے اتر گیا۔"

ادھر شوکت صاحب کو دونوں جُوتے جی جان سے پسند تھے۔ شاید یہی سبب تھا کہ وہ دونوں جُوتوں کی شان میں قصیدے پر قصیدے کہہ رہے تھے۔ چند لمحے پہلے جگر صاحب جو اشعار گنگنا رہے تھے اس کا مطلب کچھ ویسا ہی معلوم ہوا جیسے کسی فلم میں کوئی ہیرو یا ہیروئن کسی بات پر اچانک خوش ہو کر گانے لگے۔ جگر صاحب کے سلسلے میں ایسی تشبیہ دینا گھٹیا سی بات ہے۔ ورنہ میں اصرار کرتا کہ میری اِس تشبیہ پر سو فی صد نہ سہی، اسّی فیصد اعتبار کر لیجئے۔

میں آنکھیں ملتا ہوا باہر آ ہی چکا تھا، اس لیے شوکت صاحب نے جگر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا: "آپ انھیں جانتے ہیں؟"

"جی ہاں!"

شوکت صاحب کو میرا صرف جی ہاں کہنا پسند نہ آیا اس لیے اُنھوں نے بات بڑھائی :

"بھلا کون ہیں؟"

مجھے اِس وقت ایسا محسوس ہُوا کہ شوکت صاحب مجھ پر اور جگر صاحب پر بیک وقت کرم کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ پر اِس لیے کہ مجھ سے ایک بڑے شاعر کا تعارف کرایا جا رہا تھا اور جگر صاحب پر اِس لیے کہ میرے منہ سے ان کی شان میں چند ایک مدحیہ فقرے کہلوا کر اپنی جگہ خوش ہو جائیں۔

ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ بات ہو کہ ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی وسیع الظرف کیوں نہ ہو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر تسکین پاتا اور خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے جواباً گزارش کی کہ "انھیں تو سب جانتے ہیں لیکن یہ سب کو نہیں جانتے۔"

اس پر جگر صاحب کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ کھیل گئی اور شوکت صاحب سے میرے متعلق پُوچھا: "آپ کی تعریف؟"

میں نے سوچا کہ میرا تعارف کوئی دوسرا کیوں کرائے حالانکہ تعارف کسی دوسرے ہی نے کرایا تھا۔ پھر بھی اپنا بھرم یہ کہہ کر رکھ لینا چاہا کہ "میرا نام محمد طفیل ہے اور لاہور سے حاضر ہُوا ہُوں"۔

شوکت صاحب کسی بھی محفل میں بیٹھے ہوں اُن کا خاموش رہنا ناممکن ہے۔ اس لیے وُہ اپنی روایت غلط ہوتے نہ دیکھ سکے۔ یُوں بھی جگر صاحب نے براہِ راست سوال بھی انہی سے کیا تھا۔ اس لیے ان کا کچھ نہ کچھ کہنا برحق تھا "آپ لاہور سے آموں کے موسم میں تشریف لاتے ہیں، آم بھی کھاتے ہیں اور مجھ سے کتاب بھی لکھواتے ہیں"۔

جب شوکت صاحب کا "تعارفیہ" ختم ہُوا تو جگر صاحب پہلے ہلکے سے مُسکرائے، پھر کہا: "بڑی مسرت ہوئی۔" اور ساتھ ہی یہ بھی کہا:

"جو کوئی یہ کہتا ہے کہ میں "آمیہ" ہُوں تو طبیعت باغ باغ ہوجاتی ہے"۔

اس پر میں نے جھجکتے جھجکتے ایک ترمیم اس فقرے کے سلسلے میں پیش کر دی، اور عرض کیا: اگر اس فقرے کو یُوں کہا جائے تو کیسا ہے کہ "جو کوئی یہ کہتا ہے کہ میں آمیہ ہُوں تو طبیعت آم آم ہو جاتی ہے"۔

اس پر محفل میں پھلجھڑی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جگر صاحب تو بے اختیار ہنسے۔ دو مرتبہ خوب خوب بھی کہا۔ ہنسی پر ضبط کیا تو مجھ سے کہا:

"کل میری اصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں آموں کی دعوت ہے۔ مزے مزے کے آم ہوں گے، لہٰذا میرے ساتھ چلنا"۔

جگر صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے، اور وہ بالکل خاموش، ایسے جیسے اُنھوں نے ابھی تک بولنا نہیں سیکھا۔ میں نے اُن سے رسم و راہ پیدا کرنی چاہی اور عرض کیا:

"میرا تعارف تو ہوگیا، آپ کی تعریف؟"

اُنھوں نے بولتے ہُوئے جواب دیا:

"مجھے مجروح سلطان پوری کہتے ہیں"۔

میں نے اُن کا نام سُن رکھا تھا اس لیے مجھے ان کی سنجیدگی بڑی پیاری معلوم ہُوئی۔

ہم لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہو کر سنبھلے ہی تھے خیال تھا کہ اب ایک دوسرے کی خیر خیریت پُوچھیں گے، ایک دوسرے کو باتوں سے تولیں گے کہ کون کتنے پانی میں ہے یا کون کتنے وزن میں ہے کہ اتنے میں جگر صاحب نے پوچھا:

"اب کیا وقت ہوگا؟"

شوکت صاحب نے جواب دیا کہ "دو بجنے والے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "آپ کی گھڑی شریف میں کیا بجا ہے؟"

جگر صاحب کو ایک دم یاد آیا کہ گھڑی تو ان کے پاس بھی تھی اور ایسی گھڑی تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ دن بھی

بتاتی تھی۔ اس لیے انھیں ہم سب کی طرف دیکھ کر مسکرانا پڑا۔ ہم ان کی اس بھول پر پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہوئے تھے کہ اُنھوں نے میرے نزدیک ایک عجیب سی بات کہہ دی :

" اُفوہ ! نمازِ جمعہ تو رہی جاتی ہے۔ اچھا بھئی چلیے "

میں نے سُن رکھا تھا کہ جگر صاحب شراب پیتے ہیں ایسے جیسے پانی، اور انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا۔ اس وقت انھیں تن بدن کے علاوہ اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریزی بھی یاد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ایک اولوالعزم رند سے نمازِ جمعہ کی بات سُن کر بڑا تعجب ہُوا۔ لیکن انہوں نے مجھے زیادہ متعجب ہونے کا موقع نہ دیا، بلکہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی مجھ سے کہا :

" آئیے آپ بھی چل کر نماز پڑھیں "

چنانچہ تینوں نمازی کڑکتی دھوپ میں اللہ کا نام لے کر نکل پڑے۔ شوکت صاحب کو نماز سے زیادہ ایک اور ضروری کام تھا اس لیے وُہ معذور رہے۔ مجروح صاحب کی دو ایک باتوں سے یہ اندازہ ہُوا کہ وُہ نماز میں شرکت صرف جگر صاحب کی وجہ سے کریں گے۔ اُدھر دیر بھی ہوگئی تھی۔ اس لیے جب راستے میں نوری ریسٹورنٹ آیا، تو جگر صاحب بجائے مسجد میں جانے کے ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہو گئے۔

مجروح صاحب ہنسے اور کہا :

" جگر صاحب ! یہ مسجد نہیں ہے ریسٹورنٹ ہے "

جگر صاحب نے کہا :

" مجھے معلوم ہے، سوچا کہ وقت تنگ ہے اللہ کو تو خوش کر نہیں سکتا اُس کے بندوں ہی کو خوش کروں ۔ آئیے ! "

ان کے حکم کی تعمیل کی۔ جب چائے سامنے آئی تو جگر صاحب نے خود ہی بنانی شروع کر دی، اور ساتھ ہی کہنے لگے :

" جو دلی سکون اور راحت اللہ کی بارگاہ میں حاضری پر ہوتی وہ افسوس کہ میری کاہلی سے نصیب نہ ہُوئی۔ میں دو ماہ سے سفر میں تھا۔ اس عرصے میں کوئی نماز قضا نہ ہوئی۔ آج لکھنؤ پہنچ کر قضا ہوئی۔ نماز ہر انسان کو پڑھنی چاہیے، خواہ وہ مسلمان ہو یا نہ ہو اس لیے کہ اس سے انسان بڑا پاکیزہ نفس رہتا ہے۔ اگر انسان سے اس کی پاکیزگی اور طہارت چھین جائے تو وہ شیطان بن جاتا ہے —— بھئی ! چائے لوٹا، بن گئی ہے —— جس نے خدا سے لو لگائی اُس نے سب کچھ پالیا، میں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہُوا تو اُنھوں نے فرمایا کہ تزکیۂ نفس ہی سب سے بڑی عبادت ہے، وُہ بڑی برگزیدہ اور باعمل شخصیت ہیں۔ اُن میں جلالی اور جمالی دونوں کیفیات ساتھ ساتھ ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی بھی ان کے مریدوں میں سے ہیں (اُن دنوں مولانا اشرف علی

تھانوی زندہ تھے) حضرت قاضی سید عبدالغنی شاہ صاحب کا نام تو آپ نے سُنا ہوگا۔ بھٹی شکر کم ہے، لڑکے کو آواز دینا۔ حضرت عام پیروں فقیروں کی طرح نہیں ہیں۔ اُن کے مرید بڑی دُور دُور تک ہیں۔ اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر آدمی اپنے آپ کو کونین کا مالک سمجھنے لگتا ہے۔ بھٹی اچار کا مزا نہیں آیا، نہ جانے کیا بات ہے۔"

یہ تھا میرا جگر صاحب سے پہلا باقاعدہ تعارف!

سچ پُوچھیے تو صحیح تعارف میرا اُن سے بہت پہلے امرتسر کے ایک مشاعرے کے سلسلے میں ہوا تھا۔ وار فنڈ کے سلسلے میں امرتسر میں بڑے وسیع پیمانے پر ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا۔ پاکستان اُن دنوں معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا ورنہ میں انڈو پاک مشاعرہ کہتا۔

آج جب پاکستان بن چکا ہے تو امرتسر کتنی دُور ہو گیا ہے۔ لندن اور امریکہ پہنچنا نسبتہً آسان ہے لیکن اُس امرتسر پہنچنا اب آسان نہیں رہا۔ جہاں ہم مشاعرے سننے، کپڑا خریدنے، فالودہ اور لسی پینے جایا کرتے تھے۔ ڈپٹی کمشنر امرتسر مشاعرے کے منتظم تھے۔ ہندوستان کے قریب قریب تمام شعرأ وہاں موجود تھے سوائے سیماب اکبر آبادی کے، جب میں اپنے ایک دوست سمیت امرتسر پہنچا تو ہم اتفاق سے منتظم بنا دیئے گئے تمام شعراء کا ایک ہوٹل میں قیام تھا۔ شعرأ زیادہ تھے اور ہوٹل کے کمرے تھوڑے تھے۔ اس لیے طے یہ پایا کہ ایک کمرے میں جگر مراد آبادی اور جوش ملیح آبادی صاحب کو ٹھہرایا جائے اور باقی شعراسے درخواست کی جائے کہ وہ ہوٹل کے لان میں جو خیمے نصب کیے گئے ہیں ان میں قیام اور آرام فرمائیں۔

شدید سردیوں کا زمانہ تھا۔ شعرأ حضرات کے دانت سے دانت بج رہے تھے۔ اگر اس وقت ان سے یہ درخواست کی جاتی کہ مشاعرہ شروع ہے لہٰذا آپ اپنا اپنا کلام سُنائیں تو منتظمین کی شان میں وہ وہ ہجویات پڑھی جاتیں کہ سودا کی رُوح بھی تسکین پاتی۔

مجھے اس وقت دو ایک بزرگ قسم کے شعراء کا بڑا خیال آیا اور چاہتا تھا کہ انھیں کسی طرح سے ایک ہی کمرہ مل جائے۔ جب میں نے اس کا تذکرہ کچھ اور منتظمین سے کیا تو ڈانٹ پڑی،

"خبردار! ایسی حرکت نہ کرنا ورنہ مصیبت آجائے گی۔"

میں مصیبتوں سے پہلے ہی گھبراتا ہُوں۔ اس لیے چپکا ہو رہا کہ اتنے میں ساغر نظامی صاحب رات کی گاڑی سے تشریف لاتے، تانگے سے اُن کا سامان اُترتے ہی ایک دم شور برپا ہوگیا کہ" ادھر لے آؤ میرا سامان، میں ٹینٹ میں ہرگز نہ ٹھہروں گا۔"

کسی نے کہہ دیا کہ کُل ایک کمرہ خالی تھا۔ اُس میں جگر صاحب اور جوش صاحب کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر ایک بھی کمرہ خالی ہوتا تو آپ کو پیش کر دیا جاتا، مجبوری ہے۔

اس پر ساغر صاحب بگڑے اور کہنے لگے: "جب جگر اور جوش کو کمرے میں ٹھہرایا جا سکتا ہے تو

مجھے کیوں نہیں ٹھہرایا جاتا ؟" صاحب انھوں نے خوب خوب ہنگامہ کیا۔ شعرا اپنے اپنے خیموں سے نکل آئے۔ جگر صاحب کے کانوں میں بھنک پڑ گئی۔ کمرے سے اُٹھے۔ میدانِ کارزار تک آئے، اور ساغر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا : "آپ خفا نہ ہوں۔ میرا کمرہ حاضر ہے، تشریف لائیے !"

اس کے بعد جگر صاحب کمرے میں واپس آئے اور اپنا سامان اُٹھا کر خود ایک ٹینٹ میں چلے گئے۔ جب ہم لوگ ساغر صاحب سے اپنی مجبوریوں کا تذکرہ کر کے پلٹے تو دیکھا کہ جگر صاحب اپنے کمرے میں موجود نہیں۔ ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ کسی ایک خیمے میں چلے گئے ہیں۔ انھیں ڈھونڈھا گیا اور اُن سے درخواست کی کہ آپ کمرے میں واپس تشریف لے چلیں تو اُنھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اور یہ کہہ کر انکار کیا کہ :

"مجھے اپنی راحت سے زیادہ دُوسروں کی راحت سے خوشی ہوتی ہے !"

یہ بھی میری جگر صاحب سے پہلی ذہنی ملاقات ! اس وقت کسی نے کہا : "بڑے با اخلاق ہیں !" کسی نے کہا : "یہ شاعر تھوڑی ہیں، بادشاہ ہیں !"

قیامِ لکھنؤ میں میری جگر صاحب سے کئی ملاقاتیں ہُوئیں۔ بھوپال ہاؤس میں اُن کا قیام تھا۔ اُن دنوں وہ کوئی ہفتہ عشرہ لکھنؤ ٹھہرے ہوں گے۔ اگر ہفتہ عشرہ کا لفظ صرف دنوں سے مختص نہ ہوتا تو میں عرض کرتا کہ اُن دنوں میری اور جگر صاحب کی ملاقاتوں کی تعداد کوئی ہفتہ عشرہ ہو گی۔ طویل ملاقاتیں رہیں۔ گونڈہ تک ان کے ہمراہ بھی گیا، ان کا گھر دیکھا جو کبھی اصغر گونڈوی کا مکان تھا۔ انہوں نے میری بڑی خاطر مدارات کی۔ بعد میں سُنا جو کوئی ان کے گھر جا نکلے اس کی جگر صاحب ایک نیاز مند کی حیثیت سے اتنی عزت کرتے ہیں کہ جس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

ان دنوں جبکہ پاکستان میں گندم کی قلت ہے اگر پاسپورٹ سسٹم نہ ہوتا تو میں جگر صاحب کے ہاں چلا جاتا۔ جگر صاحب پر "کرم" بھی ہوتا اور میرا غذائی مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔ مزے مزے کی چیزیں کھانے کو ملتیں۔ مزے مزے کے شعر سنتا۔ واپسی پر جگر صاحب سے ایک بار پھر سُن لیتا کہ اُجاڑ بیابان میں رہتا ہوں۔ یہاں ٹھکانے کی کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی۔ اس لیے معاف کرنا آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔

انہی دنوں جگر صاحب سے پُوچھ ڈالا :

"قبلہ، سُنا تھا کہ آپ بلا کے پینے والے تھے اب کیسے مسلمان ہو گئے ؟"

"بس چھوڑ دی۔ جہاں تک میرے مسلمان ہونے کا تعلق ہے اس کا حال خدا جانے !"

میں نے تصدیق چاہی :

"بالکل ؟"

"جی ہاں ! قطعی، جب میں نے شراب سے توبہ کی تو رب العزت سے اپنے ارادے کی استقامت کی دُعا بھی مانگی۔ شراب ترک کرنے کے بعد سخت بیمار ہو گیا تھا، زندہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ڈاکٹر اور احباب یہ کہتے تھے کہ

اب انتقال ہُوا کہ اب، دل کے اُوپر ایک بڑا خطرناک قسم کا پھوڑا نکل آیا تھا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ ایک دم شراب چھوڑ دینے سے یہ بلا نازل ہوئی ہے اور ساتھ ہی یہ مشورہ دیا کہ اگر میں پھر شراب پینی شروع کر دوں تو وقت ٹل سکتا ہے وہ وقت میرے امتحان کا تھا۔ میں نے ڈاکٹروں سے صاف کہہ دیا کہ مسلمان کی قسمت میں جب موت ایک ہی بار رکھی ہے تو پروردگار سے شرمساری کیوں — یہ قدرت کا اعجاز تھا کہ مجھے آرام آگیا یا میرے ارادے کی پختگی پر قدرت کو ترس آگیا ہوگا۔"

ایک روایت ترکِ شراب کے سلسلے میں یہ بھی ہے کہ شراب ان کے اور ان کی بیوی کے درمیان حائل ہُوئی اور لاٹھی مارے پانی جُدا نہ ہو سکا۔ پھر اسی شراب کے ترک نے اپنی ہی بیوی سے پھر ان کی شادی کرادی۔

جس نے جگر صاحب کو رندی کے زمانے میں دیکھا بھالا ہے اُس کا کہنا ہے کہ دُھت پیئے ہوئے ہیں۔ تن بدن کا ہوش نہیں لیکن تکلّم کی نوبت جب بھی آئی تو اُنھوں نے مذہب، اخلاق اور شرافتِ نفس ہی کے تذکرے چھیڑے۔ آج جب دخترِ رز کو چھوڑے عرصہ گزر چکا ہے تو ان کی زبان پر وہی مذہب، وہی اخلاق اور وہی شرافتِ نفس کی باتیں ہیں۔ سُنا ہے کہ ہر رند پی کر باطن کی باتیں اُگلتا ہے تو سوچتا ہُوں کہ جگر صاحب کے زمانۂ رندی اور اس وقت کی باتوں میں کتنی مطابقت ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آج جگر صاحب نہ پیتے ہوئے بھی پیئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ باتیں وہی ہیں، کھوئے کھوئے بھی ہیں، آنکھوں میں نشہ بھی ہے۔ وجہ معلوم؟ — شب بیداریاں!

قیامِ پاکستان کے بعد مسلمانوں پر ہندوستان میں اور غیر مسلموں پر پاکستان میں جو کچھ گزری، وہ بربریت کی عجیب داستان ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی کتنا ذلیل ہے! اس کا حال کسی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کسی نے اپنی جان نچھاور کر کے ظالم کے چہرے پر اپنے خون کی سیاہی مل دی۔

مورخ جب اُس دور کی تاریخ لکھے گا تو پاک و ہند کا سر اور بلند ہو جائے گا۔

۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہندوستان میں ٹکنا آسان نہیں رہا۔ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان پاکستان آرہے تھے' اُن میں زیادہ تر نادار اور بے بس تھے جو سراسیمہ تھے۔ تہی دامن تھے، تہی عصمت تھے۔ انہی دنوں میں نے بھی جگر صاحب کو ایک خط لکھا کہ موجودہ حالات میں بہتر یہی ہے کہ آپ بھی پاکستان آجائیں۔ اُن کا جواب آیا،

عزیزِ گرامی قدر! سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ آپ کا خیال درست ہے کہ بظاہر مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ میں اگر پاکستان آنا چاہُوں تو میرے لیے بڑی آسانیاں بھی ہیں۔ لیکن جب میں بھی احباب کی طرح سوچتا ہُوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے، وُہ صرف اس لیے کہ اگر تمام صاحبِ رسوخ مسلمان پاکستان چلے گئے۔ تو اُن تمام بے سہارا مسلمانوں کا کیا ہوگا جو صرف خدا کی ذات پر بھروسا

کیے بیٹھے ہیں جن کے پاس نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا ہے نہ ایک وقت کی روٹی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جیوں گا تو ہندوستان میں اور مروں گا تو ہندوستان میں "

جگر صاحب کا جب یہ جواب آیا تو بڑی ڈھارس ہوئی ، اس لیے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا ایمان اور اخلاق تمام تزلزل میں تُل رہا تھا۔ کئی ایک لیڈر قسم کے مسلمان وہاں سے یوں بھاگ گئے جیسے اسی لمحے کا انتظار ہی تھا۔ انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اُن مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جن سے ہم نے 'پاکستان' کہا اور انھوں نے زندہ باد کے نعرے لگائے تھے۔ ایسے نازک وقت میں جگر صاحب کا یہ کہنا کہ :

"جیوں گا تو ہندوستان میں اور مروں گا تو ہندوستان میں"

اُس وقت کے کئی صاحب اثر مسلمانوں کے لیے ان کا یہ جواب بڑا شرم آموز تھا۔

پہلے مشاعرے نہ جانے کس مقصد کے تحت ہوتے تھے۔ اب زیادہ تر مشاعرے اس لیے ہوتے ہیں کہ جگر صاحب کا کلام سُنا جائے۔ میرے خیال میں اب مشاعرہ اور جگر مراد آبادی ایک ہی شاعر کے دو نام ہیں۔ یہ کوئی خوشی کی بات نہیں، اس لیے کہ سب کے سب سامعین اتنے خوش مذاق نہیں کہ وہ اچھے شعراء کے کلام کے مشتاق ہوں۔ زیادہ تر ایسے ہیں جو مشاعرے کو ایک تفریحی مشغلہ سمجھ کر شرکت کرتے ہیں۔ جگر صاحب کی بد قسمتی یہ ہے کہ انہیں پیٹ کی خاطر مشاعروں میں شرکت کرنی پڑتی ہے۔

اس وقت میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ میں جگر صاحب کے فن پر کچھ عرض کروں۔ پھر بھی یہ کہہ لینے دیجئے کہ جگر صاحب کے شعری کارنامے اُمٹ ہیں۔ جگر صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے شعری ادب کی تاریخ میں اپنا نام جلی حروف سے لکھ دیا ہے۔ اور یہ کسی کے مٹائے مٹنے والا نہیں۔

پنجاب نے اردو ادب کی بڑی خدمات سر انجام دی ہیں۔ اس پر اہل پنجاب کو فخر بھی ہونا چاہیے۔ اچھے ادیبوں اور شاعروں کی پنجاب نے ہمیشہ قدر کی اور انہیں ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہوئی کہ ایک بار پنجاب کا پریس جگر صاحب کے خلاف حرکت میں آ گیا، وہ پنجاب جو اپنی مہمان نوازی اور کشادہ دلی کے لیے مشہور رہا ہے ، اپنی روایات بھول گیا۔ ایک اخبار نے لکھا :

> "ایک زمانہ تھا کہ مراد آباد کے لوٹے بہت مشہور تھے تقسیم کے بعد لوٹے مفقود ہو گئے، لیکن اس کی جگہ شاعروں نے لے لی ہے۔ اب مراد آباد میں شاعر ڈھلتے ہیں اور کچّی پکی ڈھلائی کے بعد پاکستان بھیج دئے جاتے ہیں
>
> جگر مراد آبادی کوئی غیر معمولی نوعیت کا شاعر بھی نہیں ایک اوسط درجے کا سخن گو ہے جس کی شاعری وقت کے تقاضوں سے ہمیشہ معرا رہی ہے۔ اگر ہوشمندی کے ساتھ جگر صاحب کی غزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو بڑی آسانی سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اس کے کلام میں جابجا

فصاحت کا خون کیا گیا ہے (جگر کو) قدرت نے گلا اچھا عطا کیا ہے، جس کے باعث ہر قسم کی مہملات اور خرافات پر شعر کا گمان ہوتا ہے۔"

واہ دا تنقید ہو تو ایسی! میں خود پنجابی ہوں اور مجھے اپنے پنجابی ہونے پر فخر، لیکن جب میں نے اس انداز کی تنقید پڑھی، تو بحیثیت ایک پنجابی کے میری گردن مارے شرم کے جھک گئی۔

عین ممکن ہے کہ جگر صاحب نے یا ان کے کسی دوست نے اہل پنجاب کو کسی جائز شکایت کا موقع دے دیا ہو پھر بھی یہ باتیں ہمیں نہیں جچتیں۔ آپ کو معلوم ہے، ان ساری باتوں پر جگر صاحب نے لاہور سے جاتے ہوئے کیا کہا تھا؟" میں نے یہاں آکر ناحق اہل پنجاب کے دلوں کو ٹھیس پہنچائی۔ دوستو! اب میری اس خطا کو معاف کر دینا۔"

جگر صاحب کا خیال ہے کہ حقیقی شاعر کی تخلیقات اس کے اپنے جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اچھا انسان ہی اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ اگر کوئی بُرا انسان اچھے شعر کہہ بھی لے تو اس کے اشعار اثر سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ میں یہاں اس بحث میں نہ پڑوں گا کہ اچھے شعر کہنے کے لیے اچھا انسان بننے۔ ویسے اچھا انسان بننا کوئی بُری بات بھی نہیں۔ میں نے کئی اچھے آدمیوں کو دیکھا ہے کہ وہ اچھا شعر نہیں کہہ پاتے بر خلاف اس کے واہی قسم کے بُرے انسانوں کو اچھے شعر کہتے سُنا ہے۔ میں اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں، ورنہ میرے ہی کئی دوست مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔

ہاں تو جگر صاحب یہ کہتے ہیں کہ اچھا انسان ہی اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ یہ بات کسی اور کے لیے صحیح ہو یا نہ ہو، جگر صاحب کے سلسلے میں غلط نہیں کہ سچے شاعر کا ماحول سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جو دونوں طرف ہولناک حالات پیدا ہوئے ان سے جگر صاحب بُری طرح متاثر ہوئے میرا خیال ہے کہ ان حالات سے متاثر ہو کر جتنی اثر انگیز چیزیں انہوں نے کہی ہیں کسی اور شاعر نے نہیں کہیں۔ کسی نے دو ایک چیزیں کہیں اور خاموش۔ لیکن جگر صاحب نے اس المیے کے مسلسل نوحے کہے ہیں۔ طوالت کے ڈر سے ان کی غزلوں کے اس نوع کے اشعار نہیں پیش کرتا۔ اگر ان کی شخصیت کے ایک نمایاں رُخ کو یا سے واقعات واضح نہ کرتے ہوتے تو شاید میں اس بات ہی کو ٹال جاتا۔ ان حالات میں ڈوب کر جو کچھ انہوں نے کہا اُن میں سے

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

یہ غزل اسی ہولناک پس منظر کو واضح کرتی ہے۔ لیکن یہاں حالات سے مایوس نظر نہیں آتے۔ ان کا ایمان ہے کہ مایوسی کفر ہے سے

یہ لالہ و گل یہ صحن و روش، ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیرِ گلستاں ہوتے ہیں

اسی غزل میں ایک اور شعر ہے : ؎

یہ خُون ہے جو مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا، لیکن
کتنے وُہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

غرض اس دَور کی ہر غزل میں کئی اشعار آپ کو ایسے ملیں گے جن میں درد ہے، کسک ہے، ٹیس ہے۔ چُونکہ یہ میرا موضوع نہیں، اس لیے میں چھان پھٹک کی بجائے صرف اشارے کرتے ہوئے چلتا ہُوں۔ اہلِ ہند کو مخاطب کرتے ہُوئے اُنھوں نے ایک گیت بھی لکھا تھا جس پر وہاں بڑی لے دے ہُوئی۔ بعض اخبارات نے حکومت کو مشورہ دیا کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے، وُہ گیت تھا : ؎

بھاگ مسافر، میرے وطن سے، میرے چمن سے بھاگ
اُوپر، اُوپر، پھُول کھِلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ

غرض جو ان کے دل پر گزرتی ہے، رقم کر دیتے ہیں۔ نتائج کی پروا نہ انھیں ہُوئی ہے اور نہ ہوگی۔ انگریزوں کے زمانے میں جب بنگال میں قحط پڑا تو انھوں نے اُن دنوں بھی ایک آتشیں غزل کہہ ڈالی ؎

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہُوں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہُوں

اس پر بھی بڑی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں کہ انھیں گرفتار کر لیا جائے۔ حیرت ہے کہ ایک غزل گو شاعر جسے حسن و عشق کے معاملات سلجھانے اور اُلجھانے ہی سے فرصت نہیں ہوتی۔ وُہ بھی حالات سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ رومانی وادیوں سے نکلتا ہے اور حاکمانِ وقت کے منہ پر طمانچے دے مارتا ہے۔

جگر صاحب کی سوچ اور اس کے اظہار اور عمل میں تضاد نہیں، کھوج لگانے سے کوئی نہ کوئی کمزوری ان میں مل ہی جائے گی۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ ہم اچھے بھلے انسان کو فرشتہ کہہ کر اس کی تذلیل کریں۔ لیکن کھوج لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر کھوج لگانا ہی ہے تو مقابلۃً کھوج لگائیے، اور پھر دیکھیے کہ جگر صاحب کتنے اونچے مقام پر ہیں۔ آج سوچتا ہُوں کہ ۱۹۴۷ء میں جگر صاحب نے جو خط مجھے لکھا تھا اس میں اور ان کے اِس دور کے کلام میں کتنی مطابقت ہے۔

جگر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی عورت اچھے شعر نہیں کہہ سکتی۔ وہ اسے غیر قدرتی بات سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت کی تخلیق اس کی مقتضی ہے کہ اس پر شعر کہے جائیں۔ اس کے حسُن و جمال کو سراہا جائے۔ اس کی نزاکت اور اس کی تمام نسائی خصوصیات کے ساتھ ساتھ قدرت کی اعجاز کاریوں کی داد دی جائے۔ لیکن عورت خود شعر کہنے چل نکلی ہے، تعجب!

وُہ جب حسُن و محبت کی باتیں کرتی ہے تو بڑی عجیب لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جھوٹ بول رہی ہو۔ عورت شعر کے معاملے میں جھُوٹ بولے نہ بولے اتنا تو شدید احساس ہوتا ہے کہ اس نے کسی شاعر کا حق مارا ہے جب

کوئی عورت اپنے شعروں میں اپنے محبوب کا تذکرہ کرتی ہے تو میں سمجھتا ہُوں کہ اس نے اپنے آپ کو گالی دی ہے وہ جب محبوب کی بے وفائیوں کے تذکرے کرتی ہے تو معاً یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ محبوبیت کی شکل میں آکر جتنے فریب ایک عورت نے دئیے ہیں وُہ مردوں نے ان بے چاریوں کو کہاں دئیے ہوں گے پھر وُہ اپنے اشعار میں رقیبوں کا بھی ذکر فرماتی ہیں۔ نہ جانے ان کے رقیب مرد ہیں یا عورتیں۔ کئی ایک اور وجوہ بھی ہیں جن کی بنا پر یہ کہتا ہُوں کہ عورت شعر کہلوائے، کہے نہیں۔ تماشا بنائے، بنے نہیں۔

جگر صاحب بڑے خوش مذاق ہیں، ہر وقت بقراط بنے نہیں بیٹھے رہتے۔ دوستوں کو دیکھ کر کِھل اور کُھل جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی نہ کوئی فقرہ چپکا دیں گے، پھر کھلکھلا کر ہنسیں گے۔ پھر ذرا سی ہنسی کو روکیں گے اور "اوں" کہہ کر پھر ہنسیں گے اور خُوب ہنسیں گے۔ ایک محفل میں جگر صاحب شعر سُنا رہے تھے اور ایک صاحب بے نیاز سے بیٹھے تھے، ایک شعر پر اُنھوں نے ایکا ایکی اور بے ساختہ داد دے ڈالی۔ جگر صاحب ان کی طرف متوجّہ ہُوئے اور کہا:

"آپ کے پاس قلم ہے؟"

"کیا کیجیے گا؟"

"میرے اس شعر میں ضرور کوئی خرابی ہے ورنہ آپ داد نہ دیتے۔ اس لیے اسے اپنے دیوان سے خارج کرنا چاہتا ہُوں۔"

اسی طرح ایک اور صاحب نے ان سے کہا کہ "جگر صاحب ایک محفل میں، میں آپ کے ایک شعر پر پٹتے پٹتے بچا ہُوں۔"

اس پر جگر صاحب نے کہا:

"میرا وہ شعر تأثر کے اعتبار سے قطعی عاری ہوگا ورنہ آپ ضرور پٹتے۔"

اگر جگر صاحب یہ کہہ دیں کہ مجھے آپ کا مطلق اعتبار نہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انھیں واقعی آپ پر مطلق اعتبار نہیں۔ اگر وہ یہ فرماتے ہیں کہ آپ نے انھیں دھوکا دیا ہے۔ پھر بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے واقعی ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ بعض اوقات وہ اتنی سخت بات اپنے کسی قریبی دوست سے کہہ دیں گے کہ وہ بے چارا ہکّا بکّا رہ جائے گا۔ نتیجۃً وُہ صاحب ملنا جلنا ترک کر دیں گے تو انہیں سوچ دامن گیر ہوگی۔ حاضرین سے کہتے رہیں گے کہ دیکھئے فلاں صاحب نے اب ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔ ایک تو ستائیں اُوپر سے اکڑیں۔ میں نے دو ایک کھری کھری باتیں کہہ دی تھیں، غصہ آیا ہوگا۔ اِدھر یہ باتیں کہتے رہیں گے، اُدھر دل میں افسوس کرتے رہیں گے کہ جو کچھ ہونا تھا وُہ تو ہُوا۔ یہ تو نہ ہوتا کہ وہ صاحب ملنا جلنا چھوڑ دیتے۔ احباب سے کہیں گے فلاں صاحب سے ملاقات ہو تو ان سے کہنا کہ جگر صاحب یاد کرتے تھے۔

اگر وُہ صاحب یاد پر بھی نہ آئیں تو جگر صاحب بے چین رہیں گے پھر خود ان کے پاس پہنچ جائیں گے اور کہیں گے :

"آپ سے تو کئی دن سے ملاقات ہی نہیں ہُوئی۔"

ظاہر ہے کہ وُہ صاحب یہ تو نہیں کہیں گے کہ اب بھی میرے ملنے کی ضرورت باقی تھی۔ اس ساری کہانی میں جگر صاحب کا کم اور ان کے دوستوں کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ ان کا کوئی فیصلہ اپنا فیصلہ نہیں ہوتا۔ آپ جگر صاحب کے لاکھ دوست سہی لیکن آپ کے متعلق ان کی رائے کسی وقت بھی تبدیل کرائی جا سکتی ہے۔

یُوں بھی اس دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کو قدم قدم پہ فریب دیتا ہے لیکن جگر صاحب کے "دوستوں" نے اپنی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خود انہیں جگہ جگہ فریب دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب ان کے لیے دوست اور دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ان کے "دوست انہیں عجیب وغریب مشورہ دیں گے :

"جگر صاحب! اس بات کی ہامی نہ بھر لیجئے گا، وہ صاحب تعلقات کی بنا پر آپ کی ذات سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ آپ کو رُسوا کرانا چاہتے ہیں۔ پھر وُہ صاحب بڑے بدنام قسم کے ہیں (خواہ اس بیچارے کی خصوصیت صرف اس کی نیک نامی ہی کیوں نہ ہو) فلاں صاحب بھی اُن کے متعلق یہی باتیں کر رہے تھے کہ انہوں نے فلاں صاحب کو دھوکا دیا۔"

ایک آدھ بات خود اپنی طرف سے فی البدیہہ گھڑ دیں گے کہ میرے ساتھ یہ کیا۔

اُدھر جگر صاحب فرمائیں گے :

"ہاں صاحب وُہ شخص تو اپنی صورت سے بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔"

آپ خود ہی بتائیں اس میں جگر صاحب کا کتنا اور جگر صاحب کے دوستوں کا کتنا قصور ہے!

جگر صاحب روز بروز فلسفی اور "ولی اللہ" بنتے جا رہے ہیں۔ ہر بات کو فلسفیانہ رنگ میں سوچیں گے، مذہبی رنگ میں اس پر تبصرہ کریں گے۔ یہ فتویٰ علمائ سے لیجئے کہ مذہب اور فلسفے کا کہاں تک نباہ ہو سکتا ہے۔ مجھے تو گزارش یہ کرنا ہے کہ جگر صاحب اپنی باتوں میں بعض اوقات ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ دُوسرے کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ اگر دُوسرے کے پلّے کچھ پڑ گیا تو مزا آ گیا۔ ان کی باتیں غزل کے شعر ہوتی ہیں۔ جس طرح غزل کے شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح جگر صاحب کی باتوں کا مسئلہ ہے۔ ہر فقرہ (اگر سمجھا جا سکے) اپنی جگہ مکمل۔ لیکن ایک فقرے کا تعلق دوسرے فقرے سے ذرا کم ہوتا ہے۔ جگر صاحب غزل مسلسل کے ذرا کم قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی باتوں میں غزلِ مسلسل والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر کسی نوجوان نے جگر صاحب کی بات پہ اعتراض کر دیا تو وہ پیار کے ساتھ جوش میں آ جائیں گے اور کہیں گے "یہ نازک سا مسئلہ

آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ آپ تو نئی تعلیم کے کرم خوردہ ہیں۔"

گفتگو میں اضافتوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں جس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کسی پڑھے لکھے انسان سے ہو رہی ہیں۔ لیکن اُن میں روانی مفقود ہوتی ہے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں کہیں کے کہیں نکل جائیں گے اور سامع بیچارہ وہیں کا وہیں بیٹھا رہ جائے گا۔ کوشش کریں گے کہ اسے دنیا کی بھی سیر کرا دیں اور اُس دنیا کی بھی۔ ان کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں:

"اگر میں آپ کے کہنے کے مطابق یہ مان لُوں اور مجھے اس کا بھی یقینِ کامل ہو جائے کہ فلاں صاحب اچھے شعر کہتے ہیں۔ پھر بھی یہ کہوں گا کہ بس اُن میں وہی ایک چیز نہیں، اور وُہ چیز پیدا تو ہوتی نہیں، وہ تو اِنسانِ کامل اور مردِ خود آگاہ میں خود بخود ہوتی ہے۔ میری مراد خلوصِ باصفا سے ہے۔ وہ شعر بڑے بداعمال ہوتے ہیں جو ایسے ایسے ذہنی نابالغوں پر وارد ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے لیے وہ شعر مصیبت بن جاتے ہیں۔ جس شخص میں خلوص نہیں وُہ پُرخلوص شعر نہیں کہہ سکتا۔ پُرخلوص شعر کہنے کے لیے فکر و نظر کی وسعت، بلند کرداری، مشاہدات و تجربات کی ضرورت ہے۔ اس کا فقدان عام ہے۔ جہل اور علم میں لوگ تمیز نہیں کر پاتے۔ پھر شعری دیانت کہاں ہے۔ اگر آپ اس چیز کو ویسے ہی کہتے چلے جائیں گے تو آپ کو سینکڑوں سجدے بیکار نظر آئیں گے۔ ایک گنہ گار کی آنکھوں میں انفعال کی جو چمک ایک بار پیدا ہو جاتی ہے اس کے مقابلے میں سجدوں کی کیا حقیقت ہے۔ میں اپنی رندی اور اپنی توبہ، دونوں زمانوں کے ذکر سے گھبراتا ہُوں، مجھے ذہنی اور روحانی اذیت اور کرب سا محسوس ہوتا ہے، اور یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے! جی ہاں، جی ہاں وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اور صاحب! یہ بہروپیہ پن تو میری سمجھ میں آ نہیں سکتا کہ انسان کی زندگی کچھ ہو اور شعر کے اسٹیج پر ایکٹر کی حیثیت سے آئے۔ صاحب! یہ سب ایکٹر ہیں۔ یہ میناکاری کرتے ہیں۔ یہ شاعری سے زیادہ کاریگری ہے۔ ایسوں کو شعر کا صحیح عرفان ہو ہی نہیں سکتا۔ صاحب مذہب کیا ہے؟ ذاتی وجدان، اگر وجدان بھی ہم نے مغرب سے مستعار لے لیا تو ہم کیا ہیں! ہماری روایات کیا ہیں، لاحول ولا قوۃ۔"

پہلے جگر صاحب بے انتہا شراب پیتے تھے، وُہ چھوڑی۔ پھر بے انتہا سگرٹ پینے لگے، وہ چھوڑے۔ آج کل بے انتہا تاش کھیلتے ہیں، وُہ بھی چھوڑ دیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ چھوڑ بھی دی ہو اس لیے کہ یہ ارادے کے بڑے پکے ہیں۔ اس سلسلے میں ان پہ بڑا رشک آتا ہے کہ ارادوں میں پختگی ہو تو ایسی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات آپ کو سناتا ہُوں بشرطیکہ آپ جگر صاحب سے نہ کہیں، ورنہ وہ کہیں گے: دیکھو بھئی طفیل! یہ بات اچھی نہیں۔"

اپنے ایک "تاشیے" دوست سے جگر صاحب ایک بار کہہ رہے تھے،

"بھئی! تاش سے میں نے توبہ کر لی ہے۔ نہیں نہیں اب نہ کھیلوں گا کہہ جو دیا اب نہ کھیلوں گا۔ کل فلاں صاحب آئے تھے اور میں تاش میں اتنا منہمک رہا کہ اُن سے کوئی بات ٹھیک سے نہ کر سکا۔ نمازیں قضا ہُوئیں وہ الگ۔

بھلا یہ بھی کوئی معقولیت ہے کہ انسان صبح کا بیٹھا شام کرے اور شام کا بیٹھا صبح کرے۔"
وہ صاحب پوچھیں گے :
"آخر بات کیا ہوئی ؟"
جگر صاحب جواب میں فرمائیں گے :
"کل رات خواب میں دیکھا کہ تاش کھیل رہا ہوں، فوراً بیدار ہوا اور لاحول پڑھی۔ پھر جو سویا تو وہی تاش کے باون پتے، خواب میں پھر لاحول پڑھی اور سوچتا رہا کہ اگر اسی حالت میں میرا انتقال ہو جاتا تو خدا کو کیا منہ دکھاتا!"
ان کے دوستوں کو علم ہے کہ جگر صاحب کو باتوں سے رام نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ وہ ایک چال یہ چل دیں گے کہ سامنے بیٹھ کر تاش کھیلنا شروع کر دیں گے اور کہیں گے کہ بھئی! جگر صاحب نے چھوڑ دی۔ اب جگر صاحب بے چین کمرے کے چکر پہ چکر لگا رہے ہیں، پہلے آہستہ آہستہ پھر تیز تیز قدم اُٹھائیں گے۔ اپنے لمبے بالوں کو ٹوپی کے نیچے کریں گے۔ اگر سر پہ ٹوپی نہ ہوگی تو بالوں کو اور پریشان کریں گے۔ پھر ایک آدھ بار آکر چال دیکھ جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد کھیلنے والے کے ہاتھ سے پتے لے کر چال چل دیں گے۔ پھر خود جم جائیں گے۔ اُدھر دوست اپنی کامیابی پر مسکرائیں گے۔ اِدھر کہیں گے کہ میں بالکل نہ کھیلوں گا۔ یہ چال بگاڑ رہے تھے، اس لیے میں نے ان کے پتے پھینکے ہیں۔ اس طرح رات کے بیٹھے صبح کر دیں گے اور بگڑی چال بناتے رہیں گے۔ یہ اپنے پارٹنروں کے پتے بھی دیکھتے جائیں گے اور جب ان کے پارٹنر بھی ان کی تقلید کریں گے تو فرمائیں گے :
"یہ کیا واہیات حرکت ہے ؟"
کھیلتے میں اگر ان کا کوئی دوست آ گیا اور اُس نے سلام کیا تو آپ کی نظر پتوں پر ہوگی اور وعلیکم السلام کو بہت لمبا کر کے جواب دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد آنے والے کی صورت دیکھیں گے پھر پوچھیں گے :
"مزاج تو اچھے ہیں آپ کے ؟"
پھر کھیل شروع، آدھ پون گھنٹے کے بعد ان صاحب کی موجودگی یاد آئے گی تو پھر پوچھ لیں گے :
"مزاج تو اچھے ہیں آپ کے ؟"
مجھے معلوم نہیں کہ جگر صاحب قوالی کے شوقین ہیں یا نہیں اس لیے کہ اس کا کوئی تذکرہ میرے سامنے کبھی نہیں آیا۔ البتہ اس ضمن میں ایک قصہ ایسا ہے وہ اگر عرض کر دوں تو شاید ان کے اس ذوق کے سلسلے میں کوئی بات پلے پڑے۔
پیر الٰہی بخش کالونی (کراچی) میں جگر صاحب کے ایک دوست (محمود علی خاں جامعی) نے ان کی دعوت کی۔ میری بھی ان کی وجہ سے اُن سے سلام و عاشقی اس لیے میں بھی مدعو تھا۔ رات کے گیارہ بجے جب دعوت سے فارغ ہو کر پلٹے تو راستے میں ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ جگر صاحب نے فرمایا :
"بھئی! قوالی۔"

"جی ہاں قوالی !"

"چلو آؤ ، ذراسی قوالی ہو جائے ۔"

میں اس فقرے پر حیران رہ گیا ، اس لیے کہ نہ میں قوال تھا اور نہ ہی کسی قوال کا دوست ۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اُن سے پُوچھنا پڑا :

"کیا فرمایا آپ نے ؟"

"بھئی ! فرمایہ رہا ہُوں کہ ذرا قوالی سُن آئیں ۔"

اس فقرے پر ذرا جان میں جان آئی ، اور یہ کہہ کر اُن کے ساتھ ہو لیا کہ :

"دیر ہو رہی ہے نیند بھی آرہی ہے اور پھر جہاں ہم جا رہے ہیں وُہ لوگ نہ جانے کون ہیں ، کیسے ہیں ؟"

اس پر انہوں نے کہا :

"اگر انہوں نے پہچان لیا تو پھر گھبرانے کی بات نہیں ۔ نہ پہچانا تو ذرا دیر قوالی سُن کر چلے آئیں گے ۔"

ہم پہنچے تو بزم کی بزم استقبال کے لیے اُٹھی ۔ ظاہر ہے کہ استقبال جگر صاحب کا ہوا ۔ لیکن میں خوش ہو گیا ، اس لیے کہ لوگ مجھ سے بھی بڑے احترام کے ساتھ جُھک جُھک کر مصافحہ کر رہے تھے اور پُوچھتے تھے :

"مزاج اچھے ہیں ؟"

قوالوں نے پہلے تو دو تین نعتیں پڑھیں ۔ پھر جگر صاحب کی غزلوں پر غزلیں ، اِدھر جگر صاحب بھی روپے پر روپے دے رہے تھے ۔ قوال بھی خوش ، جگر صاحب بھی خوش ، البتہ میں ذرا سا افسردہ تھا اس لیے کہ شرما شرمی میں مجھے بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑ رہا تھا ، اور قوال میری غزلیں نہیں گا رہے تھے ۔

جگر صاحب جہاں اور جس شہر میں جائیں گے واپسی پر وہاں سے اپنی بیگم کے لیے عمدہ عمدہ سے ڈھیروں کپڑے خریدیں گے ۔ اُنھوں نے میرے سامنے اپنی بیگم کے لیے اتنا کپڑا خریدا ہے کہ کئی بار مجھے یہ خیال ہُوا کہ کہیں جگر صاحب کی گونڈہ میں کپڑے کی دکان تو نہیں ۔ لیکن میں گونڈہ پہنچ کر اس کی تصدیق کر چکا ہوں کہ ان کی گونڈہ میں کپڑے کی کوئی دکان نہیں ۔ اور وہ جتنا کپڑا خریدتے ہیں بیگم ہی کے لیے خریدتے ہیں ۔

ایک بار میں نے اُن سے کہا کہ :

"آپ اتنے زیادہ اور اتنے قیمتی کپڑے کیوں خریدتے ہیں ؟"

کہنے لگے ،

"زمانۂ رندی میں مجھ سے بیگم صاحب کے سلسلے میں کچھ زیادتیاں سرزد ہو گئی تھیں ، اس کی تلافی چاہتا ہُوں ۔"

انھیں اس بات کا بڑا صدمہ ہے کہ لوگ ان کی دعوتیں کرتے ہیں اور پھر قیمت وصول کرنے کے لیے ان سے شعروں کی فرمائش کرتے ہیں ۔

اس سلسلے میں جگر صاحب کا ایک فقرہ خوب ہے :

"میں کھانے کو تھوڑی کھاؤں گا بلکہ کھانا مجھے کھائے گا۔"

جگر صاحب سے اگر ان کے کسی ملنے والے نے زیادتی کر دی تو وہ یہ کہتے ہیں کہ "فلاں صاحب بک گئے ، ان کی قیمت اتنے روپے ہے ، سودا سستا رہا۔"

اگر ان کی کوئی چیز چوری ہو جائے تو یہ کہتے ہیں کہ :

" اگر چور صاحب مجھ سے پُوچھ لیتے کہ جگر صاحب ! مجھے آپ کی فلاں چیز کی ضرورت ہے تو میں چور صاحب سے کہتا کہ لے جاؤ۔"

ایک بار ان کی بیاض گُم ہو گئی بڑے پریشان ہُوئے۔ ہر آنے جانے والے سے کہتے رہے کہ "اگر میری بیاض چُرانے والا مجھ سے کہتا کہ میں آپ کی بیاض چوری کرنا چاہتا ہوں ، تو میں اس سے کہتا کہ چوری کر لو مگر میں نے جو دو ایک نئی غزلیں کہی ہیں ، وُہ مجھے نقل کر کے دیتے جاؤ۔"

جگر صاحب اوّل تو بہت کم لوگوں کو خط لکھتے ہیں۔ جنھیں لکھتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے خط کا مضمون قریب قریب یکساں ہوتا ہے۔ وہی خلوص ، وہی محبت ، وہی یگانگی ۔ ہر ایک سے ایک سطح پر ملیں گے خواہ کوئی گورنر جنرل ہو ، خواہ معمولی کلرک۔ یہ بات ہر ایک میں کہاں !

مشرقیت ان کی رگ و پے میں موجزن ہے۔ کسی کے ہاں ملنے جائیں گے تو اس کے بچّوں کے لیے مٹھائی پھل یا کھلونے لے جائیں گے۔

طبیعت میں جاؤ نہیں ، ذرا سی خلافِ طبیعت بات ہُوئی تو سمجھیے آئی شامت ۔ احباب سے ملنے میں پہل کرتے ہیں۔

جگر صاحب گھر کی بجائے سفر میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اتنا سفر کیا ہو گا کہ اگر وہ تمام اعداد و شمار جمع کر لیے جائیں تو مجموعی حیثیت سے اُنہوں نے متعدد بار تمام دنیا کا سفر کر لیا ہو گا۔

جگر صاحب ہر بات میں نفاست پسند ہیں۔ نفاست ان کی زندگی ہے یا یہ نفاست کی زندگی ہیں۔ بظاہر ان کی نفاست پر کوئی زندگی نہیں برستی ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے پہلی بار انھیں کسی مشاعرے میں پڑھتے سُنا تو اُس نے بآوازِ بلند کہا کہ جتنے یہ بدصورت ہیں ، پڑھتے ہوئے اتنے ہی خوب صورت معلوم ہوتے ہیں البتہ جن کی نظریں ان کے چہرے سے ہٹ کر اُن کے دل کو بھی ٹٹول آتی ہیں۔ وُہ چہرے کے بھدّے سے سیاہ رنگ کو بھُول جاتے ہیں۔

یہ ملنے والوں کا ہر دم خیال رکھتے ہیں۔ لاہور ہی کا ایک قصّہ ہے کہ ایک دن جگر صاحب بڑے ہی پریشان تشریف لائے آتے ہی کہنے لگے ،

"رات بھر نیند نہیں آئی۔ قصّہ یہ ہے کہ فلاں صاحب میرے پاس آیا کرتے تھے ، وہ گرفتار ہو گئے ہیں۔ اس کی

والدہ بچاری میرے پاس روتی پیٹتی آئی تھی۔ وہ لوگ بڑے ہی بے سہارا اور بڑے بے یار و مددگار ہیں۔ میں صبح سے اب تک ڈپٹی کمشنر اور فلاں فلاں افسروں کو ٹیلیفون کرا چکا ہوں اور اُن سب سے کہہ چکا ہوں کہ اول تو وہ صاحب بڑے نیک سیرت ہیں۔ اگر وُہ صاحب آپ کے خیال میں مجرم ہیں، پھر بھی چھوڑ دیں اس لیے کہ کسی غریب کو روتے دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ کائنات ہل رہی ہے اور ہم ابھی بھسم ہونے کہ ابھی —— نہ جانے وہ اب تک رہا ہو کر آیا ہے کہ نہیں چلو اس کے گھر چلیں۔"

میں نے کہا کہ "میں نے تو ان کا گھر نہیں دیکھا۔ آپ کو معلوم ہے ؟"

کہنے لگے :

"معلوم تو مجھے بھی نہیں، کل ان کی والدہ نے کچھ اتا پتا بتایا تھا، ڈھونڈھ لیں گے، مل ہی جائے گا۔"

چنانچہ صاحب اُس محلّے میں پہنچ کر کبھی میں نے اور کبھی جگر صاحب نے ان صاحب کا پتا پُوچھا، بہ ہزار دقت اُن کا مکان ملا۔ باہر ہی سے معلوم ہو گیا کہ وُہ صاحب گھر آ چکے ہیں، یہ سنتے ہی جگر صاحب نے الحمد للہ کہا اور واپسی کے لیے پلٹے۔ میں نے کہا :

"ان کے گھر والوں کو تو اپنی آمد کی اطلاع دے دیں۔"

کہنے لگے :

"کسی کی مدد کرنے کے بعد اُسے شرمسار نہیں کرنا چاہئے۔"

جگر صاحب بڑی بھُول بھلیاں ہیں، انہیں کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ آپ کا اُن کا ہفتوں ساتھ ہو جائے اور اتفاق سے درمیان میں وہ چار برس ملاقات نہ ہو، تو وہ آپ کو قریب قریب بھُول جائیں گے۔ دوبارہ ملاقات پر جب آپ ان سے کہیں کہ :

"جگر صاحب ! مجھے پہچانا ؟"

تو وُہ کہیں گے :

"بھئی ! کچھ آنکھیں مانوس ہیں اس وقت یاد نہیں آ رہا کہ کہاں ملاقات ہُوئی تھی !"

اب اُنھوں نے یادداشت کا یہ طریقہ نکالا ہے کہ ایک ڈائری پر لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن بُرا ہو یادداشت کا کہ اب انھیں یہ پتا نہیں کہ ڈائری کہاں رکھی تھی۔ حفظِ ماتقدم کے لیے وُہ عرصے سے اپنے ساتھ ایک مددگار رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ سب کچھ بھُول جاتے ہیں ان کے یُوں کھوئے کھوئے سے رہنے سے کئی لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ اپنی سیکڑوں چیزیں گُم کرتے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے لکھنؤ میں یہ بات سُنی کہ کل جگر صاحب کا بٹوہ گم ہو گیا ہے اور اس میں ہزار بارہ سو روپے تھے۔ چنانچہ بھوپال ہاؤس اس حادثے کے افسوس کے لیے پہنچا اور پُوچھا :

"آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ بٹوہ کیسے اور کہاں گم ہوا؟"

کہنے لگے: "مجھے سب معلوم ہے کل ایک صاحب سے چلتے چلتے ملاقات ہُوئی تھی اُنہوں نے بڑی نیاز مندی کا اظہار کیا۔ میں نے سوچا کوئی ملنے والا ہوگا۔ بازار سے کچھ سودا سلف خریدا، پھر تانگے میں بیٹھے اور یہاں آ گئے۔ راستے میں اُن صاحب نے میری جیب میں سے کچھ نکالا۔ میں نے سوچا مجھے بدگمانی ہُوئی ہے۔ یہ بات نہیں ہو سکتی۔ جب جیب کو ٹٹولا تو بٹوہ غائب تھا۔ میں نے اپنا بٹوہ ان کے پاس اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا لیکن میں نے اُن سے کچھ کہا نہیں۔"

میں نے پُوچھا: "کیوں؟"

کہنے لگے: "اگر میں اُس سے یہ کہتا کہ میرا بٹوہ آپ نے چُرا لیا ہے تو اس وقت جو اُسے پشیمانی ہوتی، وُہ مجھ سے نہ دیکھی جاتی۔"

داستان خواہ مخواہ طویل ہو گئی ورنہ بات تو دو سطروں میں ہو سکتی تھی وُہ یُوں کہ جگر صاحب کی شخصیت نے مجھے بہ حیثیت انسان کے اتنا متاثر کیا ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد انگلیوں پہ گنی جا سکتی ہے۔ یہ میری بھی بدقسمتی ہے اور ماحول کی بھی۔

مدیرِ نقوش

میرے بارے میں کسی نہ کسی طرح دو رائیں بنتی چلی گئیں ۔ کچھ لوگ مجھ سے ارادت رکھتے ہیں اور یہ ان کے دل کی فیاضی ہے ۔ بعض لوگ مجھے دشنام سے یاد کرتے ہیں اور یہ ان کے دل کی ناراضی ہے ۔ میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں ۔ اس کا فیصلہ آج نہیں کل ہوگا ۔ میں نے اپنی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے ۔ یہ اوراق انہیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے کہ میں کتنا بُرا اور کتنا اچھا ہوں !

(ابوالکلام)

آج میں آپ کی اُن حضرات سے ملاقات کراتا ہوں جو اس سے پہلے اپنے کئی دوستوں کی پگڑیاں اچھال چکے ہیں اور دعوٰی یہ کرتے رہے ہیں کہ میں تو صاف گو قسم کا انسان ہوں ۔ ارادہ ہے آج انھیں بھی صاف گوئی کی کسوٹی پر رگڑ دیا جائے۔

صُورت دیکھیے تو مسکین، بھولے بھالے، تجربۃً اس کے برعکس۔ میں انھیں ۱۵ اگست ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ مگر یہ حضرت اب تک چکمہ دیے جا رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا !

مجھے یہ دعوٰی ہے کہ میں ان کا بچپن کا دوست ہوں ، اُس وقت کا دوست، جب یہ بجائے چلنے کے رینگا کرتے تھے اور امّی اوچی کہہ کر روٹی مانگا کرتے تھے ۔

بعض ناسمجھوں کا خیال ہے کہ جنابِ طفیل ایسے شریف آدمی اگر پیدا ہونے بند نہیں ہوئے تو کیاب ضرور ہو گئے ہیں بلکہ یہاں تک کہ اب تو ایسا برانڈ آتا ہی نہیں ۔ یہ بھی اگر ان سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تو نقصان کا بھی کوئی خطرہ نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض بے تکلف دوست انھیں بے ضرر اور غیر مفید کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

یہ جُوں جوں بڑھتے گئے والد کی مسلسل اور جان لیوا بیماری کی وجہ سے غریبی جوان ہوتی گئی ۔ وُہ وقت بھی آیا کہ جب دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے ۔ یہی وجہ ہے کہ بیچارے کی تعلیم ادھوری رہی ۔ انھیں ہائی سکول میں پڑھتے تو دیکھا گیا ہے مگر ان کے پاس کوئی قابلِ ذکر تعلیمی سرٹیفکیٹ نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے اکثر یہ فقرہ سُننے میں آتا ہے :

اجی سرٹیفکیٹ کو چھوڑیے آج کل تو سکولوں اور کالجوں میں جہالت کے سرٹیفکیٹ بٹتے ہیں ۔

ان کی تیسری جماعت کا ایک واقعہ مجھے آج تک یاد ہے ۔ جب یہ حضرت اوّل درجہ کے کُند ذہن ہُوا کرتے تھے

اور خُوب پٹا کرتے تھے۔ اگر استاد نے گھر پر کرنے کے لیے کام دیا تو یہ پٹائی سے بچنے کے لیے اپنے ہی ہم سبقوں کے گھروں پر جاکر، انھیں باتوں میں لگاکر، آنکھ بچاکر، یا اُن کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاکر، اس دن کا کام کیے ہُوئے صفحات ہی پھاڑ لایا کرتے تھے۔ اس طرح خود سُرخرو ہوکر دوسروں کو مصیبت میں ڈال دیا کرتے تھے اور استاد اُن بے چاروں کو یہ کہہ کہہ کر خُوب پیٹا کرتے تھے:

"ہُوں، کسی نے کاپی میں سے صفحے پھاڑ لیے ہیں — شاہ! — ہُوں کاپی میں سے صفحے —— اُلّو ایک تو کام نہیں کرتے، دُوسرے جھُوٹ بولتے ہیں۔

ایک دن، ان کا ایک ہم سبق ان کے ہاتھ کی صفائی سے پٹ رہا تھا تو یہ اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے اُٹھے اور اقرار کرلیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے صحیح ہے اور قصوروار میں ہُوں۔ استاد نے ان کی صاف گوئی کی کوئی قدر نہ کی، اُلٹے اتنی ٹھکائی کی کہ اسکول کی دیواریں تک سہم گئیں۔ تب سے نہ جانے کیا ہُوا کہ یہ پڑھائی میں تیز ہو گئے، اتنے تیز کہ استاد ان پر فخر کرنے لگے۔

ان کی اس سے بھی پہلے کی باتیں مجھے یاد ہیں۔ جو ممکن ہے اب ان کے لیے وجہِ فضیلت نہ ہوں۔ مگر وُہ باتیں ان کے مستقبل کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد دے ہی سکتی ہیں۔ یہ اپنے ماضی کی یادوں کو یکسر بھُلا دینا چاہتے ہیں۔ مگر وُہ ہیں کہ انھیں یاد آ ہی جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی جھنجلاکر یہ شعر بھی دُہراتے ہُوئے پائے گئے ہیں ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ابھی یہ چار پانچ برس ہی کے ہوں گے کہ انھوں نے بھِڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنی خُوب گت بنوائی۔ روتے، چیخنے اور تڑپا، گھر والوں نے جناب کی یہ حالت دیکھی تو بھِڑوں کے چھتے کو جلا ڈالا۔ کوئی دو مہینے بعد بھِڑوں نے پھر وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ انھوں نے دوبارہ چھتے میں ہاتھ ڈال کر اپنا حلیہ حسبِ سابق بنالیا۔ آج جبکہ اس واقعہ کو تیس برس سے زاید عرصہ گزر چکا ہے اُنھوں نے بھِڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت ترک نہیں کی۔

انھی دنوں کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ جب یہ حضرت ٹھیک سے چل پھر بھی نہیں سکتے تھے انھوں نے اپنی ممانی کے ہاں ڈاکہ ڈالا۔ وہ بیچاری سب سے چھُپ کر، چارپائی کے نیچے، زمین میں سوراخ کر کے اور اس میں مٹی کا ایک چھوٹا سا آبخورا گاڑ کر پیسے جوڑا کرتی تھیں۔ یہ حضرت رینگتے، لڑکھڑاتے چلتے موقعہ واردات پر پہنچ گئے۔ ڈھکنا اٹھایا، پیسے نکالے، مُٹھی میں دبائے برآمدے میں پہنچے تو بڑے بچّوں نے چھین چھین کر خُوب مزے کیے۔

چند دنوں کے بعد یہ حضرت پھر اُسی دفینہ پر، جتنے بھی پیسے ہاتھ آئے، نکال لائے۔ ممانی نے موقعہ پر ہی چور کو پکڑ لیا، خوب پیٹا۔ پیٹتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں:

ہائے ہائے طفیل! تیرا بیڑا غرق، تُو نے مجھ ترٹی کی ساری پونجی لٹا دی۔

کہتے ہیں کہ چور چوری سے جائے بھی تو ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ طفیل صاحب ہیرا پھیری کے ساتھ چوری سے بھی باز نہ آئے۔ جب یہ چھوٹے سے تھے تو چھوٹے چور تھے۔ بڑے ہوئے تو بڑے چور ثابت ہوئے۔ پہلے ماں کی اکنیاں، دونیاں اور پیسے چرایا کرتے تھے۔ سیانے ہوئے تو والدہ کی بڑی احتیاط سے چھپائی ہوئی لوہے کی صندوقچی میں سے روپے تک چرانے لگے۔ یہ مشغلہ کوئی مہینہ دو مہینہ چلا ہو گا کہ والدین کو ان کی شرافت کا علم ہو گیا۔ اس سے پہلے اس لیے پتا نہ چلا کہ یہ چوری میں بھی عقل سے کام لیا کرتے تھے اور ایک دن میں، ایک دو روپوں سے زیادہ نہیں چرایا کرتے تھے۔

چوری میں لاکھ خوبیاں ہوں گی، مگر ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک نہ ایک دن آدمی پکڑا جاتا ہے۔ چنانچہ طفیل صاحب بھی پکڑے گئے۔ ایک دن طوفان برپا ہو گیا۔ محلے والوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ صاحبزادے چور ہیں۔ ان کی والدہ نے چور کو والد صاحب کے حوالے کر دیا اور والد صاحب، سیدھے تھانے کی طرف۔ اب طفیل صاحب رو رو کر منت سماجت کر رہے ہیں، ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ مگر والد صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

جب تھانہ قریب آ گیا تو جناب طفیل کے ہاتھ پاؤں اور پھولے، جھٹکا دے کر والد صاحب کی مضبوط گرفت سے اپنی کلائی چھڑائی اور بگٹٹ بھاگے۔ ان کے والد صاحب زور زور سے پکارتے ہی رہ گئے "پکڑو پکڑو، چور ہے۔" اب لوگوں کو کیسے یقین آئے کہ یہ چھوٹا سا لڑکا سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے جا رہا ہے چور بھی ہو سکتا ہے۔

اِس واقعہ کے بعد انہیں چوری سے ایسی نفرت ہوئی کہ باقی زندگی میں، اِس آرٹ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ورنہ طفیل صاحب تو اب بھی کہتے ہیں کہ میری ابتدا بڑی شاندار تھی۔

جب یہ سترہ اٹھارہ برس کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ دولت اور والد کا جنازہ ایک ساتھ اُٹھا۔ اب انہیں نہ صرف خود کما کر اپنا پیٹ بھرنا تھا بلکہ ایک چھوٹے سے گھرانے کی دال روٹی کی بھی فکر دامن گیر تھی۔ اتنی سی جان اور زندگی کی یہ سب سے کٹھن راہ۔

چھ سات برس انہوں نے خوشنویسی کے کام پر ضائع کر دیے۔ مگر اس میں سے کچھ پس انداز بھی کیا۔ اُس رقم سے ایک دوست کے اشتراک سے پبلشنگ ہاؤس کی بنیاد رکھی۔ اوّل تو آج کل کی دوستیاں ہی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتیں، اُس پر اشتراک، اس لیے ان کے بھی حسین خوابوں کی تعبیر وہی ہوئی جو عموماً متوقع ہوتی ہے۔

اِس واقعہ کا ان کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ بیزاری اور بیکاری میں جب کئی مہینے گزر گئے تو ۱۹۴۴ء میں انہوں نے ادارۂ فروغِ اردو کی داغ بیل ڈالی۔ ابتداءً جو کچھ گزری، اس کی داستان کیا پوچھتے ہیں، بس یوں جانیے پریشانیوں اور دشواریوں کا یہ اکیلی جان۔ یوں ہی مقابلہ کرتی رہی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ یہ تھکے ہارے گھر لوٹے، ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئے۔ والدہ نے انہیں یوں پریشان دیکھا تو پوچھا:

"بیٹا! کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں!"

"کوئی بات تو ضرور ہے!"

"بات یہ ہے کہ میں ساری دنیا سے اکیلے ہی لڑ رہا ہُوں، کوئی بھی تو نہیں ہے جو میرا ساتھ دے۔ نہ رشتہ دار نہ دوست!"

"یہ سب ٹھیک ہے مگر تُو اکیلا نہیں ہے۔"

"جی ہاں، میرے ساتھ ساری خدائی ہے!"

"تیرے ساتھ تیرے ولولے ہیں، تیری امنگیں ہیں، تیرے ارادے ہیں ——— اور پھر خدا ———"

"سب میرے ساتھ ہیں مگر خدا میرے ساتھ نہیں۔"

"ایسی بکواس نہیں کیا کرتے۔"

"میں بھی انسان ہُوں۔ بچپن سے اب تک ہزار دُکھ جھیلے ہیں مگر اب تک خدا کو ترس نہیں آیا۔"

"دیکھ میں تجھے دو باتوں کی نصیحت کرتی ہُوں، ایک یہ کہ صبر و ضبط کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ دوسرے کسی بھی کام کو ناممکن نہ جاننا۔"

طفیل صاحب نے ہمیشہ اپنے دوستوں کے رومانس کو سرِ صفحات بدنام کیا ہے۔ دل چاہتا ہے آج ان حضرت کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا جائے۔ کچی عمر میں ایک صاحبہ نے غالباً انہیں بیوقوف سمجھ کر ان سے ذرا ویسی قسم کی خط و کتابت شروع کر دی۔ جب انہیں ان صاحبہ کی طرف سے پہلا خط ملا تو یہ پاگل خانے کی سیڑھیوں پر ہی سنبھل گئے۔ وہ خط و کتابت نہایت دلچسپ تھی۔ سیکڑوں خطوں کا آنا جانا رہا۔

اگر محترمہ نے اظہارِ بےتکلفی فرمایا تو اُنھوں نے مفتیِ وقت بن کر فوراً ڈانٹ پلائی کہ یہ بات غلط۔ اگر محترمہ نے کوئی شرارت کی تو انہوں نے چھوٹی عمر میں بڑے میاں بن کر بڑی ہی معنی خیز "ہُوں" کرکے اس شرارت کا مزا ہی کرکرا کر دیا۔ اگر انہوں نے کوئی لگاوٹ کی بات کی تو انہوں نے اپنا رشتہ ہی اس سے مختلف بتا دیا۔ غرض جتنی بھی نالائقیاں اس سے سرزد ہو سکتی تھیں وُہ ہُوئیں۔ آخری نالائقی یہ کی کہ اس دو طرفہ خط و کتابت ہی کو ایک دن جلا ڈالا۔ جبکہ ان میں سے ایک ایک خط کو خود آں جناب نے ایک ایک دو دو دن کی ریاضت سے لکھا ہوا تھا۔ آج یہ خود کوشش کرکے بھی لکھنا چاہیں تو اُس جیسا ایک خط نہیں لکھ سکیں گے۔

ان سارے واقعات پہ، یہ کبھی ناول ہی لکھیں گے (بشرطیکہ انھیں کسی طرح ایک دو برس کی قید ہو جائے، ورنہ فرصت کہاں) جس کی ضخامت کوئی چھ سو صفحات تو ہو گی۔ اُس میں ہیرو کی بُزدلی، نالائقی اور بےوقوفیوں کے ساتھ، دوسرے کی بہن سے اپنے بھائی کا پیار ملے گا۔

زندگی کے اس ابتدائی غلط تجربے ہی کی بنا پر، ان کا خیال یہ ہے کہ عورت ہی کو مرد پہ عاشق ہونا چاہیے۔ مرد کو عورت

پر ہرگز ہرگز عاشق نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت پر عاشق ہوتا ہے تو انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

یہ خواہ مخواہ کے ناصح مشفق بھی، ایک دن ایک صاحبہ انہیں ادارۂ فروغِ اردو پر اکیلا پا کر ایک نہایت بازاری قسم کا ئریاں ناول خریدنے آئیں تو انہوں نے ہُوں ہاں ہی نہ کی۔

وہ صاحبہ قدرے ترّخ کر بولیں،

"میں پُوچھتی ہُوں فلاں ناول ہے ؟"

"ہے تو، مگر آپ کو نہ دُوں گا۔"

"کیوں ؟"

"وہ ناول بڑا عریاں ہے۔"

وہ بھنّا کر بولیں؛

"یہ تو مجھے بتائیے آپ میرے سرپرست کب سے بنے ہیں؟"

اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ طفیل صاحب کو دوسروں کی بہنوں کی بارے میں، اپنی بہن کی طرح سوچنے کا کیا حق ہے؛ اگر حق ہے تو جب جواب ملتا ہے تو پسینے کیوں چھُوٹتے ہیں!

ابھی کوئی ایک برس کی بات ہوگی کہ شامتِ اعمال اُس دن بھی یہ اکیلے ہی بیٹھے اپنے خیالوں کی دنیا میں گُم تھے کہ ایک صاحبہ دندناتی ہُوئی آئیں اور ان سے پُوچھا:

"گنواری" ہے ؟"

یہ بڑے پریشان ہُوئے، مگر اپنی سماعت پر یقین نہ آیا، صرف اتنا ہی کہہ سکے:

"جی !"

"میں پُوچھتی ہُوں، دُخترِ باکرہ کا اردو ترجمہ ہے ؟"

"میں فارسی نہیں سمجھتا۔"

"تو کیا اُردو بھی نہیں جانتے ؟"

"جی نہیں !"

طفیل صاحب کے اس جواب پر، پہلے تو مستاۃ نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر پاؤں سے سر تک۔ اور انہی کے جواب "جی نہیں" کو اس انداز سے لوٹایا جیسے کہہ رہی ہوں کُند کہیں کا!

طفیل صاحب سوائے اپنی ذات کے، ہر بات میں نفاست کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور خوب صورت چیزوں پر جان بھی دیتے ہیں۔ یقین کیجئے انھیں اس حد تک خوبصورتی خولیا ہے کہ کچھ نہ پُوچھیے، یہ ہر چیز میں حُسن ڈھونڈتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن یہ اپنے ایک نہایت ہی بے تکلّف دوست سے کہہ رہے تھے،" دیکھو نا یار! وُہ سامنے جو

کوا بیٹھا ہے کتنا خوب صورت ہے !"

خود ان کی اپنی ذات کا یہ حال ہے کہ اگر نیا کوٹ پھٹ گیا ہے تو پھٹ جائے۔ پتلون پر چائے گر گئی ہے تو گر جائے۔ یہ پھٹے ہوئے کوٹ اور چائے گری پتلون کے ساتھ بھی بہ خوشی نباہ کرتے چلے جائیں گے۔ پالش کے معاملے میں ان کے بوٹ عموماً یتیم ہی ملے۔ ٹائی کے بغیر کوٹ اوڑھتے ہیں اور بازار میں اکیلے جاتے ہوئے باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی پاگل !

ان میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں۔ مگر ایک انتظامی خوبی ایسی ہے کہ باقی تمام خوبیاں ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ ان کے خاص خاص دوست جانتے ہیں کہ دعوت کے دن طفیل صاحب کو کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چنانچہ انھیں حکم مل جاتا ہے کہ اب ہم کھانے پینے کا سامان مہمانوں کے سامنے رکھنے والے ہیں لہٰذا یا تو آپ یہاں سے چلے جائیں یا ادھر کا رُخ اس وقت کریں جب ہم فارغ ہو جائیں۔

آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ یہ طفیل صاحب کے دوستوں کی کتنی زیادتی ہے۔ ویسے آپ اس کا فیصلہ ان کے انتظام کے تحت جو ایک شادی ہوئی تھی اُس کا ذکر سُن لینے کے بعد کریں۔

ان کے ایک نہایت ہی عزیز دوست نے انہیں بلایا کہ میری بہن کی شادی ہے اس میں شرکت کر کے میرا ہاتھ بٹاؤ۔ چنانچہ یہ پہنچے۔ پکوانے وغیرہ کا کام کسی اور کے سپرد تھا۔ ان کے ذمہ صرف یہ کام تھا کہ برات کو اپنی نگرانی میں کھانا کھلا دینا اور جب دُولھا گھر میں داخل ہو تو یہ ہار پہنا دینا۔

باجوں کی آواز قریب آنے لگی تو ان کے ہوش اُڑنے لگے۔ جُوں جُوں برات قریب آتی گئی ان کے کان تپنے اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ برات صحن میں داخل ہو گئی۔ اب انہیں دُولھا نظر نہیں آتا۔ پہلے کا دیکھا ہُوا نہ تھا۔ پڑھا لکھا تھا اس لیے دُولھا بن کر بھی آدمی ہی تھا۔ انہوں نے گھبراہٹ میں کسی اور کو دُولھا بھائی کا خطاب دے ڈالا۔

اب کھانا نکل رہا ہے اور یہ شور مچا رہے ہیں: پلاؤ کی کتنی دیگیں ہیں ؟

آٹھ۔

آٹھ سے کیا بنے گا ! یہ حضرت تو پُورے شہر کو لے کر آ نکلے ہیں۔ شوربا ——— دو ——— ڈال دو پانی۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔

اسی اثناء میں دو ایک بچے پلاؤ کی پلیٹ لے کر ان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکلنا چاہ رہے تھے۔ یہ بوکھلائے ہوئے تو تھے ہی، انہوں نے رکھ کے جو زنّاٹے دار تھپڑ ایک بچے کو رسید کیا تو وہ کم بخت پلاؤ پھینک، زور زور سے رونے لگا ——— اب یہ اُسے منا رہے ہیں : بھئی ! خدا کے لیے چُپ ہو جاؤ اور پلاؤ کی ایک چھوڑ دو پلیٹیں لے جاؤ۔ مگر وُہ ایسا ضدی بچہ، نہ پلاؤ لیتا تھا نہ چُپ ہوتا تھا۔ آناً فاناً انھیں ایک ترکیب سُوجھی، جھٹ ایک روپیہ جیب سے نکالا، بچے کی ہتھیلی پہ رکھا، ساتھ ہاتھ بھی جوڑے۔ تب کہیں بچہ راضی ہُوا۔ اس پر بھی اُس بچے نے جا کر اپنی

ماں سے کہہ ہی دیا۔ ماں بھی بچّے کی طرح بڑی 'بھلی مانس' تھیں، ایک دم گالیوں پر اُتر آئیں۔ زنانے میں گالیاں مل رہی تھیں مردانے میں پلاؤ مل رہا تھا۔

جب برات چلی گئی اور گھر کے لوگ اکٹھے ہو کر بیٹھے تو سب کے سب ان کی باتیں یاد کر کے ہنس رہے تھے اور یہ پریشان ہو رہے تھے کہ جتنی بھی باتیں ان سے منسوب کی جا رہی ہیں وہ سب کی سب غلط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی انتظامی صلاحیتوں کی یوں بے قدری دیکھ کر آئندہ کے لیے توبہ ہی کر چکے ہیں کہ اب کسی کی برات آئے یا جنازہ اُٹھے پروا ہی نہیں کرنی چاہیے۔

ان کے سر سے والد کا سایہ اُس وقت اُٹھا جب یہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھے (یکم فروری ۱۹۴۳ء) اور والدہ کا سایہ اُس وقت اُٹھا (۵ جولائی ۱۹۵۸ء) جب یہ اس دُنیا میں آبرومندانہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق، یہ سب کچھ والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ طفیل صاحب کا اپنی والدہ کے بارے میں خیال یہ ہے کہ وُہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی بارگاہ میں، کسی شمار قطار میں ضرور تھیں۔

بیماری سے دو دن پہلے کی باتیں تو یہ کبھی بھول ہی نہیں سکتے۔

"بیٹا! یہ میری آخری بیماری ہے۔"

"یہ بھی کوئی بیماری ہے، بخار ہی تو ہے۔"

"ہے تو بخار، مگر چھوڑو ان باتوں کو، شام کو کتنے بجے لوٹو گے؟"

"کیوں؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ آج تم جلدی سے آجاؤ۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں جاتا ہی نہیں۔"

"نہیں نہیں، بات کوئی نہیں، مگر آنا جلدی سے، ایک کام ہے۔"

یہ چلے تو گئے، مگر ان کے دل میں کُھد بُد لگی رہی کہ والدہ نے جلدی سے واپس آنے کو کہا ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی۔ یہ اُس دن تین بجے ہی گھر پہنچ گئے۔ دیکھا تو والدہ کی سانس اُکھڑی ہوئی ہے۔ بہت گھبرائے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلا لائے۔ دوائی دی گئی۔ سانس بحال ہو گئی۔ بخار بھی ہلکا ہو گیا۔

دُوسرے دن پھر سانس اُکھڑ گئی تو یہ پھر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑے۔ مگر ان کی والدہ نے واپس بُلا لیا۔ اور بڑے حوصلے سے کہا:

"بیٹا! تُو جو کچھ چاہتا ہے وُہ اب پُورا نہ ہوگا۔"

ان کی والدہ ایسی باتیں کرتی ہی رہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر کو بُلا لائے۔ سانس ضرور اُکھڑی اُکھڑی سی تھی مگر ظاہری حالت بڑی اچھی تھی۔ تین چار دن میں، بخار سے مریض کی حالت بھلا خراب ہی کتنی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر نے دوائی دی۔ سانس

پھر بحال ہوگئی۔ بخار بالکل اُتر گیا۔ بظاہر سب کی عید ہوگئی۔

طفیل صاحب نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا اور والدہ سے کہا:

"بخار بھی اتر گیا ہے، سانس بھی ٹھیک سے آنے لگی ہے۔"

اس پر جواب تو کچھ نہ ملا، البتہ مسکرائیں ضرور۔ جیسے کہہ رہی ہوں: پگلا کہیں کا!

یہ اس دن کہیں بھی نہ گئے۔ سارا دن ہنسی خوشی باتیں ہوتی رہیں۔ گھر میں رشتہ داروں کا آنا جانا رہا۔ دن گزر گیا۔ رات ہوئی تو گیارہ بجے والدہ نے ان سے سو جانے کے لیے اصرار کیا۔

رات کے ایک بجے کے قریب والدہ نے انھیں بلوایا۔ یہ ہڑبڑا کر اُٹھے۔ قریب آئے تو والدہ نے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا:

"بیٹا! میں اس دُنیا سے جا رہی ہوں، اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کا خیال رکھنا۔ دیکھنا وہ دنیا میں کسی طرح بھی آزردہ نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر چھاتی سے لگا لیا اور یہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگ گئے۔ اس پر ان کی والدہ کہنے لگیں:

"روؤ نہیں، ابھی مجھے بڑی باتیں کرنی ہیں۔ حوصلے سے کام لو۔"

"حوصلے سے کام کس طرح لُوں! کیا کروں؟"

یہ تو پھر ڈاکٹر کو بُلانے چلے گئے۔ والدہ نے ایک ایک کو پاس بُلا کر پیار کیا، دُعائیں دیں، چھوٹوں کو بھی، بڑوں کو بھی۔ جب یہ (بغیر ڈاکٹر کے) واپس آئے تو سب کے سب رو رہے تھے اور والدہ سب کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں:

"دیکھو، ٹرنک کھول کر، جو سب سے اچھا جوڑا ہو وہ میرے یتیم بھتیجے کی شادی پہ دے دینا ——— میں نے نہ تو کسی کا کچھ دینا ہے اور نہ ہی کچھ لینا ہے ——— میرے کانوں میں جو سونے کے بُندے ہیں وہ نہلانے والی کو دے دینا ——— چاروں جمعراتوں پہ یتیموں کو بُلا کر کھانا کھِلا دینا۔"

اب صبح ہونے ہی والی تھی۔ یہ پھر ڈاکٹر کی تلاش میں نکلے۔ والدہ کو پتا چلا تو انھوں نے انھیں پھر واپس بلوایا۔ ڈاکٹر کو لانے سے منع کیا۔ یہ بھی کہا:

"اب کوئی فائدہ نہیں، میرے پاس بیٹھو۔"

مگر یہ نہ مانے، ڈاکٹر کو لانے کے لیے چل ہی دیے۔

ڈاکٹر کو لے کر جب یہ واپس آئے تو ان کی والدہ ان کی ممانی اور بیگم سے کہہ رہی تھیں:

"مجھے نہلا دو۔"

وہ چُپ تھیں، کیا کرتیں۔ ایک دن پہلے تک تو بخار تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ نہلایا جائے۔ ڈاکٹر دیکھ کر دوا دوائی

دے کر چلا گیا۔ یہ بھی کہہ گیا: خطرے والی کوئی بات نہیں ہے آپ لوگ بلاوجہ گھبرا رہے ہیں۔"

جب بیگم اور حمانی نہلانے پر راضی نہ ہوئیں تو والدہ نے پھر ان کی طرف دیکھا اور اصرار کیا: ان سے کہو مجھے نہلا دیں، پتا نہیں یہ کیا سوچ رہی ہیں مگر میں سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔"

میں بھی چپ ہو گیا، ماموں صاحب بھی چپ ہو گئے، حمانی بھی چپ ہو گئیں۔ میرے اشارے پر بیگم نے اٹھ کر پانی گرم کیا۔ جب پانی گرم ہو گیا تو والدہ خود چارپائی سے اُٹھیں۔ بیگم اور حمانی نے سہارا ضرور دیا۔ مگر وہ غسل خانے میں جا کر خود اپنے ہاتھوں سے صابن مل کر نہائیں۔ نہانے کے بعد، پیدل چل کر واپس آئیں اور بیگم سے کہا:

"میرے بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر دو۔"

جب یہ سارے کام ہو گئے تو ہلکی سی آواز میں ہُوں ہُوں کرنے لگیں۔

طفیل صاحب نے پوچھا:

"اماں! کیا بات ہے؟"

"بیٹا! تیرا میرا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تو میں پرایا مال ہُوں۔"

اس کے بعد ایک منٹ خاموش رہیں پھر اونچی آواز سے پڑھا:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

اس کے بعد وہ پھر کچھ نہ بولیں حالانکہ سب بلاتے ہی رہے۔

موت اور اس کا اتنا خندہ پیشانی سے استقبال! ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ والدہ کے انتقال سے طفیل صاحب بُجھ سے رہ گئے ہیں۔ کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا۔ ہر وقت کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ شاید یہی سوچتے ہوں کہ دُنیا کے یہ سارے بکھیڑے کتنے عارضی اور بے حقیقت ہیں!

اگر آپ کی ان سے بے تکلفی ہے تو یہ کافی حد تک شگفتہ ثابت ہوں گے۔ تکلّف کے تعلقات ہیں تو یہ آپ کو اتنا بور کریں گے کہ آپ پریشان ہو جائیں گے اور سوچیں گے الٰہی! کس بُدھو سے واسطہ پڑا ہے جس کے نہ منہ میں زبان ہے نہ دماغ میں بھیجا۔ حالانکہ حسبِ ضرورت ہیں دونوں چیزیں۔ اگر مخاطب بھی کم گو اور بے تکلف نہ ہو تو پھر لطف ہی آ جائے گا۔

مجاز لکھنوی اور طفیل لاہوری کے مابین ایک بار بڑے مزے کی باتیں ہوئی تھیں اور یہ گفتگو کوئی پون گھنٹہ کے عرصہ میں ہُوئی ہوگی۔ ابتدا طفیل صاحب کرتے ہیں:

"خیریت؟"

"جی ہاں!"

"چپ چپ کیوں ہیں؟"

"یُونہی۔"

(کافی دیر سکوت کے بعد) "ابھی تو آپ کچھ دن رہیں گے؟"

"جی ہاں!"

"آپ بولتے کیوں نہیں؟ کیا بات ہے؟"

"یُونہی۔"

"اچھا!"

"جی ہاں!"

(پھر کافی دیر سکوت کے بعد) "لکھنؤ دیکھا؟"

"کچھ کچھ۔"

"کافی کیسی ہے؟"

"کڑوی۔"

"شربت منگواؤں؟"

"بسم اللہ!"

"اچھا یہ بتایئے اس رفتار سے آپ والنّاس تک کب پہنچیں گے؟"

انھیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کر سکتا ہُوں جو کوئی دُوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی غلط فہمی نے انہیں مدیرِ نقوش بنایا تھا ورنہ یہ اور نقوش کی ادارت! ہُنّھ!

یہ غلط فہمی انھیں یُوں بھی ہُوئی کہ تقریباً تمام شاعروں اور ادیبوں سے ان کے ذاتی اور اچھے مراسم تھے ان میں سے کوئی دوست تھا تو کوئی بھائی۔ ان کے مدیر ہونے کے فوراً بعد، بھائی دوست بن گئے اور دوست دشمن، الحمد للہ کہ آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کا کوئی دوست ہی نہیں، سب اپنے اپنے دلوں میں بھرے بیٹھے ہیں۔

اس میں ان کے دوستوں کا کوئی قصور نہیں۔ اول تو انھیں مدیر ہی نہیں بننا چاہیے تھا، اگر بن بیٹھے تھے تو انہیں دوستانہ حقوق کا احترام کرنا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر، ان کا کوئی دوست، میل دو میل سے چل کر آتا ہے اور یہ ہیں نمبر کی دُھن میں غرق۔ دوست پُوچھتا ہے:

"طفیل صاحب! خیریت ہے؟"

"یار! کرشن چندر نے افسانہ نہیں بھیجا۔"

"اوہو!"

"جی ہاں!"

"بھابی اور بچے تو اچھے ہیں؟"

"امید ہے کل تک ضرور آجائے گا۔ مجھے کرشن چندر نے خط لکھا تھا افسانہ لکھ لیا ہے صاف کر کے دو روز تک بھیج دُوں گا۔"

"بھائی! مَیں پُوچھ رہا ہُوں، بھابی اور بچے تو ٹھیک ہیں؟"

"معاف کرنا بھائی! مجھے ان کا کچھ پتا نہیں۔ ایک ہفتہ سے گھر بارہ بجے سے پہلے نہیں جا سکا۔ صبح منہ اندھیرے اُٹھ کے چلا آتا ہُوں تاکہ پرچہ جلد آجائے۔ ہاں بھنک پڑی ضرور ہے کہ جاوید کو بخار آرہا ہے۔"

"اوہو، کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟"

"پرچہ چھپ جائے تو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں۔"

پھر ایک دم کاتب صاحب سے مخاطب ہوکر:

"بھئی! کتابت کتنی ختم ہُوئی؟"

وہ دوست، جو بیچارا مارے خلوص کے چل کے آیا تھا وہ ان کے پاس آکر ان کے نقوش خولیا سے پریشان ہوجاتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ سوچتا ہے شاید یہ اب بھی آدمی کے جامہ میں آجائیں اور کوئی ڈھنگ سے بات کریں۔ یہ اپنی دُھن میں مست، نمبر ہی کی "تجہیز و تکفین" کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ بالآخر خلوص کی زد میں آیا ہُوا دوست، ان کی یہ حالت دیکھ کر، جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ تب یہ چونکتے ہیں اور پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ، اس کا بازو پکڑ کر کہتے ہیں:

"یار! چائے تو پی لو۔"

"میں اتنی دُور سے آپ کے پاس صرف چائے پینے آیا تھا؟"

تب انھیں اپنی نالائقی، مردم بیزاری اور دوست کُشی کا احساس ہوتا ہے۔ دوست سے معافی مانگتے ہیں، اُسے باہر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ مگر وُہ جو دوست کے خلوص کو ٹھیس لگتی ہے اُس کا اُن کے پاس کوئی مداوا نہیں ہوتا۔ دوستوں کو ناراض کیا۔ بھائی مروّتاً دوستی تک بھی آئے۔ غرض اتنے انہماک کے بعد جو نمبر مرتّب کئے ان کے بارے میں لکھنؤ سے ایک خط آتا ہے:

"آپ نے شخصیات نمبر میں ہر اُرے غیرے کو شامل کیا ہے۔ مگر مجھ پہ مضمون نہ چھاپا۔ اب آپ سے کون دوستی رکھے۔"

ایک اور خط بمبئی سے آتا ہے:

"آپ بھی عجیب چیز ثابت ہُوئے ہیں۔ افسانہ نمبر میں، جو آپ نے میرا افسانہ لیا ہے وہ میرا سب سے گھٹیا افسانہ تھا۔ آخر آپ نے یہ مجھ سے کس وقت کا انتقام لیا ہے!"

کراچی سے ایک شاعر نے زبانی پیغام بھیجا :

"آپ نے غزل نمبر میں فیضؔ کی تو چھ غزلیں چھاپی ہیں اور میری صرف ایک۔ کیا میں فیضؔ سے گھٹیا شاعر ہوں۔ اگر آپ کو شاعری کے الف بے کا پتا نہیں تو کسی سے پوچھ لیا ہوتا۔"

لاہور والے پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے وہ شخصیات نمبر میں بھی نہیں آئے تھے۔ افسانہ بھی اُن کا گھٹیا شامل ہوگیا تھا۔ غزل نمبر میں بھی کسی کی ایک غزل آئی تھی اور کسی کی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ منچلوں نے چائے کی میز پر بیٹھ کر یہ پروگرام بنایا کہ ہم سب نقوش کے دفتر چلتے ہیں۔ ایک نے کہا :

میں طفیل کا گریبان پکڑوں گا۔

دوسرے نے کہا :

میں گھونسا ماروں گا۔

تیسرے نے کہا :

میں مصلحتاً بیچ بچاؤ کراؤں گا، مگر تم اپنا کام کرتے جانا۔

خیر، یہاں تک تو غنیمت تھا کوئی انھیں گالی دے لے تو دے لے، کوئی تھپڑ مار کر خوش ہو لے تو ہو لے۔ مگر ایک دن ایسا ہُوا کہ لاہور سے کراچی جاتے ہُوئے اخبار نویسوں نے یہ پروگرام بنایا کہ واپسی پر مدیرِ نقوش کی خبر لی جائے۔ بنیاد سجّاد ظہیر کے افسانے کو بنایا، جسے طفیل صاحب نے پہلے ہی کاٹ چھانٹ کر کے اصل سے کافی بے ضرر بنا دیا تھا (اُس صورت میں بھی اُس میں قابلِ اعتراض باتیں تو تھیں) میرا عرض کرنے کا مُدعا یہ ہے کہ اُس سے مُدیرِ نقوش کی نیت کا تو اندازہ ہو ہی سکتا تھا، جبکہ اسی قسم کا ایک نوٹ افسانے کی ابتدا میں بھی موجود تھا۔

قباحت یہ تھی کہ طفیل صاحب کے نزدیک اُس افسانے کی شمولیت یُوں ضروری تھی کہ وہ افسانہ نمبر کی صورت میں ایک طرح کی تاریخ مرتّب کر رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ اُس دَور کے اِس انداز کے افسانے بھی آئیں۔ جب مذہب سے بیزاری، خدا اور رسولؐ کا تمسخر (نعوذ باللہ) اور انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ اور اسی غلط روش کو دکھانے کے لیے طفیل صاحب نے اِس افسانے کی شمولیت ضروری سمجھی تھی۔

چنانچہ ایک دم طوفان اُٹھ کھڑا ہُوا، مخالفت میں بھی، موافقت میں بھی۔ مخالفت زیادہ تھی، موافقت کم۔ حالانکہ بعض لوگ کہتے ہی رہے کہ طفیل کی نیت کی طرف بھی دیکھو، اُس کا ہرگز یہ مقصد نہیں جو تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ مگر صاحب! کون سُنتا تھا۔ بڑا عمدہ پلان بنایا گیا تھا۔ مسجدوں میں مدیرِ نقوش کو مطعون کیا گیا۔ موچی دروازے کے باہر جلسہ ہُوا۔ پکٹنگ کے پروگرام بنے۔ کسی نے سوچا دفتر کو آگ لگا دی جائے، کسی نے سوچا جان سے مار دیا جائے۔ اور یہ سارا ہنگامہ اِس جانِ ناتواں کے بارے میں تھا جس نے کبھی سر اٹھا کے نہیں دیکھا کہ یہ کنکری کس طرف سے آئی ہے!

مدیرِ نقوش کو جب اپنی موت سامنے نظر آئی تو انھوں نے خدا سے التجا کی : "تُو تو علیمٌ بذات الصدور ہے۔ میرے بھی سینے کے بھیدوں کو جانتا ہے اور میرے مخالفوں کے بھی۔"

ادھر دوستوں نے سمجھایا کہ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ تُو اخباروں میں لوگوں سے معافی مانگ لے اور اس افسانے ہی کو حذف کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس دنیا میں ان کی گستاخی کا یُوں فیصلہ ہُوا۔ اب انھیں آخرت کے فیصلے کا انتظار رہے۔ ممکن ہے وہ اس سے مختلف ہو۔

انھوں نے اپنے بارے میں جب بھی غور کیا تو ایک طفیل کے اندر دُوسرا طفیل بھی چھپا ہُوا پایا۔ ایک طفیل تو وہ ہے جس نے بزرگوں کا احترام کرنا سیکھا ہے، جو پڑھے لکھوں کے سامنے طالب علمانہ حیثیت میں بیٹھا رہے، جس نے چھوٹوں اور بڑوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہا ہے اور اپنے آپ کو بالکل مبتدی جانا ہے۔

دُوسرا طفیل مدیرِ نقوش ہے۔ جب یہ کُرسیِ ادارت پر ہوتے ہیں تو ان کا دماغ عرش پر ہوتا ہے۔ اس وقت انھیں بڑے سے بڑے علاّمہ کی تخلیق میں بھی نقائص نظر آتے ہیں۔ اپنے ذہن کی اسی خرابی کی بنا پر کئی بڑے بڑے لکھنے والوں کی چیزیں ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کر چکے ہیں۔

آپ خود ہی سوچیں، جس کی افسانہ نگاری میں دُھوم ہو، نقاد اسے صفِ اوّل کا افسانہ نگار مانیں، اس کے افسانے کو اگر مدیرِ نقوش ناقابلِ اشاعت قرار دے دے تو کیا وُہ ان سے خوش ہوگا! وُہ تو یہی کہے گا نا کہ جاہل ہے یہ۔

جس شاعر کی نظم یا غزل دس ہزار کے مجمع میں پڑھی گئی ہو اور اسے سامعین نے دل کھول کر داد بھی دی ہو۔ وہ بھی اگر مدیرِ نقوش کی نظر میں نہ جچے تو پھر شاعر بے چارا ان کی شاعرانہ سُوجھ بُوجھ پر فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے۔

جس نقاد نے تمام مغربی نقادوں کو پڑھا ہو (اور اتفاق سے اپنے ہاں کے تنقیدی سرمایہ سے استفادہ نہ کیا ہو) اور ان کے حوالے پہ حوالے دے کر مضمون کو بھاری بھرکم بنا دیا ہو۔ وہ مضمون بھی اگر نقوش میں نہ چھپے تو پھر آپ ہی بتائیں مدیرِ نقوش کی عقل کا ماتم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ لطیفہ بھی ہے :

ایک نقاد نے (اب ان کا نام کیا لُوں) انھیں ایک مضمون بھیجا۔ اچھے خاصے بڑے نام والے نقاد تھے۔ جب وہ مضمون پڑھا تو انھیں نہ جچا۔ جنابِ نقاد کو بڑے احترام کے ساتھ لکھ دیا کہ یہ مضمون نقوش میں نہ چھپ سکے گا اور اس میں فلاں فلاں نقائص ہیں۔

وہ صاحب بڑے برہم ہُوئے۔ پہلے تو وہ نقوش اور مدیرِ نقوش کی تعریفیں کرتے تھکا نہ کرتے تھے۔ پھر ایک دم معصوم قسم کی گالیوں پر اُتر آئے۔ مثلاً نالائق اور بدتمیز قسم کے الفاظ بے دریغ استعمال کر ڈالے۔

اللہ کی شان ملاحظہ ہو۔ بعد میں وہ مضمون "نگار" جیسے بڑے پرچے میں چھپ گیا تب وہ صاحب اور چڑھے۔ ایک اور خط لکھا جس میں مژدہ سنایا گیا تھا کہ وہ مضمون نیاز فتحپوری جیسے علّامہ نے تو پسند فرمایا ہے مگر جناب جیسے "پڑھے لکھے" نے واپس کر دیا تھا۔

یہ واقعہ اپنی جگہ ضرور صحیح ہے۔ مگر طفیل صاحب کا آج بھی دیانت داری کے ساتھ یہ خیال ہے کہ نیاز صاحب لاکھ علّامہ سہی، میرے ذہنی گرو سہی، 'نگار' اردو کا عظیم الشان پرچہ سہی۔ مگر وہ مضمون نقوش میں چھپنے کے قابل نہ تھا۔

انھیں اپنے رسالے اور اس کے کام سے اتنا عشق ہے کہ کیا کسی عاشق کو اپنے محبوب سے ہوگا۔ بلا مبالغہ انہوں نے اپنے ایک ایک نمبر پر اتنی اتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پر بن آئی ہے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں۔ جن دنوں کوئی خاص نمبر زیرِ ترتیب ہوتا ہے تو ان کا دس بارہ پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے۔ نہ وقت پر کھانا کھانا، نہ سونا، دن رات کام، صبح کے بجتے بجتے اگر رات کے ایک دو بھی بج گئے۔ تو بھی انہیں کچھ پروا نہیں، بلکہ مگن ہیں، مست ہیں۔

ایک بار یہ ہُوا کہ یہ اپنے دفتر سے رات کے بارہ بجے لَوٹے۔ بیگم سے کہا:

"کھانا لاؤ۔"

وہ بے چاری آنکھیں ملتی ہُوئی اُٹھی، کھانا گرم کر کے لائی۔ دیکھا تو یہ پھر نقوش کے عشق میں غرق، کاپیاں پڑھ رہے ہیں۔

بیگم نے، شوہر کو اپنے سہاگ کا واسطہ دے کر کہا:

"خدا کے لیے کام بند کر دیجئے۔ بہت ہو چکی۔ اب کھانا کھا لیجئے۔ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہُوئے ہیں۔"

یہ اُسے منت سماجت سے کہتے ہیں:

"خدا کے لیے چُپ رہو، لوگوں کو نہ جگاؤ، میرے منہ میں نوالے ڈالتی جاؤ تاکہ کھانا بھی ہو جائے اور کام بھی۔"

یُوں کھانا کھایا۔ رات کے تین بجے سوئے۔ مگر بیگم کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دی: "صبح سات بجے جگا دینا۔"

بیگم کے لیے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ اُس نے سات بجے جگا دیا۔ اب ان سے اٹھا نہیں جاتا۔ آنکھیں نہیں کھلتیں۔ ایک دن کی جگائی ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔ یہاں تو روز کا قصہ تھا۔ بیگم برہمی اور طنز سے کہتی ہیں:

"اب اُٹھتے کیوں نہیں، رسالہ لیٹ ہُوا جا رہا ہے۔"

یہ کہتے:

"اٹھنا تو چاہتا ہُوں مگر آنکھیں نہیں کُھلتیں۔"

پھر طفیل صاحب پچکار کے بیگم سے کہتے ہیں:

"میرے قریب آؤ۔ میرے ہونٹوں کو زور سے اُوپر کو اٹھاؤ تاکہ میری آنکھیں کھلیں اور میں اُٹھ سکوں۔"

ممکن ہے کوئی صاحب اسے زیب داستان ہی سمجھے مگر ہے یہ واقعہ۔ اب یوں کبھی نہیں ہوتا، بلکہ اب تو ان کی زندگی یونہی گزر رہی ہے یونہی گزر جائے گی زندگی کی لطافتیں اور مسرتیں انہیں بہ آوازِ بلند پکارتی رہتی ہیں۔ مگر یہ اُن سب سے بے نیاز ہو چکے ہیں جیسے بالکل مُردہ ہوں۔

قیافہ شناسی میں بھی یہ بڑے ماہر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں صورت دیکھ کر، ہر کسی کے کیریکٹر کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ ایک بار یہ اور اُن کے ایک اخبار نویس دوست تانگے پر سوار، فلم دیکھنے جا رہے تھے۔ معاً ایک تانگہ پاس سے گزرا۔ اُس میں نقاب اُلٹے، ایک لڑکی بیٹھی تھی، چاند سی صورت، اُس پر بھی میک اپ، اُن کے اخبار نویس دوست نے اُسے دیکھتے ہی انہیں ٹھوکا دیا۔

یہ بھی متوجہ ہوئے اور فتویٰ دے دیا:

"یہ لڑکی آوارہ ہے۔"

"ارے نہیں۔"

"شرط لگاؤ۔"

"جو کہو۔"

اب ان کے لیے، یہ ثابت کرنا کہ یہ آوارہ لڑکی ہے بڑا دشوار تھا۔ آج کل آوارہ لڑکیاں کہاں آوارہ دکھتی ہیں۔ اِدھر ان کے دوست کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ لڑکی قطعاً آوارہ نہیں ہے! اب یہ کرتے تو کیا کرتے۔

اُنھوں نے تانگے والے سے کہا: "میاں کوچوان! ذرا اپنے گھوڑے کو دوڑاؤ اور اس تانگے کے برابر چلو۔"

کوچوان نے اُن کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا مگر زبان سے کہا:

"بہت اچھا سرکار!"

اب ان کا تانگہ، اس تانگے کے برابر چل رہا ہے۔ لڑکی نے بھی اس بات کو تاڑ لیا۔ انہوں نے اس سے پہلے کبھی کسی لڑکی کو آوارہ ثابت نہیں کیا تھا اس لیے پسینے چھوٹ رہے تھے اپنی بات کو سچّا ثابت کرنے کے لیے۔ انہوں نے لڑکی کی طرف تین چار منٹ ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔

لڑکی نے بھی پہلو بدلا اور اپنی ران سے ہاتھ اٹھا کر بڑے مہذب انداز میں سلام کیا۔

اب تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دوست کے چٹکی لی اور اسے نظروں ہی نظروں میں سمجھایا: دیکھا بچُو! ہم نہ کہتے تھے۔

تانگہ میکلوڈ روڈ پر پہنچ گیا، جہاں کا تانگے والے سے طے کر کے آئے تھے۔ تانگے والے نے ان کی طرف دیکھا۔

انھوں نے اسے کہا: "فکر نہ کرو، تانگہ اُدھر لیے چلو جدھر وہ تانگہ جا رہا ہے، مُنہ مانگے دام ملیں گے۔"

"بہت اچھا سرکار! پر یہ کام بڑا ٹیڑھا ہے، ایسا نہ ہو کہ میں بھی تھانے کی ہوا کھاؤں۔"

"بھئی! جو خدا کو منظور۔"

"خدا کو کیا منظور ہوگا۔ اِس قصّے کو چھوڑئیے۔ وُہ تو ہے ہی بدمعاش، دیکھا ابھی سلام کر رہی تھی۔"

کوچوان کے ان ریمارکس پر انھوں نے اپنے دوست کی طرف اس طرح دیکھا جیسے انھوں نے مونٹ ایورسٹ فتح کر لی ہو۔ یہ باتیں ہوتی رہیں۔ مگر ان کا تانگہ اس تانگے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ یہ دل میں سوچتے بھی تھے کہ ہٹاؤ اس قصّے کو، آخر کیا فائدہ! مگر زبان نے دل کا ساتھ نہ دیا۔ تانگے برابر چلتے رہے۔ وُہ لڑکی بھی ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی اور یہ بھی۔ کبھی وُہ اپنے پریشان بالوں کو سنبھالتی، کبھی یہ مُسکرا دیتے، کبھی وہ مُسکرا دیتی تو یہ سہم جاتے۔ غرض انھی بوالعجبیوں میں اُس کا تانگہ ایک جگہ رُک گیا اور ان کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔

کوچوان نے پُوچھا: "روکوں بابُو جی! تانگے کو۔"

"نہیں۔"

"پھر۔"

"سرپٹ دوڑاؤ۔"

گھوڑا سرپٹ دوڑتا رہا۔ مگر یہ اس کا فیصلہ نہ کر سکے کہ گھوڑا تیز دوڑ رہا تھا یا یہ۔

کھیلوں میں بھی یہ کئی بازیوں سے صد درجہ دلچسپی لیتے ہیں، اتنی دلچسپی کہ اللہ دے اور بندہ لے ——— کیرم بورڈ اور تاش میں اتنے گم نہیں جتنے پتنگ بازی اور کرکٹ میں۔

کوئی پندرہ سال بعد، پچھلے برس انھیں پتنگ بازی کا پھر سے اُبال آیا۔ گھر میں اعلان کر دیا "اب کے بسنت پر پتنگیں بڑھیں گی۔" بچّے، بڑے سب حیران، یونہی ہانک دی ہے۔ اب اس عمر میں بچّوں والا مشغلہ کیا اختیار کریں گے! مگر بسنت سے ایک دن پہلے چھ چھ "گوٹوں کے دو پنّے" منگوائے گئے۔ درجنوں چھوٹی بڑی پتنگیں ساتھ آئیں۔ رات بھر کنّے باندھتے رہے۔ جس وقت مؤذّن نے اذان دی، انھوں نے منڈیر پر چڑھ کے دیکھا، تو اُس وقت کوئی بھی جیالا پتنگ بڑھاتے ہُوئے نہ تھا۔ خاصا اندھیرا تھا۔ پتنگ بڑھے تو کیسے بڑھے! البتہ کہیں کہیں چھتوں پر ایک ایک دو دو منچلے کھڑے محسوس تو ہُوئے مگر نظر نہ آئے۔

تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے "وہ کاٹا" کا زوردار نعرہ لگایا اور اپنی پتنگ[1] بڑھا دی۔ اوروں کے بھی حوصلے بڑھے۔ انھوں نے بھی جواباً "وہ کاٹا" کا نعرہ لگایا۔ پھر کیا تھا آناً فاناً حریف پیدا کر لیے۔

---

[1] لفظ پتنگ مذکر ہے مگر "لاہور سکول" والے اسے مؤنث ہی لکھنا پسند کریں گے۔

قسمت کے دھنی یہ ہمیشہ سے رہے ہیں۔ ہوا بھی خُوب تیز تھی۔ انھوں نے جس سے پیچ لڑایا، کاٹا۔ جب حریفوں نے دیکھا کہ یہ تو صفایا کر رہے ہیں، تو تین تین چار چار اکٹھے حملہ آور ہُوئے۔ اس میں بھی زیادہ تر میدان انھی کے ہاتھ رہا۔ آس پاس کے محلوں میں دھاک بیٹھ گئی۔ بفضلِ خدا یہ اب اپنے علاقہ میں، دوسرے سال سے، پتنگ بازی میں چیمپئن چلے آ رہے ہیں۔

انھیں لمبے پیچ لڑانے میں مزا آتا ہے۔ "کھچم کھچی" کو یہ قطعاً پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں دشمن کو اپنے جوہر دکھانے کے پُورے موقعے دینے چاہییں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کے اتنے لمبے پیچ جاتے تھے کہ پتنگ نظر ہی نہیں آتی تھی، لڈو کے برابر نظر بھی آئی تو کیا!

ایک لمبے پیچ میں، ان کے ہاتھ، ڈور کی مسلسل رگڑ سے لہولہان ہو گئے۔ سبھی کہتے رہے کہ پتنگ ہمیں دے دیجیے۔ ہاتھوں سے خُون ٹپک رہا ہے مگر انھوں نے ایک نہ سُنی۔ برابر اُف اُف، سی سی کرتے ڈور دیتے رہے۔ کوئی آدھ پون گھنٹے کی جدوجہد کے بعد جب انھوں نے پیچ کاٹا، تب انھوں نے پتنگ اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کی۔ بڑھی ہوئی پتنگ کو جب اتارا جا رہا تھا تو ڈور ان کے خُون سے نہائی ہُوئی تھی۔

کرکٹ کا بھی شوق، انھیں بُرا لگا ہے۔ لاہور سے باہر میچ ہو رہے ہوں تو یہ اپنے دفتر ہی میں ریڈیو لے جائیں گے جب تک میچ ہوتا رہے گا برابر کومنٹری سُنتے رہیں گے۔ ہزاروں کام ہوں کچھ نہیں کریں گے۔ کوئی ملنے والا بھی آئے تو بات ہی نہیں کریں گے۔ باتیں ہوں گی بھی تو کرکٹ ہی کے بارے میں۔

سبھی قابلِ ذکر میچ اُنھوں نے یا تو دیکھے ہوں گے یا سُنے ہوں گے۔ ابھی پاکستان میں آسٹریلیا کے میچ ہُوئے ہیں۔ یہ ریڈیو سے ایک منٹ کے لیے بھی نہ ہٹے۔ کوئی اچھی ہٹ لگائے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ کوئی اچھا گیند پھینکے تو یہ خوش ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ سیٹیاں بھی بجاتے تھے۔ ناچنے سے انھیں ان کی پوزیشن روکتی تھی ورنہ یہ بیقرار اس کے لیے بھی تھے۔

یُوں بھی ہُوا ہے کہ کومنٹری سنتے سنتے ایک دم بے حد خوش ہو گئے۔ زور زور سے سیٹیاں بجانے لگ گئے۔ پُوری قوت سے تالیاں پیٹنے لگے۔ پھر نوکر کو آواز دی: "جلدی سے پانچ روپے کے لڈو لا۔" وجہ پُوچھی گئی تو بتایا "ہارڈے آؤٹ ہو گیا ہے۔"

ان کی صحت یُوں تو کبھی زیادہ اچھی نہیں رہی۔ چھوٹے موٹے بیسیوں عارضے لاحق رہے۔ مگر یہ باضابطہ قسم کے بیمار بہت کم ہوئے۔ مگر صاحب ایک بار ہُوئے، خُوب ہُوئے۔ مزا آ گیا۔ یہ قصہ ۱۹۴۸ء کا ہے کہ بیٹھے بٹھائے بیمار ہو گئے۔ سو کے اُٹھے۔ طبیعت مضمحل پائی۔ چہل قدمی کو نکلے۔ گھر تک واپس پہنچنا مشکل ہو گیا۔ لیٹے تو پھر لیٹ ہی گئے۔

بہتیرے دوا دارُو اور ٹُونے ٹوٹکے ہُوئے۔ مگر طبیعت نہ سنبھلی۔ بگڑتی ہی گئی۔ معاملہ دواؤں سے دُعاؤں

تک پہنچا۔ مگر دونوں ہی علاج بیکار ثابت ہُوئے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے بھی جواب دے دیا۔ جب یہ 'خوشخبری' عام ہُوئی کہ جناب طفیل اب ایک دو دن کے مہمان ہیں تو ان کے قریبی دوست آخری دیدار کو آن پہنچے۔

"ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں اب آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔"

"اب آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔"

"بخار ہلکا ہو گیا ہے۔"

"اِن شآ اللہ کل تک ٹھیک ہو جائیں گے۔"

طفیل صاحب یہ ساری باتیں سُنتے رہے بولنے تک کی ہمّت نہ تھی۔ نقاہت اتنی تھی کہ اگر مُنہ پہ مکّھی بیٹھ جاتی تو ہاتھ اُٹھا کر اُسے ہٹانے کی ہمّت نہ تھی، بس ہڈیوں کا ایک پنجر تھا جو چارپائی پہ بار تھا۔ یہ اپنے دوستوں کو ان کی باتوں کا جواب دینا چاہتے تھے مگر زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ اپنی اس حد تک معذوری پہ ان کے آنسو نکل آئے۔ دوستوں نے آنسو پُوچھے تو اُنہوں نے سنائی نہ دینے والی آواز میں دوستوں کی باتوں کا جو جواب دیا، یہ تھا:

"ڈاکٹروں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے وُہ یہ نہیں ہے جو آپ حضرات کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ مجھے بھی معلوم ہے۔ مگر میں ضرور صحت یاب ہُوں گا۔ آج نہیں تو کل۔ میرا بھی فیصلہ ڈاکٹروں کو سُنا دینا۔"

غیر معمولی قوّتِ ارادی کے بل بوتے پر، یہ موت کے مُنہ سے بھی نکل آئے۔ قوّتِ ارادی کے استحکام ہی نے انہیں زندگی میں آبرومند بنایا ہے۔ ان کے پاس اگر کوئی دولت ہے تو یہی۔ اگر انہیں اپنی کسی بات پہ ناز ہے تو اسی پہ۔

جب موت ان کے سامنے ناچ رہی تھی تو یہ خدا سے مَن ہی مَن میں جو باتیں کرتے تھے، وہ کچھ اس قسم کی تھیں:

"اے اللہ! مَیں تجھ سے درگزر کی التجا کرتا ہُوں، اس لیے نہیں کہ مجھے زندگی عزیز ہے، بلکہ اس لیے کہ میری اُمنگوں اور آرزوؤں کا خُون ہُوا جا رہا ہے۔ میں اس دنیا میں آکر کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ میری موت آج نہیں تو کل واقع ہو جائے گی۔ مگر تُو مجھے ان ولولوں اور ارادوں کی تکمیل کے لیے زندہ رکھ جنھوں نے میرے ذہن سے نکل کر ابھی تک زندگی کی ایک ساعت بھی نہیں گزاری۔"

کئی دنوں کی بات ہے کہ یو، پی کے ایک صاحب ان کے پاس آئے، انہوں نے انہیں بھی یُو، پی کا سمجھ لیا اور لگے پنجابیوں کی بُرائیاں کرنے۔ "پنجابی یہ ہوتے ہیں، پنجابی وُہ ہوتے ہیں، میری ترقیوں میں رُکاوٹ پیدا کر دی۔ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ مجھے ستاتے ہیں۔" یہ چپکے سنتے ہیں۔ جب انہوں نے کہا: پنجابی بڑے حرام زادے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے اپنے نوکر سے کہا:

"صاحب کے لیے چائے لاؤ۔"

چائے کا سُن کر یو، پی والے صاحب سمجھے ہوں گے یہ بھی پنجابیوں کے ہاتھوں ستا ہُوا ہے۔ وہ اور چڑھے۔

پھر تو وُہ ماں بہن کی گالیوں تک آ گئے۔طفیل صاحب نے دوسرے نوکر سے کہا،
"صاحب کے لیے مٹھائی کا بھی انتظام کر دو۔"
چائے آئی، مٹھائی آئی، دونوں نے خوب کھائی اور پی۔ ہنستے بھی رہے، پیار سے باتیں بھی کرتے رہے۔
جب وہ صاحب جانے لگے تو انھوں نے ان سے پُوچھا:
"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"
"یہ پُوچھ کر کیا کیجیے گا؟"
"نہیں، بتائیے!"
"جانے دیجیے۔"
"پھر بھی؟"
"میں پنجابی ہُوں۔"
یہ شکل وصورت کے اعتبار سے بس لونڈے سے ہیں۔ مدیر نقوش ہونے کا مطلب تو یہ تھا ڈپٹی نذیر احمد جیسا جُبّہ پہنا کرتے، سرسید ایسی داڑھی ہوتی، ابوالکلام جیسا رُعب و دبدبہ ہوتا۔ برعکس اس کے یہ سیدھے سادے آدمی کا بچہ ہیں۔ نہ رُعب نہ کچھ۔ ان کی شکل وصورت سے زیادہ ان کے نام کا اثر ہے۔ ایک لطیفہ آپ بھی سُن لیں:
ان کے چھوٹے موٹے کام تعارفی رقعوں سے ہو جایا کرتے ہیں۔ جو کام ہُوا، جس سے ہوا، تعارف ہو یا نہ ہو لکھ کر کہہ دیا، ہوگیا۔ لوگ عزت کرتے ہیں، لحاظ کرتے ہیں۔
ایک دفعہ یہ اپنے ایک کام کے لیے، خود دفتر میں جا نکلے۔ چٹ اُٹھا کر صاحب سے ملے اور بغیر تعارف کے ملے وُہ نہایت رُکھائی سے پیش آئے۔ یہ اپنا تعارف ہی نہیں کرا پائے تھے کہ وُہ صاحب برسے:
"کیا بات ہے؟"
"جی، مجھے آپ سے ایک کام ہے۔"
"کیا کام ہے؟"
"جی، وہ ذرا ———"
"آپ لوگ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے، میرے ہیڈ کلرک سے ملتے، سپرنٹنڈنٹ سے ملتے، میرے اسسٹنٹ سے ملتے۔ سیدھا منہ اُٹھاتے ہیں اور میرے پاس چلے آتے ہیں ———
چپڑاسی! ان صاحب کو کس نے اندر آنے دیا؟"
"جی غلطی ہوگئی۔"
"خبردار، جو آئندہ کوئی یُوں اندر آیا!"

"بہتر جناب!"

ڈرائے کا یہ سین ان کے سامنے اتنی تیزی سے گزرا کہ یہ سٹپٹا گئے۔ گردن لٹکائے اپنے دفتر پہنچے۔ ٹیلیفون اٹھا کر انہی صاحب سے بات کی:

"میں نقوش کے دفتر سے طفیل بول رہا ہوں۔"

"کہیے حضور! مزاج تو اچھے ہیں؟"

"جی ہاں، اللہ کا شکر ہے۔"

"فرمایئے آج کیسے بھول گئے! مدت کے بعد یاد فرمایا۔ کوئی میرے لائق خدمت؟"

"یہ ایک ذرا سا کام ہے۔"

"آپ اپنے چپڑاسی کو چٹ دے کر بھیج دیں، ابھی ہو جائے گا۔"

"بہت اچھا، چپڑاسی کو بھیج رہا ہوں۔"

"دیکھئے کبھی ملاقات کی بھی کوئی صورت نکلنی چاہئے!"

"جی!"

"میں کہتا ہوں، کبھی دفتر آئیے نا!"

"آ آ ـــــ اچ ـــــ اچھا ـــــ!"

ان کی زندگی کے ایک دو خوش کن واقعات یہ ہیں، جن پر انھیں آج بھی خوشی ہوتی ہے۔

ابھی یہ اپنے کاروبار کی ابتدائی اسٹیج پر تھے۔ چند ٹکے بھی ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھے۔ اُن دنوں انھوں نے ایک دکان سے آرٹ پیپر کا ایک رِم خریدا، ایک مزدور کے سر پہ اُٹھوایا۔ دو آنے مزدوری مقرر ہوئی۔ بارش کی وجہ سے بازار کیچڑ سے لت پت تھا۔ آرٹ پیپر بڑا پھسلواں ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ مزدور سے بار بار کہتے تھے:

"دیکھو بھئی! احتیاط سے چلو۔ کاغذ کو مضبوطی سے پکڑو۔ گر گیا تو پچاس روپے کا رِم تباہ ہو جائے گا۔"

یہ فقرہ انھوں نے ایک بار نہیں، تین چار بار دہرایا۔ کرنا خدا کا یہ ہُوا کہ وہ رِم سر سے پھسل کر زمین پر گر ہی گیا اور کیچڑ میں نہا گیا۔ مزدور کانپنے لگا۔ یہ چپ رہے۔ مزدور نے کاغذ سمیٹا۔ ساتھ چل دیا۔ دفتر پہنچ کر اس نے کاغذ ایک کونے میں رکھ دیا اور خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا۔

انھوں نے جیب سے چار اکنیاں نکالیں اور مزدور کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ مزدور شرمندہ ہو کر بولا:

"آپ سے دو آنے طے ہوئے تھے۔"

"دو آنے اس صورت میں تھے جب تم کاغذ کو صحیح سالم لے آتے۔"

"جی!"

"اب قبر چوپی رکھو۔"

ابھی پانچ چھ ماہ کی بات ہے کہ یہ سائیکل پر سوار صبح سویرے ہی والدہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جا رہے تھے کہ اسمبلی ہال کے پاس انھیں ایک اپاہج لڑکا ملا، جو چلنے سے بالکل ہی معذور تھا۔ اس نے التجا کے انداز میں ان سے کہا:

"مجھے سائیکل پر بٹھا کر گنگا رام ہسپتال تک لے جائیں۔"

انھیں جلدی تھی، گزر گئے۔ مگر لڑکے کی خواہش ان کا برابر تعاقب کرتی رہی۔ یہ قبرستان کے قریب پہنچ گئے ہوں گے مگر لڑکے کی بات ذہن سے نہیں اُتری تھی۔ ذہن سے اُترتی تو کیا، پریشانی بڑھنے لگی۔ چنانچہ یہ اُلٹے پاؤں پلٹے۔ لڑکے کو سائیکل پر بٹھایا۔ خود پیدل چل کر اسے ہسپتال پہنچایا۔ لڑکا کہتا رہا: "سائیکل پر سوار ہو جائیں آپ کو جلدی ہوگی"۔ یہ جواب دیتے: "نہیں، پیدل چلنے میں لُطف آ رہا ہے"۔

جب لڑکا منزلِ مقصود پر پہنچ گیا تو انھوں نے اس سے معافی مانگی: "میں جلدی میں تمھارا اس لئے اپنے فرض سے غافل ہو گیا تھا"۔

ایسی ہی "بیوقوفی" کی ایک بات اور بھی سُن لیں:

ایک دن یہ صبح سویرے ہی اپنے دفتر میں اس لیے آکر بیٹھے کہ ایک ضروری کام کو نپٹا لیا جائے۔ خوب گرمیوں کے دن تھے۔ پنکھا کھولا۔ کاغذ، قلم، دوات لے کر بیٹھے۔ خوب مُوڈ میں تھے۔ اتنے میں ٹھک سے پنکھے کے ساتھ کوئی چیز لگی۔ یہ اُٹھے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ معلوم ہُوا کہ ایک چڑیا پنکھے سے ٹکرا کر گر پڑی ہے۔ فوراً لپکے، چڑیا کو اٹھایا جو اُدھ موئی ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں کی گرم آغوش میں لیا اور پانی پانی کا وہ شور مچایا، جیسے پانی کے بغیر یہ خود ہی مرے جا رہے ہوں۔ چڑیا نے پانی پیا تو وہ "سر کنے" لگی۔ مگر اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ وہ جان سے تو نہ گئی مگر داغی ہو گئی تھی۔ انھوں نے اُسے اونچی جگہ پر بٹھا دیا مگر خود سارا دن کوئی کام نہ کر سکے۔ وہ ضروری کام بھی ہاتھ پھیلا کر رہ گیا۔

یہ عموماً بڑی بڑی باتوں کو پی جاتے ہیں۔ بعض اوقات یُونہی اکڑ بھی جاتے ہیں۔ یہ سمجھا اس وقت کہتے ہیں جب ان کی نیت پر حملہ کیا جائے۔ ورنہ بڑی سے بڑی بات ہُوئی اور گئی۔

پطرس نمبر کے سلسلے میں، انھوں نے کئی ایک لکھنے والوں کو خط لکھے، ان میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے پنسلین کے انجکشن لگانے والے ڈاکٹر نہیں ادب کے ڈاکٹر، بڑا رعب اور طنطنہ ہے ان کا۔ سبھی ان کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جوجی میں آئے کہتے رہتے ہیں۔ کوئی بولتا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے طفیل صاحب کے جواب میں لکھا:

طفیل صاحب قبلہ !

یہ آپ نے مرے ہُوئے آدمیوں کو بیچنے کا کیا ڈھنگ نکالا ہے۔ نہ بھائی! یہ بات اچھی نہیں۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ لوگ (یعنی اردو کے رسالوں والے) اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مرے اور اس کا نمبر نکالیں، خواہ جیتے جی اس کی طرف مُڑ کے بھی کسی نے نہ دیکھا ہو۔ بخاری میرا دوست تھا اور میں اس کے لیے بہت کچھ لکھنا چاہتا ہُوں۔ لیکن ابھی اس مُوڈ میں نہیں ہوں اور کم از کم مُردہ نمبر کے لیے میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ مُردہ نمبروں نے مجھے اس قدر حراساں کیا ہے کہ میں نے اپنی وصیت میں لکھ دیا ہُوا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کسی کو میرا مردہ نمبر شائع نہ کرنے دیا جائے کیونکہ مجھے اب یہ بالکل واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ کوئی منافع خور ضرور میرے "نام زندہ" کو "مردہ فروشی" کے بہانے بیچ کر پیسے بنائے گا اور مجھے یہ ضد ہے کہ اردو کی خدمت کرنے والے یہ کام نہ کریں۔

جس وقت انھیں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط ملا تو انھوں نے اپنے اُوپر ہزار لعنتیں بھیجیں کہ اور نکال شخصی نوعیت کے نمبر۔ یہ اہلِ قلم سے اپنی عقیدت کے اظہار میں نمبر نکالتے ہیں لوگ اسے منافع خوری کا ایک حیلہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے زخمی چیتے کی طرح ان پر جوابی حملہ کیا :

برادرم، سلام مسنون !

آپ کے خط میں اگر صرف یہی لکھا ہوتا کہ میں مضمون نہیں لکھ سکتا تو شاید میں چُپ ہو جاتا مگر اب تو جواب عرض کرنا ضروری ہو گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اور آپ کے مرنے پر کوئی بھی رسالہ نمبر نہیں نکالے گا۔ بلکہ شاید لوگ یہ کہیں، چلو اچھا ہُوا کہ مرا۔ البتہ ہمارے گھر والے ہمیں روئیں گے اس لیے کہ ہماری ذات سے ان کا مفاد وابستہ ہو گا۔ میری یہ بات شاید اب دل لگی کا درجہ رکھے۔ مگر مجھے اس کے سچ ہونے پر سو فیصد یقین ہے۔ کسی کے لیے آپ روڑا ہیں، کسی کے لیے میں! میدان البتہ الگ الگ ہیں!

"مردہ نمبر" کی ترکیب مجھے پسند آئی۔ غالباً آپ یہ چاہتے ہیں کہ حفیظ جالندھری کی طرح زندگی ہی میں ہر اہم شخصیت کا جلوس نکال دیا جائے۔ اگر کسی کا جلوس اس کی زندگی میں نہ نکلے تو پھر بعد میں بھی نہ نکلے، میں اس کا قائل نہیں ہُوں۔ اگر کوئی ادیب اس دُنیا سے چلا جاتا ہے تو باقیوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اُسے خراجِ عقیدت پیش کریں۔ اس کی کئی صُورتیں ہو سکتی ہیں جن میں ایک یہ بھی کہ مرحوم کے بارے میں رسائل نمبر نکالیں۔

ہ ہراساں

دیکھیے نقوش اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بڑی شخصیتوں کی آڑ لے کر اُبھرے۔ بلکہ اللہ کے فضل سے اس نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ وُہ اگر کسی نمبر نہیں نکالے گا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے منٹو نمبر نکالا تھا اور یہ سمجھ کے نکالا تھا کہ منٹو ایک بڑا تیکھا آرٹسٹ تھا' اسے خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہیے۔ مگر اس پر بعض نستعلیق قسم کے لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ نقوش کا یہ مقام نہ تھا۔ پھر اس کا دوسرا پہلو بھی لیجئے۔ منٹو نمبر کا پہلا ایڈیشن آج بھی بازار میں ملتا ہے مگر میرے دوسرے نمبروں کے تین تین چار چار ایڈیشن چھپے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میری یہ کوششیں صرف مالی منفعت کے باعث نہیں بلکہ ایک ادیب سے عقیدت کا اظہار ہیں۔

معاف کیجئے گا۔ میں نے اکثر یہ اندازہ لگایا کہ آپ اچھی باتوں کے بُرے پہلوؤں پر ہی سوچتے رہتے ہیں۔ یہ آپ کی خوبی بھی ہے اور خرابی بھی ——— پلڑا کون سا بھاری ہے؟ اس کا اب کون فیصلہ کرے؟

اُمید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ آپ نے "پیاری باتیں" لکھیں، میں نے پیاری باتیں سنائیں۔ والسلام

اب چونکہ بہ سلسلۂ نقوش منافع خوری کی بات چل نکلی ہے تو طفیل صاحب کا ایک خط اور بھی پڑھ لیں جو انھوں نے اپنے ایک دوسرے دوست (اختر انصاری) کو لکھا تھا:

برادرم، سلام مسنون!

آپ کی شکایت بالکل بجا ہے کہ آپ کی تمام تر تخلیقات کا انتخاب اب تک چھپ جانا چاہیے تھا یہ شکایت نہ صرف سو فی صد حق بجانب ہے بلکہ حساب کی رُو سے اگر دو سو فی صد بھی درست ہو سکتی تو بھی ٹھیک تھا۔ تو بھی غلط نہ ہوتا۔

مگر یار، کیا بتاؤں! یہ جو نقوش کی بیماری میری جان کو لگی ہے اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میرا لاکھوں کا ادارہ چوپٹ ہو گیا ہے نہ کوئی نئی کتاب چھپتی ہے نہ کسی پُرانی کتاب کا نیا ایڈیشن آتا ہے۔ پریس بھی میری بے توجہی کا بُری طرح شکار ہے۔ خود بڑا پریشان ہُوں، کئی بار اپنے اوپر غصہ آتا ہے (ادارہ اور پریس کی حالت دیکھ کر) جی چاہتا ہے یا تو خودکشی کر لُوں یا نقوش کو بند کر دوں تاکہ میں باقاعدہ قسم کا آدمی بن جاؤں اور وُہ سب کچھ کر دں جو میرے لیے دُنیاوی اعتبار سے زیادہ سُود مند ہو — یہ خیال کرتا ہُوں تو نقوش محبوبیت کی تمام تر تڑپا دینے والی اداؤں کے ساتھ میرے عزائم پر برف بن کر گر جاتا ہے اور میں ایک زخم خوردہ عاشق کی طرح، اس پر واری نثاری ہو جاتا ہُوں، بہک جاتا ہوں' ہار جاتا ہُوں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے نقوش میں مالی اعتبار سے نقصان ہوتا ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہُوں کہ مجھے نقوش کے حُسن و جمال میں مزید تابانی پیدا کرنے کے لیے اتنا کچھ کرنا پڑتا ہے کہ باقی کے سارے کام ٹھپ ہوگئے ہیں۔ دیکھا جاتے تو بحیثیت مجموعی یہ سودا مہنگا پڑ رہا ہے۔ میرے عشق نے جو میری حالت بنا رکھی ہے وہ سب کچھ آپ سے کہہ دی ہے۔ اسی وجہ سے میں آپ کی کتاب کی جلد تر اشاعت سے مجبور رہا۔ والسلام

ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ طفیل صاحب بڑے نفاست پسند ہیں۔ اس کا اقرار اوروں نے بھی کیا ہے۔ مگر میں آپ کو ان کی نفاست پسندی اور کاہلی کا حال ایک ساتھ ہی سنا دوں۔

جس دن ان کے قلم کی نب خراب ہو، سیاہی اچھی نہ ہو، یہ کسی کو خط ہی نہیں لکھیں گے خواہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ پھر جس دن یہ سب چیزیں اچھی ہوں گی یہ خط پہ خط لکھتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ بلا وجہ بھی خط لکھتے رہیں گے۔ جس دن انھیں خط لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو یہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ خط لکھ ڈالیں گے۔

ان کی میز مسودات، ضروری اور غیر ضروری کاغذات سے پٹی رہتی ہے۔ ان کے ارد گرد بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اگر ایک بڑے سے لفافے میں ضروری خطوط اور مسودے پڑے ہیں تو دوسرے لفافے میں بھی، غرض بیسیوں لفافوں میں، اگر کسی چیز کی انھیں ضرورت پڑ جائے تو ضروری نہیں وہ اسی دن مل جائے۔

کبھی کبھی ان کا "چپڑاسی"، میز کی یہ حالت دیکھ کر، سارے لفافوں کو ایک جگہ باندھ کر کسی دُوسری جگہ رکھ دیتا ہے۔ وہ بھی کیا کرے وُہ برداشت نہیں کرتا کہ میز کو مال گودام بنتا دیکھے۔ مگر یہ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ ہر کاغذ کو قیمتی سمجھ کر اپنے سے دُور کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ہر کاغذ کو غیر ضروری سمجھ کر ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی قیمتی مسودے بھی وقتی طور پر گم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ انھیں ہفتوں اور مہینوں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ پسند نہیں کہ کوئی کام آسانی سے ہو جائے۔ یہ ہر آسان کام میں خود دشواریاں پیدا کر کے پھر سے اُسے آسان بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

ایک دن ایک صاحب انھیں اپنی غزل دے گئے۔ انھوں نے رکھ لی۔ دوسرے تیسرے دن وہ صاحب تشریف لائے اور پوچھا:

"میری غزل چھپے گی؟"

"نہیں۔"

"اچھا پھر مجھے واپس کر دیجئے۔"

"پتا نہیں اب کہاں ہے!"

"یہیں میز پر ہوگی، ڈھونڈ دیجئے۔"

"بھئی نہیں ملے گی۔"

"مل جائے گی۔"

"جناب میری میز پہ اگر ہاتھی بھی گم ہو جائے تو وہ بھی ایک دن میں تو نہیں مل سکتا۔"

طفیل صاحب تصور کے بے حد قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ یہ ہر کام کے لیے اَن تھک کوشش کرتے ہیں۔ کام ہو جاتا ہے تو شکر گزار ہو جاتے ہیں۔ نہ ہو جب بھی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہو گیا۔

کسی دوست نے انھیں ورغلایا کہ حکومتِ وقت کو اپنے کارناموں سے مطلع کرو، وہ تمہارے کام کے بدلے اور کچھ نہیں تو ایک آدھ توصیفی جملہ تو بھیج ہی دے گی۔ یہ بڑے خوش، سارے نمبروں کا ایک بڑا سا پلندا بنا کر بھیج دیا۔ اور اب اُس تاریخ کا انتظار کرنے لگے جس دن حکومت اعلان کرتی ہے کہ فلاں کو یہ تمغا دیا، فلاں کو یہ خطاب — چنانچہ صاحب! وہ تاریخ بھی آئی جس دن یہ کام ہوتا ہے۔ اب یہ بار بار ناموں کو پڑھتے ہیں مگر اُن میں اِن کا نام نظر نہ آیا۔ بڑے آزردہ ہوئے مگر مایوس نہیں۔ فوراً تصور کی دنیا میں چلے آئے اور یہ سمجھ لیا کہ مجھے حکومت نے سب سے بڑا ادبی اعزاز دے دیا ہے۔ اب کوئی لاکھ کہے کہ میاں، تمھیں تو کسی نے منہ لگایا ہی نہیں۔ مگر یہ کسی کی کب سُنتے ہیں۔ اپنی موج میں رہتے ہیں۔ اپنے تصورات کی دُنیا میں بستے ہیں جو ان کی کلفتوں اور آزردگیوں کا واحد سہارا ہے۔

یہ کبھی کبھی یُوں بھی سوچتے ہیں:

"بہ فرضِ محال میں آج مر جاؤں تو کیا ہو۔ بہت سے لوگ تو خوش ہوں گے۔ کچھ خدا ترس قسم کے لوگ (میری تمام تر نالائقیوں کے باوجود) شاید یہ کہیں کہ اچھا ہی آدمی تھا۔ جن کو ادب سے شغف ہو گا وہ ممکن ہے یہ کہیں انھوں نے اپنے زمانے میں اچھے اچھے نمبر نکالے —— اور بس —— غور کیجئے میرے بعد، میری زندگی کا حاصل یہی ایک فقرہ ہو گا —— صرف اسی ایک فقرے کے لیے میں نے کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے؟ دُنیا تیاگ دی ہے۔ مجھے زندگی کی دلکشیوں اور مسرتوں سے واسطہ نہیں رہا۔ دن رات کام کرتا ہُوں، دن رات مرتا ہوں —— دن رات مرتا ہوں، دن رات کام کرتا ہُوں۔

یار دوستوں سے ملنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بچّوں کی دیکھ بھال کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ بیوی سے ہنسنا بولنا میرے مقدر میں نہیں۔ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر —— صرف ایک فقرے کے لیے۔

اگر میں عین جوانی میں مر گیا، جس کے بڑے امکانات ہیں تو میرے بچّوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے والا بھی کوئی نہ ہو گا اور میرے بچّے اس فقرے کو چاٹا کریں گے: "ہمارے ابّا نے بڑے بڑے اچھے نمبر نکالے تھے۔"

بہر حال ان کے بعد، جو کچھ بھی ہو، انھوں نے اپنی زندگی صرف اسی ایک فقرے کے لیے ضائع کر دی ہے ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں   اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

نیاز صاحب[۱]

فرمان صاحب آپ بھی فتح پور کے رہنے والے ہیں۔ وہی بات ہوگئی ناکہ یک نہ شد دو شد !

جب آپ کا پہلا خط آیا تھا اگر میں کچھ بھی نیاز صاحب پر لکھ سکتا تو اسی وقت لکھ بھیجتا۔ یاددہانیوں کی نوبت نہ آتی۔ مگر میں کیا کروں۔ نیاز صاحب کے بارے میں میری معلومات ناقص نہ سہی، محدود ضرور ہیں۔ اتنی مختصر یادوں کے سہارے مجھ سے اتنی بڑی شخصیت کا "جھٹکا" نہ کرائیں۔

میرا کوئی عذر بھی تو کسی کام نہ آیا۔ آپ نے مطلوبہ کتابیں تک بھجوا دیں۔ اب سوائے اس کے کہ کچھ زیادتی میں بھی نیاز صاحب کے ساتھ کروں اور کیا چارۂ کار باقی رہا۔ سارا گناہ ثواب آپ کی گردن پر۔

میں نقاد نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں ڈنڈی مار دوں۔ میرا موضوع شخصیتوں کا مطالعہ ہے جس میں جھوٹ نہیں چلتا بلکہ کنواری لڑکیوں کی طرح اپنی لاجوں آپ مرنا پڑتا ہے۔

بھائی! میں نیاز صاحب کی تحریر کا تو عاشق ہوں مگر شخصیت کا نہیں، بالکل نہیں۔ اس لیے اب بھی سوچ لیجیے کہ مجھ سے کچھ لکھوانا مناسب بھی ہوگا یا نہیں! پھر میرا عجز یہ بھی ہے کہ مجھے لفظی پینترے بازی آتی نہیں، بھاتی بھی نہیں۔ اس لیے دو ٹوک انداز میں یہی کہنا پڑے گا کہ شخصی اعتبار سے نیاز صاحب ایسے اور بھی بہت سے لوگ مل جائیں گے مگر نیاز بہ حیثیت ادیب نیاز ہی ہیں —— حریف کوئی نہیں۔

ہاں صاحب یاد آیا۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر ایمان رکھتا ہوں کہ یہ تھوڑی بہت انفرادیت کے ساتھ اپنی جگہ بڑی دلچسپ اور ہنگامہ آفریں شخصیت کے مالک ہیں۔

۲

میں نے نیاز صاحب کا نام اُس وقت سُنا تھا جب خود بچّہ تھا۔ مگر آج مجھے باتیں کرنی پڑیں گی ایک بُوڑھے بچّے کے بارے میں۔ لوگ بوڑھے اور بچّے کو ایک برابر سمجھتے ہیں۔ مگر نیاز ایسے بوڑھوں میں نہیں جنہیں بچّہ کہا جا سکے۔ کُلیہ غلط ہوگیا۔

---

[۱] یہ مضمون "نگار" کے نیاز نمبر کے لیے لکھا گیا تھا جس کا مطالبہ فرمان فتح پوری صاحب کی طرف سے تھا۔

بچپن ہی میں یہ سُنا تھا کہ لکھنؤ میں ایک کافر نیاز نامی ہے جو ایسی باتیں لکھتا ہے جو اسلام کا بدترین دشمن بھی نہیں لکھ سکتا۔ اس وقت ان کے خلاف جلسے ہوتے تھے، تقریریں ہوتی تھیں، ایک ہنگامہ بپا تھا۔ مولانا سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی نیاز صاحب کو کافر اور ملحد قرار دے رہے تھے۔ کیا خبر تھی کہ جب اُسی کافر اور ملحد سے ملاقات ہو گی تو وہ کئی عابدوں سے بہتر انسان ثابت ہوگا۔

میری کوئی شامت تھوڑی آئی ہے جو میں یہ کہوں کہ علمأ بلا وجہ ہی برہم تھے۔ بات یہ ہے کہ نیاز صاحب کی شرارت آمیز باتوں نے جو انہیں گرمایا تو وہ آپے میں نہ رہے۔ دوسرے ہمارے علماءِ مذہب کے معاملے میں عقل کو دخل دینے بھی تو نہیں دیتے۔ بس اتنی سی غلطی تھی جو نیاز صاحب سے ہُوئی۔ چونکہ شرارت اور اُپج سے نیاز صاحب کا خمیر اُٹھا ہے اس لیے بے مہار بھی چلے:

> ایک طرف یہ کہتے ہو کہ اسلام نے بُت پرستی کو مٹایا اور دوسری طرف اسی میں مبتلا ہو۔ بُت خواہ وہ خدا ہی کا کیوں نہ ہو بُت ہے اور توڑے جانے کے قابل ——— اور خدا خواہ وُہ کوئی بُت ہی کیوں نہ ہو قابلِ پرستش ہے۔ اگر تم اس نازک فرق کو نہیں سمجھ سکتے تو جاؤ اُٹھو وضو کر کے نماز پڑھو۔ تمہارا بُت تم سے خفا نہ ہو جائے ——— میں بھی جاتا ہُوں، آئینہ سامنے رکھ کر اپنے خدا کو پُوجوں گا۔[1]
>
> مذہب نام ہے صرف کورانہ اور جاہلانہ انقیاد و اطاعت کا۔ اس لیے اس کا وجود، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری، مفید ہو یا غیر مفید، صرف اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ وہ اسی طرح جہل و لاعلمی کی دُنیا میں رہے۔ علم کے میدان میں اس کی تگ و دَو حد درجہ نامعقول جسارت ہے کیونکہ یہیں آ کر سب سے پہلے اس کے پاستے لنگ کا حال لوگوں پہ کُھلتا ہے اور وہ مضحکہ خیز چیز بن جاتا ہے۔[2]

مثالیں اور بھی بہت سی دی جا سکتی ہیں مگر چھوڑیے ——— میں خود اپنے آپ کو کچھ معتبر قسم کا مسلمان نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود، مجھے بھی تو نیاز صاحب کافر ہی سے نظر آتے ہیں۔ واضح رہے کہ کافر ہونا اور کافر نظر آنا دونوں مختلف صُورتیں ہیں۔

کفر و اسلام کی اُس جنگ کے بعد، جس میں سرد فریق نیاز اور گرم فریق علمأ تھے۔ اُنھوں نے ایک اور محاذ کھول دیا، شیعہ اور سُنّیوں کے درمیان مسئلۂ خلافت کا۔ نچلا بیٹھنا ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ اس بحث کا آغاز "ہر نام" سے ہوتا ہے جو قرآن اور حدیث کے حوالوں سے باتیں کرتے ہُوتے نہیں تھکتے اور حوالے دیتے ہیں اُن کتابوں کے

---

[1] سالنامہ نگار۔ جنوری ۱۹۶۰ء

[2] من و یزداں حصّہ دوم ص ۳۹۳

جن میں تقریب التہذیب، استیعاب، اسد الغابہ، تاریخ کبیر، تاریخ کامل، تاریخ ابو الفدا، لباب التاویل، معالم التنزیل، مواہب اللدنیہ، تاریخ خمیس، صواعق محرقہ، خصائص، ریاض النضرہ، طبقاتِ کُبریٰ، تاریخ الخلفاء، مدارج النبوۃ، جامع البیان، تفسیر کبیر، موطا، سیرۃ ابن ہشام، روض الانف وغیرہ ہیں۔ یہ ساری کتابیں رجال، سیر، تاریخ اور تفسیر کی مشہور کتابیں ہیں۔ اس سے پہلے میں نے ان میں سے چند ہی کے نام سُنے تھے چہ جائیکہ پڑھا ہو، جانچا ہو۔ مگر حیرت ہے ایک غیر مسلم پر، جو نہ صرف ان کتابوں کو پڑھتا ہے بلکہ ان میں ڈوب کر اپنے مطلب کے حوالے بھی نکال لاتا ہے۔ جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے وُہ تو یہ ہے کہ ہر نام کے پردے میں خود نیاز صاحب ہی ہوں گے۔ اس لیے کہ بی جمالو والا کام یہ خُوب جانتے ہیں۔

رُبع صدی سے پہلے ہی کا یہ بھی ذکر ہے کہ اُنھوں نے ایک شوشہ خط کی صورت میں چھوڑا، جس میں تمام علماء سے یہ پُوچھا کہ ایک مسلمان جو فاسق و فاجر ہے اور ہر لحاظ سے بُرا انسان ہے اور اس کے برعکس ایک غیر مسلم جو ہر طرح سے بہتر انسان ہے اور دُنیا کی کوئی بُرائی اس میں نہیں ——— ان دونوں میں سے جنّت کا حق دار کون ہو گا؟

بہت سے علماء نے اپنی رائے گول مول سی دی۔ کُچھ نے کنی کترائی۔ بہتوں نے یہ لکھا کہ مسلمان ہی جنت کا حقدار ہو گا، خواہ وُہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو ——— جواب میں انھوں نے بڑے تند و تیز مضامین لکھے۔ خوب "ہلّا گلّا" ہُوا۔ ان کے کہنے کا جو کچھ بھی لُبِ لباب تھا، وُہ یہ کچھ تھا:

"آپ لاکھ سمجھائیں یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئے گی کہ خدا صرف مسلمانوں کا ہے اور سوا ان کے سب کو جہنّم میں پھینک دے گا۔ ظہورِ اسلام سے لے کر اس وقت تک زیادہ سے زیادہ دو چار ارب مسلمان پیدا ہُوئے ہوں گے اور ان کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ اور مذاہب کے لوگ۔ پھر کیا کوئی ذی عقل باور کر سکتا ہے کہ خدا ایک کو جنّت دے اور ہزار کو دوزخ میں جلائے۔ اس کو اتنے جہنمی پیدا کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی اور اتنی مخلوق کو جن میں نہ جانے کتنی حسین عورتیں ہوں گی آگ میں ڈال کر تڑپانے سے خدا کی کون سی مسرت وابستہ ہے!

آپ کے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اس کی مرضی! اور میرے پاس بھی اس کے خلاف ایک ہی احتجاج ہے ؎

یا رب زسیلِ حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بُت خانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

ابھی کوئی سال سوا سال ہوا ہو گا اُنھوں نے ایک اشغلہ اور چھوڑا کہ احمدی ہی اصل میں مسلمان ہیں باقی سب نام کے مسلمان ہیں۔ نیاز صاحب خود نیاز محمد خان تو ہیں مگر مسلمان کچھ ایسے ویسے ہی نظر آتے ہیں۔ جب معاملہ یُوں ہو تو پھر انھیں کیوں رہ رہ کر اسلام اور مذہب کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ بات یُوں ذہن میں آوے ہے کہ

نہ تو انھیں روایتی قسم کے اسلام سے کوئی دلچسپی ہے، نہ شیعوں سے، نہ سُنّیوں سے اور نہ غریب احمدیوں سے۔ یہ تو کوئی نہ کوئی اچنبھے کی ایسی بات کرنی چاہتے ہیں جس سے لوگوں کے کان کھڑے ہوں —— اور انھیں اپنی علمیت کے جوہر دکھانے کا موقع ملے۔ یہ تو صرف اپنی قابلیت اور علمیّت کی وجہ سے سب کو نالائق ثابت کرنا چاہتے ہیں —— انا بھی کیا بُری بلا ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے نیاز صاحب اندر سے بڑے مذہبی آدمی ہیں۔ اُنھوں نے اب تک مذہب کے بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا اُس میں صرف جھوٹی مذہبیت کو جھنجھوڑا۔ بنے ہوئے خدائی فوجداروں کے مذہبی پندار کو آئینہ دکھایا۔ نیاز صاحب کوئی کافر وافر نہیں ہیں بلکہ معاملہ صرف اتنا نظر آتا ہے کہ ؏

کافر ہُوا میں دین کے آداب دیکھ کر

بہرحال یہ چھیڑ چھاڑ انھیں بڑی مہنگی پڑی۔ ساری خدائی ایک طرف تھی اور یہ اکیلے ایک طرف، اپنی عقل اور علم کا عَلَم لیے۔ مولویوں سے بغاوت، رسولؐ سے بغاوت کے نام سے تعبیر ہُوئی اور پھر بات خدا سے بغاوت تک پہنچا دی گئی۔

یہ جو مذہب دشمن بنے، وُہ صرف خدا کے نمائندوں سے بدظن ہو کر۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے مولویوں کے خلاف "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" قسم کے تقدس توڑ افسانے لکھے۔ ضد میں آکر اعتدال کی حدود یہ بھی پھاند گئے اور ہمارے علمأ بھی۔ حالانکہ ضرورت تھی کہ ذرا پچکار کے اس "مسلمان کو کافر بنا لیا جاتا"۔ اس ذہنی ورزش کا اور کوئی فائدہ ہوا کہ نہیں مگر حقیقی نیاز ضرور سامنے آگیا اور اس کے ساتھ عقل کو بھی مذہب کے معاملات میں ساتھ رکھ لینے کی بنیاد پڑی۔

میں نے جو کہا ہے کہ نیاز صاحب اندر سے مذہبی آدمی ہیں تو اس کی کُچھ وجوہ بھی ہیں۔ ابھی ایک کتاب "خلافتِ معاویہ ویزید" نکلی۔ بہت سے نامور علمأ نے اس کی بڑی تعریف کی، حالانکہ اس میں بڑی اُوٹ پٹانگ باتیں درج ہیں اُس میں یزید کو خلیفہ برحق کہا گیا ہے ایسے کہ جیسے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ تھے۔ پھر یزید کو امیرالمؤمنین علیہ السلام اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھ کر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلا گیا۔ مطلب یہ کہ سخت دل آزار قسم کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق ایسے ادیب اور مولانا عبدالماجد ایسے عالم نے بھی اس کتاب کی تعریف کی، مگر نیاز نے جو کافر ہیں بڑا سخت ریویو لکھا اور اس کے مندرجات کو مطعون گردانا۔

مجھے یا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان کہیں جب کہ آج تک یہی پتا نہ چلا ہو کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں احمدی ایجی ٹیشن کے خلاف جو انکوائری کمیٹی بیٹھی تھی اس نے تمام علمأ سے سوال کیا تھا کہ پہلے یہ بتائیے کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ وہاں مختلف عقاید کے علمأ جمع تھے۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے، اس لیے کہ مسلمانوں میں بھی تو کئی عقیدوں کے لوگ ہیں، جیسے شیعی، خارجی، معتزلی، وہابی، احمدی، بہائی، نیچری وغیرہ۔ ہمارا مولوی تو دوسرے عقیدے والے کو جھٹ سے کافر کہہ دیتا ہے۔ مسلمان ہوتے

ہوئے بھی ہم، مولویوں کی نظر میں مسلمان نہیں ہیں۔ دیکھا جائے تو مختلف عقیدے رکھنے والے بھی سارے کے سارے مسلمان ہیں اس لیے کہ جو خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہے وُہ کافر کیسے ہو جاتا ہے!

اگر کوئی رسولؐ کی عظمت کے بارے میں اور اسلام کی برتری کے بارے میں نیاز صاحب کی تحریروں میں ڈھونڈنا چاہے تو وہ قطعاً مایوس نہ ہوگا۔ مگر کتنے ہیں جنہوں نے نیاز صاحب کے اس پہلو پر غور کیا ہوگا۔ ایک آدھ شہادت کے بعد، میں اس باب کو نہ چھیڑوں گا۔ اس لیے کہ میں کوئی "مفتیٔ وقت" ہوں کہ کسی کو مسلمان ہونے کے اور کسی کو مسلمان نہ ہونے کے پرمٹ بانٹتا پھروں ——— نیاز صاحب اپنے عقائد کے بارے میں خود کہتے ہیں:

"غضب خدا کا۔ میں سو بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و جبروت اور اس کی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ رسولؐ کی صداقت و بلندیٔ فطرت پر جس طرح ایمان میں لایا ہوں شاید ہی کوئی ایمان لایا ہو۔ لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں، ملحد ہوں، مرتد ہوں۔ پھر اگر اس اقرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے تو ع

نازم بہ کفر خویش کہ بہ ایمان برابر ست[1]

نیاز صاحب کے عقائد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کے معاملے میں سرسید کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ سرسید بھی اپنے وقت میں کافر اور ملحد تھے ۔ یہ بھی ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کا جُرم یہ ہے کہ انہوں نے مذہب کو عقلی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی۔ آج لاکھوں کروڑوں مسلمان ہیں مگر اُن میں کوئی سرسید نظر نہیں آتا۔ اسی طرح کل بھی لاکھوں کروڑوں مسلمان ہوں گے مگر اُن میں کوئی نیاز نہ ہوگا۔

۳

نیاز صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی۔ اُس وقت کی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں سوائے اس کے کہ میں انہیں ایک بڑا ادیب سمجھ کر ان سے ملنے چلا گیا تھا۔ دوبارہ ۱۹۴۶ء میں ملا تھا۔ دوران گفتگو کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی چلا۔ نیاز صاحب نے اس وقت تک زیادہ تر اپنی کتابیں خود ہی چھاپی تھیں۔ میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ اپنی کوئی کتاب، کسی دوسرے ادارے کو نہ دیں گے پُوچھ لیا "اگر آپ اپنی دو چار کتابیں ادارہ فروغِ اردو کو بھی چھاپنے کے لیے دیں تو کرم ہو"۔ خلافِ توقع انہوں نے بہت اچھا کہہ دیا۔ میں نے بھی موقع کی نزاکت اور اُن کی وقتی شرافت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دریافت کیا:

"آپ کے پاس کیا کچھ اشاعت کے لیے موجود ہے؟"

---

[1] من و یزداں ص ۸۹

اس کے جواب میں انہوں نے میرے سامنے ایک رجسٹر رکھ دیا جس میں ان کے تمام مضامین کی فہرست تھی جو نگار میں تو چھپ چکے تھے مگر کتابی صورت میں نہیں آئے تھے۔ وہ کوئی دو سو کے قریب مضامین تھے ان میں سے کچھ میرے پڑھے ہوئے تھے، کچھ کے معیار اور ان کی اہمیت کا اندازہ ان کے موضوعات سے لگایا، پچیس تیس مضامین پر نشان لگا دیے کہ یہ مضامین دے دیے جائیں۔ انھوں نے نشان زدہ مضامین دیکھ کر ہامی بھر لی۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ معاوضہ طے ہُوا۔

نقول کے بعد جب وہ مضامین میرے پاس پہنچے تو اُن میں ایک مضمون بھی وُہ نہ تھا جن پر میں نے نشان لگائے تھے یا جو ہمیں مطلوب تھے۔ مجھے بڑا غصہ آیا، شکایت کا خط لکھا۔ انہوں نے خوش کرنے کے لیے مجھے چند مضامین اور بطور رشوت بھیجے ——— بہرحال میں اپنے ادارہ کی طرف سے اصلی نیاز کو پیش نہ کر سکا۔ بعد میں وہ مضامین من و یزداں (حصہ اول) کے نام سے خود نیاز صاحب نے چھاپے۔

یہ وہی مضامین تھے جن پر ایک زمانے میں ہنگامہ بپا تھا اور "دین کا سچّا درد رکھنے والے" نیاز صاحب کو قتل کر دینے کی فکر میں تھے (میں نے ایسے مضامین کی اشاعت کے بارے میں کیوں سوچا تھا۔ یہ مسئلہ آج بھی میرے لیے غور طلب ہے۔ مگر یہ مسئلہ غور طلب نہیں کہ میں اگر نیاز صاحب کی ذہانت اور ان کی تحریر کا قائل ہُوا تھا تو انہی مضامین سے، عقل اور تحریر کا اتنا بانکپن، یکجا کم ہی کبھی ہوا ہو گا۔

نیاز صاحب کی تحریر کی بات آنکلی ہے تو میری دو چار باتیں اور بھی سُن لیں ——— یہ مضمون لکھنے کے لیے میں نے نیاز صاحب کی کتابوں کو پھر سے پڑھنا شروع کر دیا، اس لیے کہ میرا خیال ہے نیاز صاحب اپنی تحریروں میں بالکل ننگے ہیں دل و دماغ سے؛ ہاں دونوں اعتبار سے!

شروع شروع میں بعض خوب صورت فقروں اور جملوں پہ نشان بھی لگاتے۔ مگر میں یہ کام کہاں تک کرتا۔ ہر سطر ہر فقرہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ بعد میں تو ان کی تحریروں کے بہاؤ میں ایسا بہا کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ پھر نہ تو کوئی نشان ہی لگا سکا اور نہ کہیں اٹک سکا، بہتا ہی چلا گیا۔ یہ بھی پتا نہ چلا کہ صبح کے تین بج گئے ——— تین بجے ہوں اور سماں یہ ہو ——— ٹھنڈی یخ رات، اٹوٹ سناٹا، دُور کُتّے کے بھونکنے کی آواز، کسی کسی گھر میں سرسراہٹ، کہیں اِکّا دُکّا دُھند میں لپٹی ہُوئی آواز ——— کبھی آپ نے نیاز کی تحریریں ایسے ماحول میں پڑھی ہیں؟ اگر پڑھی ہوں گی تو اُن پہ الہام کا گمان بھی ہوا ہو گا ——— میں ایسے سمے "ایک شاعر کا انجام" پڑھ رہا تھا۔ کیا بتاؤں، میں نے کیا کچھ نہ پایا۔

نیاز صاحب نے جو کچھ بھی امتیاز حاصل کیا وُہ اپنے قلم کے سحر سے حاصل کیا۔ لکھنے کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ لکھتے بھی جاتے ہیں۔ گلوری منہ میں ہو گی۔ خُوں خُوں کر کے باتوں میں ساتھ دیں گے۔ ضرورت پڑی تو پیک نگل کر بولیں گے:

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں کام میں مشغول ہُوں۔"

حافظہ بلا کا پایا ہے۔ ہر چیز، ہر کتاب ان کے ذہن میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بڑے بڑے کام صرف چند دنوں میں کر ڈالے۔ "گہوارۂ تمدن" ایسی کتاب صرف پندرہ دنوں میں ذہن سے کاغذ پر منتقل ہو گئی تھی۔

ان کے ہاں آمد ہی آمد ہے۔ آورد نام کو نہیں۔ الفاظ واقعی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ کمال میں نے صرف انیس، جوش اور نیاز میں دیکھا۔ باقی سب کے ہاں کاریگری ہے۔ وہ چاہے محمد حسین آزاد ہوں چاہے کوئی اور ——— ہاں ابوالکلام کا نام بھی لیا جا سکتا ہے مگر انھوں نے تو آورد کو آمد بنایا۔ اس لیے میں نے دانستہ انھیں اس گروہ میں شامل نہیں کیا۔ یُوں تو نیاز ابوالکلام سے متاثر ہیں۔ نیاز ہی کیا پُورا دَور متاثر ہے۔ ابوالکلام نے تحریر کی باگیں خطابت کے ہاتھ میں دے دیں مگر نیاز نے ایسا نہیں کیا۔ اُنھوں نے اپنا رنگ جمانے کے لیے، تحریر کی آبرو کی قیمت اپنی ریاضت سے ادا کی۔

میرے ایک دوست ہیں۔ اُنھوں نے نیاز صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ یہ بڑے خود غرض ہیں۔ میں اس وقت اپنے اس دوست کو جھٹلا کر خود شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ نہ مجھے نیاز صاحب نے اس پر مامور کیا ہے کہ میں ان کی طرف سے صفائی پیش کرتا پھروں۔ میں تو اس باب میں خاموش رہنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ یہ بات سخن گسترانہ سہی مگر یکسر غلط بھی نہیں ——— ویسے خود غرض تو ہر آدمی ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی ہی بھلائی چاہتا ہے۔ یہ شاید اتنے خود غرض نہیں کہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنی بھلائی چاہتے ہوں۔ مگر ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ دُوسرے کا نقصان ہُوتے بغیر اپنا فائدہ ہوتا ہی نہیں۔ اگر معاملہ یُوں بھی ہو اور وُوں بھی تو خاکسار حدِ ادب والی بات کو بھُولنا نہیں چاہتا۔

نیاز صاحب کے مُنہ سے شکریے کا لفظ ذرا کم ہی نکلتا ہے۔ یہ ہر معاملے میں دوسرے کی مہربانی کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ ایک صاحب نے نگار کے بڑے خریدار بنائے۔ حیدر آباد دکن سے بڑے بڑے عطیئے دلواتے، ہزاروں روپے۔ مگر نیاز صاحب نے ان میں سے کسی ایک کا بھی شکریہ ادا نہ کیا حالانکہ بھاگ دوڑ کرنے والے صاحب کہتے ہی رہے کہ بھئی جن لوگوں نے اتنی اتنی بڑی رقمیں دی ہیں ان کا لفظی شکریہ تو ادا کر دو مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا ——— "یہ مجھ سے نہ ہوگا" ——— اس لیے کہ ان لوگوں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا ہے کہ نظام کے ہاں تمھاری کمان چڑھی ہُوئی ہے۔ یہ جو کچھ ہُوا نظام کی وجہ سے ہُوا۔ اس لیے نہ میں شکریہ ادا کروں نہ تم کرو۔

اسی طرح ان کی[1] انا کا ایک واقعہ وہ عرضداشت بھی ہے جو اُنھوں نے بیگم صاحبہ بھوپال کے نام لکھی تھی۔ سن پندرہ سولہ کا واقعہ ہوگا۔ یہ وُہ زمانہ تھا جب ان کی گیتانجلی کا ترجمہ شائع ہو چکا تھا۔ "شاعر کا انجام" اور "جذبات بھاشا" چھپ چکی تھیں۔ بھوپال میں ان کے کچھ ایسے قدردان پیدا ہُوئے جنہوں نے انہیں بھوپال آنے کی دعوت

---

[1] میں انا کو مونث ہی لکھوں گا۔

بھی دی اور بات بھی بیگم صاحبہ تک پہنچائی۔ بیگم صاحبہ نے وعدہ کر لیا کہ نیاز صاحب کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتے گا۔ نیاز صاحب بھوپال پہنچے تو فوری طور پر کچھ نہ ہوا۔ مجبوراً انھیں محکمۂ اوقاف میں کام کرنا پڑا۔ جب دو برس یونہی گزر گئے تو دوستوں کے تقاضے سے اُنھوں نے ایک عرضداشت بیگم صاحبہ کو بھیجی، وہ عرضداشت یہ ہے:

عرضداشتِ نیاز

زمن سپاس تو آید ہمیں کہ نالانم
زخندہ ات چہ نوا بردہ ام کہ گریانم

نگاہِ مہر کہ بر من فگندۂ بینم
سحابِ لطف کہ بر من فشردۂ دانم

ولے ز آرزوِ خود ہنوز منفعلم
ز اقتضائے کمالِ خودش پشیمانم

بدستِ من سرِ دامانِ خود رسیدن دہ
وگرنہ چاک شدن خواہدش گریبانم

عجب نباشد اگر می زنی بدستارت
بجائے طرۂ کہ من گوہرے زعمّانم

ببر مرا بہ مشامت کہ مشکم از تاتار
بکش مرا بہ برت تیغے از صفاہانم

مرا بہ افسر و دیہیم خود بدہ جاے
کہ من بہ تاب و صفا لعلے از بدخشانم

مرا بپرس نہ حسان و شیخ شیرازی
کہ نغمہ عرب و طوطیے ز ایرانم

مرا بہ وعدۂ لطفے چو شاد فرمودی
نہ زیبدت کہ تماشہ کنی پریشانم

چہا کنی کہ تو امروز نیشتر سازی
ہماں اُمید کہ دی ساختی رگِ جانم

تامّلے کن و قدرم شناس و کارم دہ
کہ باشد از نظرِ عدل و نظم شابانم

دگرنہ دہ خبر از نامرادیم کہ زنم
بہ سنگِ سخت فنا قلبِ نالہ سامانم

ملاحظہ فرمائی آپ نے عرضداشت! دیکھ لیجئے درخواست میں بھی ان کی انا کس مقام پہ ہے۔ بیگم پر طنز اور اپنی حد درجہ بڑائی کا احساس، یہ طنطنہ آپ کو اس قلندر کے علاوہ اور کس کے ہاں ملے گا! بیگم صاحبہ کا بھی ظرف دیکھئے کہ انہوں نے ایسی عرضداشت پر بھی ان کا (۱۹۱۸ء میں) کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا تا کہ "بزرگوار" آزادانہ تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں۔

عملی زندگی میں یہ ریاضی یا اقلیدس ہیں۔ جس طرح ایک عدد دوسرے عدد کو جمع تفریق ہوئے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ اُسی طرح یہ بھی اپنے ملنے والوں کو "جمع تفریق" ہوتے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔

اور گوتم بدھ کی طرح، ان کے ہاں ایک خاص قسم کا ذہنی سکون بھی ملتا ہے۔ ربودگی اور بھاری بھرکم پن کے ساتھ، ایک خاص قسم کا استغنا۔

تکلف نام کو نہیں، جھوٹے پندار سے یارانہ نہیں۔ سوچنے کا انداز نرالا، کم علموں کو پڑھا لکھا اور پڑھے لکھوں کو بے علم اور جاہل سمجھ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اپنی تحریروں میں سب کو حیرانی کی سرحد پہ لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے جو جی میں آئے لکھ ڈالیے۔ کون پوچھتا ہے۔ پھر ہر وقت ان کے ذہن میں "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" بھی گونجتا رہتا ہے۔ لکھنے لکھانے کی حد تک ان کا کلیہ یہ ہے کہ جو صاحبِ علم ہوگا وہ تو ہر چیز پڑھے گا نہیں۔ جو بے علم ہوگا اس کے لیے ہر تحریر میں سب کچھ ہوتا ہے۔

مذہبی معاملہ ہو یا علمی و ادبی، انھیں اپنے جوہر دکھائے بغیر چین نہیں پڑتا۔ چاہے کسی بھی معاملے میں سو سو کیڑے ڈلوا لیجئے۔ ہما شما کا تو ذکر ہی کیا۔ انہوں نے خدا کی کتاب (قرآن) تک کو کہہ دیا کہ یہ خدا کا کلام نہیں۔ بلکہ اس کتاب کو اگر رسولؐ کی کتاب مانیں تو اس سے رسولؐ کی عظمت اور بڑھے گی۔ مطلب یہ کہ بات دُنیا سے الگ ہو کر فنی ہوئی۔

اُنہوں نے اگر کسی کے خلاف لکھا ہے تو وہ سب ایسے ہیں جن کا ادب میں اونچا مقام ہے۔ چھوٹے موٹے ادیبوں کو تو منہ نہیں لگاتے۔ پہلے بھی میں نے عرض کیا ہے کہ مبتدیوں کی بے جا حد تک حوصلہ افزائی کر جائیں گے۔ اس خیال سے نہیں کہ وہ ایسے توصیفی کلمات کے مستحق ہوتے ہیں بلکہ اس خیال سے کہ ان کی مخفی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع تو ملے اور ——— اور ——— بعد میں دیکھا جائے گا۔

انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ کو وہ وہ اصلاحیں دی ہیں کہ بے چارے تکو بن کر رہ گئے۔ کوئی خوش قسمت ہی ہوگا جو ان کے قلم کی زد سے بچا ہو۔ جہاں تک شعر کے سمجھنے کا تعلق ہے خوب سمجھتے ہیں۔ شعروں کا آپریشن بھی خوب کرتے ہیں مگر اس آپریشن میں بعض اوقات شعر کو ذبح بھی کر ڈالتے ہیں۔ ساری دنیا اُن کی اصلاحوں کو جو چاہے درجہ دے مگر میری ناچیز رائے میں اصلاحیں بڑی بھونڈی دیتے ہیں۔ ابتدائی دَور میں ایسا نہیں کرتے تھے۔ چونکہ عمر کے ساتھ ساتھ استادی شان بھی بڑھتی ہے اس لیے ذرا سوچنے کا مقام ہے کہ یہ قصور ان کا ہوا یا یہ بھی ان کی عمر کے پلے باندھنا پڑے گا؟

ان کا شعروں پہ عمل جراحی، کچھ مکتبی تعلیم ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ استادوں کے سوالات شاید اب تک ان کے ذہن سے نہیں نکلے۔ جیسے شعر کی نثر کرو، ترکیبِ نحوی کرو، تقطیع کرو، دعوے کے ساتھ ثبوت پیش کرو وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

اُنہی مکتبی باتوں نے ان کا پیچھا اب تک نہیں چھوڑا۔ لہٰذا یہ ادیبوں اور شاعروں کا پیچھا کیوں چھوڑیں ——— یہ بھی شعر کی نثر کرائیں گے۔ دعوے کے ساتھ ثبوت مانگیں گے ——— قصّہ مختصر نیاز صاحب کی اصلاحیں کچھ ایسی ہوتی ہیں ——— "خشکہ با گندہ برو زہ" اگرچہ گندہ مگر ایجاد بندہ ——— ایسی زیادتیوں اور ایسی خوش فعلیوں کے باوجود، دشمن کا بھی دل چاہتا ہوگا کہ اُن کا قلم چوم لے۔

ایک بات اور بھی سوچنے والی ہے کہ اتنی شعری سُوجھ بُوجھ کے بعد، یہ خود جو شعر کہتے ہیں وہ بڑے پھُسپھُسے

ہوتے ہیں۔ علم اور قابلیت نے بھی اچھے شعر کم ہی لوگوں سے کہلوائے ہیں۔ دیکھ لیجئے ابوالکلام بھی اس وادی میں صفا مارے گئے۔

نیاز صاحب نے فارسی تو اپنے والد ماجد سے پڑھی اور عربی عرب محمد طیب اور مولوی صدیق حسن غازی پوری سے، انہی بزرگوں کا یہ سب کیا دھرا ہے جو نیاز کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ اب تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ فارسی اپنے والد سے بھی زیادہ جانتے ہوں اور عربی اپنے استادوں سے بھی زیادہ۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ان کے فقرے سمجھ میں نہیں آتے۔ بظاہر اردو کے ہوتے ہیں مگر ٹوہ لگائی جائے تو ان میں سے کچھ فارسی کے نکلتے ہیں اور کچھ عربی کے۔ اور بیڑا ان غریبوں کا ہو جاتا ہے جو اپنی طرف سے اردو پڑھنا چاہتے ہیں۔[1]

نیاز صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے قلم کو آمدنی کا ذریعہ بنایا۔ جب تک یہ بھوپال میں تھے اس وقت تک ان کا اپنا کوئی اشاعتی ادارہ نہ تھا مگر یہ مضامین اُس وقت بھی معاوضتہً دیتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں یہ باقاعدہ قسم کے مضمون نگار تھے۔ تمدن، اُسوۂ حسنہ، صوفی اور خطیب وغیرہ رسائل میں ان کے مضامین نکلتے بھی تھے اور چلتے بھی تھے۔

اگر یہ ملازم ساٹھ روپوں کے تھے تو ان کا خرچ کوئی پونے دو سو کا تھا۔ مکان کا کرایہ، نوکر کی تنخواہ ساٹھ روپوں میں دیتے تھے۔ باقی عیش قلم کی آمدنی سے کرتے تھے۔ اس کے بعد جب اُنھوں نے باقاعدہ کتابوں کی نشر و اشاعت کا سلسلہ چلایا اور نگار کو آسمانِ صحافت تک پہنچایا تو لاکھوں کمائے۔ خوب خوب کتابیں لکھیں جو بکیں بھی خوب خوب۔ نگار کے بھی وہ نمبر نکلے کہ اُن پر اضافہ تقریباً ناممکن ہے۔

یوں تو نگار کے قلمی معاونین میں، ہمیشہ بڑے لکھنے والے ہی رہے مگر ان سب کی موجودگی میں بھی، نیاز صاحب کی تحریر کی بات ہی اور ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ کاش سارا رسالہ خود نیاز صاحب کی تحریروں ہی سے مزین ہوتا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسا بھی کر دکھایا۔ سارے کا سارا نمبر خود "کہہ کر" پیش کر دیا۔ پڑھنے والے نہال ہو گئے۔ یہ مرتبہ بھی نیاز صاحب کے سوا، کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔

نیاز صاحب، مومن کے بڑے مداح ہیں۔ جو کوئی بھی مومن کا زیادہ مداح ہوگا وہ لازمی طور پر اس کے ہم عصر غالب کا زیادہ طرفدار نہ ہوگا۔ یہی حال کچھ نیاز صاحب کا بھی ہے۔ مگر یہ اپنے مضامین میں جتنے شعر، غالب کے کوٹ کرتے ہیں اتنے مومن کے نہیں کرتے۔ احتیاط صرف اتنی کرتے ہیں کہ غالب کے اردو شعروں کی بجائے، فارسی کے شعر، اپنی نثر میں سجاتے ہیں۔ معلوم ہُوا کہ یہ غالب کو فارسی کا شاعر اور مومن کو اردو کا شاعر مانتے ہیں۔ یہ فلسفے ہی فلسفے گویا صرف

---

[1] مثلاً میرے کو اُلف سے استبعاد حقیقی ہے۔ آج کم و بیش ۳۰ دن ہُوئے جب مجھ سے اس نامساعد مناکحت کی تقریب میں قبول کیا۔ اس کی آنکھیں یُوں تو اور بھی مسترحم اور عاشقانہ کیف کا محل نظر آئیں۔ میرے لیے وجہ نکوہش ہے۔ اس کی نگاہوں کی عادت مستمرہ ہوگی۔ "شاعر کا انجام"

تصوف ہی تصوف کو غزل نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا جو تصور ان کے ہاں ہے وُہ انہیں مومن ہی میں ملتا ہے، غالب میں نسبتاً کم ملتا ہے۔ بہ ظاہر یہ بات چاقو چل جانے والی ہے مگر یہ کچھ زیادہ غلط نہیں۔

اسی لحاظ سے بھی نیاز صاحب کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ عملی زندگی میں بھی مومن ہی نظر آتے ہیں۔ مومن ہی کی طرح عورت سے لطف اندوز ہوتے ہیں، مومن ہی کی طرح عورت کی پرستش کرتے ہیں اور مومن ہی کی طرح کا، ان کے ہاں بھی تصورِ عفت ملتا ہے۔ کچھ عجیب سی رندی میں عفت اور عفت میں رندی کا سا انداز ہے۔

مومن اپنی مثنویات میں جس طرح نظر آتے ہیں، نیاز ویسے ہی اپنے خطوط میں نظر آتے ہیں۔ آخر کوئی چیز تو مشترک تھی جس نے نیاز کی کمزوری، مومن کو بنایا ——— ان "اخلاق باختہ" باتوں کے باوجود، مومن کے معاصرین نے مومن کا ذکر ہمیشہ ہی عزت کے ساتھ کیا۔ سرسید نے بھی آثار الصنادید میں مومن کی بڑی تعریف کی ہے ——— آج نیاز نمبر سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نیاز کے معاصرین نیاز کے بارے میں کیسی رائے رکھتے ہیں۔

میں نے ان کی تحریروں میں شراب کی باتیں پڑھی ہیں مگر انہیں کبھی پیتے ہوئے نہ پایا۔ اِدھر اُدھر پوچھا بھی، مگر ان کی بادہ خواری کا حال نہ کھلا۔ پیتے ضرور ہوں گے اس لیے کہ دوستوں کو بھی کہتے ہیں کہ "چار انگل شراب پیو اور خدا کو یاد کرو"۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کا قلم اتنا سچا اور بے ریا نہ ہوتا۔ شراب میں ہزار عیب ہوں گے مگر بادہ خوار کا باطن میلا نہیں ہونے دیتی۔ اس باب میں ان کا مسلک کچھ اس قسم کا نظر آتا ہے:

گہ گہہ خورد و کم کم خورد و تنہا می خورد۔

نیاز صاحب کی یوں تو کئی تصانیف ہیں جو سب کے سامنے ہیں۔ مگر میں ایک "غیر مطبوعہ تصنیف" کا بھی ذکر کروں گا۔ شاہ دلگیر، جو نقاد کے ایڈیٹر تھے اُن کے لیے انھوں نے ایک قمر زمانی تراشی، صرف ان کے عاشقانہ ٹھمک سے لطف اندوز ہونے کے لیے۔ قمر زمانی کون تھیں، کیا تھیں! اسے جانے دیجئے۔

یہ وہی قمر زمانی ہیں جن کی وجہ سے دوبارہ نقاد جاری ہُوا تھا اور اس میں قمر زمانی کے اپنے خط میں، ان کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ شاہ دلگیر کی پہلے تو قمر زمانی سے ملاقات، صرف خط و کتابت کی حد تک تھی۔ مگر یہ کب تک دُور دُور رہتے۔ انہوں نے دیدار کے لیے التجاؤں پہ التجائیں کیں۔ بالآخر ملاقات کے لیے دہلی کا کوئی ہوٹل مقرر ہوا ——— قمر زمانی آئیں، بہ صد طمطراق آئیں۔ بُرقع میں تھیں مگر ان کے چلنے کا انداز بڑا ہی کافرانہ تھا۔ آواز میں بھی لوچ تھا۔ پان بنانے میں بھی ایک شانِ دلربائی تھی۔ سُنا ہے کہ جب اُنھوں نے دو انگلیوں میں چمچی کو پکڑا تو دیکھنے والے دل پکڑ کے رہ گئے۔ کتھا لگانے کے لیے جب ہاتھ پان پر تیرتا تو چھنگلیا تھرتھراتی اور ایک پُر کیف ارتعاش پیدا ہوتا۔

اس افسانے کی ہر ہر چُول نیاز صاحب نے بٹھائی تھی اور سارے ہی سبق انہوں نے ہی اپنی غیر مطبوعہ تصنیف کو پڑھائے تھے کہ چلنا یُوں ہوگا، بیٹھنا یُوں ہوگا، باتیں یُوں کرنا ہوں گی، پان یُوں لگانا ہوگا ——— دیکھ لیجئے کتنے مکمل انسان ہیں نیاز صاحب، کوئی کام بھی ایسا ہے جس میں انہیں یدِ طُولیٰ حاصل نہ ہو ——— مطلب یہ کہ نیاز صاحب نرے

احمق کو برداشت نہیں کرتے ذرا اوچ ہو تو خُوب کھیلتے ہیں۔

میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ میں بھی معقول آدمی بن جاؤں مگر نہیں بن سکا۔ اچھے بُرے مشاغل کا اتنا ہجوم ہے کہ پناہ بخدا۔ میرے پاس جتنے خط آتے ہیں ان سب کا جواب دینا میرے بس کی بات ہی نہیں رہی۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مجھے اپنی اس زیادتی کا احساس نہ ہو۔ مگر میں کیا کروں، ہجومِ کار کی زیادتیوں نے مجھے عاجز سا بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس نیاز صاحب خطوط کے جواب میں اتنے باقاعدہ ہیں جیسے سورج کا ہر روز نکلنا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اٹھارہ برس کے عرصہ میں انھوں نے میرے کسی خط کا جواب نہ دیا ہو —— میں کتنا نالائق یہ کتنے باضابطہ! رشک چھوڑ، حسد والی بات ہے یہ!

یہ صرف خطوں کے جواب ہی میں باقاعدہ نہیں بلکہ اُن کی پُوری زندگی ہی ایک ضابطے میں ڈھلی ہُوئی ہے۔ انھیں جو کام اِس وقت کرنا ہے وہی کام دوسرے دن اور اُسی وقت کرنا ہے۔ نیاز صاحب خط کا جواب ضرور دیں گے خواہ صرف اِتنا ہی لکھا ہو:

"تم لکھنؤ آ رہی ہو۔ بالکل جھُوٹ! —— نیاز"

میرا خیال ہے کہ نیاز صاحب بھی میری طرح دن رات کے اتنا چھوٹے ہونے پر خوش نہ ہوں گے۔ ضرور چوبیس گھنٹوں کی بجائے ایک سو چوبیس گھنٹے چاہتے ہوں گے۔ ۶۲ گھنٹے دن کے ۶۲ گھنٹے رات کے۔ مگر انہیں بھی سب کی طرح ۱۲ گھنٹے دن کے میسر ہیں اور ۱۲ گھنٹے رات کے۔ مگر ان ۱۲ گھنٹوں میں یہ کیا کچھ کرتے ہیں! آئیے ذرا اِس کا تو سراغ لگائیں۔

صبح اُٹھتے ہیں، سَیر کرتے ہیں، خطوں کے جواب دیتے ہیں (اس میں سبھی قسم کے خط ہوتے ہیں۔ عام کاروباری بھی، احباب کے نام بھی، ادبی نوعیت کے بھی اور عاشقانہ بھی) آئے ہوئے اچھے بُرے مضامین پڑھتے ہیں (یہ کام بہ ظاہر تو بڑا شاندار معلوم ہوتا ہے مگر جو کرتا ہے اُسے ہی معلوم ہے کہ ایڈیٹری کس عذاب کا نام ہے) مضامین کی تصحیح کرتے ہیں، ناقابلِ اشاعت مضامین واپس کرتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں۔ قیلولہ کرتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا کام کرتے ہیں۔ دوست احباب سے گپ لڑاتے ہیں۔ چائے نہیں پیتے۔ پان کھاتے ہیں۔ سگریٹ نہیں پیتے۔ شام کو کوئی نہ کوئی دلچسپ کام کرتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں۔ دعوت اُڑاتے ہیں "کسی نہ کسی" سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ مطالعہ کرتے ہیں اور پھر سونے سے پہلے بیوی کو یقین دلاتے ہیں کہ میں صرف تیرا ہُوں۔

۴

مجھے نیاز صاحب کے خط بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ مکتوباتِ نیاز میں جتنے خط ہیں ان میں کچھ تو فرضی ہیں جو اُنھوں نے کسی نہ کسی مسئلے کو خط ہی کے پیرایہ میں لکھنے کو بہتر جان کر لکھ ڈالے۔ مگر بیشتر خط ایسے ہیں جن کا واقعی کوئی مخاطب تھا بھی اور تھی بھی۔

مکاتیب نمبر کی ترتیب کے وقت، مجھے ان کے کچھ ایسے خط بھی ملے تھے جن میں نیاز صاحب نے اپنے جوان قلم سے

خون کی سیاہی چھڑکی تھی۔ مگر میں نے ان کی اشاعت مناسب نہ سمجھی، اس لیے کہ مجھے نیاز صاحب کی شخصیت سے ایک نیاز مندانہ ربط ہے مگر نیاز صاحب خود اس کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ وہ علی الاعلان راجہ اندر بننے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے ـــــ اس لیے میں بھی انہیں مسیح کیوں سمجھوں!

یہاں نیاز صاحب کا ایک خط ملاحظہ فرمالیں۔ دُنیا خوب صورت معلوم ہونے لگے گی:

اتنا قاتل خط اور اس قدر طویل! ـــــ تم تو صرف یہی کہنا چاہتی تھیں نا کہ آئندہ میں تمھیں خط نہ لکھوں۔ پھر یہ پُورے چھ صفحے کیوں؟ ـــــ شاید اس لیے کہ صاف صاف ایسا کہتے ہوئے تمھیں حجاب آتا تھا۔

نہیں یہ بات نہیں! ـــــ میں سمجھتا ہُوں تم نے مجھے آہستہ آہستہ ذبح کرنا چاہا اس طرح کہ حلق پر چھُری بھی چل رہی ہے، تم مسکرا مسکرا کر مجھ کو تسلیاں بھی دیتی جاتی ہو اور میں بے خبر ہوں۔ یہاں تک کہ دفعتہً تمہارا ہاتھ شہ رگ تک پہنچ جاتا ہے یعنی تمھارا خط ختم ہوجاتا ہے اس حکم کے ساتھ کہ آئندہ تمہیں کوئی خط نہ بھیجوں ـــــ اور ـــــ مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے کوئی نہایت بیش قیمت چینی کی قاب دفعتہً ہاتھ سے چھُوٹ جائے اور فرش پر گر کر چُور چُور ہوجائے۔ لیکن خیر، اس سے ایک فائدہ ضرور ہُوا اور وہ یہ کہ تم نے خط لکھنے سے باز رکھ کر مجھے اس کا موقع تو دے دیا کہ جو کچھ کہنا ہے آزادی سے کہہ دوں اور دل کی وُہ بات جو تم پر ظاہر نہ کرسکتا تھا کہہ ڈالوں۔ کیونکہ اب مجھے کیا ڈر ہے۔ تم سُن نہ سکو گی اور دُنیا سُنتی ہے تو سُنے۔ اچھا تو شروع کرتا ہُوں۔

ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ!

تمھاری سب سے پہلی تحریر مجھ تک پہنچی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ اگر یہی باتیں میں تمھاری زبان سے سُنتا تو کیا ہوتا ـــــ تمہیں خبر نہیں۔ لیکن ہُوا یہی!

میں نے تمھاری تحریر کے ایک ایک لفظ کو دیکھ کر، حرفوں کی ہر ہر کشش کو سمجھ کر، کاغذ کے رنگ اور اس کی عطریت سے مدد لے کر، میں نے تمھاری ایک تصویر کھینچی، کاغذ پر نہیں، قلب پر، دماغ کے اس پردے پر جو صرف نغمہ و نکہت کے نقش کے لیے مخصوص ہے اور میں اس میں محو ہوگیا ـــــ تو کیا میں بتا ہی دُوں کہ میں نے تمھاری تحریر کے اندر چھُپا ہُوا تم کو کیسا پایا؟ معاف کرنا۔ ممکن ہے کوئی بات خلافِ حقیقت ہو یا تمھارے ذوق کے خلاف۔ لیکن جب میرا یہ خط تم تک پہنچ ہی نہیں سکتا تو پھر یہ اندیشہ کیوں؟

اچھا تو سُنو اب تم اپنا سراپا ـــــ کوئی پسند کرے یا نہ کرے لیکن مجھے تو وہ اس قدر عزیز ہے کہ اگر تم واقعی ویسی نہ نکلتیں تو مجھے افسوس ہوتا۔

گھلتا ہوا سا فولاد رنگ، یعنی وُہ رنگ جو کیفیات سے شروع ہوتا ہے اور کیفیات ہی پر ختم ۔ وُہ جسے چھُونے کو جی چاہے اور ہونٹوں میں بے اختیار کپکپی سی محسوس ہونے لگے ۔ معاف کرنا میرے ہاتھوں نے بھی تمھیں چھُوا اور میرے ہونٹوں نے بھی تمہارے لبوں کو مَس کیا جو ریشم کی طرح نرم اور پنکھڑی کی طرح نازک تھے —— میں نے تم کو نحیف و ناتواں پایا ۔ لیکن اپنی رعنائی و کشیدہ قامتی کے لحاظ سے تمہیں ایسا ہونا ہی چاہیے ۔ تمہارے بال بہت سیاہ تو نہیں ۔ لیکن ان میں ایک خاص قسم کی چمک ضرور ہے اور تھوڑا سا گھونگھر بھی کنپٹی کے بالوں میں مجھے نظر آتا ہے —— پیشانی بہت فراخ ہے اور اس میں ایک میگوں رگ اُبھری ہُوئی مانگ تک چلی گئی ہے —— بھویں کافی چوڑی ہیں اور ایک نہایت ہلکی عنبری لکیر ان دونوں تلواروں کو ایک دوسرے سے ملا رہی ہے ۔ رنگ کے بعد سب سے زیادہ قاتل چیز آنکھیں ہیں ۔ ہر وقت کسی خیال میں مستغرق رہنے والی آنکھیں، جن کو ایک بار دیکھ لینا گویا کسی سمندر میں ڈوبتے چلے جانا ہے —— چہرہ کتابی —— گردن کھنچی ہُوئی، تناسب اعضاُ کانٹے پر تُلتا ہُوا —— اور —— چال ایسی جیسے کوئی ناگن راستہ کاٹتی ہُوئی سامنے سے گزر جائے ۔ عمر تم خود ہی بتا چکی ہو کہ ۲۰ سے کم اور ۱۵ سے زیادہ ہے ۔ غالباً ۱۸ سال ! —— یہ تھی تمہاری وُہ تصویر جو میں نے تمہارے سب سے پہلے خط کو دیکھ کر اپنے دل پر نقش کی تھی اور اگر میں یہ سب کچھ پہلے ہی لکھ دیتا تو شاید تم اسی وقت مجھے لکھ بھیجتیں کہ آئندہ میرے نام کوئی خط نہ بھیجا جائے ۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے زیادہ بے تکلف ہو جاؤ اور میں تم کو ایسے لفظ سے خطاب کر سکوں جو تمہاری خوبصورت پیشانی پر ہلکا سا خم پیدا کر سکے ۔ لیکن اچھا ہُوا کہ اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ بساط اُلٹ دی گئی اور تم نے زندگی کی اُس تلخ حقیقت کو جان لیا کہ اگر عورت اس کے سمجھنے پر مجبور نہ ہو تو خدائی کا دعوٰی بھی اس کے لیے کوئی بڑی چیز نہیں ۔

ہر چند میں تم کو دُنیا میں آزاد، انسانی دسترس سے دُور، کسی آسمانی دیوی کی طرح بلند دیکھنا چاہتا تھا ۔ لیکن میری یہ تمنّا پُوری نہ ہُوئی اور تمہاری زندگی کا وُہ دور، جب تمہارا جسم تمہاری روح کے اندر محوِ خواب تھا، جلد ختم ہو گیا ۔

پھر بتاؤ کہ اب تم کیا کرو گی ۔ مگر میں یہ کیوں پُوچھ رہا ہُوں ۔ مجھے کیا حق حاصل ہے اور اگر تم کچھ کہنا بھی چاہو گی تو کیسے کہو گی اور اگر کہو گی بھی تو کلیجہ پر کون ہاتھ رکھے گا !

تمہارے اس چھ صفحہ کی داستان میں سب سے زیادہ تڑپا دینے والی بات یہ تھی کہ تمہارے جسم کے ساتھ تمہاری رُوح کا سودا نہیں ہو سکا ۔ باور کرو یہ سُن کر مجھے بہت قلق ہوا اور دیر تک سوچتا رہا کہ تم کس قدر گھبرا رہی ہو گی لیکن میں تو اب تسکین کے الفاظ بھی تم تک نہیں پہنچا سکتا ۔

کیا کروں، مجبور ہوں۔ اچھا تو لو اب میں اپنی تسکین کی چیزیں اپنے سے جُدا کئے دیتا ہوں اور تمھاری تمام تحریریں جن کو میں نے اس وقت تک حرزِ جاں بنا کر رکھا تھا، نذرِ آتش کئے دیتا ہوں۔

اے عزّت و شرافت کی دیوی ——— میری یہ قربانی قبول کر لے۔

صنفِ لطیف کی نفسیات کا جتنا گہرا مطالعہ ان کے ہاں ملتا ہے وُہ انہی کا حصّہ ہے۔ جذبات بھاشا ہمیں ان کے ادبی رجحانات کا رُخ سُجھاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وُہ کس طرح عورت کی نفسیات کی عکّاسی اور نقاشی کرتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے بھی "لیلیٰ کے خطوط" میں عورت کی نفسیات کی بڑی عمدہ عکّاسی کی ہے مگر ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ قاضی صاحب کے ہاں عورت کی جو نفسیات ملتی ہے وہ کوٹھے والیوں کی ہے۔ نیاز کے ہاں شوقین عورتوں کی نفسیات ہے۔

اِسی نوع کا، ان کا ایک مضمون "کیوپڈ اور سائیکی" ہے پڑھتے جائیے اور مرحبا کہتے جائیے۔ مگر میں یہاں ان کے مضمون رقاصہ کا ذکر کرنا چاہتا ہُوں۔

اس مضمون میں بڑی بڑی گہری باتیں ہیں۔ یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے نیاز صاحب اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ رقّاصہ کی تعریفیں کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی کہتے ہیں، کاش! تُو صرف میری ہوتی، اور اس پر افسوس بھی کرتے ہیں کہ تُو سب کی ہے۔ شاید یہی وُہ اندازِ فکر تھا جس کی وجہ سے اُنھوں نے کوٹھوں پر چڑھنے کی بجائے شائستہ عورتوں ہی سے ایک قسم کی ذہنی وابستگی رکھی۔ یہ "وصل کے بعد تنہائی بھی اک دنیا ہے" پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو قطعی طور پر ذہنی آوارگی کی ضد ہے۔ یہ اگر اپنی زندگی کو کچھ محرومیوں سے بھی آشنا نہ رکھتے تو اس رنگ میں اُتر ہی نہیں سکتے تھے۔ اتنا گہرا مشاہدہ کہ تصور کی آنکھیں ہار مان لیں، شاید ہی اردو میں کہیں ملے۔ اگر یہ اس نوع کے بھی عملی انسان ہوتے اور اپنی جوانی کو نگار کے صفحات سے اٹھا کر ہاتھ پہ لیے پھرتے تو ایسا مضمون قیامت تک نہ لکھ سکتے۔ اُنھوں نے ہمیشہ بازار کی روٹی اور بازار کی چیز سے پرہیز کیا۔ عجیب سے رندِ پاک باطن ہیں یہ!

آنسہ عائشہ خاں، جنھوں نے نگار کا 'انشائے لطیف نمبر' مرتّب کیا تھا انھوں نے اپنے مضمون میں بڑی مردانہ جرأتوں کے ساتھ، کئی باتیں کُھلے انداز میں لکھ ڈالیں۔ نیاز اور عائشہ کے مکالمے سُنیے۔

نیاز صاحب زیادہ تر سائنٹیفک فلمیں پسند کرتے ہیں، میں نے ایک بار پُوچھا: "رومانی فلمیں آپ کیوں نہیں دیکھتے؟"

تو بولے: "رومان کیا جاتا ہے دیکھا نہیں جاتا۔"

ان کو سیر و تفریح سے خاص دلچسپی ہے اور بارہا BIG GAMES میں حصّہ لیا ہے۔ میں نے ایک دن پُوچھا کہ آپ کا نشانہ کبھی خطا بھی جاتا ہے؟ بولے: "اکثر، مگر ہرنیوں کی حد تک کبھی نہیں۔"

ان کا یہ فقرہ جو بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا تھا، میں کبھی نہ بھولوں گی ——— "ہر حسین عورت میری معشوقہ ہے۔ خواہ وُہ دُنیا کے کسی گوشے میں ہو"۔

میں نے پُوچھا : "اگر حسین نہ ہو ؟"

بولے : "کوئی عورت غیر حسین نہیں ہوتی ، عورت ہونا بجائے خود اک حُسن ہے"۔

میں نے کہا : "کم از کم اخلاقی حیثیت سے ضرور اس کی اچھائی ، بُرائی کا فیصلہ کرنا پڑے گا"۔

فرمایا کہ "عورت جتنی غیر محتاط ہو گی اتنی ہی زیادہ چاہے جانے کے لائق ہے"۔

یہی عائشہ خاں اپنے مضمون میں کہتی ہیں : "نیاز صاحب عورت کو چھوڑ کر ہر معاملہ میں اعتدال پسند ہیں"۔

یہاں میں ایک بات خود نیاز صاحب سے پوچھ کر آگے چلوں گا "یہ آنسہ عائشہ خاں کون ہیں ؟" ——— آپ کے دوست کی بیٹی ہیں۔ بجا ارشاد۔ مگر یہ تو بتائیے یہ خاتون تو کچھ آپ ہی کے انداز میں سوچتی اور آپ ہی کے انداز میں لکھتی ہیں ——— ٹھیک ! آپ کی شاگرد جو ہوئیں ——— مگر ایسے شاگرد کتنے خوش قسمت ہیں اور کتنے ہیں جو شاگرد ہو کر بالکل استاد نظر آتے ہوں۔

اچھا اچھا قبلہ نیاز صاحب ! آپ اتنے غصّے سے میری طرف نہ دیکھیں۔ میں آگے چلتا ہُوں ، ایک ذرا سی بات کی وضاحت میں مجھے آپ کی ناراضی منظور نہیں۔

جہاں تک میں نیاز صاحب کی تحریروں سے اندازہ کر سکا وُہ تو یہی کچھ ہے کہ ابتدائی زندگی انہیں بڑی پابندیوں اور بڑی گھُرکیوں کے سے ماحول میں بسر کرنی پڑی۔ مگر جب عمر ایسی لگی جس میں ذہنی نشاط کی قیمت معلوم ہوتی ہے تو پھر انہوں نے غسل کی حاجت کو عیب کا درجہ دینا پسند نہ کیا۔

میٹھا برس لگنے کے بعد انہوں نے کیا کچھ کیا ہو گا۔ اس کا کچھ زیادہ پتا نہیں چلتا۔ یہ ہزار ننگے سہی، مگر پھر بھی جوشؔ اور فراقؔ کی طرح نہیں ہیں جو بہ آوازِ بلند کہتے ہوں کہ میں نے دو درجن عشق کیے اور میں نے تین درجن عشق کیے ——— یہ درجنوں عشق والی بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آتی۔

ویسے نیاز صاحب نے بھی اپنی رومانی زندگی کا تعلق لکھنؤ ، رامپور ، بھوپال ، دہلی ، ہانسی اور مسوری سے جوڑ رکھا ہے مگر ہمیں کیا، بے شک امریکہ تک مار کریں۔

جمالیاتی ذوق کے اعتبار سے یا انجائمنٹ کی حد تک کرشن کنہیا ہیں یہ ، گوپیاں بہت سی نظر آتی ہیں مگر رادھا کون ہے۔ اس کا حال نہیں کھُلتا۔ دُوسرے نیاز صاحب ہر عورت کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس کے ساتھ دلچسپی لی جائے۔ وہ "مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں" کے قائل نہیں بلکہ اس شعر کی تفسیر ہیں : ؎

ہر غنچۂ لب سے عشق کا اظہار ہے غلط
اس مبحث صحیح کی تکرار ہے غلط

یہ جتنے شاہد باز ہیں اُتنے شاہد کار نہیں۔ یہ خُوب جانتے ہیں کہ کہاں تیرنا چاہیے اور کہاں نہیں تیرنا چاہیے۔ جہاں جہاں بھی انھوں نے ذہنی رفاقت محسوس کی ہوگی وہاں یہ تیرے بھی ہوں گے۔ ڈوبے بھی ہوں گے۔ مگر ہیں انسانی لطف گیری کا مارجن تو دینا ہی ہوگا۔ سُنا تو آپ نے بھی ہوگا ——— "پہلا پتھر وہ مارے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو"

نیاز صاحب کی عمر اس وقت اسی برس کے لگ بھگ ہے۔ اگر میری عمر بھی اتنی ہوتی تو مجھے یہ سب کچھ لکھنا چاہیے تھا۔ اب تو میں نے ان کی بزرگی کا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا۔ مگر میں لحاظ کرتا بھی کیوں؟ ان کی بارگاہ میں، مَیں نے تو ہمیشہ برابری میں بزرگی گھُلی ملی اور بزرگی میں برابری گھُلی ملی کا سا انداز پایا۔

اقرار کرتا ہُوں اگر میں نیاز صاحب کی خدمت میں اتنا گستاخ نہ بنتا تو اچھا ہی تھا۔ مگر میں نے یہ سب کچھ دانستہ کیا ہے۔ اس لیے کہ میرا خیال ہے اور لوگ ضرور نیاز صاحب کو فرشتہ بنا کے چھوڑیں گے۔ مگر میں اتنے بڑے آدمی کو اتنا ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جوش صاحب

ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ میں نے نیاز فتحپوری پر اپنے تعصّبات کا اظہار کیا تھا۔ آج جوشؔ صاحب پر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں جو بلاشبہ "تعصبات" ہی کی ذیل میں آئیں گے۔

ان دونوں "بزرگوں" کو پڑھنے میں مجھے ان کی کئی رگیں ایک ہی جگہ جا کر ملتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ میرے مطالعے کا قصور ہے یا ان کرمفرماؤں کا! کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اردو کے ان جیالوں کو اپنے اپنے رنگ میں دکھانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔

دونوں ہی شاہد باز، دونوں ہی مذہبًا کافر، دونوں ہی قلندر، اور سب سے بڑا عیب دونوں کا یہ کہ تقاضائے انسانیت سے آشنا، نہ صرف آشنا بلکہ پیغمبرانہ حد تک پرچارک۔

یہ صرف انسان ہی نہیں، شاعر بھی ہیں، دوہری تہری خوبیاں اور خرابیاں۔ اس لیے یہ اچھے کام بھی کریں گے اور بُرے کاموں کی اوسط بھی خراب نہ ہونے دیں گے۔ اس اعتبار سے یہ مجھے مکمّل انسان نظر آتے ہیں۔ دونوں رُخ مکمّل!

نواب محمد علی خاں ان کے چچا تھے۔ آمدنی کوئی لاکھ روپے سالانہ کی ہو گی۔ کچھ اتنی ہی آمدنی ان کے والد بزرگوار (نواب بشیر احمد خاں) کی تھی جو ان صاحبِ حوصلہ بزرگوں نے بدانتظامی، مقدمہ بازی اور دل کے ارمان نکالنے کی نذر کر دی۔ تلچھٹ میں جو کچھ اُنھیں ملا اُنھوں نے بھی خاندانی روایات کو شرمسار نہ ہونے دیا۔ خوب خوب عیش کئے، خُوب خوب جئے!

ملیح آباد کے پٹھان، شبیر حسن خاں نام، تخلّص جوشؔ، نواب ابن نواب کے بعد صرف جوشؔ، شبیر حسن خاں بھی نہیں۔

اجداد میں شعر و شاعری کے چرچے، بلکہ شاعر بھی، وہی علّت ہوتے ہوتے ان تک پہنچی۔ مگر ان کے بزرگ رُسوائی کُن حد تک 'بدنام' نہ تھے جتنے کہ یہ ہیں۔ اگر اُن کا ذکر ہُوا بھی تو اس لحاظ سے کہ گویا اور بشیرؔ، جوشؔ کے اجداد میں اچھے شاعر تھے۔

کئی معاملات میں یہ دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ کبھی اتنے خود غرض کہ آپ ہکّا بکّا رہ جائیں، کبھی اتنے مخیر کہ عقل نہ مانے۔ ان کے مزاج کی دُھوپ چھاؤں انسانی فطرت ہی کی غمّاز ہے۔ ایک رُخ کے اظہار سے بلونے

اور دُوسرے رُخ کے اظہار سے، عام انسانوں کے قد سے اُونچے نظر آئیں گے، اس لیے چھوڑیئے اس قصّے کو!

جوشؔ صاحب نے اپنی شخصیت پر کوئی نقاب نہیں ڈال رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی ستر پوشی کے باوجود ڈھکے چھپے نہیں رہتے۔ وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس ڈر سے قابو میں رکھتے ہوں گے کہ ہمیں دُنیا وی آنکھیں دیکھ رہی ہیں مگر جوشؔ صاحب کو یہ ملمّع بازی پسند نہیں۔ یہ مصلحت آمیز قسم کی قیود سے قطعی طور پر نا آشنا ہیں۔

میں کئی ایسی شخصیتوں سے واقف ہُوں جنہوں نے اپنے اوپر شرافت کے غلاف چڑھا رکھے ہیں۔ ایسے "اللہ والوں" کو جھانکنا مشکل ہے چہ جائیکہ پڑھ لینا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر سے اگر ایک غلاف اُتار دیا جائے تو وُہ بالکل آدمی کی صُورت میں نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ بعض کے دو غلاف اتارے جائیں تو بعض کے تین اُتریں تو ———— اور بعض شخصیتیں تو بالکل پیاز ہوتی ہیں، چاہے جتنے غلاف اتار ڈالیں، ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا۔

یہ چھوٹے اور بڑوں کو آپ اور جناب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، دوست ہو تو، دُشمن ہو تو، وہ آپ بھی ہے اور جناب بھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جوشؔ صاحب بڑے مؤدّب ہیں۔ جناب! یہ بڑے پھکّڑ بھی ہیں۔ ان کے نزدیک جو زیادہ محترم نہیں وُہ تو آپ اور جناب کے کھاتے میں۔ جو دوست ہے، یار ہے وہ دوسرے کھاتے میں۔ بیچ والا راستہ ان کے یہاں نہیں۔ ابے تبے، تُوں تڑاں اُن کے ہاں نہیں چلتا۔

جس ماحول میں یہ پروان چڑھے وُہ ان کے الفاظ میں یُوں تھا:

ایک بڑے کڑیل پٹھان، بڑے ہی رعب داب والے، ہمارے والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ جب وُہ آتے تو ہمارے والد آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ ہم بڑے پریشان ہوتے تھے کہ ہمارے میاں ایسا کیوں کرتے ہیں۔

ایک دن پُوچھ ہی بیٹھے:

"میاں! کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟"

"ہاں بیٹا! ہم ان سے ڈرتے ہیں"

"آخر کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ یہ صاحب فلاں جگہ کے رہنے والے ہیں۔ کبھی ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ بڑے بہادر اور مالدار تھے مگر اب کچھ عرصے سے ان کے حالات خراب ہو گئے ہیں۔ زندگی کے دن کاٹنے کے لیے اب یہ مجھ سے گزارہ لینے آتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا ہُوں تاکہ نہ آنکھیں چار ہوں اور نہ اُنہیں شرمساری ہو۔"

بچپن کی ایک بات اور بھی سناتے ہیں:

عہدِ طفلی میں ہم پہ بڑی کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ اونچا نہ بولیں، ننگے سر نہ پھریں، کوئی چیز بازار میں نہ کھائیں، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے نہ چلیں۔ ایک دن شامتِ اعمال ہم دونوں بھائی اپنے ایک ہجولی کے ہاتھ

میں ہاتھ ڈال کے گھُوم رہے تھے۔ کسی طرح اس کا علم والد صاحب کو ہوگیا۔ انہوں نے ہمیں سوتے سے جگایا۔ دریافت کیا؛ کیا تم دونوں آج فلاں لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چل رہے تھے؟ ہم نے اقرار کرلیا۔ کیا کرتے!

جس وقت والد صاحب یہ پُوچھ رہے تھے اُس وقت وہ حقہ پی رہے تھے اُنہوں نے حقّہ پر سے چلم اتاری۔ دہکتے ہوئے کوئلے ہم دونوں کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ خبردار! جو آئندہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چلے۔

اس کے بعد جوشؔ صاحب نے یُوں تبصرہ کیا:

والد صاحب نے بھی ہمیں بچپن میں سنوارنے کی کیا کیا ترکیبیں نہ کیں مگر جو ہوں ہی ازلی بدمعاش، بھلا وُہ کیسے سُدھرتے!

یُوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے "انگارہ بازی" ان کے والد کے مزاج میں شامل تھی۔ ایک واقعہ اور بھی میں نے انہی کی زبان سے سنا تھا، ذرا تمہید کے بعد وہ بھی سناتا ہُوں:

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ علامہ جوشؔ ملیح آبادی کو زبان کی غلطیاں پکڑنے کا بڑا شوق ہے (میرے پاس بیٹھے ہوتے تو ابھی کہتے واہ رے نالائق! غلطی کی جمع اغلاط ہے غلطیاں نہیں) پڑھے لکھوں کو بھی نکّو بنا کے رکھ دیں گے یہ جو ایک رسالے کا جوشؔ نمبر نکل رہا ہے وہ ان کے اسی شوق کے صدقے میں تو نکل رہا ہے اس لیے کہ انہوں نے مدیر رسالہ مذکور کے جدّامجد کی کتابوں میں سے اتنی غلطیاں نکالیں کہ انہیں بھی جوشؔ صاحب کی غلطیاں نکالنے کے لیے پورا ایک نمبر چھاپنا پڑ رہا ہے۔

یہ خوبی جوشؔ صاحب کی اکتسابی نہیں بلکہ انہیں وراثتاً ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ کہا:

"پان لگاؤں؟"

تو اباجان نے اسی وقت انگارہ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا کہ

"غلط زبان بولنے پر اسی طرح سزا ملے گی، پان بنایا جاتا ہے لگایا نہیں جاتا۔"

جوشؔ صاحب سے خط و کتابت تھی۔ تکلّف کی سی فضا میں واجبی سے تعلقات تھے۔ میں لاہور سے دلّی پہنچا۔

"جی ہاں!"

"زندہ ہوں۔"

"بہت اچھا، بہت اچھا —— اچھ ——"

"اخاہ! واہ وا، بھئی خوب آئے۔ بیٹھو بیٹھو!"

"میرے ایک دوست پاکستان سے آئے ہیں ان سے کہہ رہا تھا۔"

"کہہ دوں گا۔"

"تم تو اچھی ہو۔"

"کہہ تو دیا ہو جائے گا۔"

"جی ہاں! میں نے کہہ دیا تھا کہ جب وُہ کپڑے پہن لیتی ہیں تو بڑی خوب صورت معلوم ہوتی ہیں۔"

"آہاہاہا!"

"آداب عرض!"

جوش صاحب سے ملنے جب میں ان کے دفتر پہنچا تو وہ ٹیلیفون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ جو اور جس قسم کی باتیں ہُوئیں وہ آپ نے بھی سُن لیں۔

چائے کا آرڈر دیا، چائے آئی، میں نے بنائی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا: "بہت پی ہے، خدا کے لیے مجھے نہ پلایئے!"

"چائے پی لو میاں! خدا وُدا کوئی نہیں ہے۔ خدا کا لفظ تو بزدلی کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ جنگلوں میں رہتے تھے۔ راتوں کو سانپ سُونگھ جاتے تھے، دن کو شیر کھا جاتے تھے، بجلی چمکتی تھی تو لرز جاتے تھے۔ لوگوں نے ان مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دل کو سہارا یُوں دیا کہ کوئی طاقتِ بالا ہے جو ہمیں ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ امید، بزدلی اور ناطاقتی کا نام خدا ہے۔ جب آبا و اجداد خواب میں آنے لگے تو سوچا کہ مرنے کے بعد بھی رُوح باقی رہتی ہے۔ اس سے سمجھدار لوگوں نے بیوقوفوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر خدا کو حقیقت منوا لیا۔"

اس بھرپور وار کے بعد ان صاحب کو چائے پینی پڑی۔ بلکہ انہوں نے پہلے ہی دو ایک فقروں میں چت ہو کر چائے پینی شروع کر دی تھی۔ یہ تقریر کر رہے تھے، وہ چائے پی رہے تھے۔ جب یہ چائے پینے لگے تو انہوں نے ایک سوال اور جھاڑ دیا:

"جوش صاحب! آپ کچھ بھی کہیں مگر آپ لوگوں کے دلوں سے خُدا اور مذہب کے تصوّر کو ختم نہیں کر سکتے۔"

"جناب! ایک بات تو یہ ذہن میں رکھیں کہ رسولؐ نے خدا کو پیدا کیا۔ ورنہ اللہ تھا کہاں، کوئی بھی رسولؐ سے پہلے ان "صاحب" سے واقف نہ تھا۔ رسولؐ نے مذہب کی آڑ میں لوگوں کو لالچ بھی دیا، ڈرایا بھی، دھمکایا بھی ——— لالچ یہ دیا کہ اگر تم اللہ کے بتائے ہوئے دین پر چلو گے تو مرنے کے بعد جنّت میں جاؤ گے، جنّت میں شراب ملے گی، حُوریں ملیں گی، دُودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ چونکہ اہلِ عرب شراب کے رسیا تھے اور عورتیں ان کی کمزوری تھیں، اس لیے وُہ رسولؐ کے کہنے سننے میں آ گئے (نقلِ کفر، کفر نباشد) اس لیے کہ رسولؐ نے موت ایسی خوفناک حقیقت کو بھی لذیذ ترین شَے بنا دیا تھا۔ محمدؐ واقعی دنیا کا سب سے بڑا انسان گزرا ہے جس نے عرب ایسی جاہل قوم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔ اسی لیے میں نے کہا ہے:

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے — اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ورنہ مذہب تو فطرتِ انسانی کے ساتھ ایک گستاخی ہے۔"

میں نے بھی ذرا چڑایا :

"یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کے ہاں مذہب کی بنیادیں لرز رہی ہیں مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو مذہب ہی سب کچھ ہے" (یہ باتیں اُن دنوں کی ہیں جب جوش صاحب بھارت کے شہری تھے)

"جی ہاں! مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بھی کیا ہے۔ آپ کے ہاں کا جو سب سے بڑا مولوی ہے وُہ اور مَیں بھوپال میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت تو وہ بالکل آدمی تھے اب مولوی بن گئے ہیں، لیڈر بن گئے ہیں۔ پیٹ بُری بلا ہے۔ اگر اُن کے معاشی حالات اچھے ہوتے تو وہ ہرگز مولوی نہ بنتے، بدستور آدمی بنے رہتے۔ مجھے ان سے اور کوئی شکایت نہیں بجز اس کے کہ وہ پڑھے لکھے ہو کر مولوی بن گئے۔ خوب بیچا انہوں نے بھی مسلمان قوم کو۔ مذہب کے نام پر کوئی جتنا چاہے اسے بیوقوف بنالے۔"

باتوں کا رُخ بڑا غلط ہو گیا تھا اس لیے حاضرین میں سے کسی نے کہا :

"جوش صاحب! ان باتوں کو چھوڑیئے، کوئی رُباعی چھیڑیئے۔"

"بہت اچھا ڈارلنگ!" کہہ کر سامنے رکھی ہوئی ڈبیا سے پان لے کر شعر و شاعری کا آغاز فرما دیا۔ بہت سی رُباعیاں پڑھیں، ان میں سے دو چار آپ بھی سُن لیں : ؎

تحقیق کو جس وقت بصیرت نکلی — پردہ میں ذہانت کے غباوت نکلی
جب علم کی سطح کو ذرا سا کُھرچا — اک جَو کی مسافت پہ جہالت نکلی

———

اللہ میں حکمت جو نہیں پاؤں گا — میں حشر میں بندگی سے شرماؤں گا
ہو گی جو بجائے عدل رحمت مجھ پہ — تو اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گا

———

چونکہ اس وقت ان کا مُوڈ مذہب اور علم کے دھارے کی طرف بہہ رہا تھا اس لیے انہوں نے رباعیاں بھی ویسی ہی پڑھیں۔ یہ بحث بعد میں کریں گے کہ مذہب کے معاملے میں ان کے اصلی خیالات کیا ہیں اور ان کی باتوں میں زیبِ داستاں کے لیے کتنا کچھ ہوتا ہے اور کیوں!

یہاں ذرا "ذہن کا ذائقہ" بدلنا چاہیے اور جوش صاحب کے خاص رنگ کی بھی ایک دو رُباعیاں سُن لینی چاہئیں جو اُنہوں نے اسی وقت آنکھیں بند کر کے اور لہرا لہرا کے پڑھی تھیں : ؎

زلفیں باندھیں مگر بکھرتی ہی رہیں — گھڑیاں روکیں مگر گزرتی ہی رہیں
امید کا رخسار میں بھرتی رہیں رنگ — اور یاس کی جھُریاں اُبھرتی ہی رہیں

———

کاکُل کُھل کر بکھر رہی ہے گویا　　زمی سے ندی گزر رہی ہے گویا
آنکھیں تری جُھک رہی ہیں مجھ سے مل کر　　دیوار سے دُھوپ اُتر رہی ہے گویا

یہ تھی میری تفصیلی ملاقات۔ سن ہوگا ۱۹۵۴ء!

میں اُن کے پاس وہاں دو گھنٹے بیٹھا ہُوں گا۔ ان کی باتیں ایسی مسحور کُن تھیں کہ مجھے اُن کے تکلّم کی سحرآفرینیوں میں گُم ہو جانا پڑا۔ یہ ہر بات کو اُس انداز میں نہیں سوچتے جس طرح سوچا جاتا ہے بلکہ اُن کے سوچنے کا انداز بھی اپنا ہے، جو عجیب و غریب ہونے کے باوجود غور و فکر پہ آمادہ کر لیتا ہے۔

شام کو پھر جوش صاحب نے اکٹھے مل بیٹھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کھانے کی دعوت دی اور یہ بھی نوید سُنائی کہ شعر و شاعری بھی ہوگی۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں پہنچا مختصر سی نشست تھی۔ جمپئی بوتل سامنے رکھی تھی۔ اُس شعلۂ دارو سے سبھی کو شوق فرمانے کی دعوت دی گئی۔ اپنے اپنے ظرف کے مطابق سبھی نے ہاتھ بڑھائے جو میری طرح کے ازلی بُزدل تھے وہ تشنہ لب رہے۔

یہ پیتے جاتے تھے اور شراب پر وعظ فرماتے جاتے تھے اور ہم بزدلوں کو سمجھا رہے تھے کہ اسلام کی رُو سے بھی شراب پینا ناجائز نہیں ہے اس لیے کہ قرآن میں آیا ہے:

جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز مت پڑھو۔

مگر نشے کی حالت میں شعر کہنے، پڑھنے اور سُننے سے نہیں روکا گیا۔ میرے نزدیک تو یہ بھی ایک عبادت ہے۔ نماز روزہ تو انسان اپنے لیے پڑھتا اور رکھتا ہے مگر شاعر اپنا خونِ جگر، اللہ کے بندوں کے لیے صرف کرتا ہے۔

یہ ماحول تھا جس میں جوش صاحب نے اپنی نظم "جھومتی برسات" شروع کی اور ایسے جذب کے ساتھ پڑھی کہ لطف آگیا۔ اس میں ایک لطیفے کی بات یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے یہ نظم ترنم کے ساتھ پڑھی۔ ترنم تو خیر پٹھانی قسم کا تھا لیکن اُس ترنم میں ذرا سی ایک بات ضرور تھی۔ میں اس نظم کے کئی مصرعوں پر کھو سا گیا۔ میں شعر بڑے بے ڈھنگے طریقے سے سُنتا ہُوں۔ وہ یُوں کہ شاعر ہلکان ہو رہا ہے اور میں چُپ بیٹھا ہُوں۔ کبھی کسی شعر پہ واہ کہہ دیا تو کہہ دیا ورنہ چُپ۔ وُہ بھی اتنی مدھم آواز میں کہ شاعر سُن نہ سکے۔ لیکن اُس دن نظم سنتے ہُوئے مَیں نے اپنی روایات کو توڑ دیا تھا۔ میں بیخود ہو گیا، سرشار ہو گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے جی کھول کر داد دی۔ میرے جاننے والے حیران تھے کہ مَیں موج میں ہُوں حالانکہ میں موج میں نہ تھا بلکہ اُس دن مجھے اندازہ ہُوا کہ کوئی کتنا ہی بدذوق کیوں نہ ہو وُہ اچھے شعروں پر وجد میں بھی آسکتا ہے۔

اس ضمن میں مجھے ایک بات یاد آئی۔ نواب جعفر علی خاں اثرؔ لاہور آئے ہُوئے تھے۔ وُہ میرے ہاں تشریف لائے، میں نے اُن سے عرض کیا کہ آپ مجھے دُوسرے شعرأ کے اچھے شعر سنائیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اُن دنوں فراق گورکھپوری اور اثر لکھنوی میں ٹھنی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف لکھنا نقوش ہی سے شروع کیا تھا۔ اور اثر صاحب مجھے فراق پارٹی کا آدمی سمجھتے تھے۔

اثر صاحب نے بڑے بڑے پیارے شعر سنائے۔ میں بیحد لطف اندوز ہوا۔ مگر اُنھوں نے ایک شعر ایسا سنایا کہ میں تڑپ اُٹھا، بے اختیار ہو گیا۔

اثر صاحب نے میرا رنگ دیکھا تو فرمایا:

"اب تو بے قابو ہونا ہی تھا"

میں نے سنبھل کر کہا:

"جی!"

"میں نے بڑے بڑے اساتذہ کے شعر سنائے مگر اُچھلے تو فراق کے شعر پہ۔"

میں نے عرض کیا:

"آپ مجھ سے جس کی چاہے قسم لے لیں مجھے اس سے پہلے علم نہ تھا کہ یہ شعر فراق کا ہے۔"

معلوم ہوا کہ اچھا شعر ہو تو وہ پتھر ایسے آدمی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

ہاں تو بات جوش کی نظم "جھومتی برسات" کی ہو رہی تھی ——— اس کے بعد میں نے دوبارہ یہی نظم ایک ایسی رنگین محفل میں سُنی کہ جس کا ماحول ہی شاعرانہ تھا۔ متعدد مجسّم شعر اور متعدد مجسم مصرعے بہ نفسِ نفیس موجود تھے اور راجہ اندر یعنی کہ جوش صاحب لہرا لہرا کے پڑھ رہے تھے:

ہاں، دیکھ، ذرا برسے سروِ لبِ جُو
گھنگھور گھٹاؤں کا یہ چلتا ہُوا جادُو
زرتار دُپٹوں کے یہ اڑتے ہوئے پلّو
یہ کُنج میں رندانِ سیہ مست کی یاہُو
اے دولتِ پہلو

ہاں تان، اڑا تان، قمر پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلو

ساحل پہ یہ اُڑتے ہُوئے جنّت کے نظارے
افلاک پہ یہ سُرخ دوشالوں کے کنارے
بجلی کی لپک میں یہ حسینوں کے اشارے
اُمڈے ہُوئے دریا کے اُبلتے ہُوئے دھارے

دھاروں میں گھری ناؤ کے مُڑتے ہُوئے چپّو
اے دولتِ پہلو
ہاں سوچ، دِوانے ہوں نہ کس طور سے لحات
جب ناز سے ابھرے ہوئے کُولھے پہ دھرے ہات
دن کو ہو فروشندہ و رقصندہ جواں رات
کیا بات ہے، برسات ہے، برسات ہے برسات
لہراؤں سماوات پہ چل جائے جو قابُو
اے دولتِ پہلو
ہاں، تان اڑاتان، قمر پارہ و گل رُو
اے دولتِ پہلُو

اُس ماحول نے اس نظم کو بڑا دُور پہنچا دیا تھا۔ ہر مصرعے پر جوشؔ صاحب کے اشارے اور قدرے ایکٹنگ غضب ڈھا رہی تھی۔ تصوّر فرمائیے جب زرتار دُپٹّوں کے ذکر پر، زرتار دُپٹّوں کی طرف اشارے ہوں۔ گُنج میں رندسیہ مست کی یا ہُو کے وقت یا ہُو کے نعرے لگیں۔ بجلی کی لپک میں، حسینوں کے اشاروں پر، اشالے ہوں۔ "اور پھر ناز سے اُبھرے ہوئے کُولھے پہ دھرے ہات" پر ان کا کُولھوں پہ ہاتھ دھر کر ایکٹنگ کرنا، جو سننے والا سماں نہیں اور یہ سب کچھ مخصوص دوستوں کی محفل ہی میں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ماحول میں ہر پتّہ ڈول رہا تھا۔

میں نے جان بُوجھ کر، آپ کو جوشؔ صاحب کی ملحدانہ سوچوں سے دُور لے جانے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ میں نے کوشش اس امر کی بھی کی کہ ذکر "پری وشں" کا چھڑ جائے تاکہ آپ کا دل بہلا رہے اس لیے کہ انسان یا تو خدا کے نزدیک ہونے میں خوش رہ سکتا ہے یا پھر ——— یا پھر ——— !

اللہ کا شکر ہے کہ بعد میں بھی جوشؔ صاحب سے ملنا جلنا رہا۔ ورنہ میری بھی ان کے بارے میں وہی رائے ہوتی جو اس وقت آپ کی ہے۔ یہی کہ "بدتمیزی کی حد تک مذہب دشمن ہیں"۔

مذہب کے معاملے میں ناپختہ عمر تک سبھی ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند، چہرے پہ نورانی ڈاڑھی۔ غرض مجھ جیسے اور آپ جیسے مسلمان تھے جو زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہتے ہوں اور خدا اور رسولؐ کا نام آتے ہی گردن جُھک جاتی ہو۔ مگر ہمارا عمل سراسر غیر اسلامی، نماز روزہ بھی دکھاوا۔ اس لیے کہ جب تک مذہب کی رُوح کو سمجھا نہ جائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال نہ لیا جائے اس وقت تک تمام نعرے سیاسی اور کاروباری ہوں گے۔ آج کسی بھی بڑے سے بڑے عالم کو دھیان میں رکھ لیجئے اور اس کا مقابلہ رسول اللہؐ کے کسی ادنیٰ سے صحابی سے بھی کر کے دیکھ لیجئے عقل و ہوش کی ساری سیڑھیاں کھسکتی نظر آئیں گی۔

جوشؔ صاحب جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں مَیں ان کا ہمنوا نہیں، قطعاً نہیں۔ اور میں اُن مولویوں کا بھی ہمنوا نہیں جو خدا اور رسولؐ کا ذکر بھی معاوضہ لے کر کرتے ہوں بلکہ میرے دل میں اُن درویشوں اور اُن بوریہ نشینوں کا احترام ہے جنھوں نے مذہب کی خدمت اس انداز سے کی جس میں نمائش کا کوئی پہلو نہ تھا بلکہ عاجزی ہی عاجزی تھی۔

جوشؔ صاحب آج بظاہر دہریے نظر آتے ہیں مگر یہ کٹّر شیعہ بھی تو ساتھ ہی ہیں۔ کیا کوئی شیعہ دہریہ ہو سکتا ہے؟ آپ کہیں گے ہو کیوں نہیں سکتا! جوشؔ صاحب ہی کو دیکھ لیجئے۔ مگر یہ جواب تسلّی بخش نہیں۔ اس لیے کہ دہریہ کبھی بھی شیعہ نہیں ہو سکتا۔

یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور امام حسین علیہ السلام کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ رسولؐ کی عظمت کو بھی دل و جان سے مانتے ہیں۔ بس ذرا خدا سے دل لگی رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ہم جیسے ۳/۴ مسلمان ہیں اور ۱/۴ جو مسلمان نہیں ہیں تو اس قلابازی کی بھی ایک وجہ ہے۔ جب یہ حیدر آباد دکن میں ملازم تھے تو انہیں ایک دن یک لخت یہ آرڈر ملا کہ پندرہ دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیے۔ اس وقت ان کا ساتھ کوئی دس بارہ آدمیوں کا تھا۔ دو بچّے تھے، بیوی تھی اور اس کے ساتھ عزیز و اقارب۔ حیدر آباد سے نکلے تو تین برس تک ذہنی اذیتوں میں مبتلا رہے۔ پیٹ کی مار کے ہاتھوں عاجز رہے۔ تن کا رشتہ رُوح سے برقرار رکھنا محال ہو گیا۔ اس وقت جو ڈگمگائے تو آج تک نہیں سنبھلے۔ کہتے تھے کہ خدا کہتا ہے:

میں رزّاق ہُوں۔

اور میں ہُوں کہ نانِ شبینہ کا بھی محتاج ہُوں۔ اگر خدا ہوتا تو اپنے بندے کو یُوں عاجز نہ بناتا۔ یہ تھے وہ واقعات و حالات جن میں یہ خدا سے ناراض ہُوئے۔ خدا کے مُنکر تو آج بھی نہیں، زبان سے کچھ ہی کہتے رہیں مگر خدا کے وجود کا اقرار قدم قدم پہ کرتے ہیں، اس وقت بھی کیا جب یہ اُفتاد پڑی تھی ؎

اس تلاطم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی ایزد باری

جوشؔ صاحب خدا سے ناراضی کا ایک اور واقعہ بھی سُنایا کرتے ہیں:

"میں ایک دن صبح ہی صبح سیر کے لیے نکلا کہ دیکھتا ہُوں ایک بُڑھیا پھٹے حالوں، لاٹھی ٹیکتی چلی آ رہی ہے۔ مجھے ترس آیا۔ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کے دیا اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہا:

"ابھی میری بہن زندہ ہے، وُہ مجھے پانچ روپے مہینہ گزارہ کے لیے دے دیتی ہے۔ جیسے تیسے گزارہ کر لیتی ہوں۔ جس دن وُہ مر گئی اُس دن شاید مانگنے کی بھی نوبت آ جائے مگر ابھی نہ لُوں گی۔"

میں نے سوچا، کتنی خود دار ہے یہ بُڑھیا! اس کی حالت پر مجھے ترس آ رہا ہے۔ مگر رب العالمین کو ترس نہیں آیا تھا۔ اس بات نے مجھے خدا سے بغاوت پر آمادہ کیا۔ وہ دن اور آج کا دن، اپنی خدا سے نہیں بنی۔"

ایک دن یہ خدا کے بارے میں' اپنے ایسے ہی" ارشاداتِ عالیہ سے حاضرین کو مستفید فرما رہے تھے کہ :

" جہالت کی کوکھ سے خدا کا وجود ظہور میں آتا ہے "

اس پر میں نے کہا :

" جوش صاحب ! اگر خدا سچ مچ نکل آتے تو پھر آپ کا کیا بنے گا ؟ "

کہنے لگے :

" ایسی صورت میں اللہ میاں مُسکا کے بغل گیر ہو جائیں گے اور کیا ہو گا ۔ خدا جسے ہم سب رحیم اور کریم کہتے ہیں ۔ وہ یقیناً ظالم نہ ہو گا کہ اپنے بندوں سے انتقام لے ۔"

یہ عام آدمیوں سے ذرا مختلف طریقوں سے سوچتے ہیں ۔ خطا ہے تو اتنی ! اگر مندرجہ ذیل واقعہ کسی اور کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو وہ نہ جانے خود کو ولایت کی کون سی منزل پر پہنچا دیتا ۔ کہتے ہیں عرصہ ہُوا میں نے ایک نعت لکھی تھی بڑے ہی جذب کے ساتھ ۔ اسی رات خواب میں ایک بزرگ شخصیت کو دیکھا ۔ احساس ہوا رسولؐ اللہ ہیں ۔ کمرہ بھی معطّر ہو گیا ۔ معاً جاگ اُٹھا تو مجھے کمرہ ویسا ہی معطّر ملا ۔ خوشی اور حیرت کے ساتھ بیگم کو آواز دی ۔ وہ آئیں تو کہنے لگیں ، کمرہ بڑا معطّر ہے ۔ اس کے بعد میں نے نوکر کو آواز دی ۔ وُہ آیا تو وہ بھی کہنے لگا کہ کمرے سے خوشبو آ رہی ہے !

میں سوچنے لگا کہ آخر ایسا ہُوا کیوں ؟ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ یہ سب میرے ہی تخیّل کا تعطّر تھا اور اس میں کوئی کراماتی یا روحانی پہلو نہ تھا ۔

واقعی اگر یہی خواب کسی مولوی کو آجاتا اور یہی کچھ وہ محسوس کرتا تو وہ اپنا بھی دماغ خراب کر بیٹھتا اور اوروں کا بھی !

جس حیدر آباد سے یہ نکلے وہاں جانے کا وسیلہ عماد الملک بنے ۔ اُنھوں نے ہی نظام سے انہیں روشناس کرایا تھا ۔ عماد الملک نے یہ کہہ کر ان کی تعریف کی کہ اس وقت جوش ہی ہندوستان کا منفرد شاعر ہے جو اپنے اندر جان رکھتا ہے اور یہ بھی کہا کہ میں نے آج تک کسی شاعر کی تعریف نہیں کی مگر مجھے جوش کے کلام نے اتنا متاثر کیا ہے کہ آپ سے عرض کروں کہ انہیں یہاں بہ طور خاص بلایا جائے ۔ اس وقت عماد الملک کی بڑی پوزیشن تھی اور جوش صاحب اتنے بڑے شاعر نہ تھے ۔ بس ستاروں پہ کمندیں پھینکنے والے ایک اُبھرتے شاعر تھے ۔ چنانچہ ان کا تقرر نظام کے حکم سے ہُوا ۔ کوئی جگہ نہ تھی مگر انہیں (بقول شاہد احمد دہلوی) انگریزی ادب کے شعبۂ تراجم میں دھانس دیا گیا ۔

بعد میں تو حیدر آباد میں ان کا خوب طوطی بولا ۔ امرأ و رؤسا سے یہ ایسے ملتے تھے جیسے وُہ کوئی ان کے ذلیل ہوں ، ماتحت ہوں ۔ نظام کے ہاں بھی انہیں درباری ضابطوں کی رعایتیں تھیں ۔ مثلاً نظام کی خدمت میں حاضر

ہونے کے لیے ایک خاص قسم کے لباس کی ضرورت تھی جس سے جوشؔ صاحب مستثنیٰ تھے ——— اور پھر یہ واقعہ بھی اُسی حیدر آباد میں پیش آیا کہ جب یہ نظام کے حکم سے پندرہ دن کے اندر اندر حیدر آباد چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو وہ لوگ جو اُنھیں روزانہ گھیرے رہتے تھے اور ان سے سَو طرح کے فائدے اٹھاتے تھے۔ وہ سب کے سب پَر لگا کے اُڑ گئے۔ جس وقت اُنھوں نے حیدر آباد کو چھوڑا اس وقت اسٹیشن پر ایک شخص بھی خدا حافظ کہنے والا نہ تھا۔

نظام کے منجھلے لڑکے معظّم جاہ سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ پہلے یہ پیتے تو تھے مگر اتنے باقاعدہ نہ تھے۔ وہاں کی روزانہ نشست میں روزانہ چلی اور خُوب چلی۔ معظّم جاہ باواجان کے چھیتے بیٹے تھے۔ چنانچہ اُس عالم میں اُن کے مُنہ میں جو آتا کہہ گزرتے۔ وہ کہتے، باواجان کنجوس ہیں۔ تو یہ کہتے: ارے کنجوس، مہاکنجوس۔ وہ کہتے: باواجان بڑے تھرڈ کلاس انسان ہیں۔ تو یہ کہتے: تھرڈ کلاس۔ اتنا چھوٹا آدمی تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ ایسے ہی کی حالت میں معظّم جاہ نے کہا:

"اچھا تو پھر باواجان پر نظم ہو جائے۔"

اُنھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اور اسی حالت میں نظم فرما دی۔ وہ تو تھا بیٹا۔ اس لیے چھوٹ نہ سکا۔ یہ تھے شاعر، دھکیل دیے گئے۔

ہاں صاحب! شراب پینے کا تو لُطف ہی یہ ہے کہ خود بھی بہکے، اپنے ہم نشین کو بھی بہکائے۔ انشاؔ نے جو کہا ہے،

"تُو بھی بہک مجھے بھی بہکا"

تو کچھ غلط نہیں کہا۔

جوشؔ صاحب نے بھی، حیدر آباد سے بھاگنے کی بابت کچھ یُوں بتایا تھا:

"ہم نے نواب کی ملازمت جتنا عرصہ بھی کی خوش نہ رہے بلکہ اپنی بدبختی پر، گھر آکر، اپنی بیوی کے سامنے رویا کرتے تھے۔ نواب کی سی آئی ڈی زوروں پہ ہوتی تھی۔ کسی نے بات نواب صاحب تک پہنچا دی کہ جوشؔ صاحب آپ کی نوکری کو بدبختی کی علامت سمجھتے ہیں اور گھر جاکر رویا کرتے ہیں۔

دُوسرے ہم نے نواب کے خلاف نظم لکھ ڈالی اور اسے امرا۔ اور وزرا کی محفل میں پڑھ ڈالا۔ سب سنّاٹے میں آگئے۔ مجھ سے کہا:

جوشؔ صاحب! یہ آپ نے کیا غضب کر دیا!

مجھے اپنا انجام نظر آرہا تھا اس لیے میں نے استعفا لکھ کر بھیج دیا کہ مجھے نوکری سے سبکدوش کر دیا جائے۔ جنگل کی آگ کی طرح، ایک ہی دو گھنٹوں میں میرا استعفا نواب صاحب تک پہنچ گیا۔ نواب صاحب اور بھنّائے کہ ایک تو ہمارے خلاف نظم پڑھی، الٹا استعفا لکھ کر بھیج دیا۔ یعنی برطرف کرنے کا حق بھی ان کے استعفیٰ نے

باقی نہیں چھوڑا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ لکھ دیجئے! استعفا منظور، اور پندرہ دن کے اندر خارج البلد کیا جاتا ہے۔ اس پر نواب صاحب خوش ہوئے کہ ہاں ہاں بات بن گئی۔

جوش صاحب کہتے ہیں کہ میری اتنی گستاخی پر بھی نواب صاحب یہ چاہتے تھے کہ ہم کسی طرح سے معافی مانگ لیں اور نوکری بحال کر دی جائے۔ مگر میں نہ مانا اور میں نے حیدر آباد کو خیر باد کہہ دیا، حالانکہ میرے دوست، میری بیوی کہتی تھی: نوکری کا معاملہ ہے معافی مانگ لیجئے۔ مگر میں نے اپنی خود داری کو چند سکوں کے عوض نہ بیچا۔

اب یہ روزانہ پیتے ہیں، باقاعدگی سے پیتے ہیں۔ گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں۔ گھڑی اتنی باقاعدہ نہیں چلتی جتنے یہ باقاعدہ چلتے ہیں۔ ایک بار جب گاندھی جی نے انھیں شام کا وقت ملنے کے لیے دیا تو انھوں نے کہا:

"گاندھی جی! کوئی اور وقت دے دیجئے، یہ وقت تو میرے شراب پینے کا ہے۔"

جوش صاحب کے جو دوست شراب نہیں پیتے اُن پر یہ پھبتیاں کستے ہیں، نابالغ قرار دیتے ہیں، بچہ پارٹی کہتے ہیں۔ ان باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جوش صاحب پینے کو بُرا نہیں سمجھتے۔ مگر جب بیٹے نے پینی شروع کر دی تو انہیں دلی صدمہ ہوا۔ کہا: "وہ منحوس گھڑی تھی جس میں میں اس نابکار کا شکار ہوا تھا۔ مگر میں نے تو اپنے آپ کو سنبھال لیا، مگر سجاد کا کیا ہو گا!"

ابھی ابھی بہکنے اور بہکانے کے سلسلے میں انشاؔ کا ذکر آیا تھا۔ انشاؔ کے ذکر سے ایک اور بات ذہن میں اُبھرتی ہے کہ اردو شاعری کے اُفق پر انشاؔ نہ اُبھرا ہوتا تو جوشؔ پیدا ہی نہ ہوتے۔ یہ انشاؔ نامی شخص بھی کیسے کیسے الفاظ کو روندکر آگے بڑھا۔ نئے نئے الفاظ گھڑنا، نئی نئی تشبیہات تراش لینا، جوشؔ کے ہاں ورثہ ہے انشا کا، جوشؔ کی قادرالکلامی مسلّم۔ مگر جوشؔ کے مصرعوں میں انشاؔ جھانکتے ہیں۔ میں جوشؔ کو انشاؔ سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں مگر یہاں ذکر اس ذہنی غذا کا ہے جو انشاؔ کے توسط سے جوشؔ تک پہنچی۔

میں نے یہاں انشاؔ اور جوشؔ کا بلاوجہ موازنہ کر ڈالا۔ ایسا صرف میں نے ایک نکتے کی وضاحت کے لیے کیا ہے ویسے میں میرؔ و غالبؔ کے گز سے، دُوسرے شاعروں کو ناپنے کا قائل نہیں ہُوں۔ اس ویسے میں آپ سے بھی کہوں گا کہ آپ جوشؔ کو جوش کی حیثیت سے اور انشاؔ کو انشا کی حیثیت سے ناپیں۔ یہ دونوں صرف ایک پڑاؤ پہ اکٹھے نظر آتے ہیں ورنہ شعری زندگی کے میدان میں دُور دُور کھڑے ہیں۔

جوشؔ صاحب کو شاعرِ انقلاب مان لیا گیا ہے۔ مگر میں انہیں شاعرِ جمالیات ہی سمجھتا ہوں اس لیے کہ شاعرِ انقلاب اگر کوئی ہُوا ہے تو وہ صرف نذرالاسلام ہے۔ ہاں کسی حد تک اقبال کو بھی شاعرِ انقلاب کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اقبال نے سوچے سمجھے انداز میں انقلاب آسا سُروں کو الاپا۔ مگر جوشؔ نے جوش میں آکر بھی ایسا نہیں کیا۔ گھن گرج اور توڑ پھوڑ والی شاعری تعمیری نوع کی انقلابی شاعری نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے ہاں بھی انقلابی شاعری کا صرف جسم ملتا ہے رُوح نہیں ملتی۔ انقلابی شاعری کی رُوح اگر کسی کے ہاں ہے تو

وہ صرف نذرالاسلام ہے۔ اقبال بنیادی طور پر صرف شاعرِ ملت ہیں۔ اس میں ان کے ہاں جسم بھی ہے، روح بھی ہے۔

انقلاب ذہنوں کو کتنا ہی لبھائے مگر وہ کلیتہً تعمیری نہیں ہوتا۔ تعمیری ارتقاء تو ایک تدریجی عمل کا نام ہے۔ جس سے فکر و عمل کا ایک مخصوص سانچا تشکیل پاتا ہے اور انقلاب محض بدنظمی ہے جس سے بگاڑ کے تو بہت سے پہلو نکلتے ہیں مگر بناؤ کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ محض داخلی شاعری پوری شاعری نہیں ہوتی۔ خارجی شاعری کی چاشنی کے بغیر پورا شاعر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ جوش کے ہاں یہ دونوں پہلو ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ کبھی ان پر خارجی شاعری کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی داخلی کا۔ دونوں چیزیں بیک وقت اور ایک ہی تخلیق میں ان کے ہاں نہیں ملتیں یا کم ملتی ہیں ایک اعتبار سے یہ بات اچھی بھی ہے کہ ان کی تخلیقات کا ایک موڈ اور ایک آہنگ ہوتا ہے۔ یہ نظم کو غزل کی طرح ملغوبہ بنانا نہیں چاہتے۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ آج کل ان کی چھوٹی چھوٹی سی اور پیاری پیاری سی جو نظمیں سامنے آ رہی ہیں وہ کچھ غزلِ مسلسل ہی کے سے انداز کی ہیں جیسے "دعوتِ سفر" اور "مقدمِ بہار"۔

غزل کے بارے میں ان کے تاثرات تو آپ نے سُنے ہی ہوں گے۔ ایک حکایت یہ بھی ہے۔ الفاظ بھی انہی کے ہیں:

"ایک مرتبہ دہلی میں جگر، فراق وغیرہ سے غزل کے متعلق بحث ہو گئی۔ اُنھوں نے پوچھا: "آپ غزل کے اتنے مخالف کیوں ہیں؟"

میں نے جواب دیا: "یہ میں اس وقت نہیں کل صبح آپ کے ہوٹل میں آ کر بتاؤں گا۔"

چنانچہ دُوسرے دن صبح پیدل وہاں پہنچا، انہوں نے پُوچھا:

"جوش صاحب! اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

میں نے کہا:

"قبلہ! کیا عرض کروں، کوئی سواری نہیں ملی۔ پیدل چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے اور جواہر لعل کا بیان مجھے بڑا پسند آیا۔ ویسے اسٹالن قابل آدمی تھا اور پکاسو کا آرٹ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مگر میر کا کلام سراپا الہام ہے۔ کل جو پٹنہ کے قریب گاڑی لڑی ہے اتنا بڑا حادثہ میں نے کبھی نہیں سنا۔"

ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ جگر نے بیچ میں ٹوک کر کہا: "جوش صاحب! آپ کیا اُول فول بک رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا:

"حضور! اول فول نہیں بک رہا ہُوں غزل کہہ رہا ہوں۔"

ان میں ایک بات اور عجیب دیکھی کہ آپ غزل کے بڑے دشمن ہیں۔ لیکن شعر و شاعری کے سلسلے میں جب کسی

سند کی ضرورت پیش آئے گی تو پڑھیں گے غزل کے شعر۔ آپ خدا کے بھی خلاف ہیں لیکن قدم قدم پر خدا کے وجود کا بھی اقرار کرتے جائیں گے۔ اب ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے تو کیا کرے ——— واقعی یہ ایک چکرا دینے والی شخصیت ہیں۔

(جگر کے انتقال کو ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ان سے استفسار کیا)

"جگر کی شاعری کے بارے میں حضور کی رائے کیا ہے؟"

"اپنا مسلک چھوڑوں تو بات کروں۔ یہ تو آپ کو علم ہی ہے کہ میں صنفِ غزل کے خلاف ہوں اور جگر غزل کے شاعر تھے۔"

"آپ اپنے مسلک سے تھوڑی دیر کے لیے ہٹ جائیں۔"

"یہ بات ہے تو جگر غزل کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ بڑا رچا ہوا مذاق پایا تھا۔ ڈوب کر کہتے تھے۔ مگر آخری دنوں میں جذبے کی وہ شدت نہیں رہی تھی۔"

"یہ بات تو نہیں۔ ان کی آخری دور کی شاعری میں زیادہ غور و فکر ملتا ہے۔ زیادہ جان دار غزلیں ملتی ہیں۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے مگر وہ والہانہ پن جاتا رہا، جیسے ؏

میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

دوسرے جگر کے ساتھ فراق بھی غزل کے شاعر ہیں۔ فراق کے ہاں WIT زیادہ ملتی ہے اور جگر کے ہاں تغزل۔"

میں نے شرارتاً کہا،

"جگر کے ساتھ فراق کا نام نہ لیں۔ فراق تو شعر کہتے چلے جاتے ہیں خواہ وہ بحر میں ہوں یا نہ ہوں۔"

"فراق بحر کے نہیں لہر کے آدمی ہیں مگر دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور بڑا اونچا مقام ہے۔ بہر حال جگر کے انتقال سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تنہائی میں اضافہ ہوگیا ہو!"

میں نے کہا: "آپ کو چاہیے کہ اُن پہ ایک بھرپور مضمون لکھیں۔"

"ہاں لکھوں گا۔ میں جو اپنی سوانح (یادوں کی برات) لکھ رہا ہوں، اس میں اپنے سارے دوستوں کا ذکر تفصیل سے کروں گا اور اس میں اپنے اٹھارہ معاشقوں کا بھی ذکر کروں گا۔"

"سب کچھ سچ سچ لکھ دیں گے؟"

"فی الحال تو شاعری کروں گا مگر لکھ کے رکھ جاؤں گا۔ کہہ دُوں گا کہ میرے مرنے کے بعد وُہ حصّہ بھی شائع کردیا جائے۔"

"ہمّت ہے تو ابھی چھپوا ڈالیے نا!"

"بھئی میرا تو کچھ نہیں جن کا ذکر کروں گا ان کے لیے مصیبت ہو جائے گی ــ ان کے شوہر پُوچھیں گے ——— اچھا تو تُو جوشؔ کے ساتھ پھنسی ہُوئی تھی۔"

دوسری مرتبہ جب میں دِلّی گیا تو جوشؔ صاحب اپنے کمرے میں نہ تھے۔ ایک صاحبہ تشریف فرما تھیں۔

وُہ بار بار گھر پہ ٹیلیفون کر کے معلوم کرنا چاہ رہی تھیں کہ جوشؔ صاحب گھر پہ ہیں یا نہیں !

وہیں بیٹھے بیٹھے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھایا ۔ آواز آئی :

"یہاں کون صاحبہ بیٹھی ہُوتی ہیں ؟"

میں نے کہا :

"مجھے تو معلوم نہیں کہ کون ہیں مگر آپ کون بول رہی ہیں ؟"

جواب ملا :

"میں بیگم جوشؔ بول رہی ہُوں ۔"

اس پر میں نے کہا :

"بھابی ! آداب عرض !"

بیگم جوشؔ نے اس وقت نہ جانے مجھے جوشؔ صاحب کا کون سا دوست سمجھ کر یہ کہا :

"جوشؔ صاحب کے کیریکٹر کا خیال رکھنا آپ لوگوں کا کام ہے ۔ میں تو گھر میں رہتی ہُوں ۔ مجھے کیا پتا کہ وہاں کیا گلچھرّے اڑا رہے ہیں ۔"

اب میں ان کے گلچھرّوں کا جواب کیا دیتا ، چُپ ہو رہا ۔

جوشؔ صاحب نے ایک جگہ اپنے اوّلین عشق کا حال مزے لے لے کر بیان کیا ہے ۔ دلچسپی ہو تو اسے پڑھ لیں ۔ اللہ والے ہوں تو دو ایک ورق اُلٹ کر آگے چل دیں :

"فراغت کی ریل پیل اور رنگ رلیوں کا دَور دَورہ تھا ۔ اس لیے کیسے ممکن تھا کہ میری "مونچھوں کے کونڈے" کا جشن بڑے دُھوم دھڑکّے سے نہ منایا جاتا ۔

تفصیلات سے قطع نظر کر کے صرف دو مجروں کا حال بیان کرنا چاہتا ہُوں :

رات ہوتے ہی جگ مگ جگ مگ کرنے والے شامیانے میں علی جان کاشمیری نے جب قدم رکھا تو سب کی نگاہیں اُس کے چہرے پہ یُوں گڑ کر رہ گئیں گویا ہر نظر میں ایک زنجیر ڈال دی گئی ہے ۔

علی جان ، نامِ خُدا ، خُوب رُو ، خوش گلو ، شیریں حرکات اور کم سِن کاشمیری تھا جس کے چہرے کی شکر میں تھوڑا سا نمک بھی گھُلا ہُوا تھا اور اس وجہ سے جب وُہ اپنے چہرے کی ممزوج آب و تاب کے ساتھ نقابوں کے حلقے سے نکل کر سامنے آیا تو ایسا محسوس ہُوا کہ ہلکے سے کہرے کی چھاؤں تلے صبحِ بنارس طالع ہو رہی ہے ۔

سامنے آتے ہی پہلا وار اُس نے یہ کیا کہ اپنے گھُنگروؤں کی جھنکار میں تلے ہُوئے اعضاُ کے لوچ کے ساتھ کُولھے پہ ہاتھ رکھ لیا اور کُولھے پر ہاتھ کے جمتے ہی ایسا نظر آیا جیسے کوئی ہوا پہ رقص کرنے والا کبوتر چھتری پہ آ کر بیٹھ گیا یا دریائے ناز پہ ایک لچکیلا پُل تعمیر کر دیا گیا ۔ کُولھے پہ ہاتھ رکھتے ہی حضنت کو انگڑائی آئی اور یکا یک علی جان نے

اپنی سرمستی اور وحشی آنکھوں کو آدھا بند کر کے اپنی صراحی دار گردن کے ڈورے کو یوں ہلانا شروع کر دیا جیسے حبس کے عالم میں ٹھنڈی ہوا دفعتہً سنکنے لگتی ہے یا چاند کے اُبھرتے ہی دریا کی نبضیں چلنے لگتی ہیں۔ گردن کا ڈورا ہلتے ہی سارنگیوں کے گز ایک دردآمیز، نشاط آمیز جھنجھناہٹ کے ساتھ درخشاں تاروں پر یُوں کروٹیں بدلنے لگے جیسے برکھا کی برستی ڈستی راتوں میں کسی برہا کی ستائی الھڑ کے ارمان مچلنے لگتے ہیں۔

الاماں! طبلے کی دل پر ضرب مارنے والی، گمگ، سارنگیوں کی خُون میں تیرنے والی جھن جھن، مجیروں کی رگوں میں چٹکیاں لینے والی کھن کھن اور تپتی تلی سازوں کی دھاروں پر آڑی تالیوں کی گونج، ان سب نے ہم آہنگ ہو کر ایک گنگناتا متحرک منظر پیش کر دیا۔ گویا کسی خواب کے جزیرے سے پریوں کی برات گزر رہی ہے۔ علی جان کا مجرا ختم ہُوا تو دیر تک سناٹا بجتا رہا۔

اس کے بعد چار طوائفیں مُجرے کو آئیں۔ رنگ جما نہ سکیں۔ ہر مجرا پھیکا پھیکا سا رہا۔ البتہ جب پانچویں طوائف جھمکتی آئی، ناک میں چھوٹی سی نتھنی، کانوں میں اتیاں، گلابی سا رخ، شہابی مکھڑا، تو دیکھنے والوں کی نگاہیں الف ہونے لگیں۔ بزرگوں نے خُردوں سے نظر بچا کر کن انکھیوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کی آنکھوں کے حلقے میں بالوں کی سفیدی کا غم چکر کھانے لگا اور آسمانوں سے یہ صدا آنے لگی کہ : ؎

اینست کہ دل بُردہ وخوں کردہ بسے را

بسم اللہ اگر تابِ نظر ہست کسے را

اس کافرہ نے ابھی مشکل سے زندگی کی پندرہ سولہ بہاریں دیکھی تھیں اور اس کی چنچل جوانی میں وُہ زور تھا جیسے کوئی اس کو پیچھے کی طرف ریلے دے رہا ہے۔

وہ ہری کونپل اور مدھ ماتی الھڑ، راگ، نرت اور ناچ میں ابھی خام تھی۔ لیکن اس کی کچی جوانی کا رس، اس کی خامی کو یُوں سہارا دیئے ہوُئے تھا گویا کرشن جی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رادھا مشقِ خرام کر رہی ہے۔

جب نرت کے دوران میں اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا تو ایسا دکھائی دیا جیسے کالی زلفوں کے اُوپر دھنک نکلی ہوئی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اُس نے وادرا چھیڑا تو سا، رے، گا، ما کی چلت پھرت اُس کے گلے کے کورسے پن میں گھومنے لگی جیسے تیز ہوا کی رو میں دھان کے کھیت سرسرانے لگتے ہیں اور جب گاتے گاتے، ناچتے ناچتے وہ میرے قریب آئی اور یکایک جُھک گئی تو ایسا محسوس ہُوا گویا گلاب کی نرم ٹہنی چٹ سے ٹوٹ کر دوہری ہو گئی۔

اور آخر کار جب داد کی خاطر وہ عین میرے سامنے آکر بیٹھ گئی تو اس کے کم سنی کے مہکتے ہوئے کورے پنڈے کی لپٹوں نے میرے تمام وجود کا احاطہ کر لیا اور اس کے ساتھ ساتھ جب اس کی زرتار پشواز کے نرم ہیرے نے میرے ہاتھ کو دفعتہً چھُو لیا تو اس لمسِ اوّلین نے ایک ایسا تازیانہ مارا کہ میرا خُون بلّیوں اُچھلنے لگا۔

یہ میری زندگی کا اوّلین عشق تھا، نامعلوم و نیم محسوس!

یہ سب سے پہلا عشق، آدھی رات کی شبنم کے مانند گرا اور میرے خوابیدہ وجود میں جذب ہو کر مجھ سے کچھ کہے سُنے بغیر، گونگے کی طرح رخصت ہو گیا۔ لیکن آگے چل کر اس نے بڑے گُل کھلائے اور میری کشتِ حیات میں عشق کے بہت سے درخت پیدا کر دیے۔ آج بھی جب میں اپنے اس بائیں ہاتھ کی پشت پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کی ماہ و سال کی اُبھاری ہوئی موٹی موٹی رگوں اور اس کی درازیِ عمر کی بنی ہوئی جھریوں کے نیچے وہ شامیانہ، وُہ جشن، وہ مکھڑا اور پیشواز کا وُہ لمس شیریں اب بھی نظر آ جاتا ہے اور دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔

رہے نام اللہ کا!"

یہ تھا جوشؔ صاحب کے عشقوں کا "ابتدائیہ"۔ میں جوشؔ صاحب کے اس پہلے عشق پر اس لیے ایمان لے آیا ہوں کہ بغیر شدید جذبے کے، اس قسم کی تحریر ممکن ہو ہی نہیں سکتی۔ واہ وا! کیا خوبصورت نثر لکھ گئے۔

یہ دوستوں سے وعدہ خلافی یا اُن کے جا و بے جا تقاضوں سے بچنے کے لیے بیوی کی تُند مزاجی کی بھی پناہ لیتے ہیں۔ دوستوں میں بیٹھ کر جب بیوی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ عموماً یہ کہتے ہیں کہ یہ سب کی سب بیویاں، بڑے بڑے جابر بادشاہوں مثلاً فرعون، چنگیز خاں، ہلاکو اور نیرو کی بہو ہوتی ہیں۔

یہ واقعہ تو ہے کہ یہ شاعرِ انقلاب اپنی بیوی سے بڑا ڈرتے ہیں۔ کچھ ان کی کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے انھیں ڈرنا پڑتا ہے۔ کچھ وہ سخت گیر ہیں جن کی وجہ سے ان کی گھگھی بندھی رہتی ہے۔ یہ ہر وُہ بات جو بیوی سے چھپانے والی ہوتی ہے چھپاتے ہیں۔ مگر یہ بیوی سے چھپانے والی باتیں اس تواتر سے کرتے ہیں کہ وُہ چھُپ نہیں سکتیں۔ اس لیے ان کی کنّی دبتی رہتی ہے اور وہ شیرنی سے شیرنی تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ان کے بھائیوں میں، اولاد میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے جوشؔ صاحب سے تھوڑی بہت نسبت دی جا سکے۔ ان کا خیال ہے کہ جب کوئی جینئس پیدا ہوتا ہے تو وُہ اُوپر کی اور نیچے کی دو تین پشتوں کی ذہانت کو نچوڑ لیتا ہے۔

جوشؔ صاحب سگریٹ کبھی کبھار پیتے ہیں مگر سگار اور حُقّہ برابر پیتے رہتے ہیں۔ پچھلے برس لاہور آئے تو ایک حقّہ بھی خرید فرمالیا۔ کہتے تھے کہ کراچی میں یہ حقّہ پچپن روپے کا ملتا ہے یہاں بائیس روپے کا ملا ہے۔ لاہور والے بڑے شریف لوگ ہیں (پھر مزاحاً) اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ لاہور میں طفیل رہتا ہے اور کراچی میں جوش۔"

جوشؔ صاحب نے حقّہ خرید کر تانگے میں رکھوایا اور خود کو اس زاویے سے رکھا جیسے تصویر کھنچوانے کا ارادہ ہو۔ جبھی میں نے کہا تھا کہ اس وقت آپ کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ "کوئی آپ کی تصویر لے لے۔"

"ہاں بھئی ہاں، اگر کوئی اس وقت میری تصویر لے لے تو مجھے بڑی خوشی ہو۔ مگر یہ حقّہ والی بیماری ہماری خاندانی ہے۔ میرے والد صاحب بھی جب باہر نکلتے تھے تو وُہ بھی گاڑی میں حقّہ رکھوا لیتے تھے۔ میں ان سے ذرا مہذب ہوں،

اس لیے کہ میں حقّہ صرف گھر پر پیتا ہوں۔

راستے میں مجھ سے پوچھا:

"یہاں پر پرآن کا بھی ایک ہوٹل ہوتا تھا۔ تقسیم سے پہلے میں اس کے پاس ٹھہرا کرتا تھا، اب وہ غریب دلّی میں ہے اور بُرے حالوں میں ہے۔ اُس ہوٹل سے میری بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ فلاں فلاں اور فلاں میرے پاس ہوٹل میں آیا کرتے تھے۔ اُن دنوں لاہور میں سعیدہ نامی ایک رنڈی تھی، بڑا عُمدہ گاتی تھی اور پھر ———"

میں نے عرض کیا:

"اور پھر کے آگے بھی کچھ کہئے۔"

"معلوم ہوتا ہے تم بڑے کُند ذہن ہو۔"

ادبی دُنیا کے سامنے جوش صاحب کا باقاعدہ تعارف، سب سے پہلے بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کرایا تھا۔ "روحِ ادب" پر "معارف" میں بڑا اچھا تبصرہ کیا۔ مولانا اُن دنوں اپنے دلکش اور فلسفیانہ مضامین لکھنے کی وجہ سے بڑے ہی ہر دلعزیز تھے۔ یہ وُہ وقت تھا کہ مولانا نئے نئے مسلمان ہُوتے تھے۔ یعنی ان کا الحادی دور ختم ہو چکا تھا۔ جب کوئی نیا نیا مسلمان ہو تو وُہ دو ہزار رکعت پڑھنے کو بھی کوئی بڑی بات نہیں سمجھتا۔ پھر ایسے زاہد' جو ہر وقت مثنوی مولانا روم بغل میں رکھتے ہوں۔ وُہ اگر اس رندِ خراباتی کی تعریف کریں تو اپنی جگہ بات کچھ کم اہم بھی تھی۔

بات یہ ہے کہ مولانا ماجد علم اور ادب کے راستے سے مذہب کی طرف لَوٹے تھے۔ اس لیے انہوں نے ادیب کو ادیب کی حیثیت سے پہچانا۔ آج مولویوں کا دکاندار طبقہ ادب کو جس طرح مسلمان بنانے کی فکر میں ہے اس میں ادیب کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔

مولانا ماجد ہی نے سب سے پہلے اُنھیں مصورِ جذبات لکھا اور شاعرِ انقلاب مولانا ظفر علی خاں نے کہا شبابیات پر لکھا تو یہ شاعرِ شباب بھی بنے۔ انہیں سب سے پہلے شاعرِ شباب کس نے کہا، اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

جوش صاحب جمگھٹے کو پسند نہیں کرتے۔ وُہ چاہتے ہیں کہ چند بے تکلف دوست ہوں تاکہ ہر گفتہ اور ہر ناگفتہ بات کہی جا سکے، باتیں کرنے کی حد تک، شعر سنانے کی حد تک، ان کی نگاہیں صرف بے تکلف دوستوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ حاضرین میں غیر مانوس شکلیں ہوں گی تو انہیں شعر سنانے میں ہچکچاہٹ ہو گی۔ لبعض اوقات غلط قسم کے ماحول میں کلام سنانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اصرار ہو گا تو ایسے جملے بھی کہہ گزریں گے جو دلآزاری کے ذیل میں آتے ہوں۔

ایک دفعہ یہ اپنے چند بے تکلف دوستوں میں بیٹھے چہک رہے تھے، لہک رہے تھے۔ بڑے اچھے مُوڈ میں تھے اور اپنا کلام ترنّم سے سنا رہے تھے (ان کا کلام گھن گرج والی آواز میں تو سب نے سُنا ہو گا مگر ترنّم کے ساتھ سُننے کا اتفاق کبھی کبھار ہی ہوتا ہے)

ایسے میں دو تین صاحب آن وارد ہُوئے جن سے جوش صاحب واقف نہ تھے۔ پہلے تو عینک میں سے

اُن حضرات کو بڑے غور سے دیکھا۔ جب انہوں نے السلام علیکم کہا تو انہوں نے بڑے زور سے لاحول ولا قوۃ کہہ کر اپنی بیاض بند کردی۔ تھوڑی دیر کے بعد حاضرین میں سے کسی نے کہا:

"جوشؔ صاحب! چُپ کیوں ہو گئے؟"

پھر کہنے لگے:

"مَیں اُس وقت تک شعر نہیں سناؤں گا جب تک کہ فاسد مادہ نکل نہیں جاتا۔"

حاضرین میں سے کسی نے کہا:

"شعر نہ سنائیے مگر اس شعر کا مطلب تو سمجھا دیجئے۔ غالبؔ کے نسخۂ حمیدیہ میں ایک شعر ہے۔"

جوشؔ صاحب نے پوچھا:

"کون سا بد معاش شعر ہے وہ؟"

شعر ہے: ؎

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
قیامت اِک ہوائے تُند ہے گورِ شہیداں پر

جوشؔ صاحب نے کہا:

"یہ شعر غالبؔ کا ہے تو ہُوا کرے۔ ہم اُس لونڈے سے مرعوب تھوڑے ہوں گے مگر یہ شعر ولادت لفظی کے لحاظ سے ہے کرودر، میں ولادت لفظی کے اعتبار سے اُس شعر کو کمزور کہتا ہُوں جس کا مفہوم میرے ذہن میں کچھ آئے اور آپ کے ذہن میں کچھ آئے۔ یہ شعر مشکل نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ غالبؔ فارسی میں سوچا کرتے تھے اور اردو میں شعر کہا کرتے تھے اگر غالبؔ اس شعر کو فارسی میں کہتے تو وہ اپنے مفہوم کو بڑے عمدہ انداز میں بیان کر جاتے۔ مگر تھا لونڈا جینئیس —— غالبؔ کے اور بھی متعدد اشعار ایسے ہیں جو مشکل ہیں جن میں مرزا اپنا مفہوم ادا نہ کر سکے اور ہم لوگ خواہ مخواہ آپس میں ہاتھا پائی ہو رہے ہیں۔"

حیدر آباد کے دوران قیام میں (۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء) فانیؔ مرحوم نے جوشؔ صاحب کو ایک عجیب سی لت لگا دی تھی کہ گھنٹوں غائبانہ رُوحوں سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ پہلے کچھ پڑھا۔ وصیاں کو کسوتی بخشی تو روحیں موجود ہو جاتی تھیں۔ اب یہ بیٹھے ان سے مختلف سوال کر رہے ہیں۔

میں نے ان سے پُوچھا:

"آپ نے کسی شاعر کی رُوح کو بھی بلایا تھا؟"

"ہاں غالبؔ کو بلایا تھا۔"

"پھر کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

میں نے پُوچھا، "آپ کا نام ؟"

کہنے لگے، "غالبِ مغلوب!"

"میں آپ کے مزار پر گیا تھا۔"

"میرا قیام مزار میں نہیں۔"

"بادہ نوشی کا کیا معیار ہے آپ کے نزدیک ؟"

"ارے میاں! ظرف لازم۔"

"آزاد انصاری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟"

"میرے پوتے ہوتے ہیں۔ ہاں! میرے شاگرد کے شاگرد جو ہُوئے۔"

"ساری عمر آپ وصل کی تمنا کرتے رہے، اب تو مقصود مل گیا ہوگا۔"

"ارے جوش! ہم تو یہاں بھی یادِ جاناں کے مشغلے میں رہتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے پُوچھا:

"اور کسے بلایا تھا؟"

"تلک کی رُوح کو بُلایا تھا اس نے مجھے سارے جواب ہندی میں دیے حالانکہ میں ہندی نہیں جانتا۔ ایک دن فانی نے رنڈیوں کو بلایا تھا کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ سب کہتی تھیں ہم مزے میں ہیں۔"

پھر اس واقعہ پر یُوں تبصرہ کیا: "یہ سب فریب ہی فریب ہے۔ ہر انسان کے اندر خوابیدہ حالت میں سب کچھ موجود ہے۔ دیکھ لینا کچھ عرصے کے بعد اندرونی علوم کی یونیورسٹیاں قائم ہوں گی۔ استاد بھی اپنے شاگرد کے اندر کی گرہیں کھولتا ہے۔ جس میں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے وہ میرؔ، غالبؔ اور انیسؔ بن جاتا ہے۔ جس میں کم صلاحیت ہوتی ہے وُہ نوحؔ ناروی بن جاتا ہے۔"

نگار کے صفحات پر جوشؔ ملیح آبادی کے خلاف کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہا ہے وُہ بھی زیادہ تر نیاز صاحب کے قلم سے۔ میں یہاں جوشؔ صاحب کا ایک خط (جو نگار ہی میں چھپا تھا) اور ایک اخبار کا تراشا پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہُوں تاکہ ان دونوں کی ناراضی کا تھوڑا بہت پس منظر سامنے آجائے، اور اس کے ساتھ ان دونوں کے کردار پر بھی روشنی پڑے بشرطیکہ آپ کا بھی ایمان ہو کہ تحریریں بھی صاحبِ مضمون کی باطنی کیفیات کا اظہار ہوتی ہیں۔

خط بھی پڑھیے مگر اس پر جو نوٹ نیاز صاحب کا ہے وُہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ دیکھیے بڑے آدمی لڑتے بھی ہیں تو کس شائستگی کے ساتھ۔ ملاحظہ فرمائیں:

حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا ایک طنزیہ شاہکار

نثر میں جواہر ریزوں کا ایک عدیم المثال نمونہ

یہ تو تھے عنوان اور ضمنی عنوان! اب نوٹ ملاحظہ ہو:

روح وہی ایک ہے پاک و شرافت مآب
نظم میں زیر حجاب نثر میں بے نقاب

پہلی جولائی ۱۹۵۵ء کی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ ملا جس پر میرا پتہ نیاز محمد خاں فتحپوری دفتر نگار لکھنؤ درج تھا۔ دیکھ کر حیرانی ہوئی کیونکہ مجھے نیاز محمد کے نام سے پکارنے والوں میں اب میری صرف بڑی بہن باقی رہ گئی ہیں جو یہاں نہیں پاکستان میں ہیں۔ لفافہ کھولا تو ایک مضمون نظر آیا جس کے آخر میں جناب جوش کے دستخط ثبت تھے۔ اس کو پڑھ کر حیرت مسرت میں تبدیل ہو گئی، کیونکہ مضمون کیا تھا ایک آبشار جواہر تھا اور بے اختیار سعدی کا یہ شعر زبان پر آ گیا:

لبت بدیدم و لعلم بیفتاد از چشم
سخن بگفتی و قیمت برفت لؤلؤ را

لیکن اس کے ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ ہم اپنی کم مائیگی کے باعث شایانِ شان اس کی داد نہ دے سکے:

ہیہات کہ چوں تو شاہ بانے
تشریف دہد در آشیانم

ہمیں امید ہے کہ حضرت جوش آیندہ بھی اپنے "انشائے عالیہ" اور "افکارِ نادرہ" سے اسی طرح نگار کو زیر بارِ کرم فرماتے رہیں گے:

من چہ دریائے تو ریزم کہ خورائے تو بود
سر نہ چیزے ست کہ شائستہ پائے تو بود

نیاز

"ہمارے سپاہیوں میں، یادش بخیر، ایک تھے۔ ستر بہتر برس کے ناتواں لیکن بلا کے تیکھے اور کرّوے، نومسلم ٹھاکر اللہ بخشے ہدایت اللہ خاں اور ہمارے قرابت داروں میں ایک تھے نوجوان قوی ہیکل اور قیامت کے ظرافت پسند خلیل اللہ خاں!

خلیل اللہ خاں آج بھی زندہ ہیں لیکن چونکہ ان کی وہ ظرافت باقی نہیں رہی ہے جو روتوں کو ہنسایا کرتی تھی اور اس بنا پر وہ اب ——— "وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے" ——— کے زمرے میں آ چکے ہیں۔ اس لیے ایک تھے خلیل خاں۔ چنانچہ ایک روز سریع الاشتعال

ہدایت اللہ خاں کے غیظ و غضب کا تماشا دیکھنے کی خاطر، ان کے بیڑے کے ایک سپاہی نے اُن سے کہا "ہدایت اللہ خاں! تمھاری مُونچھوں سے تو چنگاریاں اُڑا کرتی ہیں مگر تمہیں اپنے پوتے کی بھی کچھ خبر ہے!"

"ہمرے پوتے کی کیا بات کرت ہو" (ہمارے پوتے کی کیا بات کرتے ہو) ہدایت اللہ خاں نے خوخیا کر جواب دیا۔

اس پر اس سپاہی نے، اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز سے گھما کر کہا کہ "خلیل اللہ خاں تمہارے پوتے کو بڑے باغ کی ہوا کھلاتے پھرتے ہیں۔"

"ہمرے پوتے کا؟" (ہمارے پوتے کو؟) ہدایت اللہ خاں نے تین بل کھا کر کہا اور ان کی سفید داڑھی کے بال سیہی کے کانٹوں کی طرح یکایک کھڑے ہو گئے۔

ابھی ان کے اعصاب کی کھولن کم نہیں ہونے پائی تھی اور ان کے چہرے کی جھریاں آپس میں گتھی ہُوئی تھیں کہ اتفاق سے خلیل خاں محل کے پھاٹک پر نمودار ہُوئے اور ہدایت اللہ خاں نے جوانوں کی سی چُستی کے ساتھ معاً کھڑے ہو کر خلیل خاں سے، اپنے ہونٹ چباتے ہُوئے پُوچھا کہ "کھلیل کھاں! ہم تم سے، یو پُوچھت ہیں کہ یو، تم کا ہمرے کالے پوتے میں کا مجا آوت ہے کہ تم اُس سار کو باگن باگن کی ہوا کھلات پھرت ہو" (خلیل خاں! ہم تم سے یہ پُوچھتے ہیں کہ یہ تم کو ہمارے کالے پوتے میں کیا مزا آتا ہے کہ تم اُس سالے کو باغوں باغوں کی ہوا کھلاتے پھرتے ہو)

اور قبل اس کے مسکراتے ہُوئے خلیل خاں کچھ جواب دیں ہدایت اللہ خاں نے اپنے سُوکھے ہات میں لاٹھی بلند کر لی۔ یہ دیکھتے ہی دُوسرے سپاہی اور خدمت گار دوڑے اور ایک نے اُن کی لاٹھی پکڑ کر کہا:

"گھانس کھا گئے ہو ہدایت اللہ خاں! اگر خاں صاحب بہادر کو خبر ہو گئی تو جانتے ہو کہ اس بڑھوتی میں تمہاری کیا گت بنا دی جائے گی!"

غرض کہ اس روز کا یہ ہنگامہ رفت گزشت ہو گیا۔ لیکن ناعاقبت اندیش و کینہ پرور بُوڑھا ٹھاکر بھُول جانے یا معاف کر دینے والا انسان ہی نہیں تھا۔

چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن وُہ بُوڑھا رینگتا اور لاٹھی ٹیکتا ہُوا، بڑے باغ پہنچ کر "گاڑے" پر بیٹھ گیا اور جب اپنی بڑی بڑی مُونچھوں کے ساتھ خلیل خاں، حسبِ دستور، ہدایت اللہ خاں کے کالے پوتے کو لئے ہُوئے بڑے باغ میں نمودار ہُوئے تو اس مرجھائے ہُوئے بوڑھے نے ڈپٹ کر آواز دی کہ "ٹھارہو کھلیل کھان! بڑے جیوٹ ہو تو آؤ اور دوئی دوئی ہات کر لیو۔"

(کھڑے ہو جاؤ خلیل خاں! بڑے بہادر ہو تو آؤ اور دو دو بات کر لو)

دادا کا یہ بھرّاتا نعرۂ جنگ سُنتے ہی اُن کا پوتا تو غزالِ وحشی کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہُوا بھاگ کھڑا ہوا اور خلیل خاں نے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"ہدایت اللہ خاں! تم بوڑھے آدمی ہو، میں تم پر کیا ہات اٹھاؤں، ہاں تم اپنا حوصلہ نکال لو"

"اچھا، بڑے جوان بنت ہو" (اچھا بڑے جوان بنتے ہو) کہہ کر ہدایت اللہ خاں نے اپنی داڑھی دانتوں میں دبالی اور اپنی پُوری جسمانی و روحانی طاقت کے ساتھ یہ یقین کر کے بھرپور لاٹھی ماری کہ پہلی ہی ضرب میں خلیل خاں کا بھیجا بہتا نظر آئے گا۔

اس "بے پناہ" ضرب کو بڑی ہی آسانی کے ساتھ، اپنی لاٹھی پر روک کر خلیل خاں نے کہا:

"فِش!"

اس غیر متوقع حیرتِ ذلّت آمیز سے بِلبلا کر ہدایت اللہ خاں نے —— پھِس پھِس کیا کرت ہے اور لے (فِش فِش کیا کرتا ہے اور لے) کا نعرہ بلند کر کے دُوسری لاٹھی ماری۔

خلیل خاں نے اس وار کو بھی روک کر کہا: "فِش!"

"اے پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے۔ کھٹاخ ——" "فِش!"

"اے پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے۔ کھٹاخ ——" "فِش!"

"اے پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے۔ کھٹاخ ——" "فِش!"

الغرض خلیل خاں کی "فِش" اور ہدایت اللہ خاں کی "پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے" نے اس قدر کھول کھینچا کہ ہدایت اللہ خاں کا دم پھُول گیا۔ اس دم پھُولنے میں بھی آخری بار "پھِس —— پھِس —— کا کرت ہے" کہہ کر وہ بے چارے دھڑام سے گر پڑے اور بیہوش ہو گئے۔ ؏

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

سُنتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہرایا کرتی ہے۔ چنانچہ بالکل اُسی طرح ایک فتحپوری نیاز محمد خاں عرف "نگار" ایک ملیح آبادی شبیر حسن خاں عرف "نگار باز" بھی پچیس تیس برس تک یہی "فِش" اور "پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے" کا کھیل کھیل کر ابھی چند ماہ ہُوئے کہ فارغ ہُوئے ہیں۔

اور اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ نئے فتحپوری ہدایت اللہ خاں انتقاد کے "بڑے باغ" میں چاروں شانے چت بے ہوش پڑے ہُوئے ہیں اور نئے ملیح آبادی خاں "شکر خورے کو شکّر اور مُوذی کو ٹکّر" کی زندہ مثال بنے ہُوئے فتحپوری کی زرد رو شہرتِ انتقاد کو ہدایت اللہ خاں کے

"کالے پوتے" کی طرح "باغوں باغوں" کی ہوا کھلاتے پھر رہے ہیں۔

جاہلانہ انتقاد ——— مُردہ باد !
غیظ ناتوانی ——— مُردہ باد !
احساسِ کمتری ——— مُردہ باد !
بُغضِ للّٰہی ——— مُردہ باد !
"پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے ——— مُردہ باد !"

والسلام
جوشؔ

اس خط میں نیاز صاحب کا بھی کردار واضح ہے اور جوشؔ صاحب کا بھی، نیاز صاحب کا اس لیے کہ انھوں نے اس خط کو ایک ادبی شاہپارہ سمجھ کر اپنے پرچے میں جگہ دی اور یہ نہ سوچا کہ ہیٹی ہوگی۔ جوشؔ صاحب کا کردار یہ کہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں بھی براہِ راست حملے کرنے کی بجائے دانستہ تلمیحات کا سہارا لیا۔

اِس خط میں جوشؔ صاحب کا کمال اتنا ہے کہ اُنھوں نے اپنی شکایت کو خوبصورت انداز میں پیش کیا مگر نیاز صاحب کا ظرف دیکھیے کہ انہوں نے اس "گالی نامہ" کو اپنے پرچے میں جگہ دی۔

نیاز صاحب نے جس بڑائی کا ثبوت ۱۹۵۵ء میں دیا تھا ویسی ہی بڑائی کا ثبوت جوشؔ صاحب نے ۱۹۶۲ء میں آکر دیا۔ جوشؔ صاحب کی وُہ تحریر بھی ملاحظہ فرمالیں جس کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا:

> یادش بخیر! یہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ میری سب سے پہلی تصنیف "روحِ ادب" شائع ہُوئی تھی اور میں اُس زمانے میں آگرے گیا ہُوا تھا جہاں لطیف الدین احمد صاحب کے دانشکدے پر حضرتِ نیاز سے مجھ کو پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہُوا تھا۔ اس وقت میں بھرپور جوانی کی طرف جا رہا تھا اور نیاز صاحب آغازِ پیری کی طرف مُڑنے والے تھے۔
>
> مجھے یاد ہے کہ نیاز صاحب نے اس ملاقات میں میری اُس زمانے کی تازہ مطبوعہ نظم "جنگل کی شہزادی" کی مجھے دل کھول کر داد دی تھی اور رُوحِ ادب پر تنقید کا بھی وعدہ کیا تھا جو کبھی ایفا نہ ہوسکا۔
>
> اُس زمانے میں نیاز صاحب ڈاڑھی رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُن کے مُنہ پر ڈاڑھی مجھ کو اچھی نہیں لگی تھی اور یہ بھی یاد ہے کہ اُس زمانے میں نیاز صاحب نے مجھے اپنے قریب آنے کا کبھی موقع نہیں دیا تھا۔ نیاز صاحب مجھے اپنے قریب آنے کا موقع کیوں دیتے؛ اس وقت میرے پاس ذہانت کے سوا اور تھا ہی کیا!
>
> میری جھولی میں تو آج بھی بقدرِ حوصلہ علم و فکر کی پونجی نہیں ہے۔ اس سے آپ اندازہ

لگا سکتے ہیں کہ اس وقت تو مجھ پر علم و فکر کی چھاؤں تک نہیں پڑی ہوگی۔ نیاز کا سا آدمی مجھ کو منہ کیوں لگاتا!

اس کے بعد نیاز صاحب سے حیدر آباد (دکن) میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی اور میں نے ان کے میزبان ہوش صاحب بلگرامی سمیت اپنے گھر مدعو کیا۔

ہزار افسوس کہ میری وہ مخلصانہ دعوت میرے ایک قرابت دار دوست کی بے پناہ بدمستی اور شرمناک فحش کلامی کی بنا پر غارت ہو کر رہ گئی۔

وہ میری زندگی کی بڑی منحوس گھڑی تھی کہ اس دعوت میں میرے دوست کی شرافت سے گری ہوئی فحاشی کی بنا پر نیاز اور ہوش دونوں کو میری جانب سے بدگمانی پیدا ہوگئی کہ یہ سب کچھ میرے ایما سے ہوا تھا۔

اس بدگمانی کی شکایت نیاز صاحب سے نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ جس نامراد قوم کے ہم افراد ہیں وہ اس قدر اوچھی اور گھٹیا ہے کہ اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر کمینگی کا ارتکاب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اُس رات کے بعد ہمارے تعلقات کی دنیا میں سویرا ہوگیا۔ نیاز صاحب مجھ سے بگڑ گئے۔

نیاز صاحب پٹھان آدمی ہیں۔ میں بھی خیر سے پٹھان ہوں اور ظاہر ہے کہ مشتعل ہو جانے کے بعد پٹھان کے امکان سے یہ بات خارج ہو جاتی ہے کہ وہ علتِ اشتعال تک پہنچنے کی زحمت گوارا فرمائے۔

نیاز صاحب کی بدگمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس تاریخ سے لے کر پورے ایک سال تک نگار کے ہر پرچے میں وہ مجھ پر تبرا کرتے رہے اور اس کے بعد ہر چند ہر پرچے میں تو میرے خلاف لکھنا ترک کر دیا لیکن جب بھی ان کو موقع ملا انھوں نے میرے خلاف لکھنے میں کبھی ایک بار بھی تساہل سے کام نہیں لیا۔

ہر چند اس وقت میں جوان اور سریع الاشتعال نوجوان تھا۔ لیکن نیاز صاحب کے کسی ایک مضمون کا بھی میں نے جواب نہیں دیا۔ البتہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر میں نے ان پر ایک بہت ہی سخت نظم کہی۔ لیکن اپنے دوست اعجاز الحق صاحب قدوسی کو سنانے کے بعد اس کو بھی شائع نہیں کیا اور چاک کر کے پھینک دیا۔ مضامین کے علاوہ نیاز صاحب نے اس زمانے میں لوگوں کو میرے خلاف بڑے بڑے طویل خط لکھے جن میں ایک خط تو اس قیامت کا تھا کہ اگر حالات میری مساعدت نہ کرتے تو میں جس نگر میں دُھونی رما کر بیٹھا تھا وہیں دفن کر دیا جاتا۔

پھر بھی میں نہایت واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ نیاز صاحب کے اس فرطِ غضب میں ان کی کوئی خطا نہیں تھی۔ کون معاف کر سکتا ہے ایک ایسے فرومایہ شخص کو جو اپنے دوستوں کو خود

اپنے گھر بلا کر ذلیل کرتا ہے۔ نیاز صاحب نے مجھ کو ایک ایسا شخص تسلیم کر لیا تھا اور اس لیے انھوں نے میرے باب میں جو کچھ بھی کیا وُہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

اب یہ بھی سُن لیجئے کہ میں نے کیوں جواب نہیں دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ کو اس بات کا سو فیصد یقین تھا کہ اگر میرے کلام میں جان ہے تو دنیا کی کوئی قوت اس کو دبا نہیں سکتی اور اگر جان ہی نہیں ہے تو ایسے بے جان کلام کی حفاظت کرنا سراسر تضیع اوقات ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اُس اُبلتی جوانی کے گرجتے برستے اشتغال میں کس کی یہ مجال تھی کہ گھنیری زُلفوں کی چھاؤں سے نکل کر جواب نویسی کی دُھوپ میں آکر بیٹھ جاتا ؂

اس فصل میں اس درجہ رہا بے خود و سرشار
میخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

اس لیے میرے جواب نہ دینے کو براہِ کرم میری شرافت پر محمول نہ فرمایا جائے ؏

بنیاد تھی اس کی نوجوانی میری

بہرحال اب وُہ طوفانی دَور باقی نہیں رہا ہے۔ اب ہم دونوں ضارب و مضروب بُوڑھے ہو چکے ہیں۔ ناقابلِ برداشت بوڑھے، سریع الاشتعال جوانیاں ہم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو چکی ہیں۔ ہمارے سروں کے بال گر چکے ہیں لیکن کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا اکھوا پھُوٹ آیا ہے۔

اس منزل میں ہمارے واسطے یہ نازیبا اور شرمناک حد تک نازیبا ہے کہ ہم اپنی پُرانی یادوں اور طفلانہ جذبات کی بنا پر امرِ حق پر پردہ ڈالنے کا ارتکاب کریں۔ اس لیے کامل ذہنی سکون اور دیانت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہُوں کہ حضرتِ نیاز چند اُن گنے استثنائی افراد میں سے ہیں جن کے پیدا کرنے کے معاملے میں یہ دوں پرور آسمان ازل سے لے کر اب تک بخل کرتا چلا آرہا ہے۔

جب یہ دیکھتا ہُوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنے خلّاقی کے شہر آباد ہیں، اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور رامش و رنگ کی اتنی بے شمار راتیں اُتری ہُوئی ہیں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو کلیجے سے لگاؤں۔

کاش نیاز فتحپوری کا سا خالقِ طرزِ انشا پرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا لیکن کیا کیا جائے ؏

ہائے وہ عقل جو نرغے میں ہو دیوانوں کے

یہ مضمون کچھ "موازنۂ جوشؔ و نیازؔ" قسم کی چیز بنتا جا رہا ہے۔ میں نے اس لغزش سے بچنے کی کوشش تو کی مگر بچ نہ سکا۔ سچ پُوچھیے تو جان بُوجھ کر اس "زیادتی" کا مرتکب ہُوا۔ مجھے بہانے بہانے سے نیازؔ اور جوشؔ کی شخصیتوں کو مزید واضح کرنے کے لیے ایسا کرنا ہی تھا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ "نگار" میں جوشؔ صاحب کے خلاف خُوب خوب لکھا گیا ——— یہ سب جانتے ہیں کہ غصّے اور ضد کی بنیاد پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں وہ پانی پر نمک کی دیواروں سے زیادہ زندگی نہیں پا سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز صاحب نے جوشؔ صاحب کے خلاف جتنے بھی حصار باندھے وہ ان کی شہرت کے سفینے کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ اللہ کا شکر کہ ۴۵ برس کی تناتنی کے بعد اب کہیں جا کر کھوپڑیوں میں پختہ عقل کا اکھوا پھوٹا! اور یوں دونوں جِن گلے ملے۔

جوشؔ صاحب کی ایک کمزوری لغات بھی ہے۔ ذرا ذکر چھیڑیئے تو پھر دیکھیں کہ کیا کچھ ارشاد نہیں ہوتا، کیا کچھ رونا نہیں روتے۔ مثلاً:

"بڑا لمبا کام ہے۔ میں چاہتا ہُوں کہ آکسفورڈ ڈکشنری کی طرز پر لغت تیار ہوتی۔ پچاس برس میں تو وُہ لغت تیار ہُوئی تھی۔ پھر اس میں ۲۵۰ اسکالروں نے بلا معاوضہ کام کیا تھا۔

میں چاہتا ہُوں ہر لفظ کا صحیح استعمال بتایا جائے۔ مثلاً رونے کی کتنی کیفیتیں ہیں، جیسے سِسکی، سُبکی، ہچکی۔ جب تک ان کی آواز کے فرق کا پتا نہ چلے بات نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں کہتا ہُوں کہ ایک لُغت کے ساتھ ایک ٹیپ ریکارڈر مشین بھی ہو جو سِسکی، سُبکی اور ہچکی کا فرق بتائے۔

پھر ابھی بے شمار نئے الفاظ کی ضرورت ہے جو ابھی تک بنے ہی نہیں۔ مثلاً اِزار بند ڈالنے والی لکڑی کا کوئی ایک نام نہیں ہے، سب یہی کہتے ہیں کہ اِزار بند ڈالنے والی لکڑی دینا۔ اس کے لیے میں نے "کمرنی" کا لفظ بنایا ہے یا "اِزار کش" بھی ہو سکتا ہے۔

پھر سونے کے لیے ایک لفظ خواب ہے۔ اس ایک لفظ کی مختلف کیفیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے ۳۵ لفظ بنائے ہیں۔ مثلاً پڑھتے ہُوئے نیند آجائے تو اس کے لیے میں نے "خوابِ مطالعہ" کا لفظ بنایا ہے۔ ریل میں نیند آجائے تو اس کے لیے "خوابِ حرکت"۔ مطلب یہ ہے کہ اُردو کو اتنے الفاظ دئے جائیں کہ اس کی ہر ہر کیفیت کو ظاہر کریں۔

پھر الفاظ میں بھی خاندان اور قبیلے ہوتے ہیں۔ ہمیں الفاظ کا آپس میں ملاپ کراتے ہُوئے اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ ان میں سے کوئی لفظ نیچ خاندان کا تو نہیں۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا گیا تو خاندانی الفاظ کی نسل تباہ ہو جائے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ بعض الفاظ پردہ کرتے ہیں ضرورت ہے کہ بڑے پیار کے ساتھ گھونگھٹ اُٹھا دیا جائے۔"

میرے پاس ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر ہے جو بیٹری سے چلتا ہے۔ جوشؔ صاحب ترنگ میں تھے، میں نے اسے اُون کر دیا اور انہیں پتا بھی نہ چلا۔ آواز ملاحظہ ہو:

"مسلمانوں نے تجارت شروع کر رکھی ہے۔ نمازیں پڑھو، روزے رکھو، جنّت ملے گی۔ اس تاجرانہ

ذہن کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھے کام اس لیے کرنے چاہئیں کہ اس سے اپنا اور دوسروں کا بھلا ہوتا ہے۔

کانوں کی معرفت بڑا زہر پلایا گیا ہے۔ جہاں تک ہو سکے آدمی کو مذہب سے دُور رہنا چاہئے اور اگر کوئی مذہب قبول کرنا پڑے تو اسلام قبول کرنا چاہیے، اس لیے کہ اس میں سب سے کم وہم ہیں۔

مادی اور روحانی پہلوؤں کے ساتھ مذہب تک ایک پہنچ نفسیات کا نام لگے گا اس وقت تک بات کھل کر سامنے نہ آسکے گی۔ ویسے رسولؐ نے جو "کن فیکون" کہا تو بڑی بات کہی۔ رسولؐ کی بڑائی سے کوئی بھی انسان منکر نہیں ہو سکتا۔ پھر رسولؐ نے جو باتیں کہیں وہ اس وقت کے لوگوں کے ذہن اور ان کی بساط کے مطابق کہیں مگر وُہ باتیں آج بھی اتنی ہی اہم ہیں۔ یہ بڑائی ہوتی ہے ایک پیغمبر کی۔"

کسی نے ٹوکا :

"جناب قرآن کی باتیں رسولؐ کی باتیں تو نہیں ہیں انھیں آپس میں گڈمڈ نہ کریں۔"

اس پر جوش صاحب نے یہ شعر پڑھا :

کھل کر کہوں تو کفر کے فتوے لگائے خلق
وہ ارتقائے نوعِ بشر دیکھتا ہُوں میں

اور اس کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت یُوں فرمائی :

"جاہلو! کچھ عرصے کے بعد انسان موت پر بھی قابو پالے گا، اس لیے کہ جتنی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں وہ اگر بحال رکھی جا سکیں تو موت کا وجود نہ رہے گا۔

وُہ جو آپ کے ایک دوست پی، ایچ، ڈی ہیں۔ ادب پڑھاتے ہیں۔ موٹی موٹی کتابیں لکھتے ہیں۔ وُہ مجھے ایک دن کہنے لگے " جوش صاحب! میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے انہیں ڈانٹ دیا کہ آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ سوال کیا جاتا ہے پُوچھا نہیں جاتا۔

پھر انہوں نے کسی بات پر کہا :

"پھر ؟"

میں نے کہا :

"پھر کا جواب پھُر !"

پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے کسی بات پر کہا :

"کیوں ؟"

میں نے کہا : " کیوں کا کوئی جواب پیدا نہیں ہُوا، کیونکر کی نوبت آئی ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جوش صاحب نے فرمایا: "ایک علاّمہ یہ ہیں، ایک علاّمہ وہ تھے۔ یعنی علامہ عبداللہ عمادی۔ جو بات کہی، ترازو کا تول، ہر مشکل کا حل موجود —— ایک دفعہ ہم علاّمہ کو رنڈی کے کوٹھے پر لے گئے۔

مولانا سے بڑے مؤدب بن کر عرض کیا: "مولانا! میرے ایک دوست کے ہاں آپ کی بھی دعوت ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ تشریف لے جائیں گے تو میری اور میرے دوست کی عزّت افزائی ہوگی۔"

مولانا نے بڑی معصومیت سے فرمایا: "اگر یہ بات ہے تو ضرور چلوں گا۔"

مقررہ وقت پر، میں مولانا کو لے کر چلا، رنڈیوں کا بازار آیا تو کہنے لگے: "ارے جوشؔ! یہ تو رنڈیوں کا بازار معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں! مگر میرے دوست ذرا آگے رہتے ہیں۔"

اس طرح میں نے انہیں رنڈیوں کے بازار میں سے گزارا۔ یہ لمبی لمبی سفید نورانی داڑھی، چوڑے پانچوں کا پاجامہ، چلنے میں بھاگنے کی سی کیفیت دیکھ کر سبھی متوجہ تھے۔

ایک جگہ رُک کر میں نے کہا: "مولانا! آ گیا میرے دوست کا مکان!"

"الحمدللہ!"

میں نے ایک مکان کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: "چلئے!"

مولانا کو شک تو گزرا کہ یہ مکان بھی اُسی علاقے کا حصہ ہے۔ چونکہ وُہ کسی پہ بدگمانی کرنی نہ جانتے تھے اس لئے ذرا تامّل کے بعد سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

آگے آگے وُہ، پیچھے پیچھے میں۔ پہلی منزل پر پہنچ کر مولانا نے کھنکارا تاکہ صاحبِ خانہ کو علم ہو جائے کہ کوئی آیا ہے۔ ادھر سے نسوانی آواز آئی:

"بے تکلف چلے آیئے۔"

مولانا آگے بڑھے تو نائیکہ نے نورانی شکل دیکھ کر طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا:

"تشریف لایئے۔"

بوکھلاہٹ میں مولانا نے کہا:

"وہ کہاں ہیں؟"

"آپ پُتریا کا پُوچھ رہے ہیں؟"

اس پہ مولانا لاحول پڑھتے ہوئے نیچے اُترے۔ اب میں آگے آگے تھا اور وُہ پیچھے پیچھے۔ راستہ بھر کہتے رہے:

"میں تم سے سمجھوں گا۔ میں تم سے سمجھوں گا —— رنڈی کے کوٹھے پر چڑھا دیا۔"

اس کے علاوہ جوش صاحب کی اور بھی بہت سی باتیں ٹیپ ریکارڈر میں موجود ہیں مگر وہ ایسی نہیں کہ انھیں لکھا جا سکے۔ جو کچھ یہاں تحریر میں آگیا ہے وہی قدرے زیادتی والی بات ہے اس لیے کہ نشے کی حالت میں ان کی جتنی باتیں ہوتی ہیں انھیں کوئی سنجیدہ صورت تو نہیں دینی چاہیے۔

جوش صاحب اپنے دوستوں کی مدد بڑے شوق سے کرتے ہیں بلکہ اس سلسلے میں دوست دشمن، اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہیں رکھتے۔ یہ شوق اس حد تک ہے کہ ایک اسامی کے لیے متعدد سفارشیں کر گزریں گے۔ متعلقہ صاحب کہیں گے: "جوش صاحب! کل آپ نے ایک اور صاحب کی سفارش کی تھی آج اسی شد و مد سے اور اسی جگہ کے لیے ایک اور صاحب کے لیے کہہ رہے ہیں۔ جگہ ایک ہے۔ لہٰذا یہ فرما دیجئے کہ دونوں میں سے کسے قابلِ توجہ سمجھا جائے!"

اس سلسلے میں میرا بھی ایک تجربہ ہے۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ لکھنؤ میں فلاں ادارے نے ہماری کتابیں بلا اجازت چھاپ رکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ کیا جائے۔

"ہاں ہاں ضرور کرو، میں تمہیں کمشنر کے نام خط لکھے دیتا ہوں۔ آج ہی لکھنؤ چلے جاؤ اور واپسی پر بتانا کہ کیا ہوا۔

خط ہے:

اخی العزیز!

حاملِ رقعہ محمد طفیل صاحب مدیرِ نقوش لاہور کو اگر آپ کی اخلاقی امداد کی ضرورت ہو تو وہ انھیں ضرور میسر ہوگی۔ اس یقینِ کامل کے ساتھ یہ چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں۔

موسمِ برشگال کی دھوم دھام یہاں کم ہی رہی۔ لیکن ادیانِ خرابات نے اپنی دریا دلی سے اس بوند بھر ابرِ باراں کو جیحون و قلزم سے بھی بڑھا دیا ہے۔

آپ کا پرستار
جوش

صہباگسار، محبوب پاک پروردگار "مردودِ دمِ چار یار"

اِس خط کے چھپوانے کی بظاہر کوئی ضرورت نہ تھی۔ خط میں کوئی خاص بات بھی نہیں مگر جہاں جوش صاحب نے دستخط فرمائے اور اس کے ساتھ جو لکھا "محبوب پاک پروردگار"، "مردودِ دمِ چار یار" یہ دونوں باتیں قابلِ غور ہیں۔

یہ خط لیتے وقت میں نے جوش صاحب سے عرض کیا تھا اب ایسا نہ کیجئے گا کہ وہ صاحب، جن کے خلاف آپ نے مجھے یہ خط دیا ہے اگر آپ کے پاس پہنچ جائیں تو انھیں بھی اس نوع کا خط لکھ دیں کہ اس کی مدد کی جا سکے۔

اس پر ہنسے، مگر بات بنا گئے — "اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو پھر میں متعلقہ صاحب سے کہتا ہوں —— ان میں سے جو زیادہ خوب صورت ہو میری سفارش اُس کے لیے ہے۔"

ہندوستان میں ان کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے تھے، سبھی سے برابری کا ملنا جلنا تھا۔ جواہر لعل نہرو اور ابو الکلام سے دھڑا دھڑ مل سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ایک مرتبہ مولانا آزاد سے ملنے گئے تو وہ جواہر لعل سے باتیں کر رہے تھے انھیں انتظار کرنا پڑا۔ چند منٹ انتظار کیا تو ان کی پٹھانیت نے وہاں مزید رُکنا گوارا نہ کیا۔ کاغذ کے ایک پُرزے پر یہ شعر لکھ کر واپس آنے لگے ؎

نا مناسب ہے خُون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

مولانا اور پنڈت جی کی گفت گو ختم ہو چکی تھی یا کیا کہ وُہ دونوں یہ پرزہ ملتے ہی ہنستے ہوئے باہر آ گئے اور جوش صاحب کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔

اصول کی خاطر یہ بڑے بڑے آدمیوں کو ڈانٹ دیتے ہیں، تکلف نہیں برتتے۔ ان کی کامیابی کا راز یہی ہے اس کی جھلک ان کے خطوط میں بھی ملے گی جو انہوں نے وعدہ فراموش اور تغافل شعار افسروں اور بڑے آدمیوں کو لکھے۔ مثلاً لکھنؤ کا ڈپٹی کمشنر کسی سے نہیں ملتا تھا۔ انہوں نے اسے ڈانٹ کے خط لکھا اور یہ بھی لکھا کہ مجھے بھی آپ سے ملنا تھا۔ چونکہ آپ اوروں سے نہیں ملتے اس لیے میں آپ سے کیوں ملوں۔ اس بات کا صاحب بہادر پر اچھا اثر ہُوا۔ اس کے بعد اُس نے سب سے ملنا جلنا شروع کیا۔

یہی بڑوں سے ملنا اُنھیں مہنگا بھی پڑا۔ سکندر مرزا سے ان کے تعلقات تھے۔ چیف کمشنر سے ان کے تعلقات تھے۔ اُنھوں نے انہیں سبز باغ دکھائے کہ پاکستان آ جائیے ہم آپ کے لیے یہ کریں گے وہ کریں گے۔ جب یہ اُن کی ترغیب پر پاکستان آ گئے تو یہاں کے اخبارات نے شور مچایا کہ جوش صاحب جو کچھ کر رہے ہیں، غلط کر رہے ہیں اور حاکمانِ وقت بھی جو کچھ سوچ رہے ہیں غلط سوچ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سکندر مرزا (اُس وقت کے صدرِ پاکستان) کچھ کر سکے اور نہ چیف کمشنر، اور بھگتنا پڑا جوش ملیح آبادی کو۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" والی بات ہُوئی۔ یہ غلطی اُنہوں نے اتنی بڑی کی تھی کہ زندگی بھر بھلا نہ سکیں گے۔

غرض یہ ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان کے شہری بن گئے۔ ان کے اور دوستوں کی طرح مجھے بھی تکلیف ہُوئی میں کراچی گیا تو دانستہ ان سے نہ ملا۔ جب انہیں معلوم ہُوا کہ میں کراچی گیا تھا اور ان سے ملے بغیر واپس چلا آیا تو انھوں نے مجھے بڑے دُکھ کے ساتھ لکھا:

حضرت!
آپ کراچی تشریف لائے اور میرے وجود کی نفی کر کے مجھ سے ملنے تک نہیں آئے۔

آپ جب دلّی آتے تھے تو ایک خورد کی حیثیت سے میرے پاس ہمیشہ آتے تھے لیکن اب چونکہ میں پاکستانی ہو چکا ہُوں اس بنا پر آپ کی نظروں میں اپنی توقیر کھو چکا ہُوں۔

آپ اپنے ذی قدر پرچے میں ایسے شخص کا کلام شائع فرما کر رسوائی کیوں مول لیں جس سے اسلامی دُنیا منہ پھیر چکی ہے ؎

جاؤ بالیں سے ہٹو بھی، موت کو آنے تو دو
چین سے جینے نہیں دیتے تو مرجانے تو دو

جوشؔ

اس خط سے معلوم ہُوا کہ جوشؔ صاحب کے دل میں اپنے ملنے والوں کے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے کتنی جگہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہُوا کہ وہ پاکستان آکر کتنے افسردہ خاطر ہوئے!

ایک بار میرے دل میں، جوشؔ صاحب کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہُوئی خط لکھ مارا۔ جواب آیا:

بندہ نواز!

آپ کو شاید علم نہیں کہ میری ہستی ایک ایسے شیشے کے مانند ہے جس میں نگاہ آر پار ہو جاتی ہے اس لیے اس امر کا یقین فرمائیے کہ اگر میرے دل میں آپ کی جانب سے ذرہ برابر بھی کدورت ہوتی تو میں اُس کو آپ پر ظاہر کیے بغیر چین سے بیٹھتا ہی نہیں۔

اس منفی رُخ کے بعد آپ کو مثبت رُخ بھی دکھانا چاہتا ہُوں اور وُہ یہ ہے کہ وحشت کے عوض میں اپنے دل میں آپ کی جانب رغبت و اُنس محسوس کرتا ہُوں۔

اب رہی میری کوتاہ قلمی اور "جواب خوری"۔ سو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں مراسلت کے باب میں ہمیشہ وُہ رہا ہُوں جس کو "مرفوع القلم" کہا جاتا ہے۔

اپنی اس افتادِ طبع کے دوش بدوش میری ہولناک مصروفیت بھی ایسی جان لیوا ہے کہ میرے سر پر دوستوں کے خط کچّے ڈوروں میں لپٹی ہُوئی تلواروں کے مانند لٹکے رہتے ہیں لیکن جواب لکھنے کی فرصت ہات نہیں آتی۔

آپ کو کاش معلوم ہوتا کہ اس وقت کس قدر اہم فرائض کا خُون کر کے یہ خط آپ کو لکھ رہا ہُوں اور وُہ بھی محض اس خیال سے کہ میری مزید خاموشی کہیں آپ کو مجھ سے مزید بدظن نہ کر دے۔

ہاں اِن دنوں ایک خاصی طویل نظم "آدمی" کہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بھیج دُوں اور ضرور بھیج دُوں گا بشرطِ فرصت!

میری تمنا ہے کہ یہ خط آپ کو تندرست، مطمئن اور شادکام پائے۔

نیاز مند
جوش

اپنے نام، جوش صاحب کے خط چھپوانے کا مجھے کچھ شوق نہیں۔ متعدد خطوں میں سے چند خط اس لیے چھاپنے کہ ان میں جوش صاحب بہ نفسِ نفیس موجود ہیں، اس لیے میں نے اُنھیں آپ سے چھپانا نامناسب نہ جانا۔

جوش صاحب مجلسی اخلاق کے اب میں اونچے نظر آتے ہیں (بشرطیکہ وقت شام کے بعد کا نہ ہو) مثلاً کسی شہر میں جائیں گے تو اپنے دوستوں سے ملنے خود جائیں گے۔ یہ اُمید نہیں رکھتے کہ وہ خود ملنے آئیں۔ اسی اخلاقی ضابطے کی بنا پر ایک بار مجھ سے کہا:

"دیکھو بھئی! تم چونکہ ہمیں اپنے ہاں بلا رہے ہو تو اس میں فیضؔ اور صوفی تبسم کو ضرور بلانا اس لیے کہ ہم ان سے خود ملنے نہ جائیں گے۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ یہ دونوں حضرات کراچی گئے اور مجھ سے مل کر نہیں آئے تھے اس لیے ہم ان کے پاس خود نہ جائیں گے مگر ہمارا دل ملنے کو چاہتا ہے۔"

ابھی چند مہینے ہوئے کہ لاہور آئے تھے اور اسی دن یہ اعلان فرما دیا تھا کہ کل واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے ان کے آتے ہی چلے جانے کا سُن کر افسوس ہوا۔ میں نے جواباً کہا "کل کی بجائے آج ہی چلے جائیے بلکہ ابھی چلے جائیے"۔ میرے یہ کہنے پر دو منٹ تک خاموش رہے۔ پھر کہا "اچھا کل نہیں جائیں گے۔ ایک دن اور صرف تمہاری خاطر سے رُک جائیں گے۔"

یہ اُس شخص کی باتیں ہیں جس نے بڑے بڑے لاٹ صاحبوں کو جُوتی کی نوک پر مار دیا۔

اس سے بھی پہلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ جوش صاحب لاہور آئے تھے۔ قائدِ اعظم کی برسی کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بانیانِ مشاعرہ کو پتا چلا کہ جوش صاحب بھی لاہور آئے ہوئے ہیں تو وہ مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دینے کو ان کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا —— "میں شرکت سے معذور ہوں"۔

کسی نے کہا: "قائدِ اعظم کی برسی کے سلسلے میں مشاعرہ ہے، انکار نہ کیجئے۔ سوچ لیجئے ہوں گی"۔

"باتیں ہوں گی تو ہوں، میں بلا معاوضہ نہ جاؤں گا۔ خود قائدِ اعظم نے مسجد شہید گنج کا مقدمہ لڑا تھا تو مسلمانوں کے لیڈر ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں سے دس ہزار روپیہ معاوضہ طلب کیا تھا، میں بھی تو قائدِ اعظم کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا ہوں۔"

بانیانِ مشاعرہ بلا معاوضہ لے جانا چاہتے تھے قائدِ اعظم کا نام لے کر معاملے کی اونچ نیچ سمجھاتے تھے

مگر یہ طرح ہی نہیں دے رہے تھے مگر اس وقت جوشؔ صاحب کے ایک دیرینہ دوست مولانا ابوالخیر مودودی نے متعلقہ صاحب سے چپکے سے یہ کہہ دیا: ”آپ وقتِ مقررہ پر آجائیے گا۔ جوشؔ صاحب مشاعرے میں شرکت کریں گے اور بلا معاوضہ کریں گے۔“

مشاعرے کا وقت قریب آیا تو متعلقہ صاحب آن پہنچے۔ جوشؔ صاحب نے ان کی شکل دیکھتے ہی کہا: ”بھئی مجھے چھپاؤ، مشاعرے والے تو پھر آ گئے۔“

مولانا ابوالخیر نے فرمایا: ”چھپنے کی ضرورت نہیں انھیں میں نے بلایا ہے۔“

”کاہے کو بُلایا ہے؟“

”تاکہ آپ کو مشاعرے میں لے جا سکیں۔“

”دوستی کا امتحان نہ لو۔“

”جو کچھ کہیں، اب آپ کو جانا پڑے گا۔“

”ابوالخیر! تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے جانا پڑے گا۔“

دیکھا آپ نے اس رندِ خراباتی کا یہ رُخ، جو کتنا حسین ہے، جس میں دوستوں کے لیے کتنی قابلِ رشک جگہ ہے!

ساری دُنیا میں یہ مشہور ہے کہ جوشؔ صاحب لالچی ہیں۔ مَیں نے بھی یہ باتیں سُن رکھی تھیں مگر میرے ساتھ انہیں مخلصانہ تعلقات کا دعویٰ بھی تھا۔

جشنِ نقوش کے سلسلے میں (جو انجمن ادبی رسائل پاکستان نے منایا) سیکرٹری صاحب کے علاوہ میں نے بھی خط لکھا کہ آئیے گا ضرور! —— اور یہ بھی واضح کر دیا کہ انجمن صرف آمد و رفت کا کرایہ پیش کرے گی، کوئی معاوضہ پیش نہ کر سکے گی۔

جوشؔ صاحب کا جواب آیا:

عزیزم!

آپ بار بار کرائے کا کیوں لکھتے ہیں، بے شک مَیں چھوٹا، بہت چھوٹا آدمی ہُوں لیکن اتنا بھی نہیں کہ اگر آپ کرائے کی خطیر رقم نہ مرحمت فرمائیں تو میں آپ کی تقریب میں شریک نہ ہوں۔ یہ بھی کہہ دُوں کہ لاہور آؤں گا تو آپ ہی کی خاطر، لیکن آپ کا مہمان نہیں بنوں گا۔ دو ایک روز، اپنے پاس سے ہوٹل میں ٹھہروں گا جس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہوگا اور یہ بھی کھول دُوں تو کوئی حرج نہ ہوگا کہ میں آپ سے کرایہ بھی نہیں لوں گا۔ بابا! کیا میں کرائے کا ٹٹّو ہُوں!“

مخلص
جوشؔ

اس خط کے ملنے پر بھی خیال یہ تھا کہ جھونجل میں اگر خط تو لکھ دیا ہے مگر اتنی گرمی میں آ نہ پائیں گے۔ جون کا مہینہ، جوشؔ سا نازک مزاج۔ پھر معاملہ یافت کا بھی نہ تھا مگر دیکھا کہ تقریب سے ایک دن پہلے جوشؔ صاحب لاہور میں موجود ہیں۔ ٹیلیفون کیا ——— "مردود! مروا دیا نا اتنی گرمی میں" ——— میں ان کی آواز سن کر خوش ہو گیا۔ انھوں نے نقوش کی تقریب میں پوری دلجمعی سے دلچسپی لی۔

لاہور سے رخصت ہونے لگے تو میں نے انھیں آمد و رفت کے سلسلے میں روپے دلوائے مگر انھوں نے واپس کر دیئے ——— کہا ——— "اس تقریب میں شامل ہونا تو میرے فرائض میں سے تھا، روپے پیسے کا کیا سوال!"

ایک اور مشاعرے کے سلسلے میں، ان کے ایک افسر دوست نے، جو اتفاق سے ڈپٹی کمشنر ہیں، انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ یہ پہنچے۔ دیکھا تو ڈپٹی کمشنر صاحب اسٹیشن پر موجود نہیں۔ ان کے نمائندہ موجود ہیں۔ انھوں نے پوچھا: "بھئی! خود کیوں نہیں آتے؟"

"ایک ضروری کام میں اُلجھ گئے ہیں۔"

"اچھا تو اسٹیشن پر آنا غیر ضروری تھا۔"

یہ کہتے ہی اپنا سامان پھر گاڑی میں رکھوا دیا اور اس مشاعرے میں شرکت نہ کی جہاں سے ایک ہزار روپیہ اور آمد و رفت کا کرایہ ملنا تھا۔

دیکھا آپ نے، جوشؔ صاحب روپے کے معاملے میں کتنے لالچی ہیں!

درختوں کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ درخت جتنا اونچا ہوگا اتنی ہی گہری جڑیں ہوں گی۔ اصل درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔ یہی حال اشخاص کا ہے۔ جو شخص جیسا نظر آتا ہے وہ وہی کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بہت کچھ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اُسے صرف زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لینا، شخصیت سے آگاہی کے ذیل میں نہیں آتا۔ شخصیت سے آگاہی صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی ہوئی شخصیت میں اُتر جائے۔

۲

جوشؔ صاحب کے بارے میں، آپ نے میرے خیالات جان لیے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حضرت میرے قابو میں آئے کہ نہیں۔ اس کے بارے میں میرا کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا۔ لکھنا میرا کام تھا، فیصلہ کرنا آپ کا کام!

آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ جوشؔ صاحب پہ دو نمبر نکل چکے ہیں، ایک نمبر "افکار" کا، دوسرا "ساقی" کا! افکار کا نمبر مدح کے کھاتے میں ڈال دیجیے، ساقی کا قدح کے!

کسی کی تعریف ہو رہی ہو تو ہم کیوں جلیں۔ البتہ جب کسی کی پگڑی اُچھلنے والی ہو تو بھلے آدمیوں کا کام ہے کہ

وہ خطرے کو سُونگھیں۔

بھلا آدمی نہ ہونے کے باوجود میں نے سوچا کہ یاروں کو تھکم تھکا سے بچاؤں مگر میری کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔

اس سلسلے میں جو میری خط و کتابت مدیرِ "قدح" سے ہوئی وہ بھی پیش کر رہا ہوں کیونکہ اس سے بھی جوش صاحب کی شخصیت کے کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔

ایک مکتوبی مثلث*

شاہد، جوش اور طفیل

شاہد احمد دہلوی فرماتے ہیں:

"ادبی دنیا میں بھی بھلے آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔ جب میں نے "ساقی" کے "جوش نمبر" کا مفصل اعلان کیا تو محمد طفیل صاحب (مدیرِ نقوش) کو یہ بات بہت بُری لگی۔ وہ جوش صاحب کے قدردان اور مدّاح ہیں۔ قدردان اور مدّاح وہ میرے بھی ہیں شاید اسی لیے طفیل صاحب نے یہ چاہا کہ حسبِ اعلان "ساقی" کا "جوش نمبر" شائع نہ ہو۔ مگر انھیں اس خاص نمبر کے پس منظر کا علم نہیں تھا یہی مشورہ مجھے چند اور بزرگ ادیبوں نے بھی دیا تھا۔ اُن میں سے ایک مولانا سیّد ابو الخیر مودودی بھی تھے جو مولانا مودودی، امیر جماعت اسلامی کے بڑے بھائی ہیں اور دار الترجمہ، حیدر آباد دکن میں جوش صاحب کے برسوں رفیقِ کار رہے ہیں۔ چند مہینے پہلے وہ کراچی تشریف لائے تھے تو انہوں نے میرے گھر آکر مجھ سے ملنے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ اُن کے ارشاد پر میں نے عرض کیا کہ آپ نے وہ خاکہ ملاحظہ فرمایا ہے جو میں نے جوش صاحب کا لکھا ہے؟ فرمایا: "ہاں، افکار کے "جوش نمبر" میں پڑھا ہے۔" میں نے پُوچھا: "آپ نے وہ نہیں پڑھا جو "نقش" اور میری کتاب میں چھپا ہے؟" فرمایا: "نہیں۔" میں نے کہا: "آپ اسے ملاحظہ فرمالیں کیونکہ اس میں مسوّدے کے وہ حصے بھی شامل ہیں جنہیں مدیرِ افکار نے میری اجازت سے قلمزن کر دیا تھا اور ہاں یہ بتائیے کہ آپ نے جوش صاحب کا جواب بھی دیکھا؟" فرمایا: "نہیں۔ وہ کہاں چھپا ہے؟" میں نے بتایا کہ "جوش نمبر" کے دُوسرے ایڈیشن میں چھپا ہے۔ میں دونوں مضمون آپ کو دیتا ہوں، انہیں آپ لے جا کر اطمینان سے پڑھیے۔ اس کے بعد آپ

---

* یہ خطوط "ساقی" کے "جوش نمبر" میں شائع ہو چکے ہیں۔

جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔" مولانا نے دونوں مضمون پڑھے اور جب دوبارہ تشریف لائے تو میں نے عرض کیا، "فرمایئے کیا حکم ہے؟" مولانا نے افسردگی سے فرمایا، "اب میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ آپ کے مضمون میں دو ایک واقعات صحیح نہیں ہیں ان کی تصحیح اگر جوشؔ صاحب کر دیتے تو کافی تھا۔" مولانا بہت کم گو ہیں۔ جچی تلی مختصر بات کہتے ہیں۔ اتنا کہنے کے بعد اُنھوں نے موضوع ہی بدل دیا۔ طفیل صاحب نے بھی دونوں مضمون نہیں پڑھے تھے۔ میں نے اُنھیں بھیج دیے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ آپ ان دونوں پر ایک مضمون لکھ دیجئے۔ طفیل صاحب نے دل میں کہا ہو گا؛ "یک نہ شُد دو شد، کہا تھا کہ 'جوشؔ نمبر' مت چھاپو اور حضرت کہہ رہے ہیں کہ "جوشؔ نمبر" تو چھپے گا ہی، آپ بھی اس میں لکھئے۔ بیچ بچاؤ کرنے والا خواہ مخواہ رگیدن میں آجاتا ہے ؎

منصفی ہو تو غضب، نا منصفی ہو تو ستم
اُس نے میرا فیصلہ موقوف مجھ پر رکھ دیا

طفیل صاحب نے بہت رسّیاں تڑائیں مگر بھلے آدمی کی بڑی مشکل ہے۔ اُنھیں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر آپ رفعِ شر کی خاطر بھی نہیں لکھیں گے تو "جوشؔ نمبر" کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ بہت گھبرائے کہ اس گتھی کو کیسے سلجھائیں۔ آخر اڈیٹر ہیں اور ادیب ہیں۔ ایک حل اس مصیبت کا سمجھ میں آگیا۔ وہ ہفتے ہوئے کراچی آئے تھے تو مجھ میں اور اُن میں جو خط و کتابت ہُوئی تھی اُسے مُرتّب کر کے بھیجنے کا وعدہ کر گئے۔

حُسنِ اتفاق سے یہ مضمون اس خاص نمبر کا سب سے دلچسپ مضمون بن گیا ہے، وہ کیسے؛ پڑھ کر دیکھ لیجئے۔

شاہد احمد دہلوی

ماہنامہ 'ساقی' کراچی

۴ر اپریل ۱۹۶۳ء

برادرم! سلام مسنون

یکم اپریل کا خط ملا۔ شکریہ!

"نقوش" پر ہم فخر کرتے ہیں۔ اس سے ادبی رسائل کا وقار قائم ہے۔ اگر آپ سے کسی مسئلہ میں ہم اختلاف کرتے ہیں تو وُہ بھی اتفاق کے لیے۔

"جوشؔ نمبر" دو مہینے سے پہلے تو نہیں چھپتا۔ مجھے "مشرقی پاکستان نمبر" نے مار رکھا ہے۔

اگر آپ "جوش نمبر" کے لیے کچھ لکھیں تو صفحات حاضر ہیں۔ اُن کی موافقت و توصیف میں افکار کا "جوش نمبر" ..، صفحے کا شائع ہو چکا ہے۔ ساقی کے "جوش نمبر" میں اُن کا دُوسرا رُخ ہی آنا چاہیے۔ اُن کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ شخصیت پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ آپ لکھ سکتے ہیں اور بے رُو رعایت لکھ سکتے ہیں۔ متوازن ہی سہی۔ خوبیاں بھی اور خرابیاں بھی لکھ ڈالیے ہمت کر کے۔

آپ نے میرا مضمون بھی پڑھا ہوگا اور جوش صاحب کا جواب بھی۔ اس "جواب" کا جواب ساقی کا 'جوش نمبر' ہوگا۔ اُن کا جواب شائع ہونے سے پہلے میں نے قدوسی صاحب اور جالبی صاحب کے ذریعہ جوش صاحب کو آگاہ کر دیا تھا۔ اب اُنھیں معاف کر دینے اور بخش دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ع

کلوخ انداز را پاداشِ سنگ است

خاکسار
شاہد احمد

ماہنامہ ساقی کراچی
۲۲ر اپریل ۶۶۳

برادرم! سلام مسنون

کہئے آپ نے کیا فیصلہ کیا؟ سچی سچی باتیں جوش صاحب کے ایک خاکے میں لکھ دیجئے۔ آپ نے تو اُنھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔

اخبارات و رسائل سے معلوم ہُوا کہ شوکت تھانوی بہت بیمار ہیں۔ میں اُنھیں بیمار پُرسی کا خط لکھنا چاہتا تھا، کہاں لکھوں؟

خاکسار
شاہد احمد

ادارۂ فروغِ اُردو
۱۱۔ ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

برادرِ محترم! سلام مسنون!

آپ کے خط ملے۔ شکریہ۔ شوکت صاحب کو خط میرے پتے سے لکھ دیجئے، میں اُن تک پہنچا دُوں گا۔ خیال ہے کہ وُہ آج یا کل تک ہسپتال سے گھر چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر تقریباً جواب دے چکے ہیں۔ گھر والے اپنی آخری کوشش کر لینا چاہتے ہیں، زندگی بھر ہنسنے ہنسانے والا انسان

آج دوستوں کو دیکھتے ہی رو دیتا ہے۔

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں، مَیں جوش صاحب پر مضمون ضرور لکھ دیتا۔ میں اُنھیں کوئی بیس برس سے پڑھ رہا ہُوں مگر میرا خام مطالعہ آپ کے نمبر کے مزاج کے خلاف ہوگا۔ میری نگاہ اچھائیاں اور برائیاں دونوں دیکھتی ہے۔ اچھائیوں کا اظہار برملا کرتا ہُوں۔ کمزوریوں کے اظہار کے لیے پہلے جواز ڈھونڈتا ہُوں۔ پھر اشارۃً کچھ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیتا ہُوں۔ اتنی احتیاط پر بھی دوست کبھی خوش نہ ہوتے۔

آپ کے پرچے میں جوش صاحب پر کچھ لکھنا اس بات کا ثبوت ہوگا کہ میں بھی آپ کا ہمنوا ہُوں، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ "ساقی" کے "جوش نمبر" میں میرے مضمون کا بھی الٹا مطلب سمجھ میں آئے گا۔ لوگ کہیں گے نیازمندی کا دم بھرتا رہا مگر مضمون ایسا لکھا کہ برائیوں کا اظہار تو برملا کیا مگر خوبیوں کو اشارۃً بیان کیا۔

میرا مطالعہ یہ ہے کہ جوش صاحب میں برائیاں کم، اچھائیاں زیادہ ہیں۔ پہلے تو آپ میرے دماغ کی "اصلاح" کریں۔ اس کے بعد مجھ سے لکھوائیں تاکہ مضمون ناخلف کے زُمرے میں نہ آئے۔

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ والسلام

آپ کا

محمد طفیل

۲۵-۴-۶۳

ساقی، کراچی ۵

۲۸-۴-۶۳

برادرم، سلام مسنون!

۲۵ر اپریل کا عنایت نامہ ملا۔ شکریہ!

شوکت صاحب کی کیفیت معلوم کر کے ازحد رنج پہنچا۔ کیسا ہنستے ہنسانے والا انسان جُدا ہُوا جا رہا ہے۔ اگر میرا خط وقت پر پہنچ جائے تو انہیں پہنچا دیجئے گا۔

جوش صاحب کی شاعری اور خوبیوں کا تو میں بھی مدّاح ہُوں اور رہوں گا۔ میرا مضمون دیکھ لیجئے مگر ان کی شخصی خرابیوں کو آخر کیوں نہ ظاہر کیا جائے؟ خیر اس اختلافی بحث میں پڑے بغیر آپ کے لیے مناسب یہ ہو گا کہ آپ میرے مضمون اور ان کے جواب پر محاکمہ لکھ دیں۔

اسی سلسلے میں آپ جوش صاحب کی خُوبیاں بھی گنا دیں۔ آپ کُھل کر میرے مضمون پر

اعتراض کیجیے اور اُن کی لکھی ہُوئی ناگفتہ بہ باتوں پر بھی۔ آپ کے ایسے مضمون پر تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ میرے بے حد اصرار پر یہ محاکمہ تفصیل سے لکھ دیجیے۔ جوش صاحب کے بارے میں آپ کی رائے محتاجِ اصلاحِ اصلاح نہیں ہے۔ آپ بے تکلف (اگر چاہیں تو) ان کا نثری قصیدہ لکھ دیں۔ میں اُسے ضرور چھاپوں گا۔ لوگوں کو اُن کی خوبیوں سے آگاہی تو ہوگی۔ جوش صاحب کی شخصیت پر لکھا ہی کب گیا ہے، محاکمہ لکھنے میں آپ اس الزام سے بھی بری ہو جائیں گے کہ ساقی کے "جوش نمبر" میں آپ نے مضمون لکھ کر میری ہمنوائی کی ہے یا میرا ساتھ دیا ہے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار

شاہد احمد

ادارہ فروغِ اردو

۱۱۔ ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

۳۔ مئی ۶۹۳

برادرم، سلام مسنون!

آپ کا ۲۸۔ اپریل کا لکھا ہوا خط ملا۔ شکرگزار ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں آپ کے اور جوش صاحب کے مضمون پر "محاکمہ" لکھ دوں۔ میں آپ کی اس بات پر بڑا خوش ہُوا (واللہ بڑا خوش ہُوا) اور خود کو آپ سے بھی معتبر قسم کا آدمی سمجھنے لگا مگر اس کے ساتھ ہی ایسے محسوس ہُوا کہ جیسے ایک دم سے میری لمبی سی سفید ڈاڑھی نکل آئی ہو۔ مونچھیں اور بھنویں سفید ہوگئی ہوں۔ اس لیے کہ یہ کام بزرگوں کا ہے کہ وہ خُردوں کے جھگڑوں میں منصف بنیں۔

اس جھگڑے میں ایک "خُرد" تو ہوئے آپ یعنی کہ حضرت شاہد احمد دہلوی، اور دوسرے ہوئے جوش صاحب، رندِ خرابات جوش ملیح آبادی! آپ کا شمار کراچی کے بزرگ ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ایسے بزرگ ادیب، جن کے "اپنے بیس پچیس" پٹھے" ہوں جو استاد سے بھی پہلے میدان میں اُترتے ہوں، جیسے پہلوان پہلوان سے کشتی لڑنے کے لیے اس کے پٹھوں سے کشتی لڑنی پڑتی ہے۔

دُوسری طرف ہُوئے جوش صاحب، مانے ہُوئے استاد۔ ان کے بڑے شاعر ہونے میں اگر کسی کو کلام ہے تو وہ خود کوتاہ بین ہے، بر خود غلط ہے۔ جوش صاحب آج ہی کے بڑے شاعر نہیں کل بھی انہیں بڑا شاعر مانا جاتے گا۔ بلکہ اُن کے انتقال کے بعد ایسے علم و فضل والے نظر ہی نہ آئیں گے یا عرصے بعد پیدا ہوں گے۔

آپ انھیں شخصی اعتبار سے لاکھ بُرا جانیں مگر ہمارا اخلاقی ضابطہ جس تیزی سے انحطاط کی دہلیزیں چھوڑ رہا ہے۔ اُس میں جوش صاحب کل کلاں کو فرشتہ سیرت نظر آئیں گے ؂
بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں! کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں
والا مضمون ہوگا۔

آپ نے جوش صاحب کے بارے میں جو مضمون افکار میں لکھا تھا وہ تو میں نے پڑھا تھا اس کے بعد کیا ہُوا؛ جوش صاحب نے کیا لکھا؛ وہ میں نے اپنی عادت کے مطابق نہیں پڑھا۔ عادت کے مطابق اس لیے کہ جب ایک دوسرے کے خلاف لکھنا لکھانا شروع ہو جاتا ہے تو میں اسے پڑھا ہی نہیں کرتا (میں اپنے خلاف لکھی گئی ہر چیز بھی نہیں پڑھتا) کیوں اپنے دل کو میلا کیا جائے؟ کیوں دوسرے کی زیادتی کے بارے میں سوچا جائے؟

میرے پاس وہ "مواد" نہیں جو ایک دوسرے کے خلاف پھیلایا گیا۔ اگر ہوتا تو میں آپ کے ارشاد کے مطابق گھاس کُٹائی کا کام شروع کر دیتا۔ ابھی تو یہی کہوں گا، مہاراج! شانتی، شانتی!

آپ کا خط شوکت تھانوی صاحب کے پاس لے گیا تھا ڈاکٹروں نے ملنے ملانے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ خیال تھا کہ ہوش میں ہوں گے تو آپ کا خط دے دوں گا مگر افسوس کہ آپ کا خط واپس لانا پڑا۔

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

آپ کا
محمد طفیل

ساقی۔ کراچی ۵
۴۔ مئی ۶۳ء

برادرم، سلام مسنون!

۲۔ مئی کا نوازش نامہ ملا۔ شکریہ!

شوکت صاحب کی کیفیت معلوم کر کے ان کے لیے دُعائے خیر کی۔ اُن سے میرا ۲۳ سال کا تعلق ٹوٹا جا رہا ہے۔

جو شخص بیس سال سے ادب کا کام کر رہا ہو، وہ بزرگانِ ادب میں شامل ہونے سے کیسے انکار کر سکتا ہے؛ اور پھر بزرگی بعقل است نہ بسال۔ آپ یقیناً اس کے مجاز ہیں کہ میرے اور

جوش صاحب کے مضامین پر محاکمہ لکھیں۔ آپ ایڈیٹر بھی ہیں ادیب بھی۔ خاکہ نگاری کا بھی خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ جوش صاحب کا خاکہ لکھنے میں مجھ سے جو کوتاہیاں اور زیادتیاں ہُوئی ہیں اُن پر ضرور لکھیے۔ اس کے بعد اُن کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ اس کی کاپی ایک آدھ روز میں مَیں آپ کو بھیج دُوں گا۔ اُنھوں نے جواب میں جوکچھ لکھا ہے کیا اُنھیں وہی لکھنا چاہتے تھا؟ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔ آپ اپنے مضمون کو محاکمہ نہ کہیں کچھ اور کہہ لیں۔

جوش صاحب کی شرافت، ان کی زندگی کے اچھّے پہلوؤں اور اُن کے ایک بڑے شاعر ہونے سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے؛ منکر تو میں بھی نہیں ہُوں۔ اُن خوبیوں کا اعتراف میرے مضمون میں موجود ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جب آپ ان دونوں پر بے لاگ رائے دیں گے تو گھاس کٹائی نہیں کریں گے بلکہ ادب کی ایک اچھی خدمت انجام دیں گے۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

کیفیت یہ ہے کہ اس وقت گھر میں ایک سادہ لفافہ بھی موجود نہیں۔

خاکسار

شاہد احمد

نقوش، لاہور

۱۱-مئی ۶۳ء

برادرِ محترم۔ سلام مسنون!

آپ کا پانچویں تاریخ کا لکھا ہُوا خط ملا، شکریہ ادا کرتا ہُوں۔ اگر آپ مجھے جوش صاحب کا جوابی مضمون بھجوائیں گے تو اور نیکی کا کام کریں گے۔

آج آپ کے نائب مدیر "نقش" تشریف لائے تھے۔ ذکر جب قیامت کا چھڑا تو بات آپ کی جوانی تک پہنچانے کی ضرورت نہ تھی اس لیے معاملہ جوش صاحب تک ہی رہا اور میں چُپکے سُنتا رہا۔

علامہ نقش نے فرمایا: "جوش صاحب بھولے آدمی ہیں۔ شرارت ان کی سرشت میں داخل نہیں۔ یہ سب کیا دھرا جوش صاحب کے دوستوں کا ہے۔"

میں نے پُوچھا: "کیسے؟"

گویا ہُوئے: "شاہد صاحب کے خلاف مضمون زبردستی لکھوایا گیا۔ وہ لکھنا نہیں چاہتے تھے اُنھیں ورغلایا گیا کہ یہ جوش نمبر ادبی دستاویز ہے اگر آپ چُپ رہے تو کل کلاں کو لوگوں تک جو تصویر

آپ کی پہنچے گی وُہ بڑی بھدی ہوگی۔ بڑی مکروہ ہوگی۔ چنانچہ جوش صاحب غلط قسم کے مشیروں کے چکر میں آ گئے اور شاہد صاحب کے مضمون کا جواب لکھ مارا (اس کے بعد علامہ نے چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا)

"جوش صاحب اور شاہد صاحب کے مشترکہ دوستوں کو جب اس بات کا علم ہُوا تو ان میں سے اعجاز الحق قدوسی اور جمیل جالبی صاحب، جوش صاحب تک پہنچے۔ اُن سے کہا آپ نے شاہد صاحب کے جواب میں جو مضمون لکھا ہے وہ آپ کو لکھنا نہیں چاہیے تھا اور یہ بھی سُنا ہے کہ آپ نے کچھ تیز باتیں بھی لکھی ہیں۔"

اس پر جوش صاحب نے کہا کہ وہ مضمون مدیر "افکار" کے پاس ہے آپ اُن کے دفتر چلے جائیں، مضمون دیکھ لیں۔ اگر آپ کے نزدیک اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہو تو اُسے حذف کر دیجئے، میری طرف سے اجازت ہے (اس کے بعد علامہ نقش نے میز پر رکھی ہُوئی عینک اپنی ناک پر رکھ لی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا)

"چنانچہ مخلصین کا وفد مدیر افکار کے پاس پہنچا مگر مدیر افکار چونکہ جوش صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے اس لیے انہوں نے قدوسی صاحب اور جالبی صاحب کو بہلا یا مگر مضمون نہ دکھایا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد وہ مضمون چھپ گیا۔"

ان باتوں سے میں نے اندازہ یہ لگایا کہ اس معاملے میں جوش صاحب کا اتنا قصور نہیں جتنا کہ ان کے دوستوں کا ہے۔ اگر آپ جوش صاحب کی زندگی کو پڑھیں گے تو ایسے نہ نکلیں گے کہ وُہ اپنے مخالفوں کے پیچھے قلمی بندوق لے کے نکلے ہوں۔

اگر یہ واقعات سچے ہیں جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے تو پھر ضرورت اس امر کی تھی کہ آپ نمبر جوش کے مشیروں کا نکالتے نہ کہ جوش صاحب کا۔ جوش صاحب بے ضرر آدمی ہیں۔ بُرے ہیں تو صرف زبانی، وہ بھی فقرے بازی کی خاطر، یا اپنی ذہانت کی نکاسی کی خاطر۔ ورنہ ان کا دل خوب صُورت ہے۔

یہ بات اپنی جگہ رہی کہ جوش صاحب کنوئیں میں چھلانگ لگانے سے پہلے (تماشا دیکھنے والے دوستوں کے خلاص پر غور کر لیتے۔ مگر جوش صاحب کو کیا پتا تھا کہ واسطہ شاہد احمد دہلوی سے نہیں ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے سے ہوگا۔ شاہد احمد دہلوی اچھے آدمی ہیں۔ مگر جو ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں اصل میں وُہ ہیں خطرناک!

مجھے ایسا نظر آ رہا ہے کہ شاید میں یہ مضمون نہ لکھ سکوں۔ اسی لیے تو آپ کو خطوں سے

بھلا رہا ہُوں تاکہ آپ کو میرے خلاف نمبر نکالنے کی ضرورت نہ پڑے اور یاد اللہ بھی باقی رہے۔
دیکھ لیجئے، شوکت صاحب چل دئے۔ میں کئی دن پریشان رہا۔ عید بھی ایسی گزری جیسے وُہ چپکے سے مرحوم میں آ گئی ہو۔ میرے کچھ کرم فرما پٹنہ سے آئے ہُوئے تھے، انہوں نے عید کے دن مجھ سے متعدد بار یہ سوال کیا:

طفیل صاحب! کیا بات ہے، آپ آج بڑے خاموش ہیں؟

میں کیا جواب دیتا!

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

والسلام

آپ کا
محمد طفیل

ساقی، کراچی ۵
۱۳-مئی ۶۳ء

برادرم، سلام مسنون!

۱۱-مئی کا عنایت نامہ ملا- شکریہ!

شمس صاحب نے آپ سے جو واقعات بیان کیے، وہ صحیح ہیں۔

جوشؔ صاحب سے مجھے نہ تو پہلے دشمنی تھی اور نہ اب ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں میرے متعلق اور میرے باپ دادا کے متعلق نہایت بیہودہ باتیں لکھ دی ہیں۔ لہٰذا مجھے اُن کا جواب دینا ہے اور جواب ہے "جوشؔ نمبر"۔ جس کا الٹی میٹم میں نے اُنھیں ان کے مضمون کی اشاعت سے پہلے دے دیا تھا۔ میں نے اُن سے ساقی کا "جوشؔ نمبر" شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے اپنا وعدہ پُورا کرنا ہے۔

اپنا استخفاف کوئی گوارا نہیں کرتا۔ میں بھی بے غیرت نہیں ہُوں کہ اپنی ذلت گوارا کر لُوں۔ اسے اگر آپ چاہیں تو "خطرناک" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ میں نے آپ کو دونوں مضمون بھیج دئے ہیں۔ ملاحظہ فرما لیجئے۔ میں آپ کو مجبور کروں گا کہ آپ دونوں پر غیر جانبدارانہ رائے لکھ دیں۔

شوکت تھانوی آخر چلے ہی گئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

خاکسار: شاہد احمد

ساقی۔کراچی ۵
۲۷۔مئی ۶۳ء

برادرم۔سلام مسنون
فرمائیے، کیا فیصلہ کیا آپ نے؟
اگر آپ محاکمہ لکھ کر اس قضیہ کو ختم کرنے کی تحریک نہیں کریں گے تو "جوش نمبر" کی اشاعت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔
امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار
شاہد احمد

نقوش، لاہور
۲۹ مئی ۶۳ء

برادرم۔سلام مسنون!
آپ کا ۲۷ تاریخ کا خط ملا۔ شکریہ!
مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پہلے خط کا جواب نہ دے سکا۔ فرصت کے لمحات ڈھونڈ رہا تھا اور ابھی اسی کوشش میں تھا کہ آپ کا دوسرا خط آیا بصورت التی میٹم۔

ان دنوں "نقوش" کا نیا شمارہ چھپ رہا ہے۔ ہر چند کہ یہ کوئی خاص نمبر نہیں، پھر بھی میرے حواس باختہ کر دینے کے لیے اتنا کچھ بھی بہت ہے، جلد جواب نہ دینے کی وجہ صرف اتنی ہی ہے کہ نقوش کے پیارے میں سب کچھ بھولے ہوئے ہوں یوں ایک ہفتہ اور "بارگاہِ محبوب" میں گزر دے گا۔

آپ کے ۱۳ مئی والے خط کا مزاج ناساز ہے۔ میرے دماغ کے پرزوں نے کہا "شاہد صاحب گرمی کھا رہے ہیں، اس لیے تمہی برخورداری کا ثبوت دو، چپ رہو" ساتھ ہی دھڑکا یہ بھی تھا کہ کہیں طویلے کی بلا بندر کے سر نہ آئے۔ یہاں یہ مثال کچھ اچھی نہیں لگتی۔ ذرا اس مفہوم کا کوئی اچھا سا محاورہ تو لکھئے۔ آپ کو دسیوں یاد ہوں گے، دسیوں گھڑ بھی سکتے ہیں۔ اپن کو تو یہ بھی اجازت کوئی نہیں دیتا۔ ورنہ یہاں پنجابی کا ایک ایسا محاورہ لکھتا کہ آپ کا جی خوش ہو جاتا۔ مگر آپ وہ سمجھتے کہاں!

ایک تو آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ "معرکہ جوش و شاہد" میں میری خط و کتابت صرف آپ سے ہے۔ جوش صاحب سے اس معاملے میں دو چار باتیں زبانی ہوئی تھیں، بس۔ اس لیے

ساری باتیں آپ ہی کو لکھوں گا۔ اگر اس سلسلے میں جوش صاحب سے بھی خط وکتابت رکھتا تو ایک اُدھر کہتا، ایک آپ سے کہتا۔ یُوں میرا ذہنی ہاضمہ برقرار رہ سکتا تھا۔ اب تو میں صرف آپ سے جھگڑوں گا۔

اب آپ کہتے ہیں کہ اگر میں نے محاکمہ لکھ کر اس قضیہ کو ختم کرنے کی تحریک نہ کی تو "جوش نمبر" کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے، یہ اچھی زبردستی ہے صاحب!

ویسے "رہ سکتا ہے" میں بڑی گنجائش کے پہلو ہیں مگر میری ازلی بزدلی کی بنا پر آپ جوش صاحب پر اور طعن وتشنیع کے تیر کیوں برسائیں گے؛ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ جوش صاحب کو "بچانے" کے لیے مجھے بھی سُولی پہ چڑھنا پڑے گا۔

اچھا! موجودہ شمارہ چھپ لینے دیجئے، دماغ اپنی جگہ پر آلے۔ پھر ماتھے پہ تیوریاں ڈال کے سوچوں گا۔ اس کے بعد جو ہو سو ہو۔ ویسے خدا سے دُعا اب بھی یہی ہے کہ وہ مجھے بزرگوں کو بُرا بھلا کہنے سے بچالے۔ لیجئے صفحہ ختم ہو گیا، میں کیا کروں!

والسلام

آپ کا

محمد طفیل

ساقی۔ کراچی ۵

یکم جُون ۶۳ء

برادرِ مکرم! سلام مسنون!

آپ کا ۲۹ مئی کا خط ملا۔ شکریہ!

اس عمر میں بھلا میرا دماغ کیا گرمی کھائے گا! اور جوش صاحب کا "جواب" دیکھ کر جو جھلّی پیدا ہوگئی تھی اُسے بھی میں نے آٹھ مہینے کے عرصے میں دُور کر دیا۔ ان کے جواب کا جواب میں نے اب مئی میں لکھا ہے ورنہ میں غصّہ میں خبر نہیں کیا اول فول بک جاتا۔ آپ سے میں محاکمہ اس لئے لکھوانا چاہتا ہوں کہ:

(۱) آپ خاکہ نگاری کے اصول جانتے ہیں۔ آپ نے خود "جناب" اور "صاحب" میں بیسیوں خاکے لکھے ہیں، اس لیے آپ میرے لکھے ہوئے خاکے کو صحیح جانچیں گے۔ مثل مشہور ہے کہ:

پیشِ طبیب مرد، پیشِ تجربہ کار برو

(۲) آپ ادیب ہیں، اس لیے ادبی لحاظ سے دونوں مضمونوں کو پرکھ سکتے ہیں۔
(۳) آپ ایک اعلیٰ درجے کے ادبی جریدے کے ایڈیٹر ہیں۔ اردو کے بہترین اور بدترین لکھنے والوں سے آپ کا سابقہ رہا ہے اور رہتا ہے۔ دونوں مضمونوں پر آپ کی رائے وقیع ہو گی ——— اور

(۴) آپ ایک اچھے انسان ہیں جھگڑے فساد سے دور رہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی جھگڑے فساد سے دور رہیں۔ لہٰذا اس جھگڑے کو ختم کرانے کے لیے آپ ہی موزوں شخصیت ہیں۔
دونوں مضمون آپ کے سامنے ہیں ان پر اپنی بے لاگ رائے لکھ دیں۔ نہ مجھے بچائیے نہ جوش صاحب کو۔ جھگڑے فساد کو رفع کرنا تو کارِ خیر ہے اور اچھے کام اچھے لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔
لہٰذا فرصت نکال کر جما کر لکھ ڈالیے۔
امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار
شاہد احمد

نقوش۔ لاہور

برادرم، سلام مسنون!
یکم جون کا لکھا ہوا خط ملا۔ شکر گزار ہوں۔
(۱) آپ نے مجھے سو طرح سے سمجھایا کہ میں ہی اس جھگڑے کو ختم کرانے کے لیے موزوں ترین شخص ہوں۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ اس معاملے میں پڑنے والا اگر کوئی غلط ترین آدمی ہو سکتا ہے تو وہ اس خاکسار کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔
(۲) یہ تو فرمائیں کہ جوش نمبر کب تک نکلے گا؟ اور اس برات میں کون کون ہوں گے؟ میرا خیال ہے کہ آپ اس نمبر کو ذرا متوازن قسم کا چھاپیں، جوش صاحب کے صرف بُرے پہلوؤں کو سامنے نہ لائیں بلکہ اچھے پہلو بھی لائیں۔ آپ کہیں گے کہ تعریف و توصیف میں ایک نمبر پہلے نکل چکا ہے۔ میں کیوں نکالوں؟ ——— آپ متوازن پرچہ اس لیے چھاپیں کہ کوئی انگلی نہ اُٹھے۔
(۳) سارے لاہور میں آپ کی کتاب "گنجینۂ گوہر" نہیں ملتی۔ یہ میرے پاس ہوتی تو میرے لیے رہبر بن جاتی۔ براہِ کرم اپنے پبلشر سے کہیں کہ وہ مجھے اس کتاب کا ایک نسخہ وی پی کر دیں۔ ریویو تو اس کتاب پر بہت دیکھے، مگر بکنے کے لیے یہاں کسی بک اسٹال پر نہیں آئی۔ یہ طریقہ بھی اچھا ہے کہ حملہ ہو تو پوری تیاری کے ساتھ۔

(۴) کتاب ملنے پر میں اپنے تاثرات لکھ بھیجوں گا مگر وہ اشاعت کے لیے نہ ہوں گے بلکہ آپ کے حکم کی تعمیل میں ہوں گے۔
(۵) اور ہاں گیا "جنگ" کا وہ تراشا مل جائے گا جو جوش صاحب نے اپنے معاشقوں کے بارے میں لکھا تھا؟

محمد طفیل
۶/۶/۶۳

ساقی۔ کراچی ۵
۸ جون ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!
۶ جون کا عنایت نامہ ملا۔ شکریہ!
میں نے کتاب کے چھپتے ہی ایک فہرست بنا کر پبلشر صاحب کو دے دی تھی کہ انھیں کتاب بھیج دی جائے۔ آج معلوم ہُوا کہ آپ کی خدمت میں اب تک کتاب ارسال نہیں ہُوئی سخت شرمندگی ہے۔ آج خود کتاب لاکر بھیج رہا ہُوں۔ لاہور سے چند اور شکایتیں بھی موصول ہو چکی ہیں کہ کتاب نہیں ملتی۔ پبلشر صاحب کو ایسے خط بھیج دیتا ہُوں، یہ کتاب آپ کی نذر ہے، جی چاہے تو آپ اس پر ریویو لکھ کر نقوش میں شائع کر دیں ورنہ میرے لیے یہی کافی ہے کہ یہ آپ کے مطالعہ میں آجائے۔
"جوش نمبر" جولائی میں شائع ہوگا۔ یہ خاص نمبر بالکل ایک نُسخہ ہوگا۔ اس میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سبھی مضامین نظم و نثر شائع ہوں گے۔ انگلیاں اُٹھنے کا مجھے خیال ہوتا تو سرسے ساقی ہی کیوں نکالتا؟ جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں کا کیا ڈر؟ آپ سے تو صرف یہ درخواست ہے کہ میرے خاکہ اور جوش صاحب کے جواب پر محاکمہ لکھ دیں۔
جنگ کا تراشا میں نے اپنے مضمون کے لیے حاصل کرنا چاہا تھا، نہیں ملا۔ چونکہ میں نے اتفاقاً اسے پڑھ لیا تھا اس لیے یاد رہ گیا تھا۔
اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار شاہد احمد

نقوش۔ لاہور
۱۲ جون ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

آپ کا ۸ جُون کا لکھا ہُوا خط ملا۔ کتاب بھی ملی۔ دوہرا دوہرا شکریہ!

آپ کے ارشاد کے مطابق، آج اس خط میں اس "ناگفتہ بہ" موضوع پہ چند باتیں کروں گا جس کے بارے آپ لکھتے رہے اور میں ٹالتا رہا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر جوش صاحب کے مضمون کا جواب دینا ضروری تھا تو آپ بھی اس کے جواب میں مضمون لکھ لیتے۔ مگر اپنے ساتھ اتنی لمبی چوڑی برات لے کے نہ چلتے۔ یہ جو آپ جوش صاحب کے ایک مضمون کے خلاف پُورا نمبر چھاپ رہے ہیں۔ یہ زیادتی کی ذیل میں آئے گا۔

آپ کہتے ہیں: "میں خاکہ نگاری کے اصول جانتا ہُوں۔ اس لیے آپ میرے لکھے ہوئے خاکے کو صحیح جانچیں گے"۔

میری گزارش ہے کہ میں خاکہ نگاری میں بھی بڑے اُوٹ پٹانگ نظریات رکھتا ہُوں مثال کے طور پر میں مولوی عبدالحق کو شخصیت نگار نہیں سمجھتا، انہوں نے شخصی نوعیت کے جتنے مضمون لکھے وُہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں مگر ان کا انداز سوانحی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے بھی بڑے زور کے شخصی مضمون لکھے۔ وہ مضمون اور اچھے ہوتے بشرطیکہ رشید احمد صدیقی خود اتنے بڑے اور اتنے اچھے انشا پرداز نہ ہوتے۔

شخصیت نگاری میں، مَیں منٹو کے مضامین "گنجے فرشتے" کو اہمیت دیتا ہُوں۔ جمیل الدین عالی کے اکلوتے مضمون کو بھی (جو انہوں نے نواب سائل دہلوی پر لکھا تھا) خاکہ نگاری میں خوشگوار اضافہ سمجھتا ہُوں۔ بھلا ایسے خیالات رکھنے والے کو کوئی کیسے تسلیم کرے گا کہ میں بھی اس باب میں کُچھ جانتا ہُوں۔ اگر کوئی خاکہ نگاری میں میرے عجیب سے نظریات کو تسلیم کرنے والا ہو تو اُس سے یہ بھی کہوں گا کہ آپ کے مضامین "لذیذ" ہوتے ہیں اور فنِ خاکہ نگاری میں بھی اونچا درجہ رکھتے ہیں۔

اب میں اِدھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ لذیذ مضامین کی وضاحت کروں گا۔

بات یہ ہے کہ شخصیت نگاری ایک ایسا موضوع ہے جسے میں اُستروں کی مالا کہا کرتا ہُوں اس صنفِ ادب میں لکھنا اپنے دشمن بنانے کے مترادف ہے۔ قصیدہ پڑھا جائے تو قاری جُوتے مارتا ہے۔ ہمت کر کے لکھ دیا جائے تو زیرِ بحث شخصیت تھوکتی ہے۔ اگر کسی کے مرنے کے بعد کچھ کہا جائے تو سب پُکار اُٹھتے ہیں: ہے ہے مرنے کے بعد بھی نہیں بخشا مردود نے۔

اگر آپ شخصیت نگاری میں مولوی عبدالحق کی تکنیک برتتے تو آپ سے کوئی بھی ناراض نہ ہوتا۔ وہ تکنیک ہے تعریف و توصیف کی۔ جس طرح آپ پہ یہ الزام ہے کہ آپ کا قلم

صرف بُرے پہلوؤں پر اُٹھتا ہے، اُسی طرح مرحوم کا فن بھی مجروح ہے کہ وُہ صرف اچھے پہلوؤں پر اُٹھتا تھا۔ ضرورت تھی کہ شخصیت نگاری کے میدان میں کوئی مولوی عبدالحق اور شاہد احمد کے درمیان پیدا ہوتا۔

خُدا کی ہر مصلحت کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتی، اس لیے میں کیا جانوں کہ اللہ میاں نے آپ میں یہ خُوبی کیوں پیدا کی کہ ایسے ایسے فقرے لکھنے پر قادر کر دیا جو سیدھے جا کر دل کو پکڑ لیتے ہیں۔ اگر اس پر اکتفا کیا ہوتا تو لوگ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ شاہد صاحب کا مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ ضرور زہر اُگلیں گے مگر باتیں اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ چبھتے ہُوئے فقرے لکھنے میں آپ کے پائے کا ادیب اور کوئی نہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہُوں کہ آپ کسی شخصیت پر لکھتے ہُوئے اس امر کی شعوری کوشش نہیں کرتے کہ ضرور خلاف ہی لکھنا ہے۔ وُہ تو آپ کا ایک قسم کا "قلمی مزاج" ہے جو چٹپٹے فقروں کو قلم کی نوک پر آنے سے نہیں روک سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو بہت بڑا فقرے باز سمجھتا ہُوں۔ موجودہ دور کا سودا سمجھتا ہُوں۔ مگر یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہُوں کہ دانستہ پگڑیاں اُچھالتے ہیں۔

آپ کوئی چیز لکھیں تو یہ ناممکن ہے کہ قارئین اُسے دل چسپی سے نہ پڑھیں۔ مجھے اوروں کا تو پتا نہیں، میرا اپنا یہ حال ہے کہ اگر کسی رسالے میں آپ کا مضمون آتا ہے تو اسے جلد سے جلد پڑھ لینا چاہتا ہُوں تاکہ مجھے تھوڑا سا مسکرانے کا، تھوڑا سا افسوس کرنے کا اور تھوڑا سا لُطف لینے کا موقعہ مل جائے۔

آپ کے مضامین مجھے مُسکرانے پر اس لیے اُکساتے ہیں کہ آپ کا شگفتہ انداز بُجھی ہوئی طبیعتوں میں خوشیوں کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ افسوس اس لیے کرتا ہُوں کہ آپ اپنی فقرے بازی اور محاورہ بازی کے ہاتھوں خود بھی بے بس نظر آتے ہیں اور یہ چیز آپ کو وراثت میں ملی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنی اس اُپج کے ہاتھوں سُبک ہُوئے۔ آپ بھی ہر دلعزیز نہ ہوں گے۔ لُطف یُوں لیتا ہُوں کہ آپ جیسی من موہنی اُردو لکھ لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

اس مضمون میں ایسے فقرے ہیں جو جوشؔ صاحب کو بُرے لگنے چاہئیں تھے۔ ایک دو نہیں متعدد فقرے ایسے نکالے جا سکتے ہیں۔ دُوسرے کہیں کہیں ایسا بھی معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ باتیں آپ نے دانت پیس کے لکھی ہوں۔ میں حوالے دینا نہیں چاہتا، صرف اپنا تاثر بیان کرنا چاہتا ہُوں۔

اس کے ساتھ آپ نے جوشؔ صاحب کی خُوبیوں کی بھی تعریف کی ہے جس کے بلاشُبہ جوشؔ صاحب حقدار ہیں اور اس کے بھی حقدار ہیں کہ آپ اُن کی کمزوریوں کو اس انداز میں نہ لکھتے۔ اچھی باتیں تو سب کے منہ سے اچھی لگتی ہیں بُری باتوں کو اچھے انداز میں کہہ دینا ہی تو فن کہلاتا ہے۔

آپ کے دادا جان کے بارے میں جو مضمون فرحت اللہ بیگ نے لکھا تھا وُہ اتنا خطرناک ہے کہ اُس سے زیادہ کسی کے خلاف لکھا نہیں جا سکتا۔ مگر اُس مضمون کا کمال یہ ہے کہ لکھنے والے نے حد درجہ ذہانت کا ثبوت دیا اور اپنے قلم کو فن کی عظمتوں سے ہمکنار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مضمون مزے لے کر پڑھا جا سکتا ہے اور ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت (بُرے پہلوؤں کے باوجود) دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ اس دلچسپ پہلو کے علاوہ جو بات بھی ذہن میں اُبھرتی ہے وہ دبی دبی سی ہے۔

میرا تاثر آپ کے اس مضمون کے بارے میں یہ ہے کہ "فرحت اللہ بیگ کا قلم" اُلٹے رُخ پر چلنے لگا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہُوں کہ خاکہ نگار کو حقیقت نگاری سے آنکھیں نہیں چُرانا چاہئیں لیکن اُس کے پاس ایسا حکمت آمیز قلم ہونا چاہیے کہ وہ کہے سب کچھ، مگر اس ڈھب سے کہ ہر قدم پر سُجھا سُجھا کے انجان بنتا چلا جائے۔

حقیقت نگاری کی ایک مثال اور بھی ہے۔ وُہ ہے عصمت کا مضمون "دوزخی" اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں۔ شخصیت نگاری میں اس مضمون کو بھی اونچا درجہ حاصل ہے۔ اس کے باوجود میں یہ کہتا ہُوں کہ اگر عصمت یہی مضمون عظیم بیگ کی زندگی میں لکھ دیتی تو وہ عصمت کا گلا گھونٹ دیتے۔

جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ خاکہ نگاری میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہی آپ کے ہاں کم ہے (صرف چند مضامین میں) میری مراد توازن سے ہے۔ یہ الگ بات ہُوئی کہ اس کمی کے باوجود میں آپ کو اس دور کا بہترین خاکہ نگار مانوں بلکہ رشک کروں کہ کاش ایسا لکھنا مجھے بھی آتا۔

میں آپ کے مضامین کو تین حصّوں میں تقسیم کرتا ہُوں:

واقعاتی مضمون،

توصیفی مضمون اور

فنکارانہ مضمون۔

واقعاتی مضامین کی ذیل میں ڈپٹی نذیر احمد، بشیر الدین احمد آتے ہیں۔ توصیفی مضامین میں جمیل جالبی اور ایم اسلم آتے ہیں۔ باقی مضامین بڑے پائے کے ہیں جنھیں میں فنکارانہ مضمون کہتا ہُوں۔ میں میر ناصر علی، بیخود دہلوی اور خواجہ حسن نظامی قسم کے مضامین کو کبھی بھُول نہ سکوں گا اور ہاں مضمون جوش ملیح آبادی بھی بڑے زور کا مضمون ہے بشرطیکہ تھوڑی سی احتیاط کر لی جاتی۔

بہر حال میرے نزدیک یہ کتاب قابلِ ذکر ہی رہے گی۔ آج اگر یہ قابلِ ذکر ہے تو کل فخر کے قابل سمجھی جائے گی۔

آخر میں مجھے آپ سے ایک شکایت بھی کرنا ہے (جیسے اب تک کوئی شکایت نہ کی ہو) وہ یہ کہ میں نے آپ کی کتاب "گنجینۂ گوہر" منگوائی تھی۔ کتاب اس خیال سے منگوائی تھی کہ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اس میں آپ نے اپنا خاکہ بھی لکھا ہے۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کا قلم حقیقت نگاری کے جرم میں بدنام ہے یا بے رحم ہے وہ اپنے بارے میں بھی اتنا ہی بے رحم ہو گا۔ مگر مجھے وہ مضمون پڑھ کر افسوس ہوا کیونکہ وہ مضمون "در مدحِ خود" کی ذیل میں آتا ہے۔ جو باتیں خود نہ کہہ سکے وہ راجہ مہدی علی خاں نے کہہ دیں اور آپ نے چھاپ کر "در پردہ خود" لکھ دیں۔ ان حالات میں مَیں سمجھتا ہُوں کہ آپ کو اپنے قلم کا مزاج بدلنا چاہیئے اس لیے کہ وہ اپنے بارے میں تو توصیفی کلمات ہی لکھ سکتا ہے مگر دُوسروں کے بارے میں دیدہ دلیر ہے۔ اگر آپ نے اپنے بارے میں بھی جوش صاحب ہی کی طرح بے رو رعایت لکھ دیا ہوتا تو میں ساری دُنیا سے کہتا کہ جوش صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے لکھنے کا حق شاہد صاحب کو تھا اس لیے کہ جب مصنّف خود اپنے آپ کو بھی نہ بخشتا ہو تو اوروں کو کیوں بخشے۔ مگر میں کیا کروں۔ آپ نے تو اس مضمون کو کتاب میں شامل کر کے اپنی لُٹیا خود ہی ڈبو دی۔ (ایسی ہی ایک غلطی میں نے بھی کی تھی جس پہ آپ نے بھی مجھے ٹوکا تھا۔ پھر اسی قسم کی غلطی آپ نے بھی کر ڈالی)

اب اگر جوشؔ صاحب یا اُن کے دوست یہ کہتے ہیں کہ شاہد صاحب نے مضمون جان بوجھ کر جوش صاحب کے خلاف لکھا تھا تو انھیں کوئی جواب نہ دیا جا سکے گا۔

بے شک آپ کے مضمون لذیذ ہوتے ہیں۔ فنِ خاکہ نگاری میں بھی اونچا درجہ رکھتے ہیں مگر احتیاط کی حدیں پھاند جاتے ہیں۔ اگر یہ کمزوری آپ کے مضامین میں نہ ہوتی تو میں کہتا آج تک کسی نے بھی ایسے خاکے نہیں لکھے۔

لیجئے، آپ کی ضد پُوری ہو گئی۔ دو چار روز تک کچھ باتیں جوشؔ صاحب کے مضمون کے بارے میں لکھوں گا۔ ہو سکے تو اب مجھے چھُٹی دے دیجئے۔

محمد طفیل

ساقی۔ کراچی ۵

۱۷ جون ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

میں آپ کا شکر گزار ہُوں کہ آپ نے ایک طویل خط لکھنے کے لیے وقت نکال لیا۔ اس میں بہت سی باتیں میرے کام کی ہیں۔

اندازہ یہ ہُوا کہ آپ محاکمہ لکھنا نہیں چاہتے۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ آپ "جوش نمبر" کے لیے محاکمہ لکھ کر اس سلسلے کو ختم کرنے کی تاکید کرتے۔ آپ کا جی یہ نہیں چاہتا تو خیر جو مزاجِ یار میں آئے۔

آپ نے شوکت تھانوی نمبر شائع کرنے کا اعلان بھی سمجھا ہے کیا مجھے اس کے لیے لکھنا ہے؟ میری کمزوریاں تو آپ کو معلوم ہی ہیں۔ اگر آپ مجھ سے لکھوائیں گے تو اس میں ناگوار باتیں کچھ زیادہ ہی ہوں گی۔ پطرس پر میں نے اسی لیے نہیں لکھا تھا۔ فرمائیے کیا حکم ہے؟

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار
شاہد احمد

نقوش۔ لاہور
۱۱۔ ایبک روڈ۔ انار کلی
۲۶ جون ۶۳ء

برادر محترم۔ سلام مسنون!

آپ کا ۱۹ جون کا خط ملا۔ شکریہ!

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ شوکت صاحب پر ضرور لکھیں۔ آپ کے اسکیچوں کی ساری اچھائیوں اور برائیوں کے باوجود یہ چاہتا ہوں کہ آپ کا اسکیچ ملے۔ جزوی اختلاف کے باوجود آپ سا لکھ لینا کچھ آسان نہیں۔ باتیں تو سبھی بنا لیتے ہیں خواہ وہ محمد طفیل ہوں یا جوشؔ ملیح آبادی!

اگر آپ میرے پاس ہوتے تو میں آپ کو گلے لگا لیتا، وہ اس بات پر کہ آپ نے میری برادرانہ درخواست کو قبول فرمایا اور میری "جوش و شاہد" کے باب میں چپ رہنے والی بات مان لی شاہد احمد دہلوی زندہ باد!

پچھلے اتوار کو، میں نے الف سے ی تک "گنجینۂ گوہر" پھر پڑھ ڈالی۔ لطف آیا۔ میں اتوار کو کوئی ایسا کام نہیں کرتا، جو لُطف سے خالی ہو۔

میں آپ کو ایک اور مضمون لکھنے کی بھی دعوت دیتا ہُوں۔ وُہ مضمون آپ کو اپنی ذات کے بارے میں لکھنا ہوگا۔ آپ نے جو مضمون لکھا ہے وہ مجھے پسند نہیں۔ اس میں میرا شاہد احمد نہیں، وُہ تو اللہ والے کوئی اور ہی صاحب ہیں۔

خدا کرے آپ مزے میں ہوں اور اس کا امکان ہے کہ میں جولائی کے پہلے یا دوسرے ہفتہ کے درمیان آپ کو بدمزا کرنے کے لیے کراچی آنکلوں۔ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے

عُرس میں، گلگڈ والے بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ اس گرمی کی وجہ سے میں کڑاہی میں ڈالنے کا کام دے سکوں۔

والسلام

آپ کا

محمد طفیل

ساقی۔کراچی ۵

۲۹ جون ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

آپ کا ۲۶ جون کا عنایت نامہ ملا۔ شکریہ!

یہ آپ کی نوازش ہے کہ میری تحریر کو پسند فرماتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں لکھنے سے بہت ہی گھبراتا ہوں۔ اب دیکھیے نا صرف ایک مضمون جوش صاحب پر ایسا لکھا جس میں اچھی بُری باتیں دونوں لکھ دیں، تو اس پر کتنا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ صہبا لکھنوی صاحب نے جان کھا رکھی ہے کہ اُن کے "حفیظ نمبر" کے لیے بھی ایک ایسا ہی مضمون لکھ دُوں۔ میں کہہ رہا ہُوں میری توبہ، میرے باپ کی توبہ، اب کیا مجھے حفیظ سے اور سارے پنجاب سے لڑوانا چاہتے ہو؟ تو وہ کہتے ہیں کہ جوش پر آپ لکھ سکتے تھے حفیظ پر نہیں لکھ سکتے؟ ہمّت ہے تو حفیظ پر بھی لکھیے۔ اب ان سے اپنی بزدلی کا اقرار کر کے پیچھا چھڑا رہا ہُوں۔ گویم مشکل وگرنگویم مشکل۔

تعمیلِ ارشاد میں شوکت تھانوی پر مضمون لکھنے کی کوشش کروں گا۔ مگر جولائی کا شاید پُورا مہینہ اس میں نکل جائے۔ "جوش نمبر" کا سارا کام سمیٹنا ہے۔ اللہ کے فضل سے ایڈیٹر سے لے کر چپراسی تک میں ہی ہُوں۔

آپ بھی نئی سے نئی سوچتے ہیں۔ "آپ بیتی نمبر" ایک عظیم الشّان ادبی کارنامہ ہوگا۔ مگر ہے کسی میں ہمت آپ بیتی لکھنے کی؟ گاندھی جی سچ کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے تھے، وُہ بھی بس ٹرخا ہی گئے۔ ایک بات ضرور ہے آپ کے اس آپ بیتی نمبر سے "بڑے ادیبوں" کی ایمان داری کا امتحان ضرور ہو جائے گا۔

مجھے اللہ توفیق دے کہ ہمت کر کے کچھ لکھ جاؤں۔

میرے پچھلے تین ہفتے نزلہ، زکام، کھانسی میں گزرے، اب بھی انجکشنوں کا سلسلہ جاری ہے۔ افاقہ ہے مگر سینہ ابھی جکڑا ہُوا ہے۔ عمر بڑھ رہی ہے اور عناصر میں اعتدال کم ہو رہا ہے۔

کراچی ضرور آئیے، ضرور!

خاکسار
شاہد احمد

نقوش۔ لاہور
یکم جولائی ۶۳ء

برادر محترم۔ سلام مسنون!

آپ کا ۲۹ جون کا خط ابھی ابھی ملا۔ شکریہ!

یہ ٹھیک ہے کہ آپ "جوش نمبر" میں مصروف ہیں۔ اب آپ کو اس "عبادت" سے روکے کون؟ مگر بھائی شوکت تھانوی پر مضمون اگر ۱۵، ۲۰ کے لگ بھگ نہ آیا تو پٹرا ہوجائے گا۔ میرا بھی تو ارادہ یہی ہے کہ یکم اگست تک پرچہ آجائے۔

یہ مولانا صہبا لکھنوی کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ضرور ایسے ہی کام کریں گے جس سے ہنگامہ ہو۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ جن کے بارے میں نمبر نکال رہے ہیں یا نکالیں گے ان کے بارے میں خود مخلص نہیں ہیں بلکہ چاہتے یہ ہیں کہ ہر نمبر پر شور مچے کہ مار دیا، مار دیا۔ جب آپ کی رائے حفیظ صاحب کے بارے میں اچھی نہیں تو پھر نہ انہیں مضمون لکھوانا چاہیے نہ آپ کو لکھنا چاہیے۔ یہ معاملہ اس صورت میں بھی نازک ہے کہ سوال یو پی اور پنجاب کا اُٹھے گا اور یہ مسئلہ اتنا نازک ہے جسے کسی طرح بھی چھونا نہ چاہیے جبکہ آپ پر پہلے ہی یہ الزام ہو کہ شاہد صاحب بڑے یو، پی والے ہیں۔

یہ تو آپ نے ٹھیک کہا کہ آپ بیتی نمبر خاصے کی چیز ہوگا۔ یہ بھی آپ نے ٹھیک کہا کہ ادیب سچ سچ لکھتے ہوئے گھبرائیں گے مگر مجھے اتنی اُمید ضرور ہے کہ میر تقی میر کے زمانے کے ادیبوں سے آج کے ادیب زیادہ سچ بولیں گے۔

کراچی آؤں گا کلکڑ والے مجھے خواہ مخواہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس میں دھکیل رہے ہیں۔ نہ میں ادیب نہ ادیب کا بھائی۔ پھر قیامت کی گرمی۔ خود بھی بیمار رہتا ہوں مگر انکار اس لیے نہیں کیا کہ انفرادی نوعیت کے کاموں میں تو اپنے آرام و آسایش کے بارے میں سوچ لینا چاہیے مگر اجتماعی نوع کے کاموں میں خود کو واجد علی شاہ نہیں سمجھنا چاہیے ——
جب حیدر آباد تک آؤں گا تو پھر آپ کو آکر کیوں نہ دیکھوں؟ وہاں اور بھی چند ایسے دوست ہیں جو میرے کراچی آنے سے خوش ہوں گے ویسے ایک خبر یہ بھی ہے کہ کراچی میں میرے صرف مخالف

بستے ہیں مگر میں اس کو نہیں مانتا۔ میرا کوئی مخالف نہیں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ سب میرے اپنے ہیں اور میں اُن سب کا ہُوں۔ ادب کے رشتے سے اگر ہم میں اتنی بھی انسانیت نہ ہو تو (مجھ سمیت) سب پر لعنت ہو۔

خدا کرے آپ بالکل اچھے ہوں۔

محمد طفیل

ساقی۔ کراچی

۳ جولائی ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

یکم جولائی کا خط ملا۔ شکریہ!

۱۵، ۲۰ جولائی تک مضمون لکھنا مشکل ہے تاہم کوشش کروں گا۔ اب آپ کراچی آئیے تو آپ سے بہت سی باتیں ہوں گی۔ میں حفیظ صاحب پر مضمون نہیں لکھوں گا[1]۔ دیکھئے میں یُو۔پی والا نہیں ہُوں، دِتی والا ہُوں۔ شاید اسی وجہ سے مجھ میں یُو۔پی اور پنجاب کا تعصب نہیں ہے۔

مخالف تو سبھی کے ہوتے ہیں مگر ہمیں اپنے کاموں سے کام رکھنا چاہیے۔ سب سے بڑی کسوٹی تو خود انسان کا اپنا ضمیر ہوتا ہے، لہٰذا اپنا ضمیر مطمئن ہونا چاہیے۔

آپ جب کراچی آجائیں تو مجھے ٹیلیفون کرلیں۔ یہ اس لئے کہ آپ کا قیام بہت مختصر ہوتا ہے اور اسی میں آپ کو ایک شب میرے ساتھ کھانا کھانا ہوگا۔ کوئی عذر قابلِ سماعت نہیں ہوگا۔ میرا ٹیلیفون نمبر ۴۲۸۵۶ ہے، ساقی منتھلی کے نام سے ڈائرکٹری میں۔

خدا کا شکر ہے کہ اب میری طبیعت اچھی ہے۔ کھانسی کسی قدر باقی ہے۔ باقی اِن شاء اللہ زبانی!

خاکسار

شاہد احمد

نقوش۔ لاہور

۵ جولائی ۶۳ء

برادرم۔ سلام مسنون!

---

[1] صہبا صاحب نے لکھوا ہی لیا۔

آپ کا خط ملا۔ میں ابھی اسی گاڑی میں سوار ہو جاؤں گا، جو کراچی جائے گی۔ مگر میں پروگرام کے مطابق پہلے حیدر آباد اُتروں گا۔ ۸، ۹ جولائی کو کراچی میں ہوں گا۔ ملاقات بھی ہوگی۔ شکوے شکایتیں بھی ہوں گی۔ کھانا بھی ہوگا۔ سبھی کچھ ہوگا۔ سبھی کچھ کے لفظ سے ڈر یئے نہیں۔ ہم دونوں کسی قابل نہیں ہیں۔ میں تو ویسے ہی کبھی کبھی اپنے آپ کو ذہنی دھوکے دے لیا کرتا ہوں۔ بڑا سکون ملتا ہے صاحب!

میں نے سابقہ خط و کتابت کے تحت، جوشؔ صاحب کو بھی ایک خط لکھا تھا، آج ہی اس کا جواب آیا ہے، وہ بھی ساتھ لاؤں گا۔

اس وقت اتنی بھی فرصت نہیں کہ آپ کی خیریت ہی پوچھ لوں۔

والسلام

آپ کا

محمد طفیل

کراچی

برادرِ محترم!

ابھی ٹیلیفون پر میں نے جوشؔ صاحب کے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ درج کرتا ہوں۔ مگر اس سے پہلے کہ آپ جوشؔ کا خط پڑھیں پہلے میرا خط دیکھ لیں جس کے جواب میں جوشؔ صاحب نے مجھے لکھا۔ ملاحظہ ہو:

برادرِ محترم۔ سلام مسنون!

آپ کو ہندوستان گئے ہوئے دو مہینے سے زائد عرصہ ہوگیا ہے۔ برابر دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں آپ بھی قرۃ العین حیدر نہ بن جائیں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ قرۃ العین حیدر ہندوستان جاکر وہیں کی شہری بن چکی ہیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ آپ واپس آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دُنیا مانے یا نہ مانے۔ پاکستان کے لیے فخر کی ایک بات یہ بھی ہے کہ اس کا شہری جوشؔ ملیح آبادی بھی ہے۔

شاہد احمد دہلوی سے میری کوئی ڈو مہینے سے خط و کتابت چل رہی ہے۔ میں نے انھیں بڑا سمجھایا کہ وہ "جوشؔ نمبر" نہ نکالیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ اس کے ساتھ ان کا ارشاد یہ بھی رہا کہ میں آپ کے اور اُن کے مضمون پر محاکمہ لکھوں۔ مگر میں نے اپنے آپ کو اس کا اہل نہ پایا، ٹال دیا اور کیا کرتا۔

ویسے آپ مجھے یہ تو بتائیں کہ اس سلسلے میں آپ کا موقف کیا ہے؟

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے اور جلد آئیں گے۔ آپ کو دیکھنے اور باتیں سننے کو جی چاہتا ہے۔ والسلام

محمد طفیل
۲۰/۶/۶۳

اب جوش صاحب کا جواب ملاحظہ فرمالیں:

عزیزم!

آپ کے خط کا جواب صرف اس قدر ہی ہوسکتا ہے کہ میں شاہد میاں سے کوئی کینہ نہیں رکھتا اور میرا خیال ہے کہ وہ جو کچھ میرے خلاف ہنگامہ کر رہے ہیں اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں بلکہ جبر حالات نے یہ صورت پیدا کر دی ہے اور ظاہر ہے کہ مجبور پر غصّہ نہیں آتا ترس آتا ہے۔

شاہد صاحب جو چاہیں کہیں، جو چاہیں لکھیں میں کوئی جواب نہیں دینے کا۔ میں تو اُن لوگوں میں سے ہوں جن میں عناد و فساد کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی اور جو اپنے بدترین دشمنوں کو بھی بآسانی معاف کر دیا کرتے ہیں۔

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

نیاز مند
جوش
۱/۷/۶۳

شاہد بھائی! آفریں! میں آپ سے پھر یہی کہتا ہوں جو ہوا سو ہوا۔ مٹی ڈالیے اس پہ۔ آ تیے میں آپ کو جوش صاحب سے گلے ملواؤں۔ سینے سے سینہ لگے گا تو کدورتیں دُور ہوں گی۔

جوش صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے کہ میں اور میری طرح کے سارے انسان کوتاہیوں اور لغزشوں سے مبرا نہیں، پھر جوش صاحب نے اپنی پارسائی کا دعوٰی کبھی نہیں کیا۔ یہ کوئی ولی یا پیغمبر تھوڑا ہی ہیں جو معصوم ہوں، خطاؤں سے پاک ہوں۔ میری اور آپ ہی کی طرح کے انسان ہیں جو ہر قدم پر ٹھوکر کھا سکتے ہیں۔ لہذا چھوڑیئے اس قصّے کو، ورنہ دو آدمی آپ کو بُرا کہیں گے دس آدمی جوش صاحب کو بُرا جانیں گے۔ فائدہ کچھ نہ ہوگا۔ بلاوجہ تھڑی تھڑی ہوگی!

میں آج تیز گام سے واپس جا رہا ہوں۔ میرا یہ خط کل تک آپ کو مل جائے گا۔ والسلام

محمد طفیل
۱۲/۷/۶۳

حکیم صاحب

میں بیک وقت دو شخصیتوں سے متصادم ہونے والا ہوں، ایک حکیم یوسف حسن سے، دوسرے نیرنگِ خیال سے۔ دلکشی دونوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں 'نیرنگِ خیال' بھی شخصیت ٹھہری؟ میں عرض کروں گا: کیوں نہیں! جس نے ذہنوں کو نکھارا ہو، شخصیتوں کو جِلا بخشی ہو۔ وہ شخصیت ہی نہیں اس سے بھی بڑی کوئی بلا ہے۔

یہ خدا کی دین ہے۔ کسے معلوم تھا کہ ریلوے کا گڈز کلرک یوسف حسن، کبھی 'نیرنگِ خیال' ایسے عظیم رسالے کا خالق ہوگا۔ جو ایک کارِ بلند انجام دے گا اور صاحبِ روایت شخصیت بنے گا۔ ورنہ ادبی پرچوں کی کہانی تو صرف اتنی ہوتی ہے زن سے نکلے، چھن سے غائب!

مضمون شروع کرنے سے پہلے اگر میں یہاں یہ اقرار کر لوں تو مناسب ہوگا کہ ان میں سے، ایک شخصیت کی تصویر کشی میں، میں آپ سے کوئی رعایت نہیں چاہتا۔ مگر دوسری "شخصیت" کے سلسلے میں، کچھ چھوٹ کا بھی ملتجی ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ حق کی ترازو میں، مجھے مضمون نویسی سے زیادہ 'نیرنگِ خیال' کا دھیان رہنا چاہیے۔ اگر یہ نہیں تو میرا رشتۂ گفتگو بیکار!

میں لاہور کا رہنے والا، حکیم صاحب بھی لاہور کے باسی۔ مگر ہماری ملاقات ہوئی لکھنؤ میں، شوکت تھانوی کے ہاں! غالباً ۱۹۴۵ء میں۔ معاملہ علیک سلیک تک ہی رہا۔ اُس وقت حکیم صاحب بہت کچھ تھے، اس لیے مُنہ کیوں لگاتے۔ میں کچھ نہ ہونے پر بھی سُبک ہو کر کیوں ملتا؟

بہر حال اُن کا انداز کچھ فُوں فُوں قسم کا ہی تھا۔ سُوٹ میں ملبوس تھے۔ سر پہ ہیٹ تھا۔ میں نے سُنا ہے کہ اُن دنوں چھوٹے موٹے ادیب ان سے ملتے ہوئے جھجکتے ہی تھے۔ آج بھی ایک بڑے ادیب یہ کہتے ہیں کہ اُن دنوں میری ہمت نہ تھی کہ ان سے بلاجھجک گفتگو کر سکتا۔ ایک تو کام کا رُعب تھا، دُوسرے شخصیت کا!

تصدیق کے طور پر، اردو کے مشہور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کی بھی رائے سُن لیں۔ ابھی انہوں نے حکیم صاحب کی صرف تصویر دیکھی تھی۔

"پرچہ کے اُوپر کا کاغذ پھاڑا۔ شروع ہی میں ایک زبردست آدمی کی تصویر نظر آئی۔ خیال ہوا کہ امان اللہ خان کا فوٹو ہوگا۔ ایک دفعہ ہی کونہ پر نظر پڑی اور خونی حرفوں میں لفظ "ایڈیٹر" دکھائی دیا۔ یقین مانیے کہ اُچھل پڑا۔ بھلا یہ اور آپ! اللہ رحم کرے۔ جو نقشہ اب تک آپ کی شکل کا دل میں بیٹھا تھا وہ یک قلم

محو ہو گیا۔ سمجھتا تھا کہ حکیم ہیں، دُبلے پتلے آدمی ہوں گے، لمبی داڑھی ہو گی، چندھیائی ہُوئی آنکھیں ہوں گی۔ اُوپر موٹے تالوں کی آٹھ آنے والی عینک ہو گی، جسم پر کشمیری کام کا چوغہ ہو گا۔ اُس کی گھنڈی ثابت اور تکمہ ٹوٹا ہُوا ہو گا۔ غرض عین مین حکیم جی ہوں گے۔ مگر حضرت! آپ نے تو غضب کر دیا خدا کے لیے یا تو اپنے نام کے سامنے سے "حکیم" کا لفظ نکالیے یا حکیموں کی سی شکل بنائیے۔ ورنہ اور نہ سہی، میں تو یہی سمجھوں گا کہ حکمت کی سند آپ نے کہیں سے اُڑائی ہے یا نقل کر کے امتحان میں پاس ہُوئے ہیں۔ آپ کے خطوں میں حرفوں پر باقاعدہ نقطے ہوتے ہیں اُس نے شُبہ میں ڈال دیا کہ بس یُونہی سے کچھ حکیم ہیں۔ لیکن آپ کی تصویر نے اور رہے سہے خیالات، آپ کی طرف سے خراب کر دئیے۔ یقین مانیے کہ آج سے مَیں آپ کے نام کے ساتھ "حکیم" کا لفظ کبھی نہیں لکھوں گا۔ ایسے فیشن ایبل آدمی کے لیے "حکیم" کا لفظ استعمال کرنا ایک طرف اس لفظ کی توہین ہے تو دوسری طرف خود اس شخص پر پھبتیاں اڑانا ہے۔ اس لباس اور اس شکل میں آپ کو ایڈیٹر بننے کا یقیناً حق حاصل ہے لیکن حکیم بننے یا حکیم کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرا ارادہ مونچھیں بھی منڈوا دینے کا ہے۔ ضرور بسم اللہ کیجئے۔ مگر اپنی اس نئی صورت کا فوٹو ضرور شائع کیجئے اور نیچے میرا یہ شعر لکھ دیجئے ؎

داڑھی تو منڈاتے تھے مونچھیں بھی صفا کر دیں
اب نکلی ہے اے فرحتؔ کچھ صورتِ مردانہ"

میں نے اپنی رائے کی تصدیق میں، مرزا فرحت اللہ بیگ کی رائے پیش کی۔ اب مرزا فرحت اللہ بیگ کی رائے کی تصدیق کے لیے، خواجہ حسن نظامی کی رائے پیش کرتا ہُوں تاکہ کسی قسم کا شک و شُبہ باقی نہ رہے۔

"میں بُت شکن قوم کا بیٹا، تُو کا غذی بُت نئے زمانے کا! دیکھوں تو موجود، ہاتھ لگاؤں تو نابُود! تُو ہے یا نہیں ہے؟

آنکھ جانتی ہے تُو ہے۔ ہاتھ کہتا ہے نہیں ہے۔ اگر ہو تو انگریز ہو۔ کیونکہ رُخ انگلش، دل زنکانہ داری!

پیشانی ایسے جیسے مومن کا دل صاف، بلند، کشادہ، بھویں بھیلوں کے تیر کی کمان آنکھیں قاف کی پریوں سے چرائی ہُوئی۔ ناک، رخسار، مونچھیں ایسی، جیسے جرمن فوج کا بندوقچی۔ ٹھوڑی میں گڑھا نہیں ہے جس کو غبغب کہتے ہیں۔ البتہ مصوّرِ قدرت نے تصویر بناتے وقت چاہِ یوسفؑ کا سایہ دکھایا ہے۔ اُوپر ظلمت، نیچے نور، گویا رات دن کا فرق ایک جگہ جمایا ہے۔

اس بُت کے کان ایک ہی سے ہیں۔ یہ بولتا نہیں چُپ ہے۔ تو سنتا بھی نہ ہو گا اور سُنتا ہو گا

تو فقط ایک کان سے، کیونکہ دُوسرا کان کئی لاکھ کوس سے فقط اپنا ماتھا گھسا رہا ہے۔

کپڑے اس کے بدیشی، بائیکاٹ کا ہدف، سینہ پر بے رنگ پھُول نہیں "نیرنگ" کی ایک بے رنگی!

(نیرنگِ خیال، دسمبر ۱۹۳۱ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ اور خواجہ حسن نظامی بڑے شخصیت نگار ہیں۔ لہٰذا اس باب میں، ان کا کچھ کہنا، سند پہ سند والی بات ہے۔ غرض شنید کے مطابق یہ قیامت ہی قیامت تھے۔

۱۹۴۵ء میں جب مَیں نے انھیں دیکھا تو کچھ ایسے تھے:

رنگ شنگرفی، چہرے پہ چمک، آنکھوں میں بجلیاں، قامت بلند، جسم گٹھا ہُوا، مُونچھیں گھنی، ناک نقشہ موہنا، خوش وضع، خوش قطع، چال پُرشکوہ اور چہرہ باوقار!

آواز میں طنطنہ، باتوں میں تیقّن ——— ایک جلالی شخصیت!

آج جب یہ مضمون لکھ رہا ہُوں تو:

(بہت آہستہ آہستہ پڑھیے) رنگ سفید، چہرے پہ رونق، آنکھوں میں جان، کمر نیم خمیدہ، جسم ڈھلتا ہوا، مُونچھیں سفید، داڑھی سفید، ناک پہ عینک، دانت غائب، حلیم الطبع، سلیم الفطرت، چال میں لڑکھڑاہٹ اور چہرہ سوالیہ!

آواز میں کچھ ٹھسک، باتوں میں کچھ اُمید، ——— مگر ایک مشفق شخصیت۔

غرض حکیم صاحب کی شخصیت میں بڑی موہنی ہے۔ اس کے ساتھ ہنگامہ خیزی بھی، کچھ ایسی ہی باتوں کو ذہن میں رکھ کر، میں نے حکیم صاحب کی خدمت میں گزارش کی: اپنی سوانح لکھ ڈالیے۔ میری سوچ پہ علامہ اقبال کا یہ شعر سوار تھا: ؎

تُو اپنی سرگزشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

مگر جواب ملا تو یہ:

"میری سوانح میں کیا رکھا ہے؟"

"آپ کی سوانح میں کیا نہیں رکھا۔ جو کچھ آپ کے پاس ہے ویسا کچھ تو ادبی میدان میں کسی کی بھی گرہ میں نہیں۔"

"اس بڑھاپے میں مجھے غلط رستے پر نہ ڈالو یار!"

مَیں نے محسوس کیا کہ حکیم صاحب اس فرض سے سبکدوش نہ ہوں گے، کچھ اپنی عمر کے تقاضے سے، کچھ اپنی انکساری کی وجہ سے۔ یہی وجہ تھی کہ مَیں نے اُن کی باتیں چُرانی شروع کر دیں یہ سوچ کر کہ اگر اس "جن" کو مَیں نے بھی سرِ صفحات قید نہ کیا تو پھر بات رہ جائے گی۔ عامل مَیں نہیں ہُوں۔ انجام خدا معلوم۔ دھڑکتے دل کے ساتھ آنکھیں

---

[1] سنِ ولادت ۳ر جون ۱۸۹۲ء

چار کرتا ہوں۔

حکیم صاحب کو اپنی تعلیم کے ادھورے رہ جانے کا بڑا افسوس ہے۔ کہتے ہیں کہ مَیں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بے حد ذہین تھا، بے حد لائق۔ یہی وجہ تھی کہ مَیں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو درخواست دی کہ میں ساتویں اور آٹھویں جماعت کا امتحان اکٹھا دوں گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اور میرے استاد کے درمیان، میرے متعلق کچھ باتیں ہوئیں۔ نتیجہ یہ نکلا درخواست منظور ہو گئی یہی ڈھیل میرے لیے تعلیمی تباہی لائی۔ میں نے اپنا وطیرہ یہ بنا لیا تھا کہ استاد کو، اسکول سے یہ کہہ کر چلا جاتا تھا کہ آٹھویں جماعت کی تیاری کرنی ہے۔ لہٰذا ساتویں جماعت میں بیٹھ کر کیا کروں؟ اسکول سے نکلتا، سیدھا پنجاب پبلک لائبریری پہنچ جاتا۔ وہاں جا کر پڑھتا کیا؟ 'طلسم ہوشربا'! نو مہینے تک 'طلسم ہوشربا' پڑھتا رہا۔ صبح جاتا تھا، لائبریری بند ہونے تک پڑھتا رہتا تھا۔ اُس کتاب نے مجھے ایسا پکڑا تھا کہ ہل نہ سکا۔ اُس ماحول میں پڑھائی 'خاک' ہوتی۔ شام ہوتی تھی تو صبح کا انتظار۔ نتیجہ؟ آنکھیں نکل آئیں، چہرہ زرد ہو گیا، صورت وحشت زدہ۔ مگر شوق تھا کہ فزوں سے فزوں تر! پھر عمر ایسی کچی تھی کہ کتاب کے ہر ہر واقعے سے متاثر ہوتا تھا۔ مثلاً "نور افشاں" جادوگر کو مسلمانوں کا خیر خواہ بتایا ہوا تھا۔ وُہ ایک جگہ مر جاتا ہے۔ میرا یہ پڑھنا تھا کہ بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ اتنا رویا، اتنا رویا کہ گھگی بندھ گئی، جیسے میرا کوئی بھائی بند مر گیا ہو۔

ان حالات میں جب آٹھویں جماعت کا امتحان قریب آ گیا تو مجبوراً پڑھائی پر توجہ دی۔ کورس کی کتابیں کچھ کہتی تھیں، 'طلسم ہوشربا' کے کردار کچھ۔ غرض ذہن خُوب اُتھل پُتھل ہُوا۔ کہنے کو تو مَیں پاس ہو گیا۔ مگر جو میرے ذہن کی چمک تھی وُہ ماند پڑ گئی۔ نویں جماعت میں مَیں نے یہ محسوس کیا کہ باقی لڑکوں سے کمزور ہوں۔ یہ چیٹک ایسی تھی کہ پھر کورس کی کتابوں میں دل نہ لگا۔ نویں جماعت بہ مشکل پاس کی۔ دسویں جماعت پاس کرنے کی بجائے، مَیں نے مناسب یہ سمجھا کہ 'طلسم ہوشربا' پر ہی پی ایچ ڈی کروں۔ یُوں کورس کی کتابیں ہاتھ سے چھُوٹ ہی گئیں۔

حکیم صاحب یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے کہا،

"اُس کتاب نے آپ کو بڑا نقصان پہنچایا۔"

"مَیں تو پھر بھی بچ گیا۔ اس کتاب نے ہزارہا آدمیوں کو اندھا کر دیا اور ہزاروں ہی کی زندگی تباہ کر ڈالی۔"

حکیم صاحب کے پڑھنے کا حال سُن لیا، اب کچھ لکھنے کا بھی سُن لیجئے:

یہ بھی ایک عجیب اور دلچسپ قصّہ ہے جس نے میری ادبی زندگی کی طرف باگیں موڑ دیں۔ میں 'انتخاب لاجواب' پڑھا کرتا تھا۔ مجھے اس کے ایڈیٹوریل پسند تھے۔ اس لیے میں نے ایک افسانہ نما مضمون "پُراسرار عمارت" لکھ کر مدیر "انتخاب لاجواب" کو بھیجا۔ جس وقت میں نے وہ مضمون بھیجا تھا اس وقت میری عمر چودہ برس تھی۔

مجھے اُمید نہ تھی کہ میرا مضمون چھپے گا۔ نہ صرف مضمون چھپا بلکہ منشی محبوب عالم ایڈیٹر "انتخاب لاجواب" کی طرف سے ایک خط بھی ملا۔ رقم تھا: "مجھ سے آ کر ملیے۔"

اُچھلتا کودتا دفتر پہنچا، چِٹ بھجوائی۔ فوراً بلا لیا گیا۔ مگر وُہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پُوچھا: "یہ مضمون جو ہمارے رسالے میں چھپا ہے آپ کا لکھا ہوا ہے؟"

"جی ہاں!"

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔"

"اچھا تو آپ ابھی اپنی تعلیم جاری رکھیں، مجھے تو اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔"

میں نے دیکھا کہ اُن کی میز پر پیپر ویٹ پڑا ہے جس پر لکھا ہے:

TIME IS MONEY.

اس لیے میں نے اسی کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"مجھے اجازت دیجیے۔"

اس پر منشی محبوب عالم مسکرائے، کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ میں بڑا خوش ہُوا کہ اتنے سے بچے کی اتنی حوصلہ افزائی! جگہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کی! میری تحریر کا یہ مقام و مرتبہ، کچ طبع تھا، کچ ذہن تھا، مہینوں زمین پر پاؤں نہ ٹکے۔"

اُن دنوں "انتخاب لاجواب" کا بڑا مقام تھا۔ اس ادارہ سے "انتخاب لاجواب" کے علاوہ بھی پرچے نکلتے تھے جو بڑے پائے کے تھے، جن میں روزنامہ "پیسہ اخبار"، ہفت روزہ "پیسہ اخبار"، ماہنامہ "شریف بیوی" اور "بچوں کا اخبار"۔

اُنہی دنوں 'پیسہ اخبار' کے علاوہ دو اور اخبار بھی لاہور سے نکلتے تھے جن میں 'وطن' اور 'اخبارِ عام' زیادہ مشہور تھے۔ 'وطن' اور 'پیسہ اخبار' میں خوب چپقلشیں رہتی تھیں۔ ایک دُوسرے کے خلاف خُوب لکھا جاتا تھا۔ صبح جُوتیوں میں دال بٹتی نظر آتی۔ مگر شام کو منشی محبوب عالم اور انشاء اللہ خان ایک ہی لینڈو میں بیٹھے سیر کو جاتے ہُوئے نظر آتے۔ عجیب لوگ تھے، عجیب کردار تھا ان کا!

'اخبارِ عام' کچھ اس انداز سے نکلتا تھا کہ اخبار میں "اخبار کی بہار" کے عنوان سے ایک سطر میں پُورے اخبار کی چوڑائی کے برابر، ایک خبر ہوتی تھی جس میں یہ لکھا ہوتا کہ فلاں جگہ اور فلاں فلاں آدمیوں کے درمیان لڑائی ہُوئی اور اُن میں سے فلاں شخص مارا گیا۔ پھر اسی سطر میں، آخر میں ایڈیٹر کی طرف سے یوں تبصرہ ہوتا ——— "خدا کی مرضی!"

یا یہ خبر کہ فلاں عورت کے فلاں مرد کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے موقع پا کر دونوں بھاگ گئے۔ ایڈیٹر کی طرف سے تبصرہ! ——— بد معاشی کی انتہا۔

یا یہ خبر کہ فلاں دفتر میں، فلاں مجسٹریٹ نے اس وقت چھاپہ مارا جب کہ کلرک رشوت لے رہا تھا۔ تبصرہ ——— پیٹ کی مار۔

دیکھی آپ نے لہجے کی ٹکور، آج بھی کوئی "اخبارِ عام" کے فائل کھنگالے گا تو اسے خبروں کے ساتھ، ایڈیٹر کی طرف سے بڑے دلچسپ تبصرے ملیں گے۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ منشی محبوب عالم ایسا باہوش ادیب بھی۔ جب حکیم صاحب کو اپنے رسالے کی ایڈیٹری کے لیے موزوں پاتا ہو تو پھر یہ کیوں نہ اپنا پرچہ نکالتے۔ اسی دھن میں یہ شفاءُ الملک حکیم فقیر محمد چشتی کے پاس جا رہے تھے کہ راستے میں انھیں عبدالمجید سالک مل گئے۔ انھوں نے پُوچھا:

"حکیم صاحب! کدھر؟"

"شفاءُ الملک کی خدمت میں حاضری کا ارادہ ہے۔"

"خیریت؟"

"ایک ادبی رسالہ نکالنے کا خیال ہے، مشورے کے لیے جا رہا ہُوں۔"

"ان سے مشورہ بعد میں لینا، پہلے میرا مشورہ سُنو، اور وُہ یہ کہ ادبی رسالہ نہ نکالنا' مارے جاؤ گے۔ ادبی پرچے نہیں چلتے۔ مَیں نے "فانوسِ خیال" میں ہزاروں کا نقصان اُٹھایا۔ فلاں نے پرچہ نکالا تباہ ہو گیا، فلاں نے پرچہ نکالا پاگل ہو گیا۔ لہٰذا حکیم صاحب! آلُو چھولے بیچ لیجئے گا' پرچہ نہ نکالیے گا۔"

"اب میں نے جو ارادہ کر لیا ہے اُس میں تباہی ہو یا بربادی' اپنے ارادے سے باز نہ آؤں گا۔ اور یہ بھی کہے دیتا ہُوں کہ پرچہ ایسا نکالوں گا کہ اس سے پہلے کے سارے پرچے گرد ہو جائیں گے۔"

سالک صاحب سے رخصت ہو کر، میں شفاءُ الملک حکیم فقیر محمد چشتی کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنا عندیہ بیان کیا۔

انھوں نے دعا دی:

"خدا تمھیں کامیاب کرے۔"

میں نے شفاءُ الملک سے درخواست کی: "رسالے کا نام تجویز فرما دیجئے۔"

"کیا کیا نام سوچے؟"

"دلچسپ، لالہ زار، نیرنگِ خیال"۔

شفاءُ الملک بڑے ماہر خطاط تھے اُنھوں نے فرمایا:

"اچھا نام وُہ ہوتا ہے جو لکھنے میں بھی اچھا لگے۔ میرے نزدیک تو ان میں سے "نیرنگِ خیال" سب سے بہتر ہے۔"

چنانچہ "نیرنگِ خیال" کا جو پہلا شمارہ نکلا اس کا ٹائٹل حکیم فقیر محمد چشتی کا لکھا ہُوا ہے۔

اب رسالے کے متعلق ان کے بنیادی نظریات بھی سُن لیں: "مَیں نے ابتدا ہی میں چند باتوں کو دھیان میں رکھ لیا تھا، وہ یہ کہ میرا رسالہ دوسرے رسالوں سے مختلف ہو۔ بہتر ہو۔ مفید ہو۔ خوبصورت ہو۔"

تکمیل کی ابتدا یُوں ہُوئی تھی، عبدالرحمٰن چغتائی سے تصویر لی جس کا نام 'لیلیٰ' تھا۔ اُسے پہلے شمارے میں بڑی شان سے چھاپا۔ اہتمام یہ بھی کہ کاغذ اچھا لگایا، کتابت عُمدہ کرائی، چھپائی نفیس کرائی اور پھر یہ کہ مضامین بھی بڑے ادیبوں کے۔ پہلا پرچہ بازار میں آیا تو لوگ ٹھٹھکے۔ ایک شہرِ معارف آباد تھا پرچے میں، ہما شما کا تو ذکر ہی کیا۔ علامہ اقبال نے پہلے پرچے پر اپنے خیالات کا اظہار یُوں کیا تھا:

"رسالہ 'نیرنگِ خیال' جو لاہور سے نکلنا شروع ہُوا ہے بہت ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مضامین میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔ ایڈیٹر دونوں (حکیم یُوسف حسن ایڈیٹر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر جائنٹ ایڈیٹر) نوجوان ہیں اور لٹریچر کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں۔ جناب عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویر 'تحفۂ لیلیٰ' بہت خوب ہے۔ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ دیکھیے اب تحفۂ قیس کب نکلتا ہے۔"

لاہور، ۱۷۔ اگست ۱۹۲۴ء — محمد اقبال

۱۹۲۴ء کے بعد پھر ۱۹۲۸ء میں بھی علامہ اقبال نے 'نیرنگِ خیال' کی خدمات کو سراہا:

"رسالے کے مضامین اور تصاویر خُوب ہیں۔ حکیم یوسف حسن کا انتخاب واقعی قابلِ داد ہے۔ غالباً 'نیرنگِ خیال' کا سالنامہ اردو رسائل میں سب سے اچھا ہے۔ 'نیرنگِ خیال' کے خاص نمبروں نے تمام اردو رسائل کو اپنا معیار بلند کرنے پر مجبور کیا ہے بالخصوص ان کے ظاہری محاسن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ملک کو حکیم صاحب کی اس مستعدی، بے دریغ زرافشانی اور ذوقِ سلیم کی قدر کرنی چاہیے۔"

جنوری ۱۹۲۸ء — محمد اقبال

ان کا جو پہلا شمارہ نکلا، اس کے سرِورق پہ بجائے ۸۶، ۸۷ کے، لکھا ہُوا ہے۔ بسم اللہ غلط تھی مگر انجام بخیر ہُوا اور ہوگا۔ اب تک جو کچھ سامنے آچکا ہے۔ وُہ بھی حیران کُن ہے، وہ بھی ناقابلِ تسخیر ہے۔ وُہ بھی مستقبل کا سرمایہ ہے، اس لیے کہ اس کی ہر ہر سطر سے تفکّر کی آنچ آتی ہے۔

'نیرنگِ خیال' کے پہلے شمارے کا جو اداریہ ہے وُہ بھی قابلِ توجہ اس لیے ہے کہ اُسی سوچ پر تو ساری "عمارت" کھڑی ہے۔ اُسی پہ تو فکر و شعور کا سفینہ رواں ہے۔ اجازت دیجئے تاکہ وُہ مَیں آپ کو پڑھ کر سُنا دُوں:

"پنجاب زندہ دلی کے لیے ضرب المثل ہُوا اور ہو کر رہ گیا کوئی وقت تھا کہ قومی جدوجہد کے ہر شعبہ میں ہمیں سبقت حاصل تھی۔ ہر مذہبی، معاشرتی اور ادبی تحریک میں ہمیں پیش روی کا فخر حاصل تھا مگر ملکی انحطاط کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی زوال آتا گیا، بلند ہمتی پستی کے ساتھ بدل گئی۔

ادبیات کی تاریخ میں، پنجاب کا نام تا ابد ایک مخصوص شہرت کے ساتھ زندہ رہے گا۔

اردو پنجاب کے بطن سے پیدا ہوئی۔ تورانی حملہ آوروں نے پہلے پہل یہیں بُود و باش اختیار کی اور بھاشا یہیں نئے سانچے میں ڈھالی گئی۔ مگر حکومت کے تغیر کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ زبان کے مرکز بن گئے اور اُردو اپنی سوتیلی ماں کی آغوش میں پرورش پاتی رہی اور یہ موانست یہاں تک بڑھی کہ پنجاب اجنبی قرار دیا گیا اور دہلی لکھنؤ والوں کی زبان ٹکسالی شمار ہونے لگی مگر انقلابِ زمانہ نے وطنی حکومت کو تباہ کر دیا۔ اغیار نے قدرتاً بیگانگی برتی اور اس آزمائش کے وقت میں پنجاب مردِ میدان ثابت ہوا۔

دہلی اور لکھنؤ کے اکھاڑا بند ہر چند آوازے کستے رہے مگر پنجاب میں احیائے اردو کی تحریک حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ ترقی پکڑتی گئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں بے شمار اخبار اور رسالے شائع ہونے لگے اور تمام ملک نے غیر معمولی سرگرمی کا اظہار کیا۔ یہ علامہ اقبال اور 'مخزن' کا دور تھا۔ مگر اقتصادی اور معاشرتی تغیرات اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے۔ جنگِ یورپ تمام ادبی تحریکات کے لیے پیغامِ قضا ثابت ہوئی۔ لیکن پنجاب پھر بیدار ہوا۔ قومی نشوونما کے ساتھ ادبی ترقی بھی ہونے لگی اور پھر رسائل جاری ہونے لگے ؎

گرم صد بار سوزی باز بر گردِ سرت گردم
منم پروانہ کز یک سوختن از دست و پا رفتم

یہ مرمر کے جینے کی سرگزشت پنجاب کی ادبی شیفتگی کی ادنیٰ ترین مثال ہے۔ چاہیے تھا کہ ماہوار رسائل ان تجربات سے کچھ فائدہ حاصل کرتے۔ گزشتہ شب کی گرمیِ صحبت نے جو پروانوں کا ڈھیر چھوڑا تھا اگر اسے آنے والی صبح کی تعمیر میں صرف کرنا دشوار تھا تو اس سے مشعلِ ہدایت کا کام لینا محال نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے رسائل نے انگریزی میگزینوں کی کورانہ تقلید ترک نہ کی اور محض ادبِ لطیف کی اشاعت اپنا مقصد بنا لیا۔ یہ روش نہ تو پبلک میں مقبول ہے اور نہ قوم کے لیے مفید اور نہ ہی ادبیات کی خدمت کرنے کا اعلیٰ طریقہ ہے۔ اردو کے مشہور ادیب آزادؔ، شبلیؔ، حالیؔ، سرسیدؔ، محسن الملکؔ، ادبِ لطیف کے علمبردار نہ تھے۔ ہم ادبِ لطیف کو معیوب نہیں سمجھتے۔ ہمارے خیال میں ادبِ لطیف مہذب زندگی کا ایک جزوِ لاینفک ہے مگر اسے ادبیات کا واحد نصب العین تصور کرنا کسی طرح روا نہیں ہے ؎

---

[1] اردو سلطنت مغلیہ کے عہد میں پیدا نہیں ہوئی۔ اس زبان کی پیدائش کے تمام اسباب پہلے بھی بوجوہ اتم موجود تھے۔ ولی جسے غلطی سے اردو کا پہلا شاعر کہتے ہیں دکنی تھا۔ جس سے اُردو کی عالمگیر شہرت کا اندازہ ہو سکتا ہے مگر اس سے پہلے دسویں صدی ہجری میں سلطان محمد قلی قطب شاہ دکن صاحبِ کلیات تھا۔

من نگویم فرو بند لب از نکتۂ شوق
ادب از دست بدہ بادہ باندازۂ ہوش

ہم نے "نیرنگِ خیال" کا اجراء اردو ادبیات میں اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے کیا ہے ہمارا ادعا قوم کے احاطۂ نظر کو وسعت دینا ہے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ مہذب دُنیا کے ہر شعبۂ خیال کو ادبی لباس میں پیش کیا جائے۔ معاشرتی، مذہبی، تعلیمی، تاریخی غرض ہر قسم کے مضامین ہوں گے مگر اس تنوع کے ساتھ ساتھ ایک مقصدِ وحید ہر وقت پیشِ نظر رہے گا کہ ہر مضمون ایک ادبی تحریر ہو۔"

جولائی ۱۹۲۴ء

یہ ہے وُہ پہلی اینٹ جس پر ساری "عمارت" کھڑی ہے۔ یہ ہے وہ فکر و شعور کا انگڑائیاں لیتا ہوا انداز، جس نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

حکیم صاحب نے فرمایا:

"ادارت بڑا مشکل کام ہے بابا! یہ ہر کسی کے بس کا نہیں۔ بعض اوقات علمیت اور قابلیت بھی کام نہیں آتی۔ ذاتی سُوجھ بُوجھ کا بھی اس میں بڑا دخل ہے۔ مثال کے طور پر 'لیلیٰ کے خطوط' کا قصہ سنو۔

یہ خطوط قاضی عبدالغفار نے سید امتیاز علی تاج کو بھیجے تھے 'کہکشاں'[1] میں اشاعت کے لیے۔ مگر تاج صاحب نے انہیں نہ چھاپا۔ ان کا خیال تھا کہ فحش ہیں۔ ڈرتے تھے احتساب کی زد میں آ جاؤں گا۔

مجھے تاج صاحب نے وُہ خطوط، یہ کہہ کر دے دئے تھے: "ہمّت ہے تو چھاپ دیجئے!"

میں نے جواب دیا: "پڑھ کر عرض کروں گا۔"

میں وُہ خطوط لے آیا، پڑھ ڈالے۔ جیسے جیسے میں انھیں پڑھتا گیا متاثر ہوتا رہا۔ جب کتاب ختم کر لی تو میں نے سوچا کہ ایسی کتاب اور اس نوع کی کتاب تو پُورے ادب میں ہے ہی نہیں۔ انداز بے باکانہ ضرور ہے۔ سو اس کا کوئی حل سوچنا چاہیے۔ دو چار دن سوچتا رہا بالآخر فیصلہ یہ کیا جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا، میں اسے چھاپوں گا ضرور!

حل یہ سوچا تھا کہ اُن خطوں پر مفصّل نوٹ لکھنا چاہیے اور بس! مَیں نے پہلی قسط کے طور پر، صرف تین صفحوں میں تو خطوط چھاپے اور اُن پر دو صفحوں کا نوٹ لکھا تھا کہ یہ خطوط فحش نہیں ہیں بلکہ عورت کی نفسیات کا نفیس ترین اور نازک ترین مطالعہ ہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ اُردو ادب میں اس انداز کی کوئی چیز نہیں۔ وغیرہ وغیرہ!

میرا خیال تھا کہ اگر مَیں نے وُہ خطوط، بغیر کسی نوٹ کے چھاپ دیئے تو پرچہ ضبط ہو جائے گا۔ چونکہ میں نے

---

[1] سیّد امتیاز علی تاج کا رسالہ، جو تھوڑا عرصہ نکلا۔ مگر نکلا دھوم سے۔

حصار باندھ دیا تھا۔ اس لیے یہ خطر تھا کہ اب کچھ نہ ہوگا بلکہ اُلٹی واہ واہ ہوگی۔ چنانچہ وہی ہُوا۔ حکومت کو اعتراض کا موقع نہ ملا اور ادب میں دھوم مچ گئی۔ اگر میں بھی تاج صاحب کی طرح سوچنے لگ جاتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ ادبی شاہکار ہماری مصلحتوں کے چکر میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا۔

حکیم صاحب نے فرمایا یہ وہ زمانہ تھا جسے اُٹھتی جوانی کہتے ہیں۔ اس لیے میں ہر قسم کا خطرہ مول لے سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ میں ہر کسی سے لگا بھی جاتا تھا۔ مجھے ادبی محاذ پر سبقت لے جانے اور دُوسروں کو پچھاڑنے میں مزا آتا تھا۔ مگر مجھے اس امر کا افسوس ہے کہ میرا پہلا ادبی معرکہ دوستوں سے ہوا۔ وہ یُوں :

میرے ہاں اُٹھنے بیٹھنے والوں میں حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تاثیر، غلام عباس اور بدرالدین بدر تھے کبھی کبھی عبدالرحمٰن چغتائی بھی آن نکلتے تھے۔ خُوب گپ بازی ہوتی تھی۔ جلیبیاں اور کباب اڑتے تھے۔ چائے کے دَور چلتے تھے ادب پر باتیں اور بحثیں ہوتی تھیں۔ یعنی خُوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ہم سب ایک تھے۔

حفیظ صاحب کی دبی دبی خواہش یہ تھی کہ مجھے بھی 'نیرنگ خیال' کے ادارے میں شامل کر لیا جائے۔ میری سوچ یہ تھی کہ حفیظ صاحب ہمیں اپنے شعری کارناموں سے نوازتے رہے ہیں۔ اس لیے اس تکلف کی ضرورت کیا ہے۔ مگر اس بات کو حفیظ صاحب نے بہت محسوس کیا۔

اُدھر مولانا تاجور 'مخزن' سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ مالکوں نے 'مخزن' بند کر دیا تھا حفیظ صاحب مالکان رسالہ سے جا کر ملے۔ انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ 'مخزن' کو دوبارہ نکالا جائے۔ ساتھ ہی اپنے آپ کو ادارت کے لیے پیش کر دیا۔ وہ بھی بغیر تنخواہ کے !

وہ ساری پارٹی جس میں ڈاکٹر تاثیر، بدرالدین بدر، غلام عباس اور چغتائی تھے۔ سب کے سب 'نیرنگ خیال' کے دفتر سے اُٹھ کر مخزن کے دفتر پہنچ گئے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ 'نیرنگ خیال' کا جنازہ نکال دیا جائے ادھر میں اکیلا رہ گیا تھا ادھر جنازہ نکالنے والے کئی تھے۔

یہ لوگ میرا جنازہ ضرور نکال دیتے بشرطیکہ مجھ میں کوئی صلاحیت نہ ہوتی یا میری ادبی موت واقع ہو جاتی۔ میں خود جیتا تھا میرے عزائم جیتے تھے۔ میری لگن جیتی تھی۔ میری سُوجھ بُوجھ جیتی تھی۔ اس لیے سب کے سب اپنی خواہشوں میں بُری طرح ناکام ہوئے۔

جن دنوں حفیظ صاحب نے 'مخزن' سنبھالا تھا۔ اُن دنوں حفیظ صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ان کے کلام کی دھوم تھی۔ نہ صرف دھوم تھی بلکہ حفیظ صاحب پُوجے جاتے تھے۔ شاعر اسلام جو تھے۔

اُن دنوں 'نیرنگ خیال' کی ادبی اہمیت کے ساتھ اس کی ایک خُوبی یہ بھی گنی جاتی تھی کہ اس میں بہترین مصوروں کی تصویریں چھپا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ پرچہ فوٹوگرافی کے بھی شاہکاروں سے آراستہ ہوتا تھا۔

حفیظ صاحب نے شہر بہ شہر جاکر 'نیرنگ خیال' کی اس رُخ سے مخالفت کی کہ تصویریں چھاپنا خلافِ شریعت ہے۔ اس لیے 'نیرنگ خیال' کی وجہ سے مذہب خطرے میں پڑگیا ہے۔

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ اُن دنوں مَیں نے گیارہ ماہ کے بعد' تاثیر کو اپنے دفتر میں دیکھا تھا اور یہ وہ دن تھا جس دن حفیظ صاحب کی ادارت میں نکلنے والا 'مخزن' بند ہوا تھا۔

'نیرنگ خیال' کی دُھوم' زیادہ تر اُن کے سالناموں کی وجہ سے تھی۔ ظاہری شان و شوکت بھی ایسی ہوتی تھی کہ دل کھنچتا تھا۔ خوب صورت ٹائٹیل کے ساتھ، متعدد رنگین تصویریں ہوتی تھیں۔ آج بھی اتنے خرچ کا تصور محال ہے۔ چہ جائیکہ اُن دنوں جب کہ لوگ سیدھے سادے انداز میں پرچہ چھاپنے کے عادی تھے۔ یہ اجتہاد انہی کا حصہ تھا۔

حکیم صاحب پرچے کی آرائش پر کس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ اُس کا ایک واقعہ اُنھوں نے یوں سُنایا تھا:

"پرچے کو معتبر بنانے کا شوق، جنون کی حد تک تھا۔ مَیں نے ایک دفعہ بازار میں رنجیت سنگھ پر انگریزی میں ایک کتاب دیکھی، قیمت پُوچھی تو اُس نے نوّے روپے بتائی۔ میں نے تھوڑے سے تامّل کے بعد کتاب خرید لی۔ اُس نوّے روپے کی کتاب میں سے تصویر پھاڑ کر، کتاب سیّد امتیاز علی تاج کو دے دی تھی۔"

وہ زمانہ آج کا نہ تھا۔ اُس وقت نوّے روپے کی بڑی قیمت تھی۔ صرف ایک تصویر کے لیے نوّے رُپے خرچ کرنا آسان کام نہ تھا۔ واقعی وہ شوق نہ تھا، جنون تھا۔ شوق اور جنون میں صرف ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے مگر اسے پھلانگنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

اس ٹھاٹھ کا تو تھا اس کا ظاہری حُسن، سفید کاغذ، بعض اوقات موجودہ رسالوں سے بڑا سائز، خوبصورت لکھائی، خوب صورت چھپائی۔ اس اہتمام سے اور اتنی تعداد میں اگر آج پرچہ چھاپا جائے تو کم از کم بھی نصف لاکھ روپیہ لاگت آئے گی۔ یہ تو تھی اس پرچے کی ظاہری شان، اب معنوی حیثیت بھی دیکھئے:

میرے سامنے اس وقت ۱۹۳۴ء کا سالنامہ ہے۔ اس کے قلمی معاونین ہی سے اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ کر لیجئے۔ اس سے زیادہ لکھوں گا تو نقاد حضرات کہیں گے، پھر آیا ہماری حدود میں۔ مختصر جائزہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ آپ حکیم صاحب کے خرچیلے مزاج کے ساتھ، ان کے ادبی رجحان کو بھی جان سکیں۔

مضمون نگاروں میں سے صرف چند نام لکھتا ہُوں، وہ بھی بغیر کسی ترتیب کے، جنہوں نے سالنامہ ۱۹۳۴ء میں شرکت کی تھی اور اسے اپنے رشحاتِ قلم سے سنوارا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر اقبال، سر عبدالقادر، عشرت لکھنوی، آغا حشر، عبدالمجید سالک، نیاز فتحپوری، ایم اسلم، منشی پریم چند، امتیاز علی تاج، محمود شیرانی، نصیر حسین خیال، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، نور الٰہی، محمد عمر، سیماب اکبر آبادی، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر تاثیر، شوکت تھانوی، فراق گورکھپوری، قاضی عبدالغفار، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، صفی لکھنوی،

جگر مراد آبادی، ظریف لکھنوی، احسن مارہروی، عظیم بیگ چغتائی، سائل دہلوی، عزیز لکھنوی، ریاض خیر آبادی۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے لکھنے والے تھے۔ سب کے نام کہاں تک گنواؤں۔ ابھی تو ایک لمبی فہرست' اسی ایک شمارہ کے مضمون نگاروں کی باقی ہے۔ جب ایسے ایسے لوگ لکھنے والے ہوں گے اور اتنے زیادہ لکھنے والے ہوں گے تو اس رسالے کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ خود ہی کر لیجئے۔ یہ سب کچھ چھومنتر کے زور پر نہیں ہو جاتا اور یہ بھی کہ ادبی اسرار کے قفل اُس وقت تک نہیں کھلتے جب تک کہ کوئی عشق پیشہ اپنے لہو کی اِک اِک بُوند کو نذر نہ کر ڈالے۔ اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آ رہا ہو تو آئیے میں آپ کو اس وقت کے نمایاں اکابرینِ ادب کی رائے بھی سُنوا دوں! حوصلے سے اسے بھی پڑھ لیجئے۔ حکیم صاحب کو زمانہ نے دیا کیا ہے سوائے تحسین کے، سوائے واہ وا کے جھولے کے!

مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا:

"اردو ادب پر جو پنجاب نے احسان کئے ہیں وُہ زاید از حدِ شمار ہیں۔ یہ خود ستائی نہیں۔ خود غالب و انیس کے نام لینے والے معترف ہیں کہ جو کام دہلی اور لکھنؤ سے نہ ہو سکا لاہور والوں نے کر کے دکھا دیا۔ صحافت کی موقت الشیوع صنف آج کل ادبیات کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اس صنفِ سخن میں پنجاب گریز پا ترقی کر رہا ہے اور متعدد و بلند پایہ صحائف کا بدیع المنزلت وجود، اس پر گواہ، یُوں تو ان میں ہر ایک گنجِ شائگان ہے۔ لیکن میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہُوں کہ 'نیرنگِ خیال' جس کا اہتمام حکیم یُوسف حسن کے باسلیقہ ہاتھوں میں ہے ان سب کا سرتاج ہے۔ میرے سامنے اس وقت 'نیرنگِ خیال' کا وُہ خاص نمبر ہے جو سالنامہ کے نام سے شائع ہُوا ہے اور دو سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی اٹھان کو دیکھ دیکھ کر میں حیران ہُوں کہ اس کی ترقی کہاں جا کر رُکے گی اور اس کی بے مثال خُوبیوں پر نظر ڈال ڈال کر لسان الغیب کی زبان میں بے اختیار پکار اُٹھتا ہُوں کہ ؎

غبارِ خط بپوشانید خورشید رخش یا رب!

حیاتِ جاوِدانش دِہ کہ حُسنِ جاوِداں دارد

ان چند سطور میں سالنامہ 'نیرنگِ خیال' کی واجبی ستائش کے حق سے عہدہ بر آ ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ معارف اور حقائق کے رنگا رنگ جواہرات کا ایک ڈھیر ہے جس کی چمک دمک نگاہ کو خیرہ کئے دیتی ہے۔ نثر اگر دلکشا ہے تو نظم دلربا۔ اس پر ایک دو نہیں اکٹھی ۲۲ تصویریں، جو صنعت گری کی جان ہیں، سونے پر سہاگہ ہیں اور لُطف یہ کہ باوجود ان تمام محاسن کے سالانہ بدلِ اشتراک صرف چار روپے بارہ آنے۔ آپ خود ہی اسے پڑھیے اور اس کی خُوبیوں کا اندازہ لگا لیجئے ؎

ہے جو شوقِ جلوۂ حسنِ زلیخائے ادب

دیکھیے یوسف حسن سے لے کے 'نیرنگِ خیال'"

جنوری ۱۹۲۸ء

یہ اُس شخص کی رائے ہے جسے لوگ بابائے صحافت کہتے ہیں۔ یہ ادیب ایسے تھے کہ بڑے بڑے ادیب پانی بھرتے تھے۔ شاعر ایسے تھے کہ ہر مصرع پر مرحبا کہنے کو جی چاہتا تھا۔ لیڈر ایسے تھے کہ ساری قوم لبیک کہتی تھی۔ اللہ اللہ کیا شان تھی ان کی، درۂ خیبر سے لے کر راس کماری تک ان کے کارناموں کی دُھوم تھی، ان کے جوش و خروش کی دھوم تھی۔ مگر ہوا کیا آنکھیں بند ہوتے ہی قوم نے انھیں بھی طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ اے دوستو! ذرا سوچو تو، جو شخص ساری عمر آپ کی بہتری کے لیے سرگرداں رہا ہو۔ کیا اُس کا انعام یہی کچھ ہے؟ زوالِ آدمیت کی حد ہوگئی۔

یُوں تو 'نیرنگِ خیال' پر سارے ہی ادیبوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اُن سب کا بیان کہاں تک ہو مگر مَیں آپ سے گزارش کروں گا کہ ایک دو نامور ادیبوں کی رائے ضرور سُن لیں۔ آپ کا کچھ حرج نہیں۔ خدمت گزار کی اشک شوئی ہوجائے گی۔

مولانا وحید الدین سلیم نے فرمایا:

"آپ کا ہر رسالہ اپنے سابقہ رسالے سے بہتر اور برتر نکل رہا ہے اور ہر ایک رسالے میں آپ کسی جدّت کے نمایاں کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ بڑا کام جو آپ نے کیا ہے وُہ یہ ہے کہ آپ نے مضمون نگاروں کا ایک گروہ کھڑا کر دیا ہے جن کی تحریروں میں زندگی اور جذبات کی جھلک ہے۔ میری ابتدا سے یہی رائے تھی کہ نوجوانوں میں مذاقِ ادب پیدا کیا جائے۔ پُرانے مضمون نگاروں سے بھیک مانگنے کا شیوہ ترک کر دینا چاہیے۔ ان میں کام کی قوّت اور زندہ دلی کا جوش فرو ہوگیا ہے۔ الحمدللہ کہ آپ نے میرا منشا پُورا کر دکھایا۔ فنونِ لطیفہ پر جو خاص توجہ آپ نے کی ہے وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ کسی رسالے نے آپ سے پہلے اس میدان میں قدم نہیں اٹھایا تھا۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے فرمایا:

"نئے رسالے نکلتے ہیں اور بھانت بھانت کی جدّتیں کرتے ہیں مگر حکیم یوسف حسن صاحب کو کد ہے کہ ان سے کوئی بازی نہ لے جائے اور سچ یہ ہے کہ ان کا پلّہ ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔

سال بھر اپنے سالنامے کی دُھن میں رہتے ہیں۔ شہد کی مکّھی کی طرح پھُول پھُول سے رس جمع کرتے ہیں اور وقت آنے پر ایسا بھاری بھرکم رسالہ نکالتے ہیں کہ تعریف کرتے ہی بنتی ہے مضمونوں کی پُوچھیے تو یہ گویا ایک فرش ہے جس پر پچی کاری کی گئی ہے۔ الگ الگ کرکے دیکھیے تو کوئی ٹکڑا ڈھنگ سے تراشا گیا ہے اور کوئی ٹیڑھا بنگا، مگر سب کو ملا کر دیکھیے تو آنکھوں کو راحت معلوم ہوتی ہے نیرنگِ خیال کے احسانات اُردو صحافت پر بہت زیادہ ہیں۔ اس کی اشاعت اور مقبولیت ہماری زبان کی ترقی کا باعث ہوگی۔"

ایسا رسالہ جس کی شان میں علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، وحید الدین سلیم اور مولوی عبدالحق ایسے

اکابر بھی مرحبا کہتے ہوں تو اس کے بارے میں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ بہت بڑے سرمائے سے نکلا ہو گا۔ مگر یہ جان کر حیرت ہُوئی کہ یہ رسالہ تو سرمائے کی تہمت سے بالکل ہی بے نیاز نکلا سوائے سینے میں روشنی کی دولت کے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ حقیقتِ حال سُنیئے گا!

"ابتدا میں تو آپ نے خُوب سرمایہ لگایا ہو گا۔"

"بالکل نہیں۔"

"پھر بھی؟"

"ایک پیسہ بھی نہیں۔"

"تو پھر پرچہ نکلا کیسے؟"

"قرض سے۔"

"کے ہزار کے؟"

"صرف چھ سو سے۔"

"صرف چھ سو۔"

"ہاں صرف چھ سو روپے سے، وُہ بھی پرچے کے اجراء کے چوتھے مہینے واپس کر دئیے تھے۔ اُن دنوں میرے پاس اگر کوئی سرمایہ تھا تو وُہ صرف میرا عزم تھا۔"

پھر یہ بھی فرمایا اور مَیں مُنہ کھولے سُنا کیا؛

"مالی اعتبار سے پرچے پر کئی بُرے دَور آئے مگر مَیں نے ہمت نہ ہاری۔ مشکلیں آتی رہیں۔ تدبیریں کام کرتی رہیں۔ جب تدبیر بھی کام نہ آئی تو قدرت نے ساتھ دیا۔"

ایک بار یہ ہُوا کہ ایک سالنامہ چھپا ہُوا بالکل تیار پڑا تھا۔ مگر پریس کے مالک نے پرچہ اٹھوانے سے انکار کر دیا۔ میرا جتنا بھی سرمایہ تھا وُہ تو اس میں لگ چُکا تھا۔ مگر میرے لگے ہُوئے سرمائے سے، خرچ زیادہ آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پریس کے مالک نے کہا؛

"رقم دیجئے جناب!"

"میرا سرمایہ تو اس میں لگ چکا ہے۔ اگر آپ نے تعاون نہ کیا تو میں کسی صورت بھی آپ کی رقم ادا نہ کر سکوں گا۔"

"پھر ہوا کھائیے!"

"ہوا کھا تو لُوں مگر اس سے نہ میرا مسئلہ حل ہو گا نہ آپ کا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔"

فوراً ایک ترکیب سُوجھی "آپ سات ہزار پرچوں کے ایک ایک سَو کے ستر پیکٹ بنا لیں۔ میں ایک ایک پیکٹ

آپ سے نقد رقم ادا کر کے لیتا رہوں گا اور اس طرح سارا پرچہ اُٹھا لوں گا۔"

پریس کا مالک مان گیا۔ میری بھی مشکل آسان ہو گئی اس لیے کہ پرچے کی بے حد مانگ تھی۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ لے گئے۔ یُوں قرض اُتر گیا، میں سُرخرو ہو گیا۔

ایک اور واقعہ سُنو:

"جب 'نیرنگِ خیال' کا طوطی بولتا تھا اُس وقت بھی میں پریشان حال تھا۔ رسالے سے جتنا روپیہ آتا تھا اُس پر مَیں اُس سے زیادہ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اگر مَیں یہ سوچتا کہ اس رسالے سے مجھے کچھ کمانا ہے تو پھر مَیں یہ پرچہ نکال ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر نکال سکتا تو اس شان سے نہ نکال سکتا۔ آج میرے پاس سرمایہ نہیں۔ مگر یہ اطمینان تو ہے کہ مَیں نے ادب کی دُنیا میں آ کر، اپنا وقت ضائع نہیں کیا، بلکہ رسائل کی دُنیا میں قابلِ توجّہ کام کیا ہے۔

معلوم ہُوا کہ کسی سالنامے کے لیے، ان کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اُسے چھاپ سکتے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ لاہور سے نکلوں، ایجنٹوں سے روپیہ وصول کروں اور سالنامہ چھاپوں۔ اس خیال سے دِلّی پہنچے۔ ایجنٹوں سے ملے مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہُوئی۔ یعنی جو کچھ ملا اُس سے ہوٹل کا کرایہ بھی پُورا نہ ہُوا۔"

کہا "ان حالات میں بھی، مَیں مایوس نہ ہُوا۔ انسانوں نے ساتھ نہ دیا تو بزرگوں کے پاس پہنچا۔ پہلے دن نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دی، دُوسرے دن بختیار کاکیؒ کے مزار پر، تیسرے دن خواجہ باقی باللہؒ کے مزار پر، چوتھے دن سیّد حسن رسول نماؒ کے مزار پر، پانچویں دن مولانا جمالیؒ کے مزار پر، جب میں ان بزرگوں کے مزار پر جاتا تو ان سے یہ کہتا:

"آپ میری خدا سے سفارش کریں اور مجھے روپیہ دلوائیں۔"

ان کا بیان ہے کہ جب میں پانچویں دن ہوٹل میں واپس آیا تو ایک تار رکھا تھا جس میں لکھا ہُوا تھا: "آپ آکر اپنا ایک ہزار روپیہ وصول کر لیں۔"

بعض 'روشن خیال حضرات' اس واقعہ کو توہم پرستی سے تعبیر کریں گے۔ مگر میں نے خود یہ دیکھا ہے کہ بعض اوقات علم اور تجربہ دَھرا رہ جاتا ہے اور خدائی کرشمے اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔

انھی کی "توہم پرستی" کی ایک اور بات سنا دُوں؟ جی تو نہیں چاہتا کہ آپ ایسے "عقل والوں" سے ایسی باتیں کروں مگر یُوں ہوتا تو ہے۔

ادبی رسالوں کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ جو چاہو مانگو، ملے گا۔ مگر ایک چیز نہ مانگنا، اور وہ ہے مالی آسودگی! یہی وجہ ہے کہ ہزاروں ہی رسالے، اپنے اپنے خُون میں نہا کر بے چارگی کی گھاٹیوں میں جا سوئے۔ قدرت کے اس فیصلے کے مطابق حکیم صاحب بھی تہی دامن ہی رہے ہمیشہ تہی دامن! چھوٹے موٹے شمارے تو یہ آسانی سے نکال لیتے تھے مگر جب سالنامے کی اشاعت کا موقع آتا تھا تو جمع جتّھا ساتھ نہ دیتا تھا۔

ایک بار یہ ہُوا کہ یہ ہندوستان کا چکّر لگا کے، سالنامے کے لیے مضمون اکٹھے کر چکے تھے۔ سالنامے کی کتابت

ہو چکی تھی، مگر اتنا سرمایہ نہ تھا کہ کاغذ خرید کر پرچہ چھپوا لیتے۔ بہتیری کوششیں کیں، سب ناکام۔ اُدھار مانگا وُہ نہ مِلا۔ عموماً ایسے مواقع پر، دوست بھی مالی اعتبار سے "ننگے" نکلتے ہیں۔

جب اپنی کوششوں کا جائزہ لے کر، اُس کے نتیجے پر سوچا تو ان کے آنسو نکل پڑے۔ انہوں نے کمرہ بند کر کے کُنڈی چڑھالی۔ سجدے میں گر گئے۔ زار و قطار روتے رہے، روتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے: "اے اللہ! میں اپنی ذات کے لیے روپیہ نہیں مانگتا۔ میں اپنے طور پر جو کام کر رہا ہُوں وُہ مخلوقِ خدا کی بھلائی کے لیے ہے۔ پھر کیوں تُو میرا ساتھ نہیں دیتا!"

حکیم صاحب کے بیان کے مطابق، یہ کوئی گھنٹا بھر سجدے میں گرے رہے اور یہی کچھ کہتے رہے، بڑے ہی جذب کے ساتھ!

اتنے میں کسی نے کُنڈی کھٹکھٹائی، انھیں بڑا غصّہ آیا۔ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت کوئی ان کا اور خدا کا رابطہ توڑے۔

جب کُنڈی مسلسل کھٹکتی رہی تو منُہ پونچھ کے غصّے سے اُٹھے "کیا ہے؟"

اُنھوں نے دیکھا کہ دروازے پر گیلانی پریس کے مالک، سفید ریش بزرگ کھڑے تھے اور سڑک پر ان کے ننھے سے گھوڑے والی ننھی سی ٹمٹم کھڑی تھی۔

"آئیے شاہ صاحب!"

"میں یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کو سلام کرتا چلوں۔"

"زہے نصیب!"

"آپ کاغذ کہاں سے خریدتے ہیں؟"

"جہاں سے ملے۔"

"ہم سے لیا کریں۔"

"میں تو کاغذ اُدھار لیتا ہُوں۔"

"ہم بھی ادھار دے دیں گے۔ ہر ماہ کتنا کاغذ درکار ہوتا ہے؟"

"کوئی چار سو روپے کا!"

"بہت اچھا! فی الحال مَیں آپ کو چار ہزار روپے کا کاغذ بھجوا دیتا ہُوں، جب جی چاہے اور جتنی رقم دے سکیں وہ دیتے رہیں۔ ہماری طرف سے کوئی شرط نہ ہوگی۔"

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ "میری زندگی کے یہ دو چار واقعات ایسے ہیں جنھیں میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ مادی دنیا کے لوگ اسے محض اتفاق کہیں گے مگر میں یوں سوچ نہیں سکتا۔ میں اتفاقات کو بھی خدائی وسیلہ سمجھتا ہُوں۔ کسی کو

قدرت خود نواز دیتی ہے کسی کو درخواست کرنا پڑتی ہے۔"

میں نے حکیم صاحب سے کہا: "آپ روپے پیسے کے لیے خواہ مخواہ پریشان رہے۔ وہ دَور تو ایسا تھا کہ ادب کی سرپرستی امراء اور رؤسا کی" ہوبی" تھی آپ نے کیوں نہ فائدہ اٹھایا؟"

کہنے لگے: "یہ وصف مجھ میں نہ تھا۔ میں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہاتھ نہیں پھیلا سکتا تھا بلکہ اکثر یہ ہُوا کہ اپنا حق بھی حاصل نہ کر سکا۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ سر عبدالقادر، ریاست بہاولپور کے چیف جسٹس تھے۔ اُنھوں نے سوچا بہاولپور میں ایک بڑے پیمانے پر مشاعرہ کرایا جائے۔ صدارت کے لیے نواب صاحب راضی ہو گئے۔ نواب صاحب راضی کیوں نہ ہوتے؛ اسکیم سر عبدالقادر کی تھی۔ صاد نواب صاحب نے کیا ہوا تھا۔

مجھے خط لکھ کر سر عبدالقادر نے بہاولپور بُلایا۔ پہلے مقصد بتایا پھر وزیرِ تعلیم سے ملوایا اور اُن سے میرے پہنچنے کی غرض و غایت بیان کی۔

غرض و غایت یہ تھی کہ میں 'نیرنگِ خیال' کا مشاعرہ نمبر نکالوں، جس میں اس مشاعرے کا حال بھی ہو اور امراء و وزراء کا تعارف بھی' اور نواب صاحب کی صلاحیتوں اور فیاضیوں کا ذکر بھی۔

چنانچہ اس غرض کے لیے تین چار بار بہاولپور گیا۔ پہلے مشاعرے کا حال نوٹ کیا۔ پھر امراء و وزراء کے فوٹو اور حالات اکٹھے کیے۔ غرض خوب محنت کی۔"

حکیم صاحب کے بیان کی روانی میں، مَیں نے پُوچھ لیا: "جناب! یہاں مجھے یہ بتاتے چلیں کہ اس مشاعرے میں شرکت کن کن شعراء نے کی تھی؟"

کہنے لگے: "مولانا ظفر علی خاں، دل شاہجہان پوری، سیماب اکبر آبادی، خوشی محمد ناظر، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، شعری بھوپالی، روش صدیقی، شکیل بدایونی اور نہ جانے کون کون! غرض شاعرات نے تھے کہ چار دن تک مشاعرہ چلا تھا۔

شاعروں کی آؤ بھگت بھی بڑی ہُوئی۔ شاہی محل میں خود نواب صاحب نے مدعو کیا۔ کھانا ساتھ بٹھلا کے کھلایا۔ غرض وُہ مشاعرہ یادگار تھا، نہ کبھی ایسا مشاعرہ ہُوا ہوگا اور نہ ہو گا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے بڑی محنت کر کے نیرنگِ خیال کا مشاعرہ نمبر چھاپا تھا۔ جب نمبر چھپ گیا تو مجھے سر عبدالقادر نے پھر بہاولپور بلایا۔ اس وقت وزیرِ تعلیم بھی موجود تھے۔ سر عبدالقادر نے کہا: "حکیم صاحب! آپ نے جو اہلِ بہاولپور کی خدمت کی ہے وُہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ کچھ آپ کی بھی خدمت کریں۔"

میں نے سر عبدالقادر کی باتوں پہ سوچا۔ معاً میرے ضمیر نے آواز دی۔ مانگنا ہے تو خدا سے مانگ۔ چنانچہ

میں نے ان سے گزارش کی: میرے صرف ساڑھے آٹھ سو روپے خرچ ہوئے ہیں۔
"صرف ساڑھے آٹھ سو؟"
"جی ہاں!"
"سوچ لیجئے۔"
"سوچ لیا۔"
چنانچہ مجھے ساڑھے آٹھ سو روپے ادا کر دئے گئے۔ بعد میں سر عبدالقادر نے کہا کہ اس موقع پر، جبکہ نواب صاحب بھی بے حد خوش تھے، آپ کو آٹھ دس ہزار روپیہ مل جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر آپ نے صرف خرچہ مانگا۔ اپنی زحمتوں اور کارگزاریوں کا کچھ نہ مانگا۔"
جواب میں حکیم صاحب نے کہا: "مانگنے کے لیے میں نے جس کا انتخاب کر رکھا ہے وہ نواب صاحب بہاولپور نہیں۔"
جب میں نے حکیم صاحب کی یہ بات سُنی تو وہ خیال بھی آیا کہ حکیم صاحب جو کنڈی لگا کر خدا سے مانگتے ہیں تو وہ غلط نہیں مانگتے۔
انھوں نے نہ کبھی سگریٹ پیا اور نہ شراب، حالانکہ ادیب برادری یہ کبھی مُوٹی پائی گئی ہے کہ سگریٹ پینے سے خیالات کا نزول ہوتا ہے۔ ہوگا! اپن کو تو اس کا تجربہ ہی نہیں۔ لہٰذا ایک اناڑی پولے بھی تو کیا بولے!
پھر بعض شاعر اور ادیب شراب پی کر بہکنے ہی میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ جو اس شغلِ دارو سے رغبت نہیں رکھتے ان پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ انہیں "بچہ پارٹی" کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی ۵۷، ۶۷ برس کے بچے ٹھہرے۔
'نیرنگِ خیال' کے دُوسرے رسائل کے ساتھ بھی بڑے معرکے رہے۔ حکیم صاحب کسی زمانے میں تھے بھی جیوٹ، ہر ادبی معاملے میں اپنی چودھراہٹ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ پھر تھے بھی نیرنگِ خیال ایسے عظیم رسالے کے ایڈیٹر۔ یہ نشہ کچھ کم نشہ نہ تھا۔
ایک چپقلش جو ہمیشہ ہی چلی وہ تھی لکھنؤ اسکول اور دِلّی اسکول کی۔ ایک اسکول کہتا تھا زبان ہے خیالات نہیں، تُف! دُوسرا کہتا تھا خیال ہو تو ہو، زبان کا بیڑا غرق ہو گیا، تھو!
ان دونوں اسکولوں کی آپس میں کبھی نہ بنی۔ مگر جب بھی بنی تو اس بنیاد پر، اہلِ پنجاب کے لتّے لینے کو۔ اِدھر بھی حکیم یُوسف حسن تھے، سو ہنگاموں کے ایک ہنگامہ!
لیجئے رن پڑا۔
یُو پی کے دوستوں نے پنجابیوں کی زبان پر اعتراض کیا۔ اعتراض نہیں اعتراضات!
پنجابی بھی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہنگاموں کا مرکز حکیم یُوسف حسن کا دفتر (بلکہ اڈا) سرخیلوں میں پطرس، تاثیر، سالک اور تاج! اس پارٹی کے ذمّے تھا اعتراضات کا جواب دینا اور نئے شوشے چھوڑنا۔

ان کے مددگاروں میں تھے حفیظ جالندھری، ہری چند، اختر، غلام عباس، بدرِ دین بدر اور حکیم یوسف حسن۔ ان کے ذمّہ تھا ایسا مواد اکٹھا کرنا جو "دشمنوں" کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔

جب یہ لوگ "اس کارِ خیر" میں شرکت کے لیے اکٹھا ہوتے تھے، عموماً آپس میں اس قسم کی گفتگو کرتے تھے:

"پٹ گئے ہم"

"اب دشمن بھی جانے نہ پائے۔"

انھی دنوں رسالہ "نگار" میں ایک سوال چھپا تھا: البانیہ کہاں ہے؛ حدود اربعہ کیا ہے؛ آبادی کتنی ہے؛ سیاسی اعتبار سے اس کی پوزیشن کیا ہے، وغیرہ وغیرہ!

اس سوال کے چھپنے کے دُوسرے مہینے البانیہ پر ایک بڑا لمبا چوڑا مضمون، نیاز فتحپوری کا "نگار" میں چھپا۔ سبھی اس معلوماتی مضمون سے متاثر ہوئے۔ مگر "کھوجیوں" نے سراغ لگایا کہ یہ مضمون تو حرف بحرف ترجمہ ہے امریکن میگزین کے ایک مضمون کا۔ اسی طرح کھوجیوں نے نیاز صاحب کی ایک دو چوریاں اور پکڑیں تو نیاز صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے، وہ اس ترکیب سے کہ اپنا ایک مضمون "نیرنگِ خیال" میں اشاعت کے لیے بھیج دیا اور اس کے ساتھ خلاصہ مضمون کا لکھا:

"یہ مضمون نہیں ہے، خراج عقیدت ہے۔"

اس طرح حامد اللہ افسر نے کسی مضمون کا ترجمہ کر کے اپنے نام سے چھپوا دیا۔ اس کو بھی یاروں نے پکڑ لیا کہ یہ فلاں مضمون کا ترجمہ ہے۔ اس کا جواب اِدھر سے یوں دیا گیا کہ "نیرنگِ خیال" میں ایک ڈراما چھاپا گیا دو قسطوں میں۔ جس میں ڈرامے کے کرداروں کے ذریعے جھوٹ اگلوایا گیا۔ وہ ڈراما کیا تھا؛ چوری پر بڑا کھیلا طنز تھا۔ حامد اللہ افسر کے بعد اُڑتی۔ چنانچہ اس طنز کی تاب نہ لا کر انھوں نے بھی فوراً معذرت چاہی، صلح صفائی ہو گئی۔

جس طرح اِدھر کے چودھری حکیم یوسف حسن تھے؛ اُدھر کے چودھری شاہد احمد دہلوی تھے۔ وہ اپنے پرچے میں پنجاب کے اہل قلم کی زبان درست کرتے اور گراتے تھے۔ اِدھر یہ ان کی چوریاں پکڑ پکڑ کے رسالوی رپٹ لکھواتے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو کہتے تھے "نیاز مندانِ لاہور" دلی کا رسالہ "ساقی" انھیں کہتا تھا ——— شلواران ادب!

واہ وا کیا دن تھے وہ بھی! اور کیا لوگ تھے وہ بھی، اُن میں سے پطرس، تاثیر اور سالک چل بسے۔ دُوسری پارٹی سے نیاز فتحپوری، سیماب اکبر آبادی اور شاہد احمد دہلوی چل بسے، پالی خالی ہو گئی۔ اب بُوڑھے خلیفہ کے رُوپ میں، حکیم صاحب زندہ ہیں، خدا انھیں سلامت رکھے۔

وہ جو میں نے ابھی کہا کہ انھیں چودھری بننے کا شوق ہے تو وہ غلط نہ تھا۔ اس شوق میں یہ نہ اپنوں کو بخشتے تھے نہ پرایوں کو، جس نے سر اٹھایا نہیں اُسے نیچا دکھایا نہیں۔

یہ کسی بات پر پطرس سے ناراض ہوئے تو ان کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ براہِ راست نام لے کر تو نہ کوسا،

مگر یہ لکھا: ریڈیو والے بڑا غلط کام کر رہے ہیں (اُن دنوں پطرس ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے) پروگرام بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ریڈیو کے ناخداؤں سے باز پرس کی جائے۔

پطرس ان کیسی تیسیوں میں سے تھے۔ وہ حکیم صاحب کے ہتھکنڈوں سے واقف تھے۔ انھوں نے انھیں فوراً خط لکھا: "میں سارے جہان کا مقابلہ کر سکتا ہوں مگر "نیرنگ خیال" کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ اس پرچے سے مطلق نہ ہو گے۔ انا بڑی بلا ہے۔ دوبارہ لکھا۔ لہجہ پہلے سے بھی زیادہ تند و تیز اختیار کیا۔ اس کے جواب میں پطرس نے پھر لکھا: "اگر آپ نے میری مخالفت بندنہ کی تو میں مرجاؤں گا۔"

اگر آپ پطرس کے مزاج سے واقف ہیں، ان کے پندار سے آگاہ ہیں تو پھر پطرس کا یہ فقرہ حکیم صاحب کے اشاروں اور دبدبے کو ظاہر کرنے کے لیے، ایک بہت بڑا سرٹیفکیٹ ہے۔ اس لیے کہ پطرس اپنے وقت کے خدا تھے۔

یہ واقعہ بھی معلوم ہو گا کہ،

مولانا چراغ حسن حسرت، دل محمد روڈ پر رہتے تھے۔ حکیم صاحب کا دفتر فلیمنگ روڈ پر تھا، بالکل قریب قریب۔ حسرت صاحب اُن دنوں ہفت روزہ "شیرازہ" نکالتے تھے۔ مولانا بلاشبہ بڑے پائے کے ادیب تھے۔ ادب میں بڑا اونچا مقام تھا مگر اُن میں ایک بڑی خرابی تھی کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ حقائق سے آنکھیں چرایا کرتے تھے۔ ہر ایک کا تمسخر اڑایا کرتے تھے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکالا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن انھوں نے اپنا ذہنی رنگ ان پر بھی جمانا چاہا۔ یہ بھی ذہن پر غلاف چڑھائے ہوئے نہ تھے۔ تک چڑھے تھے، خاموش کیسے رہتے۔

حسرت صاحب نے فرمایا:

"مولانا اپنے پرچے کو بہتر بنایئے، رسالے کو ترقی دیجئے، کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں!"

یہ سُن کر حکیم صاحب آگ بگولا ہو گئے۔ انھوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دے ڈالا: "حضرت! پہلے اپنے گھر کی تو خبر لیجئے، محاوروں کے بنڈل اب نہیں چلتے۔ نیوز ایجنٹوں کے ہاں سے پرچہ سیدھا ردی کے بیوپاریوں کے ہاں پہنچ رہا ہے۔"

حکیم صاحب میں باوجود بڑھاپے کے حد درجہ شگفتگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر محفل میں فٹ نظر آتے ہیں۔ بڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان، بچوں میں بچے!

۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک صاحب آئے۔ اصل میں وہ "نیرنگ خیال" میں کام کرنا چاہتے تھے۔ تھے گنی، سیدھی طرح بات کرنے کی بجائے، گھما پھرا کر بات کرنی چاہتے تھے۔ یہ فوراً تاڑ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ صاحب گویا ہوتے ہیں:

"حکیم صاحب، پرچے کو اٹھایئے۔"

"بہت اچھا!"

"صرف اچھا کہہ دینے سے بات نہ بنے گی، جب تک ——"

"محنت کرتا ہوں، روپیہ خرچ کرتا ہوں اور کیا کروں؟"

"نہیں صاحب! کچھ کیجئے۔"

"جو کچھ میرے بس میں ہے وُہ تو کر ہی رہا ہوں۔"

"بہرحال کسی طرح پرچے کو اُٹھائیے۔"

"بہت اچھا، دو آدمی اور لے آئیے تاکہ اُسے اُٹھایا جائے۔"

یہ سُننا تھا کہ وُہ صاحب ایسے بھاگے، جیسے شکاری سے شکار!

باتوں باتوں میں مولانا اظہر دہلوی کا ذکر آیا۔ حکیم صاحب نے کہا: اظہر صاحب بھی عجیب آدمی تھے۔ تھے تو قابل، مگر جتنے قابل تھے باتیں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر کرتے تھے جھک جھک، جھک جھک!

ایک بار اُنھوں نے اپنے پرچے "تحریک" میں 'نیرنگِ خیال' کی چند منظومات پر تبصرہ کر ڈالا۔ تبصرہ کچھ اس قسم کا تھا کہ فلاں نظم اور غزل میں یہ غلطی ہے اور فلاں نظم اور غزل میں یہ، غرض اُنھوں نے اچھا خاصا تماشا بنایا۔

اُن دنوں 'نیرنگِ خیال' کا دفتر 'مستی گیٹ' میں تھا۔ نیچے دفتر تھا اور اس کے اُوپر بیٹھک۔ میں بیٹھک میں بیٹھا ہُوا تھا کہ مجھے بازار میں جاتے ہوئے اظہر صاحب نظر پڑ گئے۔ میں نیچے اُترا۔ سلام علیک کہا۔ ساتھ چل دیا۔ پہلے تو میں نے خیر خیریت پُوچھی، پھر احوال۔ چلتے چلتے میرا لہجہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ مولانا بھانپ گئے۔ وہ کنی کترانا چاہتے تھے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ غرض وُہ میری شکایتوں کی آنچ سے بچنا چاہتے تھے۔

جب ہم مستی دروازے سے چل کر چوک سُرجن سنگھ تک آئے تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ مولانا بھاگ کھڑے ہوئے مگر میں نے ان کے بھاگنے کی ابتدا ہی میں یہ فقرہ جڑ دیا:

"آیندہ ایسی حرکت کی تو گردن سے پکڑ کر نالی میں گھسیٹ دُوں گا۔"

میں نے کہا: "حکیم صاحب! یہ تو آپ نے بڑی زیادتی کی۔"

کہنے لگے: زیادتی والی بات ٹھیک ہے مگر مولانا بلا وجہ جھک جھک کیا کرتے تھے۔ خواہ مخواہ غصہ آتا تھا۔ سبھی کو جاہل سمجھتے تھے۔ یہی تھی ان کا روزمرہ تھا۔ چونکہ مولانا نے شاعری کالج کھولا ہُوا تھا جہاں شاعر بنائے جاتے تھے، اور شاعری بِکتی تھی۔ نرخ تھا تین روپے غزل، چار روپے غزل۔ مولانا کو چونکہ اپنا رعب گانٹھنا ہوتا تھا اس لیے سب کی غلطیاں نکالا کرتے تھے۔ جیسے سب عقل کو دفن کر کے بیٹھے ہوں اور ایک یہی علامۂ دہر ہوں۔

لو، ایک قصہ اور سُنو، پھر تم کچھ فیصلہ کر سکو گے۔

اسی طرح یہ مولانا ظفر علی خاں کے دفتر پہنچ گئے۔ علمی باتیں شروع ہُوئیں مگر نوبت تُو تکار تک پہنچ گئی۔ اظہر صاحب ایک دم گرم ہو جانے کے مرض میں مبتلا تھے۔ پہل خود کرتے تھے۔ مخاطب کو غصہ آ ہی جایا کرتا تھا۔

غرض انظر صاحب کی مولانا ظفر علی خاں سے بات اس حد تک بڑھی کہ ظفر علی خاں نے مولانا اظہر کے ایک تھپڑ جڑ دیا۔

انظر صاحب وہاں سے یہ کہتے ہوئے اُٹھے :

"اب ملاقات تھانے میں ہوگی۔"

مولانا اظہر چلے گئے تو ظفر علی خاں کو خیال آیا کہ کہیں واقعی مولانا اظہر تھانے نہ پہنچ جائیں، واقعی غصہ مسئلہ بن جائے۔

وہ زمانہ خلافت کا تھا۔ ظفر علی خاں کے پاس بے شمار والنٹیر تھے۔ انہوں نے دس بارہ والنٹیروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ فلاں جگہ مولانا اظہر دہلوی کا مکان ہے وہاں جاؤ اور ان کے مکان کا محاصرہ کرو تاکہ مولانا گھر سے نکلنے نہ پائیں۔ چنانچہ والنٹیروں نے انظر صاحب کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ کوئی چھ سات دن تک یہ قصہ چلا۔

ایک دن مولانا ظفر علی خاں نے دیکھا کہ والنٹیر واپس چلے آ رہے ہیں۔ مولانا نے وجہ پوچھی تو اُنھوں نے مولانا اظہر دہلوی کی تحریر دکھائی جس میں لکھا تھا :

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تھانے نہ جاؤں گا۔"

ایک دن حکیم صاحب تشریف لائے۔ میں دفتر میں موجود نہ تھا۔ مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ دُوسرے دن ملاقات ہُوئی تو پُوچھا :

"کل کہاں تھے ؟"

میں نے عرض کیا: "پڑوسیوں کا جھگڑا تھا، اُنھوں نے میری گواہی لکھوا دی تھی، اس لیے عدالت میں گواہی کے لیے گیا ہُوا تھا۔"

کہنے لگے : "میں نے بھی زندگی میں ایک دو گواہیاں دی تھیں جو دلچسپ تھیں۔"

پھر گویا ہُوئے : "میں ریلوے میں ملازم تھا، میرے پاس دو سکھ آتے، ایک کا نام گہنا تھا، دُوسرے کا نام لہنا۔ انہوں نے کہا، کل کے لیے ٹکٹ بُک کرا لیجیے، ہم موشی لے کر آئیں گے۔"

میں نے کہا : "بانک لانا، ٹکٹیں مل جائیں گی۔"

مگر دُوسرے دن ان میں سے کوئی نہ آیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ پندرہ بیس روز کے بعد لہنا آیا۔ میں نے کہا : "گہنا کہاں ہے ؟" اور یہ بھی پُوچھا کہ "تم لوگ پھر آئے ہی نہیں !"

لہنا نے کہا : "بابُوجی ! یاری کی چوری بن گئی۔"

"سمجھ میں نہیں آیا کہ تم کیا کہہ رہے ہو ؟"

لہنا نے بتایا کہ "دوسرے دن" پروگرام کے مطابق ہم ضرور حاضر ہوتے، مال بھی بُک کراتے۔ مگر ہوا یہ کہ گہنا پر چوری کا الزام لگا دیا گیا اور وُہ پکڑا گیا۔ قصہ یہ تھا کہ گہنا پر ایک لڑکی عاشق تھی۔ اُن لوگوں کی اور تو کوئی پیش نہ گئی،

اُنھوں نے گھنا کو چوری کے الزام میں گرفتار کرادیا۔ یُوں ہم لوگ نہ آسکے۔ معاملہ کچُھ، بہانہ کچُھ!
اب آپ سے عرض ہے کہ آپ ہماری گواہی دیں کہ ہم نے فلاں تاریخ کو مال کی بکنگ کرائی تھی۔ مگر ہم لوگ وقت پر حاضر نہیں ہُوتے تھے۔

"گواہی سچی تھی" میں نے ہامی بھرلی
عدالت میں پہنچا تو دیکھا کہ کو سکھوں سے بھرا ہُوا ہے۔ وہ ٹولیاں الگ الگ بیٹھی ہیں اُن کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ میں نے ماحول دیکھا تو بے حد گھبرایا۔ مگر اس وقت سوائے حوصلے سے کام لینے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

میرا نام پُکارا گیا۔ جو واقعہ تھا، میں نے عرض کردیا۔ مخالف وکیل نے جرح کی "آپ گھنا اور لہنا کو پہلے سے جانتے تھے؟"
"نہیں!"
"پھر آپ کو ان کے نام کس طرح یاد رہ گئے ہیں؟"
"ان کے نام ہی ایسے تھے گھنا اور لہنا۔ جو شخص ان کے ناموں کو ایک بار سُن لے گا، وہ عمر بھر بھُول نہیں سکتا۔"
"اچھا تو پھر اُنھوں نے مال بُک کرانے کے لیے آپ سے کہا؟"
"جی ہاں!"
"آپ کے پاس رجسٹر تو ہوگا جس میں آرڈر بُک کرتے ہیں؟"
"جی ہاں، رجسٹر ہوتا ہے مگر ہم رجسٹر کا استعمال اُس وقت کرتے ہیں جب بے حد رش ہوتا ہے۔ جن دنوں یہ دونوں آئے تھے اُن دنوں کوئی رش نہ تھا۔ جو کوئی بھی مال لے کر آتا تھا بُک ہو جاتا تھا۔"
حکیم صاحب نے کہا "مخالف وکیل نے مجھے پٹڑی سے اتارنے کی بڑی کوشش کی مگر میں کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے مخالف وکیل کی ایک نہ چلنے دی۔"
اس کے بعد کہنے لگے "ایک اور گواہی بھی دی تھی جو بے حد دلچسپ تھی، مگر میں وہ آپ کو پھر کبھی سُناؤں گا۔ اس وقت تھک گیا ہُوں۔ ہائے ہائے مر گئے۔ حد ہوگئی گرمی کی بھی۔ معلوم ہوتا ہے جہنم کے پٹ کھُل گئے ہیں۔"
میں نے سوچا یہ بات اب رہ گئی تو پھر ذہن سے اُتر جائے گی۔ بڑی محبت سے پُوچھا "حکیم صاحب! چائے پیجیے گا یا کوئی ٹھنڈی چیز؟"
"اس وقت کچھ نہیں، میری جان چھوڑو۔"
"آپ کی جان چھوڑ دوں گا مگر یہ تو بتا دیجیے کہ کیا پئیں گے؟"

"اچھا تو پھر چائے منگواؤ، لوہے کو لوہا کاٹے۔"
چائے آگئی، چسکی لی تو میں نے کہا "حکیم صاحب! معلوم نہیں کل تک ہم زندہ بھی رہیں گے یا نہیں۔ اس لیے دلچسپ گواہی والی بات آج ہی بتا دیجئے۔"
"بڑے بد معاش ہو۔"
"جی ہاں!"
"سنو، پنڈت ٹھاکر دت لاہور کا ایک مشہور حکیم تھا۔ اکثر دواؤں کے اشتہار دیا کرتا تھا۔ قوت مردمی کی دواؤں پر اس کے سارے کاروبار کا انحصار تھا۔ اس نے ایک اشتہار چھاپا حکومت نے اُسے فحش قرار دے کر مقدمہ چلا دیا۔
وہ اشتہار کچھ ایسا تھا:
"دو گھنٹے قبل ..... حسب خواہش ...... ہوتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔
یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ یہ اشتہار فحش نہیں ہے، پانچ بڑے نامور حکیم گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر تھے۔ اُن میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی، شفاء الملک محمد حسن قرشی، حکیم ظفریاب، ڈاکٹر مرزا امام الدین اور پانچواں یہ خاکسار!
اشتہار فحاشی کی ذیل میں آتا تھا مگر ہمارے وکیل نے سبھی گواہوں سے یہ کہا تھا کہ گواہی میں یہ کہنا ہے کہ پنڈت ٹھاکر دت کی مشہور دوا "حبِ نشاط" مردانہ کمزوریوں کا شافی علاج ہے۔ اس کے استعمال سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچا ہے، اس لیے پبلک کی بہبود کے لیے اشتہار دیا گیا۔ جہاں فحش لفظ لکھنے کا امکان ہو سکتا تھا وہاں حکیم صاحب نے ڈیش لگا دیئے ہیں تاکہ اعتراض کا محل نہ رہے" وغیرہ وغیرہ!
حکیم صاحب نے کہا "اتفاق کی بات کہ سب سے پہلے مجھے گواہی کے لیے طلب کیا گیا۔"
"آپ کے سامنے جو اشتہار ہے، کیا یہ فحش نہیں ہے؟" سرکاری وکیل نے کہا
معاً مجھے احساس ہُوا کہ جو باتیں ہمارے وکیل نے بتائی ہیں اگر میں نے وہ کہہ دیں تو پنڈت جی قانون کی زد سے بچ نہ سکیں گے، لہٰذا میں نے کچھ سوچ کر کہا،
"اس میں ایک لفظ بھی فحش نہیں۔"
"دو گھنٹے قبل کس طرف اشارہ ہے؟"
"حبِ نشاط دوا کی طرف۔"
"حسب خواہش سے کیا مطلب ہے؟"
"فائدہ سے۔"

"جو تاویل آپ کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب وہ بالکل نہیں، بلکہ اشتہار بالکل واضح ہے اور فحش ہے۔" (پھر ذرا رک کر) "بھلا یہ اشتہار خصوصی طور پر کس مقصد کے لیے ہے؟"

"جو دوا مردانہ بیماریوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ عموماً دیگر امراض کے لیے بھی مفید ہوتی ہے۔ مثلاً دل، دماغ، معدہ، جگر وغیرہ کے لیے۔ اور ان سارے ہی امراض کے نام اس اشتہار میں موجود ہیں (اور پھر زور دے کر) جب سارے نام اشتہار میں درج ہیں تو میں حیران ہوں کہ ہمارے مخالف وکیل ایک دو امراض کے ناموں سے آگے کیوں نہیں بڑھتے؟ کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"میں کیوں بڑھوں جب کہ بات واضح ہے!"

"بے ادبی معاف، آپ نے اپنے ذہن میں اپنے مطلب کی بات کو جگہ دے رکھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے سوچنے کا رُخ غلط ہے جو قطعی صحت مندانہ نہیں۔"

جب حکیم صاحب یہ سب کچھ بیان کر چکے تو انھوں نے آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا "میں نے وہ بیان اس انداز سے دیا تھا کہ جج بھی متاثر ہوا، مخالف وکیل بھی گھبرایا۔ میرے بیان کے بعد جب مخالف وکیل نے کہا: "اور گواہ پیش کیجیے۔" تو ہمارا وکیل میرے بیان سے اتنا مطمئن ہو گیا تھا کہ اُس نے کہہ دیا تھا" ہم کوئی اور گواہ پیش نہ کریں گے ہماری یہی ایک گواہی کافی ہے۔"

نتیجہ یہ نکلا کہ پنڈت ٹھاکر دت مقدمہ جیت گیا۔

یہ واقعہ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے کچھ سُبک ضرور ہے۔ جی بھی یہ چاہتا تھا کہ اسے گول کر جاؤں۔ اگر یُوں کرتا تو ممکن ہے میری قلمی شرافت پر حرف نہ آتا، مگر یہ ضرور ہوتا کہ میں حکیم صاحب کی شخصیت کے ایک رُخ کو واضح نہ کر سکتا۔ مجبوریاں بھی بعض اوقات اُنگلیاں اُٹھوا دیتی ہیں۔

حکیم صاحب ایک نامور رسالے کے ایڈیٹر ہی نہیں، نامور حکیم بھی ہیں۔ انھیں دُکان داری نہیں آتی اس لیے مطب میں بھیڑ نہ لگا سکے۔ دیانت داری سے علاج کرتے ہیں۔ نہ کھال اُدھیڑنے کی کوشش کرتے ہیں نہ مریضوں کو لٹکانے کی۔ غریبوں سے حتیّ المقدور رعایت کرتے ہیں۔ امیروں سے "ٹکا"[1] کے پیسے لیتے ہیں مگر کھال پھر بھی سلامت رہنے دیتے ہیں۔

میں ان کی حکیمانہ سُوجھ بُوجھ کا بڑا قائل ہُوں۔ اگر میں اُن سے پُوچھوں گا کہ آپ نے کون کون سے معرکے کے علاج کیے تو ایران توران کی بہت سُنائیں گے۔ مگر میں ایران توران کی سُنوں کیوں؟ اپنے چشم دید حالات کیوں نہ کہوں!

ایک دن ہمارے رسالے کے خوشنویس، دانتوں کے درد سے بے حال بیٹھے تھے۔ درد اتنا شدید تھا کہ

---

[1] یہ لفظ پنجابی کا ہے اردو میں مجھے اس سے بہتر لفظ نہیں ملا۔

انھوں نے ٹھوڑی کے نیچے سے لے جاکر، سر پہ کس کے رومال باندھا ہوا تھا۔ اس پر بھی ہائے وائے کر رہے تھے۔ اتنے میں حکیم صاحب آگئے، پوچھا "کیا تکلیف ہے؟"

"دانتوں میں بے انتہا درد ہے بُری طرح ہل رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے، سارے دانت نکلوا دو۔"

"ایسا ظلم نہ کرنا، یہ ایک پڑیا کھالو، درد غائب ہو جائے گا، ہلنے والے دانت ہتھوڑی سے ہلاؤ گے تو نہیں ہلیں گے۔"

چنانچہ صاحب! ایسا ہی ہوا۔ چند گھنٹوں میں درد غائب، دانت بھی پختہ!

ان کے اس نوع کے ایک ہزار قصّے سناتے جا سکتے ہیں مگر ہمیں ان کے اس رُخ کو زیادہ اُجاگر نہیں کرنا ہے تاکہ یہ سوال نہ اُٹھے کہ یہ حکیم زیادہ بڑے ہیں یا مدیر!

حکیم صاحب پنڈی سے لاہور پہنچے، ہمارے دفتر تشریف لائے۔ میں موجود نہ تھا۔ پوچھا تو انھیں معلوم ہوا کہ کل سے طبیعت خراب ہے۔ اس لیے آج دفتر نہیں آئے۔ چنانچہ حکیم صاحب گھر پہنچے۔

جب حکیم صاحب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو ایک صاحبہ سیڑھیاں اُتر رہی تھیں۔ میرے پاس پہنچے تو پوچھا: "کیا تکلیف ہے؟"

"دل گھبراتا ہے۔"

"یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔"

میں نے پریشان ہو کر پوچھا: "کیوں؟"

"جب ایسی ایسی لڑکیوں سے تمھارا مِلنا جُلنا رہے گا تو دل ٹھیک رہ ہی نہیں سکتا۔"

"حکیم صاحب! وہ تو میری ——"

"میں خُوب سمجھتا ہُوں۔"

سفر میں ایک دُوسرے کی اچھائیوں اور بُرائیوں کا حال خُوب کھلتا ہے۔ ایک بار اور دوستوں کے ساتھ حکیم صاحب بھی میرے ہمسفر تھے یا یہ کہ میں ان کا ہمسفر تھا اور ہمارے پاؤں کے نیچے زمین تھی مشرقی پاکستان کی! سفر میں، حکیم صاحب اتنے اچھے ساتھی ثابت ہُوئے کہ لُطف آگیا۔ جب ساتھیوں میں سے کوئی منہ بسور کے الگ پڑا ہوتا تو حکیم صاحب اپنے تجربات و مشاہدات کے ایسے ایسے واقعات سنانے شروع کر دیتے کہ لطف آجاتا۔ وقتی بدمزگی کے سارے آثار اُڑن چھو ہو جاتے۔ سب قریب قریب ہو کر بیٹھ جاتے۔

اس سفر ہی کے دوران ہمیں یہ بھی معلوم ہُوا کہ حکیم صاحب اپنے زمانے میں قیامت تھے۔ جوانی کی کھٹک سے لے کر جوانی کی لٹک تک دَرّانہ چلے۔ عورت کی نفسیات اور اس سے لُطف اندوز ہونے کے ایسے راز اور ایسے واقعات سنائے کہ مولانا رازق الخیری ایسے ادھیڑ بھی جوان ہو اُٹھے ویسے بھرم رکھنے کو مولانا ساتھ ساتھ لاحول ولا قوۃ بھی پڑھتے

جاتے تھے۔ مگر واقعاتِ گرم سُن رہے تھے پوری دلچسپی کے ساتھ، بلکہ ایک حد تک خشوع و خضوع کے ساتھ! سر ہلا ہلا کر اور ہر "ٹیپ کے مصرع" پر لاحول ولاقوۃ!

بے تکلف دوستوں اور بے تکلف سہیلیوں کی محفلیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں، خدا ان سے "نہ" بچائے کیونکہ یہ بناوٹ کے پردے چاک کر دیتی ہیں اور نتھرے ستھرے آدمی کو سامنے لے آتی ہیں۔

پھر گناہ، سارے گناہ نہیں ہوتے۔ کچھ معصوم گناہ بھی ہوتے ہیں جن پر قدرت کو بھی پیار آسکتا ہے اور پھر تھکی ہوئی زندگی میں بجھی ہوئی دھنک کی کروٹ جُرم ہے تو کیوں؟ یہ مَیں کس سے پُوچھوں؟

مولانا رازق الخیری کی طرح، مجھے بھی یہاں لاحول ولاقوۃ پڑھ لینا چاہیے۔ اس کے بعد کہنا چاہیے جوانی سب کی دیوانی ہوتی ہے۔ مگر ان کی جوانی کچھ زیادہ ہی دیوانی تھی۔ یہ بڑے کھرے آدمی ہیں۔ تقدس کا لبادہ اوڑھ کے انہیں بزرگ بننا نہیں آتا، بلکہ صاف گوئی اور بے باکی ان کی کمزوریاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قریبی دوستوں کو، ان کا کچا چٹھا بھی معلوم ہے مگر میں کیا کروں؟ کیسے وُہ باتیں لکھوں؟ جنہیں اصولاً مجھے لکھنا نہیں چاہیے۔ اگر لکھنا نہیں چاہیے تو نظر انداز بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بعض نستعلیق قسم کے بزرگ مُجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ میں زندگی کے اس باب کو گول ہی کر جایا کروں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا اس لیے کہ شخصیت نگاری میرے نزدیک اُس مکمل چہرے کی مانند ہے جس کے کان، ناک، منہ اور آنکھیں ہوتی ہیں۔ اگر میں کسی شخصیت کا کوئی پہلو چُھپاتا ہُوں تو میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس شخصیت کی ناک کاٹ ڈالی یا اس کے کان کاٹ ڈالے۔

میں یہاں سچ کی زد میں آگیا ہُوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ مَیں اب یہاں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟

سوچتے سوچتے ذہن ابوالکلام کے تذکرے کی طرف جا نکلا۔ دیکھئے مولانا نے اپنی جوانی کے بارے میں کیا خوب لکھا:

"ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زُہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اس رندی و ہوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کو عین اکیس بائیس کی عمر میں (کہ جنونِ شباب کی سر مستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑتا گیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی۔ لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے، کتنی ہی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں۔ ولولوں، امنگوں، اُمیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے۔ جب کہیں جا کر اس کُوچے میں دم لے سکے، جہاں آج اپنے آپ کو پا رہے ہیں۔

ہزاروں دام سے نکلا ہُوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے"

حکیم صاحب ابوالکلام نہیں ہیں۔ نہ ہی میرے قلم میں اتنا گوتا ہے کہ میں تلمیحات اور استعاروں میں واقعات کو

ڈبو سکوں۔ اسں لیے سوئی ہوتی راتوں کو کون جگاتے ؟

مَیں لکھنے کو تو یہاں سب کچھ لکھ دُوں۔ مگر ڈر ہے تو یہ کہ یہ ذکرِ جمیل طول بہت کھینچے گا۔ کم ازکم بھی سو پچاس صفحات۔ ممکن ہے کہ آپ اس کے لیے بھی تیار ہو جائیں مگر اس کے لیے تیار نہیں۔ کھنکتی باتیں، صاحب تذکرہ ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ "اہلِ حیا" کے لیے واجب ہے کہ وہ اس ضمن میں، اگر اشاروں سے کام چلا سکیں تو دریغ نہ کریں۔ اس لیے یہاں مَیں بھی صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ ابوالکلام کی جوانی کو، حکیم صاحب کی جوانی کا دیباچہ سمجھیں۔ 'نیرنگِ خیال' نے کتنے ادیب بنا ڈالے۔ اس میدان میں بھی ان کا کوئی حریف نہیں۔ یہاں صرف ایک مثال دوں گا' صرف ایک مثال!

غلام عباس جو اُردو کے بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ آٹھویں جماعت پاس کرکے، 'نیرنگِ خیال' کے دفتر میں آنے جانے لگے تھے۔ حکیم صاحب نے دیکھا کہ لڑکا محنتی ہے اس لیے اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ لہٰذا ہم غلام عباس کی تحریروں کی تراش خراش میں لگ گئے۔ چینک کوئی بھی ہو، خراج ضرور وصول کرتی ہے!

اُن دنوں ادب پاروں کا رواج تھا۔ سبھی انگریزی کے اچھے اچھے ادب پاروں کو اُردو میں منتقل کرنے کو ہی بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔

بقول حکیم صاحب، غلام عباس اس وقت انگریزی میں معمولی شُد بُد رکھتے تھے۔ بعد میں چھوٹے موٹے امتحان ویسے ہوں تو دیے ہوں مگر اُن دنوں آٹھویں جماعت ہی کے طالب علم تھے۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اُن دنوں میں نے جب بھی انھیں کسی ادب پارے کے ترجمے کے لیے کہا تو انھوں نے ڈکشنری سامنے رکھ لی۔ پہلے تمام مشکل الفاظ کے معنی لکھ لیے۔ پھر ایک ایک جملے کے ترجمے کی کوشش کی۔ اس طرح ایک ایک جملے کو کئی کئی طرح سے لکھا، یُوں وُہ ایک چھوٹے سے ادب پارے کو ہفتوں میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس کے بعد وُہ ہم میں سے کسی کو دکھاتے تھے۔ اس پر اصلاح ہوتی تھی تب وہ کہیں جاکر چھپتا تھا۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ ہم لوگ اتنی ریاضت ایک ادیب کو بنانے اور سنوارنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ جب یہ واقعہ حکیم صاحب بیان کر چکے تو ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے تان یہاں پہ توڑی "آج اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ غلام عباس کو صدرِ مملکت نے اپنی کتاب کے ترجمے کے لیے چُنا۔ حالانکہ اس ملک میں، ایک سے ایک پڑھا لکھا پڑا ہے۔ پی ایچ ڈی پڑے ہیں۔"

تھوڑی دیر رُک کر حکیم صاحب پھر گویا ہوئے: "میں صرف زبانی حوصلہ افزائی نہیں کیا کرتا تھا بلکہ روپے پیسے سے بھی دل بڑھایا کرتا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے بیس روپے غلام عباس کی والدہ کو جاکر دیے تھے اور یہ کہا تھا کہ یہ غلام عباس کے ایک مضمون کا انعام ہے۔ اس وقت میرے ساتھ تاثیر مرحوم بھی تھے۔"

یہ جوہر شناس تو تھے، انھوں نے جب عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں میں نُدرت دیکھی۔ فن پایا تو انھوں نے سوچا، چغتائی صاحب کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ تشہیر کرنی چاہیئے تاکہ وہ آئندہ کار ہائے نمایاں انجام دے سکیں۔ چنانچہ انھوں نے چغتائی صاحب کی نہ صرف تصویریں چھاپیں بلکہ ان کے فن پر مضامین بھی چھاپے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب چغتائی صاحب کے فن کی زیادہ دھوم نہ تھی بلکہ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو ان کی تصویروں کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے یہ تصویریں کیا ہیں! کچھ بھی نہیں!

جب "نیرنگ خیال" میں مسلسل مضمون نکلنے لگے۔ تصویریں چھپنے لگیں تو اس وقت کے ایک رسالہ "الکمال" کے ایڈیٹر نازش رضوی نے چغتائی صاحب کی تصویروں کے خلاف، اپنے پرچے میں مضمون چھاپا۔ جس میں یہ لکھا کہ چغتائی کو مصور کون کہتا ہے، تصویر کی تعریف یہ ہے کہ انسان اُسے دیکھ کر مبہوت ہو جاتے۔ چغتائی کی تصویریں صرف بچوں کو ڈرانے کے کام آسکتی ہیں۔ آنکھیں ایسی جیسے بٹن، انگلیاں ایسی جیسے بھنڈیاں، چہرہ ایسا جیسے طباق!

جب "الکمال" میں ایسا مضمون نکلا تو حکیم صاحب کو فکر ہوئی۔ اُنھوں نے سوچا کر بجائے اس کے کہ "الکمال" کے مضمون کا جواب لکھا جائے، بہتر یہ ہے کہ مضمون نگار سے ملا جائے۔

نازش صاحب نے مجھے بتایا، حکیم صاحب مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے آئے، فرمایا،

"یہ آپ نے چغتائی کے خلاف کیا لکھ دیا؟"

"جو محسوس کیا وہ لکھا۔"

"آپ جس انداز کی مصوری کے دلدادہ ہیں وہ مصوری نہیں فوٹو گرافی ہے۔"

"میں تو مصوری کے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ مصوری ایک ایسی شراب ہے، جو آنکھوں کے رستے پی جاتی ہے۔"

"جس طرح شاعر، نئے انداز فکر کو اپناتا ہے کہ اس کی انفرادیت ظاہر ہو اسی طرح اس مصور نے اپنی تصویروں میں لکیر کا فقیر بننے کی بجائے اپنا الگ راستہ تلاش کیا ہے۔"

"نیا پن وہی بھلا جو ناگوارِ خاطر نہ ہو۔"

"مجھے بڑی حیرت ہے کہ آپ کو ان تصویروں میں کوئی حسن نظر نہیں آتا۔"

"جی ہاں میرا یہی خیال ہے۔"

نازش صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد حکیم صاحب چلے گئے۔ دو تین مہینوں کے بعد پھر ملے تو کہنے لگے،

"نازش صاحب! مجھے ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے، کیا آپ ہمارے ہاں آسکیں گے؟"

"میں تو ایک جگہ کام کر رہا ہُوں۔"

"وہاں سے چھوڑ دیجئے مَیں آپ کو دس روپے زیادہ دُوں گا۔"

چنانچہ میں نے وہاں سے کام چھوڑ دیا "نیرنگِ خیال" میں آگیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ نیرنگِ خیال میں جاؤں گا تو ادبی ذوق کو تسکین ملے گی، میرے مضمون چھپیں گے۔ مگر مجھے حکیم صاحب نے کبھی بھی کسی چیز کے دینے کے لیے نہ کہا۔ میں حیران تھا۔

ایک دن پُوچھ ہی لیا:

"جناب! میں بھی مضمون لکھ سکتا ہُوں، ایک سال ہوگیا ہے آپ نے مجھ سے سوائے پروف ریڈنگ کے کبھی کچھ کہا ہی نہیں، آخر کیوں؟"

"ہمیں ضرورت نہیں۔"

"پھر مجھے بلایا کیوں تھا؟"

"صرف اس لیے کہ تم چغتائی کے خلاف نہ لکھ سکو۔"

نازش صاحب کہتے ہیں:

"اُس وقت تو مجھے بڑا غصہ آیا، پی گیا، خاموش رہا۔ آج جب مجھے وہ بات یاد آتی ہے تو حکیم صاحب پر بڑا پیار آتا ہے، صرف اس بات کی خاطر کہ میں چغتائی صاحب کے بارے میں کچھ نہ لکھوں۔ اُنھوں نے مجھے اپنے ہاں نوکر رکھ لیا تھا۔"

واقعی کسی فن کار کے ساتھ اس حد تک مخلص ہونا حکیم صاحب ہی کا حصہ ہے۔ بے شک چغتائی اپنی صلاحیتوں ہی سے آگے بڑھے۔ اگر چغتائی کے فن میں جان نہ ہوتی تو حکیم صاحب کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر فن کی پرکھ، پھر فن کار سے اس حد تک محبت انھی کا حصہ ہے۔

مجھے یہاں ڈاکٹر اقبال کا وُہ واقعہ یاد آگیا کہ جب علامہ اقبال نے (ابتدا ہی میں) شاعری ترک[1] کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا تو سر عبدالقادر نے کہا تھا:

"اقبال! ایسا ظلم نہ کرنا، تمھاری شاعری کی مسلمانوں کو ضرورت ہے۔"

اگر اس وقت سر عبدالقادر بھی اقبال کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تو آج علامہ اقبال کے نام سے، شاید ہم واقف ہی نہ ہوتے، بالکل اُسی طرح اگر "الکمال" کے ایڈیٹر کی طرح کے لوگ چغتائی صاحب کے پیچھے پڑ جاتے اور انھیں کرتی

---

[1] اقبال ہی کا یہ شعر ہے:

توبہ کر لی ہے شعر گوئی سے
اس کی قیمت پڑی نہ اک پائی

حکیم یوسف حسن نہ ملتا تو ہو سکتا تھا کہ چغتائی صاحب بھی بد دل ہو کر اپنا راستہ بدل لیتے۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ پہلے پہل عظیم بیگ چغتائی کی "شریر بیوی" قسط وار "نیرنگِ خیال" میں چھپی تھی۔ اس سے پہلے عظیم بیگ کو زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے یا یہ کہ زیادہ شہرت نہ تھی۔

"شریر بیوی" کی دو چار قسطیں چھپی ہوں گی کہ دھوم مچ گئی۔ خود چغتائی صاحب نے مجھے لکھا کہ "میں اس سے پہلے ہندوستان کے کئی پرچوں میں لکھتا تھا۔ مجھے کسی نے نہ جانا۔ میں نے "نیرنگِ خیال" میں لکھا تو سب نے جان لیا۔"

"شریر بیوی" کی اشاعت سے پہلے یہ حال تھا کہ عظیم بیگ چغتائی کے مضامین عدمِ اشاعت کی بنا پر واپس بھی آجایا کرتے تھے۔ جن پر مدیران کرام کے یہ ریمارکس ہوتے تھے کہ "معیار کے مطابق نہیں" یوں تین مضامین واپس آچکے تھے۔

یہ واقعہ جب عظیم بیگ نے حکیم صاحب کو بتایا تو حکیم صاحب نے لکھا :

"وہ سارے مضامین مجھے بھیج دیں۔"

مضمون آگئے تو انھوں نے انہیں پڑھا۔ تین مضامین "نیرنگِ خیال" کے لیے رکھ لیے۔ باقی دس مضمونوں کے بارے میں چغتائی صاحب کو لکھ دیا کہ فلاں فلاں رسالے کو بھیج دیجئے، چھپ جائیں گے۔ انھوں نے مضامین کے معیار اور رسائل کے مدیران کے رجحان کو سامنے رکھتے ہوئے وہ رائے قائم کی تھی۔ ان کی ریڈنگ صحیح نکلی اور وہ پہلے ہی مضامین مختلف رسالوں میں چھپ گئے۔ چغتائی صاحب بڑے حیران ہوئے۔ انھوں نے انھیں لکھا :

"صاحب مان گئے"

انھوں نے یہ بھی بتایا :

"شوکت تھانوی بھی ادھر اُدھر لکھا کرتے تھے۔ شگفتہ نگار کی حیثیت سے پڑھے ضرور جاتے تھے، مگر جو شہرت انھیں "نیرنگِ خیال" نے دی وہ انھیں کسی اور طرح نہ مل سکتی۔"

"وہ کیسے ؟"

کہنے لگے : "لوگوں نے شوکت تھانوی کو 'سودیشی ریل' کی وجہ سے پہچانا۔ وہ پہلے پہل 'نیرنگِ خیال' میں چھپا تھا اور میں نے شوکت صاحب سے مضمون کی اشاعت سے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ اس مضمون کی اشاعت سے آپ آسمان پر پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ میرا اندازہ صحیح نکلا۔"

میں نے پوچھا : "کیا وہ مضمون آپ نے لکھوایا تھا جو آپ اتنا اینٹھ رہے ہیں ؟"

"ہاں، میں نے لکھوایا تھا۔ شوکت سے مضمون لکھنے کو کہا۔ انہوں نے مجھے دو تین پلاٹ سناتے، رائے پوچھی "کس موضوع پر لکھوں ؟" میں نے 'سودیشی ریل' کے موضوع کو پسند کیا تھا۔ پھر وُہ ان کی لی۔ اگر کوئی ایڈیٹر یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ اسے کس قسم کے مضمونوں کی ضرورت ہے تو وہ ایڈیٹر بننے کے قابل نہیں۔ ایڈیٹر کا کام یہ ہے کہ وہ با صلاحیت لکھنے والوں کو تحت الثریٰ سے اٹھائیں اور آسمان پر پہنچا دیں۔"

حکیم صاحب نے بتایا کہ جب میرے پرچے کو بے اندازہ مقبولیت حاصل ہوئی تو ساتھیوں نے سوچا کہ پرچہ تو ہماری وجہ سے، اس مقام پر پہنچا ہے اور حکیم یوسف حسن ہے کہ ہمیں لفٹ ہی نہیں دیتا، کیوں نہ اس کا مزاج درست کر دیا جائے!

چنانچہ میرا مزاج درست کرنے کے لیے انھوں نے "کارواں" نکالا۔ چغتائی صاحب کو گانٹھا۔ مجید ملک اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مددگاروں میں تاثیر، پطرس، غلام عباس، قاضی عبدالغفار، سبھی نے ادارۂ "کارواں" کا ساتھ دیا۔ پرچہ بے شک اچھا نکلا۔ مگر انجام کیا ہوا۔ صرف دو پرچے نکلے۔ جذبہ غلط تھا، پروان کیسے چڑھتا!

جب "کارواں" کے لیے ابتدائی کوششیں جاری تھیں تو انہی دنوں مجھ سے کہلوایا گیا تھا کہ حکیم صاحب اب اپنی خیر منائیں۔ اِدھر "کارواں" نکلے گا اُدھر "نیرنگِ خیال" راستے سے ہٹ جائے گا۔

پھر انھوں نے بتایا کہ ایک ایسا ہی بھرپور وار تاجور نجیب آبادی نے بھی کیا تھا۔ انھوں نے "شاہکار" نکالا، بڑے ٹھاٹھ سے! تاجور کے پاس اُس وقت کوئی تیس چالیس ہزار روپیہ تھا۔ انہوں نے بہت بڑا اسٹاف رکھا۔ ڈھائی سو روپیہ ماہوار کرائے پر دفتر لیا۔ مضمون نگاروں کو معقول رقم معاوضے میں دینے کا اعلان کیا۔ یہ زمانہ ۱۹۲۳-۲۴ء کا ہوگا۔ سبھی مضمون نگار اُدھر "ڈھل" (اردو میں "ریجھ" کا لفظ 'قدرے ہم معنی ہے) پڑے۔ پہلا پرچہ جو نکلا تو دھوم مچ گئی۔ "نیرنگِ خیال" سے سائز دوگنا، کاغذ سفید، ٹائیٹل نورنگ کا، مضمون نگار اچھے، میں دم بخود رہ گیا۔ قیمت بھی لاگت اور دیگر اخراجات کے مقابلے میں کم رکھی۔ ہر طرف شاہکار ہی شاہکار کی دھوم۔ یہی وجہ تھی کہ تاجور صاحب آپے میں نہ رہے۔ جب میرے ایک دوست تاجور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے شاہکار کی تعریف کی۔ تعریف کے قابل جو تھا۔ میرے اس دوست نے بتایا کہ میرے تعریفی کلمات کہنے پر تاجور صاحب کرسی سے اُٹھے۔ سیدھے کھڑے ہو کر جھکے اور اپنی انگشت کھڑی کر کے، زمین سے آسمان کی طرف کر کے اُٹھتے ہوئے بڑے ایکٹرانہ انداز میں پورے زور سے کہا:

"مٹا دوں گا۔"

پرچہ دیکھا تھا۔ ایسی باتیں سُنیں۔ گھبرانے والی بات تھی۔ مگر میں بالکل نہ گھبرایا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ اس ٹھاٹھ کا پرچہ سدا نہیں نکل سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس طرح کا پرچہ اور اتنے سرمائے سے، ایک سال تک نکالا جا سکتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا مجھے اس پرچے کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ پرچہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے پرچے کو بجائے بہتر بنانے کے اُسے ترقیٔ معکوس کی طرف لڑھکایا۔ سائز چھوٹا کر دیا۔ صفحات کم کر دئے۔ ایک سال تک شاہکار خوب چڑھا۔ میرا پرچہ دبّو رہا۔ اُدھر واہ وا، اِدھر ہے ہے!

میرے دوستوں نے کہا: "یہ کیا کر رہے ہو، لُٹیا ڈبو دی!"

میں نے کہا: "چپ رہو۔"

میں نے اُن دنوں اپنا نعرۂ "ری ٹریٹ" (RETREAT) یعنی پیچھے ہٹ جاؤ، بنا لیا۔
میرے خیر خواہ پوچھتے: "پرچے کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟"
میں کہتا ہُوں: "ری ٹریٹ"۔

جب میں نے اندازہ لگایا کہ تاجور صاحب کا مال ختم ہوگیا ہے تو میں اپنے پروگرام کے مطابق مستعد ہوگیا۔ ایک دم بڑا سائز کردیا، محنت کی، روپیہ خرچ کیا اور ایک ہی ہلّے میں "شاہکار" کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ اس کے بعد "شاہکار" پنپ نہ سکا اور "نیرنگِ خیال" نے پھر اپنا وہی سابقہ مقام حاصل کر لیا۔ پھر زندگی میں تاجور صاحب کی زبان سے کسی نے یہ نہ سُنا:

"مٹا دُوں گا!"

بالآخر انجام یہ ہُوا کہ جس پرچے پر، چالیس ہزار لگائے گئے تھے اُسے چار سو میں بیچ کر گھر بیٹھنا پڑا۔ آغاز وُہ، انجام یہ!

کہتے ہیں کہ "نیرنگِ خیال" کے عروج کے زمانے میں، اتنے منی آرڈر آتے تھے، اتنے وی پی آتے تھے کہ گھنٹوں ہی فارموں پر دستخط کرتے کرتے گزر جایا کرتے تھے۔ اور ہاتھ دستخط کرتے کرتے تھک جایا کرتے تھے۔ غرض ہُن برستا تھا۔

جن دنوں کی یہ بات ہے اُن دنوں اور بھی کئی اچھے رسالے لاہور سے نکلا کرتے تھے۔ مثلاً:

عالمگیر، ہمایوں، شباب اردو، ادبی دنیا وغیرہ!

"عالمگیر" نے بڑی کوشش کی کہ "نیرنگِ خیال" کو نیچا دکھایا جائے۔ مگر ان کی آرزو کبھی پُوری نہ ہُوئی۔ گھٹیا قسم کی ادبی رقابتوں نے انہیں کچھ کر کے دکھانے پر مجبور کر رکھا تھا، ورنہ شاید یہ بھی سمجھا دیگرے نیست کہہ کر لنگوٹ کھول دیتے۔

اتنے معرکوں کے ناخدا، ویسے آج بڑے افسوس کے ساتھ کہتے ہیں: "اب جاکر ہار گیا ہُوں، عمر نے ہرایا"۔

واقعی، بڑھاپا ——— تمناؤں اور آرزؤں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور فاصلہ ہے۔

میرے علم میں یہ تھا کہ حکیم صاحب نے صرف ایک رسالہ "نیرنگِ خیال" ہی نکالا تھا۔ معلوم ہُوا کہ میری معلومات ناقص ہیں۔ وُہ ایک رسالے کے نہیں، اکٹھے سات رسالوں کے مدیر رہے۔ نہ صرف مدیر رہے بلکہ مالک بھی، بیک وقت دو دو تین تین پرچے ایڈٹ کیے۔ سبحان اللہ!

نام آپ بھی سن لیں، نیرنگِ خیال، تازیانہ، بائیسکوپ، لیلیٰ، کامیابی، اسرارِ حکمت اور مخزنِ حکمت، ان میں کوئی ادبی پرچہ تھا، کوئی طبی، کوئی صنعتی اور کوئی فلمی۔ یہ ہر طرف مار کرتے تھے۔ عجیب دماغ پایا تھا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہر فن مولا کہا جاتا ہے جو اپنی راہیں خود کاٹتے ہیں۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل رسائل کے بھی ادارتی فرائض انجام دیتے رہے جیسے: الحکیم، ویلش اوپکارک، حامیِ صحت، مسیح الملک، تندرستی۔

ان کے علاوہ ہفتہ وار سیاسی اخبار 'الخلیل' بجنور (یو، پی)۔ غرض اپنے شہر کے پرچوں کے علاوہ دوسرے پرچوں کے بھی ادارتی فرائض انجام دیتے رہے، پالیسی مرتب کرتے رہے، نوٹ وغیرہ لکھتے رہے۔ پھر پندرہ سولہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جن میں سے بعض کے کئی کئی ایڈیشن چھپے۔ یہ سب سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ حکیم صاحب کس بلا کے انسان ہیں۔ کتنی انرجی تھی! کیا لگن تھی! کیا جنون تھا! کیا عشق تھا!

بیشتر ادیبوں اور شاعروں نے یہ بھی سوچ رکھا ہے کہ بے راہ روی ہمارے فن کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ یُوں نت نئے تجربے حاصل ہوتے ہیں، احساسات جوان ہوتے ہیں۔ ایسی سوچیں کچّے ذہنوں کی پیداوار ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اچھّا ادیب، اچھّا آدمی بھی ہوتا ہے۔ جو اچھّا ادیب اچھّا آدمی نہیں وہ اپنے آپ میں نامکمل ہے۔

انھوں نے ادیب بننے کے لیے نہ ہی نت نئے تجربے حاصل کئے اور نہ ہی احساسات کو جوان رکھنے کے لیے مصنوعی سہاروں کو اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اخلاقی قدروں کی پامالی قطعاً نہیں، بلکہ حد درجہ توازن ہے، حد درجہ شائستگی ہے۔

اور ہاں، یہ بھی تو سُنیں:

"جن دنوں یہ لائل پور میں تھے، ریلوے میں گڈز کلرک، عمر بھی ان کی کچھ زیادہ نہ تھی، یہی کوئی اکیس بائیس برس ہوگی۔ اُن دنوں یہ سکھوں کے ایک اخبار 'خالصہ' میں بہ طور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرتے تھے۔ چونکہ سرکاری ملازم تھے اس لئے اخبار پر ان کا نام تو نہ آتا تھا مگر کام انھیں پُوری ذمہ داری کے ساتھ کرنا پڑتا تھا۔ تنخواہ تھی پچاس روپے ماہوار، جو آج سے پچاس برس پہلے اچھی خاصی تنخواہ تھی۔

اس اخبار کے ایڈیٹر لال سنگھ ایم اے تھے اور مالک ہرچرن سنگھ۔ دونوں سے حکیم صاحب کی اچھی یاری تھی۔ ملازم اور مالک والا رشتہ نہ تھا، بلکہ خوب گھُٹتی تھی۔

لال سنگھ کے بارے میں، حکیم صاحب کا خیال یہ ہے کہ وہ تھے بے شک ایم اے، مگر تھے سِکھ، اس لیے اپنی سادگی کی بنا پر، جو جی میں آتا تھا لکھ ڈالتے تھے۔ ایک سے ایک لطیفے ہوتے رہتے تھے۔

ہرچرن بڑے شریف آدمی تھے، بے حد ملنسار، من موہ لینے والے۔ مگر وہ کبھی کبھی ایسا لفظ بول دیتے تھے کہ ہنس ہنس کے پیٹ میں بَل پڑ جاتے تھے۔

مثلاً ایک واقعہ سُنو:

"جن دنوں مَیں، اخبار میں کام کرتا تھا، انہی دنوں پنجاب کے گورنر لائل پور کے دَورے پر آئے۔ ان کا کوئی

خاص ہوا گت نہ ہُوا ۔ یہی بات لال سنگھ ایم اے کو لکھنا تھی مگر لال سنگھ نے لکھا تو یہ کہ "گورنر صاحب لائل پور سے ایسے گزر گئے جیسے ایک چپڑاسی گزر جاتا ہے"۔

اس فقرے پر اخبار کی ضمانت ہوگئی، تب ہر چرن سنگھ نے مجھ سے کہا "یوسف صاحب! آپ نے بھی نہ ٹوکا کر لال سنگھ یہ نہ لکھو"۔

"میں کیسے ٹوکتا سردار جی؟"

"جیسے ٹوکا جاتا ہے"۔

"جی اس طرح تو ٹوکا تھا مگر لال سنگھ جی نے جواب دیا تھا چپ رہو اس میں بڑا تھرل ہے"۔

"ان کے تھرل میں ہمارا پڑلی ہوگیا"۔

یہ تھے ان کی ادارت کے قصے، پھر ادبی مقابلوں میں شریک خواجہ حسن نظامی نے اپنا ہفت روزہ "توحید" نکالا تو اس میں اعلان چھپا کہ اس سال جس کا سب سے اچھا مضمون ہوگا اُسے ایک اشرفی انعام میں دی جائے گی۔ چنانچہ اُس سال اشرفی حکیم یوسف حسن کے حصّے میں آئی۔ مضمون کا نام تھا "فرانسیسی ڈیوک کا الکو تالاڈلا"۔ یہ واقعہ "نیرنگ خیال" کی اشاعت سے بھی پہلے کا ہے۔

جب مولانا عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر نے "زمیندار" سے علیحدہ ہوکر اپنا اخبار "انقلاب" نکالا تو اُنھوں نے شروع دنوں میں "عید نمبر" کا بھی اعلان کیا تھا۔ اُن میں اور مضمون نگاروں کے ساتھ حکیم صاحب کے بھی نام کا اعلان تھا کہ وہ بھی مضمون لکھیں گے۔

ادھر خود حکیم صاحب "نیرنگ خیال" کا "عید نمبر" چھاپ رہے تھے۔ بیحد مصروفیت تھی۔ انقلاب کے لیے مضمون نہ لکھ سکے۔ یہی اطلاع دینے دفتر "انقلاب" پہنچے کہ میری معذرت قبول کرلی جائے۔

سالک صاحب نے کہا :

"اگر آپ کے نام کا اعلان نہ کیا ہوتا تو بات ٹل سکتی تھی۔ موجودہ صورت میں معذرت قبول نہیں کی جائے گی بلکہ آپ اس وقت تک دفتر "انقلاب" سے جا ہی نہیں سکتے جب تک کہ مضمون لکھ کر نہ دے جائیں"۔

چنانچہ حکیم صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے، بغیر کتابوں کی مدد کے ایک مضمون لکھا "حربی سیاست"، جس میں دُنیا کے تمام ممالک کی حربی سیاست پر بحث تھی۔ موضوع ادق تھا۔ کتابیں بھی موجود نہ تھیں مگر اس مضمون کو سالک صاحب نے بھی پسند کیا اور قارئینِ انقلاب نے بھی۔ اس واقعہ کا ذکر خود سالک صاحب نے "انقلاب" کے اُس "عید نمبر" میں بھی کیا تھا۔ حاضر دماغی کی بھی حد ہوگئی۔ جادُو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔

حکیم صاحب کہتے ہیں : لوگ سمجھتے ہیں کہ پرچہ چھاپنا معمولی کام ہے، مضمون حاصل کرنا معمولی بات ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہُوں کہ وزیر بن جانا آسان ہے مگر اچھا پرچہ چھاپنا اس سے زیادہ مشکل ہے"۔

حکیم صاحب مضمون حاصل کرنے کے لیے، پُورے ہندوستان کا دورہ کیا کرتے تھے۔ ادیبوں سے ذاتی تعلقات بنایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستان کا کونا کونا چھان مارا۔ مثلاً دلّی، لکھنؤ، حیدر آباد، بمبئی، کلکتہ، رام پور، علی گڑھ، مدراس۔ غرضیکہ ہر جگہ پہنچے۔ پھر خط و کتابت کا لامتناہی سلسلہ! کرب ہی کرب والا مسئلہ!

کہنے لگے کہ لاہور میں بیٹھے ہُوئے بھی، لاہور سے کسی اچھے مضمون کا حاصل کرنا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے سیّد امتیاز علی تاج کے ہاں اٹھائیس چکّر لگائے تھے تب جاکر ایک مضمون ملا تھا۔

نہ تو امتیاز علی تاج کو رحم آیا کہ حکیم صاحب اتنی بار آئے ہیں، نہ میں نے یہ سوچا کہ میں ایک اتنے بڑے رسالے کا ایڈیٹر ہوں، اس لیے کیوں اپنی جُوتی گھساؤں۔ غرض جو مضمون جس طرح ملا اُسے حاصل کیا۔ روپے اور وقت کے زیاں میں کوئی ایڈیٹر پڑے گا تو وُہ اچھا پرچہ نہ چھاپ سکے گا۔ رسالہ کا تو مطالبہ ہی یہ ہے کہ دولت برباد کرو، وقت ضائع کرو۔ غرض رسالہ ایک ایسا راکشش ہے جس کے حضور وقت بھی بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے اور دولت بھی، جو جتنی زیادہ قربانی دے گا راکشش اس سے اتنا ہی خوش ہوگا۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ چچا چھکن[1] 'نیرنگِ خیال' میں مسلسل چھپتا رہا ہے اور وہ مضامین ایسی ہی تگ و دَو کے بعد حاصل کر کے چھاپے گئے تھے۔ اگر میں ہمّت ہار بیٹھتا تو بہت ممکن تھا کہ یہ کردار اُردو ادب کے سامنے آہی نہ سکتا۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ ایسے مضامین لکھنے کا مشورہ مَیں نے ہی تاج صاحب کو دیا تھا۔ انگریزی کی کتاب[1] لاکر دی تھی۔ پھر مَیں نے اپنے رسالے میں، ایک انگریزی رسالے سے نقل کر کے ایک تصویر چھاپی تھی۔ اُس میں چچا چھکن تصویر ٹانگ رہے تھے۔ یہ وُہ سارے عوامل تھے جنھوں نے مل کر تاج صاحب سے ایسی شاندار چیز لکھوائی تھی۔

حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مَیں چاہتا تھا کہ کوئی بڑا شاعر جنگ اور جہاد کے موضوع پر، ساری اسلامی لڑائیوں کو نظم کر دے۔ یہ خیال انھیں اس لیے پیدا ہُوا تھا کہ اُنھوں نے اپنے پرچے میں ایک نظم فتح قسطنطنیہ[2] چھاپی تھی، جو پسند کی گئی تھی۔

انھوں نے یہ بات کئی شاعروں سے کہی کہ اسلامی فتوحات پر، جوش اور ولولے سے مملو، جرّاری زبان میں نظمیں لکھی جائیں، تاکہ مسلمان سوتے سے بیدار ہوں۔ اپنی اس اسکیم کا ذکر ابوالاثر حفیظ جالندھری سے بھی کیا۔ انھوں نے اس پر سوچا، مزید سوچا۔ تب اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اسلامی تاریخ کو نظم کرنا چاہیے۔ اس طرح جنگ نامۂ اسلام تو نہ چھپا مگر شاہنامہ اسلام چھپ گیا۔ یُوں چت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی والی بات ہوگئی۔

میں بڑا حیران ہُوں۔ "لیلیٰ کے خطوط" انھوں نے پیش کیے۔ اگر یہ ہمّت نہ کرتے تو شاید چھپتے ہی نہیں۔

---

[1] چچا چھکن کے دیباچہ میں خود امتیاز صاحب نے لکھا ہے، ماخوذ "جیروم کے جیروم"۔
[2] نظم نگار تھے سیّد طالب علی عابد الہ آبادی۔

"شریر بیوی" انہوں نے لکھوائی اور چھاپی۔ "سودیشی ریل" کا سہرا بھی انہی کے سر بندھتا ہے۔ "پطرس کے مضامین" بھی "نیرنگِ خیال" میں چھپ کر بامِ عروج تک پہنچے۔ "چچا چھکن" کا بھی کریڈٹ یہ لے رہے ہیں۔ "شاہنامہ اسلام" کے بھی محرک یہی بنے۔

تھوڑا بہت ان واقعات میں مبالغہ ہو سکتا ہے، دس بیس فیصد۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اگر اردو ادب کو حکیم یوسف حسن نہ ملتے تو ان میں سے بیشتر شاہکار منظرِ عام پر نہ آ سکتے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو اردو ادب جتنا شاداب اب نظر آتا ہے اتنا کبھی نظر نہ آتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے نزدیک حکیم صاحب اردو ادب کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ اس لیے انہیں اگر اکیس تلموں کی سلامی بھی دی جائے تو وہ کم ہوگی۔

شاہد احمد دہلوی مرحوم، جو ایک دوسری "دت" (فریق) کے آدمی تھے۔ وہ بھی حکیم صاحب کی صلاحیتوں کا اقرار کرتے تھے۔ سچ ہے کہ وقتِ گزراں کے ساتھ واقعات کی صداقت کچھ نکھر جاتی ہے، ماند نہیں پڑتی،

"نیرنگِ خیال ایسا رسالہ نکلا کہ اس نے ہمارے ادبی رسالوں کی روش بدل ڈالی۔ حکیم یوسف حسن صاحب نے ایک نئی بات یہ کی کہ پرچے کی ظاہری خوبیوں کی طرف بھی توجہ دی۔ 'نیرنگِ خیال' سے پہلے رسالوں کے ٹائیٹل بالکل سیدھے سادے ہوتے تھے۔ رسالے کا نام اور ایڈیٹر کا نام بس! حکیم صاحب نے طرح طرح کے ڈیزائن بنوا کر کئی کئی رنگ میں بلاک کی چھپائی شروع کی۔ مضامین لکھنے کے لیے انہیں لاہور کے چند اچھے لکھنے والے مستقلاً مل گئے تھے۔ یہی حضرات بعد میں "نیاز مندانِ لاہور" بن گئے۔ سالک، امتیاز، پطرس، تاثیر، ہری چند اختر اور ایم اسلم کے مضامین نے 'نیرنگِ خیال' کو ایک دم اُچھال دیا۔ جب اس کی ساکھ بن گئی تو ہندوستان کے تمام اچھے لکھنے والوں کے مضامین بھی 'نیرنگِ خیال' میں آنے لگے۔ دوسری تبدیلی حکیم صاحب نے یہ کی کہ 'نیرنگِ خیال' کا سائز عام رسالوں سے بڑا کر دیا۔ تیسری اور سب سے بڑی تبدیلی جسے انقلاب کہنا چاہیے یہ کی کہ 'نیرنگِ خیال' کے خاص نمبر اور سالنامے شائع کرنے شروع کر دئے۔ عام روش سے بچنے کے لیے حکیم صاحب نے 'نیرنگِ خیال' کے خاص نمبروں کا سائز بڑھانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کا ایک خاص نمبر گز بھر لمبا بھی نکلا تھا۔ آسکر وائیلڈ کی تمثیل 'سلومی' کا ترجمہ ڈاکٹر تاثیر کا کیا ہوا اُسی خاص نمبر میں چھپا تھا۔ ان کے ہر خاص نمبر میں ایک نہ ایک معرکے کا مضمون ضرور ہوتا تھا، مثلاً ایک میں شوکت تھانوی کا مضمون "سودیشی ریل" چھپا تھا۔ دوسرے میں عظیم بیگ چغتائی کا مزاحیہ مضمون "انگوٹھی کی مصیبت"۔ تیسرے میں قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط"۔ ان مضامین کی اشاعت سے 'نیرنگِ خیال' کو شہرت ہوئی اور 'نیرنگِ خیال' کے ذریعے ان مضمون نگاروں کو شہرت ملی۔ حکیم یوسف حسن کو ہماری برادری میں مجتہد کا درجہ

حاصل ہے، مگر افسوس کہ ادب کے اتنے بڑے خدمت گزار اور محسن کو زمانے کی گردشوں نے ماضی کے دھندلکوں میں محو کر دیا اور ناقدری نے اس عالمِ ضعیفی میں ملازمت کرنے پر مجبور کر رکھا ہے مگر اس ناداری میں بھی بھاگ کر کے حکیم صاحب 'نیرنگِ خیال' شائع کر رہے ہیں۔ یہ انہی کی ہمت ہے۔"[1]

میں نے جن باتوں کا اُوپر ذکر کیا تھا کہ حکیم صاحب نے اردو ادب کو بڑی نادر قسم کی تخلیقات سے مزین کیا تھا اور یہ بھی کہ کئی بڑے بڑے مصنفوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا تھا، تو وُہ کوئی غلط نہ کہا تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے بھی تصدیق کر دی۔ تصدیق تو واقعی وُہ ہوتی ہے جو اہلِ زبان کریں، ہمارا کیا ہے!

یہ تو اردو کے لیے مرتے رہے۔ تن من دھن تج اور کرتے رہے۔ مگر کچھ بدباطن ایسے بھی تھے جنہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ حکیم صاحب کیا ہیں۔ لوگ مضمون بھیج دیتے ہیں اور یہ چھاپ دیتے ہیں۔ تو انہیں بڑا غصّہ آیا۔ غصّے والی بات بھی تھی۔ اس لیے کہ پرچہ چھاپنا اتنا ہی آسان ہوتا تو اور حضرات بھی "نیرنگِ خیال" قسم کے پرچے نکال لیتے۔ چونکہ اچھا پرچہ چھاپنے کے لیے کسی حکیم یُوسف حسن ایسے ہی با ہوش، با تدبیر اور صاحبِ قلم کی ضرورت تھی۔ اس لیے کوئی بھی ایسا پرچہ نہ نکال سکا۔ چُونکہ غلط باتیں کرنا، حوصلہ شکنی کرنا ہمارا قومی شعار بنتا جا رہا ہے۔ سو وہ ہم لوگ انجام دیتے رہتے ہیں جزاک اللہ!

غصّے میں آ کر انھوں نے یہ سوچا کہ مجھے ایسے نمبر نکالنے چاہئیں، جس میں صرف حکیم یُوسف حسن ہی یُوسف حسن ہو۔ چنانچہ انہوں نے "نیرنگِ خیال" کے دو تین "ایڈیٹر نمبر" نکال ڈالے۔ جس میں صرف حکیم صاحب ہی نے مضامین لکھے اور کسی کی ایک سطر بھی نہ تھی۔ ممکن ہے حکیم صاحب کا خیال یہ ہو کہ خطّۂ عاقلاں کے رہنے والوں کو تھوڑی سی عقل بانٹ دی جائے!

نہیں صاحب! اوروں کی بھی چند سطریں تھیں جو میں نے ایک ایڈیٹر نمبر میں بہ طور تعارف دیکھی تھیں۔ سید امتیاز علی تاج نے لکھا تھا:

"میں نے ایڈیٹر نمبر کے تمام مضامین ذوق و شوق سے پڑھے ہیں اور ان کے مطالعے سے بہت لطف اندوز ہوا۔ اس نمبر کے مختلف موضوع بڑی خوش مذاقی سے جمع کیے گئے ہیں۔ اور حکیم صاحب نے اپنے مخصوص و مقبول انداز میں ان پر دلآویز مضامین تحریر فرمائے تھے۔ شاعری اور مصوّری کی کمی انتخاب دیج کر کے پوری کر دی گئی ہے۔ اس طرح حکیم صاحب نے خریدارانِ "نیرنگِ خیال" کی ضیافتِ طبع کے لیے دسترخوان بچھایا ہے کہ اس کے پُرلطف ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر حکیم صاحب کی یہ جدّت مقبول ہوتی اور انہوں نے اس طرح زیادہ ایڈیٹر نمبر شائع کرنے شروع

---

[1] نقوش، لاہور نمبر

کرتے اور دُوسرے رسائل کے لیے بھی ان کی تقلید کرنے کے سوا چارہ نہ رہا تو ہم مضمون نگار، یوسفِ بے کارداں ہو کر رہ جائیں گے۔"

ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے لکھا تھا:

"نیرنگِ خیال" کی کامیابی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا ایڈیٹر نبض شناس ہی نہیں، خود اہلِ درد میں سے ہے۔ قارئینِ "نیرنگِ خیال" کو اپنے مضامین سے بھی خوش کر سکتا ہے اور ان کی پسند کا انتخاب بھی کر سکتا ہے۔

حکیم یُوسف حسن محض ادبی اشغال میں منہمک نہیں رہے بلکہ سیاسی اور معاشرتی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہے۔ ان کا ہفتہ وار "تازیانہ" اس قسم کی سرگرمیوں کا آئینہ دار تھا۔ ۱۹۹۲ء کا نقشہ بھی اسی قبیل سے ہے اور قارئین کے تخیل کے لیے تازیانے کا کام دے گا۔ ہر ایک کو نئی نئی باتیں سجھائے گا۔ اس میں قوم پرست، رجعت پسند، انقلابی ہر ایک سیاسی جماعت کے لیے کافی سامانِ غور و فکر ہے۔ ہنسی ہنسی میں بڑے پتے کی بات کہہ گئے ہیں۔ سیاسیات، ظرافت، افسانہ، ڈراما، تنقید، غرض ——— ہر فن میں ہُوں مَیں طاق مجھے کیا نہیں آتا ——— کے پُورے مصداق ہیں۔"

نیرنگِ خیال، جولائی ۱۹۳۰ء

معلوم ہُوا کہ ضد میں آ کر یہ ایڈیٹر نمبر کی وبا حکیم صاحب ہی نے پھیلائی تھی جس کی بعد میں تقلید نیاز فتح پوری نے بھی کی۔

یہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم کسی کی صلاحیتوں کا اقرار کریں، ہم اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح ٹانگ گھسیٹیں، کس طرح پریشان کریں! تُف ہے ایسے افراد پر، ایسے ذہنوں پر کہ ہم اشرف المخلوقات میں سے ہیں اور حال یہ ہے کہ بخل کے اُس مقام پر ہیں کہ جہاں ایک انسان کو، دُوسرے انسان میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ وہ دَور اگرچہ تیس چالیس برس پہلے کا تھا۔ مگر ذہنیتوں میں فرق آج بھی نہیں پڑا۔ بُرائیوں میں بے مثال تھے، بے مثال ہیں! خوفِ خدا نہ تھا اور نہ ہے۔

حکیم صاحب کا "نیرنگ خیال" کے ساتھ ساتھ "تازیانہ" جیسا بلند پایہ ہفت روزہ اخبار بھی جاری تھا۔ ہم نے "تازیانہ" کے پرچے دیکھے ہیں، خُوب ہیں۔ وُہ پرچہ خالصتاً ادبی نہ تھا۔ نیم سیاسی اور نیم ادبی قسم کا پرچہ تھا پانچ برس تک تو ہفت روزہ کی صُورت میں نکالا اور دو برس تک ماہانہ، اخباری سائز کے ستر اسّی صفحات پر، جس کی اہمیت کو آج بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر حکیم صاحب یہی پرچہ نکالتے اور کچھ نہ کرتے تو بھی ایک دیانتدار ادبی مورّخ کو ان کا نام احترام سے لینا پڑتا۔ چونکہ ادب کی وادی[1] میں محسن کش لوگ بستے ہیں اس لیے تازیانے کو کون

[1] زیادہ پڑھے لکھے لوگ وادی کو مذکر لکھتے ہیں۔

پُوچھے گا جب کہ نیرنگِ خیال کو بھی کوئی نہیں پُوچھتا!

آپ کہیں گے، پُوچھتے کیوں نہیں۔ ہم تو اس کا نام آتے ہی گردن جُھکا لیتے ہیں۔ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ مگر میں پُوچھتا ہُوں حکیم صاحب کو اس جانکاہی کا صِلا کیا؟ یہی نا کہ اس عمر میں بھی حالات کے ہاتھوں اپنی روزی آپ کمانے پر مجبور ہیں ورنہ بُھوکے مر جاتے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا ہے چاہے اسے اوڑھ لیں چاہے بچھالیں چاہے کفن کے لیے رکھ لیں۔

کچھ ایسی ہی باتوں کو ذہن میں رکھ کر، مَیں نے 'نقوش' کا ایک اداریہ بھی لکھا تھا:

"پچھلے شمارے میں، مَیں نے مرحوم رسالوں کا ذکر کیا تھا آج ایک زندہ رسالے کا ذکر کرنا چاہتا ہُوں، جو عوام اور حکومت کی سرد مہری کی بنا پر مرحوم بننے کا فخر حاصل کرنے والا ہے۔ میری مراد "نیرنگِ خیال" سے ہے۔

وہ "نیرنگِ خیال" جو ادب کی دُنیا میں ایک مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔

کوئی دو ہفتے ہُوئے کہ حکیم یوسف حسن نے مجھے ایک اخبار کا تراشہ بھجوایا (جو نیرنگِ خیال کی شاندار کارگزاریوں پر مشتمل تھا) اور ساتھ ہی خط میں لکھا تھا کہ اب میری بُوڑھی ہڈیاں موجودہ حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ عوام ناقدر شناس ہیں اور حکومت بے مہر! لہٰذا میرا اور نیرنگِ خیال کا اس دَور میں زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔

آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اب جب کہ زندگی کی قندیل بجھنے والی ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ یہ تراشہ آپ کو بھجوا دُوں۔ ممکن ہے اس کی کبھی ضرورت پڑ جائے۔

وُہ خط اس وقت میرے سامنے نہیں۔ الفاظ یہ نہ ہوں گے مفہوم یہی تھا۔

حکیم صاحب بھی خُوب جانتے ہیں کہ میں مُردہ پرست قوم میں پیدا ہُوا ہُوں، جو جیتے جی تو کسی کو نانِ شبینہ سے بھی محتاج دیکھ کر نہیں پسیجتی مگر مرنے کے بعد اس پر القا ہوتا ہے کہ ایک جوہرِ قابل مر گیا اور اس خلا کو کوئی پُر نہ کر سکے گا۔

مولانا صلاح الدین احمد کا قصّہ سُنیے:

اُنھوں نے اپنا سب کچھ بیچ کر ادب کی آبیاری پہ لگا دیا۔ جب تک زندہ رہے کسی نے منہ نہ لگایا۔ بلکہ ایک جھڑپ میں ان کے ساتھ بڑا نامناسب سلوک کیا گیا۔ مگر جب مولانا مر گئے تو حکومت کو بھی معلوم ہو گیا کہ ایک بڑی قد آور ہستی رُوٹھ کر چلی گئی ہے ——— اور اس وقت اُن کی قبر پر انعام و اکرام کی بارش کر دی گئی۔

اے اللہ! ناقدر شناسوں کی اس دنیا میں تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں، اور

کیا سوچ کر اپنی زندگیاں ادب کے لیے وقف کر دیں ؟
کیا اس امید پر کہ مرنے کے بعد کسی امیر وزیر کی طرف سے ایک بیان آ جائے گا کہ ——
مرحوم کی ادب کے سلسلے میں بڑی خدمات ہیں ؟
کاش صاحبِ اختیار لوگوں میں کوئی ایک بھی ایسا باضمیر ہو جو یہ اقرار کر سکے کہ مرحوم کی صلاحیتوں کو ہم نے کچلا تھا۔ اور —— ادب کے قتل میں ہمارا ہاتھ ہے۔
میرے بزرگ حکیم صاحب ! یہ قوم اور ملک کے صاحبِ اختیار لوگ تو آپ کے لیے صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ آپ کے مرنے کا انتظار کریں اور پھر آپ کی قبر پر اپنی قدر شناسی کا بورڈ لٹکا دیں"۔
(نقوش، شمارہ ۱۰۶)

ابھی میں نے "تازیانہ" کا ذکر کیا تھا۔ اس کی اہمیت کیا تھی ؛ اس کا دبدبہ کیا تھا ؛ اُس کے بارے میں ایک چھوٹا سا واقعہ سُن لیں :

"زمیندار" سے نکل کر جب عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر "انقلاب" میں آ گئے تو یہ ایک دوسرے کے خلاف لکھنے لگے۔ مولانا ظفر علی خان، سالک و مہر کے خلاف، مہر و سالک مولانا ظفر علی خان کے خلاف !

حکیم صاحب "تازیانہ" میں اُس آویزش کا ذکر کچھ اس ڈھب سے کیا کرتے تھے کہ بظاہر اُس سے مولانا ظفر علی خان کی تعریف کے پہلو نکلتے۔ تعمقِ نظری سے دیکھا جاتا تو وہ مولانا کے خلاف ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ مولانا ظفر علی خان علم کا سمندر ہیں۔ شعر کے بادشاہ ہیں، سیاست کے ناخدا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس کے ساتھ آخر میں حکیم صاحب یُوں لکھ دیتے کہ مولانا کو نہیں چاہیے کہ مہر و سالک کے مُنہ لگیں۔ اس لیے کہ بات ان کے مرتبے سے فروتر ہے۔ بظاہر کچھ، بین السطور میں کچھ !

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اُن دنوں مجھے لال دین قیصر نے یہ بتایا تھا کہ جب ملک صاحب نے مولانا ظفر علی خان سے کہا کہ آپ مہر و سالک کو بخش دیں۔ اُن کے خلاف نہ لکھا کریں تو مولانا ظفر علی خان نے کہا : میں مہر و سالک کو کیا سمجھتا ہوں، وُہ میرے پڑھائے ہُوئے ہیں۔ وُہ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ مگر میں حکیم یوسف حسن کی تحریروں سے پریشان ہُوں اُن کا میرے پاس جواب نہیں۔

ایک بات بھُول نہ جاؤں وُہ پہلے سُن لیجیے۔ اس کے بعد اور باتیں ہو جائیں گی۔ وہ یہ کہ حکیم صاحب ملک کے بڑے بڑے فن کاروں کو "ادبی خطابات" سے بھی نوازا کرتے تھے۔ یہ اپچ بھی انہی کی ہے جسے اہلِ قلم، انگریزوں کے خطابات، سر اور خان بہادر سے زیادہ اہم جانتے تھے۔ مثلاً ۱۹۳۵ء میں انہوں نے جنہیں اور جو جو خطابات دیئے وہ عرض کرتا ہوں :

علامہ : سر عبدالقادر، ممبر انڈیا کونسل لنڈن —— پروفیسر محمد دین تاثیر ایم۔ اے (کیمبرج انگلستان)

——ڈاکٹر مولوی سیّد نجم الدین احمد ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لاء —— آنریبل سر تیج بہادر سپرو پی سی، بیرسٹر ایٹ لا، الٰہ آباد۔

ادیب العصر: لطیف الدین احمد (ل۔ احمد) آگرہ —— قاضی عبدالغفار مراد آبادی (حیدر آباد) —— مولانا عبدالمجید سالک، روزنامہ انقلاب لاہور۔

ادیب الملک: نذر سجاد حیدر غازی پوری —— حجاب اسمٰعیل (مسز تاج) —— خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی —— پروفیسر حامد اللہ افسر میرٹھی بی اے (لکھنؤ) —— مولانا تاجور نجیب آبادی (لاہور)

ملک الشعراء: مولانا ظفر علی خان مدیر "زمیندار" لاہور

لسان العصر: نواب سائل دہلوی —— پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی —— جوش ملیح آبادی —— سیماب وارثی اکبر آبادی (آگرہ)۔

لسان الملک: یاس عظیم آبادی —— جگر مراد آبادی۔

لسان القوم: پنڈت ہری چند اختر —— ساغر نظامی۔

مدیر اعلیٰ: عزیز حسن بقائی، مدیر 'پیشوا' دہلی —— لالہ کرم چند، مدیر 'پارس' لاہور —— نصر اللہ خاں عزیز بی اے، مدینہ بجنور —— شاہد احمد دہلوی بی اے آنرز، مدیر 'ساقی' دہلی —— حامد علی خان بی اے، مدیر 'ہمایوں' لاہور —— مولوی سیّد محمد جعفر بی اے، ایڈیٹر 'ملت' دہلی۔

بہزاد ہند: اُکیل دہلوی —— الٰہ بخش لاہوری۔

مصوّر قلم: شوکت تھانوی —— بلقیس جمال بریلوی —— مرزا عظیم بیگ چغتائی —— شمسی عباد الرحمٰن (علی گڑھ) —— صفوۃ اللہ بیگ صُوفی دہلوی —— ابوطاہر داؤد بی ایس سی —— عبدالرحیم شبلی بی اے (کامرس) —— مظہر انصاری بی اے آنرز دہلوی —— سیّد خواجہ وکیل ہائیکورٹ حیدر آباد دکن۔

خطابات کی اپج کے علاوہ انہوں نے عنوانات قائم کرنے میں بھی ندرت دکھائی۔ مثلاً اختر شیرانی کی نظم کا عنوان "لمعاتِ اختر"۔ جگر مراد آبادی کا عنوان "داغِ جگر" غرض اسی طرح کی اور بہت سی اختراعات!

اسی طرح سالانہ نمبر یا اینول نمبر (ANNUAL NUMBER) کا نام۔ لفظ سالنامہ بھی "نیرنگِ خیال" کی دین ہے۔

ہمارے نیاز فتحپوری کی عادت تھی کہ وُہ چڑھتے سُورج کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ڈاکٹر اقبال کے بارے میں بھی پُوری دیدہ دلیری سے لکھا:

"اوّل اوّل جب مَیں نے کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا تو ان کے خیال کی رفعت اور جذبات کی اثریت کو سامنے رکھ کر جو صورت مَیں نے ان کی قایم کی تھی وُہ یہ تھی:

ایک نحیف الجثہ انسان (دماغی ترقی اور جسمانی ترقی دونوں کا اجتماع میرے ذہن میں نہیں آتا) بڑی چمکیلی آنکھیں، داڑھی اگر ہوتی تو مسترسل الشعر قسم کی ورنہ چار ابرو کا صفایا ہنستے کم ہوں گے لیکن باریک جلد کے نیچے ایک قسم کا نورانی خندہ ہر وقت جھلکتا ہوگا۔ معاشرت نہایت سادہ مگر پاکیزہ ہوگی۔ بلحاظ اخلاق کے عجز ہوں گے۔ بات بات پر آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہوں گی، اور بحیثیت مجموعی ان میں ایک کشش ہوگی کہ انسان خود بخود اُن کی طرف کھنچ جاتے ہوں گے۔ لباس بالکل مشرقی ہوگا اور نمائش سے بالکل دُور! لیکن جب میں اُن سے ملا تو مجھے کسی قدر تکلیف ہوئی کہ وہاں ایک بات بھی میری مزعومات کے مطابق نہ تھی۔"

یہ باتیں اہلِ پنجاب کو ناگوار گزریں۔ بھلا لباس سے علمیت کا کیا تعلق؟ بھاٹی کے حکیم صاحب اداریہ لکھتے ہیں اس لئے کہ یہ اپنے آپ کو پنجاب کا واحد نمایندہ سمجھتے ہیں۔ ہر معرکے میں حصہ لینا ان کے مزاج میں داخل ہے۔ لہٰذا چُپ کیسے رہتے۔ لنگوٹ کس کے میدان میں آ گئے۔ جواب میں لکھا:

"ہم حیران ہیں کہ نیاز صاحب نے علامہ اقبال کے کلام سے ان کے نحیف الجثہ ہونے پر کس طرح حکم لگا دیا۔ علامہ موصوف کے کلام میں ایسا کوئی عنصر نہیں ہے جس سے بانکپن اور نسائیت ٹپکتی ہو نہ ان کے ہاں یاس و حرماں کے نشان ہیں نہ مایوسی اور نا امیدی کی تلخی پائی جاتی ہے بلکہ وہاں زندگی کا ایک بحرِ ذخّار ہے جو جبل پیکر موجیں لیے چلا آتا ہے اور جو چیز سامنے آتی ہے بہا لے جاتا ہے وُہ خون شدہ آرزوؤں اور منفعل گشتہ حسرتوں کے ماتم گسار نہیں بلکہ تخلیق تولید مقاصد کے مدعی ہیں وہ عرصۂ حیات کو ایک تماشائی کی نگاہ سے مشاہدہ نہیں کرتے بلکہ وُہ ایک امیر الجیش اور سر عسکر کی حیثیت سے اس کی روئداد بیان فرماتے ہیں۔ ان کا رفیع اور پُر وقار تخیل آپ کے ہم جلیس شعراء کی طرح کمرو ذہن کی باریکیوں میں سرگشتہ نہیں پھرتا بلکہ وُہ رازِ حیات سے آشنا ہو کر بصد صولت و بصالت ؎

تیغ و سنان و خنجرم و شمشیرم آرزو است
با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزو است

کے جگر پاش نعروں کے ساتھ بلند ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ اس ہنگامہ آرائی، محشر خیزی، ایک معرکہ کرب و بلا برپا کرنے کی آرزو کے باوجود اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے۔

حضرت علامہ کے کلام کا پُر وقار اور شاندار ترنّم، اس کی بلند آہنگی، سوز و گداز، عمیق تفکر اور وہ تشکیک؛ سوز آتشِ ملتہب جس کو نکلسن ایک کوہِ آتش افروز بتاتا ہے۔ سب نیاز صاحب کے استنباط کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ نیاز صاحب کلامِ اقبال کا چندے اور

مطالعہ فرمائیں ع

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

آگے چل کر آپ ناطقانہ انداز میں جو حضرت نیاز کی خصوصیت ہے فرماتے ہیں ؛
"دماغی ترقی اور صحتِ جسمانی ، دونوں کا اجتماع کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا"۔ بجا ارشاد ہے آپ کے ذہن میں ان دونوں کا اجتماع کیوں آنے لگا۔ یہی غنیمت ہے کہ اس میں "وسعتِ نظر" اور "ندرتِ خیال" کے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شیعہ سُنّی کی تفریق اور پنجاب و یو،پی کا امتیاز اور یہ تو آ گیا کہ کیوپڈ اور سائکی کے ترجمہ کو طبع زاد کہہ کر کس طرح شائع کیا جاتا ہے۔ رہا جسمانی ترقی اور صحت کا اجتماع ، یہ تو آپ کے دماغ میں اُس وقت تک نہیں آئے گا جب تک آپ دنیا کی عظیم الشان شخصیتوں کا مطالعہ نہ فرمائیں گے۔ ملٹن ، شیکسپیئر ، گوئٹے ، ڈاکٹر جانسن ، گولڈ سمتھ ، کلیمن شو ، روزولٹ ، لائڈ جارج ، ایچ جی ویلز ، ایچ وارٹ بیچ ، ولیم جیمس کو نیاز صاحب شاید شعرا اور بڑے آدمیوں میں سے نہ مانیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایک زمانہ ان کی دماغی قابلیت کا معترف ہے اور بدقسمتی سے صحت جسمانی بھی ان کی دماغی ترقی سے مجتمع ہے۔ نیاز صاحب کا یہ نظریہ ان کے نہاں خانہ کی باریکیوں تک ہی محدود رکھا جائے تو شاید صحیح ہو۔ لیکن جہاں تک دنیائے علم و ادب کا تعلق ہے اس کو کلیہ قرار دینا سراسر غلط اور جہالت پر مبنی ہے اور داڑھی کے متعلق جو ارشاد ہُوا ہے یہ بھی جناب کی عقل کا پھیر ہے۔ اس سے بڑھ کر حماقت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ کے بعد داڑھی اور اس کی نوعیت کے متعلق حکم لگایا جائے اگر ہو سکتا ہے تو ہم نیاز صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا نئے نئے سوانگ بدلنے سے آپ کے اندازِ بیان میں بھی فرق پڑتا ہے جس سے قاری اس امر کا اندازہ لگا سکے اگر نہیں ، اور ہر حالت میں آپ کا اندازِ بیان اور "حُسنِ تخیل" وہی رہتا ہے خواہ آپ ٹیگور کا بہروپ بدلیں یا اپنی حد درجہ شاعرانہ طبیعت کے مطابق حد درجہ شاعرانہ انداز میں کمبل اوڑھ کر مچھندروں کی سی صورت بنالیں جیسا کہ شروع سے آپ کا معمول رہا ہے تو فرمائیے شعر کے مطالعے سے داڑھی کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔

علامہ موصوف کی سی معلمِ اخلاق ہستی کی پاکیزہ اور سادہ معاشرت علوّ اخلاق دلچسپ اور دلآویز اندازِ تقریر کے متعلق آپ کے نقالوں کی ہرزہ سرائی کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان باتوں کو علمائے مشرق و مغرب جنہیں حضرت علامہ سے شرفِ نیاز حاصل ہُوا ہے اور وہ بھی بے شمار مشتاقانِ جمال جو ہر روز زیارت کے لیے آتے رہتے ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں آپ ایک بار کیا لاکھ بار آسمان پر تھوکیے لیکن یہ فراموش نہ کیجئے کہ یہ آپ کے حد درجہ شاعرانہ رُخِ مبارک پر آ کر پڑے گا۔ کاش

نیاز صاحب اس قسم کی حد درجہ شاعرانہ باتیں لکھنے سے پیشتر اُن آرا کو دیکھ لیتے یا ہم سے منگوا لیتے جو بڑی بڑی شخصیتوں نے علامہ موصوف کی ملاقات سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔

علامہ موصوف کے کلام ہی سے ظاہر ہے کہ آپ کے جذبات کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں اور جنہیں حضرت علامہ سے ذاتی طور پر شرفِ نیاز حاصل ہے وہ اس امر کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے جب علی گڈھ میں حضرت علامہ کی موجودگی میں "صقلیہ" پر آپ کی مشہور نظم ؎

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار

وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

پڑھی تو جہاں دیگر سامعین کی آنکھیں اشکبار تھیں وہاں علامہ موصوف بھی زار و قطار رو رہے تھے لیکن ہمارے خیال میں یہ کبھی نہ آیا تھا کہ قوم کی حالت پر رونے والے فلسفی کو یو، پی کے ایک بر خود غلط ادیب کی ذہنیت پر بھی رونا چاہیے۔ اس میں شک نہیں نیاز صاحب کی حد درجہ شاعرانہ قطع و برید واقعی سزاوار ترحم ہے اور ان کی "دماغی ترقی" "ندرتِ خیال کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ صفِ ماتم پنجاب کی "حد درجہ غیر شاعرانہ" سرزمین میں برپا کی جائے اور اجی حضرت یہ کشش ہی تھی جو آپ سے متکبر اور ہمچو ما دیگرے نیست رٹنے والے جوتیاں چٹخاتے یہاں تک آ گئے تھے۔

نیاز صاحب حد درجہ شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں،

"مَیں کبھی یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ شلوار پہنتے ہوں گے جو مرد کے لیے حد درجہ غیر شاعرانہ ملبوس ہے اور اونچا کوٹ جو پنجابی یُونیفارم کا جُزوِ لاینفک ہے استعمال کرتے ہوں گے جسے کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کرتا۔"

دروغ گو را حافظہ نباشد، ابھی آپ کو یہ شکایت تھی، آپ کی یہ توقع کہ علامہ موصوف کا لباس مشرقی وضع کا اور نمائش سے بالکل دُور ہو گا۔ غلط ثابت ہُوئی۔ اگر شلوار اور اونچا کوٹ استعمال کرنا جو خود نیاز صاحب کے الفاظ میں پنجابی یُونیفارم کا جُزوِ لاینفک ہے۔ مشرقی وضع کے خلاف ہے تو مشرقی وضع سے آپ کی مراد کمبل اوڑھنے کا وُہ حد درجہ شاعرانہ انداز ہو گا جو آپ نے ان دنوں اختیار کر لیا تھا۔ جب آپ پر ٹیگور یت کا بھُوت سوار تھا اور جس نے اب آپ کو "جن" کے سے حد درجہ شاعرانہ رسالہ کے اجراء پر مجبور کر دیا ہے۔

یہ بھی نیاز صاحب کی حد درجہ شاعرانہ فتحپوری منطق ہے جس کا سمجھنا غیر شاعرانہ ذہنیت کے آدمی کا کام نہیں۔

یہ امر واقعی کس درجہ مضحکہ خیز اور حد درجہ شاعرانہ ہے کہ ایک یُو، پی کا رہنے والا جب دنیا کے

کسی خطہ کے باشندے کا تصور کرتا ہے تو عالمِ خیال میں اسے وہی اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور دو پلّے کی ٹوپی اوڑھے دیکھتا ہے، جس کا وُہ خود عادی ہوتا ہے۔ اس بھلے آدمی سے کوئی پُوچھے کہ اگر آپ برنارڈ شا، گالزوردی اور آرنلڈ بینیٹ یا اون کوب وغیرہ کو جن کے متعلق آپ یہی زعم رکھتے ہوں کہ فتح پور کے حددرجہ شاعرانہ لباس میں ملبوس ہوں گے۔ حددرجہ غیر شاعرانہ مغربی لباس میں دیکھ کر سٹپٹا جائیں تو اس میں اُن بیچاروں کا کیا قصور ہے! علامہ اقبال پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں، پنجابی ہیں اور وُہ پنجاب کا لباس ترک کرکے یوپی معاشرت کیوں اختیار کر لیں۔

"رہا شلوار کا حددرجہ غیر شاعرانہ ہونا" تو جہاں یُوپی کے دو ممتاز ادیبوں کے اچھے خاصے شگفتہ نام عبدالباری اور حامد اللہ آپ کے نزدیک حددرجہ غیر شاعرانہ ٹھہرتے ہیں تو شلوار کی کیا حقیقت ہے۔ جسے پنجاب کی حددرجہ غیر شاعرانہ سرزمین سے ایک خاص مناسبت ہے۔ آپ اس کے حددرجہ غیر شاعرانہ ہونے کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ دُعا دیجئے اچکن کو جس نے آپ کی پردہ پوشی کر رکھی ہے اور جس کے بغیر آپ "شاعرانہ بیل" نظر آتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں اونچے کوٹ کو کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ فلسفہ سمجھنے کے دعویدار آپ کب سے ہُوئے ہیں اور فلسفہ میں پڑھا ہی کیا ہے جو فلسفیانہ ذہنیت جتانے لگے۔ فارسی کی دو تین کتابیں پڑھنے اور الہلال سے ترجمہ کرکے اپنے نام سے چھپوانے کا نام فلسفہ نہیں ہے۔ رسالہ 'جن' کے اجراء کرنے اور بھُوت پریت میں ایمان رکھنے والے ڈھلمل یقین قسم کے لوگ فلسفی ہو ہی کب سکتے ہیں۔ آپ کو فلسفہ سیکھنا ہے تو علامہ ممدوح کے ادنیٰ ترین خادموں کے آگے زانوئے ادب تہ کیجئے۔ فتحپور میں چلّے کاٹتے کسی کو فلسفی بنتے دیکھا نہیں آج تک!

علامہ ممدوح کے تلفظ پر وہی شخص حرف رکھ سکتا ہے جس نے عقل و خرد کو بالکل جواب دے دیا ہو اور جس کے تمام قوائے ذہنی کو تعصب نے معطل و ناکارہ کر دیا ہو۔ عجمی اور عربی علماء بھی آئے دن حضرت علامہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں لیکن آج تک کسی نے قیام کو کیام نہیں سُنا۔ یہ بھی محض آپ کی سماعت کا فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت متناسب الاعضاء اور تندرست انسان ہیں موزوں ساخت کے چہرے پر ایک پُروقار و دلکشی اور نُور برستا ہے۔ جسے مردانہ حسن کا شاندار اور مکمل نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ نگاہوں میں ایسی دلفریب کشش ہے کہ انسان خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ لیکن نیاز صاحب اپنی فطرت سے مجبور ہو کر فرماتے ہیں:

"جسم پہلوانی کے لگ بھگ فربہ و تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے آج تک پہلوان دیکھے ہی نہیں اور آپ کا پہلوان کا تصور بھی اسی قدر غلط ہے جس قدر آپ فلسفہ سے

کو رہے ہیں۔ وہ کوئی لکھنؤ کا بانکا ہوگا جسے آپ اپنی سمجھ میں پہلوان بنائے بیٹھے ہیں۔ کبھی آپ کلّو، گونگا اور گاماں (ہر چند آپ کی حد درجہ شاعرانہ طبع پنجاب کی حد درجہ غیر شاعرانہ ناموں کی متحمل نہ ہو سکے گی لیکن کیا کیا جائے کہ آپ کو پہلوان بھی ضرور دکھانا چاہیئے تاکہ آیندہ پھر کبھی ایسی غلطی نہ کر بیٹھیں) کو دیکھ لیتے تو آنکھیں کھل جاتیں کہ اللہ تیری شان پہلوان یہ ہوتا ہے۔ آپ حقیقتاً حضرت علّامہ کو پہلوان سمجھنے میں معذور ہیں اور حُقّے کے متعلق بھی سارا قصور آپ کے متعفن دماغ کا ہے، جس میں اس وقت فتحپور کے کسی بھٹیار خانے کا تصوّر سمایا ہوگا۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی لاہور کی کشادہ کوٹھیوں میں سے ہے۔ اس کی فضا نہایت پاکیزہ اور لطیف رہتی ہے۔ اس کا گول کمرہ ٹینس کے لان سے کسی طرح کم کشادہ نہیں۔

ایاز قدر خود بشناس !

سُنا جناب حد درجہ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ صاحب! آپ اپنی اوقات پہچانیے اور ڈاکٹر صاحب کے متعلق ہرزہ سرائی کر کے چھوٹا مُنہ اور بڑی بات کے مصداق نہ بنیے۔ ایک محدود حلقے میں جو رہی سہی توقیر باقی ہے آپ اُسے بھی ضائع کر بیٹھیں گے۔"

اقتباس طویل ہوگیا ہے، اس کی معذرت! مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حکیم صاحب نے ایک بڑے نازک مسئلے کو چھیڑا تھا۔ لہجہ بھی تند و تیز استعمال کیا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں دِلّی اور یو۔پی کے دوست خفا نہ ہو جائیں، مگر انہوں نے اپنا اداریہ اس طرح ختم کیا:

"ہم نے حضرت نیاز کی زہریلی تحریر کے اُن جملوں کو نقل کر کے رسالہ کو ناپاک نہیں کیا جو ان کے صحیفہ میں شائع ہوئے تھے۔ ہم یو۔پی کے سخن فہم اصحاب کو عموماً اور لکھنؤ کے اہل الرائے حضرات کو خصوصاً توجہ دلاتے ہیں کہ وہ حضرت نیاز فتحپوری کی اس سفیہانہ تحریر پر سختی سے نوٹس لیں اور پوری کوشش کریں کہ اُمّتِ مرحومہ کے سربرآوردہ اور واجب التعظیم بزرگوں کی اس درجہ توہین پر وہ اظہارِ ندامت کریں اور اگر وہ اس پر تیار نہ ہوں تو اطبائے لکھنؤ ان کے سر پر جو "جن" مسلّط ہے۔ اس کے نکالنے کا انتظام فرمائیں۔" (نیرنگِ خیال، جنوری ۱۹۳۰ء)

یہ ہے ایڈیٹر کی قابلیت یا اُس کا مقامِ گفتگو کہ وہ نازک مرحلوں سے بھی سُرخرو گزرے۔ ورنہ اس جھگڑے میں اہلِ زبان کا ناراض ہو جانا لازمی امر تھا (ایسے مواقع پر اکثر معقولیت اور نامعقولیت کو بھی دھیان میں نہیں رکھا جاتا) مگر حکیم صاحب نے اس معاملے کو پُوری ہوشمندی سے سنبھالا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے سُنا تھا کہ اس معاملے میں "اہلِ اُردو" بھی حکیم صاحب کے ہمنوا تھے اور نیاز صاحب کے رویّے کو ناپسند کر رہے تھے۔ اسے کہتے ہیں تلخ نوائی میں شیریں کلامی!

میں نے مندرجہ بالا طویل اقتباس کو دیا اور اقتباسات کو) اس لیے بھی درج کرنا مناسب سمجھا کہ بہانے بہانے سے حکیم صاحب کے اندازِ تحریر اور اندازِ فکر کا بھی سراغ ملتا جائے۔ یوں میں نے بزعم خود ایک تیر سے دو نشانے کیے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ایک بھی تیر نشانے پر نہ لگا ہو۔

میں نے حکیم صاحب سے پوچھا :

"آپ نے اس وقت علامہ اقبال کی وکالت تو خوب کی تھی۔ علامہ بھی خوش ہوئے تھے کہ نہیں ؟"

کہنے لگے :

"وُہ ان چیزوں سے بالا تھے۔ میں نے جب وُہ پرچہ علامہ کی خدمت میں پیش کیا تھا تو وُہ نوٹ پڑھ کر صرف مُسکرا دیتے تھے۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ مجھ میں بھی ہمت نہ تھی کہ پُوچھ لیتا ، کیسا رہا یہ اداریہ ؟"

"آپ کے علامہ سے تعلقات کیسے تھے ؟"

"لوگ تو یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہمارے علامہ سے بڑے تعلقات تھے۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ہر آدمی یہ کہ رہا ہے کہ علامہ میرے دوست تھے ، مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے مگر میں اس ضمن میں یہ کہوں گا کہ میں تو ان کے ہاں حاضری پر بھی فخر کیا کرتا تھا۔ میری نہ ان سے دوستی تھی نہ وُہ مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ علامہ کی مجھ پر یہی مہربانی بہت تھی کہ انھوں نے مجھے اپنے ہاں بیٹھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لذتِ بیداری مجھے اُسی چوکھٹ سے ملی تھی ، ورنہ میں اس سے آشنا ہی نہ تھا۔

ایک دن میں نے علامہ سے گزارش کی : 'نیرنگِ خیال' کے لیے کوئی نظم دیجئے "۔

انھوں نے فرمایا : "نئی چیز کوئی نہیں ہے "۔

میں نے یاد دلایا کہ جب میں پہلی مرتبہ حاضر ہُوا تھا تو آپ نے حاضرین کو ایک نیا شعر سنایا تھا ۔

یہ پنڈت ، یہ بنیے ، یہ مُلا ، یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے

اس کے بعد کچھ شعر اور ہوئے ہوں گے "۔

کہنے لگے ، اور کوئی شعر نہیں ہُوا۔ وہی ایک ہے ۔

پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا : اچھا لکھو :

یہ کُتب ، یہ اسکول ، یہ پاٹھ شالے
یہ تکیے ، یہ مندر ، یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت ، یہ بنیے ، یہ مُلا ، یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

وطن کیا ہے اک نوعِ سرمایہ داری
بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری
یہ دیکھو وہ چلی آ رہی ہے سواری
نئے جال لائے پُرانے شکاری
غریبوں کا دُنیا میں اللہ والی

(نیرنگ خیال ۱۹۲۸ء)

جب فی البدیہہ اتنے اشعار لکھوا چکے تو فرمانے لگے :
" اگر یہ شعر کام آسکیں تو چھاپ دیجئے مگر مجھے اس کی نقل دیتے جائیں۔"
اس کے بعد حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں علامہ کی خدمت میں مہینے میں ایک دو بار ضرور حاضری دیا کرتا تھا۔ میں ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مولانا ظفر علی خان بہت گھبرائے ہوئے آئے۔

علامہ نے پوچھا : خیر باشد !"
" خیریت کہاں ہے !"
" کیوں ؟"
" گورنمنٹ نے ایک سرکلر بھیجا ہے کہ ہم اپنی طرف سے پانچ لاکھ روپے دیں گے اور پانچ لاکھ روپیہ مسلمان اکٹھا کریں تاکہ حجاز میں ہسپتال بنوائے جائیں۔ کیونکہ حج کے موقع پر مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"
" پھر؟"
مولانا پہلے ہی پریشان تھے، حد درجہ مضطرب، گلوگیر انداز میں جواب دیا :
" یہ انگریزوں کی چال ہے، جس میں وہ مسلمانوں کو بھی شامل کر کے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ انگریز جہاں ہسپتال یا رفاہی ادارے بنواتے ہیں۔ وہاں پہلے اسی قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ پھر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس لیے حجاز بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔"

علامہ نے فرمایا :
" معاملہ بے شک سنجیدہ ہے مگر آپ پریشان نہ ہوں، شام کو اپنا چپڑاسی بھیج دیجئے گا۔ میں اُسے چار پانچ شعر لکھ دوں گا، وہ اپنے اخبار میں چھاپ دیجئے گا۔ پھر نہ کوئی چندہ دے گا، نہ ہسپتال بنیں گے، نہ انگریز کی چال کامیاب ہوگی۔"
چنانچہ علامہ نے " شفاخانۂ حجاز " کے نام سے ایک نظم لکھی جو " زمیندار " میں چھپی۔ نظم کے چھپنے سے مسلمان خبردار ہو گئے۔ چنانچہ انگریز کی اسکیم دھری رہ گئی۔

حکیم صاحب نے فرمایا :

"اُس نظم میں بڑا تاثر تھا، میں آپ کو ایک دو شعر سُناتا ہُوں : ؎

اک پیشوائے قوم نے اقبالؔ سے کہا
کھُلنے کو جدّہ میں ہے شفاخانۂ حجاز

اس نظم کا ایک اور شعر ہے : ؎

دار الشفا حوالیِٔ بطحا میں چاہیے
نبضِ مریض پنجۂ عیسٰی میں چاہیے

مگر جب علامہ کا یہ شعر حکیم صاحب نے پڑھا : ؎

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہُوں زمینِ حجاز میں

تو حکیم صاحب رو پڑے۔ بُری طرح روئے۔ عجیب گداز دل پایا ہے۔ سرمایۂ دولت ہے، جسے بھی ملے۔ حکیم صاحب کی جو حالت تھی وُہ تو تھی ہی، مجھے بھی اُٹھ کر مُنہ دھونا پڑا۔

یہ بات مجھے حکیم صاحب ہی سے معلوم ہُوئی کہ اس نظم کا پس منظر کیا تھا اور پیشوائے قوم کون تھے! تھوڑی دیر کے بعد مَیں نے کہا ،بڑی تاثیر تھی علامہ کے کلام میں، امامِ عاشقانِ دردمند تھے۔ یہ ترکیب علامہ ہی کی ہے' جو اُن پر صادق آتی تھی۔

تاثیر کی بات پُوچھتے ہو؟ لو ایک قصہ اور سُنو :

علامہ اقبالؔ نے جنگِ طرابلس کے دنوں میں ایک نظم لکھی۔ نام تھا اس کا "حضور رسالتمآبؐ میں"۔ یہ نظم شاہی مسجد لاہور میں' ہزاروں لاکھوں کے مجمعے میں، علامہ نے بڑے ہی دل سوز قسم کے ترنم سے پڑھی۔ ایک تو علامہ نے اُس دن جس سوز سے نظم پڑھی تھی وُہ سماں بھی دیکھنے اور سُننے والا تھا۔

نظم پڑھنے سے پہلے سر شفیع، سر فضل حسین اور مولوی محبوب عالم ایسے اکابرین نے بڑی آتشیں تقریریں کی تھیں۔ جن میں اٹلی کے خلاف مسلمانوں نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد علامہ نے نظم سنانی شروع کی۔ مجمعے پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا۔ فرش پر سُوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ علامہ نے جب پُوری سرشاری کے ساتھ یہ شعر پڑھا : ؎

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہُوں
جو چیز اس میں ہے جنّت میں بھی نہیں ملتی

تو لوگوں کا تجسس بڑھا۔ سوال پیدا ہُوا بھلا وُہ کیا چیز ہو گی جو جنّت میں بھی نہیں ملتی۔ اس کے بعد جب علامہ نے

یہ شعر پڑھا : ؎

جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے، نالہ و شیون اور آہ و بکا کا ایسا سماں کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ جوش اتنا تھا کہ لوگوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، فرش پر تڑپنے لگے۔ آدم کی تڑپ کا وہ سماں، ضمیرِ کائنات میں اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ جو اس چشمِ فلک نے شاذ ہی دیکھا ہو گا۔

حکیم صاحب یہ واقعہ سناتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ مجھے بھی اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ کہنے لگے اُس دن میرا جی چاہتا تھا کہ غیر ملکی حکومت کے سارے آثاروں کو مٹا دوں اور خود پھانسی پہ لٹک جاؤں۔

حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اس واقعہ کے دُوسرے یا تیسرے دن، مَیں علّامہ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو حاضرین میں سے کسی نے علّامہ اقبال کے شاہی مسجد میں پڑھی جانے والی نظم کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ اُس دن خیریت ہی گزر گئی، ورنہ جو حال پبلک کا تھا اس سے اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ بے قابو ہو کر ہنگامہ برپا نہ کریں۔

اس پہ علّامہ نے فرمایا :

"اچھا ہی ہُوا جو مسلمان اپنے آپ میں رہے ورنہ میں چاہوں تو اپنے شعروں سے آگ لگا دوں۔ مگر میں دیکھتا ہُوں کہ ابھی میری قوم تیار نہیں ہے۔"

حکیم صاحب سے جب مَیں نے ایسے ایسے واقعات سُنے تو مزید کرید کی جستجو ہُوئی۔ نوائے عاشقانہ کو دل اور مچلا۔ مگر میرے استفسار پر کہ علّامہ کا کوئی اور واقعہ بھی سُنائیے۔ حکیم صاحب کہنے لگے :

"اَب میں تھک گیا ہُوں، بُوڑھا آدمی ہُوں۔ ۷۶ برس کی عمر ہے۔ پھر کبھی سہی۔"

"پھر کبھی نہیں، آج ہی!"

"آج کی بات تو پھر یہ ہے کہ تم شام کو گھر آجانا۔ میں تمھیں علّامہ کا ایک اور قصّہ سُناؤں گا، عجیب قصّہ! اللہ اللہ کیا عظمت تھی اس شخص کی! مُشتِ خاک تھا مگر دانشِ حاضر کا امام تھا۔"

میں اپنے کام کاج چھوڑ کے پہنچ گیا۔

حکیم صاحب نے کہا :

"میرا خیال نہ تھا کہ تم آسکو گے۔ کیسے چھوڑ دیا لوگوں نے تمھیں؟"

"دو تین آدمی بیٹھے تھے مگر میں اُن سے معذرت کر کے آگیا ہُوں۔ جب کاموں کا ہجوم ہو تو پھر میں یہ دیکھتا ہُوں کہ زیادہ ضروری کون سا کام ہے!"

"یہ زیادہ ضروری تھا؟"

"جی ہاں! آپ نے تو علامہ اقبال سے میری شیفتگی بڑھادی۔ کسک میں کچھ اضافہ ہی کردیا۔"

"اچھا، تو سنو:

قیام پاکستان سے پہلے، جب ہندوستان پر انگریز حکمران تھا تو اس کا قاعدہ یہ تھا کہ ریاستوں میں وزیرِاعظم خود نامزد کیا کرتا تھا۔ نوابوں اور مہاراجوں کو اس امر کی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کو وزیرِاعظم بنا سکتے۔ چنانچہ ریاست بہاول پور میں، جسے وزیرِاعظم بنا کر بھیجا گیا تھا وہ نواب صاحب کی منشا کے مطابق نہ تھا۔ آپس میں بنتی نہ تھی۔ ایک دوسرے کی ضد تھے۔ پہلے تو خود نواب صاحب وائسرائے بہادر کو لکھتے رہے کہ موجودہ وزیرِاعظم سے میری جان چھڑائی جائے مگر شنوائی نہ ہوئی۔

مجبور ہو کر نواب صاحب نے سوچا کہ میری اس مشکل کو، اگر کوئی حل کرا سکتا ہے تو وہ صرف ڈاکٹر اقبال! چنانچہ نواب صاحب کا آدمی علامہ کے پاس پہنچا، ڈاکٹر صاحب نے اس معاملے کو بہ حیثیت بیرسٹر جانچا۔ ہامی بھر لی۔ چار ہزار روپیہ مقدمے کی فیس طے پائی۔

ڈاکٹر صاحب وائسرائے کے پاس پہنچے۔ سیکرٹری کو اپنا کارڈ دیا۔ سیکرٹری نے کہا: قاعدہ یہ ہے کہ ہر ملاقاتی اپنا نام رجسٹر میں لکھتا ہے۔ رجسٹر اندر جاتا ہے۔ جسے بلانا مقصود ہوتا ہے اسے بلا لیا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ بھی کارڈ دینے کی بجائے رجسٹر میں اپنا نام لکھیں۔"

اس پر اقبال نے کہا:

"اگر وائسرائے میرے کارڈ پر مجھ سے ملنا نہ چاہیں گے تو میں واپس چلا جاؤں گا مگر عام لوگوں کی طرح رجسٹر میں نام نہ لکھوں گا۔"

مجبوراً سیکرٹری کو کارڈ ہی لے جا کر اندر جانا پڑا۔ وائسرائے نے کہا:

"میں ان سے ملوں گا انہیں بٹھایا جائے۔"

تھوڑی دیر کے بعد وائسرائے ملاقاتیوں کے کمرے میں آئے، پوچھا:

"کیسے آئے؟"

"آپ نے ریاست بہاولپور میں جسے وزیرِاعظم بنا کر بھیجا ہوا ہے اُسے تبدیل کر دیں اس لیے کہ اس کا برتاؤ نواب صاحب سے اچھا نہیں۔"

"ضابطے کے مطابق، نواب صاحب کو، اُس وزیرِاعظم کو قبول کرنا چاہیے!"

"کیا سیاست اسی کا نام ہے کہ آپ ایک فرمانروا کے معمولی سے مطالبے کو بھی نہیں مان سکتے؟ جبکہ نواب صاحب حکومتِ برطانیہ کا وفادار دوست ہے۔ پھر مسلمانوں میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر ایسی چھوٹی سی بات بھی نہ مانی گئی تو بڑا انتشار پھیلے گا۔ آپ کا اس میں کچھ حرج نہیں کہ کوئی دوسرا وزیرِاعظم بنا دیں۔"

وائسرائے کو ایک تو علامہ اقبال کے مرتبے کا علم تھا۔ دوسرے علامہ نے بات بھی کچھ اس ڈھب سے کی تھی کہ وائسرائے کو انکار کرتے نہ بنی۔ کوئی صاحب اور اک ہو تو ایسا!

جب یہ بات طے ہوگئی تو وائسرائے نے کہا:

"اب آپ پرسوں میرے ساتھ کھانا کھائیں۔"

"میں تو آج واپس جا رہا ہوں۔"

"اچھا تو کل سہی!"

"میں تو آج ہی واپس جاؤں گا، کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔"

"میری خواہش تھی کہ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی خوشی حاصل کرتا۔"

"اگر یہ خواہش ہے تو آج کھانا کھلا دیجئے!"

حکیم صاحب نے اس واقعہ پر تبصرہ یوں کیا کہ یہ شان علامہ ہی کی تھی کہ وہ وائسرائے کی بات کو بھی رد کرنے یا اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی ہمت رکھتے تھے۔ ورنہ کسی والیِ ریاست تک کی مجال نہ تھی کہ وہ وائسرائے کے حکم کے خلاف زبان بھی کھول سکتا۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ چودھری محمد حسین بھی موجود تھے۔ ایک تار آیا۔ چودھری صاحب نے وصول کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا:

"پڑھ کر سُنا دیجئے!"

چودھری صاحب نے بتایا:

"تار نواب صاحب بہاولپور کی طرف سے آیا ہے، انہوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے: ملاقات کے لیے بہاولپور آ جیئے۔"

ڈاکٹر صاحب ایک آدھ منٹ خاموش رہے۔ اس کے بعد فرمایا:

"نواب صاحب نے مجھے اپنا ملازم سمجھ لیا ہے۔"

چودھری صاحب نے کہا:

"کیا جواب دے دُوں نواب صاحب کو؟"

"لکھ دیجئے مجھے فرصت نہیں۔"

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد میں نے کسی دوسرے موقع پر چودھری صاحب سے اُس تار کا پس منظر پُوچھا تھا تو اُنہوں نے مجھے وُہ ساری تفصیل بتائی تھی جو میں نے آپ کو ابھی سنائی ہے۔ بقول حکیم صاحب وہ موقع ایسا تھا کہ اگر ڈاکٹر صاحب نواب صاحب کے پاس پہنچ جاتے تو وُہ انہیں دس پندرہ ہزار روپیہ ضرور دے دیتے۔ مگر اس

مردِ خود آگاہ کو کون خرید سکتا تھا!

حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی مرضی کے مالک تھے انہیں کسی بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے علامہ کا ایک اور واقعہ بھی سُنایا:

ہندوستان کے ایک نواب (شاید نواب جوناگڑھ) لاہور آئے۔ سر عبدالقادر کے ہاں قیام کیا۔ انہوں نے سر عبدالقادر سے کہا:

"میں دو کاموں کے لیے آیا ہوں، ایک تو میں لاہور دیکھنا چاہتا ہوں، دُوسرے علامہ اقبال سے ان کا کلام سُننا چاہتا ہوں۔"

سر عبدالقادر جو علامہ کے گہرے دوست تھے اُنہوں نے جواب دیا:

"لاہور کی سیر تو میں بخوبی کرا دُوں گا مگر علامہ اقبال سے کلام سنوانا میرے بس کی بات نہیں۔ ہاں میں یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کی خاطر دعوت کروں، علامہ کو بھی مدعو کروں، ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی صُورت از خود پیدا ہو جائے کہ علامہ اپنا کلام سُنا دیں ورنہ فرمائش کی جُرأت نہ تو مجھ میں ہے اور نہ ہی کسی اور میں!"

اس پر حکیم صاحب نے تبصرہ فرمایا:

"ایک علامہ تھے کہ کوئی ان سے فرمایش کر کے بھی کلام نہیں سُن سکتا تھا۔ ایک آج کے شاعر ہیں کہ اپنی بیاض بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ حیلے حوالے سے سامعین کو گھیرتے ہیں۔ پھر انہیں اپنا کلام سناتے ہیں اور اتنا سناتے ہیں کہ سُننے والوں کو اُدھ مُوا کر دیتے ہیں۔"

حکیم صاحب نے اقبال کے بارے میں جتنی باتیں سُنائیں، بڑے جذب کے ساتھ سُنائیں۔ میں نے بھی انہیں اس لیے محفوظ کر لیا ہے کہ مجھے پھر کون ایسی باتیں سُنائے گا، وہ بھی اتنے درد کے ساتھ! اتنی لذّتِ شوق کے ساتھ!

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اقبال کے انتقال کی خبر، بمبئی میں سُنی تھی۔ اُن دنوں مجھے جب وقت بھی وہ حادثہ یاد آ جاتا تھا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ میں جتنے دن بھی وہاں رہا، روتا رہا۔ میرا بمبئی میں زیادہ دن رُکنے کا پروگرام نہ تھا، دانستہ رُکا۔ میں سوچتا تھا جب میرا یہ حال یہاں ہے تو لاہور جا کر کیا ہو گا۔ جہاں کہ اقبال کے بہت سے دوست ہیں، اقبال کا گھر ہے، اقبال کے بچے ہیں۔

ایک دن حکیم صاحب بھر ترنگ میں تھے۔ مَیں نے اُس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اُن کی خدمت میں عرض کیا:

"باہر بارش ہو رہی ہے، سردی بھی ہے، لہٰذا کوئی گرم مگر دلچسپ قصّہ سُنائیں۔"

کہنے لگے: "میری زندگی میں بے شمار واقعات ایسے ہیں جنہیں لوگ دلچسپ کہہ سکتے ہیں۔ مگر اب میں وہ کیا سُناؤں،

اچھا نہیں لگتا۔ کچھ میری جوانی سے متعلق ہیں کچھ میری افتادِ طبع کے متعلق، کچھ میری چودھراہٹ کے متعلق!"

"پھر بھی کچھ تو فرمائیے؟"

"بارش تو تیز ہوگئی، جلد تھمے گی بھی نہیں، دھاروں دھار ہے۔"

"جی ہاں!"

"اچھا، تو پھر ایک لمبا قصّہ سُنو، بارش تھم جائے گی، یہ قصہ نہ تھمے گا۔"

"بسم اللہ۔"

"کلکتے سے ایک ہفت روزہ اخبار نکلتا تھا۔ "چونچ" اس کا نام تھا۔ ایڈیٹر اس کے عنایت حسین تھے یا عنایت علی۔ بہرحال مجھے صحیح نام یاد نہیں رہا۔ آپ یہی سمجھیں گے کہ وُہ عنایت صاحب تھے اور عنایت دہلوی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

عنایت صاحب کی، مشہور اداکارہ کجّن سے ٹھن گئی۔ عنایت صاحب، کجن کے خلاف اپنے پرچے میں لکھا کرتے تھے کجن تنگ آ کر ان پر مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ جب بات بہت بڑھ گئی تو عنایت صاحب نے مجھے خط لکھا کہ کلکتے آئیے اور میرا اور کجن کا جھگڑا طے کرا دیجئے، کیونکہ کجن آپ کا کہا مانتی ہے، اس لیے یہ جھگڑا طے ہو سکتا ہے تو آپ ہی کے ذریعے!

میں عموماً دتی جایا کرتا تھا۔ سوچا اب کے کلکتے ہو آؤں۔ میرا ایک ڈراما بھی عبدالرشید کاردار کے پاس تھا، جو اُن دنوں کلکتے میں تھے۔ کسی فلم کمپنی میں بہ طور ڈائرکٹر، میرے ڈرامے کا نام تھا: "حُور بانو"۔ کاردار نے بھی لکھا ہُوا تھا کہ یہاں آ جائیے تاکہ معاملہ طے ہو جائے۔ یہ ساری باتیں سوچ کر مَیں نے کلکتے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سوچا ایک پنتھ دو کاج!

عنایت صاحب کو تار دیا: کلکتے پہنچ رہا ہُوں، فلاں تاریخ کو اسٹیشن پر ملو۔ پہنچا تو عنایت صاحب اسٹیشن پر موجود تھے، بڑی گرم جوشی سے ملے۔ سامان اٹھایا، لینڈو میں رکھوایا۔ چل دیے ٹخ ٹخ ٹخ!

بجائے اس کے کہ مجھے اپنے گھر لے کے جاتے، انہوں نے ستم ظریفی یہ کی کہ مجھے بغیر بتائے سیدھا آغا حشر کے مکان پر لے گئے۔ اندر جا کر آغا صاحب سے کہا:

"میں آپ کے لیے ایک شاندار مہمان لایا ہُوں۔"

آغا صاحب سمجھے کسی دلربا کو لاتے ہوں گے آنکھ مار کر پُوچھا:

"کسے لائے؟"

"حکیم یوسف حسن کو!"

"اچھا! میں کچھ اور سمجھا تھا، مگر حکیم صاحب بھی کسی معشوق سے کم نہیں۔ تم نے بڑا اچھا کیا جو انہیں یہاں

لے آتے !"

واپس جاکر عنایت صاحب نے مجھے کہا" میں آپ کو اپنے مکان سے اچھے مکان میں لایا ہوں اور یہ مکان آغا حشر کا ہے "

"آغا حشر کا ؟"

"جی ہاں !"

اتنے میں آغا صاحب باہر تشریف لے آئے۔ میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے ہاتھ جھٹک کر بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا، اور پھر میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے اندر لے گئے۔ صوفے پر بیٹھے تو آغا صاحب نے پھر عنایت صاحب کو مخاطب کر کے کہا :

"عنایت صاحب ! میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔"

میں نے سوچا جب حکیم صاحب مجھے یہ بتا کر خاموش ہو جائیں گے کہ میں نے قیامِ کلکتہ میں جہاں آر اکبر کی عنایت صاحب سے صلح کرادی تھی اور واپس چلا آیا تھا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر میں نے حکیم صاحب سے کہا:

"ذرا آغا حشر سے بھی ملاقات کرادیں !"

"یہ ایک الگ مضمون ہے۔"

"ارے صاحب ! الگ ہے تو ہوا کرے۔ ہم یہاں کون سی تاریخ ادب اردو لکھ رہے ہیں۔ جس میں خطرہ ہو کہ ایک شخصیت، دوسرے میں مدغم نہ ہو جائے۔ باتیں ہی تو ہو رہی ہیں۔ میری معلومات کے لیے بتائیے نا کچھ !"

"اچھا، تو سنو، عنایت صاحب کے معاملے کو پھر پکڑلیں گے۔"

آغا صاحب کا منشی ہندو تھا۔ یہ ڈراما بولتے تھے وہ لکھتا تھا۔ ایسے سمے آغا صاحب کا حلیہ یہ ہوتا تھا کہ وہ صرف بنیان اور تہبند باندھے ہوئے ہوتے تھے، ریشمی اور قیمتی تہ بند !

روز لکھواتے نہ تھے مگر جب لکھوانے پر آتے تھے تو الفاظ آبشار کی طرح گرتے تھے۔ چند دنوں میں ڈراما مکمل ہو جاتا تھا۔

قاعدہ یہ تھا کہ صبح آٹھ نو بجے کے قریب، خوب پیٹ بھر کے ناشتا کرتے تھے۔ سارا دن فلم کمپنیوں کے چکر لگایا کرتے تھے۔ کبھی کسی کے ہاں پہنچے، کبھی کسی کے ہاں، کسی سے مذاق، کسی سے معاملے کی باتیں، کسی سے گالی گلوچ، کسی سے راز و نیاز، غرض یونہی دن گزارا کرتے تھے۔ چار بجے باہر ہی چائے پی لیتے تھے۔ رات کو گھر آکر کھانا کھاتے تھے۔

ایک دن میں اپنے ڈرامے کی معاملت کے لیے نکل گیا۔ کار دار سے ملے اُنہوں نے سیٹھ سے ملایا۔ سیٹھ نے ہنس راج ڈائرکٹر سے ملنے کے لیے کہا۔ ہنس راج سے ملا تو اس نے سیٹھ صاحب سے جاکر کہا :

"ڈراما اچھا ہے، معاملہ طے کر لیجئے" سیٹھ صاحب نے مجھے پانچسو روپے دیے اور کہا "فلم بن جانے پر اپنی خوشی سے اور بھی دیں گے۔"

جب مَیں نے یہ بات آغا صاحب کو آکر بتائی تو وہ بڑے ناراض ہُوئے، کہنے لگے:

"صرف پانچ سو روپے لاتے ہو، اگر مجھے بتا دیتے تو میں تمہیں اسی ڈرامے کے پانچ ہزار روپے دلواتا۔"

آغا صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہُوا تو مَیں نے اُن سے کہا:

"میں کجن سے ملنا چاہتا ہُوں" کجن کی ماں سے اوائل عمر میں آغا صاحب کے تعلقات رہے تھے۔ اس لیے میری بات سُن کر چونکے مگر مجھے وہاں جانے سے منع نہ کیا۔ کہا:

"آپ کجن کے ہاں نہ جائیں، اُسے یہاں بُلا لیں گے۔ یہیں بات ہو جائے گی۔"

میں نے کہا:

"مجھے تو کوئی کام نہیں، 'چونچ والے' عنایت صاحب کا کام ہے۔"

اس پر آغا صاحب نے بیزاری کے لہجے میں کہا:

"دیکھا جائے گا۔"

آغا صاحب نے اندازہ لگایا کہ میں کجن سے تفریحاً بھی ملنا چاہتا ہُوں اس لیے وُہ مجھے شام کو اپنی محبوبہ مختار بیگم کے ہاں لے گئے۔ آغا صاحب نے رات کا کھانا وہیں کھلایا، تعارف بھی کرایا۔

دُوسرے دن کجن کو پیغام بھجوایا اس نے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ کھانے کے سلسلے میں بے حد اہتمام کیا ہُوا تھا۔ تیس پینتیس کھانے چکھتے چکھتے ہی پیٹ بھر گیا۔ کیا امارت تھی اُن لوگوں کی اور کیا ٹھاٹھ تھے ان کے، بڑے بڑے راجہ مہاراجہ بھی ان کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے۔

کھانے کے بعد کجن نے کہا:

"آئیے آپ کو کلکتے کی سیر کراؤں۔"

چنانچہ انہوں نے اپنی بڑی شان دار کار نکلوائی، خُوب گھومے، خُوب سیر کی، باغات، بازار، سیرگاہیں سب دیکھیں، ایک جگہ پٹرول ختم ہو گیا۔ پٹرول پمپ سے پٹرول لیا۔ بجائے رقم دینے کے، کجن نے بل پر دستخط کر دئے۔

میں نے کہا: "روپے دے دیتیں، دستخط کیوں کئے؟"

کہنے لگیں: "کلکتہ کے سارے لوگ مجھے جانتے ہیں۔ وہ اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ ظاہر کریں کہ ہمارا واسطہ کجن سے بھی ہے۔ ان کی خوشی کی ایک شکل یہ بھی ہے۔"

چار بجے کے قریب کلکتے کے ایک شان دار ہوٹل میں چائے پلائی۔ کلکتے سے رخصت ہوتے وقت، قیمتی تحائف دیے۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد، حکیم صاحب کجن کے تصور میں گُم ہو گئے۔ میں نے ٹھوکا دیا:

"حضرت کہاں ہیں؟"

"تُو بھی عجیب بدمعاش ہے خواہ مخواہ ہمارے زخموں کو کریدتا ہے۔"

"زخم کھایا تھا کوئی؟"

"نہیں، یہ بات نہیں۔" یہ کہہ کر پھر کھو گئے۔

میں تاڑ گیا کہ اب ان سے کوئی بات کرنا مغزپچی کرنے کے برابر ہو گا۔ لہٰذا چائے کا آرڈر دیا۔ چائے پی۔ بال بچوں کی خیریت پُوچھی۔ پنڈی کے موسم کی بات کی۔ ہاں یہ بتانا تو شاید میں بھُول ہی گیا کہ مجھ سے حکیم صاحب کی ملاقات ماہانہ ہے۔ یہ راولپنڈی سے ہر ماہ دو چار دن کے لیے لاہور آیا کرتے ہیں۔ میرے ہاں بھی التزاماً تشریف لاتے ہیں۔

اتنے میں دیکھا کہ حکیم صاحب پھر مُوڈ میں آ گئے۔ بارش بھی ابھی تھمی نہ تھی۔ لیکن ہلکی ضرور ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ بھی آہستہ آہستہ کہنے لگے:

"کجن مجُھ پر بڑا اعتماد کرتی تھی۔ وُہ اپنے سارے معاملات میں، بذریعہ خط و کتابت مجھ سے مشورے کیا کرتی تھی ایک دن اس نے مجھے لکھا کہ میں نے نوکری چھوڑ دی ہے اپنا تھیئٹر بنانا چاہتی ہُوں، مجھے بتائیے کہ میں کیا کیا کروں؟ اور یہ بھی لکھا کہ "مَیں آپ کے بنائے ہُوئے پروگرام پر عمل کروں گی۔"

حکیم صاحب نے کہا:

"یہ اس کی عنایت تھی کہ اس نے مجُھ سے یہ سب کچُھ پُوچھا، ورنہ کلکتے میں اس فن کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے۔

میں نے کجن کو لکھا کہ تھئیٹر کے پرانے طریقے[1] کو ختم کیا جائے۔"

اُن دنوں ایک دن میں ایک شو ہوتا تھا۔ مَیں نے لکھا ایک دن میں دو شو ہونے چاہئیں۔ میں نے تجویز کیا کہ پہلا شو ساڑھے تین بجے شروع ہو کر نو بجے ختم ہو، دُوسرا شو دس بجے شروع ہو کر ڈیڑھ بجے ختم ہو۔

جب کجن نے اس تجویز کو دُوسرے لوگوں کے سامنے رکھا تو سب نے مخالفت کی۔ ایک آدمی ایسا نہ تھا جس نے میری رائے کی تائید کی ہو۔ سب یہی کہتے تھے: تباہ ہو جاؤ گی۔ لیکن کجن نے جواب دیا: میں وہی کروں گی جس کا مشورہ حکیم صاحب نے دیا ہے، اس لیے کہ میرا ایمان ہے کہ وُہ مجھے غلط مشورہ نہیں دے سکتے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ ایک دن میں دو شو ہوں گے تو میں نے ڈراموں کے غیر ضروری حصّوں کو حذف کر کے

---

[1] تھئیٹر کے سلسلے میں حکیم صاحب کی معلومات وسیع ہیں۔ افسوس کہ ان سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ جوہر اس میدان میں دکھاتے۔ کُل دو تین ہی تو آدمی ہیں جو اس باب میں کچھ جانتے ہیں: ایک حکیم احمد شجاع، دوسرے امتیاز علی تاج اور تیسرے یہ!

انھیں مختصر کردیا۔ اس سے یہ ہُوا کہ ڈراموں میں اور زور پیدا ہوگیا۔ نئے ڈرامے بھی اسی نہج پر لکھوائے۔ چنانچہ تھیٹریکل کمپنی نے بنارس، لاہور، امرت سر، ملتان، سکھر اور حیدر آباد میں اپنے ڈرامے کھیلے جو بے حد کامیاب ہُوئے۔ لاکھوں روپیہ کمایا، لاکھوں لاکھ!

لاہور میں اس تھیٹریکل کمپنی کا قیام چار پانچ مہینے رہا۔ ایک دھوم مچی ہُوئی تھی۔ کمپنی کی مقبولیت پر میں بہت خوش ہُوا کرتا تھا۔

جس دن کجن اپنی کمپنی کو لے کر لاہور پہنچی تھی اس دن لاہور ریلوے اسٹیشن پر اتنی پبلک تھی کہ تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چنانچہ ہم کجن کو پچھلی طرف سے لے کر نکلے۔ ورنہ وہ کچلی جاتی۔ مرجاتی!

یہاں حکیم صاحب نے پھر رُخ بدلا۔ پھر پری لی۔ انھیں پھر آغا حشر نے دبوچ لیا۔ ذہنی طور پر، میں جانتا تھا کہ وُہ کجن کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں ہمیں کہہ دیں۔ مگر میں نے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں سلسلہ منقطع نہ ہوجائے۔ حکیم صاحب تھک چکے تھے۔ میں ڈر رہا تھا۔ ویسے جہاں تک میرا خیال ہے مجھے تو یہ "ڈبل ٹریک" سلسلہ پسند ہے۔

انہوں نے کہا: آغا حشر سے تھیٹروں اور ڈراموں پر اکثر بات چیت ہوتی تھی۔ ایک رات میں سویا ہُوا تھا۔ مجھے سوتے سے جگایا۔ کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ اُسی وقت باہر سے آئے تھے۔ میرے سامنے پانچ ہزار کے نوٹ ڈھیر کر دیئے۔ کہا:

"ابھی سالے سیٹھ سے معاہدہ کر کے آیا ہُوں۔"

میں نے کہا:

"پانچ ہزار؟"

"یہ تو پیشگی ہیں۔ جب ایک سین لکھ لُوں گا تو اتنے ہی روپے اور لُوں گا۔ جب فلم مکمل ہوگی تو سیٹھ مجھے پندرہ بیس ہزار سے زاید دے چکا ہوگا۔"

پھر کہنے لگے:

"آغا صاحب کی مالکان تھیٹر پر اتنی مضبوط گرفت تھی کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ جو چاہتے تھے منوا لیتے تھے۔ سیٹھوں کو دھتکے دیتے تھے۔ مگر وہ ڈراما آغا حشر ہی کا حاصل کرتے تھے۔"

ایک تھیٹریکل کمپنی کے مالک نے اُن سے از رُوِ مذاق یہ کہہ دیا:

"آغا صاحب! آپ کو اپنے ڈرامے پر ناز ہے، ہمیں اپنے روپے پر ناز ہے۔ اگر ہم ایک ناٹک پر دو تین لاکھ روپیہ صرف نہ کریں تو اتنی آمدنی نہیں ہوسکتی۔ یہ ہمارا روپیہ ہے جو روپے کو کھینچتا ہے اور آپ کے ڈرامے قبولیت پاتے ہیں؟"

آغا صاحب نے غصّے میں آکر کہا :

" تمہاری بہن کی.... آپ بکواس کر رہے ہیں، جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ میرا ڈراما ہی ہے جس کی وجہ سے خلقت کھنچی چلی آتی ہے اور آپ کی تجوریاں بھر رہی ہیں "

انہوں نے کہا :

"اب میں ایک ایسا ڈراما لکھوں گا جس میں آپ کا کچھ خرچ نہ آئے گا مگر اس کی آمدنی پہلے ڈراموں سے زیادہ ہو گی "

آغا صاحب اُسی وقت غصّے میں اُٹھ کر وہاں سے چلے آئے۔ رات کو ڈراما لکھوانا شروع کر دیا۔ اُس ڈرامے کا نام تھا " دھرمی بالک "۔ یہ کھیل ایک یتیم خانے سے شروع ہوتا تھا، جہاں چند یتیم بچے پڑھتے تھے جن کے کھدر کے کپڑے تھے، کھدر کی ٹوپیاں اور معمولی چپلیں!

نہ اسٹیج پر محل بنے، نہ بھڑکدار لباس کی ضرورت پڑی۔ نہ طمطراق کی ضرورت تھی نہ شان و شوکت کی۔ مگر پبلک کی پسندیدگی کا یہ عالم رہا کہ وُہ کھیل کلکتہ کی اسٹیج پر تین سال تک مسلسل کھیلا گیا اور اس کی آمدنی پہلے کھیلوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔

اِسی طرح آغا صاحب کی تکرار چند مشہور ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے ہو گئی۔ انہوں نے کہا : "یہ سب کچھ ہم کرتے ہیں تو مقبولیت آپ کو ہوتی ہے۔ اگر ہم اتنی جان نہ ماریں، اتنی محنت نہ کریں تو آپ کو کوئی بھی نہ پُوچھے "

آغا صاحب نے حسبِ معمول سب کو ماں بہن کی گالیاں دِیں اور کہا :

" آیندہ جو ڈراما لکھوں گا اُس میں نہ کوئی ڈائرکٹر ہو گا، نہ ہیرو، نہ ہیروئن، صرف پردے اُٹھانے والے قُلی ہوں گے "

چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ آغا صاحب نے جو بات کہی تھی وُہ سچ بھی کر دکھائی، ایک ایسا ڈراما بھی لکھ مارا جس میں بڑے ایکٹروں کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وُہ کھیل بھی حسبِ معمول مقبول ہُوا۔ خُوب آمدنی ہُوئی۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ تھیٹر کی دُنیا میں آغا صاحب ہی سب کُچھ تھے۔ وُہ جو چاہتے تھے اُس میدان میں کر کے دکھا دیتے تھے۔

پھر حکیم صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ مَیں اُن دنوں کلکتہ میں کوئی آٹھ روز رہا۔ میں نے آغا صاحب کو خُوئے دلنوازی میں یکتا، بیحد ملنسار اور خوش گفتار پایا، اس کے ساتھ بیحد عالم!

میں نے سوچا، حکیم صاحب آج کی گفتگو کے آخری نکتے پر پہنچ گئے ہیں۔ لہذا پُوچھا :

"حکیم صاحب باتیں بہت ہُوئیں، میری معلومات میں اضافہ بھی ہُوا، مگر اُس غریب 'پچونچ' کے ایڈیٹر کا کیا بنا؟"

"کجن کو سمجھا دیا تھا۔ اس نے مقدمہ واپس لے لیا تھا۔"

لو بھئی! قصہ تو ایڈیٹر "چونچ" کا تھا مگر بات کہاں سے کہاں پہنچی! میں نے تو ان باتوں سے لطف اٹھایا، معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ حکیم صاحب بھی کھلے مگر اس کے باوجود میں نے "کچھ مزید" والی عادت کو ترک نہ کیا۔ مجھ ایسا بندۂ گستاخ بھی کوئی نہ ہو، پوچھ ہی لیا:

"حکیم صاحب! ہم تو آپ کے بارے میں یہی جانتے تھے کہ آپ ادبی میدان کے سرخیل ہیں، مگر یہ ایکٹرسوں سے دوستی کا راز آج ہی کھلا۔"

"میرے تعلقات صرف کجن ہی سے نہ تھے بلکہ سردار اختر، خورشید اور زہرہ سے بھی تھے۔"

میں نے سوچا، "لو بھئی! یہ معاملہ تو بہت دور تک چلا گیا" جبھی تو میں نے حیرت سے کہا "سبحان اللہ!"

حکیم صاحب نے کہا:

"یہاں سبحان اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ان عورتوں سے بڑے تعلقات تھے، اتنے تعلقات کہ جتنا جھوٹ بولا جا سکے۔ مگر میرے تعلقات' ان سے شائستہ تھے، بازاری عورتوں والے نہ تھے۔ میں نے اپنے آپ کو بچایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ان جھمیلوں میں اٹک گیا تو پھر میری ہڈیاں بھی نہ بچیں گی۔ یوں میں 'نیرنگِ خیال' کی وجہ سے سوچتا تھا۔ رسالے نے مجھے بڑا نقصان پہنچایا مگر اس کے تقاضوں نے مجھے ایسی آلائشوں سے بچایا بھی!"

پھر حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جن دنوں کجن، لاہور میں تھیٹر لے کے آئی ہوئی تھی۔ میں ہر روز تھیٹر جایا کرتا تھا۔ تھیٹر کے منیجر نے کجن کی ماں سے کہا:

"حکیم صاحب روز آتے ہیں، کجن بھی حکیم صاحب کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

اس پر کجن کی ماں نے کہا تھا:

"ہم آدمی کی آنکھ پہچانتے ہیں اس لیے ہمیں حکیم صاحب سے کوئی خطرہ نہیں۔"

باتیں کرتے کرتے شام ہو چلی تھی، بارش بھی تھم چکی تھی۔ حکیم صاحب نے کہا:

"آج گھر جانے کا ارادہ نہیں؟"

"کیوں نہیں؟"

"پھر چلیے۔"

راستے میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے پوچھا:

"کجن سے واقفیت کیسے ہوئی تھی؟"

کہنے لگے:

"کجن علم دوست تھی۔ مطالعہ تھا۔ 'نیرنگِ خیال' کی خریدار تھی۔ خط و کتابت میں دوستی ہو گئی۔ ہمارے رسالے کا

سالانہ چندہ پانچ روپے تھا۔ مگر وُہ پچاس روپے بھیجا کرتی تھی۔"

پھر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ گجن کی والدہ آغا حشر کی محبوبہ تھی۔ بہارہ کی رہنے والی تھی جو گجن سے زیادہ خوبصورت تھی۔ پھر حکیم صاحب نے آہ بھری، کہنے لگے: "گجن بے شک ایکٹرس تھی۔ مگر دل و دماغ بڑا خوب صورت پایا تھا۔ اس نے لکھنؤ کے ایک نواب سے شادی کی جس کی آرزو خود نواب صاحب کو تھی۔ گجن نے بھی یہ سوچ کر شادی کی کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے یہی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ مگر نواب جو شریف زادہ تھا ایک ایکٹرس کو دھوکا دے گیا۔ مگر ایکٹرس نے جو کچھ نواب صاحب کے لیے کیا۔ وہ شریف زادی سے شریف زادی بھی نہیں کر سکتی۔ بہرحال چھوڑیئے اس قصے کو، اس معاشرے میں اچھا کون ہے اور برا کون۔ اس کا فیصلہ خاندانی شرافت یا اُجلے لباس سے نہیں کیا جا سکتا۔

حکیم صاحب معمر ہیں مگر ان کا جوش و ولولہ نوجوانوں سے کم نہیں۔ جن دنوں پاک و ہند لڑائی چھڑی ہُوئی تھی اُن دنوں بھی یہ اپنے پروگرام کے مطابق پنڈی سے لاہور آتے رہے۔ کچھ لوگ لاہور سے پنڈی جا رہے تھے مگر یہ پنڈی سے لاہور آتے رہے۔

کوئی آ کے کہتا:

"ہماری فوج فلاں محاذ پر آگے بڑھ گئی ہے۔"

کوئی کہتا، فلاں محاذ پر۔ یہ کہتے، تم لوگ یہ کیوں کہتے ہو کہ فلاں محاذ پر بڑھی، فلاں محاذ پر بڑھی۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہر محاذ پر بڑھی!

ساتھ ہی پُورے جوش کے ساتھ، ہندو ہمیں میدانِ جنگ میں شکست نہ دے گا۔ شکست جب دے گا میز پر بیٹھ کر دے گا۔

پاکستان کی فارن پالیسی پر یہ ہمیشہ خوش ہُوئے۔ ان کے مُنہ سے اکثر سُننے میں آیا فلاں بیرونی مسئلے پر وُہ مارا، فلاں مسئلے پر وُہ مارا۔ یعنی ہندوستان کی سیاسی چالوں کو بے نقاب کر دیا۔ ناصر نے پاکستان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ عربوں کے دل جیت لیے۔ روس کو ہمنوا بنا لیا، وغیرہ وغیرہ!

یہ صدر ایوب کے بڑے زبردست حامی ہیں[1]۔ اگر کوئی کہے کہ صدر نے یہ کام اچھا نہیں کیا یا یہ کہ صدر کے فلاں رشتہ دار نے یہ کیا تو یہ فوراً اس پر جھپٹ پڑتے ہیں:

"تمہیں کیا معلوم، ساری سُنی سنائی باتیں سچی نہیں ہوتیں۔" پھر یہ دلیل بھی، اگر یہ سب کچھ کیا بھی ہو تو ٹھیک ہے اُس نے ہمیں موت کے منہ سے چھینا ہے۔ آئے دن کا سیاسی تماشا ختم ہُوا۔ دُنیا میں ہماری عزت تو بنی وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن کہنے لگے: "ایک تو ہمارے ہاں اناج کی قلت ہے دوسرے ہم لوگ خود بڑے نالائق ہیں۔ چونکہ

---

[1] یہ مضمون ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا تھا۔

اسراف ہماری گھٹی میں پڑ چکا ہے اس لیے یہ مسئلہ قیامت تک حل نہ ہوگا۔"

"وجہ ؟"

"وجہ یہ کہ ہر گھر میں روزانہ ہی ایک ایک دو دو روٹیاں بچ رہتی ہیں۔ لبعض حالتوں میں تین تین چار چار۔ یہ بے تدبیری ہے۔ اگر ہم لوگ آج یہ طے کرلیں کہ اناج ضائع نہ ہونے دیں گے تو ہم کم از کم بھی سال بھر میں تین مہینے کا تو اناج بچا ہی سکتے ہیں۔ اب ہمیں جتنا نو مہینے کے لیے اناج درکار ہے وہ اصل میں سال بھر کے لیے کافی ہے۔"

"آپ نے حساب لگایا ہے کیا ؟"

"جی ہاں !"

"آپ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی سوچتے ہیں ؟"

"یہ بات چھوٹی تو نہیں۔ اگر آپ حساب کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم ہر سال کھربوں روٹیاں ضائع کر دیتے ہیں۔"

"کھربوں کیا ؟"

"بھئی ! ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں کے بعد جو کھربوں ہوتا ہے وہ !"

حکیم صاحب کی دو بیویاں ہیں، دونوں سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں۔ ایک پنڈی میں رہتی ہیں، ایک لاہور میں۔ بڑی بیگم پنڈی میں رہتی ہیں[1] چھوٹی لاہور میں۔ آج کل خود حکیم صاحب پنڈی میں رہتے ہیں بڑی بیگم کے پاس۔ "اصولاً" تو انہیں چھوٹی بیگم کے پاس رہنا چاہیے مگر یہ ایسا نہیں کرتے۔ چونکہ ان کی ہر ادا معقولیت کے ساتھ لگا کھاتی ہے۔ لہٰذا ہوگی اس میں بھی کوئی حکمت !"

لاہور والی چھوٹی بیگم کو روزانہ ایک خط لکھتے ہیں اور ہر ماہ کی پہلی تاریخوں میں لاہور کا ایک چکر بھی لگا لیتے ہیں۔ مقررہ تاریخ پر خرچ دونوں کو دیتے ہیں۔ غرض ان کے اس لین دین میں بھی ایک باضابطگی ہے جس میں کوئی کمی نہیں ہوتی، کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یوں نہ کرتے تو خوشیاں ان کی دشمن بن جاتیں۔

میں نے پوچھا: "دونوں آپس میں لڑتی نہیں ہیں ؟"

"اوّل تو کھٹ پٹ کم ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی یوں ہُوا بھی تو میں نے اُن کے جھگڑوں میں دخل نہیں دیا۔ دونوں ہی خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں میں احتیاط یہ برتتا ہوں کہ ان کے معاملات میں خاموش رہتا ہوں۔ جھگڑا ہوتا رہتا ہے، میں چپ بیٹھا رہتا ہوں۔ سچی کو سچی اور جھوٹی کو جھوٹی نہیں کہتا۔ میرے ان سے خوشگوار تعلقات کا راز یہی ہے۔

---

[1] اب تو ان میں سے بڑی بیگم اللہ کو پیاری ہوگئی ہیں (۱۹ اپریل ۱۹۶۷ء)۔ ناز تخش رضوی نے تاریخِ وفات کہی،

گل ہو گیا ہے چراغِ خانہ

۱۹۶۷ء

ایک دن بڑی لمبی سرد آہ کھینچی، کہا :

" مجھے ادب نے بڑا نقصان پہنچایا، اگر یہ لت مجھے نہ پڑتی تو آج میرا ہمدرد دواخانہ کے بعد، سب سے بڑا دواخانہ ہوتا۔"

میں نے کہا " اگر آپ ادب میں نہ پڑتے تو آپ لاکھوں روپوں کے مالک ضرور ہوتے۔ مگر آپ کی یہ عزت نہ ہوتی جو آج ہے۔ اور پھر یہ کہ آپ کے ادبی کارنامے تو آپ کو مدتوں زندہ رکھیں گے، جب تک اردو ہے۔"

" میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔"

" مایوسی کی وجہ ؟"

" آپ نے اپنے بارے میں جو مضمون لکھا تھا وہ بالکل صحیح ہے کہ زندہ رہتے تو ادب کی خاطر ہزاروں قربانیاں دیں، اسالیب تج دیں، روپے پیسے نچھاور کئے۔ مرگئے تو ایک فقرہ سننے میں آیا کہ :

" مرحوم نے اپنے زمانے میں بڑا کام کیا تھا، اچھے اچھے نمبر نکالے۔"

کیا یہ فقرہ ہماری تمام اذیتوں اور تمام جانکاہیوں کا انعام ہوسکتا ہے ؟"

" جواب دو ؟"

میں کیا جواب دیتا۔

اتنی ہنگامہ آفریں شخصیت کہ جس کا ہر لمحہ اپنے تشخص کے اظہار کے لیے ہی ہو وہ اس حد تک علیحدگی پسند اور قناعت پسند بھی ہوگا ؟ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بہ ظاہر یہ کرشمے عمر کے ہیں، جو سب کے بل نکال ڈالتی ہے۔ مگر یہی اُسی صورت میں ممکن ہے کہ سرشت میں کجی نہ ہو۔ بہرحال اب تو ان کی خاموشی، کنارہ کشی اور صبر و سکون ہی ان کی زندگی کے زیور رہیں۔

ایک دن حکیم صاحب میرے پاس تشریف لائے تو پسینے میں شرابور تھے۔ انتہا درجے کی گرمی تھی۔ اس پر مستزاد شیروانی پہنے ہوئے تھے اور بٹن بھی سارے بند !

میں نے کہا :

" اتنی گرمی میں، آخر اس شیروانی کی کیا ضرورت تھی ؟ "

" ضرورت تھی ! "

" آخر کیوں ؟ "

" اگر میں اس وقت شیروانی پہنے ہُوئے نہ ہوتا تو مجھے پچاس روپے نہیں مل سکتے تھے۔"

" وہ کیسے ؟ "

" میں اس وقت ایک مریض دیکھ کر آرہا ہُوں۔ اُس نے مجھ سے فیس پُوچھی، میں نے پچاس روپے

کہہ دیے، اگر شیروانی پہنے ہُوئے نہ ہوتا تو وہ مجھے بیس روپے بھی نہ دیتا۔"

"ایسے سہاروں پر یقین نہ رکھیں۔ اگر آپ میں کوئی جوہر ہے تو وہ قیمت ڈلوائے گا، کپڑوں سے کیا ہوتا ہے۔"

"میں مہاتما گاندھی نہیں ہُوں کہ لنگوٹی باندھ کر بھی ———"

"بہر حال قیمت اپنی ڈلوائیے، کپڑوں کی نہیں۔"

تم نے شیخ سعدیؒ کی حکایت پڑھی ہوگی وہ ایک دعوت میں اپنے روزمرہ کے لباس میں چلے گئے تھے۔ ہیئت دیکھی تو دربان نے اندر جانے نہ دیا۔ چنانچہ وہ واپس ہُوئے۔ دوبارہ اچھے کپڑے پہن کے گئے تو کسی نے نہ روکا، کھانے پر بیٹھے تو شیخ سعدی کپڑوں کو کھانے میں بھگونے لگے۔ لوگوں نے پوچھا:

"حضرت! یہ کیا؟"

کہنے لگے:

"یہ دعوت تو کپڑوں کی ہے میری تھوڑی ہے۔"

"حکیم صاحب! یہ حکایت تو میں نے سُن رکھی تھی پھر آپ نے پُوری تفصیل سے کیوں دہرائی؟"

"اس لیے کہ تمھارے خیالات قابلِ اصلاح ہیں۔ اس چکر میں پڑے رہے تو پیچھے رہ جاؤ گے۔ فوراً ایک موٹر خریدو، ہر مہینے ایک دو سُوٹ بنواؤ۔ جتنی زیادہ ٹیپ ٹاپ میں رہو گے لوگ اتنی زیادہ قدر کریں گے۔ کام کرنے کی بھی ضرورت نہیں، صرف باتیں کرنے کا فن سیکھو۔ پھر دیکھو تم کہاں سے کہاں پہنچتے ہو!"

"میں جہاں ہُوں وہیں ٹھیک ہُوں۔"

"میں بھی یہی سوچا کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ آج رو رہا ہُوں۔"

میں نے سوچا یہ تو بڑی اُونچی ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ قناعت کے بھی دعوے دار ہیں حالانکہ اوروں کی طرح انھوں نے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ سوال سُوجھا شیطان نے بھی وسوسے کو تقویت بہم پہنچائی۔

"آپ نے ایک دفعہ حیدر آباد (دکن) کے بارے میں بھی تو ایک نمبر چھاپا تھا جس میں نہ صرف نواب صاحب کے بڑے بڑے فوٹو چھاپے تھے بلکہ شہزادوں اور شہزادیوں تک کے فوٹو چھاپے تھے اور پھر وہاں کے رؤساء اور امراُ کے بھی تو حالاتِ زندگی چھاپے تھے۔"

"ہاں چھاپے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"نواب صاحب تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے اہلِ علم کی خدمت کیا کرتے تھے، ضرور آپ کو بھی نوازا ہوگا جبکہ آپ نے ان کے بارے میں نمبر بھی چھاپا ہو۔"

"میں نے اپنی عادت کے مطابق، نواب صاحب سے کسی قسم کی درخواست کرنی پسند نہیں کی تھی۔"

"خود نواب صاحب نے بھی خیال نہ رکھا ؟"

"رکھا تھا۔"

"کیا ؟"

"میرے پاس ایک خط آیا تھا، جس میں لکھا تھا کہ شاہی فرمان جاری ہوا ہے، جس کے مطابق آپ کی خدمت میں سوا چار روپے بہ طور سالانہ چندہ ارسال کیے جا رہے ہیں۔"

انسان کتنا گھٹیا ہے اور کتنا اعلیٰ۔ اس کے پرکھنے کے معیار اور بھی ہوں گے۔ میرے نزدیک ایک معیار یہ بھی ہے کہ اُسے روپے پیسے کے لین دین کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اس معیار پر بڑے بڑے گھرے ملمّے اُترتے دیکھے گئے ہیں۔ اپنی حکیم صاحب سے نیاز مندی بھی ہے۔ روپے پیسے کا لین دین بھی ہے۔ مجھے تو حکیم صاحب نے اس کا موقع نہیں دیا کہ میں اس ضمن میں ان سے کوئی شکایت کر سکتا۔ اُنھیں ہی مجھ سے کوئی شکایت ہو تو ہو۔

'نقوش' کی بیسویں سالگرہ تھی۔ حکیم صاحب بھی مدعو تھے۔ راولپنڈی سے بہ طورِ خاص آئے تھے۔ پہلی قطار میں بیٹھے تھے، تقریریں ہو رہی تھیں۔ تعریفی جملے پھینکے جا رہے تھے۔

میں نے بھی دیکھا، اوروں نے بھی دیکھا کہ حکیم صاحب کرسی پر بیٹھے ہیں۔ زاویہ یہ ہے کہ چھڑی ہاتھ میں ہے جس کا دوسرا سرا زمین پہ ٹکا رکھا ہے۔ سر جُھکائے، چھڑی پہ جُھکے بیٹھے ہیں۔ جیسے حد درجہ ملول ہوں۔

میں نے سوچا —— نہ جانے ایسے کیوں بیٹھے ہیں۔

جب میں نے اپنے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے جواب دیا:

"آپ بھی کیا بھولے بنتے ہیں حالانکہ جانتے سب کچھ ہیں۔"

"مثلاً ؟"

"مثلاً یہ کہ وُہ سوچتے ہوں گے کہ میں نے بھی اپنے وقت میں کیا کچھ نہ کیا۔ مگر میری اتنی پذیرائی نہ ہُوئی۔ صاحب جوبل تو وہ بھی تھے، پریشان کیوں نہ ہوتے !

بات سچی تھی۔ انہیں ایسا سوچنے کا حق تھا۔ پھر حکیم صاحب مجھے بغیر ملے واپس راولپنڈی چلے گئے۔ کوئی ہفتہ بھر بعد خط آیا، جس میں لکھا تھا سخت بیمار ہُوں، کمر میں اتنا شدید درد ہے کہ تڑپتا رہتا ہُوں۔ اس روز بھی جب کہ 'نقوش' کی تقریب تھی، مَیں ایسی ہی تکلیف میں مبتلا تھا۔ حال یہ تھا کہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ تڑپ رہا تھا مگر دل یہ کہتا تھا کہ یہ تقریب دوست کی ہے۔ جیسے بھی بیٹھ سکتے ہو' بیٹھے رہو۔"

خلوص اور اخلاق کا اس نہج پر بھی ساتھ دینا حکیم صاحب ہی کا کام تھا۔

اس بڑھاپے میں بھی، حکیم صاحب کی آواز میں طنطنہ ہے۔ گفتگو دلچسپ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ

ان کے پاس ماضی کی خوب صورت یادوں کا اثاثہ ہے۔ پھر طرزِ ادا کے سلسلے میں بھی، کچھ تھیٹر کے ایکٹروں کا سا انداز ہے جو ان کے پاس بیٹھ گیا، وُہ انہی کا ہوگیا۔ اسے اخلاق کہیں گے یا جادُوگری؟

میں نے حکیم صاحب سے پُوچھا: "حکیم احمد شجاع نے آپ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ آپ خاکسار بھی رہے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"ایک مدیر اور ادیب، خاکسار۔"

مَیں اس تحریک سے متاثر تھا۔ ان میں جو دوسروں کی خدمت کا جذبہ تھا وُہ بڑا قابلِ قدر تھا۔ میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے معقول لوگ اس تحریک میں شامل ہو رہے ہیں تو میں بھی شامل ہوگیا ایک سپاہی کی حیثیت سے۔ اس تحریک کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ کوئی گُسکٹ[1] نہ سکتا تھا۔ اگر علامہ نے کسی سے ناراض ہو کر اُس کے دُرّے بھی لگا دیے تو اُس نے چُوں نہ کی۔ بڑے بڑے لوگ بھی اُس سزا کو ہنسی خوشی جھیل گئے۔ ایسی تحریک جس نے آزار کو بھی لذت کا درجہ دے دیا ہو مَیں نے نہیں دیکھی۔

علامہ کو علم ہُوا کہ 'نیرنگِ خیال' کا ایڈیٹر تحریک میں شامل ہوگیا ہے تو اُنھوں نے ایک حکم کے ذریعے مجھے بمبئی کا گورنر بنا دیا۔"

"گورنر؟"

"ہاں گورنر! جب میں نے یہ آرڈر سُنا تو ہکا بکا رہ گیا۔ اس آرڈر کے ساتھ حکم یہ بھی تھا کہ بمبئی سے پانچ لاکھ خاکسار بھرتی کئے جائیں۔"

انہی دنوں پشاور کے ایک سپاہی کو بھی یہ حکم ملا تھا کہ آپ کو رنگون کا گورنر بنایا جاتا ہے۔ اُن کا حال تو مجھے معلوم نہیں۔ مگر میں نے سوچا کہ میں اتنے بڑے عہدے کو سنبھال نہیں سکتا اس لیے تحریک سے الگ ہوگیا۔

پھر تبصرہ یُوں بھی کیا کہ:

"علامہ حساب کے ماہر تھے۔ اس مضمون کی بڑی بڑی ڈگریاں ان کے پاس تھیں۔ مگر وہ یہ حساب نہ لگا سکے کہ میری تحریک کا کیا ہوگا!"

یہ علامہ مشرقی کے آرڈر پر بمبئی کے گورنر نہ بنے۔ بنتے بھی کیسے؟ یہ تو خود صحافتی ادب کے وائسرائے تھے۔ اس لیے یہ کیوں اپنے مرتبے سے کم عُہدے پر راضی ہوتے۔

پھر گویا ہُوئے: "میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ آیا ہے، جس کے بارے میں، مَیں آج تک اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ میرا وہ قدم صحیح تھا یا غلط! یہ قصہ اُن دنوں کا ہے کہ جب مسجد شہید گنج کے سلسلے میں، لوگ سر سے

---

[1] یہ لفظ پنجابی کا ہے جس کے معنی دم نہ مار سکنے کے ہیں۔

کفن باندھ کے مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دِلّی دروازے سے لے کر مسجد تک لاکھوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ہر شخص شہادت کا درجہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

انہی دنوں، اکابرین کا ایک جلسہ راولپنڈی میں ہُوا۔ پیر جماعت علی شاہ جو اس جلسے کے صدر تھے اُنھوں نے اعلان کیا کہ یہاں جتنے خفیہ پولیس کے سپاہی موجود ہیں وہ سب کے سب نکل جائیں ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے گا۔"

چنانچہ جتنے سپاہی تھے وُہ چُپکے سے اُٹھے، باہر نکل گئے۔ تب مسجد کے دروازے بند کر دیے گئے اور جلسے کی کارروائی شروع ہُوئی۔ بڑی دُھواں دھار تقریریں ہُوئیں۔ بے حد جوش تھا، سر کٹانے کا جذبہ بیحد راسخ!

مَیں اُسی جلسے کے لیے لاہور سے پنڈی پہنچا تھا۔ تقریریں سُنیں تو میرے دل میں بھی یہ آرزو انگڑائیاں لینے لگی کہ جب موت ہر شخص کے مقدر میں ہے تو کیوں نہ کسی مقصد کے لیے جان دی جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو کام آجانے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ بندۂ خاک تھا۔ باشندۂ آفاق کی جستجو بڑھی۔

جلسہ سُن کر واپس پہنچا تو جہاں مَیں ٹھہرا ہُوا تھا اُس دفتر کے سامنے سے ایک شخص کبھی اِدھر جاتا تھا کبھی اُدھر۔ ساتھ ہی وُہ مجھے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب دو تین مرتبہ یُوں ہُوا تو مَیں نے اُسے بُلایا اور پُوچھا:

"خیر باشد؟"

"آپ حکیم یُوسف حسن ہی ہیں؟"

"جی ہاں!"

"ایک ضروری کام ہے۔"

"فرمایئے۔"

"مجھے لاہور سے ایس، پی صاحب نے بھیجا ہے۔ وُہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں آج کے جلسے کی صحیح رپورٹ سے آگاہ کریں۔"

"کیا تم نے مجھے مخبر سمجھا ہے؟"

"جی نہیں!"

"پھر؟"

"بات یہ ہے کہ آپ کی وساطت سے گورنمنٹ تک صحیح رپورٹ پہنچ جائے گی اور مسلمانوں کے جذبات سے حکومت آگاہ ہو جائے گی اور یہ مسلمانوں کی صحیح معنوں میں خدمت ہو گی۔ وگرنہ کسی غیر مسلم نے غلط سلط رپورٹ دے دی اور حکومت نے اُسے صحیح جان لیا تو مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔"

یہ باتیں سُن کر میں سوچنے لگا کہ میں کیا کروں! بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مسلمانوں کے جذبات، حکومت تک پہنچانے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے اس دن کی ساری کارروائی، تفصیل کے ساتھ، کوئی دس بارہ

صفحوں میں لکھوادی۔ بیشتر اکابرین کی تقریروں کے صحیح صحیح جُملے تک لکھوا دیے۔

دوسرے دن پھر جلسہ تھا۔ میں جلسے سے فارغ ہو کر اپنے میزبان کے ہاں پہنچا۔ اُن سے کہا: میں اپنے ایک عزیز کے ہاں فلاں گاؤں جا رہا ہُوں، دو تین دن تک واپس آؤں گا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ نہ میں یہاں ہُوں گا نہ پولیس مجھ سے رپورٹ لے سکے گی۔ میں گزشتہ دن کی کارروائی سے تذبذب میں تھا، وسوسے میں تھا۔

جس دن مَیں گاؤں پہنچا۔ اُس رات کوئی گیارہ بجے کے قریب وہی صاحب پھر آن دھمکے: "حکیم صاحب! ہم تو آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاگل ہو گئے ہیں!" "آپ سے چھپ کر تو یہاں پہنچا تھا۔ آپ یہاں بھی پہنچ گئے"!

"یُوں نہ سوچیں، آپ کی رپورٹ بڑی مؤثر ثابت ہُوئی۔ ہمارے انسپکٹر جنرل پولیس (جو انگریز ہیں) کہتے ہیں کہ تمام رپورٹوں میں یہی رپورٹ درست معلوم ہوتی ہے باقی سب سُنی سُنائی اور غلط ہیں۔ اُنھوں نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جس شخص نے کل رپورٹ دی تھی اُسی سے آج رپورٹ حاصل کی جائے"۔

"بات یہ ہے کہ میں اس بات کو مناسب نہیں سمجھتا کہ حکومت کا آلۂ کار بنوں"۔

"آلۂ کار بننے کا سوال نہیں، غلط رپورٹ پر غلط کارروائی ہو سکتی ہے۔ ایسی صُورت میں کیا مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچے گا؟"

غرض مَیں نے پھر کارروائی کی تفصیل لکھوادی۔

اس کے بعد حکیم صاحب نے تبصرہ یُوں کیا کہ "مجھے معلوم نہیں کہ میرا وہ قدم جادۂ حق کی جانب تھا یا اس کے برعکس۔ بہرحال اُس واقعہ کی پھانس کو مَیں آج تک نہیں نکال سکا۔ جب بھی وُہ دن یاد آتے ہیں ایک چُبھن سی محسوس کرتا ہُوں"۔

میں نے کہا: "آخر پولیس نے آپ کو اس کام کے لیے چُنا کیوں؟"

"ہاں! آپ کا یہ سوال بڑا اہم ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا چھوٹا بھائی یعسوب الحسن کٹّر کانگریسی تھا حکومت کو اس کے خلاف بڑی شکایتیں تھیں۔ گھر والے مجھے مجبور کرتے تھے کہ یا تو یعسوب الحسن کو سمجھاؤ یا پھر ایس پی پولیس سے کہو کہ وہ یعسوب الحسن کے بارے میں کوئی سخت قدم نہ اُٹھائے۔ چونکہ ان دنوں ایس پی پولیس محمود نظامی مرحوم کے عزیز تھے اس لیے میری نظامی صاحب کی معرفت اُن سے شناسائی تھی"۔

"کیا آپ بھائی کے مستقبل کی وجہ سے، رپورٹیں دینے پر راضی ہُوئے تھے؟"

"بالکل نہیں، اگر مسلمانوں کے مفاد میں، میرے بھائی کو پھانسی بھی لگ جاتی تو مجھے ملال نہ ہوتا اور اگر مسلمانوں کے مفاد میں مجھے بھی پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تو بھی ہنسی خوشی لٹک جاتا"۔

یہ تھا ایک صاحبِ روایت شخصیت کا احوال! کچھ میری کچھ اُن کی زبانی!

شاہد احمد دہلوی

شاہد احمد دہلوی، اِس دنیا میں موجود نہیں۔ اس لیے ان پر مضمون لکھنے کا مزا کیا؟ دوستانہ چُہلیں، زندوں ہی کے ساتھ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ مذہب بھی یہ کہتا ہے کہ مرنے والوں کو اچھے نام سے یاد کرو۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہُوں کہ شاہد صاحب نے مرکر، میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

ارے، یہ کون چلا آرہا ہے۔ شاہد صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ وہی سانوُلا رنگ، وہی قدرے چپٹی ناک، وہی آنکھوں پہ عینک، وہی سر پہ ٹوپی، وہی شیروانی، وہی متوازن قد، وہی چال!

نہیں یہ وُہ تو نہیں، مگر پھبن ویسی ہی تھی۔ ناک نقشہ ویسا تھا۔ طنزیہ مسکراہٹ انہی جیسی تھی۔ وہی ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

زندگی میں ہزاروں لوگ ملتے ہیں مگر ایسے کم ملتے ہیں جن کی ہم عزت کرتے ہیں۔ شاہد صاحب ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

زمانہ ۱۹۴۶ء کا ہے۔ میٹھی زبان میں، دو اشخاص کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ کون کون ہیں یہ، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ میں صرف گفتگو کے سحر کی بنا پر، ایک کونے میں کھڑا ہو کر باتیں سننے لگ گیا تھا۔ عجیب موہنی باتیں تھیں۔

۱۹۴۸ء میں وہی صاحب مجھے لاہور کے ایک ہوٹل میں ملے۔ کسی نے تعارف کرایا: "یہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔" مجھے فوراً جامع مسجد دلّی کے سامنے والی دکان یاد آگئی جس میں یہ حضرت بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رسالہ "ساقی" کے مدیر، اُس وقت کے بڑے معروف آدمی تھے۔

اتفاق کی بات کہ جس ہوٹل میں جا کر ہم بیٹھا کرتے تھے اُسی میں شاہد صاحب بھی باقاعدگی سے آنے لگے۔ تعلقات صرف سلام دعا تک رہے۔

کچھ عرصے کے بعد، شاہد صاحب پھر اُس ہوٹل میں نظر نہ آئے۔ میں نے ان کے ساتھی سے، جو ویسی ہی شیروانی پہنتے تھے پوچھا:

"شاہد صاحب نظر نہیں آتے؟"

جواب ملا "کراچی چلے گئے ہیں۔ اب وہیں سے پرچہ نکالیں گے کیونکہ پنجاب گورنمنٹ نے مسلسل آٹھ ماہ کی جدوجہد کے

بعد بھی، انہیں یہاں سے پرچہ نکالنے کی اجازت نہیں دی۔"

۱۹۵۰ء میں، مجھے بھی سُرخاب کا پر لگ گیا۔ یعنی 'نقوش' کی ادارت میرے حصے میں آئی۔ میں نے بھی انھیں اپنا رسالہ بھیجا۔ رسید کے طور پر، جو ان کا خط ملا تھا اس میں انھوں نے کچھ مبالغے ہی کے ساتھ رسالے کی تعریف کی تھی۔ ہمعصر جب کسی کے لیے کلمۂ خیر کہتا ہے تو اسے کم اہمیت والی بات نہ جانیے۔ کسی کی تعریف کرنے کے لیے شرافت، دیانت اور حوصلہ چاہیے۔ اس اعتبار سے شاہد صاحب اونچے انسان تھے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے میری کوئی فرمایش رد کی ہو۔ مَیں نے اُنھیں جب بھی پکارا اُنھوں نے ہمیشہ لبیک کہا۔ جتنے مضمون شاہد صاحب کے 'نقوش' میں چھپے ہوں گے اتنے شاید ہی کسی دوسرے رسالے میں چھپے ہوں۔ لطیفہ یہ کہ انھوں نے اپنے ہی بعض مضمون 'نقوش' سے 'ساقی' میں نقل کیے۔ ایسے ایثار کی مثال شاذ ملے گی جو اپنی صلاحیتوں کو دوسروں کے لیے مقدم اور اپنے لیے مؤخر جانتے ہوں جبکہ آپ کا ج مہا کاج میں ساری ہی دنیا مبتلا ہو۔

شاہد صاحب میرے ساتھ بڑا اخلوص برتتے تھے۔ بڑی محبت کرتے تھے۔ مگر ایک موقع پر یہ ہُوا کہ اُن کا قلم میرے خلاف حرکت میں آگیا۔ چنانچہ وہ وہ فقرے بازی ہُوئی اور وہ وہ طعن و تشنیع کے تیر برسائے گئے کہ توبہ ہی بھلی۔ میں اقرار کرتا ہُوں کہ میں دوسروں کو بُرا بھلا کہنے میں اُتنا ماہر نہیں جتنا کہ شاہد صاحب تھے۔

قصہ یہ تھا کہ انتخابی پرچوں کے خلاف، ادبی پرچوں کے مدیرانِ کرام نے ایک جائز قسم کی مہم چلائی تھی جس میں مولانا صلاح الدین احمد ایسے بزرگ بھی شامل تھے اور مجھ ایسے خورد بھی۔ وُہ مہم یہ تھی کہ انتخابی پرچوں کے مدیران، مصنّف اور مدیر سے اجازت لیے بغیر، کسی تخلیق کو اپنے رسالے میں نقل نہ کریں۔ چونکہ ایک پرچے پر شاہد صاحب کا نام چھپتا تھا اس لیے وہ میدان میں کُود پڑے۔ ہم دلیلیں دیتے تھے، وہ فقرے بازی کرتے تھے۔ ہم اصول اصول پکارتے تھے۔ وہ ہمیں سمجھاتے تھے میاں! اصول کیسا؟ یہ دَور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا ہے۔ غرض وُہ اپنی زبان دانی اور فقرے بازی کے بل بوتے پر جھوٹا مقدمہ بھی جیت گئے۔ اُن کے حصے میں "مقصد براری" آئی، ہمارے حصے میں "محض اصول!"

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اتنے بھلے آدمی کا آخر یہ رُخ کیا ہے؟ تھا صاحب یہ بھی اُن کی شخصیت کا ایک رُخ، ادبی خلیفہ تو وُہ تھے ہی، تھوڑی سی دریائی میں ہوا سے باتیں کرنے لگ جاتے تھے۔ ویسے بھی معرکہ آرائی کو، اُن کے مزاج سے نسبت تھی بھی!

یہ باتیں وُہ ہیں کہ جو میں نے شاہد صاحب کی زندگی میں بھی اُن سے کہی تھیں۔ میرے نزدیک کسی کا اِس دنیا میں ہونا یا نہ ہونا، صداقتوں کے اظہار کے سلسلے میں روک نہیں بن سکتا۔ شاہد صاحب کے ایسے جتنے بھی معرکے ہوئے وہ ہم "بے زبان" پنجابیوں کے ساتھ، مگر آخر میں وہ اس داغ کو دھو گئے۔ جوش ملیح آبادی کے خلاف نمبر نکال ڈالا۔

یہ طنطنہ ان کا یُونہی تو نہ تھا۔ کسی بنیاد پر استوار تھا۔ ۱۹۵۹ء میں رائٹرز گلڈ بنا تو یہ اس کے کرتا دھرتا، ۱۹۲۶ء میں سجاد ظہیر اور اختر حسین رائے پوری کے اشتراک سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی دہلی میں شاخ قائم ہُوئی تو یہ اس کے

سیکرٹری، ۱۹۴۲ء میں کرشن چندر اور رواتسین کے ساتھ مل کر، دلّی کی ہارڈنگ لائبریری میں آل انڈیا رائٹرز کانفرنس کا انعقاد ہوا تو وہ ان کی توجہ سے، ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ادب میں تجدد کا غلغلہ بلند ہوا تو شاہد صاحب پیش پیش، جو شخص اس حد تک ادبی چودھری ہو وہ کسی کی سُنے بھی کیوں ؟ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے حق دار تھے کہ جدھر سے بھی گزریں لوگ یہی کہیں باادب باملاحظہ ہوشیار!

پرکھ کا وقت آیا تو بھی ان کے قدم پیچھے نہ ہٹے، عصمت چغتائی کی "چوٹیں" اور سعادت حسن منٹو کا "دھواں" شائع کرنے پر لاہور میں مقدمہ چلا۔ دہلی سے تیرہ مرتبہ لاہور آنا پڑا، وہ بھی پُورے اسٹاف کے ساتھ۔ مگر ان کے ماتھے پر تیوری نہ تھی۔ ہٹ کے پکے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شوربے کو چپاتی چوس نہ سکی۔

۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدہ کا انتقال ہوگیا۔ والد نے ان کی دیکھ بھال کے لیے یورپین گورنس رکھی جس کی وجہ سے ان کی بنیادی انگریزی اچھی ہوگئی اور یہ بھی کہ اس زبان سے لگاؤ پیدا ہُوا۔ یہی وجہ تھی کہ قلم اُٹھاتے تھے اور انگریزی مضامین کا ترجمہ کر ڈالتے تھے۔ ترجمہ کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ بڑے بڑے مار کھا گئے۔ مگر انہوں نے درجنوں ہی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ وہ بھی اصل کی رُوح کو سمجھ کر، اپنی دل نشین اردو میں، ترجموں میں یا تو عنایت اللہ دہلوی کا لطف آیا یا پھر ان کا، باقیوں نے تو وقت گزارنے کے لیے ترجمے کیے مگر مولوی مدن والی بات پیدا نہ ہُوئی۔ یا اگر کسی نے اچھا ترجمہ کیا بھی، تو وہ بھی ایک آدھ کتاب کا، جیسے مولوی ظفر علی خاں نے، عبدالمجید سالک نے، ڈاکٹر عابد حسین نے، پطرس بخاری نے۔ یہاں بحث معیار اور مقدار دونوں سے ہے۔

ہاں تو ذکر ان کے بچپن اور ان کی تعلیم کا ہو رہا تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم حیدر آباد دکن میں پائی۔ پھر علی گڑھ میں، میٹرک عربک اسکول دلّی سے کیا۔ لاہور کے ایف سی کالج سے ایف۔ ایس سی کیا۔ آخر میں مشن کالج سے بی اے آنرز کی ڈگری لی۔

شاہد صاحب کے بہنوئی، ڈاکٹر اجمل حسین صاحب کنگ ایڈورڈ کالج (لاہور) میں پروفیسر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شاہد میاں ڈاکٹر بنیں۔ تھوڑا عرصہ پڑھا بھی، چونکہ یہ بنیادی طور پر بے حد رقیق القلب تھے۔ اس لیے مُردوں کی چیر پھاڑ سے بھاگے۔ بھاگے بھی ایسے کہ دلّی جا کر دم لیا۔

جن دنوں یہ دہلی کے مشن کالج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے درپے تھے۔ انہی دنوں، انہوں نے اپنا رسالہ "ساقی" جاری کیا۔ غالباً ۱۹۳۰ء میں، جب سے آخری دم تک، ادب کے ساتھ اپنا رشتہ نباہا۔ نہ صرف نباہا بلکہ حق ادا کیا۔

رسالہ نکالنے کا تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ "مائی خدائی مار"۔ چنانچہ جیسے جیسے ساقی لوگوں کی نظروں میں چڑھتا گیا، توں توں جمع جتھا ختم ہوتا گیا۔ ایک دن شاہد صاحب کے ماموں (جن کے پاس ساقی کے مالی امور تھے) سید اشتیاق حسین چشتی نے بتایا: برخوردار! تم نے باوا جان کی اتنی دولت، اب تک برباد کر دی ہے، سنبھل جاؤ ورنہ ہوا کھاؤ۔

تب شاہد صاحب کے دوستوں کی کابینہ بیٹھی۔ غور و خوض ہوا۔ طے یہ پایا کہ رسالے کے ساتھ پبلشنگ ہاؤس کا

بھی کام کیا جائے۔ بڑے بڑے ادیب گھر کے تھے۔ پرانے اور اچھے لکھنے والوں سے شاہد صاحب کے مراسم تھے، بلکہ جو نئے لکھنے والوں کا سکہ رواں تھا اُن میں سے بیشتر کو "ساقی" نے اجالا تھا۔

یُوں کہیں جا کر رسالے کے سنبھلنے کے آثار پیدا ہوئے۔ کتابیں بھی چھپتی رہیں۔ رسالہ بھی نکلتا رہا۔ ان دنوں ترقی پسند ادب کا طوطی بول رہا تھا۔ شاہد صاحب ایسے لٹریچر کے مربیوں میں سے تھے۔ لہٰذا خوب کاروبار چمکا۔ ادیبوں کی بھی خدمت ہُوئی، ادب کی بھی!

پاکستان بنا تو یہ صرف اپنا قلم اٹھا کر اِدھر چلے آئے تھے۔ بنی تو دال روٹی کے چکر میں، اُسی کو گھساتے رہے۔ آخری دم تک، اُسی کی روٹی کھائی۔

سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے، جب ادھر پبلشنگ ہاؤس کا کام نہ چلا تو انہوں نے سوچا مستحق ادیبوں کو یا ان کے ورثاء کو کتابوں کے حقوق لوٹا دیے جائیں تاکہ انھیں کچھ مالی آسودگی ہو جائے اور کتابیں بھی بازار میں آجائیں۔ یہ حوصلہ بھی کسی کسی کا ہوتا ہے کہ اپنی خریدی ہُوئی چیز کو کوئی یُوں بغیر داموں واپس کر دے۔ اس موضوع پر کسی نے ان سے بات کی بھی تھی۔ جواب میں اُنھوں نے کہا تھا کہ پاکستان آکر مجھے معلوم ہُوا ہے کہ غربت کیا چیز ہوتی ہے۔ میرے پاس اور تو کچھ ہے نہیں۔ یہی کتابوں کے حقوق ہیں۔ سوچا، یہی ساتھیوں کو واپس کر دوں۔

انھیں ادبی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے۔ جغادری ادیب کے پوتے، پھر بشیر الدین احمد کے صاحبزادے! جن کی ادبی حیثیت نہ صرف مسلّم تھی بلکہ حد درجہ واجب التعظیم بھی۔ انھوں نے "واقعات دار الحکومت دہلی" ایک ایسی کتاب (تین جلدوں میں) لکھ دی ہے کہ کیا اس سے بہتر کوئی لکھ سکے گا۔ یہ اکیلی کتاب ہی ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جو بڑی لمبی زندگی پائے گی۔ دتی پر کچھ لکھنے کے لیے اس کتاب کو چھو لینے والا ٹھوکر کھائے گا، موتی نہ رولے گا۔

پھر اسی قسم کی ایک اور کتاب "تاریخ بیجاپور" لکھی۔ اس کا بھی حق ادا کیا۔ مگر یہ کوشش "واقعات دار الحکومت دہلی" سے بالا تو نہیں، فروتر ہے مگر اس فروتر کا بھی مرتبہ یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کچھ کہنے والا پیدا ہوگا تو اسے لوہے کے چنے چبانے ہوں گے۔ اسی طرح کا ان کا ایک اور کارنامہ "فرامینِ سلاطین" ہے جو مغل بادشاہوں کے فرامین پر مشتمل، ایک قیمتی دستاویز ہے۔

باپ نے (ڈپٹی نذیر احمد نے) "مرأۃ العروس" لکھی تو بیٹے نے (بشیر الدین احمد نے) اُسی طرز پر "اقبال دلہن" لکھی۔ بشیر الدین جو کچھ بھی تھے اپنی جگہ بھاری پتھر تھے مگر ڈپٹی نذیر احمد تو نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "اقبال دلہن" کو زیادہ شہرت کے پَر نہ لگے۔

بشیر الدین احمد نے اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔ چند ایک کے نام لکھتا ہُوں۔ میرا موضوع ریسرچ بگھارنا نہیں۔ اس لئے زیادہ گہرا غوطہ لگانے کا ارادہ نہیں مگر پس منظر کے طور پر کچھ عرض کرنا ہی تھا تاکہ شاہد صاحب کی پشت پر ذہانتوں اور کاوشوں کا جو بوجھ لدا ہُوا تھا وہ تو نظر آتا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بشیر الدین احمد نے اور بھی کتابیں لکھیں ایک خاص خاکے کو ذہن میں رکھ کر، محض معاشرے کی اصلاح کی خاطر، ذہنوں کے جلا کی خاطر۔ بچّوں کے لیے جو کتاب لکھی اس کا نام تھا "حرزِ طفلاں"۔ جوانوں کے لیے جو کتاب لکھی وُہ تھی "نشاطِ عمر"۔ بوڑھوں کے لیے جو کچھ لکھا وہ تھا "عصائے پیری" کے نام سے!

اور ہاں یہ بات تو بھُول ہی گیا کہ بشیر الدین احمد باپ کی طرح شعر بھی کہتے تھے۔ "دیوانِ بشیر" ان کی منظومات کا مجموعہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ جب دیوانِ بشیر چھپ کر آیا تو گھر میں باتیں ہونے لگیں دیوانِ بشیر آگیا، دیوانِ بشیر آگیا۔ تو ان کی بچّی نے (شاہد صاحب کی بہن نے) کہا:

"ہمارے ابّا دیوانے کیوں ہونے لگے، کہنے والا ہی دیوانہ ہوگا۔"

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شاہد احمد ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا تھا، جس نے درجنوں زندہ کتابیں لکھیں۔ جب تک اردو زندہ ہے ڈپٹی نذیر احمد کی تحریریں روشنی دیتی ہی رہیں گی۔ لوگ فیض پاتے ہی رہیں گے۔ ان کے بیٹے نے جو کچھ لکھا وہ باپ سے کم تر درجے کی تحریریں ہیں، مگر زندہ وہ بھی رہیں گی۔ کم از کم تاریخی نوعیت کے کام، اصلاحی سلسلے کی تحریریں مار کھا جائیں تو کھا جائیں، پوتے نے جو کچھ لکھا وہ نہ باپ کی ٹکر کا ہے اور نہ دادا کی ٹکر کا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں ان کی تحریروں کی قیمت پڑ رہی ہے۔

ستم کی بات یہ بھی ہے کہ شاہد صاحب پر، اس خاندان کی علم و فن والی برتری بھی ختم ہو گئی۔ شاہد صاحب کی اولاد میں مجھے تو کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو قلم تھام کے کہہ دے کہ میں ابھی زندہ ہُوں۔

مَیں نے سُنا ہے کہ شاہد صاحب موسیقی کے بھی بڑے اُستاد تھے۔ مجھے نہ تو اس فن کی شُد بُد اس وقت تھی اور نہ آج ہے اس لیے مَیں اُن کے مرتبے کو نہیں جان سکتا۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں فنِ موسیقی پر ایک مذاکرہ ہُوا تھا شاہد صاحب کو خاص طور سے کراچی سے بُلایا گیا۔ جس سہ پہر کو انھوں نے مقالہ پڑھنا تھا اس کی صبح مجھ سے فرمایا میں مقالہ پڑھ رہا ہُوں، پاکستان کونسل پہنچنا۔ اُس وقت میں نے اُن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا تھا جیسے کوئی مظلوم یہ سمجھا رہا ہو، میری جان بخش دیجئے۔ مجھے کوئی اور سزا دے دیجئے لیکن موسیقی پر مقالہ نہ سنوائیے۔ مگر وہ نہیں مانتے تھے۔ وہاں ایک مقالہ چھوڑ کئی مقالے سُننے پڑے۔ مضمون نگار مقالہ پڑھتا تھا۔ سامعین سوالات کرتے تھے۔ (سوالات نہیں اعتراضات) جن کا جواب دینا پڑتا تھا، شاہد صاحب پہلے تو اعتراضات کے جوابات دیتے رہے۔ پھر قدرے "سُرخ رُو" ہو گئے۔ بعد میں مجھے کہا سب.... اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ کیا جانیں موسیقی کس چڑیا کا نام ہے!

ان کے اس شوق کے متعلق معلوم یہ ہُوا کہ انھوں نے مذاق ہی مذاق میں گانا سیکھا تھا۔ وہ یُوں کہ چند دوست بیٹھے تھے ایک دم ترنگ میں آگئے۔ انصار ناصری نے کہا: میں طبلہ بجاتا ہُوں۔ شاہد احمد دہلوی نے کہا: میں ہارمونیم بجاتا ہُوں۔ کسی نے کہا: میں گاتا ہُوں۔ یُوں چوکی پُوری ہو گئی۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دا۔ نی۔ سا شروع،

یَمک دَیا، ہَمک دَیا چالو!

کیا معلوم تھا کہ وقتی اُبال رنگ لائے گا۔ جُوں جُوں مذاق بڑھتا گیا یہ گویّے بنتے چلے گئے۔ ایک وقت وہ آیا کہ لوگوں نے محسوس کیا کہ شاہد صاحب تو مذاق کی حدیں پھاند کر فنکار بن گئے ہیں۔ تب انہوں نے استاد پکڑا، جو قریب ہی مل گئے۔ چار پیسے ڈولی پر گھر والی بات ہو گئی۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وُہ بھی پُوری ہو گئی۔ خوب خوب ریاض ہوئے غرض غریب گلے کی خوب شامت آ ئی۔

شاہد صاحب کی آواز تو اچھّی نہ تھی مگر فن سے پُوری طرح آگاہ تھے۔ تال سُر کے استاد، جب پاکستان میں عُسرت کی زندگی گزارنی پڑی تو ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا، گویا بن کر، پیٹ کے لیے ایندھن مہیّا کرتا رہا۔ شوق روزگار بن گیا پھر تو یہاں تک ہُوا کہ پاکستان کی نمایندگی بیرونِ ملک بھی جا کر کی۔ پاکستان میوزک اکیڈمی کے صدر جو تھے۔

موسیقی کے استاد عام طور پر گا کے فن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ مگر وُہ راگ راگنیوں کو تحریر میں نہیں لا سکتے۔ چونکہ یہ پڑھے لکھے تھے اس لیے بڑے ہی دل نشین انداز میں، انھوں نے فن کے بارے لکھا بھی۔ اگر کوئی صاحب ان کے موسیقی پر مضمون اکٹھا کرنا چاہیں گے تو وُہ بڑی آسانی کے ساتھ ایک کتاب چھاپ سکیں گے۔ اس فن پر نہ ان کے باپ نے کتاب لکھی نہ دادا نے، بزرگوں پر فضیلت پائی بھی تو کس فن میں؟

موسیقی میں مبتلا ہونے یا اسے آمدنی کا ذریعہ بنانے کی مجبوری وُہ حالات تھے جن سے دوچار ہو کر انھیں پاکستان آن پڑا۔ پاکستان کن حالات میں آنا پڑا، وُہ بھی انھی کی زبانی سُنیے۔ مرثیوں میں جس طرح مرثیہ انیسؔ کا ہے اُسی طرح فسادات نوحوں میں نوحہ شاہد احمد کا ہے۔ صرف چند سطریں ملاحظہ ہوں:

"توبہ توبہ! تھُو تھُو! شیطان کے کان بہرے — اب سے دُور دلّی پر وہ پیغمبری وقت پڑا کہ خلقِ خدا تراہ تراہ پکار اُٹھی وہ بیرا کھیری مچی کہ مرد، عورت، بچّے، بُوڑھے سب کھیرے ککڑی کی طرح کاٹے جانے لگے۔ انسانیت دم توڑ چکی تھی اور فتنہ و فساد کا شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا تھا۔ دلّی کے بازاروں میں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا ہُو کا عالم ہو گیا تھا۔ جہاں لچھمی دھن برساتی تھی وہاں بھیروں ناچ رہا تھا۔"

شاہد صاحب میں دوسروں کی خدمت کا جذبہ بڑا وافر تھا وہ ہر ملنے والے کی خدمت ہی کرنا چاہتے تھے وہ سب کی بھلائی کے لیے سوچتے تھے ایک دو نہیں درجنوں ہی ملنے والوں کی زندگی سنوار دی۔ مثال کے طور پر فضل حق قریشی دلّی میونسپلٹی میں ملازم تھے معمولی تنخواہ پر، انھوں نے قریشی صاحب میں "ادبی جراثیم" دیکھے تو انہیں وہاں سے اُچکا، ساقی میں جگہ دے دی۔

تھوڑے عرصے بعد، جب قریشی صاحب کا مذاقِ ادب سنور گیا تو ان کی مانگ بھی بڑھی۔ آغا اواشی نے انھیں "آج کل" کے لیے چاہا۔ تنخواہ کے بڑھاوے کی چھوٹ دی۔

فضل حق قریشی نے سہمتے ڈرتے شاہد صاحب سے ذکر کیا کہ "آغا صاحب مجھے لینا چاہتے ہیں تنخواہ بھی زیادہ دینے کے لیے کہتے ہیں۔ آپ کا کیا حکم ہے؟

شاہد صاحب نے کہا "میں تو تمہاری ترقی چاہتا تھا اس لیے میونسپلٹی چھڑوائی تھی۔ شوق سے اس پیش کش کو قبول کرلو، مجھے خوشی ہوگی۔"

یہ تو ایک قصہ ہے اور نہ جانے ایسے کتنے قصے ہوں گے۔ آوارہ حیدر آبادی، تابش دہلوی، انصار ناصری، اخلاق احمد دہلوی، خمار دہلوی، شمس زبیری یہ سب کے سب اُنہی کے لگائے ہُوئے پودے ہیں۔ انھیں شاہد صاحب پر ناز تھا۔ شاہد صاحب کو ان پر ناز تھا۔ اس ضمن میں المیہ یہ ہے کہ اپنے بچّوں کے لیے کچھ نہ کیا۔ دس بچّے، جن میں تین لڑکے اور سات لڑکیاں۔ یہ سب کے سب اُس چیز کی بھینٹ چڑھ گئے، جسے اگلے وقتوں کے لوگ خودداری کہتے تھے اور آج کل کے لوگ بے وقوفی!

شاہد صاحب وضعدار اتنے تھے کہ زندگی میں جو معمول بنالیا، بس بنالیا۔ اُس کی ایک مثال یہ بھی ہے،

شاہد صاحب روزانہ چار پانچ بجے کے درمیان، کتب خانہ علم و ادب (دہلی) میں پہنچ کر، رات کے سات آٹھ بجے تک رہا کرتے تھے۔ آندھی آئے یا طوفان، شاہد صاحب پہنچتے ضرور تھے۔ حتیٰ کہ عید بقر عید کا بھی ناغہ نہ ہوا۔ کتب خانہ میں اور لوگ بھی آیا کرتے تھے۔ چار بجے سے پہلے کتب خانہ، کتب خانہ ہوتا تھا۔ چار بجے کے بعد "ادبی اڈا" بن جاتا تھا۔ باقاعدہ پہنچنے والوں میں انصار ناصری، فضل حق قریشی، ظفر قریشی، اخلاق احمد دہلوی، صادق الخیری اور نہال سیوہاروی تھے۔

باہر سے کوئی ادیب آتا تھا تو وہ بھی شام کے وقت کتب خانہ علم و ادب میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا وہاں ایک ساتھ بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہوجائے گی۔ یُوں اُس دکان پر شاہد صاحب کی وجہ سے ہندوستان بھر کے ادیب اور شاعر اکٹھے ہوتے رہے۔ اپنی کہتے اور دُوسروں کی سُنتے رہے۔ دلچسپ صحبتیں تھیں وُہ! ایک بار میں نے شاہد صاحب سے انھی صحبتوں کا ذکر کیا تھا تو انھوں نے مختصراً اتنا کہا تھا: ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے، ہمنشیں!
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

شاہد صاحب شاعروں سے بہت بھاگتے تھے۔ مگر یہ لوگ اُس دن کی طرح آج بھی خوش مذاق لوگوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اپنا کہا سناتے ہیں۔ کوئی خوش دلی سے سُن لے تو بے دلی سے سُنے تو سناتے ضرور ہیں۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے شاہد صاحب نے ایک اصول نافذ کر رکھا تھا۔

اگر کوئی شاعر، اپنے شعر سنانا چاہتا ہے تو وہ بے شک سنائے۔ مگر شرط یہ ہے کہ سامعین کو ایک ایک، چائے کا کپ پلائے اور اگر کوئی شاعر اپنے شعر ترنّم سے سنانا چاہتا ہے تو وُہ چائے کے ساتھ کچھ کھلائے بھی۔ یہی وجہ تھی کہ کتب خانہ علم و ادب میں کوئی شخص، جرمانہ ادا کیے بغیر شعر نہیں سنا سکتا تھا۔

کبھی کبھی کوئی شاعر، چالاکی سے سادہ چائے منگوا کر، تحت اللفظ پڑھنا شروع کردیتا تو شاہد صاحب کہتے

"اماں یار، تحت اللفظ کیوں پڑھ رہے ہو۔ ہمیں تو بھوک لگی ہے۔ پڑھنا ہے تو ترنّم سے پڑھو۔ ورنہ ہماری اشتہا میں اضافہ نہ کرو۔"

شاہد صاحب کے یُوں تو کئی ادیبوں اور شاعروں سے مراسم تھے مگر دو کے ساتھ بڑی خصوصیت تھی۔ ایک مولوی عنایت اللہ دہلوی سے، دُوسرے عظیم بیگ چغتائی سے!

مولوی عنایت اللہ شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ کے بیٹے تھے۔ مترجم اس بلا کے تھے کہ ہزاروں صفحات ترجمہ کر ڈالے۔ فاضل اتنے تھے کہ چاہتے تو متعدد طبعزاد کتابیں لکھ ڈالتے، مگر انھوں نے کیے تو صرف ترجمے ہی کیے۔ وہ بھی زیادہ تر شاہد صاحب کے لیے!

عظیم بیگ چغتائی کو بھی شاہد صاحب سے بڑی محبت تھی۔ شاہد صاحب بھی ضرورت کے وقت مالی امداد سے ہاتھ نہ کھینچتے تھے۔ ایک مرتبہ عظیم بیگ بیمار ہُوئے۔ شاہد صاحب کو اپنی دل بستگی کے لیے بُلایا۔ ان کے پہنچتے ہی وہ اپنی بیماری بُھول گئے اور شاہد صاحب کی خوشنودی کے لیے افسانے لکھوانے شروع کر دیے (کیونکہ کمزوری کی وجہ سے خود لکھنے سے معذور تھے) جس دن شاہد صاحب واپس چلنے کے لیے کہتے وُہ انھیں ایک اور مضمون لکھوا دینے کا لالچ دے دیتے۔ یُوں ان کی محبت اور ان کے لالچ کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک پُورے چغتائی نمبر کا مواد اکٹھا ہو گیا۔ چنانچہ چھپا ساقی کا "چغتائی نمبر"!

شاہد صاحب جوشؔ صاحب کے خلاف ایک نمبر نکالنا چاہتے تھے۔ میں اُنھیں منع کرتا تھا مگر وہ مان نہیں رہے تھے۔ اس سلسلے میں میری ان سے خاصی لمبی چوڑی خط و کتابت ہُوئی تھی۔ شاہد صاحب مجھ سے بھی جوشؔ صاحب کے بارے میں مضمون چاہتے تھے۔ میں ان سے کہتا تھا میرے مضمون لکھنے کا کیا سوال! آپ بھی جو کچھ کر رہے ہیں زیادتی کر رہے ہیں کچّا دودھ کس نے نہیں پیا؟ لہٰذا اس مسئلے پر "مٹی ڈالیے"، مگر شاہد صاحب اس مسئلے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔

جب شاہد صاحب کا مضمون کے سلسلے میں اصرار بڑھا تو مَیں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے ان سے کہا: اگر آپ پسند کریں تو بہ سلسلہ جوشؔ میری اور اپنی خط و کتابت شائع کر دیں۔ انھوں نے ہامی بھر لی۔ میں حیران ہُوا۔ حیران اس لیے ہُوا تھا کہ اُس خط و کتابت میں شاہد صاحب کا پہلو دبتا تھا۔ پھر میں نے سوچا، شاہد صاحب وہ فقرے اور وُہ باتیں حذف کر دیں گے۔ جن میں اُن پر حرف آتا ہوگا۔

جب وُہ نمبر چھپ گیا جس میں وُہ خط و کتابت بھی تھی تو مَیں اور حیران ہُوا۔ وُہ یُوں کہ شاہد صاحب نے اُس میں سے کوئی فقرہ کاٹا نہ تھا۔ ساری خط و کتابت جُوں کی تُوں چھاپی تھی۔ صاحب! یہ حوصلے اور کردار کی بات ہے جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں۔

انتقال سے کچھ دن پہلے انھوں نے مجھے اپنا مضمون مولانا عبدالسلام نیازی پر بھجوایا تھا۔ توقع نہ تھی کہ وہ میری درخواست پر، اپنی طویل علالت کی الجھیڑ کی وجہ سے، کچھ لکھ بھی سکیں گے مگر انھوں نے لکھا۔ میں حیران! اس سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں مضمون پڑھا تو وہ بھی "قلم گھسیٹ" قسم کا نہ تھا۔ اچھا خاصا تھا۔ جواب میں مَیں نے

لکھا تھا کہ ایک بار مَیں بھی مولانا نیازی کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا اور میری اُن سے یہ گفتگو ہُوئی تھی :

"فارسی جانتے ہو؟"

"جی نہیں!"

"عربی؟"

"جی نہیں!"

"علم منطق اور معقولات و منقولات؟"

"جی نہیں!"

"پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُمّی ہُوں"

میرے اس خط کے تین چار روز بعد، شاہد صاحب کا جواب آیا۔ مولانا نیازی کے علم و فضل کا یہی عالم تھا کہ بڑے لکھے سے پڑھا لکھا آدمی بھی، مولانا کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں بھی کچھ پڑھا ہُوا ہُوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمہ جیسے آدمی بھی ان کے سامنے زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے۔ میں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا، اگر آپ میرے مضمون میں اپنے یہ فقرے ایزاد کر دیں، خواہ اپنے نام سے، خواہ میرے نام سے، کیونکہ مولانا کی شخصیت کے سلسلے میں ان فقروں کا اضافہ ضروری ہے۔

چنانچہ میں نے اپنا نام بتائے بغیر، ان کے حکم کی تعمیل کر دی تھی اپنا نام اس لیے ظاہر نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنی سبکی کا احساس ہوتا تھا مگر آج اپنا نام ظاہر کر دیا، اس لیے کہ یہ حوصلہ بھی مجھے شاہد صاحب نے دلایا ہے۔

ابھی تک اس ملک میں رائٹرز گلڈ کا وجود ہے۔ عرض کر چکا ہُوں کہ اس کے بانیوں میں شاہد صاحب کا بھی نام آتا ہے۔

یاروں نے بہکایا کہ مجھے بھی رائٹرز گلڈ کا ممبر بننا چاہیے۔ ہر چند کہ مَیں، اپنی طبیعت کی افتاد اور اس کی "قدرے غیر ضروری سی کائنات" کے باعث اس امر کی ضرورت نہ سمجھتا تھا مگر ضرورتاً مجھے "ادیب" بننا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ رائٹرز گلڈ کے پلیٹ فارم سے، اس نیازمند کے خلاف ہلبلی شروع تھی۔ نیا قصہ انتخابی پرچوں کے خلاف مہم کا تھا۔

ممبر شپ کے لیے میرا نام، مغربی پاکستان کی مجلسِ عاملہ نے منظور کر کے کراچی، یعنی مرکز کو بھجوا دیا تھا۔ خدشہ تھا کہ مرکز اسے منظور نہ کرے گا۔ وجوہ ظاہر تھیں پنجاب اور کراچی کا بُعد، انتخابی پرچوں سے پرخاش، شاہد صاحب سے تناتنی!

چنانچہ جب میرا نام ممبر شپ کے لیے سامنے آیا تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

ادیبانہ شور! ——"ممبر بنایا جائے" "ممبر نہیں بنایا جائے گا"

دیکھتے ہی دیکھتے تقریریں شروع ہو گئیں، کوئی حق میں کوئی خلاف، جنہوں نے میرے خلاف ہنگامہ کیا ان کے نام بھول چکا ہُوں۔ جنہوں نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہا اُن میں سید وقار عظیم، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب اور

شاہد احمد دہلوی تھے۔

شاہد احمد دہلوی ؟

جی ہاں ! شاہد احمد دہلوی ! وہی شاہد احمد دہلوی، جو کچھ عرصہ پہلے میرے خلاف لکھ رہے تھے، بپھرے ہوئے قلم سے !

اب میں ایسے "دشمن" کو کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں !

ادبی رسائل کی حالت، ہمیشہ سے خراب رہی ہے۔ بڑے بڑے معرکے کے پرچے نکلے، جن میں زمانہ، مخزن، ادیب، ہمایوں، نیرنگِ خیال، ادبی دنیا اور ساقی ! مگر یہ رہے مالی اعتبار سے زیر بار ہی، جس کے پاس جتنا سرمایہ ہوتا ہے وہ اتنا پھونک کے بیٹھ جاتا ہے۔ نہ عوام اتنا ساتھ دیتے ہیں کہ کوئی رسالہ اپنا خرچ چلا سکے اور نہ حکومت ہی اس "غلط کام" میں ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے حکومت فیملی پلاننگ پر کروڑوں روپے خرچ کر سکتی ہے مگر ادبی رسائل کے سلسلے میں اس کے پاس کسی قسم کی پلاننگ نہیں۔

میں بڑا حیران ہوتا ہوں کہ یہ ادبی رسالوں کے مدیر پاگل ہوتے ہیں یا کیا وہ جانتے بوجھتے گھاٹے کا سودا کرتے ہیں یہ لوگ اپنی جدوجہد، اپنی کاوشیں، اپنا روپیہ اور اپنا خونِ جگر یوں اُچھال دیتے ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو اور ہمارا یہ کرتب عوام بھی دیکھتے ہیں خواص بھی اور حکومت بھی، مگر کسی کو ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔

ادبی رسائل کی حالتِ زار پر شاہد صاحب بہت کُڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کراچی میں بیٹھ کر ایک اسکیم بنائی کہ ایک آل پاکستان ادبی رسائل کی انجمن بنائی جائے تاکہ رسائل کی حالت کو کسی طرح استوار کیا جائے۔

جلسے ہوئے ریزولیوشن پاس ہوئے۔ بھاگ دوڑ کی۔ حکومت کی چوکھٹ پر ناک رگڑی۔ مگر معاملہ وہی ڈھاک کے تین پات، آج تک حکومت نے ادبی رسائل کے لیے کچھ نہیں کیا حالانکہ ہم لوگ وزیرِ تعلیم سے بھی ملے تھے' وزیرِ خزانہ سے بھی' اور ان لوگوں سے بھی جو غلط کار تھے مگر حکومت کے دربار میں اہمیت رکھتے تھے۔ اگر وہ لوگ کچھ کر گزرتے تو ممکن تھا کہ شاہد صاحب اتنی کس مپرسی کی حالت میں نہ مرتے کیونکہ یہ ہندوستان کے لکھ پتی تھے مگر پاکستان کے "کنگال تھے" !

انجمن کو فعال بنانے کے لیے شاہد صاحب نے اتنی جدوجہد کی، جس کی کوئی حد نہیں۔ آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی اسی کی فکر، اس سلسلے میں شاہد صاحب نے مجھے بھی گھیرا۔ میں کتنی کتراتا رہا۔ اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ کچھ نہ ہوگا۔ اچھے کاموں کی توفیق کسے ہے ؟ مگر شاہد صاحب کے خلوص اور اصرار کے سامنے مَیں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ کئی سال تک ہم لوگ لکھتے لکھاتے رہے، بھاگتے دوڑتے رہے مگر وہی ہُوا جس کا مجھے پہلے دن سے خدشہ تھا۔

ایک واقعہ سُنیے :

مجھے شاہد صاحب نے لکھا، مولانا صلاح الدین احمد کی خدمت میں حاضری دو اور انھیں انجمن کا ممبر بناؤ"۔

چنانچہ پہنچا۔

"مولانا ! السلامُ علیکم !"

"آئیے آئیے!"

"کراچی میں فلاں فلاں دوستوں نے مل کر، ایک انجمن، 'انجمن ادبی رسائل' کے نام سے بنائی ہے۔ سب دوستوں کی خواہش ہے کہ آپ بھی اس کے ممبر بنیں تاکہ انجمن زیادہ باوقار اور زیادہ مؤثر بن سکے۔"

"انجمن کا دائرۂ کار کیا ہوگا؟"

"انجمن اس امر کی کوشش کرے گی کہ آج کل نیوز پرنٹ کی جو نایابی ہے اس کا تدارک کیا جائے۔ ادبی رسائل کو بھی اشتہارات ملیں اور —"

"رُکیے! — میں سمجھ گیا، میں آپ کی انجمن کا ممبر نہیں بن سکتا۔"

"کیوں؟"

"اگر مجھے نیوز پرنٹ ملنے لگا، اشتہارات ملنے لگے تو مجھے مجبوراً پرچہ نکالنا پڑے گا اور مجھے پھر گھاٹا ہوگا۔ میں تو آپ کی انجمن کی مخالفت کروں گا تاکہ نہ ہمیں نیوز پرنٹ ملے نہ کہیں اشتہارات ملیں اور نہ ہم تباہ ہوں۔"

مولانا کی اس گفتگو میں، بیکسی کی جو لہر ہے وہ ادبی رسائل کا مقدّر ہے۔

شاہد صاحب خدمتِ خلق کے سلسلے میں، ہر لمحہ مستعد رہتے تھے۔ وقت ضائع کرتے تھے۔ روپیہ تھا نہیں ورنہ وہ بھی لٹاتے۔ انجمن ادبی رسائل کے لیے اُنھوں نے بڑا کام کیا، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ رائٹرز گلڈ کے بھی مخلص خدمت گزاروں میں تھے مگر سُنا ہے کہ جب شاہد صاحب کا انتقال ہوا تو رائٹرز گلڈ کے ممبران میں سے کوئی بھی جنازے میں شریک نہ تھا۔ یہ حشر ہوا شاہد صاحب کی اُن کارگزاریوں کا، جس میں تنہا ان کی ذات کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر حکومت بے مہر ہے تو قوم احسان فراموش، حکومت فیملی پلاننگ میں لگی ہوئی ہے اور قوم ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں۔ نہ فرصت اِسے ہے نہ اُسے۔

اچھا آدمی کتنا اچھا ہے اور بُرا آدمی کتنا بُرا۔ اس کا حال کچھ سفر میں زیادہ ہی کُھلتا ہے۔ مجھے یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ ہم نے اکٹھے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ ہم پانچ افراد تھے: شاہد احمد دہلوی، مولانا رازق الخیری، حکیم یوسف حسن، عشرت رحمانی اور یہ خاکسار!

مولانا رازق الخیری سارے سفر میں ہمیں یہی بتاتے رہے کہ میں بڑے کام کا آدمی ہوں، میری قدر کرو۔ حکیم یوسف حسن اپنی زندگی کے ایسے واقعات سے دل بہلاتے رہے کہ ہم میں سے بعضوں کو عمرِ رفتہ کو آواز دینے کی ضرورت پڑ گئی۔ عشرت رحمانی صاحب یہ سمجھاتے رہے کہ تم سب بچے ہو، اِس ٹولی کا دماغ میں ہوں۔

ہم میں سے ایک شاہد صاحب ایسے تھے جو اپنی کسی حیثیت پہ نازاں نہ تھے۔ جب یہ سارے ساتھی ڈینگ کی لیتے تو شاہد صاحب ہلکا سا قہقہہ لگاتے، پھر قہقہہ لگاتے، پھر قہقہہ لگاتے۔

انسان کا سفر ازل سے جاری ہے، ابد تک جاری رہے گا۔ دُنیا میں آکر ہر شخص اپنا اپنا کردار ادا کر کے نیک نامیوں اور حسرتوں کی گود میں سو جاتا ہے اُن میں سے ایک شاہد صاحب بھی تھے۔ یہ اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ہم زیادہ تر ان کی اچھائیوں سے واقف ہیں۔

شخصیّت نگار کی تلاش

ممتاز مفتی

طفیل کی شخصیت کے متعلق کرشن چندر لکھتے ہیں :

"پہلی بار جب طفیل میرے کمرے میں داخل ہوئے تو پہلی نظر میں وہ مجھے سجادہ نشین نظر آئے دوسری نظر میں لکڑیوں کے ٹال کے مالک، تیسری نظر میں ایک معصوم سے بچے، چوتھی نظر کا انہوں نے موقعہ ہی نہیں دیا ـــــ اس وقت تک وہ مجھ سے بغل گیر ہو چکے تھے۔" (آپ ص ۲۲۰)

طفیل سے میں بیسیوں مرتبہ مل چکا ہوں۔ لیکن انہوں نے مجھے دوسری نظر کا بھی موقع نہ دیا۔ میرا اندازہ ہے کہ دوسری نظر کا انہوں نے کبھی کسی کو موقعہ نہیں دیا اگرچہ کبھی کبھار ان کے معصوم ہونٹوں میں دبے ہوئے مبہم سے شرارت آمیز اشارے کو دیکھ کر شک پڑتا ہے کہ وہ دوسری نظر کا موقعہ دے سکتے ہیں۔

اپنے محلے والوں کے متعلق شکیلہ سے وضاحت کرتے ہوئے طفیل نے کہا تھا :

"یہ سب لوگ مجھے صورتاً جانتے ہیں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔" (جناب ص ۶۷)

اس لحاظ سے میں طفیل کا محلّے دار ہوں۔ غالباً ہم سب ہی ان کے محلّے دار ہیں۔ بیسیوں ملاقاتوں کے باوجود میں انہیں صرف صورتاً جانتا رہا۔ وہی ایک نظر۔ دوسری نظر کا موقعہ طفیل نے نہیں بلکہ "آپ"، "جناب"، "صاحب" نے دیا۔ میں نے پہلی مرتبہ طفیل کو ان تحریروں کے آئینے میں دیکھا۔ غالباً طفیل وہ بدمنی ہے جسے آئینے کی مدد کے بغیر دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ طفیل ان شخصیتوں میں سے نہیں جو صورتاً ہویدا ہوتی ہیں۔ ان شخصیتوں میں سے بھی نہیں جو بات چیت اور برتاؤ میں اپنا آپ اُجاگر کرتی ہیں یا کر سکتی ہیں۔ ان شخصیتوں میں سے بھی نہیں جو اپنے آپ سے دل کی بات کہہ سکتی ہیں۔

طفیل کو صورتاً جاننے اور "آپ" میں ان کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد مجھے ایسا لگتا ہے کہ طفیل گونگا پہلوان ہے اور اگر پہلوان کی قوت کی نوعیت اور اس کے تصرف کے انداز کو مدِنظر رکھ کر بات کی جائے تو یوں کہنا پڑے گا کہ طفیل گونگی پہلوان ہے۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس لیے پہلوان ہیں کہ گونگے ہیں یا اس لیے گونگے ہیں کہ پہلوان ہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اگر طفیل کی شخصیت ان دونوں ستونوں پر استوار ہوتی تو بات گڈمڈ نہ ہوتی۔ لیکن فطرت نے گونگے پہلوان میں نسائیت کی ایک رنگین لہر دوڑا کر بات الجھا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شخصیت میں جاذبیت اور اسرار کی کلی لگ گئی۔ عزم میں نسائی ضد پیدا ہو گئی۔ نقوش کے ماتھے پہ بندی لگی اور آنکھ میں سُرمے کی دھار ـــــ وہ پبلشر سے

ادیب بن گئے۔ تحریر میں آگ نے پھول انگاروں کی شکل اختیار کرلی اور طفیل خود ایک المیہ بن کر رہ گئے۔
اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے کہ ازلی طور پر اظہار کے راستے مسدود ہوں ایک طوفان چلنے کے لیے بے تاب ہو اور شدید احساسات، احتیاط، سلیقہ، نیکی اور حُسن دامن تھام کے بیٹھے ہوں۔

طفیل کے ان " آبگینوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کرشن چندر نے لکھا تھا :

" لکڑیوں کے اس گٹھے میں جس کا نام " جناب " ہے ہر طرح کی لکڑی ہے، موٹی اور پتلی بھی، نئی اور پرانی بھی، گیلی اور سُوکھی بھی۔ مگر ادیبوں کا یہ پشتارہ ہے بے حد دلچسپ۔ صفحہ اول سے آخر تک یہ کاغذی زنبیل گوناگوں جادو رنگ کیفیتوں سے معمور ہے اور ان میں ہر لکڑی جلتی ہے کوئی پطرس کی طرح پٹاخے چلاتی ہے، کوئی مرزا ادیب کی طرح رک رک کر جلتی ہے کوئی شکیلہ اختر کی طرح ایک ہی رنگ میں جلتی چلی جاتی ہے تو کوئی مجاز کی طرح جل کر راکھ ہو چکی ہے " (آپ ص ۲۲۰)

کرشن چندر نے اس لکڑی کا تذکرہ نہیں کیا جو پھلجھڑی کی طرح جلتی ہے اور جگہ جگہ ایسے پھول انگارے چھوڑتی ہے کہ ساری فضا ان پھول انگاروں سے بھر جاتی ہے اور جملہ لکڑیاں پس منظر میں سُلگتی رہ جاتی ہیں۔ ایسے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ' آپ ' ' جناب ' ' صاحب ' کے پردے میں مَیں ہی میں جلوہ آرا ہو۔ اس ذوق جلوہ آرائی نے طفیل کو ادیب بنا دیا۔

ویسے طفیل سے پُوچھیے تو وہ جلوہ آرائی کے حق میں نہیں۔ چونکہ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے۔ شکیلہ نے پوچھا : آپ نے مکان پر اپنے نام کی تختی لگائی ہوتی۔ طفیل نے جواب دیا : میں اسے پسند نہیں کرتا۔ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے۔ (آپ ص ۶۷)

خاکہ کے متعلق فرماتے ہیں :

خاکہ میں ضروری ہے کہ لکھنے والا شخصیت میں گھسا ہوا نظر نہ آئے بلکہ شخصیت ہی رواں دواں دکھائی دے۔ اگر مصنف خود کو لانے پر مجبور ہو تو ایسے جیسے قمیص میں بٹن نہ کہ بٹن میں قمیص۔ لیکن ان قمیصوں کو ملاحظہ کیجئے۔ ان پر جا بجا بٹن ٹانکے ہُوئے ہیں اور وہ کتنے اچھے لگتے ہیں۔ شخصیتوں کا ذکر کرتے ہیں وہ چپکے سے چق اٹھاتے ہیں اور جھانک کر زیر لب کہتے ہیں[1] " میں خاکسار ہوں " (آپ ص ۱۵۲) " میں تو کو دن ہی رہا " (آپ ص ۱۹۲) " شرفا میں سے نہیں ہوں " (آپ ص ۱۹۲) " معقول نہ بن سکا "[2] (آپ ص ۴۵) " تعصبات میں کھویا ہوا ہوں " (آپ ص ۶۰) " میری خام خیالی یہ ہے "۔

میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ طفیل کی اپنی ذات کے متعلق ' خام خیالیوں ' ناچیز راؤں ، من آنیوں سے بچئے۔ ان بھول بھلیوں میں پھنس کر آپ کچھ پا نہیں سکتے صرف کھو سکتے ہیں۔ انہیں " راستہ تلاش کرو " قسم کا گورکھ دھندا بننے کا لاشعوری

---

[1] و [2] صاحب (دیباچہ)

شوق ہے اور قاری کو جستجو پر آمادہ کرنے کے لیے انہوں نے۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ میرا کیا ہے۔ میری بات چھوڑیئے۔ قسم کے الو کے سنگھار ایجاد کر رکھے ہیں۔

بے شک طفیل کا خلوص مسلم اور بے پایاں ہے۔ شرط یہ ہے کہ بات ان کی ذات کے متعلق نہ ہو۔ آپ یا مجھ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے چھپے رہنے کے لیے انہوں نے عجز بازیوں کا ایک عظیم الجثہ تخلیق کر رکھا ہے۔ پھر بھی کبھی کبھار ان کے خلوص کی کرن ان کی اپنی ذات پر پڑ جاتی ہے۔ وہ چونک پڑتے ہیں۔ پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور پھر موضوع بدل دیتے ہیں۔ اس کے سوا چارہ کار بھی کیا ہو۔

وہ رنگین، مخلص اور جہاں دیدہ بڈھا بھی جسے ہم بابائے اردو کہتے ہیں۔ طفیل کی شخصیت کے متعلق "عجیب و غریب" (آپ ص ۱۲) کہنے سے باز نہ رہ سکا۔ اگر وہ رکھ رکھاؤ کا دیوانہ نہ ہوتا تو یقیناً عجیب و غریب کی وضاحت کرتا۔ طفیل کی منہ بولی بہن شکیلہ اختر نے تہذیب احتیاط اور احترام کے باوجود اپنے بھائی صاحب کو "چپ شاہ" اور "چلتر" کے القاب دیئے۔ چپ + شاہ + چلتر میں طفیل کی شخصیت کے تین پایہ ستون موجود ہیں۔ (آپ ص ۹)

لوگوں کی آراء کو چھوڑیئے۔ 'جناب' میں التزاماً اپنی شخصیت کے ضمنی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے دو ایک جگہ سہواً طفیل صاحب خود اپنی بنیادی شخصیت کا تذکرہ کر گئے ہیں۔ مثالاً :

"میں ان صاحب کو اگست ۱۹۲۳ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں مگر یہ حضرت مسلسل چکمہ دے جا رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا۔" (جناب ص ۹۴)

انہیں صفحات میں انہوں نے اپنے متعلق اپنے دوستوں کا خیال درج کیا ہے : "طفیل برانڈ قسم کے لوگ بہت ہی کمیاب ہیں بلکہ یہ برانڈ اب آتا ہی نہیں۔" (جناب ص ۹۴)

پھر یہ بھی کہ :

"جب بھی اپنے بارے میں غور کیا تو طفیل میں دوسرا طفیل چھپا ہوا پایا۔" (جناب ۱۱۶)

لیکن "راستہ تلاش کرد" کے ازلی شوق نے حقیقت کا پلو چھڑایا۔ جھٹ سے بات بنائی ——— نقاب گرایا بولے :

"یہ دوسرا طفیل مدیر نقوش ہے۔"

یوں کرسیِ ادارت پر بیٹھنے کا ناٹک کھیل کر، بچ کر صاف نکل گئے۔

بہر حال یہ حقیقت مسلم ہے کہ طفیل میں ایک اور طفیل چھپا بیٹھا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک پہلوان ہے، مگدر اٹھاتے پھرتا۔ ہمچو ما دیگرے نیست ۔ دوسرا دھان پان۔ گھونگھٹ نکالے ۔ ہاتھ جوڑے ، من آنم کہ من دانم ۔ طفیل اپنے ان دونوں پاٹوں تلے پس رہے ہیں اور آپ اور میں 'راستہ تلاش کرد' کی بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

علم النجوم کے مطابق یہ ساری قیامت اس لیے ٹوٹی کہ طفیل اگست میں پیدا ہوئے اگر وہ چار ایک دن پہلے پیدا ہوتے لیو ہوتے جس کا نشان شیر ہے، خالص پہلوان، اپنے جیسا کسی اور کو نہ سمجھتے۔ ٹھہر و میری بات سنو ، میری

LEO ل

طرف دیکھو۔ میں نے تمہیں کہا نہ تھا' سا انداز ہوتا۔ چھاتی نکلی رہتی، مونچھ مروڑ کر چلتے۔ اگر وہ دس بارہ دنوں کے بعد پیدا ہوتے تو ورگو ہوتے، جس کا نشان دوشیزہ ہے اور جسے 'کنیا' بھی کہتے ہیں، پاکیزہ دوشیزہ۔ آرسی کا کٹورہ بنا کر انتظار کرنے والی، لاج کی ماری۔ پلے سے دیا بجھانے والی بے زبان۔ سرِ تسلیم خم کرنے والی داسی۔

لیکن طفیل اس وقت پیدا ہوئے جب لیو کا شیر مدھم پڑتا جا رہا تھا اور دوشیزہ اُبھر رہی تھی۔ شیر اور دوشیزہ کا ملاپ ہو گیا۔ یوں شیر اور دوشیزہ خلط ملط ہو گئے۔ شیر میں دوشیزہ کا یا دوشیزہ میں شیر کا پیوند لگ گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ طفیل میں شیر کی سی دبی دبی تندہی ہے۔ غصہ ہے، خود اعتمادی ہے۔ ایسا کام ہاتھ میں لینے اور اُسے تکمیل دینے کا جذبہ ہے جو کوئی دوسرا نہ کر سکتا ہو۔ دوسرے کو کھری کھری سنا دینے کی جرأت ہے اور اس کے ساتھ ہی دوشیزہ ایسی جھجک ہے رنگین بیانی ہے حُسن پسندی ہے، لاج کا احساس ہے، عجز ہے' برداشت ہے اور نیکی کا بے پناہ خبط۔

آپ، صاحب اور جناب میں جگہ جگہ دوشیزہ گنگناتی ہے، کہیں کہیں شیر غراتا ہے۔ دوشیزہ اور شیر۔ کس قدر رومان بھرا امتزاج ہے، رنگین دو آتشہ!

دوشیزہ کہتی ہے —— "اچھائیوں کا اظہار برملا کرتا ہوں۔ کمزوریوں کے اظہار کے لیے پہلے جواز ڈھونڈتا ہوں پھر اشارۃً کچھ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیتا ہوں۔ اتنی احتیاط پر بھی دوست کبھی خوش نہ ہوئے۔" (آپ ص ۱۳۵)

شیر کہتا ہے: —— چونکہ ہمیں کچھ اور کچھ اور کی عادت پڑی ہوئی ہے اس لیے میں بھی بال کی کھال اتاروں گا خواہ سلیقہ ہو یا نہ ہو۔ (آپ ص ۱۸۱)

دوشیزہ کہتی ہے: —— میں نقاد نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں ڈنڈی ماروں۔ میرا موضوع شخصیتوں کا مطالعہ ہے جس میں جھوٹ نہیں چلتا بلکہ کنواری لڑکیوں کی طرح اپنی لاجوں آپ مرنا پڑتا ہے۔ (آپ ص ۱۸۱)

شیر کہتا ہے: —— میں بھی ایسا کھرا انسان ہوں کہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا خواہ زبان سے کچھ کہوں۔ دماغ یہی کہتا ہے۔ ہنہ! (آپ ص ۱۸۸)

دوشیزہ کہتی ہے: —— میں کوئی مفتیِ وقت ہوں کہ کسی کو مسلمان ہونے کے اور کسی کو مسلمان نہ ہونے کے پرمٹ بانٹتا پھروں۔ (آپ ص ۳۱)

شیر غراتا ہے: —— آج مولویوں کا دکاندار طبقہ ادب کو جس طرح مسلمان بنانے کی فکر میں ہے۔ اس میں ادیب کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔ (آپ ص ۹۴)

شیر اور دوشیزہ الگ الگ بولتے رہیں تو محفل لگی رہتی ہے لیکن کبھی کبھار وہ ایک دوسرے کے مدِ مقابل آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو طعنے دیتے ہیں۔ پھر بھانڈے پھوٹتے ہیں، پردے چاک ہوتے ہیں، بھرم

ٹوٹ جاتے ہیں۔

دوشیزہ کہتی ہے: —— انہیں اپنے بارے میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی غلط فہمی نے انہیں مدیرِ نقوش بنا دیا تھا ورنہ یہ اور نقوش کی ادارت۔ ہنھو! (جناب ص ۱۱)

شیر دھاڑتا ہے: —— اپنی قسمت میں خدا نے کسی معاملے میں ہار نہیں لکھی۔ (آپ ص ۶۷)

دوشیزہ مذاق اُڑاتی ہے: —— آج بھی جب کہ اس واقعہ کو تیس برس سے زاید عرصہ گزر چکا ہے۔ انہوں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی عادت کو ترک نہیں کیا۔ (جناب ص ۹۶)

شیر قہقہہ مارتا ہے: —— تمہارے پسینے کیوں چھوٹتے ہیں۔ (جناب ص ۱۰۲)

ان گھر کے بھیدیوں کی باہمی چپقلش کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لنکا ڈھے جاتی ہے اور لنکا کی اوٹ میں چھپے ہوئے مناظر منظرِ عام پر آجاتے ہیں۔

لیکن جب یہ دونوں سمجھوتہ کر کے ایک ہو جاتے ہیں تو اندھیرے اجالے سمٹ کر معدوم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ روپہلی شفق چھا جاتی ہے، ایک حسین دھندلکا اُبھرتا ہے۔ بادِ نسیم چلتی ہے، پتیاں پھوٹتی ہیں، پھول کھلتے ہیں اور ادب کی دُنیا میں بہار آجاتی ہے — لیکن اس ملاپ کے باوجود شیر شیر رہتا ہے اور دوشیزہ دوشیزہ۔

شیر لکھواتا ہے دوشیزہ لکھتی ہے، ملاحظہ ہو:

شاہد احمد دہلوی کو خط لکھاتے ہوئے شیر گرجا، لکھو دوشیزہ —— شاہد احمد صاحب آپ خطرناک آدمی ہیں (آپ ص ۱۴۵) —— دوشیزہ گھبرا گئی۔ اس نے بڑھ کر شیر کی گرج پر پھولوں کی چادر ڈال دی۔ بولی —— شاہد احمد دہلوی تو اچھے آدمی ہیں مگر جو ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے ہیں۔ اصل میں وہ ہیں خطرناک" (آپ ص ۱۴۵)۔

شیر جھنجھلایا، لکھو دوشیزہ —— "شاہد احمد صاحب! جو مضمون آپ نے لکھا ہے وہ مجھے پسند نہیں۔" (آپ ص ۱۶۵) دوشیزہ لکھ کر مسکرائی اور اپنی طرف سے کلی ٹانک دی —— "اس میں میرا شاہد احمد نہیں۔" (آپ ص ۱۶۵)

نیاز کے متعلق شیر نے لکھا: —— آپ شعروں کا آپریشن بھی خوب کرتے ہیں۔ اس آپریشن میں شعر کو ذبح بھی کر ڈالتے ہیں۔ اصلاحیں بھونڈی دیتے ہیں (آپ ص ۴۰) دوشیزہ نے چپکے سے "میری رائے میں" —— بڑھا دیا۔

شیر نے لکھا: —— آپ ابتدائی دور میں ایسا نہیں کرتے تھے چونکہ عمر کے ساتھ ساتھ استادی شان بھی بڑھتی ہے۔ دوشیزہ نے دھار کند کرنے کے لیے بڑھایا: —— اس لیے سوچنے کا مقام ہے قصور ان کا ہوا یا یہ بھی ان کی عمر کے پلے باندھنا پڑے گا۔ (آپ ص ۱۶۵)

جوش کے متعلق لکھتے ہوئے شیر غرّایا: —— وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس ڈر سے قابو میں رکھتے ہوں گے کہ ہمیں دُنیا دی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ (آپ ص ۶۱) —— دوشیزہ نے اپچ لگائی —— جوش صاحب کو ملمع بازی پسند نہیں مصلحت آمیز قسم کی قیود سے قطعی طور پر ناآشنا ہیں۔ (آپ ص ۶۱)

ادب اور خاکہ نویسی میں طفیل کی عظمت کا راز یہ ہے کہ شیر زنجیر سے بندھا ہُوا ہے اور دوشیزہ آزاد ہے۔ نجی زندگی میں طفیل کے المیے کا یہ راز ہے کہ شیر زنجیر سے بندھا ہوا ہے اور دوشیزہ (دوشیزگی کی ازلی بندشوں کے سوا) آزاد ہے۔ نقوش کے ضخیم نمبروں کی کامیابی اس لیے ہوئی کہ اگرچہ شیر بندھا ہوا ہے مگر ہے وہ سچ مچ کا شیر، نقوش کا حُسن اور نوک پلک دوشیزہ نے اپنے ذمے لے لی۔ جملہ ادیبوں سے خوشگوار تعلقات اس لیے قائم ہُوئے کہ شیر بندھا ہُوا ہے اور دوشیزہ آزاد ہے۔

دوشیزہ نے کُھل کھیل کر طفیل صاحب کو ادیب بنا دیا اگر شیر کُھلا ہوتا تو وہ بہت بڑے اور کامیاب بزنس مین ہوتے اور آج لاکھوں میں کھیلتے۔

دوشیزہ کے کُھل کھیلنے کی بات سُن کر شاید طفیل شرما جاتیں۔ لیکن کیا کیا جائے جب تک نسائیت کی کلی نہ چٹک جائے ادیب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ صرف طفیل ہی نہیں بیشتر ادیب ورگوؒ (دوشیزہ) ہیں۔ مثلاً اشفاق احمد ہیں اور اگر مجھے بھی فہرست میں شامل کر لیا جائے تو میں خود ورگو ہوں اور دوشیزہ کے لچھنوں سے خاصا واقف ہُوں میری دوشیزہ کہہ رہی ہے یہ بھی لکھ دو کہ افسوس مجھ میں شیر کی آمیزش نہ ہوئی۔

"آپ" میں صفحہ ۱۶۲ – ۱۵۵ میں طفیل نے خاکہ نگاری اور خاکہ نگاروں کے متعلق اپنے خیالات کا وضاحت سے اظہار کیا ہے جس کا لُبِ لباب یہ ہے کہ پھُول بھی ہوں اور کانٹے بھی، چٹکیاں بھی ہوں اور التفات بھی۔ بادِ حق بھی ہو اور رندانہ انداز بھی۔ لیکن طفیل کے جملہ خاکوں کو پڑھنے کے بعد میں سمجھتا ہُوں کہ طفیل کا ایمان ہے کہ آپ کسی شخصیت کو قلم بند نہیں کر سکتے جب تک آپ کو اس شخصیت سے بے پناہ پیار نہ ہو۔

طفیل کو ان شخصیتوں سے بے حد پیار ہے۔ اتنا پیار ہے کہ پڑھنے والے کو غصّہ آنے لگتا ہے۔ کبھی وہ ان کی وکالت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور خاکے سے کورٹ روم کی بُو آنے لگتی ہے۔ کبھی وہ ان کا منہ دھوتے ہیں، بال بناتے ہیں، سُرمہ لگاتے ہیں جیسے کسی ایسی عورت کے ہاتھ بچّہ لگ گیا ہو جو اولاد سے محروم ہو اور خاکے سے ماں کی بُو آنے لگتی ہے۔ لیکن محبت کے ساتھ ساتھ وہ چٹکیاں بھی بھرتے جاتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے طفیل کہہ رہے ہوں چٹکی بھرنے کا مزا ہی کیا جب تک دل میں محبت نہ ہو۔ اور محبّت کا مزا ہی کیا جب تک ساتھ چٹکیاں نہ ہوں۔ اور سچ پُوچھیے تو ان تمام خاکوں کی دلکشی اور حُسن کا راز یہی چٹکیوں اور یہی محبّت کی آمیزش ہے۔

طفیل کے طرزِ تحریر کی تمام تر رنگینی، شگفتگی اور حسن بھی اسی آمیزش کی وجہ سے ہے۔ شخصیت میں شیر اور دوشیزہ کی آمیزش، بیان میں چٹکیوں اور محبت کی آمیزش، اسلوب میں مٹھاس اور نمک کی آمیزش، عقیدے میں بت پرست اور مومن کی آمیزش، کردار میں رادھا اور راہو کی آمیزش۔ مجھے اس گنگا جمنی رنگ کو دیکھ کر یُوں لگتا ہے جیسے ایک جانب عمر خیام بیٹھے ہوں۔ دوسری جانب چغتائی کی حسینہ اور درمیان میں صراحی اور شیشے کی جگہ جائے نماز اور تسبیح پڑی ہو۔

ایک جدید شخصیّت نگار

مجنوں گورکھپوری

پندرہ سال سے کچھ اوپر ہی ہوئے ہوں گے کہ میری شناسائی نقوش اور طفیل سے ہوئی۔ نقوش سے بالمواجہ یعنی پرچہ میرے پاس برابر آتا رہا اور میں اُس کا بڑے شوق اور غور کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ طفیل سے میری شناسائی دسمبر ۱۹۶۷ء تک نصف الملاقات یعنی مراسلت تک محدود رہی۔ میں ان کو ایک خاصی مدت تک نقوش کا مدیر سمجھتا رہا اور اُن لوگوں میں شمار کرتا رہا جن کا منصب اربابِ قلم کو ستاتے رہنا ہوتا ہے اور جو یہ نہیں سمجھ سکتے یا سمجھنا نہیں چاہتے کہ لکھنے والے اوزار و آلات نہیں ہوتے۔ رگ، پٹھے اور گوشت پوست کے زندہ جانور ہوتے ہیں جو تھکے ہارے بھی ہو سکتے ہیں۔ عام روزمرہ زندگی کے حالات و حوادث کا شکار بھی ہو سکتے ہیں اور اگر وہ کسی مدیر کے مطالبے یا تقاضے کا حسبِ مراد جواب نہ دے سکیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مغرور یا بداخلاق ہیں۔

قصہ مختصر اوّل اوّل میں نے طفیل کو بھی ایک مدیر ہی سمجھا۔ لیکن اُس وقت بھی ان کی بعض خصوصیات بار بار مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی رہیں اور کچھ دنوں کے بعد مجھے ان کا معترف ہونا پڑا۔ مجھے غائبانہ طور پر ہی یہ محسوس ہو گیا کہ طفیل بڑے سالم کردار کے انسان ہیں۔ ان کے مزاج میں بڑا استقلال ہے۔ استقامت، تحمل اور اعتماد ان کے خمیر میں داخل ہیں۔ ان کا اپنا ایک معیارِ نظر ہے اور ان کی فطرت کی ترکیب میں تخیل اور ذوقِ عمل دونوں یکساں طور پر داخل اور کارفرما ہیں۔ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں اس کو پورے انہماک اور نشاطِ کار کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ طفیل کی انہی تمام خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ نقوش آج اتنا کامیاب اور معتبر رسالہ ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ نقوش اور محمد طفیل سے مجھے واقف ہوئے مجھے پندرہ سال سے زیادہ ہوئے۔ مجھ میں ابتدا سے ایک عیب ہے۔ ویسے تو میں اپنی ادبی زندگی کے اوائل میں مہینے کے اندر دو دو افسانے یا مضامین لکھ لیتا تھا۔ میرے سارے ناولٹ یا طویل مختصر افسانے اسی حساب سے لکھے گئے ہیں۔ بعض افسانے اور مضامین عشا سے فجر کی اذان تک ایک نشست میں لکھ ڈالے گئے ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک ماہوار رسالے کے لیے بارہ شماروں کا مواد ایک ماہ کے اندر مرتب کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن کسی کی فرمائش پر کسی دی ہوئی میعاد کے اندر، میں لکھنے سے ہمیشہ معذور رہا۔ اور اب تو اور معذور ہوں۔ صرف نیاز فتح پوری کی فرمائش پر "نگار" میں تا بہ مقدور دی ہوئی مدت کے اندر ضرور لکھتا رہا۔ ورنہ میں اپنا موضوع اور عنوان خود مرتب کرتا رہا اور وقت لے کر اس پر لکھتا رہا۔

طفیل کے بھی جتنے خطوط میرے پاس آئے وہ نقوش کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش لیے ہوتے۔ مجھے شرمندگی

اور افسوس کے ساتھ احساس ہے کہ نقوش کو اردو کے گنتی کے چند وقیع رسائل میں شمار کرتے ہوئے بھی اُس کے لیے کچھ نہ کر سکا اور جو کچھ کیا وہ نہیں کے برابر ہے۔ لیکن قائل ہُوں طفیل کی وضع کا جس میں مجھے شروع سے خلوص اور محبّت کا عنصر نمایاں طور پر محسوس ہوتا رہا۔ وہ مجھے نقوش برابر بھیجتے رہے اور تقاضے کے خطوط مسلسل لکھتے رہے۔ یہ ثبوت اس کا ہے کہ طفیل کو ایک طرف تو نقوش کے ساتھ لگن تھی دوسری طرف جن لکھنے والوں کو انہوں نے اپنے رسالے کے لیے منتخب کیا تھا اُن پر اِن کو اعتماد تھا کہ جلد یا بدیر وہ ضرور کچھ لکھ کر بھیجیں گے۔

طفیل نے معصوم طبیعت پائی ہے۔ وُہ بچوّں کی طرح رُوٹھ بھی سکتے ہیں اور بہت جلد منا سے بھی جا سکتے ہیں۔ یہ احساس مجھے اُس وقت سے ہے جب مَیں اُن سے ملا نہیں تھا۔ صرف مراسلت کا رشتہ درمیان تھا اور ملنے کے بعد میرا یہ احساس مضبوط ہو گیا۔ لیکن وہ محض معصوم نہیں ہیں۔ وُہ بعض اُن بچوّں کے مانند ہیں جن کے ذہن عمر سے زیادہ بالغ اور رسا ہوتے ہیں اور جو بالغوں سے زیادہ آدمیوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنی اس صلاحیت کا بڑی معصوم بے باکی کے ساتھ سیدھے سادے مگر دلنشیں انداز میں اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اُس وقت ہُوا جب میں نے ان کی وُہ کتابیں پڑھیں جو باہم ایک سلسلہ ہیں۔

جنوری ۱۹۶۷ء کے اواخر میں، لاہور کی تین ادبی نشستوں میں مجھے اِن سے دیر تک ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا۔ اور اسی وقت مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وُہ باتیں کم کرتے ہیں مگر کام کی کرتے ہیں گرد و پیش بیٹھے ہُوئے لوگوں کو نظر جمائے دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کے دیکھنے کے انداز میں بہ ظاہر بچوّں کا سا استعجاب اور تجسس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو اُن کے اِس دیکھنے کے انداز کو غور سے دیکھے گا وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کی نگاہ بڑی درِیاب ہے اور جس شخص پر پڑتی ہے اس کی شخصیت کی ہر تہہ اور ہر زاویہ تک پہنچنے کی اور ڈوب کر جائزہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔ مجھے جتنی بار موقع ملا ہے اس کو عینک کے پیچھے سے دیکھتے ہوئے بہت غور سے دیکھا ہے اور ان کی جویا اور خاموشی کے ساتھ دریافت کرنے والی نگاہوں سے بڑا لطف حاصل کیا ہے۔

پہلے میں طفیل کو صرف نقوش کا مدیر سمجھتا تھا اور یہ آج تک ان کی سب سے بڑی اور قابلِ قدر حیثیت ہے۔ نقوش محض ایک رسالہ ہی نہیں وہ ایک ادارہ کا مقام پا چکا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے پہلے نقوش سال میں کئی بار نکلتا تھا۔ لیکن عرصے سے اُس کا ہر شمارہ سالنامہ ہوتا ہے اور کسی خاص موضوع کے لیے وقف ہوتا ہے۔ موضوع اور اس پر لکھنے والوں کا انتخاب بڑے شعور اور سلیقے کے ساتھ کیا جاتا ہے اور رسالہ کا ہر شمارہ حسنِ نظر اور حُسنِ تدبیر کا پتا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا ہر نمبر ایک معتبر قدر کا حامل ہوتا ہے۔ نقوش کا کوئی شمارہ اب تک ایسا نہیں نکلا ہے جو اپنے موضوع پر قاموسی معلومات کا ذخیرہ نہ ہو۔ ہر شمارہ موضوع کے اعتبار سے اس قابل ہوتا ہے کہ اہلِ تحقیق اس سے استفادہ کریں اور اس کے حوالے دیں اگر طفیل نے اور کچھ نہ کیا ہوتا تو بھی ان کا نقوش اردو زبان اور ادب کی یادگار خدمت ہے۔

لیکن طفیل صرف مدیر ہی نہیں وُہ ایک چونکا دینے والے مصنّف بھی ہیں۔ ان کے مضامین کے چار مجموعے "صاحب"، "جناب"، "آپ" اور "محترم" میں پڑھ چکا ہُوں اور اُن سے لُطف بھی اٹھایا ہے۔ دو مجموعے "مکرم" اور "ناچیز" زیرِ طبع ہیں۔ یہ تمام مضامین ایک مخصوص نوع کے ہیں اور اپنی اپنی جگہ الگ اور مکمل ہوتے ہوئے بھی ایک سلسلہ ہیں۔ سب کے سب مصنف کی اسی متجسس اور دریاب نگاہ کے نتیجے ہیں جس کا ذکر میں کر چکا ہُوں۔ اور جس سے ہم سب کو ہشیار رہنا چاہیے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اردو میں اس نوع کی ادبی تحریریں پہلے نہیں تھیں لیکن اب تک کسی نے اس اہتمام اور درد کے ساتھ اُسے اپنا فن نہیں بنایا تھا۔ ایسے کردار نما قلمی چہرے ہمیں مغربی بالخصوص انگریزی زبان میں کافی ملتے ہیں طفیل نے اس کو اپنا فن بنا لیا ہے جو بلاشبہ ایک جدید انداز کی شخصیت نگاری ہے مصنف جس شخص کو اپنا موضوع بناتا ہے اُس کے قیافے، اُس کی حرکات وسکنات، اُس کی بات چیت سے اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اور وہاں جو کچھ اُس کے ہاتھ لگ جاتا ہے اُس کو بے ساختہ سب کے سامنے لے آتا ہے۔ طفیل کا ہر مجموعہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں متعلق اشخاص کو اپنی اپنی شخصیت کے چند ایسے خم اور گوشے اجاگر نظر آئیں گے جن کا یا تو اُن کو اب تک کوئی علم نہیں تھا یا وہ جان بُوجھ کر اُن کو چھپائے ہُوئے تھے۔ یہ ایک ایسا کمال ہے جسے فنِ شخصیت نگاری میں اُونچا درجہ حاصل ہے۔ طفیل نے اب تک جن شخصیتوں پر اپنے فن کا اظہار کیا ہے ان میں کچھ تو ایسے ہوں گے جو سُنی اَن سُنی کر دیں۔ بہتیرے ایسے ہوں گے جو طفیل سے بلاوجہ مکدّر ہو جائیں لیکن کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوں گے جو چونک کر خود اپنے بارے میں، ایمانداری کے ساتھ سوچنے لگیں۔

جن چار مجموعوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے اُن میں ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی طرف ذہن جلد منتقل نہیں ہوتا اور وُہ ہے مصنّف کا حُسنِ اہتمام اور بندوبست۔ طفیل نے بڑی مرتبہ شناسی اور ہُنر مندی کے ساتھ اپنی مجلس آراستہ کی ہے۔ جن لوگوں کو "صاحب" کی صف میں جگہ ملنا چاہیے اُن کو وہیں جگہ ملی ہے۔ جو لوگ "جناب" کی صف کے لائق ہیں اُن کو کسی اور صف میں نہیں رکھا گیا ہے۔ اسی طرح نہ "آپ" کو "محترم" کے ساتھ مخلوط کیا گیا ہے نہ "محترم" کو "آپ" کے ساتھ!

طفیل کا اندازِ بیان سادہ اور بے تکلف ہے۔ ان کے مزاج میں مزاح کا ایک میلان ہے جو مہذّب شوخی کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ کسی کا مضحکہ نہیں اُڑاتے۔ ہجو و استہزا ان کا شیوہ نہیں۔ کسی کو رُسوا کرنا ان کا مقصد نہیں۔ شخصیتوں کے مزاج و کردار میں ان کو جو خُوبیاں ملتی ہیں۔ ان کو تمام کمزوریوں کے ساتھ جو چھپی رہتی ہیں، ہلکی پھلکی ظرافت اور ایک فن کارانہ انداز میں بغیر ہچکچائے ہُوئے سب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور یہ انداز اُن کا اپنا ہے اور بس ——— یا باقی پھر!

طفیلیات

ڈاکٹر محمد حسن

چاہ کن را چاہ درپیش۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ جو دُوسروں پر خاکے لکھے گا ایک دن اس پر بھی خاکہ لکھا جائے گا۔

محمد طفیل کے خاکوں میں دو بنیادی عناصر ہوتے ہیں، ایک محمد طفیل اور دوسرا ان کے طفیل میں ممدوح کا ایسا بانکا ترچھا روپ جو خود صاحبِ تصویر کی نظروں سے چھپا ہو۔ ان کے علاوہ کچھ اک " رنج گراں باریٔ زنجیر" بھی ہوتا ہے جسے محمد طفیل کا گھریار قلم اور تیکھا طرزِ تحریر نشاط میں تبدیل کر دیتا ہے۔

محمد طفیل کے بارے میں شاید سب سے انوکھی بات یہی ہے کہ وُہ قطعی طفیلی نہیں ہیں، بلکہ ان کے طفیل 'نقوش' نے نئی زندگی پائی اور نقوش کے طفیل اردو کے بہت سے نئے ادیب اُبھرے، پُرانے ادیب چمکے اور اردو ادب پر نیا نکھار آ گیا۔ پھر انہی محمد طفیل کے طفیل بے رنگ خاکوں میں ایسے سجیلے رنگ بھرے گئے کہ بہار آ گئی بظاہر سیدھی سادی شخصیتوں کے ایسے ایسے خط و خال واضح ہوئے کہ آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال بن گیا۔

قصّہ مشہور ہے کہ ایک بار کسی بادشاہ نے مصوّروں کی دو ٹولیوں کا مقابلہ کرایا۔ دونوں کو قصرِ شاہی کی دو متقابل دیواروں پر بے مثال نقش و نگار بنانے تھے۔ دیکھنا یہ تھا کہ کون زیادہ بہتر تصویریں بناتا ہے۔ ایک گروہ جی جان سے نقش و نگار بنانے میں لگ گیا، دوسرے گروہ نے پردہ ڈال کر مقابل کی دیوار کو ایسا صیقل کر دیا کہ جب پردہ ہٹایا گیا تو سامنے کی دیوار کے نقش و نگار زیادہ نکھرے اور سُتھرے انداز سے اس آئینہ ایسی دیوار میں جھلک رہے تھے۔ محمد نقوش کا فن بھی کچھ اسی ڈھب کا ہے۔ یہ اپنی شخصیت کو آئینہ ایسی صیقل سے آراستہ رکھتے ہیں۔ اور جہاں کہیں کوئی دلچسپ شخصیت نظر آتی ہے اپنی شفاف شخصیت کو لا سامنے کر دیتے ہیں کہ اس کے سبھی نقش و نگار ان کی اپنی شخصیت، ان کے اپنے طرز کے آئینے میں جھلکنے لگیں۔

محمد طفیل نے بڑی ریاضت سے اپنی شخصیت کو شفاف بنایا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ شخصیت آئینہ نہ ہو شیشہ ہو جس سے نگاہیں آسانی سے آر پار ہو جاتی ہیں، گرد کدورت سے پاک، ادیبوں ایسی کاٹ پیچ کرنے والی، ایک دوسرے سے برسرِ پیکار قوم کے درمیان رہ کر اور ان سے معاملہ کرتے ہوئے اپنے دامن کو کدورتوں سے سمیٹ لے جانا حیرت خیز کام ہے اتنا حیرت خیز کہ بیسویں صدی کے معجزوں میں اس کا شمار کرنا چاہیئے۔

سیدھے سادے طویل قامت، گداز جسم والے محمد طفیل کو باطنی زندگی گزارنے میں بڑا لطف آتا ہے ان کی شخصیت اس آرام دہ موٹر کار کی مانند ہے جو موسمی اثرات سے محفوظ کر لی گئی ہو۔ دبیز پردوں اور آرام دہ سیٹوں سے

آراستہ ہو چاروں طرف شفاف شیشے لگے ہوں جن سے باہر کی دنیا کا نفی راصاف نظر آتا ہو۔ محمد طفیل اسی شخصیت کے اسی آرام دہ خول میں مزے سے سفر کرتے ہیں جہاں کہیں جاتے ہیں بقول میراجی :

"میرے پیارے لوگو ! میرے پاس آؤ !"

پرکار بند نہیں ہوتے بلکہ پبلسٹی سے گریزاں بلکہ شرمندہ اور حیران سے نقوش پرستوں کے مجمع سے دامن کشاں سے ادیبوں سے کچھ اس طرح ملتے ہیں جس کا بیان فارسی کے ایک شاعر نے اس طرح کیا ہے :

"دم بہ دم با من و ہر لحظہ گریزاں از من"

یہ ہیں محمد طفیل، جب کوئی ان سے بات کرتا ہے یہ گویا اپنے معمل کے لٹمس پیپر پر اس کی باتوں کے نقش اور رنگ اُبھرتے دیکھتے رہتے ہیں کیسی شخصیت اُبھر رہی ہے ! کیسے رنگ کس قسم کے دائرے یا نقش بنا رہے ہیں ! ممکن ہے باتیں کرنے والا اسنا رہی داستانِ امیر حمزہ ختم کرلے اور یہ ایک چونکا دینے والا جملہ سوچتے رہ جائیں یہ بھی اس لیے نہیں کہ چونکا دینا ان کا فن ہے یا انھیں سننے یا پڑھنے والوں کی واہ وا عزیز ہے بلکہ محض اس لیے کہ اچھا جملہ ان کے نزدیک کارِ ثواب ہے بلکہ عین عبادت ہے جس کے ستھرے پن اور نفاست کے اس نظام اقدار میں اہم مقام حاصل ہے جسے محمد طفیل تہذیب جانتے ہیں۔

جی ہاں ! محمد طفیل کو نفاست عزیز ہے اور ان کے نزدیک نفاست انسانیت کا دوسرا نام ہے نفاست ان کے ہاں امارت کے ہم معنی نہیں سلیقے سے عبارت ہے نقوش پڑھنے والوں کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر صفحے پر محمد طفیل کی فطری نفاست کی مُہر ثبت ملے گی لیکن نقوش کے صفحوں سے باہر بھی نفاست محمد طفیل کی شخصیت کی کلید ہے ہر چیز قرینے سے ہر نکتہ مقام سے ہر لفظ طریق سے حتیٰ کہ خاموشیاں بھی اپنی جگہ پر ! یہ ہیں محمد طفیل۔

اور نفاست کے اس معیار نے محمد طفیل کو ایک اور بڑا وصف بخش دیا وُہ ہے بے تکی باتوں سے مرعوب نہ ہونے کا وصف، ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی بڑا ادیب، وزیر یا بقول تاباں "توپ" کیوں نہ ہو، آخر ہے انسان ہی تو پھر اس کے لوازم سے رعب کھانا چہ معنی دارد ! میرا خیال ہے کہ جس ایک خصوصیت نے محمد طفیل کے لکھے ہُوئے خاکوں میں جان ڈال دی ہے وہ یہی عدم مرعوبیت ہے۔ آپ، جناب، معظم، محترم وغیرہ وغیرہ میں یہ خصوصیت لالی دھاگے کی طرح صاف جھلکتی ہے مرعوبیت نہ ہو تو رشتہ موضوع اور مصنّف کا نہیں رہتا شخصیت اور فن کا ہو جاتا ہے اور سوال سیدھا سادا یہ رہ جاتا ہے کہ زندگی کے سادہ ورق پر دئے ہوئے وقت میں کون کس قسم کے نقش و نگار بنا سکا ہے اور کیسے ؟ باقی تمام فضائل و مناقب فرضی، تمام تشبیب و گریز مہمل ! سیدھے سادے لفظوں میں یُوں کہیے کہ محمد طفیل "برہنہ حرف گفتن" کے قایل ہیں اور اس برہنگی میں وہ شائستگی اور ہُنر مندی ہے جس پر ہزار رنگینیاں قربان ہیں (بے جھجک تنقید کے نمونے دیکھنے ہوں تو مولانا کوثر نیازی اور منٹو کے خاکے پڑھ ڈالیے)

محمد طفیل کے نزدیک ہر شخص ایک اسٹائل ہے محض اسٹائل اور اس اسٹائل کی کھوج وُہ اپنی رگوں میں

دوڑتے پھرنے والی عکس ریز نگاہوں سے کرتے ہیں بعض اسٹائل معلق ہوتے ہیں لفظ آپس میں دست وگریباں، معنی لفظوں سے برسرِ پیکار۔ محمد طفیل ان سب کو اپنی اپنی جگہ بٹھاتے ہیں، ان کی باتیں سُنتے ہیں اور پھر ان کا ایک پیٹرن یا آہنگ بنانے کی کوشش کرتے ہیں کچھ اسٹائل نظر فریب ہونے کی حد تک سادہ ہوتے ہیں لیکن اس فریب سے آگے قدم بڑھائیے کہ پیچیدگیاں دامن کش ہوتی ہیں، وُہ بھی ایسی جیسے کہتی ہوں کہ 'جا ایں جا است' محمد طفیل ان پیچیدگیوں میں غلطاں پیچاں 'توشب آفریدی چراغ آفریدم' گنگناتے گردش کرتے نظر آتے ہیں غرض محمد طفیل کے خاکوں کے موضوع گویا الگ الگ کائناتیں ہیں جو شخصیت کی سطح پر آباد ہیں اور محمد طفیل غالب کے لفظوں میں شطرنجی اور لوٹا لیے کبھی بغداد پہنچے کبھی ایران جا دھمکے۔ الفاظ غالب کے نہیں مفہوم غالب کے ایک خط کا ضرور ہے اسی طرح جیسے شخصیت دُوسرے کی ہوتی ہے اور مفہوم محمد طفیل کا۔

محمد طفیل کا آرٹ برجستہ بلیغ مختصر جملوں کا آرٹ ہے! WIT کی بڑی خوبی یہی ہے کہ لفظ کم اور پھیلاؤ زیادہ اور پھیلاؤ ایسا کہ کہاں کہاں نہ گئی طبع بدگماں میری۔ طفیل نے اسے جس طرح برتا ہے اس کی مثالیں کم ہیں بہت کم ہیں۔ اُن کا حال یہ ہے کہ سیدھے چلتے چلتے اچانک ایسا موڑ کاٹتے ہیں کہ پڑھنے والا حیرت انگیز انبساط کا شکار ہو جاتا ہے دو قدم بھی سیدھے چل لیں تو سمجھیے کہ نیکی کی جون میں ہیں ورنہ ایک قدم ایران ہے تو دوسرا توران، اور اسی قسم کے تضاد سے طرزِ تحریر میں ایسا انوکھا پن جگا دیتے ہیں کہ بے محابا لبوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی ہے یا دل میں لطیف درد جاگ اٹھتا ہے یا ذہن میں کوئی نیا خیال کروٹ لینے لگتا ہے شرارتیوں کی اصطلاح میں اسے چٹکی کاٹنا بھی کہا جا سکتا ہے مگر طفیل کو در اصل ردِّ عمل سے اتنی غرض نہیں ہوتی جتنی خود عمل سے۔ وُہ نیکی کو کنوئیں میں ڈالنے کے قائل ہیں اس لیے نہ ممدوح کے چیں بہ جبیں سے غرض رکھتے ہیں نہ داد و تحسین سے۔ اُنھوں نے تو گویا اپنی عکس ریز نظروں سے مریخ سے آگے کی سربستہ کائنات کو دریافت کر کے رکھ دیا۔ اب اپنی بلا سے، لوگ خوش ہوں یا ناخوش! خود وہ کائنات اپنی دریافت پہ نوحہ کناں ہو یا شادماں!

ویسے محمد طفیل واہ واہی نہ ہوتے ہوئے بھی اچھے دردمند قسم کے آدمی ہیں اور یہ بات ان کے خاکوں سے اتنی ظاہر نہیں ہوتی جتنی خود ان کی شخصیت کے برتنے سے! وہ دوستوں کے دوست ہیں اور یاروں کے یار ہیں مگر اس قدر خنکی، نرمی اور شائستگی سے جیسے ہوا کا جھونکا آپ کا ہمدم ہو اور اپنے وجود کا احساس تک نہ ہونے دے۔ ان کا حال کچھ ان کلاسیکی قسم کے بزرگوں کا ہے جو سیدھے ہاتھ کی نیکی کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہونے دیتے تھے اور ایسی بہت سی نیکیاں ان کے نامۂ اعمال میں ہیں۔ اس معاملے میں ان کا شمار صوفیہ میں کیا جا سکتا ہے گو صوف نہیں پہنتے بلکہ صوفیانہ رنگ کے لباس سے بھی احتراز کرتے ہیں مگر صفا سے ان کا تعلق البتہ مستحکم ہے۔

اُردو نثر سے درازنفسی کا شکوہ عام ہے غزل میں جتنا ایجاز ہے نثر میں اتنا ہی غیر ضروری پھیلاؤ ہے۔ محمد طفیل نے نثر میں غزل کے شعر کہنے کی روایت قایم کی اور ہر شعر برجستہ اور ہر مصرع سبحل اور سڈول۔ یہ اپنے

خاکوں میں بھی لکیروں سے نہیں نقطوں سے کام لیتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے عظیم ترین آرٹ وہی ہے جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ اشارے فراہم کر سکے میں نہیں کہہ سکتا کہ محمد نقوش کا آرٹ کتنا عظیم ہے مگر اس میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نکات اُبھار دینے کا ہنر تو ہے۔ مولانا محمد علی کا جملہ ہے کہ "مختصر لکھنے کی فرصت نہیں ہے۔" محمد طفیل کو مختصر نگاری کے اس ریاض کے لیے کتنی ذہنی فرصت درکار ہوتی ہوگی اس کا اندازہ اُن کے جملوں میں ارتکاز سے کیا جا سکتا ہے۔ ہر جملہ کہتا ہے کہ صفحۂ قرطاس پر آنے سے قبل ایک عمر شراب کہنہ کے خم میں گزار آیا ہوں۔

مگر جوں جوں آپ، جناب، محترم، معظم کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے میرا جی دھڑکنے لگتا ہے کہ محمد طفیل کہیں اپنی قلم زوری کے بل پر غلط بخشی پر نہ اتر آئیں آخر شاندار قصیدے کے لیے ممدوح بھی ویسا ہی چاہیے غالب تو "وا دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل" کا ماتم کرتے رہے ممدوح نہ سہی موضوع کی مناسبت عظمت کے بغیر تو خیال بندی سے مضمون گھڑ لینے کافی تو ناسخ تک پہنچا دیتا ہے اور "ملے بود در سیستاں" کو بھی فردوسی کا قلم رستم بنانے میں بے طرح لگ جاتا ہے۔ جی یہی چاہتا ہے کہ طفیل اب جو تصویر اس نگار خانے کے لیے چنیں وہ ہلکی نہ ہو بلکہ پورے مرقعے کی جادوگری اور طلسم خیزی سے لگا کھاتی ہو۔

اور اس سے آگے اپنے زمانے کے ممتاز اور منفرد مختصر نویس کے بارے میں کچھ اور کہا تو طوالت کا الزام سر آئے گا اور کوئی وہ مصرع دُہرائے گا ؏

کہا جو کچھ تو ترا حُسن ہو گیا محدود

———

محمد طفیل کے خاکے اور فنِ خاکہ نگاری

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی

اس وقت میری میز پر نیلی روشنائی کی ایک دوات اور پانی کا ایک گلاس رکھا ہے۔ میں روشنائی کا ایک قطرہ پانی کے گلاس میں ٹپکا دیتا ہوں پانی نیلا ہو جاتا ہے۔ پھر ایک قطرہ اور ٹپکا دیتا ہوں۔ لیجئے نیلے رنگ کا ایک اور شیڈ وجود میں آ گیا۔ اس طرح پانی کے ایک گلاس اور نیلی روشنائی کی ایک دوات سے نیلے رنگ کے ایک ہزار آٹھ سو شیڈ وجود میں آ سکتے ہیں اور اگر کسری ترکیبات کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو انہی دو چیزوں سے نیلے رنگ کے لاتعداد شیڈ وجود میں آ جائیں گے یہ صرف دو اجزا کی ہیئت ہائے ترکیبی کا حال ہے۔ شخصیت کے اجزائے ترکیبی بھی سیکڑوں ہو سکتے ہیں اس لیے ان کی ترکیب سے وجود میں آنے والی ہیئت ہائے ترکیبی کا حصر و شمار تو ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک دنیا میں کوئی دو آدمی ایسے نہیں ہوئے جنہیں شخصیت کے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے بالکل یکساں قرار دیا جا سکے۔ محمد طفیل نے یہی بات ان لفظوں میں کہی ہے:

"پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں مثلاً گلاب کا پھول، اس کے سو رنگ ہیں۔ یہی حال شخصیتوں کا ہے۔
انسان ایک ہے مگر اس کے رُوپ سو۔ کہاں کہاں انسان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بس
اسی نازک سے فرق کے اظہار کے لیے کبھی کبھار قلم اٹھا لیتا ہوں۔" (مجبی ص ۵۱)

جی ہاں! یہی اس صنعت کا جواز ہے جسے خاکہ کہتے ہیں۔ اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاکے کی غایت محمد طفیل کے ذہن میں پوری طرح واضح ہے اس لیے اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہو گیا کہ خاکے کے قواعد و شرائط، حدود و قیود ــــ اس صنعت کے خدشات و ممکنات، مشکلات و موانع اور خود خاکہ نگار کی مجبوریوں اور معذوریوں پر ان کی نظر کتنی گہری ہے!

فرمان فتحپوری، محمد طفیل سے نیاز فتحپوری کا خاکہ لکھوانا چاہتے ہیں۔ محمد طفیل جواب میں کہتے ہیں:

"نیاز صاحب کے بارے میں میری معلومات ناقص نہ سہی محدود ضرور ہیں۔ اتنی مختصر یادوں کے سہارے
مجھ سے اتنی بڑی شخصیت کا جھٹکا نہ کرائیں۔" (آپ ص ۲۳)

گویا طفیل صاحب کے نزدیک ضروری ہے کہ خاکہ نگار صرف اس شخصیت پر قلم اٹھائے جس کے بارے میں اس کی معلومات معیاری بھی ہوں اور وافر بھی۔

"میں نقاد نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں ڈنڈی مار دوں۔ میرا موضوع شخصیتوں کا مطالعہ ہے جس میں

جھوٹ نہیں چلتا۔" (آپ ص ۲۴)

جھوٹ تو تنقید کے میدان میں بھی نہیں چلتا اور شخصیت نگاری میں بھی لوگ ڈنڈی مار جاتے ہیں لیکن اس وقت یہ باتیں ہمارے دائرہ بحث سے باہر ہیں۔ اس اقتباس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ طفیل صاحب کے نزدیک صداقت اور غیر جانبداری خاکہ نگاری کے اہم تقاضے ہیں۔

"یہ چار مضمون میں نے سات برس میں لکھے ہیں۔ ایک لحاظ سے پہلے دو مضمون میں نے بیس برس سے زاید عرصے میں لکھے ہیں، اس لیے کہ نیاز صاحب اور جوش صاحب کو میں ایک مدت سے پڑھ رہا تھا۔" (تمہیدیہ "آپ")

"اللہ کا شکر ہے کہ بعد میں بھی جوش صاحب سے ملنا جلنا رہا، ورنہ میری بھی ان کے بارے میں وہی رائے ہوتی جو اس وقت آپ کی ہے، یہی کہ بدتمیزی کی حد تک مذہب دشمن ہیں۔"

(آپ ص ۴۳)

گویا خاکہ نگاری میں تعلقات کی عمر بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ دو چار سرسری سی ملاقاتوں کے بعد کسی شخص کا خاکہ لکھنے بیٹھ جانا خاکہ نگاری کے تقاضوں کے منافی ہے۔ اس قسم کی سہل انگاری کے نتیجے میں شخصیت کی جو تصویر بنے گی وہ مکمل ہو گی نہ قابلِ اعتماد۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ نہ دل مطمئن ہے نہ دماغ، اس لیے کہ یہ مضمون مجھ سے زبردستی لکھوائے گئے ہیں۔"

(تمہیدیہ "آپ")

کسی مجبوری، کسی لالچ، فرمائش یا دباؤ کے تحت لکھے ہوئے خاکے قابلِ اعتماد اور معیاری نہیں ہو سکتے، چنانچہ خاکہ لکھنے کے لیے اس وقت تک قلم ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے جب تک اس کی چٹک دل کو نہ لگی ہو۔ حالیؔ نے یہ بات شعر کے بارے میں کہی تھی، یہاں مجھے یاد آیا کہ نقادوں نے "ایک وصیت کی تعمیل" کی تعریف کی ہے۔ اس خاکے پر محنت ضرور ہوئی ہے اور فرحت اللہ بیگ کی محنت رائیگاں بھی نہیں گئی۔ لیکن "نذیر احمد کی کہانی" والی بات پیدا نہیں ہو سکی کیونکہ یہ بہر حال ایک فرمائشی چیز ہے۔

"مجھے اپنی مضمون آرائی سے زیادہ شخصیت کی باطنی عصمت سے بھی غرض ہے۔" (مجی ص ۳۶)

"مجھے کبھی بھی اپنے مضمون کی بہتری کا خیال نہیں رہا۔ مگر یہ خیال ضرور رہا کہ جس کے بارے میں لکھ رہا ہوں وہ ہر طرح سے سامنے آئے، ہر رنگ میں سامنے آئے۔" (معظم ص ۴۲)

جس طرح رعایت لفظی کا التزام بسا اوقات معانی کا خون کر دیتا ہے۔ اسی طرح انشا پردازی کے جوہر دکھانے کی خواہش بعض اوقات شخصیت کی تصویر کو مسخ کر دیتی ہے اس لیے خاکے میں انشا پردازی کی چکا چوند کو نہیں موضوعِ خاکہ کو اہمیت دینی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ شخصیت کے صرف ایک پہلو پر انحصار و اکتفا نہ کیا جائے

کیونکہ اس صورت میں جو تصویر بنے گی وہ بھی صرف ایک ہی پہلو کی تصویر ہوگی۔

"ماحول اور تربیت کے اثر سے بھی شخصیت کے پرت کھلتے ہیں۔" (معظم ص ۱۰۵)

چنانچہ شخصیت کی تلاش میں ماحول اور تربیت کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ بسا اوقات مظاہر شخصیت کی جڑیں انھی زمینوں پر پیوست ملیں گی۔

"یہ مضمون کتاب (آواز دوست) پر کم اور صاحب کتاب (مختار مسعود) پر زیادہ تر ہے، کیونکہ میرے نزدیک فساد کی نہیں، بنائے فساد کی اہمیت ہے۔" (معظم ص ۱۰۸)

یہی خاکہ نگاری کا اصول ہے۔ موضوع ایک شخصیت ہے کوئی تحریر نہیں، البتہ اس شخصیت کو سمجھنے کے لیے ضرورت پڑے تو تحریر سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

"حرکات و سکنات، عادات و اطوار، کرامات و انکشافات کے ذکر سے پہلے ضروری یہ ہے کہ ہم ممدوح کی سوچوں کو پکڑیں۔ اگر یوں نہ ہوگا تو اس مضمون میں صرف شخصیت کا خول نظر آئے گا، شخصیت کی رُوح نظر نہیں آئے گی۔" (معظم ص ۱۱۱)

"حرکات وسکنات، عادات و اطوار، کرامات و انکشافات تو مظاہر شخصیت ہیں، ان کے پیچھے کہیں وہ فکری روح بھی موجود ہوتی ہے جسے گرفت میں لانا خاکہ نگار کا مقصود ہے" جس کسی کا خاکہ لکھا جائے اس کی کھال کھینچ کر رکھ دینا درست ہے۔" (مجبی ص ۵۲)

"میرا قلم تو صرف اسی "دشمن" کے لیے رواں ہوتا ہے جس سے مجھے تعلق خاطر ہو۔" (مجبی ص ۵۰)

تضاد؟ جی نہیں۔ دشمن کے گرد جو اوبن لگے ہیں ان پر نظر رکھیے۔ خاکہ اسی شخص کا لکھا جاتا ہے جس سے تعلق خاطر ہو۔ اگر خاکے کا محرک تعلق خاطر نہیں کوئی اور چیز ہے مثلاً انتقام یا خوشامد تو ایسی تحریر میں خاکے کی صفات پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔

"جو کسی کو ایک حال میں دیکھتا ہے وہ کسی طرح کے مضامین لکھ سکتا ہے خاکہ نہیں لکھ سکتا۔" (مجبی ص ۱۶۶)

خاکہ نگار کو چاہیے کہ صبر و سکون سے شخصیت کا مطالعہ کرتا رہے حتیٰ کہ افعال و صادرات کے ذریعے موضوع خاکہ کے بیشتر یا تمام تر اہم پہلو اس کے سامنے آ جائیں۔"

"میرے نزدیک خاکہ نگاری خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے یعنی جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہو، اس کے عین مین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے۔" (مجبی ص ۷)

یہ ایک عینی تصور ہے۔ خاکہ نگاری کی کوشش بہر حال یہی ہونی چاہیے۔

"دوسری طرف مراسم کا پھندا کوئی کیں کرے کیا نہ کرے۔" (مجبی ص ۵۲)

جی ہاں یہ مجبوری ضرور لاحق ہوتی ہے۔

"میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ حرف بہ حرف سچ ہوتا ہے۔ شخصی تحریروں میں یادوں کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔ یادیں دھندلی ہوتے ہوتے معدوم بھی ہو سکتی ہیں۔" (جناب ص ۱۴۱)

یعنی تمام تر احتیاط کے باوجود سو فیصد صداقت کا دعویٰ بہت مشکل ہے۔

"انسان بڑا ہی عاجز اور بے بس ہے وہ ایک چیونٹی اور ایک پتے کی ماہیت کا بھی اندازہ نہیں لگا سکتا چہ جائیکہ وہ انسان کو سمجھنے کا دعویٰ کرے۔ بہرحال میرا دل چاہتا ہے کہ ایسی نارسائیوں کے باوجود، میں چند باتیں بشیر کے بارے میں کروں اور چند باتیں موجد کے بارے میں۔" (مجتبیٰ ص ۱۴۴)

انسان کے اندر ایک دنیا آباد ہے۔ ہر انسان بجائے خود ایک کائناتِ صغریٰ ہے۔ علمائے نفسیات ہوں یا ماہرینِ اخلاقیات، اہلِ خانقاہ ہوں یا اہلِ مدرسہ، انسان کو پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہم انسان کو سمجھنے کی کوشش ہی ترک کر دیں۔ مکمل کامیابی تو ممکن نہیں لیکن جس حد تک ہمارے احاطۂ امکان میں ہے اس حد تک اس گورکھ دھندے کو سمجھنے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ سماجی اور باطنی علوم کے علماء و ماہرین کی کوششوں سے انسان کے ذہنی، نفسی اور باطنی کوائف کے بارے میں بعض باتیں معلوم بھی ہو چکی ہیں مگر ان انکشافات سے انسان کو سمجھنا آسان نہیں ہوا۔ کیونکہ ان انکشافات کے بعد انسان اپنے بارے میں اور زیادہ چوکنا ہو گیا ہے اس ڈر سے کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے، اس نے اپنے خول کو اور زیادہ دبیز کر لیا ہے، وہ اپنے آپ سے بھی چھپنے لگا ہے۔ ماہرینِ نفسیات تو کیا، وہ دوستوں کو بھی اپنے اندر جھانکنے کا موقع نہیں دیتا۔ کیمرہ وجود میں آیا تو انسان کیمرہ کانشس ہو گیا۔ اب تصویر میں اصل چہرہ ذرا مشکل ہی سے ملتا ہے۔

"یہ دنیا اتنی نا اعتباری ہو گئی ہے کہ انسان کو کمپیوٹر کے ذریعے بھی پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ صورت حرام لوگ تو تھے ہی اب تکلم حرام بھی ہو گئے۔ پہلے لوگ کہا کرتے تھے کہ زبان سے نکلے ہوئے دو جملے بھی انسان کو پہچاننے میں مدد دے سکتے ہیں۔ اب تو لوگ گفتگو کریں گے تو ایسی پیاری کہ دل جھوم اُٹھے۔ عمل سامنے آئے گا تو شیطان بھی شرمندہ ہوگا۔ اب تو یہ حال ہے کہ دل کا حال اللہ ہی جانے تو جانے۔ یہ دنیا تو آرٹسٹ ہو گئی۔" (مجتبیٰ ص ۱۶۲)

خاکہ نگار کا اصل کام ہی یہ ہے کہ ستر پردوں میں چھپی ہوئی "شخصیت" کو ڈھونڈ نکالے۔

"درخت کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ درخت جتنا اونچا ہوگا اتنی ہی جڑیں گہری ہوں گی۔ اصل درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوتا ہے۔ یہی حال اشخاص کا ہے۔ جو شخص جیسا ہے وہ وہی کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بہت کچھ چھپا ہوتا ہے۔ شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے صرف زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لینا شخصیت سے آگاہی کی ذیل میں نہیں آتا۔ شخصیت سے آگاہی

صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی ہوئی شخصیت میں اتر جائے۔" (آپ ص ۱۲۸)

گویا شخصیت کے ظاہر پر اکتفا کر لینا محض سہل انگاری ہے۔ اصل شخصیت تو انسان کا باطن ہے۔ اگر انسان کی باطنی کیفیات تک رسائی حاصل نہ ہو سکے تو سمجھیے کہ خاکہ ناکام ہو گیا۔

"جو شخص جس شیشے میں اُتر سکتا تھا، میں نے اُسے اسی شیشے میں اتارا۔" (حرفے چند 'معظم')

پہلے سے کوئی معیار مقرر کر کے چلنا خاکہ نگاری میں ممکن نہیں، کوئی بنا بنایا فارمولا یا کوئی معیار ایسا نہیں جس کے ذریعے ہر شخصیت کو سمجھا جا سکے۔ مختلف شخصیتوں کے لیے مختلف شیشوں کی ضرورت ہو گی۔

میرے پاس ایک قیمتی تالا تھا۔ سوءِ اتفاق سے اس کی چابی کھو گئی۔ میں نے کُنجیاں بنانے والے ایک کاریگر سے رابطہ قایم کیا، اس کے پاس کم از کم اڑھائی ہزار چابیاں ضرور ہوں گی۔ اُس نے تالے کا بغور جائزہ لیا پھر تالے کی مجموعی ہیئت اور سوراخ کی نوعیت سے مطابقت رکھنے والی پندرہ بیس چابیاں یکے بعد دیگرے آزمائیں مگر کوئی چابی نہ لگی۔ تب اس نے خاصی احتیاط اور غور و خوض کے بعد ایک چابی منتخب کی۔ پھر اس کے تین دندانوں میں سے ایک دندانہ تین مختلف زاویوں سے گھسا کر دیکھا۔ بات نہ بنی۔ پھر اسی چابی کا دوسرا دندانہ مختلف زاویوں سے رگڑ کر دیکھا اب بھی بات نہ بنی۔ تب وہ صحیح نتیجے پر پہنچ گیا اور تیسرا دندانہ ایک خاص زاویے سے گھسا کر چابی لگا دی۔ شخصیت کے لیے بھی بنی بنائی چابیاں نہیں ملتیں، بنے بنائے سانچے یہاں کام نہیں دیتے۔ مجھے یقین ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جو میری یا آپ کی شخصیت کو پُوری طرح احاطہ کر سکے۔ میں بُزدل ہوں اور فرض کیجیے آپ بھی بُزدل ہیں۔ دنیا میں لاکھوں لوگ بزدل ہیں۔ ان لاکھوں لوگوں میں میری اور آپ کی شناخت کیسے ہو گی۔ بزدلی کی بیسیوں سطحیں اور درجے ہو سکتے ہیں۔ بزدلی کے سیکڑوں اسباب ہو سکتے ہیں اور بزدلی کے مظاہر تو ہزاروں سے بھی بڑھ سکتے ہیں۔ میری بزدلی شخصیت کے دوسرے عناصر کے ساتھ مل کر ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور آپ کی بزدلی آپ کی شخصیت کے دوسرے عناصر کے ساتھ ترتیب پا کر ایک بالکل مختلف صورت اختیار کر جاتی ہے۔ خاکے کی دنیا میں کوئی MASTER - KEY نہیں ہوتی۔ یہاں شخصیتوں کے قفل کھولنے کے لیے الگ الگ چابیوں کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات چابی بنانی پڑتی ہے۔

"صرف عیب جوئی شخصیت نگاری نہیں اور نہ ہی عیب پوشی کا نام شخصیت نگاری ہے۔ میرے نزدیک تو خوفِ خدا کے ساتھ فن کارانہ عکاسی کا نام شخصیت نگاری ہے۔" (مکرم ص ۱۵)

زیرِ نظر شخصیت، اس کے احباب و اعزہ، اس کے اغیار و اعداء، اور ناقدینِ فن کی رائے تحسین یا خفگی سے بھی زیادہ اہم چیز خوفِ خدا ہے۔ خاکہ نگار خدا کے سامنے بھی جواب دہ ہے، اور خدا علیم و خبیر ہے۔

"کچھ دوست بڑے دلچسپ سوال کرتے ہیں۔ مثلاً فلاں مضمون اچھا ہے اور فلاں مضمون اتنا

> اچھا نہیں۔ اسکیچ نگاری میں اچھا مضمون ہونا یا اچھا مضمون نہ ہونا، بڑی حد تک زیرِ بحث شخصیت پر منحصر ہوتا ہے۔" (مکرم ص ۱۴)

عام لوگ اچھا خاکہ اسے کہتے ہیں جو دلچسپ ہو، اور عام لوگوں کے نزدیک دلچسپ آدمی وُہ ہوتا ہے جو بزم آرائی کا فن جانتا ہو، خواہ اس کی بزم آرائی یاوہ گوئی اور مسخرگی تک محدود ہو۔ یا وہ شخص دلچسپ سمجھا جاتا ہے جو نمایاں طور پر ابنارمل یا ECCENTRIC ہو۔ میراجی نمایاں طور پر ECCENTRIC تھے۔ چنانچہ ان کے غیر معمولی عادات و اطوار کا تذکرہ خواہ مخواہ دلچسپ ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ زیادہ فنکارانہ سلیقے یا صناعی کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ فنکارانہ کمال اس بات میں ہے کہ نارمل یا بظاہر نارمل شخصیت کی دلکشی کو سلیقے سے اُجاگر کیا جائے۔ جو شخص پہلے ہی سر کے بل کھڑا ہو، اس کی طرف تو صرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔ لوگ اس میں دلچسپی لینے لگیں گے کیونکہ ابنارمیلٹی بجائے خود پُرکشش چیز ہے لیکن نارمل آدمی کی شخصیت کو پُرکشش اور جاذبِ توجہ (یا فکر انگیز، اگرچہ یہ ضروری نہیں) بنانے کے لیے محنت، نفسیاتی بصیرت، گہرے مشاہدے اور فنی سلیقے کی ضرورت ہے۔ اس شخص کا خاکہ لکھنا بھی بہت آسان ہے جس کی انفرادیت کسی غیر معمولی خصوصیت تک محدود ہو اور وہ غیر معمولی خصوصیت اس درجہ نمایاں ہو کہ اس کی شخصیت کی کلید بن جائے۔ مثلاً حد سے بڑھی ہُوئی انانیت، دولت سے جنون کی حد تک پہنچی ہُوئی محبت، ہڈیوں میں اترا ہُوا اور شخصیت کے تمام مظاہر میں جھلکنے والا خوف، شرافت، دیانت، مروّت سب کو ہڑپ کر جانے والی خود غرضی ——— کیونکہ ایک خصوصیت کو گرفت میں لینا اور شخصیت کے تمام مظاہر میں اس کا سراغ لگا لینا کسی خاص فنی مہارت یا نفسیاتی بصیرت کا تقاضا نہیں کرتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ شارٹ کٹ صحیح نتائج تک ہماری رہنمائی کر بھی سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب اثبات میں بھی دیا جا سکتا ہے اور نفی میں بھی۔ اگر خاکہ نگار نے شخصیت کی صحیح کلید دریافت کر لی ہے یعنی شخصیت کی کلید کے طور پر اس خصوصیت کو اہمیت دی ہے جو حقیقتاً اس کے تمام عواطف و جذبات، رجحانات و میلانات اور مظاہر شخصیت کا منبع و مصدر ہے تو خاکہ صحیح نتائج تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے اور اگر خاکہ نگار نے کسی ایسی خصوصیت کو جو درحقیقت ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور کسی دُوسری خصوصیت کا محض ایک نتیجہ یا مظہر ہے، بنیادی اہمیت دے کر اسے کلید کا درجہ عطا کر دیا ہے تو شخصیت کی تصویر مسخ ہو کر رہ جائے گی اور خاکہ صحیح نتائج تک ہماری رہبری نہیں کر سکے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کسی شخص کے جذبۂ خدمت کو اس کی شخصیت کی کلید قرار دے کر اس کی پوری زندگی کو جذبۂ خدمت کا نمونہ بنا کر رکھ دیں جبکہ اس کا جذبۂ خدمت محض ہوسِ شہرت یا تمنّائے خود فراموشی کا ایک مظہر ہو۔ آپ خوف کو غیر مشروط طور پر کسی شخصیت کی کلید کیسے قرار دے سکتے ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ خوف حُبِّ ذات سے پیدا ہوتا ہے۔ جنونِ مطالعہ شوقِ علم سے بھی جنم لے سکتا ہے اور یہ تلخ حقایق سے گریز کی بھی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اول الذکر صورت میں جنونِ مطالعہ کو نہیں شوقِ علم کو شخصیت کی کلید قرار دینا ہوگا اور موخر الذکر صورت میں اس آزردگی کو جو ناکامیوں کے باعث شخصیت میں گھر کر رہ گئی۔ شوقِ علم بھی ہوا میں جنم نہیں لیتا اور آزردگی یا اُسے جنم دینے والی ناکامیوں کے اسباب بھی

موضوعِ خاکہ کی شخصیت اور اس کے خارجی عالم میں ڈھونڈنے پڑیں گے۔

کرداری افسانے میں یہ سہولت ہے کہ آپ اپنے موضوع کے تخیلی پیکر میں حسبِ ضرورت ترمیم کر سکتے ہیں۔ کردار پاکستان کے پس منظر میں پُوری طرح نہیں اُبھرتا تو اُسے ایران یا افغانستان یا فرانس کے پس منظر میں پیش کر سکتے ہیں ایک خصوصیت پوری طرح شخصیت سے مطابقت نہیں رکھتی تو آپ اس شخصیت کی ہیئتِ ترکیبی بدل سکتے ہیں۔ اس خصوصیت میں کتر بیونت کر سکتے ہیں۔ اس خصوصیت کا جواز اس کے خاندانی حالات یا بچپن کے کسی مفروضہ واقعے سے پیدا کر سکتے ہیں کیونکہ کسی اصل کی مطابقت آپ کے لیے لازم نہیں، فرضی شخصیت (کردار) دلچسپ، خوبصورت اور قرینِ قیاس ہو گئی تو کافی ہے جبکہ خاکے میں دلچسپ، خوب صورت اور قرینِ قیاس ہونے سے بھی پہلے اصل سے مطابقت شرط ہے کیونکہ ایک شخصِ معین آپ کا موضوع ہے۔ اگر آپ کی بنائی ہوئی تصویر اصل سے ذرا بھی مختلف ہو گئی تو اسی نسبت سے خاکہ بھی ناقص قرار پائے گا۔

"میرے خام خیال میں ضروری ہے کہ لکھنے والا شخصیت میں گھسا ہوا نظر نہ آئے بلکہ شخصیت ہی رواں دواں نظر آئے۔ اگر مصنف خود کو لانے پر مجبور ہی ہو تو ایسے جیسے قمیص میں بٹن، نہ کہ بٹن میں قمیص۔" (دیباچہ بعنوان اعترافِ جرم 'صاحب)

چونکہ خاکہ ہمیشہ ذاتی واقفیت کے سہارے لکھا جاتا ہے اس لیے ضمیرِ واحد متکلم کا استعمال تو ناگزیر ہو جاتا ہے مگر لوگ ضمیرِ واحد متکلم کے استعمال سے ناجائز فائدہ بھی تو اٹھاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاکہ موضوعِ خاکہ سے مصنف کے تعلقات کا اشتہار اور خود اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہ ایک قسم کی ادبی بددیانتی ہے کہ پہلے تو لوگوں کو یہ کہہ کر متوجہ کیا جائے کہ صاحبان! آئیے میں آپ کو فلاں صاحب سے ملواؤں اور جب لوگ فلاں صاحب سے ملنے کے اشتیاق میں بھاگے بھاگے آئیں تو تعارف کرانے والا فلاں صاحب کی طرف لپشت کر کے کھڑا ہو جائے اور گردان کرنے لگے "یہ صاحب میرے دوست ہیں، میرا..... میرے .....، میری .....، مجھے .....، مجھ سے .....، میں نے ....."

"بھائی! میں نیاز صاحب کی تحریر کا تو عاشق ہوں مگر شخصیت کا نہیں، بالکل نہیں۔ اسی لیے اب بھی سوچ لیجئے کہ مجھ سے کچھ لکھوانا مناسب بھی ہوگا یا نہیں۔" (آپ ص ۲۴)

گویا اگر آپ کسی کی تحریر کے عاشق ہیں مگر اس کی شخصیت میں آپ کو کوئی دلکشی نظر نہیں آتی تو آپ کو اس شخص کا خاکہ نہیں لکھنا چاہیے۔ البتہ آپ تنقیدی مضمون لکھ سکتے ہیں اور اس میں شخصیت سے بھی حسبِ ضرورت اعتنا کر سکتے ہیں مگر مرکزی اہمیت تحریر کے خصائص ہی کو حاصل ہوگی۔ اور اگر آپ کسی شخص کی شخصیت کے عاشق ہیں یا اس شخصیت میں کوئی دلکشی پاتے ہیں تو آپ کو خاکہ نگار بن کر سامنے آنا چاہیے۔ اس صورت میں اس کی تحریروں سے اعتنا کیا جا سکتا ہے مگر مرکزی اہمیت اس کے کلام یا تحریر کو نہیں، اس کی شخصیت ہی کو حاصل ہوگی۔ نقّاد کا موضوع ہے، تحریر (= کلام، کتاب، کلیات)۔ اور خاکہ نگار کا موضوع ہے: شخصیت۔ نقّاد تحریر کو سمجھنے سمجھانے کے لیے شخصیت سے مدد لے سکتا ہے اور خاکہ نگار شخصیت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تحریر سے مدد لے سکتا ہے۔ ایسی تنقید ممکن ہے جس میں شخصیت کا حوالہ سرے سے

موجود ہی نہ ہو اور ایسا خاکہ بھی ممکن ہے ———— جس میں موضوعِ خاکہ کی کسی تحریر سے مطلق مدد نہ لی گئی ہو بلکہ خاکہ تو ایسے شخص کا بھی لکھا جا سکتا ہے جو سرے سے ادیب ہی نہ ہو۔ نام دیو مالی اور نور خان ادیب نہ تھے لیکن شخصیت رکھتے تھے اور ان کی شخصیتوں میں ایک خاص نوع کی دلکشی بھی موجود تھی۔ چنانچہ ان کی شخصیتوں سے عبدالحق کی دلچسپی ان لازوال خاکوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ "ایوب" کو رشید احمد صدیقی کا بہترین خاکہ سمجھا جاتا ہے۔ ایوب شاعر نہ تھے ادیب نہ تھے عالم نہ تھے لیکن شخصیت کے اعتبار سے وہ خاکہ نگار کا موضوع بن سکتے تھے۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی نے شخصیت نگاری کے لیے ان کا انتخاب کیا اور کمال کر دکھایا۔ بات شاید یوں ہے کہ خاکہ نگار کا موضوع شخصیت ہے اور شخصیت اظہار پاتی ہے بات چیت میں، افعال و اعمال میں، اوہام و عقاید میں، افکار و تصورات میں، عزائم اور امنگوں میں، اسلوبِ حیات میں ———— اور خاکہ نگار شخصیت کو مظاہر شخصیت ہی کے وسیلے سے دیکھ اور دکھا سکتا ہے۔ چونکہ ادب بھی کسی نہ کسی رنگ میں شخصیت کا مظہر ہے اس لیے اس سے بھی مدد لی جا سکتی ہے لیکن صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ اس خاص شخص کی حد تک شخصیت اور ادب میں کس قسم کا تعلق ہے اور کس درجے کا تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جسے ہم شجاعت سمجھ رہے ہوں وہ محض بزدلی کا پردہ ہو۔ ادعائے تقدیس کے پیچھے خواہش تکریم بھی کارفرما ہو سکتی ہے۔ اور یہ بات تو ادب اور نفسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ برتری کا الجھاؤ احساسِ کمتری کا نتیجہ ہوتا ہے۔

"آپ" میں ایک خطبۂ صدارت بھی شامل ہے۔ اس تحریر کو کسی بھی پہلو سے خاکہ نہیں کہا جا سکتا۔ خود محمد طفیل نے اسے غیر متعلق سی تحریر قرار دیا ہے لیکن خاکوں کے مجموعے میں اس تحریر کا شمول بلا جواز بھی نہیں۔ لکھتے ہیں:

"یہ ایک صدارتی تحریر ہے جسے میں نے خطبۂ صدارت کی بجائے خطبۂ جسارت کا نام دیا تھا۔ اس نشست کا موضوع تھا ———— "کیا ادیب کے لیے صاحبِ کردار ہونا ضروری ہے؟" اس خطبۂ جسارت کو یہاں بطور دیباچہ پیش کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ میرا موضوع بھی تو شخصیتوں کا مطالعہ ہے۔ یوں یہ غیر متعلق سی تحریر بھی کچھ زیادہ غیر متعلق نظر نہیں آتی۔"

یہ ایک دلچسپ اور فکر انگیز مضمون ہے جس میں محمد طفیل نے ادبِ اردو کی تاریخ سے بہت سی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ضروری نہیں کہ بڑے ادب کا خالق اپنے شخصی کردار کے اعتبار سے ایک بڑا آدمی بھی ہو۔ ضروری نہیں کہ تحریر سے اُبھرنے والی شخصیت خالق کے کردار کی سچی تصویر ہو۔ بالفاظِ دیگر کسی شخص کے شخصی کردار اور اس کے تخلیق کردہ ادب میں ریاضی کے کسی فارمولے کا سا حتمی تعلق نہیں ہوتا۔ اس مضمون کا خلاصہ طفیل صاحب کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"غالب شراب پیتے تھے، جُوا کھیلتے تھے، کسی ڈومنی سے عشق کرتے تھے مگر ان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ بذلہ سنج تھے، خوددار تھے، حساس تھے ..... ادب میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کہنے والا

تو خود بڑا متقی اور پرہیز گار تھا مگر ان کی شاعری اور تحریروں سے ان کی شرافت کا زیادہ پتا نہیں چلتا۔ مثلاً ریاض خیر آبادی بڑے دیندار بزرگ تھے مگر وہ زندگی بھر شراب شراب کہتے رہے۔ نظیر اکبر آبادی کا بیشتر کلام ایسا ہے کہ وہ کسی شریفانہ مجلس میں نہیں پڑھا جا سکتا مگر وہ خود اتنے بڑے بدمعاش نہ تھے ..... اگر ان ادبا و شعرا کی فہرست بنائی جائے جو صاحبِ کردار تھے تو تعداد سیکڑے چھوڑ بمشکل دہائیوں تک پہنچے گی .... صاحبِ کردار اور بے کردار لوگ ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں، ڈاکٹروں میں بھی، وکیلوں میں بھی، استادوں میں بھی، افسروں میں بھی ——— اور ادیب بھی تو عام انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں فرشتے نہیں ہوتے۔"

یہ فکر انگیز سطور خاکہ نگاروں کو یہ بصیرت مہیا کرتی ہیں کہ بھائیو! اگر کسی شخص کا ادب عظیم ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ شخص اپنے شخصی کردار کے اعتبار سے بھی اتنا ہی عظیم آدمی ہے۔ اس عالمگیر جملے سے دھوکا نہ کھاؤ کہ "ادب شخصیت کا اظہار ہے" کیونکہ شخصیت دولخت بھی ہو سکتی ہے، نقاب پوش بھی ہو سکتی ہے، ادب محض صدائے تمنا بھی ہو سکتا ہے، ادب اس شخصیت کا اظہار بھی ہو سکتا ہے جو ادیب کو عملاً میسر نہیں بلکہ محض ایک نصب العین کے طور پر اس کے خوابوں پر محیط ہے۔ اس لیے ادب پارے کو اس کے خالق کا مترادف اور ادب پارے کی عظمت کو مصنف کی عظمتِ کردار کا ثبوت نہ جانو۔ شخصیت کی تہیں کھولنے کی کوشش کرو، ادیب کو سمجھو، اس کی نفسیات کو سمجھو، اس کے ادب سے مدد ضرور لو مگر چوکنے رہو۔ آدمی وہی کچھ نہیں جو وہ کہتا ہے۔ الحاد کی باتیں کہنے والا بباطن عابد بھی ہو سکتا ہے زندگی بھر خمریات سے دلچسپی رکھنے والا شاعر متقی اور پرہیز گار بھی ہو سکتا ہے کلام کی روشنی میں شخصیت پر حکم لگانے کے لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

"اچھی باتیں تو سب کے منہ سے اچھی لگتی ہیں۔ بری باتوں کو اچھے انداز میں کہہ دینا ہی تو فن کہلاتا ہے۔"
(آپ ص ۱۵۹)

گویا محمد طفیل شخصیت کے کمزور پہلوؤں کا تذکرہ ایسے انداز میں کرنا چاہتے ہیں کہ کمزوریاں نفرت کا سبب نہ بنیں یا اگر وہ نفرت انگیز ہیں تو خاکے کے آئینے میں نفرت انگیز نہ رہیں بلکہ ہم ان کمزوریوں کو تقاضائے بشریت سمجھ کر درگزر کرنے پر تیار ہو جائیں۔ خاکہ نفرتوں کا نہیں محبتوں کا کاروبار ہے۔ کیونکہ یہ صرف محب کی نظر ہے جو کمزوریوں کو جانتے اور ماننے کے باوجود نفرت نہیں کرتی، محبت ہی کیے جاتی ہے۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

"فلاں صاحب بہت خود غرض ہیں۔"
"جی ہاں! ہیں وہ خود غرض، اور ہر شخص کسی نہ کسی حد تک خود غرض ہوتا ہے۔"

"سنا ہے وہ شاہد باز بھی ہیں۔"
"سنا تو میں نے بھی ہے لیکن ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔"
"وہ کچھ زیادہ ہی گھمنڈی واقع ہوئے ہیں۔"
"یہ بھی درست ہے، عزتِ نفس کی حفاظت میں ان کا رویہ خاصا جارحانہ ہو جاتا ہے۔"

"آپ ایسے گھٹیا آدمی نہیں، وہ خود غرض، شاہد باز اور گھمنڈی ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں، کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں، ان کمزوریوں کے باوجود مجھے ان کی خوبیاں عزیز ہیں۔ اگر آپ کی نظر بھی میری طرح ان کی شخصیت کی گہرائیوں تک پہنچنے لگے تو شخصیت کی دلکش تصویر میں لگی ہوئی یہ بدرنگ لکیریں بھی آپ کو اتنی بُری نہیں لگیں گی۔"

حقیقت نگاری کے تقاضوں کے تحت یہ بدرنگ لکیریں بھی ضروری ہیں مگر ذہانت اور فنی کمال اس میں ہے کہ انھیں ایسے سلیقے سے لگایا جائے کہ تصویر کی دلکشی میں اضافہ نہ ہو سکے تو کم از کم وہ دلکشی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔

"حقیقت نگاری کی ایک مثال اور بھی ہے۔ وہ ہے عصمت کا مضمون "دوزخی" اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں۔ شخصیت نگاری میں اس مضمون کو بھی اونچا درجہ حاصل ہے اس کے باوجود میں یہ کہتا ہوں کہ اگر عصمت یہی مضمون عظیم بیگ کی زندگی میں لکھ دیتی تو وہ عصمت کا گلا گھونٹ دیتے۔"

(آپ ص ۱۶۰)

گویا حقیقت نگاری میں اتنا غلو کہ ہر بات منفی انداز میں کہی جائے غصہ دلانے والی بات ہے۔ جب حقیقت نگاری غصہ دلائے بغیر بھی ممکن ہو تو غصہ دلانے والی بات کیوں کہی جائے۔

"جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ خاکہ نگاری میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہی آپ کے ہاں کم ہے (صرف چند مضامین میں) میری مراد توازن سے ہے۔" (آپ ص ۱۶۰)

توازن سے یہاں کیا مراد ہے؟ یہ سطور ایک خط سے لی گئی ہیں جو شاہد احمد دہلوی کے نام ہے بالفاظِ دیگر گنجینۂ گوہر کے بعض مضامین میں توازن کی کمی کا شکوہ کیا گیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کے خاکوں نے اردو میں خاکہ نگاری کے فن کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ گنجینۂ گوہر میری پسندیدہ کتابوں میں سے ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بعض عبارتوں میں موضوعِ خاکہ کے بارے میں مصنف کا رویہ ہمدردانہ اور دوستانہ نہیں رہا۔ اس بحث کو طول دینا مناسب نہیں۔ اگر آپ طفیل صاحب کے اعتراض کو پوری طرح سمجھ گئے ہیں تو ان کا تصورِ توازن بھی آپ پر روشن ہو گیا ہوگا۔ محمد طفیل کے ہاں توازن کے معنی یہ ہیں کہ کمزور پہلوؤں کا تذکرہ تو کیجئے مگر پگڑی نہ اچھالیے۔ منتقمانہ رویہ نہ اپنائیے۔ خاکے کو ہجو نہ بننے دیجئے۔ کمزوریوں کے اظہار میں نفرت و حقارت، چڑچڑے پن اور جھلاہٹ، طنز اور زہرناکی سے کام نہ لیجئے۔ انصاف کے ساتھ عفو و احسان کے جذبوں سے بھی کام لیجئے۔ آپ محتسب نہیں اس لیے ورہ نہ پھٹکاریئے، پیار کیجئے۔ اور اگر یہ ممکن نہیں تو کم از کم ترس تو کھائیے۔

متاب ای پارسا روی از گنہگار
بہ بخشائندگی در وی نظر کن

کمزوریوں پر قلم اٹھاتے ہوئے اپنے جذبات پر بھی قابو رکھے۔ جذباتی توازن بڑی چیز ہے۔

"اگر میں کسی شخصیت کا کوئی پہلو چھپاتا ہوں تو میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس شخصیت کی ناک کاٹ لی یا اس کے کان کاٹ ڈالے۔" (حکیم صاحب (مکرم)

اختر صاحب کے خاکے میں فٹ نوٹ کے طور پر درج ہے:

"اس ناگفتنی کا بھی کچھ حال مجھے معلوم ہے مگر جو باتیں یہ خود چھپانا چاہتے ہیں ان کے لکھنے میں لطف بھی کیا۔" (آپ ص ۱۸۶)

اور اگر وہ ناگفتنی بات شخصیت کا ایک اہم پہلو ہو تو؟

گو یہ بات متنازعہ فیہ ہے تاہم اسے محمد طفیل کی ایک اور عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھیے:

"کھنکتی ہوئی باتیں صاحبِ تذکرہ ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اہلِ حیا کے لیے واجب ہے کہ وہ اس ضمن میں اگر اشاروں سے کام چلا سکیں تو دریغ نہ کریں اس لیے یہاں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ابوالکلام کی جوانی کو حکیم (یوسف حسن) کی جوانی کا دیباچہ سمجھیں۔" (مکرم ص ۱۱۸)

یہ توقع درست نہیں کہ خاکہ نگار وہ سب کچھ لکھ دے جو اس کے علم میں ہے۔ خاکہ کوئی مفصل سوانح عمری نہیں بلکہ سوانح میں شخصیت کی تلاش ہے۔ پھر خاکہ نگار کے پاس افسانہ نگار کا کینوس ہے ناول نگار کا نہیں۔ چنانچہ خاکہ نگار کو صرف وہ باتیں منتخب کرنی ہیں جو شخصیت کو روشنی میں لا سکیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہر حرکت، ہر بات اور گفتگو کا ہر جملہ شخصیت ہی کا مظہر ہوتا ہے۔ اصولی طور پر یہ بات بھی درست ہے لیکن شخصیت پر روشنی ڈالنے والی ان حرکتوں، ان باتوں اور ان گفتگوؤں میں سے کچھ ایسی بھی ہوں گی جو شخصیت پر نسبتاً بہتر اور تیز تر روشنی ڈالتی ہوں گی۔ ایک نمائندہ واقعہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ذکر کرنے کے بعد اسی نوعیت کے دوسرے پانچ واقعات بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ گویا واقعات میں حسنِ انتخاب بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ فنی ضرورتوں کے تحت بعض باتوں کو چھوڑنا پڑے گا لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں فنی ضرورتوں کے تحت نہیں بلکہ مصلحتوں کے تحت چھوڑنا پڑتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ قانونی تقاضوں کے تحت بعض باتیں چھوڑنی ضروری ہو جاتی ہیں۔

۲۔ بعض باتیں اس لیے چھوڑنی پڑتی ہیں کہ وہ شائستگی کے منافی ہیں۔

۳۔ بعض باتیں اس خوف کے تحت چھوڑ دی جاتی ہیں کہ ان کا تذکرہ زیرِ بحث شخصیت اور اس کے احباب و اعزہ کی شدید خفگی یا آزردگی کا موجب ہوگا۔ خاکہ نگاری میں یہی بات ادبی تنازعے کا باعث بنتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں مروّت، رواداری اور بخشائندگی کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ بعض برائیوں کو مغرب میں ایسی

عام بشری کمزوریاں سمجھا جاتا ہے کہ کوئی بھی عظیم المرتبت شخص جگ ہنسائی، رسوائی یا تخفیفِ عظمت کے کسی خطرے کے بغیر ان برائیوں کا برملا اعتراف کر سکتا ہے اور خاکہ نگار ان برائیوں کو ذرا نمک مرچ لگا کر بھی بیان کر دے تو موضوعِ خاکہ اور اس کے احباب و اعزّہ فقط مسکرانے پر اکتفا کرتے ہیں اور ایسے معاشرے بھی موجود ہیں جن میں فلم دیکھنا بھی اتنی بڑی بُرائی ہے کہ اس کے مُجرم کے لیے بخشائندگی کا رویّہ اپنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ خاکہ نگار تو ایک دوست کا تعارف کرا رہا ہے وُہ یہ بات کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ لوگ اس تعارف کی روشنی میں اس کے دوست سے نفرت کرنے لگیں یا خود اس کا عزیز دوست ہی اس سے خفا ہو جائے یا اس کے احباب و اعزّہ چیں بہ جبیں ہوں۔ اس لیے سماجی اقدار کی روشنی میں جتنی حق گوئی ممکن ہو، خاکہ نگار سے اس سے زیادہ کی توقع ہی نہیں کرنی چاہیے۔ معائب کا تذکرہ سماجی اقدار اور معاشرے میں مروّج معیارِ بخشائندگی کے ساتھ مشروط ہے اور میں سمجھتا ہُوں کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے سماجی اخلاقی بندھن اتنے کڑے ہیں کہ چھوٹی بڑی ہر اخلاقی بُرائی منافیِ عظمت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں محتاط اور درست رویّہ وہی ہے جو محمد طفیل نے اختیار کیا ہے۔ یعنی ایسی صورتِ حال میں اشاروں سے کام چلانا چاہیے تاکہ شخصیت کا وہ خاص پہلو اگر پُوری طرح سامنے نہ آسکے تو یکسر تشنہ بھی نہ رہے۔ محمد طفیل نے ممتاز مفتی کا جو خاکہ لکھا ہے اس میں یہ سطور بھی شامل ہیں:

"ممتاز مفتی خطرناک حد تک سچّے آدمی ہیں مجھے کہتے ہیں تو بزدل ہے۔ تو کسی پر مضمون لکھتا ہے تو اس کے ساتھ رعایتیں کرتا ہے۔ زیادہ تر اس کی شرافت کے ڈنکے پیٹتا ہے، خباثتوں کے پردے چاک نہیں کرتا۔ تم ہمیں یہی بتاتے ہو کہ دیکھو یہ شخص آدمی نہیں فرشتہ ہے، خواہ وہ کتنا ہی رذیل کیوں نہ ہو"

محمد طفیل نے جواب دیا:

"میں جس حد تک بھی جا کر لکھتا ہُوں، اگر اسی قدر ہی برداشت کر لیا جائے تو غنیمت ہے۔"

سعدی نے کہا تھا:

دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز

لیکن خاکے میں نہ دروغِ مصلحت آمیز کی گنجائش ہے نہ راستیٔ فتنہ انگیز کی۔ اگر آپ کو کسی شخصیت کی تصویر کشی میں جھُوٹ بولنے کی ضرورت پڑتی ہے تو شعر گفتن چہ ضرور۔ آپ اس شخصیت پر قلم نہ اٹھائیں۔ باقی رہا راستیٔ فتنہ انگیز کا معاملہ، تو اگر آپ کسی شخصیت کے بارے میں بہت سے سچ بول سکتے ہیں البتہ اِکّا دُکّا بات سچ ہونے کے باوجود فتنہ انگیز ہے تو راستی کے اظہار میں "ٹن ٹن" والا انداز نہ اپنائیے۔ اشارہ، بلکہ اگر اشارہ بھی فتنہ انگیز ہو تو اشارہ بھی کیجئے اور آگے بڑھ جائیے۔ کیونکہ اس طرح بھی:

جان جائیں گے جاننے والے

یہاں مناسب ہوگا کہ ہم چلتے چلتے یہ بھی دیکھ لیں کہ طفیل صاحب میں کمزور پہلوؤں کے بارے میں سچ بولنے کی کتنی ہمت ہے اور سچ کو قابلِ برداشت یا گوارا بنانے کا کتنا سلیقہ ہے!

"میرے ایک دوست ہیں، اُنھوں نے نیاز صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ یہ بڑے خود غرض ہیں یہ بات سخن گسترانہ سہی، یکسر غلط بھی نہیں۔ ویسے خود غرض تو ہر آدمی ہوتا ہے۔" (آپ ص ۳۹)

آخری جُملے نے سچ کی تلخی کو خاصا کم کر دیا ہے۔ یہ ہمدردانہ نقطۂ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔

"ہر نام کے پردے میں خود نیاز صاحب ہی ہوں گے اس لیے کہ بی جمالو والا کام یہ خوب جانتے ہیں۔" (آپ ص ۲۷)

قیوم نظر کے بارے میں:

"اُن کا کلام سمجھنے کے لیے مجھے کئی کئی ہفتے تحیر گاؤ زبان کھانا پڑا مگر شعر پھر بھی سمجھ میں نہ آئے۔" (جناب)

مزاح نے سچ کی تلخی کو خاصا کم کر دیا ہے۔ پھر انداز ایسا ہے جیسے ابلاغ کی ناکامی کا نہیں اپنے قصورِ فہم کا رونا ہے۔

"میں نے یہ بھی سُن رکھا ہے کہ مولوی (عبدالحق) صاحب کانوں کے بڑے کچے ہیں۔ عین ممکن ہے کسی بھلے مانس نے کان بھر دیے ہوں۔" (جناب ص ۱۱)

اوّل تو یہ کہ مولوی صاحب کی خامی کو شنید کی حیثیت دی۔ دُوسرے یہ کہ اس خامی کی ذمہ داری خاصی بڑی حد تک کان بھرنے والے بھلے مانسوں کے کندھوں پر ڈال دی۔

"جلیس صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں، بس اتنا چاہتے ہیں کہ سب لوگ مجھے بڑا لکھنے والا مانیں اور میری جھُوٹی باتوں پر بھی یقین کر لیں۔" (جناب ص ۱۸۶)

اچھے آدمی کہہ کر بات شروع کی اور معصومانہ انداز میں کمزوری کی طرف اشارہ کر دیا۔ غرضیکہ کمزوریوں کا سلیقہ مندانہ، ہمدردانہ اور محتاط تذکرہ کرنے میں محمد طفیل کو خاصی دسترس حاصل ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ قابلِ ستائش بات یہ ہے کہ انھوں نے فرحت اللہ بیگ کی طرح کمزوریوں کے اسباب بھی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ کسی شخص کی کمزوریوں کے اسباب بھی معلوم ہوں تو قاری کو عفو و درگزر کا رویہ اپنانے میں خاصی آسانی ہو جاتی ہے۔ جوش کے ملحدانہ افکار کا تذکرہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ادب کا ہر طالب علم اس سے آگاہ ہے۔ خاکہ نگار کا کام یہ تھا کہ ان اسباب و عوامل تک رسائی حاصل کرے جو شخصیت کے اس تاریک پہلو کا باعث بنے۔ محمد طفیل نے یہ کام بحسن و خُوبی انجام دیا ہے۔

اسباب و عوامل کی جستجو صرف معائب ہی کے سلسلے میں ضروری نہیں، محاسن کے اسباب و عوامل تلاش کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ایک ہی خُوبی دو دو مختلف صورتوں میں دو مختلف معنی رکھتی ہے۔ ایک شخص کسی معزز، ذی علم اور خوشحال گھرانے میں پیدا ہُوا، زندگی کی ہر آسائش اور تعلیم و تربیت کی ہر سہولت اُسے حاصل رہی۔ وہ شخص مساعد حالات

اور سازگار ماحول کے باعث عظمت کے ایک مقامِ بلند تک جا پہنچا۔ عظمت کے اسی بلند مقام پر ایک اور شخص بھی متمکن ہے جو کسی غریب، بے رسوخ اور کم علم گھرانے میں پیدا ہوا۔ زندگی کی کوئی آسائش اور تعلیم و تربیت کی کوئی قابلِ ذکر سہولت اسے ورثے میں نہ ملی مگر اس نے غیر معمولی محنت، لگن اور عزم و استقلال سے غیر مساعد حالات کا مقابلہ کر کے وہ مقام حاصل کر لیا۔ ان دو آدمیوں کو برابر نہیں سمجھا جا سکتا۔ مؤخر الذکر کی عظمت وقیع تر ہے۔ اس کی خوبی دوسری بہت سی خوبیوں کو بھی جلو میں لیے ہوئے ہے۔ اس کی کامیابی اول الذکر شخص کے مقابلے میں کثیر الجہات، زیادہ بھرپور اور زیادہ لائقِ ستائش ہے۔ میری اس عبارت سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ شاید میرے نزدیک خاکے میں وراثت، ماحول، بچپن اور تعلیم و تربیت کی سوانحی تفصیلات کا تذکرہ بھی ضروری ہے تاکہ شخصیت کا عہد بہ عہد ارتقا پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ سامنے آ سکے۔ جی نہیں۔ اس قسم کی تفصیلات کا تذکرہ اور عہد بہ عہد ارتقا کی تصویر کشی سوانح عمری کے دائرے کی چیزیں ہیں۔ خاکہ اس قسم کی سوانحی جزئیات اور تفصیل و طوالت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن شخصیت کی وہ جیتی جاگتی تصویر جو خاکہ نگار کا مقصود ہے اس قسم کی تفصیلات سے آشنا ہوئے بغیر کھینچی نہیں جا سکتی۔ یہ تفصیلات مذکور تو نہیں ہوں گی لیکن خاکہ نگار کے ذہن میں ضرور ہونی چاہئیں اور اگر اشد ضرورت پڑے تو ایجاز و اختصار کے ساتھ خاکے میں ان کا شمول بھی خلافِ مصلحت نہ ہوگا۔ محمد طفیل کے اکثر کامیاب خاکے وہی ہیں جنھیں اس قسم کی وافر معلومات کا پس منظر میسر ہے۔ اکا دکا خاکوں میں بعض سوانحی تفصیلات باقاعدہ خاکے کے متن میں شامل کر دی گئی ہیں اور ان کے شمول کا جواز بھی موجود ہے، یہی کہ بعض خوبیوں یا خامیوں کے اسباب و عوامل کی حیثیت سے ان کا تذکرہ لازم سا ہو گیا ہے لیکن اختر اورینوی کے خاکے میں بعض ایسی تفصیلات بھی موجود ہیں جن کا شمول کم از کم مجھے بے جواز معلوم ہوتا ہے۔ یہ تفصیلات زیادہ "باخبر" ہونے کا ثبوت دینے کے لیے شامل کی گئی ہیں مگر وہ خاکہ نگار کے عجزِ فن کا ثبوت بن کر رہ گئی ہیں۔ خیال رہے کہ اس خاکے کے بارے میں محمد طفیل کا اپنا اعتراف موجود ہے کہ یہ مضمون محض حقِ دوستی ادا کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔

محمد طفیل کی ایک عبارت سے کچھ ایسا تاثر ملتا ہے جیسے محمد طفیل کے نزدیک شخصیت کو سمجھنے کا عمل کشتی لڑنے کے عمل سے مماثل ہو۔ لکھتے ہیں:

"اگر شخصیت اور شخصیت نگار دونوں ہی قد آور ہوں گے تو پھر بے چاری شخصیت دم توڑ دے گی شخصیت نگار اُسے پچھاڑ دے گا۔" (جناب ص ۷)

میرا خیال ہے کہ یہ تمثیل غلط ہے۔ انٹرویو لینے والے چالاک صحافیوں کو بعض اوقات شاطر سیاستدانوں سے سچ اگلوانے، جھوٹ بلوانے یا انہیں غصہ دلانے کے لیے یہ تکنیک اختیار کرنی پڑتی ہے۔ خاص طور پر اگر سیاستدان مخالف کیمپ سے تعلق رکھتا ہو تو صحافی پینترے بدل بدل کر حملہ آور ہوتا ہے۔ شاطر سیاستدان کبھی جھکائی دے کر، کبھی تجاہل سے کام لے کر، کبھی قہقہہ لگا کر، کبھی فقرہ بازی کر کے وار کر دیتا ہے اور موقع موقع سے جوابی حملے بھی کرتا رہتا ہے۔ انٹرویو ختم ہوتا ہے تو سیاستدان اپنے کسی قریبی ساتھی سے پوچھتا ہے "اس بد زبان صحافی کا تعلق

فلاں جماعت سے ہے نا؟" گویا سیاست دان سمجھتا ہے کہ اس سے انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ادھر صحافی اپنے کسی ساتھی سے محوِ گفتگو ہے۔

"بڑا بنتا تھا، آج تو میں نے اسے چت کر دیا۔"

"ہاں یار خُوب پچھاڑا، آخر میں تو غصہ کھانے لگا تھا۔"

"اسے تاؤ دلا کر بدمزاجی اور دروغ گوئی پر مجبور کرنا ضروری تھا۔"

اس قسم کے انٹرویو نہ صداقت کے ترجمان ہو سکتے ہیں نہ ان میں شخصیت ڈھونڈی جا سکتی ہے اس لیے میں الکھری ملاقات پر مبنی مضمون کو خاکہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ اگر چھیڑنے پچھاڑنے کا خیال بھی ذہن میں ہو تو خاکہ بھی لگ بھگ اسی قسم کا ہو گا جس قسم کے انٹرویو کا تذکرہ اُوپر کیا گیا ہے، یعنی حد درجہ ناقابلِ اعتماد۔ مکالمات میں شخصیت موجود ہوتی ہے ——————— لیکن اگر متکلم کو یہ احساس ہو جائے کہ اس گفتگو سے اس کی شخصیت پر استدلال کیا جائے گا یا یہ مواد اس کے خلاف استعمال کیا جائے گا یا یہ کہ اسے اپنی شخصیت کا بھرپور اور صحیح تاثر انھی مکالمات سے دینا ہے تو مکالمے میں سے شخصیت غائب ہو جاتی ہے اور شخصیت کا خول یا نقاب اپنی پُوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور اگر شخصیت نگار گفت گو میں کشتی لڑنے کی تکنیک استعمال کرے گا تو مخاطب کے ذہن میں پیدا ہونے والے ردِّ عمل کی جوابی لہر صحیح نتائج کی راہ میں یقیناً رکاوٹ بنے گی۔

بچوں کی ایک کہانی میں بتایا گیا ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے ہوا اور سورج میں جھگڑا ہو گیا۔ ہوا کہتی تھی میں طاقتور ہوں۔ سورج کہتا تھا میں طاقتور ہُوں۔ طے یہ ہُوا کہ سامنے سڑک پر جو آدمی جا رہا ہے اس کے کپڑے اتروانے کی کوشش کی جائے۔ جو اس کوشش میں کامیاب ہو جائے اُسے زیادہ طاقتور مان لیا جائے۔ سخت سردی کے دن تھے اور صبح کا وقت تھا۔ غریب آدمی دگلا پہنے، سر پر بڑی سی پگڑی باندھے، ایک موٹے سے کمبل میں لپٹا لپٹایا گدھے کو ہانکتے ہوئے چل رہا تھا۔ پہلے ہوا میدان میں آئی، اس نے تیز تیز چلنا اور مسافر کے جسم پر حملے کرنا شروع کیا۔ مسافر نے دانت بھینچ لیے، کمبل کو زیادہ احتیاط سے اوڑھ لیا اور اسی طرح لپٹا لپٹایا چلتا رہا۔ ہوا کو اپنی ناکامی پر غصہ آیا تو اس نے آندھی کی شکل اختیار کر کے مسافر پر بڑا زوردار حملہ کیا اور اس کے کپڑے پھاڑنے اتارنے کی کوشش کی۔ پگڑی کا شملہ اُڑنے لگا، کمبل پھڑپھڑایا۔ مگر مسافر نے پگڑی کو مضبوطی سے سر پر جما لیا۔ دگلے کی گُھنڈیاں کس لیں اور کمبل کو زیادہ مضبوطی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا اور چلتا رہا۔ سورج کبھی کبھی بدلی کی اوٹ سے جھانک کر ہوا کی بے بسی کا تماشا دیکھ لیتا۔ آخر ہوا نے ہار مان لی اور بولی، سُورج بھیّا! لو ہم تو ہار گئے۔ اب تم کوشش کر دیکھو۔ سُورج مُسکراتا ہُوا بدلی کی اوٹ سے نکلا، اپنی زندگی بخش شعاعوں کے ذریعے اس نے مسافر کو سلام کیا۔ مسافر نے مسکرا کر سورج کو دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ظالم، گستاخ اور دلآزار ہوا رُک گئی ہے اور مہربان سورج نکل آیا ہے۔ اس نے کمبل پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ سورج کی مہربان حرارت نے اس کے جسم اور رُوح کو آسُودگی کا احساس بخشا۔ ہڈّیوں میں سرایت

کرتی ہوئی سردی کی لہر کو سورج کی مہربان شعاعوں نے باہر نکال لیا۔ تب مسافر نے محسوس کیا کہ کمبل کی ضرورت نہیں رہی۔ سورج کی موجودگی میں کمبل کی کیا ضرورت! چنانچہ اس نے کمبل اتار کر گدھے کی پیٹھ پر رکھ دیا اور ہلکے سُروں میں گانے لگا۔ سُورج نے خلوص، محبّت، دوستی اور دلآسائی کا رویہ جاری رکھا۔ تھوڑی دیر بعد مسافر نے محسوس کیا کہ اب تو حیات بخش حرارت جسم کے رُوئیں روئیں میں سرایت کرنے لگی ہے۔ چنانچہ اس نے پگڑی اتار کر گدھے کی پیٹھ پر رکھی اور اپنا سر سورج کی شعاعوں کے حوالے کر دیا۔ پھر دگلے کی گھنڈیاں کھولیں اور مزید تھوڑا سا سفر طے کرنے کے بعد دگلہ بھی اتار ڈالا اور اُونچے سُروں میں گانے لگا۔

تو جنابِ والا! اگر آپ شخصیت کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں تو آندھی یا جھکّڑ کی طرح حملہ آور ہونے سے پہلے آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ سورج کی طرح خلوص، محبت، دوستی اور دلآسائی کا رویہ اپنایئے۔ اس طرح مسافر نہ صرف یہ کہ اپنا خول اتار دے گا بلکہ اپنی باطنی کیفیات کے اظہار کے لیے نغمہ سرا بھی ہو گا۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شخصیت نگاری کے سلسلے میں اس بنیادی غلطی کے باوجود محمد طفیل کے خاکے اس تکنیک کی مضرتوں سے کیسے محفوظ رہ گئے۔ تو بات دراصل یہ ہے کہ جہاں تک محمد طفیل کے ذاتی عمل اور طریق کار کا تعلق ہے، اُنھوں نے چیرنے پھاڑنے کے قائل ہونے کے باوجود شروع ہی میں یہ فرض کر لیا ہے کہ "میں ایک بونا ہوں" یعنی میں کسی شخصیت کو پھاڑ نہیں سکتا اس لیے پھاڑنے کا خیال بھی ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ البتہ شوخی، فقرہ بازی اور ذہانت کی پھلجھڑیاں وُہ چلاتے رہتے ہیں ـــ یُوں جیسے کوئی بونا کسی قدآور اور متین شخص کو گدگدی کر رہا ہو۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا، اگرچہ مثال ذرا طویل ہے۔

ذکر ہے ریلوے سٹیشن لاہور کے ویٹنگ رُوم میں محمد طفیل اور جوش ملیح آبادی کی ایک اتفاقیہ ملاقات کا۔ لکھتے ہیں:

"میں نے شکایت کی کہ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع مجھے نہ دی۔ آج تو میں حیدر آباد جانے کے لیے اُدھر آ نکلا، ورنہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔ کیا بالا ہی بالا نکل جانے کا پروگرام تھا؟"

"ہاں صورت تو ایسی ہی ہے۔ اُم الشعراؐ بھی ساتھ ہیں۔ مگر میں نے تو میر صاحب کو لکھا تھا کہ طفیل کو اطلاع دے دینا۔"

اس پر میں نے کہا: "میر صاحب نے تو کوئی اطلاع نہ دی۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں، اب کے آپ کا کوئی ناجائز استعمال ہو۔ ورنہ کیوں چھپاتے؟"

"سچ کہا، نیتوں کا حال اللہ جانے!"

"بہت ہی اچھا ہُوا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی ورنہ شیعہ سُنّی فساد ہو جاتا۔"

میر صاحب شیعہ ہیں اس لیے جوش صاحب خوب ہنسے۔" (محترم ص ۱۳)

گدگدی کے اسی انداز کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے "اپنائیت، مخصوص بے تکلفی، ہلکی میٹھی ظرافت اور معصوم شوخی" جیسے الفاظ و تراکیب سے گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ جگن ناتھ گورکھ پوری کے نزدیک یہ مزاح کا ایک میلان ہے جو مہذب شوخی سے آگے نہیں بڑھتا، اور سید احتشام حسین نے اس خصوصیت کو "سادگی و پرکاری" سے تعبیر کیا ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ محمد طفیل کے ہاں یہ "مہذب شوخی" محض بے تکلفی اور حفظِ مراتب کی جمع و تفریق کا کھیل نہیں بلکہ یہ احساسِ یگانگت اور خلوص جیسے جذبوں سے پیدا ہوتی ہے اور ایک بشاشت آگیں فضا کا باعث بنتی ہے۔

"جناب" میں بائیس شخصیات پر مضامین شامل ہیں جنہیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصے میں صرف پانچ مضامین ہیں جو نسبتاً طویل تر ہیں۔ اس حصے میں سب سے چھوٹا مضمون مولوی عبدالحق پر ہے جو گیارہ صفحات پر محیط ہے۔

دوسرے حصے میں سترہ مضامین ہیں جو سب کے سب تین تین یا چار چار صفحات پر مشتمل ہیں (ناصر کاظمی پر جو مضمون ہے وہ بھی تین صفحات کا ہے آخری حصہ شاعری پر تبصرہ ہے) گویا مصنف نے ان مضامین کو ان کی طوالت کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہلے حصے کے مضامین تو باقاعدہ خاکے ہیں، دوسرے حصے کے مضامین محض مختصر خاکے ——— "سرسری سے جائزے" ——— ہیں، جن سے خاکے کی توقعات وابستہ نہیں کرنی چاہئیں۔

اگرچہ کسی خاکے کے خاکہ ہونے کا معیار اس کی طوالت نہیں، اس کی فنی حدود و شرائط ہیں مگر ان فنی حدود و شرائط کو نبھانے کے لیے ایک خاص حد تک طوالت بھی ضروری ہے۔ چونکہ خاکہ نگار کا مقصد ہے شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر بنانا، اس لیے کسی نہ کسی حد تک تفصیل میں اُترنا یعنی مظاہرِ شخصیت (واقعات وغیرہ) سے دلچسپی لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ ریاضی میں مختلف اعداد کا مجموعہ ایک قطعی تاثر دے سکتا ہے لیکن شخصیت نگاری میں خصوصیات کی میزان نہیں بن سکتی۔ ۲ + ۳ + ۴ = ۹ میں معنوی قطعیت موجود ہے۔ لیکن علم + حلم + خود غرضی = شخصِ خاص، معنوی قطعیت سے عاری ہے۔ چنانچہ یہاں علم کی تھوڑی سی تفصیل اور حلم اور خود غرضی کے چند مظاہر کا تذکرہ ہی شخصیت کی تصویر بنا سکتا ہے۔ گویا شخصیت نگاری کے لیے ریاضی کے جملے کا سا درجہ اختصار کام نہیں دیتا۔ یہاں تفصیل میں جانا پڑتا ہے۔ کچھ نہ کچھ طوالت لازمی ہے۔ شوکت تھانوی کا 'شیش محل' ہو یا طفیل کی 'جناب' کا دوسرا حصہ۔ یہ سرسری جائزے دلچسپ ضرور ہیں لیکن انہیں خاکے نہیں کہا جا سکتا۔ 'جناب' میں شامل ان سترہ مضامین میں سے بعض تو محض کسی اکھڑی ملاقات پر مبنی سرسری سے تاثر کی باز آفرینی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ محض اکھڑی ملاقاتوں کا حاصل ہیں۔ قاضی عبدالغفار اور یگانہ چنگیزی کے مختصر خاکے اسی ذیل میں آتے ہیں۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جہاں تک شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر بنانے کا تعلق ہے محمد طفیل بعض مختصر خاکوں میں بھی خاصے کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً میرزا ادیب مختصر خاکہ ہے مگر میرزا ادیب اس میں موجود ہیں۔ (بعد میں محمد طفیل نے میرزا ادیب کے بارے میں ایک باقاعدہ خاکہ بھی لکھا جو 'مجی' میں شامل ہے) یہی حال ظہیر کاشمیری'

ابراہیم جلیس اور بلونت سنگھ پر لکھے ہوئے مختصر خاکوں کا ہے۔ ان مختصر خاکوں میں جامعیت نہیں البتہ جامع تاثر پیدا کرنے کی کوشش ضرور ملتی ہے اور خاکہ نگار کے بس میں ہے بھی اسی قدر۔ جامع خاکہ تو آج تک لکھا ہی نہیں گیا۔

اختصار و طوالت کے باب میں محمد طفیل نے 'معظم' کے دیباچے میں ایک معنی خیز بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں :

"اس کتاب کے کچھ مضامین طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ طویل مضامین کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جامع ہیں اور مختصر مضامین کے معنی یہ نہیں کہ وہ نامکمل ہیں۔ میری گرفت میں جو شخصیت جتنے صفحات میں آئی میں نے اُتنے ہی صفحات لکھ ڈالے۔"

یہ درست ہے کہ طویل ترین مضمون بھی جامع کہلانے کا مستحق نہیں۔ شخصیت تو ناظورۂ ہزار شیوہ ہے۔ اسے کما حقہٗ گرفت میں لینا ممکن نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ضروری نہیں کہ مختصر خاکے لازماً نامکمل ہی سمجھے جائیں۔ اگر مختصر خاکہ بھی شخصیت کا جامع تاثر دینے میں کامیاب ہو جائے تو اسے نامکمل نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ ہاں بعض صورتوں میں یہ ممکن ہے۔ رہی تیسری بات کہ "میری گرفت میں جو شخصیت جتنے صفحات میں آئی میں نے اتنے ہی صفحات لکھ ڈالے۔" اصولی طور پر یہ بات درست ہے اگر شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پانچ ہی صفحے میں بن جائے تو زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ اگر تیس چالیس صفحے میں بنتی نظر آئے تو چالیس صفحے تک اسے پھیلانا ہی ضروری ہے لیکن خاکہ براہِ راست اور بلاواسطہ مشاہدے سے حاصل کی ہوئی معلومات ـــ FIRST HAND INFORMATION ـــ کا متقضی ہے۔ موضوع خاکہ کے بارے میں دوسروں کی آرا یا تحریروں سے، اس کے اپنے خطوط یا نگارشات سے، حتیٰ کہ سُنی سنائی باتوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے، مگر ان سب کی حیثیت ثانوی اور تائیدی مواد کی سی ہوتی ہے۔ یہ معاونات ہیں۔ بنیادی اہمیت فرسٹ ہینڈ انفرمیشن ہی کو حاصل رہے گی۔ اس کے بغیر کوئی مضمون خاکہ کہلانے کا مستحق نہیں ہو گا۔ ایک فرضی خاکہ دیکھئے : "میں نے ایک دفعہ علامہ اقبال کو انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں نظم سناتے دیکھا تھا۔ وہ بڑے آدمی تھے۔ جسٹس جاوید اقبال کا بیان ہے۔ عبدالمجید سالک نے ان کے بارے میں لکھا ـــــــــــ ـــــ عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں ـــــ چراغ حسن حسرت کی رائے ہے ـــــ خود علامہ اقبال بالِ جبریل میں فرماتے ہیں ــ ـــ سننے میں آیا ہے کہ علامہ اقبال ـــــ اس کی تائید خلیفہ عبدالحکیم کے بیان سے بھی ہوتی ہے ـــــ"

اس طرح ایک اچھا سوانحی مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ تنقیدی مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ مکمل سوانحعمری ترتیب دی جا سکتی ہے۔ لیکن براہِ راست مشاہدے سے حاصل ہوئی معلومات کی کمی کی وجہ سے اسے خاکہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کسی خاکہ نگار نے براہ راست مشاہدے سے حاصل کی ہوئی معلومات کے سہارے نہایت اختصار کے ساتھ چند صفحوں میں شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر بنا دی ہے تو اسے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ جب میں نے اس شخصیت کو اتنے ہی صفحات میں گرفت میں لے لیا ہے تو اب مزید صفحات لکھنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن اگر کسی مضمون میں براہِ راست مشاہدے سے حاصل کی ہوئی معلومات

بہت کم ہیں یا سرے سے موجود ہی نہیں تو اختصار کے حق میں کہا ہُوا یہ جملہ فرسٹ ہینڈ انفرمیشن کی کمی کو چھپانے کے لیے محض ایک حیلہ قرار دیا جائے گا۔

مولوی عبدالحق کا خاکہ 'جناب' میں شامل ہے اور مصطفےٰ زیدی کا خاکہ 'مکرم' میں۔ ان خاکوں میں بڑی حد تک تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ زیدی مرحوم کے خاکے میں پونے تین صفحے کی عظیم الشان تمہید صرف یہ بتانے کے لیے لکھی ہے کہ زیدی صاحب شاعر کی حیثیت سے انا و لاغیری کا دعوٰی نہیں کرتے۔ مجھے یہ تمہید غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پطرس بخاری کا خاکہ بھی تشنہ ہے:

"اس بندۂ پر تقصیر نے مرحوم کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ ان سے خط و کتابت ضرور تھی وہ بھی مختصر۔ دو تین خط میرے نام آئے تھے اور بس۔" (جناب ص ۲۲)

ظاہر ہے اتنے قلیل مواد کے سہارے خاکہ نہیں لکھا جا سکتا۔ خود محمد طفیل نے اس خاکے کو گھاس کاٹنے سے تعبیر کیا ہے اور آخر میں یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ یہ مانگے تانگے کا مضمون ہے۔ لیکن یہ "مضمون" مولوی عبدالحق اور مصطفےٰ زیدی کے خاکوں کے مقابلے میں یقیناً بہتر ہے۔

محمد طفیل کا طویل ترین خاکہ وُہ ہے جو حکیم یوسف حسن کے بارے میں ہے۔ یہ خاکہ ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور "مکرم" میں شامل ہے۔ جس طرح دنیائے ادب میں محمد طفیل کی عظمت بڑی حد تک نقوش کی مرہون منت ہے۔ نقوش سے محمد طفیل کا اور محمد طفیل سے فوراً نقوش کا خیال آتا ہے۔ اسی طرح حکیم یوسف حسن خاں 'نیرنگِ خیال' کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ محمد طفیل کی عظمت میں سے نقوش کو منہا کر دیا جائے تو بھی یہ دنیائے ادب میں اپنے خاکوں کے طفیل کھڑے رہیں گے لیکن حکیم یوسف حسن کی عظمت میں سے نیرنگِ خیال کو منہا کر دیا جائے تو بہت کچھ ہونے کے باوجود شاید آج کچھ باقی نہ بچے۔

اتنے مفصل اور طویل مضمون کو دیکھ کر پہلا سوال معاً یہ ذہن میں اُبھرا کہ کیا یہ خاکہ ہے؟ کہیں محمد طفیل نے خاکے کے بہانے سوانحعمری تو نہیں لکھ دی۔ مگر مضمون پڑھ کر اطمینان ہو گیا کہ یہ خاکہ ہی ہے۔ اب دُوسرا سوال یہ اُبھرا کہ محمد طفیل نے خلافِ معمول اتنا طویل خاکہ کیوں لکھا؟ میں نے اپنے طور پر اس کا ایک جواب فرض کر لیا ہے اور وہ یہ کہ محمد طفیل نے حکیم یوسف حسن میں اپنی ذات کا عکس دیکھا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہئے کہ محمد طفیل نے حکیم یوسف حسن میں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ 'نیرنگِ خیال' کو بھی "شخصیت" قرار دیتے ہیں:

"آپ کہہ سکتے ہیں نیرنگِ خیال بھی شخصیت ٹھہری؟ میں عرض کروں گا، کیوں نہیں! جس نے ذہنوں کو نکھارا ہو، شخصیتوں کو جلا بخشی ہو، وہ شخصیت ہی نہیں، اس سے بھی بڑی کوئی بلا ہے۔"

یہی بات نقوش کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

"یہ خدا کی دین ہے کسے معلوم تھا کہ ریلوے کا گُڈز کلرک یُوسف حسن کبھی نیرنگِ خیال ایسے عظیم رسالے

کا خالق ہو گا جو ایک کارِ بلند انجام دے گا اور وہ صاحبِ روایت شخصیت بنے گا، ورنہ ادبی پرچوں کی کہانی تو صرف اتنی ہوتی ہے کہ زن سے نکلے چھن سے غائب۔"

یہی خراجِ تحسین محمد طفیل اور نقوش کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

حکیم یوسف حسن کو احباب نے مشورہ دیا تھا کہ پرچہ نہ نکالنا یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ تو حکیم صاحب نے جواب دیا تھا:

"اب میں نے جو ارادہ کر لیا ہے اس میں تباہی ہو یا بربادی، اپنے ارادے سے کبھی باز نہ آؤں گا اور یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ پرچہ ایسا نکالوں گا کہ اس سے پہلے کے سارے پرچے گرد ہو جائیں گے۔"

محمد طفیل کے عزائم کی کہانی بھی یہی ہے۔

"نیرنگِ خیال کی دھوم زیادہ تر ان کے سالناموں کی وجہ سے تھی۔ ظاہری شان و شوکت بھی ایسی ہوتی تھی کہ دل کھنچتا تھا۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ متعدد رنگین تصویریں ہوتی تھیں۔"

نقوش کی دھوم بھی اس کے خاص نمبروں کی بدولت ہوئی اور ظاہری شان و شوکت میں بھی نقوش نے 'نیرنگِ خیال' کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس طرح کی بہت سی مشترک باتیں اور بھی ہیں جن کا تذکرہ تحصیلِ حاصل ہے اور موجبِ طوالت بھی۔

محمد طفیل نے اپنا خاکہ بھی لکھا ہے جو ان کا ناکام خاکہ ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے جو محمد طفیل کی خاکہ نگاری کے مداح اور معترف ہیں، کہیں اس خاکے پر گرفت کی ہو گی۔ جب 'گنجینۂ گوہر' محمد طفیل کی نظر سے گزری تو دیکھا کہ اس میں ایک مضمون شاہد احمد دہلوی نے اپنے بارے میں لکھا ہے۔ چنانچہ محمد طفیل نے فوراً بدلہ چکا دیا کہ یہ مضمون "در مدحِ خود" کی ذیل میں آتا ہے۔ جی ہاں ضرور آتا ہے، اس قسم کے سارے ہی مضامین در مدحِ خود کی ذیل میں آتے ہیں۔ اٹھارہ معاشقوں کا ذکر بھی حقیقت نگاری نہیں "در مدحِ خود" ہی کی ذیل میں آتا ہے۔ اپنا خاکہ ہو، اپنی ذات کو مرکز بنا کر لکھی گئی آپ بیتی ہو یا خود نوشت سوانحِ عمری ——— اور خود نوشت سوانحِ عمری روسو کی ہو، عبد الماجد دریا بادی کی ہو یا جوش ملیح آبادی کی ——— سب "در مدحِ خود" کی ذیل میں آتی ہیں۔ سید عبد اللہ نے بڑے کام کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں:

"روسو نے اپنے اعترافات ضرور لکھے مگر مجھے روسو کی رومانی شوریدگی کے پیشِ نظر پورا بھروسا نہیں کہ اس نے سب سچ لکھا ہو۔ لوگوں کو یہ دھوکا ہے کہ اس نے اپنی بے لگام زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتا کر بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے، لیکن یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ روسو کے عہد میں اس قسم کے ادب کی مانگ تھی اور اس قسم کی اشتہار بازی سے شہرت کا بازار گرم کیا جا سکتا تھا۔ اس دور میں مغرب میں یہ خیال ہو چلا تھا کہ ادیبوں اور دانشوروں کے لیے جنسی بے راہروی خوبی کی بات ہے ایسی کہانیوں میں لوگ دل چسپی لیتے تھے (اور بعض اوقات شاید ایسی باتوں کو ادیب

کی خصوصیت سمجھتے تھے) ممکن ہے روسو نے اشتہار بازی کی ہو۔" (میر امن سے عبدالحق تک
ص ۳۰۷)

خودنوشت سوانح یا خاکے میں سرشاریوں اور کامرانیوں کا تذکرہ ہو یا محرومیوں اور ناکامیوں کا، دونوں صورتیں در مدح خود کی ذیل میں آتی ہیں۔ مؤخر الذکر صورت میں اپنی جگرداری، تحمل مصائب اور مظلومیت کی داد وصول کی جاتی ہے بلکہ اپنی حماقتوں اور بدحواسیوں کا تذکرہ بھی در مدح خود کی ذیل میں آتا ہے کیونکہ فن کار پورے فنکارانہ سلیقے سے یہ جتا رہا ہوتا ہے کہ اپنی ذات کو ہدفِ مزاح بنانا ایک بڑی شخصیت کا متقاضی ہے۔ دیکھو میں ایک عظیم آدمی ہوں — لے دے کے ایک مشتاق احمد یوسفی باقی رہ جاتے ہیں جن کی زرگزشت کی ان دنوں بڑی دھوم ہے۔ بقول ان کے یہ ان کی سوانح نو عمری ہے۔ مزاح میں یوسفی کا (اور بالخصوص اس کتاب کا) مقام بہت بلند ہے۔ زرگزشت (نوعیت مزاح کے فرق سے قطع نظر) پطرس کے مضامین کے بعد اردو مزاح کی بہترین کتاب ہے۔ لیکن میں اسے خودنوشت سوانح عمری ماننے کو تیار نہیں۔ اس میں مرکزی اہمیت یوسفی کی ذات کو نہیں، دوسرے کرداروں کو حاصل ہے۔ خود کہتے ہیں:

"ممکن ہے بعض پڑھنے والوں کو اس خودنوشت سوانحمری میں لکھنے والا خود کہیں نظر نہ آئے۔ اگر ایسا تاثر ہے تو یہ عین قرینِ حقیقت ہوگا اس لیے کہ اپنی زندگی میں بھی ہر قدم پر دوسرے ہی دخیل نظر آتے ہیں۔ عام آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں صرف تین موقعے ایسے آتے ہیں جب وہ تہا سب کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے عقیقہ، تدفین اور نکاح۔ اس کتاب کا مرکزی کردار کون ہے، راقم الحروف؟ مسٹر اینڈرسن؟ وہ فرزانے جن کے دم سے کوچۂ سود خواراں شاد و آباد ہے؟ یا زمانے کی رد، جو ایلس ان ونڈر لینڈ کی بلی کی طرح خود تو فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے لیکن اپنی امر مسکراہٹ پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔" (ص ۱۲-۱۱)

یوسفی بسا اوقات ایک ناظر ہی کے روپ میں سامنے آتے ہیں اور جہاں وہ کردار کی حیثیت سے موجود ہیں وہاں بھی UNDER ACT کرنے پر مجبور رہیں۔ اگرچہ بعض اوقات انھوں نے جان بوجھ کر بھی ایسا کیا ہے کہ یہ بھی تخلیقِ مزاح کا ایک مسلّمہ اور مؤثر حربہ ہے پھر یہ فرق بھی ملحوظ رہے کہ یوسفی کا بنیادی مقصد اپنی ذات کا انکشاف نہیں، تخلیقِ مزاح ہی ہے۔ الغرض زرگزشت اگر در مدح خود نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر اپنے بارے میں ہے ہی نہیں۔ اگر یہ سوانحمری یا خاکہ ہوتی تو یہ بھی در مدح خود ہوتی بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جن جن صورتوں میں یہ سوانح عمری ہے ان ان صورتوں میں یہ اب بھی در مدحِ خود ہے ——— کہنا یہ مقصود ہے کہ خودنوشت سوانح تو پھر ایک خاص حد تک ممکن ہے، خودنوشت خاکہ، خاکہ نگاری کے مخصوص فنی تقاضوں کے تحت یکسر ناممکن ہے۔ اس قسم کے مضامین کو جن میں مصنف نے اپنی ذات کو مرکز بنا کر اپنے بارے میں کچھ باتیں کہی ہوں خاکہ نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ایسے مضامین کو خاکے کی کڑی شرائط پر جانچنا چاہیے

ایسے کسی مضمون میں اگر لہجہ انکسار آمیز ہے، خود ستائی مبالغہ آمیز نہیں، بے جا مظلومیت کا تاثر دینے کی کوشش نہیں کی گئی، اپنی شخصیت کو روشن کرنے کے لیے دوسروں کے چراغ نہیں بجھائے گئے، ممکن حد تک "اپنا ہاتھ اور اپنا گریباں" پر عمل کیا ہے، اتفاقات کو اپنا شرف منوانے کی کوشش نہیں کی گئی، اپنی نمایاں کمزوریوں کی طرف معنی خیز اشارے موجود ہیں، لکھنے والے نے حتی الامکان اپنی علمی شخصیت کو اپنی عملی شخصیت کے ساتھ گڈ مڈ نہیں کیا (یہ بہت بڑی شرط ہے) تو اسے کافی سمجھنا چاہیے۔ یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ ہر گفتنی و ناگفتنی بات "درج گزٹ" ہو گی۔ وہ واقعات جنھیں کوئی شخص خود اپنے آپ سے چھپاتا ہے، ہمارے مطالعے کے لیے کیسے شائع کر سکتا ہے چنانچہ کچھ واقعات کے اخفا کی اجازت دینی ہو گی، خواہ یہ واقعات شخصیت کے اہم پہلوؤں ہی سے متعلق ہوں۔ واقعات کی تعبیر و توجیہ میں تمام تر انصاف پسندی کے باوجود مصنف کا اپنا زاویۂ نظر ضرور دخیل ہو گا، اسے گوارا کرنا ہو گا۔

مدیرِ نقوش (طفیل صاحب کا اپنا خاکہ) "جناب" میں شامل ہے۔ بعض واقعات کے بارے میں صاف اعتراف کر لیا ہے کہ میں انھیں قلم بند نہیں کر سکتا۔

"ان سارے واقعات پر یہ کبھی ناول ہی لکھیں گے جس کی ضخامت کوئی چھ سو صفحات تو ہو گی۔"[1]

اس مضمون میں محمد طفیل نے اپنی یہ خصوصیات گنوائی ہیں،

شرافت، حیا، نفاست مضبوط قوت ارادی اور عزم و استقلال، شرمیلا پن، بعض دنیوی معاملات میں گھامڑ پن، ماں سے عقیدت، کم سخنی، نقوش سے حد درجہ کی محبت، مدیر نقوش ہونے پر حد درجہ مگر بجا ناز و تبختر، (اس مضمون کا عنوان بھی محمد طفیل نہیں مدیر نقوش ہے) قیافہ شناسی، پتنگ بازی سے رغبت، کرکٹ سے دلچسپی، شہرت، انسان دوستی یا غریب دوستی، رقت قلب، نفاست پسندی کے باوجود میز کی اشیا میں بے ترتیبی اور انتشار کا عالم ——— مدیر نقوش نے اپنے خاکے میں خلوص کو کوئی نمایاں مقام نہیں دیا بلکہ اسے دوسری خصوصیات میں خلط ملط کر کے اپنی شخصیت کی تصویر بنائی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ شخصیت نگار دوسروں کو بے نقاب کرنے میں خود بھی بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اس کے عادات و اطوار، رجحانات و میلانات، اس کے عقائد و اوہام اور اس کی پسند و ناپسندیدگی کو جاننے کے لیے اس کی اپنی تحریر جو اصلاً دوسروں کے بارے میں ہوتی ہے، اس کی اپنی شخصیت کا آئینہ بن جاتی ہے۔ عبدالحق نے نام دیو مالی کی فرض شناسی، کام کی لگن، اپنے پیشے سے والہانہ محبت اور جذبۂ خدمت پر بہت زور دیا ہے۔ یہ باتیں عبدالحق کی اپنی شخصیت میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہیں، رشید احمد صدیقی نے ایوب کی دلسوزی اور جذبۂ خدمت کو سراہا ہے۔ مولانا ابوبکر اور مولانا سلیمان اشرف کی علم دوستی، مادی منفعت سے بے نیازی اور مشرقی شائستگی پر زور دیا ہے۔ خود رشید احمد صدیقی نے بھی انھی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح محمد طفیل نے اپنے اکثر خاکوں میں شخصیتوں کا خلوص ڈھونڈنے کی کوشش ہے۔ اگر خلوص کی ایک رتی بھی انھیں کہیں دکھائی دے گی تو انھوں نے اسے چمکا کر ضیا پاش بنا دیا ہے۔ مخلص آدمی خلوص ہی ڈھونڈے گا اور اسی کو اہمیت دے گا۔ دوسری نمایاں بات جو ان خاکوں کی روشنی میں محمد طفیل کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے، یہ ہے کہ محمد طفیل توازن کو بہت اہمیت دیتے ہیں ———

---

[1] اس خاکے کا جاندار حصہ وہ ہے جس میں والدہ کا ذکر ہے۔ یہ بجائے خود ایک ضمنی خاکہ ہے۔ (و۔ ق)

———— شخصیت میں بھی، شخصیت نگاری میں بھی۔ ان کے نزدیک برائیاں یا شخصیت کی بشری کمزوریاں منافی انسانیت نہیں، لیکن عظمت برائی کو نہیں نیکی ہی کو حاصل ہے ———— میرا خیال ہے کہ ایک خاکہ نگار کا صحیح مزاج یہی ہونا چاہیئے۔

طفیل صاحب ایک موقر ادبی رسالے کے مدیر ہیں، ایک ایسے مدیر جو منٹو جیسے چوٹی کے ادیب کا افسانہ یہ کہہ کر لوٹا سکتے ہیں کہ یہ معیاری تخلیق نہیں۔ ان کے پرچے میں چھپنا اہل قلم کے لیے موجب عزت ہے۔ وُہ ایک اشاعتی ادارے کے مالک بھی ہیں۔ پھر وہ کتابوں اور مضامین پر مصنفین کو معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ سرکاری حلقوں میں بھی ان کی آواز کو کسی نہ کسی حد تک اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ چوٹی کے ادیب اور شاعر انہیں اپنے جھگڑوں میں حَکم بنانا چاہیں ———— چنانچہ انہیں اہل قلم سے ملنے، ان کے حالات جاننے، ان کے ساتھ مراسلت کرنے، مستقل رابطہ قائم رکھنے، انہیں قریب سے دیکھنے اور پرکھنے اور بالخصوص کسی ادیب کے مالی معاملات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل اور اُلجھنوں کو سمجھنے اور پہچاننے کے بہتر مواقع حاصل ہیں اور محمد طفیل نے ان مواقع سے خُوب خُوب فائدہ اٹھایا ہے ان کے خاکوں میں بعض اہل قلم کے بارے میں ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو منظر عام پر نہ آسکتیں اگر محمد طفیل نقوش کے ایڈیٹر نہ ہوتے اور نقوش اتنا عظیم ادبی رسالہ نہ ہوتا۔

مگر میرا خیال ہے کہ طفیل صاحب کی اسی قابلِ رشک پوزیشن نے خاکہ نگاری میں ان کا راستہ روکا بھی ہے بعض لوگ ان کے سامنے کھُلے نہیں کیونکہ انہیں تو خط لکھنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ یہ صاحب خطوط نمبر اور مکاتیب نمبر کے چکر میں رہتے ہیں پھر طرہ یہ کہ خاکہ نگار بھی ہیں ان کا سامنا کرنا مووی کیمرے کا سامنا کرنے کے مترادف تھا ہے۔ اس لیے احتیاط لازم ہے جب آدمی کیمرہ کانشس ہو جائے تو اصل شخصیت کی بجائے شخصیت کا خول سامنے آجاتا ہے۔ لطیفہ ہے کہ کسی علمی محفل میں کچھ اس قسم کا موضوع زیر بحث تھا کہ افتاد طبع کے اعتبار سے انسانوں کو کتنے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک نے کہا، انسانوں کی دو ہی قسمیں ہوتی ہیں: دروں بیں اور بیروں بیں"

دوسرے نے کہا: یہ کوئی واضح تقسیم نہیں۔ انسانوں کی زمرہ بندی دو گروہوں میں کی جا سکتی ہے: رجائی اور قنوطی"

ایک پولیس افسر بھی محفل میں موجود تھے، بولے یہ سب باتیں غلط ہیں۔ ہمارے نزدیک تو آدمیوں کی دو ہی قسمیں ہیں۔

ایک وہ جن کے قلندرے کھُل چکے ہیں۔

دوسرے وہ جن کے قلندرے ابھی نہیں کھلے۔

طفیل صاحب کے ہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ ہر ادیب جو ان کے قریب گیا یا نقوش کے صفحات پر اُبھرا، طفیل صاحب نے اس کا قلندرا کھول دیا۔ بے چارے ادیب کو بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ اس کا قلندرا کھل گیا ہے اب بہت محتاط رہنا پڑے گا۔ اس قسم کی احتیاط اخفائے حقائق پر مجبور کرتی ہے۔ اس صورت حال میں بدحواسیاں بھی سرزد ہوتی ہیں جو غلط نتائج کی بنیاد بھی بن سکتی ہیں۔ غالب کو ۱۸۵۰ء ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے خطوط اشاعت کی غرض سے جمع کیے جا رہے ہیں مگر اس کی رندی بے ریا تھی، اس لیے اس نے اپنے انتقال ۱۸۶۹ء تک شراب پینے، اور بھیک مانگنے سے پہلے نقاب ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ———— لیکن ہر شخص غالب نہیں ہوتا۔

مخاطب کی حیثیت کے پیش نظر بیان کا زاویہ بدل بھی سکتا ہے اور اس کا مجموعی تاثر تو لازماً بدل جاتا ہے مثلاً کسی قابل اعتراض شرارت کا بیان اور اس کا مجموعی تاثر حسب ذیل صورتوں میں مختلف ہو گا۔

ؔ فراق جیسے آدمی کو بھی اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر طفیل صاحب سے یہ کہنا پڑا کہ یہ باتیں آف دی ریکارڈ ہیں

(۱) بے تکلف اور ہم مشرب احباب کے سامنے۔
(۲) کسی ناصح مشفق قسم کے دیندار دوست کے سامنے۔
(۳) مشفق استاد یا شیخ طریقت کے سامنے۔
(۴) پولیس انسپکٹر کے سامنے۔
(۵) والدین کے سامنے۔

چنانچہ موضوع خاکہ کے بیانات، مکالمات اور خطوط پر انحصار خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ محمد طفیل نے بیانات و مکالمات درج تو بہت کیے ہیں مگر ان پر بہت کم انحصار کیا ہے اور جہاں انہیں ایسا کرنا پڑا ہے وہاں بھی انہوں نے اس مواد کو شخصیت کے دوسرے مظاہر سے ملا کر دیکھا ہے اور بالعموم استنباط نتائج میں اس مواد کو اتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی شخصیت کے دوسرے مظاہر سے حاصل ہونے والے مجموعی تاثر کی روشنی میں دی جا سکتی ہے۔

کسی شخص کے تضادات کی تحلیل اور ان تضادات میں مطابقت کی تلاش بہت مشکل کام ہے اور اس امر خاص میں محمد طفیل کا مقابلہ کوئی دوسرا خاکہ نگار نہیں کر سکتا۔ شخصیت کے متخالف اور متضاد پہلوؤں کا ذکر تو سبھی خاکہ نگار حسب توفیق کر لیتے ہیں لیکن تضادات میں وہ "رابطہ" ڈھونڈ نکالنا جو انہیں ہم آہنگ کر کے شخصیت کے متخالف و متصادم عناصر کو ایک اکائی کی شکل عطا کر دے، طفیل اور صرف طفیل کے حصے میں آیا ہے اس نقطہ نظر سے نیاز، جوش اور صادقین کے خاکے معیاری خاکے ہیں اور نئے خاکہ نگار ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ البتہ ممتاز مفتی کے خاکہ میں محمد طفیل اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے۔ حالانکہ اس خاکہ پر اس خاص زاویے سے سب سے زیادہ محنت ہوئی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ناکامی کا سارا الزام محمد طفیل کے سر تھوپنا مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی کی شخصیت ہی ابھی تک کٹھالی میں ہے۔

محمد طفیل کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ شخصیت کی کلید ہاتھ آ جائے کوئی ایسی کلید جس سے قصرِ شخصیت کے تمام بند دروازے کھل سکیں۔ شخصیت کے تمام مظاہر کی توجیہ کی جا سکے۔ وہ حکمران جذبہ یا چند جذبوں کی کوئی ایسی ہیئت ترکیبی ڈھونڈ نکالی جائے جسے شخصیت کی تمام خوبیوں اور کمزوریوں کا مصدر و ماخذ قرار دیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے، لیکن اگر اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ تو مزاج اور شخصیت کی ایک ایسی قابلِ اعتماد تصویر بنائی جا سکتی ہے جسے خاکہ نگاری کا منتہا قرار دیا جا سکے۔ محمد طفیل نیاز فتح پوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> چونکہ شرارت اور اُپج سے نیاز صاحب کا خمیر اٹھا ہے اس لیے بے مہار بھی چلے" (آپ ص ۲۵)

نیاز صاحب کے مذہبی افکار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> نہ تو انہیں روایتی قسم کے اسلام سے کوئی دلچسپی ہے، نہ شیعوں سے نہ سُنّیوں سے اور نہ غریب احمدیوں سے۔ یہ تو کوئی اچنبھے کی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جس سے لوگوں کے کان کھڑے ہوں اور انہیں اپنی علمیت کے جوہر دکھانے کا موقع ملے یہ تو صرف اپنی قابلیت اور علمیت کی وجہ سے سب کو نالائق ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ انا بھی کیا بُری بلا ہے۔" (آپ ص ۴۰)

اختر اورینوی کے بارے لکھا ہے :

مذہب اور رومان، انہی دو حقیقتوں میں اختر صاحب گم ہیں۔ آئیے انھیں ڈھونڈ نکالیں"۔ (آپ ص ۱۷۹)

صادقین کے بارے میں لکھتے ہیں :

ہماری نیک اطواری میں خوف خدا بہت کم ہے، خوف دنیا زیادہ ہے لیکن ان کی پاک بازی میں خوف خدا زیادہ، خوفِ دنیا کم ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر صادقین کی شخصیت اور فن کا خمیر اٹھا ہے"۔ (معظم ص ۱۱۲)

شخصیت کا کوئی مطالعہ نفسیاتی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں۔ شخصیت کے مختلف عناصر میں کسی رشتے کی تلاش، مختلف اور متضاد واقعات و مظاہر کی توجیہ و تعبیر اور مظاہر شخصیت کے پیچھے چھپے ہوئے نفسی عوامل کی تفہیم کے لیے نفسیاتی بصیرت سے کام لینا ضروری ہو جاتا ہے ورنہ واقعات اور مظاہر شخصیت تو سپردِ قلم کیے جا سکتے ہیں، ان واقعات و مظاہر میں شخصیت کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا، لیکن شخصیتوں کے مطالعہ میں فرائڈ، یونگ یا کسی اور ماہر نفسیات کے بنے بنائے سانچوں سے کام لینا اور انہی پر انحصار کرنا خطرناک ہے۔ نفسیات کا علم ہمیں شخصیت کا کھوج لگانے میں مدد ضرور دیتا ہے مگر کسی سکہ بند نظریے کی روشنی میں شخصیت کا مطالعہ چنداں مفید نہیں ہوگا اس سے کسی ماہر نفسیات کے مزعومات کی تائید تو ہو سکے گی، شخصیت کا کھوج نہیں لگایا جا سکے گا۔ شخصیت نگاری میں نفسیات کے سکہ بند نظریات نہیں نفسیاتی بصیرت کام دیتی ہے (البتہ یہ مسلم ہے کہ نفسیات کے مختلف مکاتبِ فکر اور مختلف ماہر نفسیات کے افکار کا مطالعہ نفسیاتی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے) محمد طفیل نے اپنے خاکوں میں ماہرین نفسیات کے مزعومات یا ڈھکوسلوں سے نہیں نفسیاتی بصیرت سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر احمد ندیم قاسمی کے خاکے سے دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

جو ذرا سا جرأت کے ساتھ سوچنے لگتا ہے ہم اسے کمیونسٹ کہہ کر اس سے زیادتی پر اتر آتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ انہی نظریات پر راضی ہو جاتا ہے"۔ (صاحب ص ۵۶)

حقیقت یہ ہے کہ انہیں خفا ہونا آتا ہی نہیں، خفگی کے موقع پر یہ بڑے اوپرے اوپرے معلوم ہوتے ہیں اور اس وقت ان کی حالت بڑی عجیب ہوتی ہے جیسے کہہ رہے ہوں بھئی! اب میں خفا تو ہو گیا ہوں لیکن اسے نبھاؤں کیسے!

(صاحب ص ۷۰)

شوکت تھانوی کے بارے لکھتے ہیں :

آپ فرسٹ کلاس قسم کے بزدل ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں، اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رلانے پر بھی قادر ہوتے اور پھر آپ شوکت تھانوی نہ ہوتے، علامہ راشد الخیری ہوتے"۔ (صاحب ص ۹۳)

میں نے یہاں ان خاکوں کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا کہ جن میں نفسیاتی طریق کار اختیار کر کے نفسیاتی حربوں سے شخصیتوں کے قفل کھولنے کی کوشش کی گئی ہے، کیونکہ وہاں تو نفسیاتی بصیرت قدم قدم پر ملے گی۔ مجھے تو یہ بتانا ہے کہ نفسیاتی بصیرت سے محمد طفیل نے تقریباً ہر خاکے میں کام لیا ہے۔ اور یہ ان کے طریق کار کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

شخصیت نگاری میں مفروضہ بہت احتیاط چاہتا ہے جملوں کی حد تک اس کی مثالیں لگ بھگ ہر خاکہ نگار کے ہاں مل جائیں گی

مگر محمد طفیل کے ہاں یہ تموک کے حساب سے بھی ملتا ہے۔ منٹو کے خاکے میں عالم بالا سے منٹو کا ایک خط بھی شامل ہے۔ یہ نہایت کامیاب کوشش ہے۔ اس خط میں منٹو کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ نقوش نے منٹو پر ایک خاص نمبر بھی شائع کیا ہے۔ اس ضخیم نمبر کے بالاستیعاب مطالعے سے منٹو کی جو تصویر اُبھرتی ہے، وہی تصویر اس خاکے میں بھی چھوٹے پیمانے پر موجود ہے جگر مرادآبادی کے خاکے میں ایک جگہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جگر صاحب گفتگو میں اضافتوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں جس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کسی پڑھے لکھے انسان سے ہو رہی ہیں لیکن ان میں روانی مفقود ہوتی ہے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں کہیں کے کہیں نکل جائیں گے اور سامع بیچارہ وہیں کا وہیں بیٹھا رہ جائے گا۔ کوشش کریں گے کہ اسے اس دنیا کی بھی سیر کرا دیں اور اس دنیا کی بھی۔ ان کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں"۔ اس کے بعد داوین میں جگر صاحب کی گفتگو کا نمونہ دیا ہے جو پورے ایک صفحے کو محیط ہے اگر یہ ریکارڈ کی ہوئی تقریر نہیں تو محمد طفیل مستحق ہیں کہ انہیں اس کمال صناعی کی داد دی جائے۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے متعدد کرداری افسانوں سے بُرے لوگوں کے باطن میں چھپی ہوئی نیکی کی رُوح یا فطرت سعید کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً موذیل جو عفت اور حیا جیسے نسوانی محاسن سے یکسر عاری ہے کرپال کور اور ترلوچن کے حق میں فرشتہ ثابت ہوتی ہے اور اپنے ایثار کا انمٹ تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ بابو گوپی ناتھ ایک رنڈی باز ہے مگر زینت کے معاملے میں اپنی انسانیت، دلسوزی اور شرافت نفس کی داد وصول کیے بغیر نہیں رہتا۔ ممی بدمعاش اور بدنام دلاّلہ ہے مگر منٹو نے اس میں بھی انسانیت ڈھونڈ نکالی ہے بلکہ ان کہانیوں کا مقصود ہی ان کرداروں کی عظمت کا سکہ جمانا ہے گویا منٹو کہتا ہے کہ بُرے اور بدنام لوگ بھی اتنے بُرے نہیں ہوتے جتنا بُرا انہیں سمجھ لیا جاتا ہے، آدمی کتنا ہی بُرا ہو۔ اس کی فطرتِ سعید اس کے اندر کہیں نہ کہیں خوابیدہ شکل میں موجود رہتی ہے اور موقع پاتے ہی اظہار کے لیے بے تاب ہو جاتی ہے۔ محمد طفیل کا واسطہ افسانوی کردار سے نہیں معاصر شخصیتوں سے ہے جو دنیائے علم و فن کی عظیم ہستیاں ہیں ان میں سے بعض کی شخصیتیں متنازعہ فیہ ہیں۔ محمد طفیل کہنا چاہتے ہیں کہ ظاہر بین نگاہوں نے انہیں صحیح رُوپ میں نہیں دیکھا یا ان کی بعض کمزوریوں کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے جس سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اس طرح وہ عظیم ہستیاں بعض حلقوں میں معتوب، ناپسندیدہ یا بدنام سمجھی گئیں۔ جو لوگ اچھے ہیں وہ تو بعض پیاری پیاری کمزوریوں کے باوجود اچھے ہی ہیں۔ یہ لوگ جو بُرے سمجھے جاتے ہیں اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود اتنے بُرے آدمی نہیں جتنا انہیں سمجھ لیا گیا ہے۔ انسانیت کا جوہر ان میں بھی موجود ہے۔ آئیے میں آپ کو ان کی فطرتِ سعید کی ایک جھلک دکھاؤں:

"صادقین مومن نہیں کافر ہے مگر اتفاق کہ زاہدوں سے زیادہ پاکباز ہے"۔ (معظم ص ۱۱۲)

"یہ بنے ہوئے شرافتیوں سے زیادہ شریف ہیں۔ . . . برائیاں ڈھونڈنے والوں کو منٹی میں بہت سی برائیاں بھی مل جائیں گی مگر انہیں کبھی ریاکاری نہ ملے گی . . . . میں نے ان میں بے اندازہ خلوص پایا . . . . . وقت پڑنے پر دشمنوں کے بھی کام آتے ہیں"۔ (معظم ص ۱۴ تا ۱۵)

اختر شیرانی جیسا ناقابلِ اصلاح شرابی، جس کی والدہ بھی اس کی موت کی دعائیں مانگتی تھی؛ اخلاص، حیا، سادگی، بھولپن، دردمندی اور دوست نوازی جیسی عظیم صفات کا پیکر تھا"۔ (جناب ملخص ص ۷۸ تا ۷۹)

کیا خبر تھی کہ جب اسی کافر اور ملحد (نیاز فتح پوری) سے ملاقات ہو گی تو وہ کئی عابدوں سے بہتر انسان ثابت ہو گا۔" (آپ ص ۲۵)

محمد طفیل بھی منٹو کی طرح انسان کی فطرت سعید کے اچھے جوہری ہیں۔

محمد طفیل ایک خاکہ نگار ہیں اور خاکے کے فن کو خوب سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنے خاکوں میں کامیاب رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب کسی قدر تفصیل کا طالب ہے۔

خاکہ نگار کو موضوعِ خاکہ کی شخصیت کو روشنی میں لانے کے لیے تین قسم کی باتوں کا ذکر کرنا پڑتا ہے:۔

۱۔ وہ باتیں جنہیں اخلاقی محاسن سمجھا جاتا ہے، جیسے حیا، خلوص، معصومیت، رواداری، ایثار، تحمل، خوش معاملگی اور تبحر علمی وغیرہ۔

۲۔ وہ باتیں جنہیں اخلاقی معائب سمجھا جاتا ہے، جیسے مغلوب الغضبی، خود غرضی، الحاد، بدزبانی اور جنسی بے راہروی وغیرہ۔

۳۔ وہ باتیں جنہیں نہ اخلاقی خوبیاں سمجھا جا سکتا ہے نہ خامیاں، جیسے ایک خاص قسم کا لباس پہننا، کرسی پر اکڑوں بیٹھنا، ایک خاص انداز میں چلنا، بلند آہنگ قہقہے لگانا، بلیاں یا کبوتر پالنا، پتنگ اُڑانا، ہجوم میں بدحواس ہو جانا، چٹپٹی چیزیں کھانا، حُقے یا پان سے رغبت، گرمیوں میں گرم پانی سے غسل کرنا، خوشی کے موقع پر غمگین ہو جانا، یادوں سے جی بہلانا، خیالی پلاؤ پکانا وغیرہ۔

جہاں تک پہلی اور تیسری قسم کی باتوں کا تعلق ہے محمد طفیل کامیاب رہے ہیں بلکہ بعض جگہ ان کی کامیابی رشک انگیز حد تک پہنچ گئی ہے۔ دوسری قسم کی باتیں لکھنے میں متعدد موانع کے باوجود، وہ دوسرے خاکہ نگاروں سے کہیں زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ اس جواب سے ایک اور سوال اُبھر آیا کہ اگر محمد طفیل کامیاب خاکہ نگار ہیں تو اردو خاکہ نگاری میں ان کا مقام کیا ہے؟ جب میں نے اس سوال پر غور کیا تو بہت اُلجھن ہوئی۔ اگر ان کے کام کی مقدار کو پیشِ نظر رکھا جائے تو وہ اردو کے سب سے بڑے خاکہ نگار ٹھہرتے ہیں۔ ایک نہ دو اکٹھے سات مجموعے! "محترم"[1] کو نکال بھی دیجیے تو بھی چھ مجموعے! دوسری بات یہ سامنے آئی کہ خاکہ نگاری میں بیشتر خاکہ نگاروں کی دلچسپی جز وقتی رہی ہے خاکہ نگاری ان کی ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا صرف ایک پہلو ہے۔ فرحت اللہ بیگ مضمون نگاری کرتے کرتے بعض اچھے خاکے بھی لکھ گئے۔ مولوی عبدالحق تحقیق، تنقید، تاریخ، لغت اور لسانیات جیسے علمی مشغلوں کے آدمی تھے۔ چند ہمعصر بھی لکھ گئے۔ رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر طنز نگار تھے، تنقید اور شخصیت نگاری سے بھی دلچسپی لیتے رہے۔ سعادت حسن منٹو افسانہ نگار تھے "گنجے فرشتے" بھی لکھ گئے جو ان کے افسانوی عمل ہی کی ضمنی پیداوار (BY PRODUCT) معلوم ہوتی ہے جب کہ محمد طفیل نے صرف خاکے لکھے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ یک فنے ہیں اگرچہ ان کے خاکوں کو بھی تدوینِ نقوش کے عمل کا BY PRODUCT قرار دیا جا سکتا ہے مگر تخلیق کے میدان میں

---

[1] محترم خاکوں کا مجموعہ نہیں۔ خود مصنف نے اسے "ایک سفر نامہ ایک تذکرہ" قرار دیا ہے۔ البتہ اس میں مختلف اشخاص کے بارے میں کچھ چہرہ نما پیراگراف ہیں۔ شرکائے عرس کی بعض سرگرمیوں کا تذکرہ ہے، ادیبوں کی گفتگو ہے، کراچی کے بعض احباب سے ملاقاتوں کا ذکر ہے، کوشش کی گئی ہے کہ شخصیتوں کے خدوخال واضح کیے جائیں۔ یہ خاکوں کا مجموعہ نہ سہی لیکن ہے بڑی حد تک شخصیت نگاری کے دائرے کی چیز۔

یک بحیر و محکم گیر کے اصول کے تحت انہوں نے شخصیت نگاری ہی کو اپنا میدان قرار دیا اور دوسرے میدانوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ خاکہ نگاری سے ان کی دلچسپی جز وقتی نہیں یہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

پیشہ ور نقاد اسے میری کمزوری سمجھیں یا مجبوری تاہم میں اس پر نادم نہیں نازاں ہُوں کہ خاکوں کا مجموعہ یا انشائیوں کا، ناول ہو یا ڈرامہ ——— میں جب بھی کوئی کتاب پڑھوں یہ ضرور دیکھتا ہوں کہ حسن خیر اور صداقت کو چمکانے، آگے بڑھانے، دلوں میں اتارنے یا دلپذیر بنانے میں مصنف نے کوئی دلچسپی لی ہے یا نہیں ——— اس کتاب سے کوئی صالح نظامِ اقدار اُبھرتا ہے یا نہیں؟ اس کتاب میں کتنی عبارتیں، پیراگراف یا جملے ایسے ہیں جو نیکی کی عظمتوں کے نقیب ہیں اور انسانیت پر اعتماد سکھاتے ہیں؟ کتاب میں کہیں کوئی نوائے سینہ تاب سنائی دیتی ہے یا نہیں؟

اس نقطۂ نظر سے ان سات مجموعوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بے عیب ذات خُدا کی ہے۔ ہم جس طرح کے انسانوں میں گھرے ہوئے ہیں وہ خوبیاں بھی رکھتے ہیں اور خامیاں بھی۔ خوبیوں کی قدر کرنا سیکھو۔ خامیاں منافی عظمت ہیں مگر خامیوں سے بَری نہ آپ ہیں نہ میں۔ پہلا پتھر وہ مارے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ وہ لوگ عظیم ہیں جو مولوی عبدالحق کی طرح دیوانگی کی حد تک کسی اعلیٰ نصب العین سے وابستہ ہیں۔ ان کے جنونِ عشق کے طفیل ان کی چھوٹی موٹی خامیوں سے درگزر کیجیے۔ یاد رکھو "تاریخ یا تو غداروں کو یاد رکھتی ہے یا اپنے محسنوں کو"۔ پھکڑپن کوئی اچھی بات نہیں۔ لیکن ریاکاری کے مقابلے میں تو پھکڑپن ہی بہتر ہے۔ آدمی کی ہزار مجبوریاں ہوتی ہیں، اس کی کمزوریوں پر گرفت کرنے سے پہلے اس کی مجبوریوں پر بھی ایک نظر ڈال لیا کرو۔ دوستی تبادلہ منفعت ہی نہیں ایک مقدس رشتہ بھی ہے اس رشتے کی تقدیس کو پہچانو۔ اس آب گینے کو ٹھیس نہ لگنے دو۔ عظیم ہیں وہ دوست جو خفا نہیں ہوتے اور عظیم تر ہیں وہ دوست جو خفا ہونے کے بعد منانے میں پہل کرتے ہیں اور پھر جائز شکایت کو بھی یوں بھول جاتے ہیں جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ اچھا آدمی وہ ہے جو دوسروں کے لیے جیتا ہے "وہ لوگ جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں وہ مرا نہیں کرتے"۔ اگر آپ اپنے مسائل میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اس بلند معیار پر پورے نہیں اتر سکتے تو بھی آپ سے کم از کم یہ توقع ضرور کی جائے گی کہ آپ دوسروں کے لیے بے ضرر ہوں۔ دنیا میں متاعِ شادمانی بہت کم ہے، اس لیے اپنے عادات و اخلاق، اپنے معاشرتی رویے، اپنی بات چیت اور میل جول سے اس ذخیرے میں اضافہ کرتے رہو۔ دنیا میں خود غرضی بڑھ رہی ہے، معاشرہ ریاکاری، منافقت اور زرپرستی کا جہنم بن گیا ہے۔ "آگ میں پھول کھلانے کی کوشش کرتے رہو۔ یہ درست ہے کہ "سولی پر لٹکنا آسان ہے احساس بن کر جینا مشکل ہے"۔ لیکن یہ احساس موہبت خداوندی ہے، دولتِ عظمیٰ ہے۔ اس بار امانت کو قبول کرو۔ وہ ادیب، شاعر اور مصوّر ہی نہیں جس کا دل گداز نہ ہو، جو دوسروں کے مرنے سے پہلے خود نہ مر جاتا ہو۔ اپنی سوچوں کا زاویہ درست رکھو کیونکہ عبادت صرف وہی نہیں جس سے ماتھے پر گٹے پڑتے ہوں صالح سوچ بھی عبادت ہے۔" اہلِ ثروت نے تو اپنی دُنیا الگ بسا لی ہے تم علم و فن کی دنیا کے آدمی ہو، دولتِ احساس سے بہرہ ور ہو حسنِ خیر اور صداقت کے علمبردار ہو، اپنی دنیا کی حفاظت کرو، اپنی اقدار کے گیت گاتے رہو۔ زرپرست کا ہر لمحہ اس کے نفس کی امانت ہے مگر "ادیب کا ہر لمحہ دوسروں کی امانت ہے"! دیانت کا تقاضا ہے کہ یہ امانتیں لوٹاتے رہو۔ زندگی کا حقیقی اثاثہ صالح اصول ہیں۔ وُہ لوگ عظیم ہیں جو اصولوں سے محبت رکھتے ہیں۔ وُہ لوگ بھی عظیم ہیں جو اولاد سے محبت رکھتے ہیں، اور وہ لوگ عظیم تر ہیں جو اولاد کی خاطر اصولوں کو قربان نہیں کرتے۔ اصول ایثار کا تقاضا کرتے ہیں۔ اصول کی قربان گاہ پر

بنی توفیق و استطاعت کے مطابق ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھاتے رہو تاکہ اس قربان گاہ کی شمعیں روشن رہیں۔ وُہ لوگ عظیم ہیں جو حق و صداقت کی حفاظت کے لیے سُولی پر چڑھنے کو تیار رہتے ہیں۔ اور وُہ لوگ بھی اہم ہیں جو اپنی مجبُوریوں اور معذوریوں کے باعث اس جہاد میں عملاً حصہ نہیں لے سکتے۔ مگر ان کے سینوں میں بھی خیر و صداقت کے لیے تڑپ موجود ہے۔ کوشش کرتے رہو کہ یہ تڑپ ——— یہ شعلۂ سینہ تاب ——— بجھ نہ جائے، ورنہ انسانیت کا کارواں ہوس کے اندھیروں میں بھٹک جائے گا، کھو جائے گا۔

قصہ مختصر!

محمد طفیل کی کتابوں میں "آپ" "معظم" اور "مجبی" کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور یہ کتابیں فن خاکہ نگاری کے باب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

"صاحب" سے "مجی" تک

(طفیل صاحب کی خاکہ نگاری پر ایک نظر)

میرزا ادیب

خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کی روایت ہمارے ہاں جدید نہ سہی، اتنی پرانی بھی نہیں البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اپنے تکنیکی تنوع کے اعتبار سے ادب کی اس صنعت کا تعلق رواں صدی کے نصف ثانی ہی سے ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالمجید سالک، سعادت حسن منٹو، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے اپنے رنگ، اپنے اپنے ڈھنگ اور اپنے اپنے اسلوب کے مطابق معروف اور غیر معروف شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں اور انھیں بڑی دل چسپی سے پڑھا گیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں طفیل صاحب کے خاکے ان سب سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں اور اس طرح الگ تھلگ رہنے کی کئی وجوہ ہیں یا یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ طفیل صاحب کے خاکوں میں بعض ایسی امتیازی خصوصیات محسوس ہوتی ہیں جو صرف انہی کے فن سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہیں اور دوسرے خاکہ نگاروں کے ہاں یہ خصوصیات مجموعی طور پر پرتو افگن ہیں۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان ہی سمجھتے ہیں فرشتہ نہیں سمجھتے۔ انھیں اپنے "ہیرو" کی خوبیاں بہت پسند ہیں اور تہِ دل سے وہ ان خوبیوں کے معترف ہیں مگر وہ اس کی کمزوریوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان اپنی نیکیوں اور کمزوریوں سمیت انسان ہوتا ہے اور وہ انسان کو اسی سطح پر، اسی صورت میں قبول کرتے ہیں۔ وہ جب کسی کی کمزوری کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا انداز بہت خوب صورت اور بے تکلفانہ ہوتا ہے، جیسے اس کمزوری کا ذکر کرتے وقت مسکرا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: "صاحب! آپ کا یہ پہلو بھی بڑا پیارا ہے۔ واہ وا اس پہلو کے کیا کہنے!"

ہمارے خاکہ نگاروں نے عموماً اپنی شخصیتوں کو خود سے بلند سطح پر رکھ کر دیکھا ہے لیکن طفیل صاحب کا یہ انداز ہرگز نہیں وہ اپنی زیرِ نظر شخصیت کو نہ تو اپنے سے بلند سطح پر لے جاتے ہیں اور نہ پست تر مقام پر۔ اپنے پہلو میں بٹھا لیتے ہیں اور پھر اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے دو ہم جلیس، دو دیرینہ ہمدم اور دو ہمراز گفتگو کر رہے ہوں۔ اس طرح شخصیت ان کے زیرِ نظر رہتی ہے نہ تو زیرِ مشق ہوتی ہے اور نہ بالائے مشق، اس طریقِ کار کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کی خاکہ نگاری میں حقیقت نگاری بھی ہے، سادہ نگاری بھی اور مزاح نگاری بھی۔

مزاح نگاری طفیل صاحب کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ ان کے مزاج میں پھکڑ پن، طنزیت اور استہزائیہ پہلو ہرگز نہیں۔ ان کے یہاں بات میں سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ فکلّتہ ہے کہ شخصیت اور شخصیت نگار دونوں ہی مسکرا رہے ہیں اور مزے لے لے کر باتیں کر رہے ہیں۔

دوسرے خاکہ نگاروں نے عام طور پر اپنی شخصیت کو بھاری بھرکم لباس میں ملبوس کر دیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں:

"باادب باملاحظہ ہوشیار"

لیکن طفیل صاحب اپنی شخصیت سے مسکرا کر کہہ رہے ہیں:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اس لیے ترجیحی لباس میں بھی ہو، بہرصورت مناسب ہے۔

غالب نے کہا تھا:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

غالب یقیناً یہ بات کہہ سکتا تھا۔ اس کا بیان تو قیامت خیز ہوتا تھا، مگر طفیل صاحب اپنے بیان سے قیامت خیزی کے قائل نہیں۔ ان کا بیان ہزار خوبصورت، دلکش اور دلآویز سہی تاہم ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بیان کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ ان کی "بیانیہ کوششوں" کا محور وہ آدمی ہوتا ہے جسے وہ اپنی محفلِ دل میں لے آتے ہیں۔ میں نے محفلِ دل کہا ہے اور اس بنا پر کہ جو سلوک طفیل صاحب اپنی شخصیتوں کے ساتھ کرتے ہیں وہ دلی تعلق کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ وہ ذہن کی کارفرمائی سے زیادہ دل کی کارفرمائی سے کام لیتے ہیں گویا وہ انداز اختیار کیا جو خاکہ نگاری کے لیے لابدی ٹھہرا۔

دل را بہ دل رہیست دریں گنبدِ سپہر

ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کر دوں کہ طفیل صاحب کے ہاں ایسا نہیں ہوتا کہ وہ کسی شخصیت کے متعلق اس کے گوناگوں قصوں کا ذکر کریں یعنی وہ شخصیت کو مختلف "رخوں" کے دائرے میں نہیں لے آتے جیسا کہ بعض خاکہ نگار کرتے ہیں بلکہ وہ شخصیت کی "اکائی" کو لیتے ہیں اور یہ شخصیت ان کے ہاں ایک اکائی ہے اور شروع سے لے کر آخر تک اکائی ہی رہتی ہے۔

محمد طفیل کے شخصی خاکوں کی تعداد اٹھاون کے قریب ہے جو چھ کتابوں کے کم و بیش بارہ سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ طویل ترین خاکہ "نیرنگِ خیال" کے ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن کے بارے میں ہے جو ایک سو انتالیس صفحات کو محیط ہے اور اس کا عنوان ہے "حکیم صاحب"۔ یہ خاکہ طفیل صاحب کی کتاب "مکرم" میں شامل ہے۔ "محترم" بنیادی طور پر

ایک سفرنامہ ہے جو مصنف نے جولائی ۱۹۶۳ء میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے سالانہ عرس میں شریک ہونے کے لیے اختیار کیا تھا۔ اس سفر کے دوران میں انہیں جن ادیبوں کے قریب بیٹھنے اُٹھنے اور گفتگو کرنے کا موقعہ ملا تھا ان کے تعارفی سکیچ بمع تصاویر دے گئے ہیں۔ یہ سکیچ بہت مختصر ہیں۔

ان کتابوں کی زمانی طور پر ترتیبی اشاعت اس انداز کی ہے۔

سب سے پہلے "صاحب" اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ اس کا زمانۂ اشاعت جولائی ۱۹۵۵ء ہے۔ اس کے بعد "جناب" پھر "آپ"۔ پھر تین اور کتابیں چھپیں جن کے نام بالترتیب یہ ہیں: محترم، مکرم، معظم۔ اور آخر میں مخدومی اور محبی۔

جیساکہ میں نے اوپر عرض کیا ہے ان کتابوں میں سوائے ایک سفرنامے کے باقی تمام کے تمام شخصی خاکے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طفیل صاحب نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو صرف خاکہ نگاری کے لیے کیوں وقف کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ وہ کچھ اور بھی لکھ سکتے تھے۔ کسی اور صنفِ ادب میں بھی طبع آزمائی کر سکتے تھے صرف ایک ہی صنف کے ساتھ وابستگی کا مقصد کیا ہے اور طفیل صاحب نے ایسا کیوں کیا ہے؟

طفیل صاحب نے اپنی پہلی تصنیف "صاحب" کے دیباچے 'اعترافِ جرم' میں اس سوال کا جواب دے دیا ہے اُن کا اپنا جواب ملاحظہ فرمایئے:

"مارچ ۱۹۵۳ء میں جب قادیانی تحریک کے سلسلے میں معرکے سر ہونے شروع ہوئے تو نوبت مارشل لا تک پہنچی تھی۔ چونکہ فطرتاً ہنگامہ کار نہیں ہوں اس لیے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ پہلے گھر والوں سے لڑنے جھگڑنے کا سلسلہ چلایا۔ جب اس مشغلے سے طبیعت سیر ہوگئی تو یہ مضامین لکھنے شروع کر دئے جو ان شاء اللہ آیندہ جھگڑوں کا موجب بنیں گے۔"

کچھ آگے چل کر انہوں نے اپنے قاری کی توجہ ایک اور امر کی طرف مبذول کرائی ہے:

"میں نے چاہا کہ عام بول چال اور بہت ہی سادہ سے اسلوب میں چہروں کی نقاب کشائی کرتا جاؤں۔ اس سلسلے میں کسی سے مرعوب ہو کر نہیں لکھا۔ نہ ہی کسی کو غلط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

طرزِ بیان میں خامی ہو تو ہو شخصیتوں کے مطالعے میں مجھ سے زیادہ چوک نہیں ہوئی ہے اور اِس طرزِ بیان کو میں نے اس لیے اپنایا ہے کہ میرے خام خیال میں ضروری ہے کہ لکھنے والا شخصیت میں گُھسا ہوا نظر نہ آئے بلکہ شخصیت ہی رواں دواں دکھائی دے۔ اگر مصنف خود کو لانے پر مجبور ہے تو ایسے جیسے قمیص میں بٹن نہ کہ بٹن میں قمیص اور ان مضامین میں میری "شخصیت" ایک وسیلۂ محض ہے۔"

طفیل صاحب نے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے اسے مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے،

الف: ان کی خاکہ نگاری ایک حادثے کے زیرِ اثر وجود پذیر ہوئی تھی۔ اگر انھیں مارشل لا کے خوف سے مجبوراً گھر میں بیٹھنا نہ پڑتا تو ان کی گھر کے باہر کی تمام مصروفیتیں جاری رہتیں اور یوں انہیں لکھنے لکھانے

کا موقع نہ ملتا۔

ب : مصنف نے چہروں کی نقاب کشائی کے لیے عام بول چال اور بہت ہی سادہ اسلوب اپنایا ہے۔

ج : مصنف نے کوشش کی ہے کہ وہ کسی شخصیت کے اندر نہ گھسیں۔ ہر شخصیت کو رواں دواں رہنے دیا ہے۔

ان باتوں کے علاوہ مصنف نے اِس باب میں اور کچھ نہیں کہا یا کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

جہاں تک اِن کی خاکہ نگاری کا تعلق ایک حادثے سے ہے اس سلسلے میں یہ بات عرض کروں گا کہ ادب کی تاریخ میں اِس نوعیت کے 'حادثات' کی تعداد کافی ہے۔ اس وقت مجھے امریکا کا نامور افسانہ نگار 'او ہنری' یاد آ گیا ہے۔ او ہنری کی رفیقہ حیات علیل ہو کر ہسپتال میں داخل ہو گئی تھی اور او ہنری کو بھی مریضہ کی دیکھ بھال کے لیے ہسپتال میں رہنا پڑا تھا وہاں فرصت ہی فرصت تھی۔ ایک روز وقت گزاری کی خاطر اس نے ایک کہانی لکھنی شروع کر دی۔ کہانی مکمل ہو گئی تو اس نے اپنے مشغلے کو جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور یوں امریکی ادب کو او ہنری کی صورت میں ایک شہرہ آفاق افسانہ نگار مل گیا۔

کیا او ہنری کو ایک حادثے ہی کی پیداوار کہا جا سکتا ہے؟

بظاہر او ہنری کا افسانہ نگار بن جانا ایک حادثاتی واقعہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ او ہنری کا ذہن اس صلاحیت سے یکسر محروم ہوتا جو اس کی افسانہ نگاری کی بنیادی وجہ نہیں، تو کیا اس صورت میں بھی اپنی علیل بیوی کے پہلو میں بیٹھ کر وُہ افسانہ نویسی کا آغاز کر سکتا تھا؛ اس کا جواب لازماً نفی کی صورت میں دیا جائے گا کیوں کہ افسانہ نگاری کے لیے اصل چیز تو ذہنی رجحان اور ذہنی رجحان کے ساتھ تخلیقی صلاحیت کی موجودگی ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں سرے سے نہیں ہیں تو پھر ایک کیا لاکھ حادثے ہوتے رہیں کسی بھی شخص کے باطن سے کوئی تخلیق کار وجود پذیر نہیں ہو سکتا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جس شخص کو بھی آگے چل کر کوئی فن کار یا مصنف بننا ہوتا ہے اس کے اپنے باطن میں اس طرح غیر شعوری طور پر ایک فن کار یا مصنف پرورش پاتا رہتا ہے کہ خود پرورش کرنے والے کو اِس کا علم نہیں ہوتا۔ یہی بات طفیل صاحب کے معاملے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

طفیل صاحب نے اپنی خاکہ نگاری کے سلسلے میں دو تین اصول و ضوابط بھی مقرر کر دئے ہیں اور ان اصول و ضوابط کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

طفیل صاحب کے خاکوں کے ایک مجموعے کا نام ہے "جناب" اور اس کے پانچویں خاکے کا عنوان ہے "مدیر نقوش"۔ گویا یہ مدیر نقوش کا خاکہ ہے جو طفیل صاحب نے سپردِ قلم کیا ہے۔ میں فی الحال اس خاکے کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔ اس خاکے کے ایک حصے میں چند "سنسنی خیز" سطریں ملتی ہیں جو میں اس وقت پیش کرتا ہوں۔ طفیل صاحب فرماتے ہیں:

"انہوں نے اپنے بارے میں جب بھی غور کیا تو ایک طفیل کے اندر دوسرا طفیل بھی چھپا ہوا پایا۔ ایک طفیل تو وُہ ہے جس نے بزرگوں کا احترام کرنا سیکھا ہے جو پڑھے لکھوں کے سامنے طالب علمانہ حیثیت میں بیٹھا ہے"

جس نے چھوٹوں اور بڑوں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہا ہے اور اپنے آپ کو بالکل مبتدی جانا ہے۔
دوسرا طفیل مدیرِ نقوش ہے۔ جب یہ کرسیٔ ادارت پر ہوتے ہیں تو ان کا دماغ عرش پر ہوتا ہے اس وقت انہیں بڑے سے بڑے علامہ کی تخلیق میں بھی نقائص نظر آتے ہیں۔ اپنے ذہن کی اس خرابی کی بنا پر کئی بڑے بڑے لکھنے والوں کی چیزیں ناقابلِ اشاعت قرار دے کر واپس کر چکے ہیں۔

آپ خود ہی سوچیں جس کی افسانہ نگاری میں دھوم ہو، نقاد اسے صفِ اول کا سوانح نگار مانیں،
اس کے افسانے کو اگر مدیرِ نقوش ناقابلِ اشاعت قرار دے دے تو کیا وہ ان سے خوش ہوگا،
وہ تو یہی کہے گا نا کہ جاہل ہے یہ۔"

ایک طفیل کے اندر دوسرا طفیل چھپا ہوا ہے ـــــ یہ میرا نہیں طفیل صاحب کا اپنا ادعا ہے اور اس دعوے کی صداقت اسی خاکے میں واضح ہو جاتی ہے۔ اس خاکے میں طفیل صاحب نے مدیرِ نقوش یا یوں کہئے اور صحیح تر انداز میں کہ ایک ظاہری طفیل نے باطنی طفیل کا کچا چٹھا کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کی دو شخصیتیں ہیں اور دونوں باہمی طور پر متصادم ہیں۔ ایک طفیل وُہ ہے جس نے غربت کی گود میں آنکھ کھولی ہے جو اپنی کند ذہنی کی وجہ سے ماسٹر سے مار کھاتا ہے۔ جو معاشی بدحالی سے پریشان ہو کر چوری کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس کی زندگی کا سب سے دردناک حصہ اس کی پیاری ماں کے انتقال کا حادثہ ہے۔ یہ طفیل ایک عام انسان ہے۔ جس طرح ایک عام آدمی عام حالاتِ زندگی سے متاثر ہوتا ہے اس طرح وہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس کا ردِ عمل ایک عام آدمی کے فطری ردِ عمل سے مختلف نہیں ہوتا۔ مگر دوسرا طفیل ایک بہت بڑے رسالے کا مدیر ہے اور مدیر ہونے کے ناطے سے وہ بڑے سے بڑے افسانہ نگار کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس حالت میں اس کا رویہ پہلے طفیل کے رویے سے قطعی طور پر متبائن ہوتا ہے۔

یہ دو متضاد شخصیتیں ہیں ـــــ یا ایک ہی شخصیت کے دو متضاد پہلو ہیں اور میں سمجھتا ہوں یہ تضاد طفیل صاحب کے ان خاکوں میں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ کارفرما نظر آتا ہے۔

میں ان کی کتابوں کے نام دوبارہ لکھتا ہوں:

صاحب ـــ آپ ـــ جناب ـــ محترم ـــ مکرم ـــ معظم۔

یہ سارے الفاظ اپنے لغوی اور مروجہ معنوں میں احترام، وقعت اور عزت کے الفاظ ہیں۔ جب ہم کسی کو ان میں سے کسی لفظ سے مخاطب کرتے ہیں تو بعض خاص قسم کے لب و لہجہ سے قطع نظر ہمارا منشا یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کی عزت کرتے ہیں، اس کا احترام کرتے ہیں۔ طفیل صاحب ان تمام لوگوں کی عزت کرتے ہیں جن کے خاکے انہوں نے لکھے ہیں مگر یہ رویہ ایک طفیل کا ہے اور وُہ جو دوسرا طفیل ہے وُہ ان میں سے کسی کو بھی معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ایک طفیل ان سب کی عزت کرتا ہے۔ بڑے ادب سے ان کو مخاطب کرتا ہے۔ کہیں 'آپ' کہہ کر، کہیں 'جناب' سے، کہیں مکرم، محترم اور معظم سے مگر دوسرے طفیل کا رویہ ان کے ساتھ کم و بیش وہی ہے جو خود ایک طفیل کا دوسرے طفیل کے ساتھ ہے۔

ایک طفیل نے اپنی ذات کے دُوسرے رُخ یا یُوں کہئے کہ دوسرے طفیل کے دل میں جھانک کر اس کی ایک ایک کمزوری کو الم نشرح کر دیا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص اپنے آپ کو بھی معاف نہ کرے وہ دوسروں کی کمزوریوں سے صرفِ نظر کیوں کرے گا۔ مگر یہاں ایک نکتۂ خاص مدِنظر رہنا چاہیے۔ طفیل صاحب نے خاکہ نگاری کے سلسلے میں جس شخص کے اندر جو بھی خوبی محسوس کی ہے اس کے اظہار میں ذرہ برابر تامل نہیں کیا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان کا تعریف و تحسین کرنے کا اپنا انداز ہے۔ مثلاً یہی دیکھئے مولوی عبدالحق کے خاکے کی ابتدائی سطروں میں کہتے ہیں :

"مولوی صاحب آدمی نہیں، دیوانے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہُوئی کہ زندگی جیسی عزیز چیز اردو کے لیے بتا دی۔ جب سے مولوی صاحب کی اس بُری عادت کا پتا چلا ہے میں ان سے دُور رہنے لگا ہُوں تاکہ یہ مہلک بیماری کہیں مجھ سے بھی چپک نہ جاتے۔" (مولوی عبدالحق — جناب)

مولوی صاحب کی اردو سے والہانہ محبت کا اظہار غالباً اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس خاکے کا اختتامی حصہ تعریف کے باب میں نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :

"مولوی صاحب کی ذات سے مجھے تو محبت اس لیے ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں ان جیسا دیوانہ ایک بھی نہیں۔"

پطرس بخاری کے خاکے کی ابتدا یُوں ہوتی ہے :

"پطرس نے جب بھی لکھا، لفظوں کے تاج محل بنائے۔
پطرس کو جب بھی کسی دوست نے پکارا، لبیک کی آواز آئی۔
پطرس جس راہ سے بھی گزرے اپنے نقش چھوڑ گئے۔ اپنے جھنڈے گاڑ گئے۔
(پطرس بخاری — جناب)

ممتاز مفتی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"پہلی بات تو یہ ہُوئی کہ مفتی صاحب ریاکار نہیں۔ کھری باتیں کرتے ہیں۔ کھری باتیں سنتے ہیں۔"
(ممتاز مفتی — معظم)

صادقین کے بارے میں ان کی رائے سُنیے :

"صادقین، جس کا یہ بندہ بھی نیاز مند ہے مومن نہیں کافر ہے مگر اتفاق یہ کہ زاہدوں سے زیادہ پاکباز ہے ان سے ملنے سے پہلے مجھے اپنی پاکبازی پر جتنے بھی گھمنڈ تھے وہ سب ہیچ نظر آئے کیونکہ ہماری نیک اطواری میں خوفِ خدا کم ہے خوفِ دنیا زیادہ ہے۔ لیکن ان کی پاکبازی میں خوفِ خدا زیادہ، خوفِ دنیا کم ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس پر صادقین کی شخصیت اور فن کا خمیر اُٹھا ہے۔"

(صادقین — معظم)

طفیل صاحب کو جہاں کہیں بھی کسی قسم کا بھی حسن نظر آیا ہے دل کھول کر اس کی داد دی ہے۔ اس معاملے میں بخل سے مطلقاً کام نہیں لیا مگر جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے وہ تعریف کرنے میں بھی عام لب و لہجہ اختیار نہیں کرتے یہاں کوئی ایسا پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں جس کی بنا پر وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس میں 'انجو بگی' سی پیدا ہو جاتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے سلسلے میں یہ سطریں ملتی ہیں :

"یہ بڑی خطرناک حد تک شریف ہیں۔"

(ندیم صاحب — صاحب)

طفیل صاحب کی خاکہ نگاری میں ڈرامائی عنصر کی موجودگی سے بڑا حسن پیدا ہو گیا ہے۔ بات کرتے کرتے وہ اچانک ایک ایسا انداز اختیار کر لیتے ہیں جو ان کے قاری کو مسرت انگیز حیرت یا حیرت انگیز مسرت کے چند لمحے مہیا کر دیتا ہے۔ یہ ڈرامائی صورت دو جہتوں سے اپنی رونمائی کرتی ہے۔ ایک جہت ہے قاری کو انتظار کی کیفیت میں مبتلا کر دینا" گویا پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ"۔

ندیم صاحب کے خاکے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"میں اپنے جسم کے اعتبار سے بھی کمزور ہوں اور دل کے اعتبار سے بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اعتدال پسند ہوں، چنانچہ میں نے دھیمے لہجے میں ندیم صاحب سے کہا۔"

(ندیم صاحب —— صاحب)

طفیل صاحب نے کیا کہا پتا نہیں چلتا۔ قاری منتظر ہو گیا ہے۔

"عملی زندگی میں ریاضی یا اقلیدس ہیں۔ جس طرح ایک عدد دوسرے عدد کو جمع تفریق ہوتے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اسی طرح یہ بھی اپنے ملنے والوں کو "جمع تفریق" ہوئے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔" (نیاز صاحب — آپ)

"آخر میں میرا ایک مشورہ سُن لیجئے۔ زیدی صاحب سے دوستی نہ کیجئے گا، نہ ہی ان کا کلام پڑھیے گا۔"

(زیدی صاحب — مکرم)

دوسری جہت مکالمہ نگاری سے عبارت ہے۔ میں سمجھتا ہوں طفیل صاحب کردار کے مطابق مکالمہ لکھنے میں بڑی زبردست اہلیت کے مالک ہیں۔ ان کے مکالمے پڑھ کر لطف آ جاتا ہے۔ بڑی نیچرل بات چیت۔ اور جو کچھ اپنے کرداروں سے کہلوانا چاہتے ہیں بڑی عمدگی سے کہلوا دیتے ہیں۔

حکیم یوسف حسن کے سکیچ میں مکالمے کا انداز دیکھئے،

"۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک صاحب آئے۔ اصل میں وہ نیرنگِ خیال میں کام کرنا چاہتے تھے مگر سیدھی بات کرنے کی بجائے گھما پھرا کر بات کرنی چاہتے تھے۔ یہ فوراً تاڑ گئے۔ اِدھر اُدھر کی

باتوں کے بعد وُہ صاحب گویا ہوئے :
"حکیم صاحب! پرچے کو اٹھائیے۔"
"بہت اچھا"
"صرف اچھا کہنے سے بات نہ بنے گی جب تک ــ"
"محنت کرتا ہوں، روپیہ خرچ کرتا ہوں اور کیا کروں!"
"نہیں صاحب! کچھ کیجئے۔"
"جو کچھ میرے بس میں ہے وُہ تو کر ہی رہا ہوں۔"
"بہرحال کسی طرح پرچے کو اٹھائیے۔"
"بہت اچھا دو آدمی اور لے آئیے تاکہ اسے اٹھایا جاسکے۔"

(حکیم صاحب ــ مکرم)

خدیجہ مستور کے سلسلے میں ایک جگہ "مکالمہ بازی" یُوں ہوتی ہے ۔
میں بھی کسی ایک بیگم صاحبہ سے ملنے گیا تھا، ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔
انتظار کیا زیارت نہ ہوئی۔ پھر انتظار کیا پھر زیارت نہ ہوئی۔ بالآخر تنگ آکر پُوچھ ہی لیا:
"بھئی کہاں ہیں بیگم صاحبہ ؟"
"جی وُہ سیج رہی ہیں۔"

(خدیجہ مستور ــ معظم)

مکالمے میں صرف دو جملے کہے گئے ہیں مگر طفیل صاحب نے ان دو جملوں کے لیے اپنی طرف سے جو "ماحول" تیار کیا ہے وُہ خود مکالمے کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ طفیل صاحب کو اِس بات میں بڑا لطف ملتا ہے کہ وُہ کوئی مبہم سا فقرہ کہہ کر قاری کو حیرت و استعجاب کے عالم میں چھوڑ کر خود آگے بڑھ جائیں۔ ان کی یہ خُوبی جگر مراد آبادی کے خاکے میں بطور خاص موجُود ہے جگر صاحب نے شراب نوشی ترک کردی تھی۔ اس حادثے یا واقعے کے حوالے سے لکھتے ہیں ۔

"ایک روایت ترکِ شراب کے سلسلے میں یہ بھی ہے کہ شراب ان کے اور ان کی بیوی کے درمیان حایل ہوئی اور لاٹھی مارے سے پانی جُدا نہ ہوسکا پھر اسی شراب کے ترک نے اپنی ہی بیوی سے پھر ان کی شادی کرادی۔" (جگر صاحب ــ صاحب)

یہ فقرہ کہ ترکِ شراب نے اپنی ہی بیوی سے پھر ان کی شادی کرادی، ویسے تو بڑا معنی آفرین فقرہ ہے مگر قاری کو ایک بار تو چونکا ہی دیتا ہے۔

ایک اور چونکا دینے والا موقعہ دیکھئے۔

فراق صاحب رات کے دس بجے ایک دم بغل میں بوتل دبا کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور طفیل صاحب اور بلونت سنگھ سے جمنا کے کنارے چلنے کے لیے کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہاں جا کر بیٹھیں گے اور شعر و شاعری ہو گی۔

بلونت سنگھ طفیل صاحب کو اشارۃً کہتے ہیں کہ اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔ طفیل صاحب ان سے کہتے ہیں کہ آپ خود جانے سے معذرت کر دیں۔ بلونت سنگھ اس پر راضی نہیں ہوتے کہ فراق صاحب ان کے استاد ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیے۔

"یہ گستاخی میرے سپرد کی گئی تو میں نے فراق صاحب سے عرض کیا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس وقت جمنا کے کنارے جانے کے لیے راضی نہیں ہے آپ اکیلے ہی ہو آئیں۔

"اکیلے؟"

"جی ہاں!" (فراق صاحب ——— صاحب)

یہاں سے طفیل صاحب دوسرا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ فراق صاحب کا ردِ عمل کیا ہوا۔ انہوں نے کیا کہا۔ کیا کیا۔ طفیل صاحب اشارے میں بھی اس کا ذکر نہیں کرتے۔ قاری حیرت کے عالم میں ہے کہ اب ہو گا کیا اور طفیل صاحب ہیں کہ دُور کھڑے مُسکرا رہے ہیں۔

نیاز فتحپوری کے خاکے میں طفیل صاحب نے کہا ہے،

"جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے وُہ تو یہ ہے کہ 'ہر نام' کے پردے میں خود نیاز صاحب ہی ہوں گے، اس لیے کہ بی جمالو والا کام یہ خوب جانتے ہیں۔"

نیاز صاحب بی جمالو والا کام یقیناً خوب جانتے تھے مگر خود طفیل صاحب بھی بی جمالو سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ لگائی بجھائی میں ماہر ہیں لیکن ایک بات ہے اس فن میں بھی انہوں نے کچھ ایسا کارنامہ بلکہ کارنامے دکھائے ہیں کہ انہیں بہت بڑا فن کار ماننے کو جی چاہتا ہے۔

اختصار میں جامعیت ـــ یہ طفیل صاحب کے خاکوں کی بنیادی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔ کہیں تو بس ایک پُرمعنی اور بڑا جامع فقرہ کہہ کر آگے چل پڑتے ہیں اور کہیں صرف دو لفظوں پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

اختر اورینوی کے خاکے کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"مذہب اور رومان"

(اختر صاحب ـــ آپ)

جو لوگ اختر اورینوی کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں وہ ایک ہی لمحے میں سمجھ جائیں گے کہ طفیل صاحب نے "دریا بہ حباب اندر" کا منظر پیش کر دیا ہے۔ مجھے بھی یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے ایک لمبی مدت تک اختر صاحب سے مراسلت کی ہے۔ ان سے ملاقات بھی رہی ہے اور جو کچھ ان دو لفظوں "مذہب اور رومان" میں طفیل صاحب نے

اختر صاحب کے بارے میں کہنے کی کوشش کی ہے وہ حقیقتاً ان کی پوری اور مکمل شخصیت ہے۔ یہ اختصار نگاری معجزہ فن کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ اختصار نگاری جسے میں نے معجزۂ فن کہا ہے ہر ہر جگہ موجود ہے۔

عام طور پر ابتدائی سطروں ہی میں طفیل صاحب زیر نظر شخصیت پر بھرپور روشنی ڈال دیتے ہیں اور بعد میں جو کچھ کہتے ہیں اور جو کچھ کہہ چکے ہوتے ہیں اسی کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔

مختار مسعود کے سکیچ کا سب سے پہلا فقرہ ہے،

"یہ مختار بھی ہیں اور مسعود بھی ہیں لہٰذا میں بھی سوائے اس کے اور کیا کہوں اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔"
(مختار مسعود ــــ معظم)

طفیل صاحب نے اپنے مطلب کی بات شخصیت کے نام ہی سے نکال لی ہے۔

منٹو کے بارے میں،

"اس وقت سر میں شدید درد ہے۔ نہ جانے یہ جی کیوں چاہتا ہے کہ درد بڑھے ــ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت منٹو پر لکھنا چاہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں درد کی نوعیت بدل نہ جائے اس لیے کہ منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے عموماً سر کی بجائے دل میں درد محسوس کیا ہے۔"

منٹو کے افسانے دل میں درد پیدا کرتے ہیں، کیا اس فقرے میں منٹو کی پوری تخلیقی شخصیت موجود نہیں ہے!

طفیل صاحب کے طریق عمل میں بڑی اپنائیت ہے۔ وہ کوئی واقعہ بیان نہیں کرتے بلکہ ہر ہر واقعے میں اپنے قاری کو بھی شامل کر لیتے ہیں اس صورت میں قاری دور بیٹھا ہوا محض تماشائی نہیں رہتا بلکہ عمل کی کارفرمائی میں شریک ہوجاتا ہے قاری کو یہ احساس دلانا کہ آپ باہر کے آدمی نہیں ہیں۔ میں جو بھی واقعہ بیان کروں گا آپ خود بھی اس میں شریک ہیں۔ طفیل صاحب کا طریق عمل ہے۔

ان کی کوئی کتاب کھول لیجئے۔ کہیں سے پڑھیے۔

"ایک شام کا ذکر ہے کہ یہ (سیف الدین سیف) اور ابو الاثر حفیظ جالندھری موٹر سے اُترے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں پہنچے وہ سیف صاحب کا گھر تھا۔ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر ایک سے ایک ایکٹرس اور ایک سے ایک ایکٹر چلا آرہا ہے۔ طبیعت ایک دم خوش ہوگئی۔ روزادیوں اور شاعروں کی پریشان صورتیں دیکھ دیکھ کر جو کوفت ہُوا کرتی تھی وہ ان دمکتے چہروں کو دیکھ کر کافور ہوگئی۔" (سیف الدین سیف ــــ جناب)

یوں محسوس ہوتا ہے طفیل صاحب کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر ہم خود بھی سیف صاحب کے یہاں پہنچ گئے ہیں اور اپنے اردگرد ایکٹرسوں اور ایکٹروں کے ہشاش بشاش، متبسم اور چمکتے دمکتے چہرے دیکھ رہے ہیں۔ طفیل صاحب کی ایک اور خوبی یہ ہے

کہ وُہ کسی پر ضرب نہیں لگاتے، مذاق نہیں اڑاتے۔ پھبتی کستے تو ہیں مگر بڑی شائستگی سے۔ اصل میں ان کا "طریقۂ واردات" کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ جس شخصیت کا بھی انتخاب کرتے ہیں بڑی محبت اور بڑے احترام سے اس کے قریب آتے ہیں۔ اس کے ماضی کا کچھ حصہ خود سناتے ہیں اور ساتھ ساتھ مسکراتے بھی جاتے ہیں۔ وُہ دوسرا بھی مسکرانے لگتا ہے۔ کہیں کہیں چٹکی بھی بھر لیتے ہیں۔ مگر جس کے چٹکی بھرتے ہیں وُہ چیخ مار کر اپنا بازو پیچھے نہیں کھینچ لیتا بلکہ فرطِ مسکرا اٹھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں طفیل صاحب بہت بڑے کاریگر آدمی ہیں، ان کی کاریگری اس موقعے پر دیکھئے جہاں وہ کسی شخصیت کو بڑے بلند آہنگ القابات سے مخاطب کرتے ہیں اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ اپنے پاس لے آتے ہیں۔ بڑی محبت اور پیار سے کہتے ہیں: "پلیز! آپ تو اپنے گریبان میں جھانک نہیں سکیں گے، ذرا زحمت ہوگی آپ کو۔ ذرا مجھے جھانک لینے دیں"! اور اس کی اجازت لیے بغیر اس کے گریبان میں جھانکنے لگتے ہیں۔ ان کی نظریں مخاطب کے سینے کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہیں۔ اور وہاں وُہ جو کچھ پاتے ہیں اس کا برملا اظہار کرتے جاتے ہیں۔ مخاطب اگر کہتے "آپ غلط کہہ رہے۔ میں ایسا نہیں ہُوں"۔ تو طفیل صاحب فرمائیں گے "حضور! میں آپ کے دل میں جھانک رہا ہُوں۔ آپ یہ بات بھُول گئے، واہ وا !" اور وہ واہ وا کرتے کرتے ناگفتنی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔ لیکن ان کا حسنِ کارکردگی یہ ہے کہ ان کی 'واہ وا' کے جواب میں مخاطب کے ہونٹوں سے 'آہ آہ' نہیں نکلتی۔

ظہیر کاشمیری کو گفتار کا امام بتایا ہے اور آخر میں۔

"مشاعروں میں لوگ ان کی صورت دیکھ کر ہنس دیں۔ مگر ان کے کلام سے مرعوب ہی ہو کر جاتے ہیں۔
خوب ٹھکے ہُوئے پیارے پیارے سے الفاظ لاتے ہیں۔ ایک بار ایسا ہُوا کہ ایک مشاعرے ہیں
ہُوٹ ہو گئے۔ سخت پریشان ہُوتے، کہنے لگے "دوستو! میں آج تک ہُوٹ نہیں ہوا تھا اس لیے
کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ لوگ اپنی ہُوٹنگ واپس لے لیں!"

"بیٹھ جاؤ۔"

"ہائیں۔"

(ظہیر کاشمیری ـــ جناب)

دیکھ لیجیے کیسی گت بنائی ہے اپنے ممدوح کی۔ اور ملاحظہ فرمائیے:

"فراق صاحب جیسے غزل میں زیادہ سے زیادہ شعر کہنا چاہتے ہیں اسی طرح روپوں کا لالچ بھی کرتے ہیں۔"

(فراق صاحب ـــ صاحب)

شوکت تھانوی کے متعلق:

"آپ فسٹ کلاس قسم کے بزدل ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں۔ اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رُلانے پر قادر ہوتے اور پھر آپ شوکت تھانوی نہ ہوتے، علامہ راشد الخیری ہوتے۔"

(شوکت تھانوی صاحب ـــ صاحب)

طفیل صاحب دوسرے طفیل کے بارے میں

"طفیل صاحب سوائے اپنی ذات کے ہر بات میں نفاست کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور خوبصورت چیزوں پر جان بھی دیتے ہیں۔ یقین کیجئے انہیں اس حد تک "خوبصورتی خولیا" ہے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن یہ بیٹھے ایک نہایت ہی بے تکلف دوست سے کہہ رہے تھے، دیکھو نا یار! وہ سامنے جو کوا بیٹھا ہے، کتنا خوب صورت ہے!"

اس سکیچ میں طفیل صاحب نے مدیر نقوش یا دوسرے طفیل کے بارے میں لکھا ہے۔ اس اعتبار سے سب سکیچوں سے آگے نکل گیا ہے کہ طفیل نے طفیل کو دھنک کر رکھ دیا ہے۔ اگر پنجابی میں یہ مفہوم ادا کرنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ "طفیل نے طفیل نوں پنج کے رکھ دتا اے۔"

یہ سکیچ، جو نصف درجن کتابوں کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں طفیل صاحب کی شگفتگیٔ مزاج، مزاح آفریں طنز نگاری اور "انکشافِ شخصیت" کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہیں۔ طفیل صاحب نے خاکہ نگاری کا ایک بہت خوب صورت تجربہ کیا ہے۔ ان خاکوں میں ایک ایسے اسلوب کو نبھایا ہے جو ہلکا ہونے کے باوجود معنویت کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ ان سکیچوں میں طفیل صاحب کی گل افشانیِ گفتار تو ہے ہی لہجے کا تیکھا پن بھی ہے، طنز کی نشتریت بھی ہے اور دبے دبے قہقہوں کی ڈھکی چھپی کیفیت بھی۔

ایک بہت دلچسپ ناول کا نقطۂ کمال یہ ہے کہ وہ راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے اور یہ سکیچ بھی اپنے پڑھنے والوں کے لیے کم و بیش یہی سلوک روا رکھتے ہیں۔ مگر ناول پڑھ کر ہیرو یا ہیروئن کے المیے پر آپ کا دل خود ایک المناک کیفیت میں ڈوب جاتا ہے۔ یہاں یہ صورت ہرگز نہیں۔ آپ سکیچ پڑھ رہے ہیں اور آپ محسوس کر رہے ہیں جیسے ایک محفل میں آپ ان لوگوں کے درمیان بیٹھے ہیں جن کی باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ جن کے چہروں پر تبسم کی لہریں رواں دواں ہیں۔ اس محفل میں چھیڑ خانی ہو رہی ہے۔ ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ معرکے کے لطیفے ہو رہے ہیں اور آپ ایک ایک لمحے سے خوشی کا رس نچوڑ رہے ہیں اور یہ رس آپ کے رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے۔

جب آپ سارے سکیچ پڑھ لیتے ہیں تو اس بات پر مغموم نہیں ہوتے کہ اب کچھ پڑھنے کے لیے باقی نہیں رہا۔ کیونکہ طفیل صاحب نے اپنی رنگا رنگ محفل میں جن شخصیتوں کو جمع کر لیا تھا وہ ساری کی ساری شخصیتیں آپ کے ساتھ ہیں، آپ کے ساتھ ساتھ چل پھر رہی ہیں۔ آپ جب چاہیں ان سے باتیں کر سکتے ہیں — ان سے ہنس بول سکتے ہیں۔ یہ ساری شخصیتیں آپ سے بے تکلف ہو چکی ہیں، آپ کی دوست بن چکی ہیں۔ کیا یہ طفیل صاحب کے سکیچوں کا کوئی معمولی کمال ہے؟

ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ذات کئی جہتوں سے ہمارے لیے قابلِ احترام بھی ہے اور ہم انھیں اپنا گراں بہا سرمایہ بھی تصور کرتے ہیں۔ پاکستان کے قومی ترانے کے خالق کی حیثیت سے وہ ہر پاکستانی کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکے ہیں۔ شاہنامہ اسلام لکھ کر انہوں نے عزت و عظمت کا بڑا اونچا مقام حاصل کر لیا ہے۔ ادب کی دنیا میں

حفیظ صاحب نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ مدتوں یاد رہیں گے اور ان کی شاعری تاریخ ادب اردو میں ایک تابناک باب کے طور پر جھلملاتی رہے گی۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے اور مسلّمہ حقیقت ہے کہ قومی ترانے کے خالق، شاہنامہ اسلام کے مصنف اور اپنی شاعری میں ایک انوکھی دنیا آباد کرنے والے حفیظ جالندھری میں وہ کچھ بھی ہے جسے عام طور پر "تضاد" کا نام دیا جاتا ہے۔ حفیظ صاحب سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک متضاد شخصیت کے رنگ میں سامنے آتے ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ایسی شخصیت پر لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ اگر لکھنے والا ان کی خوبیوں کو آغاز تا انجام سراہتا چلا جائے تو اس سے حفیظ صاحب کے بڑے اہم پہلو نظر انداز ہو جائیں گے۔ یہ حفیظ وہ حفیظ ہرگز نہیں ہوں گے جو در اصل وہ ہیں۔ اور اس کے برعکس اگر ان کی کمزوریوں ہی سے رابطہ استوار رکھنے کی سعی کی جائے تو یہ بھی اسی قسم کا رویہ ہو گا جس کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے۔

حفیظ صاحب بڑی پیچیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے وجود میں کئی پرتیں بھی ہوتی تھیں۔ یہ پرتیں اٹھائے جائیں حفیظ صاحب بھی مختلف ہوتے جائیں گے۔ ہر پرت ایک نئے حفیظ کی جلوہ نمائی کرے گی۔

ایسی تضاد انگیز اور تضاد آفریں ذات کے بارے میں صرف طفیل صاحب ہی لکھ سکتے تھے اور وہ اس وجہ سے کہ ایک تو انہوں نے دیرینہ تعلقات کی بنا پر حفیظ صاحب کو ہر رنگ اور ہر انداز میں دیکھا تھا اور دوسری وجہ یہ کہ طفیل طبعاً حقیقت پسند ہیں اور ذہنًا بے باک، نڈر اور جرأت آزما۔ انہوں نے حفیظ صاحب کو جس جس طرح سمجھا ہے، جانا ہے، پایا ہے، اس طرح انہیں پیش کر دیا ہے۔ حفیظ صاحب کی یہ تصویر جس کے مصور طفیل صاحب ہیں، اپنے کم و بیش تمام اجزا کے ساتھ اپنے مخصوص خد و خال کے ساتھ مکمل محسوس ہوتی ہے۔

طفیل صاحب کے گہرے مشاہدے اور گہرے مشاہدے سے زیادہ ان کی قوتِ حافظہ کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ایک ایک واقعے کو اس کی جزئیات کے ساتھ اپنے ذہن میں محفوظ رکھا ہے اور حسبِ موقعہ و محل پوری تفصیل سے اسے سپردِ قلم کر دیا ہے۔ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ خاکہ نگار نے اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی کی ہے ——— یا زیبِ داستاں کے لیے کچھ بڑھا دیا ہے۔

"مخدومی" میں واقعے کے بعد واقعہ چلا آ رہا ہے اور ہر واقعہ دوسرے واقعے سے مربوط ہو گیا ہے۔ لگتا ہے طفیل صاحب نے حفیظ صاحب کی پوری روداد حیات سنا دی ہے بڑے پُرلطف پیرائے میں۔ جہاں جہاں انہوں نے حفیظ صاحب کی ذات میں خوبیاں پائی ہیں ان کے ذکر سے احتراز نہیں کیا اور جس جس مقام پر ایسی باتیں دیکھی ہیں جو حفیظ صاحب کے متضاد پہلوؤں کی نشان دہی کرتی ہیں انہیں بھی بلا کم و کاست احاطۂ تحریر میں لے آئے ہیں۔ آخر الذکر رخ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"حفیظ صاحب اچھے خاصے آدم بیزار ہیں۔"

لوگوں کی رائے تو یہ ہے کہ حفیظ صاحب بہت چڑچڑے ہیں۔ بات بات پر خفا ہوتے ہیں۔ اپنے علاوہ

کسی کو گھانس نہیں ڈالتے۔"

"میں نے سنا ہے کہ آپ ایک دفعہ حکیم فقیر محمد چشتی کے پاس تشریف لے گئے تھے ان سے آپ نے اپنی علالت کا حال بیان کیا۔ انہوں نے نسخہ تجویز کر دیا۔ آپ نے پوچھا کوئی پرہیز؟"

انہوں نے کہا: "کوئی دماغی کام نہ کریں۔"

آپ نے فرمایا: "آج کل شاہنامۂ اسلام لکھ رہا ہوں۔"

اس پر حکیم صاحب نے فرمایا "وہ لکھتے رہیں۔"

"اوروں کی طرح حفیظ صاحب بھی اپنی بڑائی کے اظہار میں، کبھی بھی اور کسی سے بھی پیچھے نہیں رہتے۔"

"جب پہلے پہل شاہنامۂ اسلام لے کر حفیظ صاحب حیدر آباد دکن گئے تو ان کی خوب مخالفت ہوئی۔ امجد حیدر آبادی ایسا شریف النفس انسان بھی کہہ رہا تھا

اوبار بصورت وبیر آیا ہے
اک شاعر تاریک ضمیر آیا ہے
شاہنامۂ اسلام کا کشکول لیے
پنجاب کا مشہور فقیر آیا ہے"

ایسی مثالیں 'مخدومی' میں کئی مقامات پر ملیں گی۔

طفیل صاحب نے، جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے حفیظ صاحب کو جیسا دیکھا ہے، پایا ہے، سمجھا ہے ویسا ہی سامنے لے آئے ہیں۔ اور یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ طفیل صاحب نے حفیظ صاحب کے متعلق جو کچھ بھی کہا ہے اس کے ساتھ واقعاتی دلیل بھی دے دی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں حفیظ صاحب ایک عجیب وہمی آدمی ہیں اور اس ضمن میں واقعہ یہ لکھا ہے:

"پچھلے دنوں انہوں نے ایک ایسے نیک اور صالح نوجوان کو اپنے پاس بُلانا شروع کیا جو ان کی سوانح لکھنے میں مدد دیتا رہا۔ یہ بولتے رہے وہ لکھتا رہا۔ یہ سلسلہ چند روز ہی چلا ہو گا کہ ایک دن انہوں نے اس نوجوان کی موجودگی میں بیوی کو آواز دی:

"مجھے دوائی دے جاؤ۔"

جب ایک دو آوازیں اس نیک بخت نے نہ سُنیں تو نوجوان نے کہا:

"قبلہ! میں لا دوں۔"

"کیا تجھے معلوم ہے وہ کہاں رکھی ہے؟"

"جی ہاں!"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں گھومتا رہتا ہے۔"
وہ چپ رہا، کیا جواب دیتا، بجز شرافت و نجابت، اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا مگر حنیفہ نے اس سے کہہ دیا،
"آیندہ اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔" اور وہ سوانحی سلسلہ ختم ہوگیا۔

اس کتاب میں، شروع سے آخر تک طفیل صاحب نے اس انداز کو بڑی خوش اسلوبی سے برقرار رکھا ہے۔ کوئی واقعہ بیان کرنا ہوتا ہے تو بغیر کسی تکلف کے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عام طور پر آغاز یوں کرتے ہیں۔
"ایک روز۔"
"ایک بار یوں ہوا۔"
"ایک دن خبر آئی۔"
"قصہ یہ تھا۔"

اس تکنیک سے وہ اپنے قاری کی توجہ فی الفور اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں۔
حنیف صاحب کے بارے میں آغاز تحریر کبھی یوں کیا ہے:
"یہ وہی صاحب ہیں جن کے احترام میں پوری قوم کو کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ یعنی ان کا ترانہ اگر کھڑے ہو کر نہ سنیں تو غیر مہذب کہلائیں۔ مارشل لا لگا ہوا ہو تو سزا ایک کا ٹیں، ایک دن فرمانے لگے۔"
اور قصہ شروع ہو جاتا ہے۔

طفیل صاحب نے آدمی کو فرشتہ نہیں، آدمی ہی کی صورت میں پیش کرنے کا پختہ ارادہ کر کے 'مخدومی' لکھنا شروع کی تھی۔ خود ہی فرماتے ہیں:
"اگر یہ کتاب لکھ کر سلیم الطبع حضرات سے شاباش کے سرٹیفکیٹ لیتا یا حنیف صاحب سے داد وصول کرتا تو آیندہ کے زیرک لوگ مجھے نہ بخشتے۔ کتنے آدمی کو فرشتہ بنا دیا۔ اب صورت یہ ہے کہ میں کسی حد تک مطمئن ہوں۔ ہم دونوں ہی آدمی ثابت ہوں گے۔"

اور کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کی سچی سچی اور اصلی تحریری تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے۔

حنیف صاحب اس کتاب کو نہیں دیکھ سکے۔ اس کا افسوس ہے۔
طفیل صاحب نے یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں لکھی تھی جو ۲۰۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ اس میں اضافہ کرنے کے آرزومند تھے مگر مہلت نہ ملی۔ حنیف صاحب کا ارشاد تھا کہ طفیل صاحب جو کچھ تحریر کریں گے وہ اسے پڑھیں گے۔ نہ صرف پڑھیں گے بلکہ ہر مطبوعہ باب پر اظہار خیال بھی کریں گے۔ مگر یہ ممکن نہ ہوا۔

حنیظ صاحب نے طفیل صاحب کو جو پیغام دیا تھا اس میں ان سے کہا تھا کہ کتاب چھاپ دے۔ اگر میرے مرنے کا انتظار رہے تو میں نہیں مروں گا، لیکن زندگی اور موت پر کس کو اختیار رہتا ہے!

حنیظ صاحب دُنیا سے رخصت ہو گئے کتاب دیکھے بغیر۔

مگر طفیل صاحب اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ حنیظ صاحب کا فقرہ سچا ہے،

"اگر میرے مرنے کا انتظار رہے تو میں نہیں مروں گا۔"

"کیونکہ حنیظ زندہ شاعر ہے۔"

"مجی" طفیل صاحب کے خاکوں کا ساتواں مجموعہ ہے جو جنوری ۱۹۸۶ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اس مجموعے میں آٹھ خاکے ہیں اور جن اہلِ قلم پر یہ خاکے تحریر کیے گئے ہیں ان کے ترتیبی لحاظ سے نام یہ ہیں:

چودھری نذیر احمد، میرزا ادیب، سید وقار عظیم، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، اقبال صلاح الدین، قتیل شفائی، محمد بشیر موجد، عطاء الحق قاسمی۔

اس فہرست سے واضح ہوتا ہے کہ طفیل صاحب نے پرانی نسل کے افراد کو بھی درخورِ اعتنا بنایا ہے اور نئی نسل کے نمائندوں کو بھی۔ اس فہرست میں تنوع بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ چودھری نذیر احمد ناشر تھے، سید وقار عظیم نقاد، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی محقق، اقبال صلاح الدین ایک سکالر، قتیل شفائی شاعر، عطاء الحق کالم نگار اور مزاح نگار بھی ہیں۔

اس مجموعے کو یہ امتیازی خصوصیت بھی حاصل ہے کہ اس کی ابتدا میں طفیل صاحب نے اس نظریے کا اظہار کر دیا ہے جو خاکہ نگاری سے متعلق ان کے ذہن میں موجود تھا اور وہ نظریہ یہ ہے:

"میرے نزدیک

خاکہ نگاری خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ یعنی جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہو

اس کے عین مین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے۔"

یہ الفاظ اپنی وضاحت آپ کر رہے ہیں۔ طفیل صاحب کے نظریے کے مطابق خاکہ نگاری کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کو بھی خاکے کی دنیا میں لایا جائے اُسے شخصی حقائق کو ہمراہ پیشِ نظر رکھا جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ خاکے کا قاری اس شخص کی مکمل تصویر ہی اپنے سامنے نہ لاسکے جس پر خاکہ لکھا گیا ہے۔ خاکے میں زیرِ نظر شخص کی پوری تصویر ذہن میں اُبھرنی چاہیے۔ ورنہ خاکے کا جو اساسی مقصد ہے وہ پورا ہی نہیں ہو سکتا۔

اپنے خاکوں میں طفیل صاحب نے شوخ نگاری سے ضرور کام لیا ہے مگر اس انداز سے کہ کسی کی شخصیت غیر مکمل نہ رہ جائے۔

میں نے بہ امعانِ نظر ان خاکوں کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے کچھ یوں احساس ہوا ہے کہ طفیل صاحب کی شوخ نگاری یہاں کچھ دبی دبی ہے۔ یُوں بھی ایسا ہونا ایک فطری امر ہے۔ طفیل صاحب یہ خاکے عمر کے اس حصّے میں لکھے ہیں جب

انسان پرسنجیدگی کا ماحول کچھ گہرا ہو جاتا ہے۔
میں نے طفیل صاحب کے نظریے کا ذکر کیا ہے۔ چودھری نذیر احمد کا خاکہ لکھتے وقت بھی انہوں نے اپنے اس نظریے کی مزید وضاحت کر دی ہے۔

"مضمون لکھنے کا ایک انداز تو یہ ہے کہ وہ اتنا سچا ہو کہ پڑھنے والا اسے جھوٹ ہی جھوٹ جانے۔ ایک انداز وہ ہے کہ وہ اتنا جھوٹا ہو کہ پڑھنے والا اسے سچ ہی سچ سمجھے۔ میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ میں نہ ایسا سچ بول سکتا ہوں اور نہ ایسا جھوٹ۔"

ایک اور خاکے کی ابتدائی سطریں ملاحظہ فرمائیے:

"پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً گلاب کا پھول، اس ایک پھول کے سو رنگ ہیں۔ یہی حال شخصیتوں کا ہے۔ انسان ایک ہے مگر اس کے رُوپ سو۔ کہاں کہاں انسان ایک دوسرے سے مختلف ہے بس اسی نازک سے فرق کے اظہار کے لیے میں کبھی کبھار قلم اٹھا لیتا ہوں۔"

یہ خاکہ میرزا ادیب پر ہے اور اس خاکے کی یہ سطریں اس اعتبار سے بڑی اہم ہیں کہ طفیل صاحب اپنے ہر خاکے سے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ایک شخص کہاں کہاں دُوسرے سے مختلف ہے۔ یعنی طفیل صاحب اس فرق کو دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جو ایک خاص شخص اور دوسرے اشخاص کے درمیان محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ان خاکوں کا ایک بہت دلچسپ پہلو یہ ہے کہ خاکہ نگار نے قریب قریب ہر خاکے کی ابتدائی سطروں میں ایک ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ یہ سطریں پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ یہ ایک قسم کا ڈرامائی انداز ہے۔ میں دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔

اقبال صلاح الدین ——— ایک سکالر ہیں۔ فارسی کے نامور محقق، پنجابی کے نقاد اور مورخ۔ ان کے خاکے کی ابتدا یُوں کرتے ہیں:

"یہ بہت لئے دئے رہتے ہیں۔ کُھل کر سامنے نہیں آتے۔ انہیں کا حقہ، کسی نے نہ جانا۔ نہ بہن بھائیوں نے، نہ ماں باپ نے نہ یار دوستوں نے۔ انہوں نے اپنے آپ کو خدا سے بھی چھپایا ہوگا مگر وُہ ذات تو سب کا حال جانتی ہے۔ مگر ان کی اپنی کوشش تو یہی رہی ہوگی کہ اللہ میاں کو بھی چکمہ دو۔"

ابتدا ہی میں ایک خاص دلچسپ شخصیت سے ہمارا 'خاص تعارف' ہو جاتا ہے۔
مُوجد آرٹسٹ ہیں ان کے خاکے کی ابتدا کا آغاز یُوں ہوتا ہے:

"آئیے آج رنگوں کی بات کریں، نیلے، پیلے اور سُرخ رنگ کی۔ بے شک بنیادی رنگ تین ہیں مگر ان بنیادی رنگوں سے جو سینکڑوں رنگ بنتے ہیں وہ بھی تو رنگ ہی ہوتے ہیں؟"

آخری سطر انتہائی اہم ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی کسی کتاب کی تقریب رونمائی منعقد ہے۔ طفیل صاحب قاسمی کا خاکہ ان سطروں سے شروع کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی قطیفن بھی ہے اور شریر بھی۔ اس لیے آدمی بھی ہے اور انسان بھی۔ یہ امر اس کی فطانت کی دلیل ہو نہ ہو اس کی شرارت کی دلیل ضرور ہے کہ اس نے اتنا بڑا مجمع اکٹھا کر لیا۔ اتنی خلقت یا تو میں نے میڈم نور جہاں کے فنکشن پر دیکھی یا اس تقریب پر۔"

میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے کہ ان خاکوں میں طفیل صاحب کا قلم تھم تھم کر چلتا ہے۔ یہاں زیادہ سوچ ہے۔ زیادہ تجزیاتی مطالعہ ہے۔ زیادہ سنجیدگی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا وجہ بیان کر دی گئی ہے۔

ان خاکوں میں ایک خاص خوبی یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان میں طفیل صاحب کا طریق واردات سنبھلا سنبھلا اور متوازن ہے۔ بے تکلفی لازماً ہے مگر سنجیدگی کا اپنا رنگ بھی ہے۔ سنجیدگی اور متانت ہے لیکن مزاح کا وہ جوہر جو طفیل کی تحریروں میں جھلکتا رہتا ہے یہاں بھی اپنی جھلک دکھا رہا ہے۔

طفیل صاحب کے مکالموں میں کمال کی شوخی ہے۔ قتیل شفائی کا معاملہ ہے۔ سوال و جواب ان کی بیگم سے ہے۔

میں نے ایک دن بھابی سے پوچھا "آپ کیوں قتیل صاحب سے لڑتی ہیں؟"

"میں کہاں لڑتی ہوں، لڑتے تو وہ ہیں۔"

"اچھا۔"

"مگر یہ آپ کو بتایا کس نے؟"

"بتایا کس نے ہے، یہ سوال وہ ہے کہ ہر میاں بیوی کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوال بھی یونیورسل ہے اور جواب بھی۔"

نقوش کے نقّاش

شوکت تھانوی

کہتے ہیں کہ اس دنیا کے جب سب جاندار مر چکیں گے اور ملک الموت سب کو مارنے کے بعد اکیلے رہ جائیں گے تو ان کو بھی موت آئے گی اور ان کو بھی مرنا پڑے گا۔ خیر یہ تو جب کبھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ مگر اسی قسم کا ایک واقعہ حال ہی میں پیش آیا ہے کہ ادارہ فروغِ اردو کے مالک، رسالہ نقوش کے ایڈیٹر اور اپنے وقت کے لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے ناشر محمد طفیل صاحب کی بھی ایک کتاب چھپ کر بازار میں آئی ہے اور دوسرے مصنفوں کو چھاپنے والے یہ حضرت خود بھی چھپ کر رہ گئے ہیں۔ کسی گمنام شاعر نے اسی قسم کے مواقع کے لیے کتنا نامور مصرع کہا ہے کہ ؎

پھانس کر دو چار بلبل پھنس گیا صیاد بھی

طفیل صاحب کی اس تصنیف کا نام ہے "صاحب"۔ اور اس میں ان کے وہ سات مضامین ہیں جو سات صاحبان کی شخصیت پر لکھے گئے ہیں اور ان ساتوں میں جو ایک شخصیت دوسروں کی نقاب کشائی کی کوشش میں خود برافگندہ نقاب ہوتی ہے وہ خود طفیل صاحب کی شخصیت ہے۔ ان سات مضامین میں سے چھ نقوش کے پچھلے شماروں میں نکل چکے ہیں صرف ایک ایسا مضمون ہے جو اسی مجموعے میں چھپا ہے۔ یہ ساتوں مضامین طفیل صاحب کے اُس ذاتی مطالعے اور مشاہدے کے آئینہ دار ہیں جو وہ ان ساتوں ملنے والوں کے متعلق کر سکے ہیں اور نہایت سادگی اور صفائی کے ساتھ اپنے ان ساتوں کرمفرماؤں کے سامنے طفیل صاحب کا آئینہ پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ خود بھی اپنے کو طفیل صاحب کی نظر سے دیکھ لیں۔ اس ہفت پیکر کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں ،

(۱) سعادت حسن منٹو	(۲) احمد ندیم قاسمی
(۳) شوکت تھانوی	(۴) جگر مراد آبادی
(۵) فراق گورکھپوری	(۶) عابد علی عابد
(۷) احسان دانش	

باقی چھ حضرات کے متعلق تو میں وثوق سے کچھ عرض نہ کر سکوں گا مگر جہاں تک اُس مضمون کا تعلق ہے جو خود میرے متعلق لکھا گیا ہے مجھ کو ایمان داری کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں نے اپنی اتنی جامع تصویر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ تصویر وہ نہیں ہے جو ہونے والے سسرال بھیجنے کے لیے لوگ خاص طور پر کھنچوانے کے بعد بنواتے بھی ہیں کہ گال اگر پچکے ہوئے ہیں تو ذرا بھر دیے جائیں آنکھیں اگر دُھندھی ہیں تو ذرا روشن کر دی جائیں۔ رنگ اگر کالا ہے تو ذرا گورا کر دیا جائے۔ بلکہ یہ

تصویر اصل خدوخال کے ساتھ جُوں کی تُوں پیش کر دی گئی ہے۔

خود اپنے متعلق اس قسم کا منہ پھٹ سچ اس مضمون سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک آدھ مقام پر اگر مجھے شبہ بھی ہُوا تو مجھ کو مجھ سے زیادہ سمجھنے والوں نے یہ کہہ کر اس شبہ کو دُور کر دیا کہ آپ مانیں یا نہ مانیں بات سچی لکھی ہے ایک مقام پر مجھے شدید اختلاف تھا جہاں طفیل صاحب نے لکھا ہے:

"میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنّم سمیت سُن چکا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہُوٹ ہُوئے۔"

میں یہ کہہ رہا تھا کہ صرف دو مشاعروں میں ہُوٹ ہُوا ہُوں۔ ایک میں اس لیے کہ سخن فہم متعصب تھے اور ہُوٹنگ کرنے والے فیاض، اور دُوسرے میں اس لیے کہ تحسین ناشناس و سکوتِ سخن تشناس دونوں شباب پر تھے مگر یہ تو ایک ہی بات ہُوئی۔ بہر حال میں صرف دو مرتبہ ہُوٹ ہُوا ہوں۔ مگر بیگم صاحبہ نے طفیل صاحب کی گواہی دی کہ خود آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ میں بڑے شوق سے مشاعروں میں جایا کرتی تھی مگر محض آپ کی غزل سرائی نے مجھ سے مشاعرے ترک کرائے ہیں۔ کاش آپ اپنی آواز خویش پروری سے باہر ہو کر کبھی سُن سکتے۔ پھر مجھ کو اس مضمون کے اس مقام پر غصہ آتے آتے رہا۔ جہاں طفیل صاحب نے مجھے خبطی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے:

"ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے ناراض ہو جاتے ہیں۔ نہ ناراض ہونے کا پلاٹ بناتے ہیں نہ کوئی اسکیم۔ نہ ہی دوسرے کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وُہ بے چارہ مدافعت میں کچھ کہہ سکے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا:

"یہ غلط ہے۔ متہم کرتے ہیں۔ تہمت لگاتے ہیں۔ اتہام ہے سراسر۔"

وہ بولیں، "حرف بہ حرف صحیح ہے۔"

میں نے کہا:

"صحیح کیسے ہے یہ تو پاگل پن ہُوا کہ بے وجہ کوئی ناراض ہو جائے میں بغیر کسی وجہ کے کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوا۔"

وُہ بولیں:

"کبھی شاید نہ ہوئے ہوں مگر اکثر ہو جاتے ہیں۔"

میں نے واقعی مشتعل ہو کر کہا:

"مثلاً۔ مثلاً کب ناراض ہُوا ہوں میں۔"

وہ بولیں:

"مثلاً اسی وقت ہو رہے ہیں۔"

اور مجھ کو واقعی اندازہ ہُوا کہ میں خود اس دعوے کی دلیل پیش کر رہا ہُوں۔ میں نے جلدی سے یہ صفحہ اُلٹ دیا اور

ایک مقام پر بے ساختہ داد دی :

"ذرا بادل گرجے، بجلی چمکے پھر دیکھیے آپ کا مزا۔ نادری حکم کے ماتحت تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرادیں گے۔ اس کے بعد خود اُٹھیں گے، چٹخنیاں دیکھیں گے کہ کہیں کوئی چٹخنی کھلی تو نہیں رہ گئی۔ پہلے خود اُٹھنے کے بجائے دوسروں کو اس لیے حکم دیں گے کہ مبادا بجلی اندر گھس کر تبادلۂ خیالات کر ڈالے۔"

میں اس "تبادلۂ خیالات" کر ڈالنے کی داد ہی دے رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نے یہ فقرے پڑھ کر سُنا دیے :

"بات کہنے والی تو نہیں ہے لیکن آپ سُن لیں کہ یہ خدا کے بنائے ہوئے بتوں کی بڑی پُوجا کرتے ہیں۔ کامیابیوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں۔"

اور یہ سُنا کر بولیں :

"دیکھ لیا آپ نے۔ میں نہ کہتی تھی کہ یہ بات ہے ضرور۔"

میں نے یہ سطریں خود پڑھ کر کہا :

"مگر یہ حضرت خود اپنے اس شُبہ کی تردید کر گئے ہیں اسی کے آگے مابدولت کا ایک اقتباس دینے کے بعد یہ بھی تو لکھا ہے :

"یہ جھُوٹے تقدس کے قائل نہیں، نہ اپنی لغزشوں پر نازاں ہیں بلکہ وُہ سادہ سے الفاظ میں کہتے ہیں کہ بھئی! میں آپ جیسا ایک انسان ہُوں آپ میں اور مجھ میں فرق اتنا ہے کہ آپ جھُوٹے تقدس کی آڑ میں وُہ کچھ نہیں کہتے جو آپ ہیں میں تو ایک کھُلی ہوئی کتاب ہُوں جہاں سے چاہو پڑھ لو۔"

اور پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ اپنی اس قسم کی لغزشوں کو جب میں ڈنکے کی چوٹ بیان کر کے دنیا کے سامنے پیش کر چکا ہُوں تو اب ان کو یا کسی کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ کامیابیوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں۔ شوکت صاحب تو جو کچھ جانتے اُس سے سب ہی کو آگاہ کر چکے ہیں۔ اس خطرناک اعتراف کے بعد یہ شک اور یہ شُبہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگیں :

"بس رہنے بھی دیجئے ایک مقدمے میں سرکاری گواہ بن جانے کے معنی یہ کہاں ہو گئے کہ چوری چوری سے بھی گیا اور ہیرا پھیری سے بھی۔ یہ چالاکی بھی تو ہو سکتی ہے کہ اس طرح اپنا بھرم قایم کر کے پھر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے کہ جو چاہیں کریں۔"

میں نے کہا کہ "خیر آپ کا اور میرا رشتہ تو ہے ہی ایسا کہ اس میں اگر بدگمانی نہ ہو محبّت ہی مفلوج ہو کر رہ جائے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل صاحب کس رشتے سے اس قدر بدگمان ہُوئے۔"

خیر چھوڑیئے اس ذکر کو میں تو اپنے ہی مضمون میں اُلجھ کر رہ گیا اس کتاب میں اور مضامین بھی تو ہیں اور جس طرح اور مضامین کو پڑھ کر میرا یہ حال ہُوا ہے کہ ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی طرح میرے متعلق جو مضمون ہے اس کو پڑھ کر دُوسروں نے بھی یہی کہا ہو گا اور یہی طفیل صاحب کی سیرت نگاری کا کمال ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون جو منٹو کے متعلق ہے اس کے دو حصّے ہیں، پہلے حصّے میں منٹو اپنی زندگی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ چلتا پھرتا سامنے آجاتا ہے اور اس کو مُردہ سمجھ کر کوسنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی منٹو کی بہکی بہکی حرکتیں، وہی اس کی سرشاریاں اور وہی اس کے لغزیدہ قدم۔ وہی اس کا اندازِ بیان کہ مضمون پڑھتے جائیے اور منٹو کو سامنے بٹھا کر باتیں کرتے جائیے مگر دوسرے حصّے میں منٹو کی طرف سے جو خط طفیل صاحب نے لکھا ہے وہ منٹو کے اسلوبِ تحریر کا ایسا جامع پر بہ ہے کہ منٹو کی موت بھی ذی رُوح نظر آتی ہے۔ اگر یہ خط منٹو کے نام سے نہ بھی ہوتا تو بجائے خود ایک اہم ادبی دستاویز کی حیثیت اس کو حاصل ہوتی۔ طفیل صاحب نے اگر اپنی اس صلاحیت کو اب تک چھپایا ہے تو خیانت سے کام لیا ہے اور اب اگر اس میں بخل برتا تو مزید خیانت ہو گی۔

دُوسرا مضمون جو احمد ندیم قاسمی کے متعلق ہے ندیم صاحب کو رفتہ رفتہ میرے قریب لا رہا تھا کہ یہ حصّہ آگیا،

"اگر یہ چارپائی پر بیٹھے ہوں تکیے سے ٹیک بھی لگا رکھی ہو اور یہ ایک دم اُکڑوں بیٹھ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اس وقت یہ سگریٹ پر سگریٹ پئیں گے۔ خوبصورت سا کاغذ لیں گے، پنسل کو باریک بنائیں گے اور مہین مہین خط میں افسانہ شروع کر دیں گے۔ آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے۔"

میں نے کہا،

"حیرت ہے ندیم صاحب کی یہ ادائیں مجھ سے کس قدر ملتی جلتی ہیں۔"

بیگم نے کہا، "مگر آپ اُکڑوں نہیں بیٹھتے۔"

میں نے کہا، "خوب صورت سا کاغذ تو لیتا ہوں۔"

وہ بولیں، "جی ہاں! مگر آپ چارپائی پر کب بیٹھتے ہیں!"

میں نے کہا، "چلو نہ سہی مگر پنسل تو باریک بناتا ہوں۔"

وہ بولیں، "عموماً قلم کا باریک نب تلاش کرتے ہیں۔"

میں نے کہا، "مطلب یہ ہے کہ مہین مہین خط میں تو مضمون شروع کرتا ہوں۔"

وہ اگلی سطریں پڑھوانا چاہتی تھیں "آگے تو پڑھیے!"

میں نے پڑھنا شروع کیا،

"آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے البتہ شعر کہنے کے لیے تنہائی چاہتے ہیں اس لیے کہ انھیں ہلکا ہلکا گنگنانا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ اپنے ترنّم کا مرتبہ جانتے ہیں اس لیے اس خداداد دیگر حال

سب پر آشکار کرنا نہیں چاہتے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا:

"دیکھیے اس کو کہتے ہیں غیرت داری!"

میں نے جل کر کہا:

"پھر آپ کا روئے سخن میرے ترنم کی طرف ہے۔ یہ تعصب کی عجیب گھریلو قسم آپ نے نکالی ہے۔"

احمد ندیم صاحب قاسمی والے مضمون میں طفیل صاحب اپنے اس احترام کو باوجود کوشش کے نہیں چھپا سکے جو ندیم صاحب کے لیے ان کے دل میں موجود ہے۔ جب خود طفیل صاحب نے ندیم صاحب پر مضمون لکھنے کے لیے ہاجرہ بہن سے درخواست کی تھی تو اُن بیچاری نے بڑی سچی بات کہی تھی کہ:

"اگر میں سچ مچ لکھ دوں تو یہ مضمون کتنے صفحوں پر پھیلے گا اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنی سچائی کا ادب میں کیا درجہ ہوگا۔ لوگ تو اسے بہن کی پیار والی بات کہہ کر ٹال دیں گے۔"

مگر خود طفیل صاحب نے بھی بھائی کی پیار والی بات سے کام لیا ہے اور صرف طفیل صاحب ہی نہیں اگر میں خود بھی ندیم صاحب کے متعلق لکھتا تو وہ بھی پیار والی بات ہی ہوتی اس لیے کہ اس شخص میں سوائے پیار کے اور ہے ہی کیا!

جگر صاحب کے متعلق طفیل صاحب کا جو مضمون ہے وہ ایک حد تک خود میرے متعلق بھی ہے اس لیے کہ طفیل صاحب اور جگر صاحب کے مراسم کی ابتدا میرے ہی گھر پر ہوئی تھی مگر جب یہ مضمون آگے چل کر صرف جگر صاحب کے متعلق رہ گیا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ طفیل صاحب نے بھی اتنے ہی دنوں میں جگر صاحب کو اتنا ہی سمجھا ہے جتنا میں ساری زندگی کے مراسم کے بعد سمجھ سکا ہوں۔ اس مضمون میں جہاں کہیں طفیل صاحب نے جگر صاحب کے اندازِ گفتگو کا چربہ اُتارا ہے۔ داد دینے کو جی چاہتا ہے واقعی معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب کے یہ الفاظ ان کے ذہن میں محفوظ نہ تھے بلکہ دستاویزی صورت میں موجود تھے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جگر صاحب کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں:

"اگر میں آپ کے کہنے کے مطابق یہ مان لوں اور مجھے اس کا بھی یقینِ کامل ہو جائے کہ فلاں صاحب شعر اچھے کہتے ہیں۔ پھر بھی کہوں گا کہ ان میں وہی ایک چیز نہیں ہے اور وہ چیز پیدا تو ہوتی نہیں وہ تو انسانِ کامل اور مردِ خود آگاہ میں خود ہی ہوتی ہے۔ میری مراد خلوصِ باصفا ہے۔ وہ شعر بڑے بداعمال ہوتے ہیں جو ایسے ذہنی نابالغوں پر وارد ہو جاتے ہیں۔"

میں جانتا ہوں کہ یہ جگر صاحب کا اندازِ بیان ہے۔ یہی الفاظ، یہی ترکیبیں، یہی بندشیں اس مضمون کا کون سا حصہ ایسا ہے جہاں جگر صاحب مع اپنی اصلی شخصیت کے متحرک نظر نہ آتے ہوں۔

فراق والا مضمون شخصیاتی بھی ہے اور دستاویزی بھی۔ اس مضمون میں فراق کے چند نہایت اہم خطوط دے کر طفیل صاحب نے ہر ایک سے فراق کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ ملا دیا ہے بلکہ یوں فراق سے ملنے وا

شاید فراق کو نہ پا سکتا البتہ ان خطوط کے آئینے میں اور پھر طفیل صاحب کی حاشیہ آرائیوں نے فراق کو اس مضمون کے پڑھنے والوں کے بالکل قریب کر دیا ہے۔ اسی مضمون میں ایک جگہ طفیل صاحب لکھتے ہیں :

"الہ آباد تین چیزوں کی وجہ سے مشہور ہے، ان میں سے ایک جواہر لال نہرو، دُوسرے فراق، تیسرے امرود۔"

یہ بات اکبر الٰہ آبادی بہت پہلے بڑے مزے میں کہہ گئے ہیں :

؎

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

مگر یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب پنڈت نہرو اور فراق نہ تھے صرف اکبر اور امرود تھے اور طفیل صاحب نے آج کل کا ذکر کیا ہے جب اکبر نہیں ہیں پنڈت نہرو، فراق اور امرود ہیں۔

سیّد عابد علی عابد کے متعلق مضمون لکھتے لکھتے طفیل صاحب کے ان فقروں نے چونکا دیا :

"مجھے ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس علمی شخصیت ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی قابلِ ذکر ادبی کام نہیں کیا یہ "فضیلت" صرف ان ہی میں نہیں ہے بلکہ یہاں کی کئی اور بڑی بڑی شخصیتوں میں بھی اور ہے۔ اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر (بعض زندہ کرم فرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لُوں تو میرے کرم فرما مجھے معاف فرمائیں۔"

طفیل صاحب زندہ کرم فرماؤں سے ڈر جائیں مگر میں ان کا نام لیتا ہُوں۔

ابھی چند ہی دن ہُوئے کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم کے گھر سیّد ذوالفقار علی بخاری نے یہی بحث چھیڑی تھی سید احمد شاہ بخاری پطرؔس کا علم و تبحر دیکھئے اور ایک کتابچہ دیکھئے "پطرس کے مضامین"۔ اس قابلیت، اس ذہانت اور اس تبحر کے اہلِ قلم سے امید نہ تھی کہ نہ جانے ادب اردو کو کیا کچھ دے دے گا۔ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرؔت اپنی صلاحیتیں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ صوفی تبسّم ہیں خدا کرے وُہ اب بھی کوئی ادبی کارنامہ پیش کر دیں۔ سید عابد علی عابدؔ کی صحت اگر اجازت دے تو ان میں عزم بھی ہے ہمت بھی' اور ان کے تیور بتاتے ہیں کہ وُہ خود اب تک کی غفلتوں کی تلافی کے لیے بیقرار ہیں۔ اس موقع پر ان کی صحت کے لیے دل سے دُعا نکلتی ہے۔ عابدؔ کے پاس بہت کچھ ہے اور ان کی نیت بھی بخل کی نہیں۔ دیر میں سہی نگران کی توجہ اس طرف ضرور ہوئی ہے اور اُمید ہے کہ وُہ کچھ نہ کچھ ضرور کر دکھائیں گے۔

آخری مضمون احسان دانش پر ہے اور بہت ہی کامیاب مصوری ہے۔ احسان اپنی تمام بے ساختگی اور تمام سادہ پرکاری اور تمام پرکارِ سادگی کے ساتھ اس مضمون میں سمٹ آئے ہیں۔ ان کا بینک کی عمارت پر قبضہ کرنا، ان کا کبوتروں سے شغف، ان کی موت کے متعلق وہ اسکیم جو تقسیمِ ملک کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ ان کا مشاعروں سے

شیخوپورے کی طرف فرار، ان کے تاجور مرحوم سے مراسم کی داستانیں اس حُسن سے بیان ہُوئی ہیں کہ طفیل صاحب پر محمد حسین آزاد کی افسانہ طرازی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ یہ مضمون بقول طفیل صاحب کے نامکمل بھی ہے اور ناکام بھی، مگر احسان صاحب کا تو کام تمام کر ہی گیا ہے۔

رہ گئی اس کتاب کی زبان، اندازِ بیان اور باقی ادبی نزاکتیں، ان کے متعلق خود مصنّف کا دیباچہ پڑھ لینا کافی ہوگا جو "اعترافِ جُرم" کے نام سے کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے۔

محمد طفیل کی خاکہ نگاری میں تخلیقی آگہی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

خاکہ کسی چھوٹی چھوٹی کیفیات سے مرتب زندگی کا رنگا رنگ اور کردار کا پہلو دار نقش ہوتا ہے۔ اس نوعیت سے اپنے اسلوب میں خاکہ بہت حد تک انشائیہ کے قریب ہے۔ جس طرح انشائیہ مصنف کے ذہن کی ترنگ اور اس کے تخیل کے بے روک بہاؤ سے اپنا کیف و جمال حاصل کرتا ہے اسی طرح خاکہ ایک خاص کردار میں مصنف کی شخصی دلچسپی اور شخصی تاثرات کا بے تکلفانہ اظہار ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے خاکہ میں کبھی مزاح کے چھینٹے بھی مل سکتے ہیں کبھی اس میں توصیف کی جھلک بھی نظر آ سکتی ہے۔ کبھی تعجب کا احساس بھی داخل ہو سکتا ہے اور کبھی رحم و ہمدردی کے جذبات کی آمیزش بھی ہو سکتی ہے۔

خاکہ نگاری میں شخصیتوں کی تصویریں اس طرح براہِ راست کھینچی جاتی ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں فوری طور پر قاری کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے والے نے نہ صرف قلمی چہرہ دیکھا ہے بلکہ خود شخصیت کو دیکھا بھالا اور سمجھا بوجھا ہو۔

محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "نوک قلم کی تصویر کشی خاکہ نگاری ہے۔ اسے قلمی تصویر یا مرقع سے بھی موسوم کیا جاتا ہے ..... یہ بے جان، ساکت اور گم صم نہیں ہوتی۔ یہ بولتی ہوئی متحرک پرکیف تصویر ہوتی ہے۔"

خاکہ نگار کو کہانی پن سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ صرف کردار کی شخصیت سے سروکار رکھتا ہے۔ صرف ایسے ہی واقعات منتخب کرتا ہے۔ جن سے شخصیت پر روشنی پڑ سکے۔ یہ اتفاقی بات ہے کہ کسی خاکے میں کہانی پن بھی پیدا ہو جائے۔ کرداری افسانے کا پلاٹ، کردار اور کہانی کو ایک دوسرے سے پیوست کرتا ہے۔ خاکہ کا پلاٹ بالکل کردار کے تابع ہوتا ہے۔

خاکہ نگاری کسی قید یا شرط کی تابع نہیں ہوتی بلکہ توصیف یا تنقیص کو مقصدِ اولی قرار دیئے بغیر اصلیت نگاری کو اپنا منتہی سمجھتی ہے۔

خاکہ نگار کو موضوع کے حالات، واقعات، صورت، سیرت اور لباس وغیرہ کے متعلق معلومات من و عن بیان کرنے پڑتے ہیں۔ کسی شخصیت کے متعلق جب تک کہ وہ ذاتی معلومات اور حقیقی و مستند مواد نہیں رکھتا۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔

شخصیت کا انتخاب۔ بجائے خود صنف خاکہ نگاری کی نوعیت کے بارے میں ایک بہترین سراغ اور واضح نشاندہی

بن سکتا ہے۔ خاکہ نگاری کا موضوع عموماً ایسی مثالی یا حقیقی ہستیاں ہوتی ہیں جو کرشمہ کردار کی حامل ہوں۔ ایسا کرشمہ جو دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ لے۔

دراصل یہی وہ خطِ فاصل ہے۔ جو ایک طرف سوانح عمری اور خاکہ کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے تو دوسری طرف یہ بیک وقت خاکہ کے موضوع کو افسانہ اور ناول کے ہیرو سے ممیز بھی کرتا ہے۔

ناول اور افسانہ میں معاشرہ، ماحول، خاص فضا، مقصد یا موضوع اور واقعات سب کے سب مشترکہ طور پر ایک ایسے سانچے کا کام کرتے ہیں جس سے محض ایک متوقع شخصیت بھی ڈھل کر نکل سکتی ہے۔ اس کے برخلاف خاکہ نگاری میں موجود شخصیت ایک DETERMINING FACTOR ہوتی ہے۔ جو زماں اور مکاں سے ہم آہنگ ہونے یا ان سے عہدہ برآ ہونے میں اپنی ساری توانائی صرف کر دیتی ہے۔ یہ ایک طرح کی نبرد آزمائی سے کم نہیں۔ نتیجہ چاہے فتح ہو یا شکست، دلِ ناتواں کا مقابلہ بجائے خود اہم ہوتا ہے۔ یہ گویا انسان کا، جاودانی، کے انجذاب کی سمت ایک سفر ہے اور اسی سفر کی روداد خاکہ نگاری ہوتی ہے۔

بقول سید حامد حسین، خاکہ کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی فنِ تحریر کی تاریخ۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم روایتی کہانیوں اور گاتھاؤں کی شکل میں یہ خاکے فنِ تحریر سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔ توریت کی کتاب ملوک میں کئی چھوٹے چھوٹے خاکے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں بھی ایسے خاکوں کی کمی نہیں۔

عہدِ جدید میں خاکہ نگاری نے صحافت کی ابتدا کے ساتھ تدریجی طور پر ترقی کے کئی مراحل طے کئے ہیں۔

ویسے خاکے کی ابتدا عام طور پر دوسری صدی قبل مسیح میں بتائی جاتی ہے جب کہ یونانی مصنف تھیو فرسٹس نے ارسطو کی کتاب "اخلاقیات" کے زیرِ اثر تیس مختلف قسم کی ذہنی کمزوریوں کو مختلف کرداروں کے ذریعہ ظاہر کیا۔ قرونِ وسطیٰ میں سبع قبائح کا تصور عام رہا اور اس کی جھلک اس زمانہ کی تحریر میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس پر مبنی کردار نگاری کی ابتدا سولہویں صدی کے آخر میں ہوئی۔ سترھویں صدی میں کرداری خاکے عام ہو گئے اور جوزف ہال، تھامس اوربری، جان ارل وغیرہ نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا۔ اٹھارھویں صدی میں جب صحافتی ادب نے اپنا سکہ جمانا شروع کیا تو ایڈیسن اور اسٹیل نے بھی اس رنگ میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے آخر تک انگلستان میں ناول نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دی اور ناول نگاری نے خاکہ نگاری کے رواج کو بہت حد تک کم کر دیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں سوانح نگاری نے ایک سائنٹفک اسلوب اختیار کر لیا جس کا اثر شخصی خاکوں پر بھی پڑا۔ چنانچہ اس دور کے خاکے عام طور پر مختصر سوانحی یا تاریخی مضامین بن گئے اور بیسویں صدی میں نفسیاتی موشگافیوں پر زور دیا جانے لگا۔ اس طرح خاکہ نگاری میں نفسیاتی پیچیدگیاں آگئیں۔

اُردو میں خاکہ نگاری کی تاریخ زیادہ طویل نہیں ہے۔ خاکہ نگاری کے ابتدائی نمونے محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" میں ملتے ہیں۔

موجودہ صدی کے آغاز میں سوانح نگاری کی ابتداء کے ساتھ ساتھ سوانحی مرقعوں کا بھی رواج ہوا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، عبدالرزاق کانپوری، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی، اخلاق احمد دہلوی، محمد طفیل، فکر تونسوی، نریش کمار شاد، مجتبیٰ حسین وغیرہ نے سوانحی خاکے تحریر کئے ہیں۔

ان میں محمد طفیل ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اس فن کو اس دلچسپی، بے ساختگی، بے تکلفی، بیانِ تدراری اور خوش مذاقی کے ساتھ اپنایا ہے کہ اس کی مثال ملنا دشوار ہے۔ خاکہ نگاری کو محض ایک فن سے۔ فنِ لطیف بنانے میں محمد طفیل نے جو کردار ادا کیا ہے وہ تاریخ ساز اور جغرافیہ گریز بھی ہے۔

خاکہ نگاری کے بارے میں محمد طفیل نے ۱۲، جون ۶۳ء کو شاہد احمد دہلوی کے نام ایک خط میں اپنے نظریات یوں لکھے ہیں:

"میں خاکہ نگاری میں بڑے اُوٹ پٹانگ نظریات رکھتا ہوں۔ مثال کے طور پر میں مولوی عبدالحق کو شخصیت نگار نہیں سمجھتا۔ انہوں نے شخصی نوعیت کے جتنے مضمون لکھے وہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں مگر ان کا انداز سوانحی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے بھی بڑے زور کے شخصی مضمون لکھے وہ مضمون اور اچھے ہوتے بشرطیکہ رشید احمد صدیقی خود اتنے بڑے اور اتنے اچھے انشا پرداز نہ ہوتے۔

شخصیت نگاری میں، میں منٹو کے مضامین "گنجے فرشتے" کو اہمیت دیتا ہوں۔ جمیل الدین عالی کے اکلوتے مضمون کو بھی (جو انہوں نے نواب سائل دہلوی پر لکھا تھا) خاکہ نگاری میں خوشگوار اضافہ سمجھتا ہوں ..... شخصیت نگاری ایک ایسا موضوع ہے جسے میں استروں کی مالا کہا کرتا ہوں۔ اس صنفِ ادب میں لکھنا اپنے دشمن بنانے کے مترادف ہے۔ قصیدہ پڑھا جائے تو قاری جوتے مارتا ہے۔ ہمت کر کے لکھ دیا جائے تو زیرِ بحث شخصیت تھوکتی ہے اگر کسی کے مرنے کے بعد کچھ کہا جائے تو سب پکار اُٹھتے ہیں۔ ہے ہے مرنے کے بعد بھی نہیں بخشا مردود نے۔

اگر آپ شخصیت نگاری میں مولوی عبدالحق کی تکنیک برتتے تو آپ سے کوئی بھی ناراض نہ ہوتا۔ وہ تکنیک ہے تعریف و توصیف کی۔ جس طرح آپ پر یہ الزام ہے کہ آپ کا قلم صرف بُرے پہلوؤں پر اٹھتا ہے اسی طرح مرحوم کا فن بھی مجروح ہے کہ وہ صرف اچھے پہلوؤں پر اٹھتا تھا۔

خدا کی ہر مصلحت کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔ اس لئے میں کیا جانوں کہ اللہ میاں نے آپ میں یہ خوبی کیوں پیدا کی کہ ایسے ایسے فقرے لکھنے پر قادر کر دیا جو سیدھے جا کر دل کو پکڑ لیتے ہیں۔ اگر اس پر اکتفا کیا ہوتا تو لوگ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ شاہد صاحب کا مزاج بھی ایسا ہے کہ وہ ضرور زہر اگلیں گے۔ مگر باتیں اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ چبھتے ہوئے فقرے لکھنے میں آپ کے پائے کا ادیب اور کوئی نہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا

ہوں کہ آپ کسی شخصیت پر لکھتے ہوئے اس امر کی شعوری کوشش نہیں کرتے کہ ضرور خلاف ہی لکھنا ہے وہ تو آپ کا ایک قسم کا "قلمی مزاج" ہے جو چھٹپٹے فقروں کو قلم کی نوک پر آنے سے نہیں روک سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو بہت بڑا فقرے باز سمجھتا ہوں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ خاکہ نگار کو حقیقت نگاری سے آنکھیں نہیں چرانا چاہیئں۔ لیکن اس کے پاس ایسا حکمت آمیز قلم ہونا چاہیئے کہ وہ کہے سب کچھ مگر اس ڈھب سے کہ ہر قدم پر سمجھا سمجھا کے انجان بنتا چلا جائے۔

حقیقت نگاری کی ایک مثال اور بھی ہے وہ ہے عصمت کا مضمون "دوزخی"۔ اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں۔ شخصیت نگاری میں اس مضمون کو بھی اونچا درجہ حاصل ہے۔ اس کے باوجود میں یہ کہتا ہوں کہ اگر عصمت یہی مضمون عظیم بیگ کی زندگی میں لکھ دیتی تو وہ عصمت کا گلا گھونٹ دیتے۔

جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ خاکہ نگاری میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے۔ وہی آپ کے ہاں کم ہے (صرف چند مضامین میں) میری مراد توازن سے ہے"۔

ایک اچھے خاکہ نگار کو چلتے پھرتے انسانوں اور ان کی متحرک زندگی کا صحیح نقش حاصل کرنے کے لئے اپنی اوپری پیشہ ورانہ شخصیت سے تھوڑی دیر غافل ہونے کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے خلیفہ ہارون رشید کی طرح اپنا شاہی خلعت اتار کر اندھیری گلیوں میں گھومنا پڑتا ہے۔

خاکہ نگاری اور خاکہ نگار کے ان اصولوں پر محمد طفیل پورے اترتے ہیں۔ لیکن یہ کتنا دشوار کام ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں "میں نقاد نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں ڈنڈی مار دوں۔ میرا موضوع شخصیتوں کا مطالعہ ہے جس میں جھوٹ نہیں چلتا بلکہ کنواری لڑکیوں کی طرح اپنی لاجوں آپ مرنا پڑتا ہے"۔ (نیاز صاحب)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "میں کئی ایسی شخصیتوں سے واقف ہوں جنہوں نے اپنے اوپر شرافت کے غلاف چڑھا رکھے ہیں۔ ایسے "اللہ والوں" کو جھانکنا مشکل ہے۔ چہ جائیکہ پڑھ لینا۔ بعض لوگ ملیدے ہوتے ہیں جن پر سے اگر ایک غلاف اُتار دیا جاتے تو وہ بالکل آدمی کی صورت میں نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ بعض کے دو اتارے جائیں تو بعض کے تین اتریں تو...... اور بعض شخصیتیں تو بالکل پیاز ہوتی ہیں۔ چاہے جتنے غلاف اتار ڈالیں۔ ہاتھ کچھ بھی نہ آئے گا"۔ (جوش صاحب)

محمد طفیل کی خاکہ نگاری میں تخلیقیت شناسی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نیاز فتح پوری کے خاکے سے یہ اقتباس دیکھئے:

"نیاز صاحب، مومن کے بڑے مداح ہیں۔ جو کوئی بھی مومن کا زیادہ مداح ہو گا۔ وہ لازمی طور پر اس کے ہم عصر غالب کا زیادہ طرفدار نہ ہو گا۔ یہی حال کچھ نیاز صاحب کا بھی ہے۔ مگر یہ اپنے مضامین میں جتنے شعر، غالب کے کوٹ کرتے ہیں۔ اتنے مومن کے نہیں کرتے۔ احتیاط صرف اتنی کرتے ہیں کہ غالب کے اردو شعروں کی بجائے۔ فارسی کے شعر اپنی نثر میں سجاتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ غالب کو فارسی کا شاعر اور مومن کو اردو کا شاعر مانتے ہیں۔ یہ فلسفے کو با صرف تصوف

ہی تصوف کو غزل نہیں سمجھتے ۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا جو تصور ان کے ہاں ہے ۔ وہ انہیں مومن ہی میں ملتا ہے ۔ غالب میں نسبتاً کم ملتا ہے ۔ بظاہر یہ بات چاقو چل جانے والی ہے ۔ مگر یہ کچھ زیادہ غلط نہیں ؟“ جوش ملیح آبادی کے بارے میں محمد طفیل لکھتے ہیں :-

”کتنی معاملات کے بارے میں یہ دوہری شخصیت کے مالک ہیں ۔ کبھی اتنے خود غرض کہ آپ ہکا بکا رہ جائیں ۔ کبھی اتنے مخیر کہ عقل نہ مانے ۔ ان کے مزاج کی دھوپ چھاؤں ، انسانی فطرت ہی کی غماز ہے ۔ ایک رخ کے اظہار سے بونے اور دوسرے رخ کے اظہار سے عام انسانوں کے قد سے اُونچے نظر آئیں گے ۔

جوش صاحب نے اپنی شخصیت پہ کوئی نقاب نہیں ڈال رکھی ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی ستر پوشی کے باوجود ڈھکے چھپے نہیں رہتے ۔ وہ اور لوگ ہوں گے جو اپنی زندگی اور اپنے خیالات کو اس ڈر سے قابو میں رکھتے ہوں گے کہ ہمیں دنیا دی آنکھیں دیکھ رہی ہیں مگر جوش صاحب کو یہ ملمع بازی پسند نہیں ۔ یہ مصلحت آمیز قسم کی قیود سے قطعی طور پر نا آشنا ہیں ؟“

اسی خاکے سے تخلیقی آگہی کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں :

”جوش صاحب کو شاعرِ انقلاب مان لیا گیا ہے مگر میں انہیں شاعرِ جمالیات ہی سمجھتا ہوں ۔ اس لئے کہ شاعرِ انقلاب اگر کوئی ہوا ہے تو وہ صرف نذر الاسلام ہے ۔ ہاں کسی حد تک اقبال کو بھی شاعرِ انقلاب کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ اقبال نے سوچے سمجھے انداز میں انقلاب آسا سروں کو الاپا ، مگر جوش نے جوش میں آ کر بھی ایسا نہیں کیا ۔ گھن گرج اور منہ پھوڑ والی شاعری تعمیری نوع کی انقلابی شاعری نہیں ہو سکتی ۔ اقبال کے ہاں بھی انقلابی شاعری کا صرف جسم ملتا ہے روح نہیں ملتی ۔ انقلابی شاعری کی روح اگر کسی کے ہاں ہے تو وہ صرف نذر الاسلام ہے ۔ اقبال بنیادی طور پر صرف شاعرِ ملت ہیں ۔ اس میں ان کے ہاں جسم بھی ہے رُوح بھی ہے ۔

انقلاب ذہنوں کو کتنا ہی لبھائے مگر وہ کلیۃً تعمیری نہیں ہوتا ۔ تعمیری ارتقا تو ایک تدریجی عمل کا نام ہے جس سے فکر و عمل کا ایک مخصوص سانچا تشکیل پاتا ہے اور انقلاب محض بدنظمی ہے جس سے بگاڑ کے تو بہت سے پہلو نکلتے ہیں مگر بناؤ کی کوئی صورت نہیں نکلتی ؟“

خاکہ نگاری کے لئے منتخب شخصیتوں سے چونکہ محمد طفیل کے ذاتی تعلقات گہرے رہے ہیں اس لئے ان کے خاکے میں اثر پذیری زیادہ ہے ۔ انہوں نے کمال خلوص کے ساتھ شخصیتوں کے پہلوؤں کو واضح کیا ہے ۔ بعض چھوٹے چھوٹے واقعات سے تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور انتہائی دلچسپ پیرائیہ بیان اختیار کیا ہے ۔ اختر اورینوی کے خاکہ سے یہ اقتباس دیکھئے ؛

”بزرگوں اور لڑکیوں نے اول میں سازش کی کہ ایک کمرہ پر جنات کا سایہ ہے ۔ پٹنہ سے اختر صاحب آتے تو انہیں بے وقوف بنانے کے لئے پوری فضا تیار تھی ۔ رات آتے ہی کھلی چھت پر لمبے تڑنگے سفید پوش جن تشریف لاتے اور غائب ہو گئے ۔ لڑکیاں چیخیں اور بے ہوش ہو گئیں ۔ سبز الائچیوں کی بارش ہوئی ، مٹھائیوں کی ڈلیاں برسیں ۔ اختر صاحب

متاثر ہوتے مگر بظاہر دلیری کا اظہار کرتے رہے۔ سسرال اور سالیوں کے درمیان سبکی اور بہادری کا مسئلہ جو درپیش تھا پھر یہ ہوا کہ جعفری کی تحریر میں خط آنے لگے۔ ہر روز رات کو یہ سوانگ بھرا گیا۔ رونگٹے کھڑے ہوتے رہے۔ لڑکیاں ایکٹنگ کرتی رہیں۔ بالآخر اختر نے اپنی مذہبیت سے فائدہ اٹھایا اور ایک دن جنات کو عربی اور فارسی کے موٹے موٹے الفاظ میں ایک خطبہ دے ڈالا اور نصیحت فرمائی کہ اہل اسلام کو مت ستاؤ۔

کچھ دنوں کے بعد لڑکیاں چھوٹیں۔ کھل کھل ہنسیں۔ بعد کو بتا چلا کہ یہ محض ڈرامہ تھا۔ اختر خفیف ہوئے اور شرمندگی اور خفگی کے مارے کئی دنوں تک اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑے رہے۔ آخر سالیوں نے منا لیا۔ جنوں کا سایہ تھا۔ پریوں نے دور کیا۔"

اسی خاکہ میں محمد طفیل نے تجاہل عارفانہ کی مثال یوں پیش کی ہے:

"باتوں باتوں میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ میں نے اختر صاحب سے پوچھا "کیا آپ خوفناک قسم کا سچ بول سکتے ہیں؟"

"بفضل خدا!"

اب اس بفضل خدا قسم کے جواب کے بعد بہت تو نہ تھی کہ کسی شرارت کی گنجائش ہوتی۔ مگر بات منہ سے نکل گئی "آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ کیوپڈ آپ پر بڑا مہربان تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

استاد تو یہ ہی۔ فوراً پینترا بدل گئے ——— ہاں میں نے بعض مذہبی شخصیتوں سے محبت کی ہے لیکن اللہ میاں سے اب تک محبت نہیں ہوتی۔ حضرت محمد صلعم کو بہت چاہتا ہوں۔ ملک کے قائدین میں پنڈت نہرو اور محمد علی جناح کو بہت چاہا۔ دوستوں میں رضا نقوی، شرف عظیم آبادی، علی اظہر، زیڈ اے تمنائی، علی عباس اور حسن سے محبت کی ہے۔

دیکھ لیا آپ نے صاف بچ دے گئے۔ پوچھا کچھ، جواب کچھ۔"

محمد طفیل ایک وسیع الذہن اور رواداد انسان تھے اور یہ وسیع الذہنی اور رواداری ان کے ہر خاکے کے پیچھے سے جھلکتے ہوئے خلوص سے نمایاں ہوتی ہے انہوں نے حقیقت پسندی اور میانہ روی کی روایت کو بھی آگے بڑھانے کا کام مستقل مزاجی سے کیا ہے۔ ان کے خاکے سے مختلف شخصیتوں کے مختلف پہلو اجاگر ہوتے ہیں:

"ایک صبح جو میں، کرشن کے ہاں پہنچا تو بجائے کسی نوکر کے کرشن خود ہی بھاگے ہوئے آئے۔ حلیہ یہ تھا کہ پاؤں سے ننگے۔ صرف پاجامہ اور بنیان پہنے ہوئے۔ مجھے دیکھتے ہی کھسیانے سے ہو کر کہنے لگے۔ آیئے آیئے ——— میں تاڑ گیا کہ یہ جو اس حلیے میں اور اس والہانہ انداز میں بھاگے ہوئے آئے ہیں تو یہ گھبراہٹ میرے لئے نہیں ہو سکتی۔ میں نے ذرا سوچ کر کہا" اس وقت بھابی آنے والی تھیں کیا؟"

"ہاں یار! اسی وقت ٹرین آتی ہے۔ میں سمجھا کہ وہ آگئی ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان کی زندگی میں بناوٹ کو بہت کم دخل ہے۔ کوئی فنکارانہ اتراہٹ نہیں۔ باتوں میں انکسار ہے بڑے متواضع ہیں (کبھی خوبصورت بھی ہوں گے) اور اس کے ساتھ خود بے حد شرمیلے۔" (کرشن چندر)

"اس وقت فراق کا نشہ وقتی تھا لیکن اس کے شعروں میں جو نشہ تھا۔ اور ہے، وہ وقتی نہ تھا۔ اس لئے سامعین کی حالت فراق صاحب سے زیادہ خراب تھی۔" (فراق گورکھپوری)

محمد طفیل غضب کے جینئس تھے۔ جینئس کے بارے میں جوگندر پال نے لکھا ہے کہ آسکر وائلڈ کا یہ مقولہ بے معنی ہے کہ ہر جینئس بتدریج جینئس نہیں بنتا۔ جینئس آغاز تا انجام ہمہ وقت جینئس ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی اپنی مخصوص جینئس کو بتدریج دریافت کرتا ہے اور دریافت کرنے سے پہلے اسے خون اور درد کی ندی پار کرنی ہوتی ہے۔ پہلے یہ جھجک، پھر دیوانہ وار، بہ ایں اندازہ اپنی ہڈیوں میں گھس کر کہیں چھپے بیٹھے شعور کی ٹوہ لگاتا ہے اور بڑی لگن اور صبر سے کئی حیلے کر کر کے اسے رام کرتا ہے۔ بڑے مزے سے کھیلتی ہوئی تحریر کے پس پشت دراصل اس کا خالق اپنی تمام حسّیں یکجا کر کے بڑی تنی تنی احتیاط سے اپنی تخلیق کے کھلنڈراپن کا سامان کر رہا ہوتا ہے اور اپنی اسی توفیق کی بدولت اس کا فن بکھر جانے کے باوجود اور نکھرنے کی اُمید بندھاتا ہے۔

محمد طفیل کی اسی ارتقا پذیری میں ان کی تخلیقی آگہی پوشیدہ ہے۔

درختوں کی جڑیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ درخت جتنا اونچا ہو گا، اتنی ہی گہری جڑیں ہوں گی۔ اصل درخت تو زمین کے نیچے چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہی حال اشخاص کا ہے جو شخص جیسا نظر آتا ہے وہ وہی کچھ ہوتا ہے۔ اس کے اندر بہت کچھ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ شخصیت سے آگہی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی ہوئی شخصیت میں اُتر جائے۔

یہ جو ادیب لوگ ہوتے ہیں بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ من کی دنیا میں اتنے محو ہوتے ہیں کہ انہیں گھر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ بیوی بچوں کو بھی یہ ایسے ہی سمجھتے ہیں۔ جیسے گھر کی کوئی دوسری چیز مثلاً میز، کرسی، بہت ہوا تو بیوی کو صوفہ سیٹ سمجھ لیا۔

جب تک مذہب کی رُوح کو سمجھا نہ جائے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال نہ لیا جائے۔ اس وقت تک تمام نعرے سیاسی اور کاروباری ہوں گے۔ آج کسی بھی بڑے سے بڑے عالم کو دھیان میں رکھ لیجئے اور اس کا تقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ادنیٰ صحابی سے بھی کر کے دیکھ لیجئے۔ عقل و ہوش کی ساری سیڑھیاں کھسکتی نظر آئیں گی۔

غصے اور ضد کی بنیاد پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں وہ پانی پر نمک کی دیواروں سے زیادہ زندگی نہیں پا سکتیں۔

محمد طفیل خاکہ نگاری کے اہم، صاف ستھرے، غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں ان کے یہاں تخلیقیت شناسی یوں بھی واضح طور پر نظر آتی ہے کہ ان کے خاکے میں موجِ حیات کا سارا اضطراب و اہتزاز شخصیت کے گوہر میں محصور رہتا ہے اور گوہر کی تابانی میں پائے جانے والے رنگوں کی تحریر کے منشور میں الگ الگ انعطاف کی سعی ہوتی رہتی

ہے۔ گرمیِ حیات جس رقصِ شرر کا عطیہ ہوتی ہے۔ محمد طفیل کی خاکہ نگاری کبھی اسے عیاں کرتی ہے تو کبھی محض حریم ذات کی مدت پنہاں کی پیمائش کرتی ہے۔ چاہے وہ بروں بیں (EXTROVERT) شخصیت کا بیان طمطراق ہو یا دروں بیں (INTROVERT) انسان کا زیرِ لب مراق ہو۔ بقول انور سدید، انہوں نے منٹو کی طرح خاکہ نگاری کے حمام میں کسی کا "ٹونڈن" نہیں کیا۔ ہر کسی کو "رحمۃ اللہ علیہ" کی کھونٹی پر بھی نہیں لٹکایا۔ ان کے یہاں شخصیت اور خاکہ نگار میں ہمیشہ ایک قابلِ عزت فاصلہ موجود رہتا ہے وہ شخصیت کو اپنے اوپر حاوی ہونے کی اجازت دیتے ہیں نہ خود شخصیت کے کندھوں پر بلا اجازت سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں ..... محمد طفیل اپنے اصلی رنگ میں اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب شخصیت کا قد ان کے اپنے قد کے برابر ہو جاتا ہے اور دوئی کا پردہ درمیان سے ہٹ جاتا ہے اور حجاب دور ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ معاصرانہ چشمک ظہور میں آتی ہے جو ان کے خاکوں میں جیتے خون کی طرح رواں ہے اور جس کے موجد اور خاتم محمد طفیل ہیں !

اِکلوتا جنّ

ڈاکٹر طارق عزیز

خاکہ نگاری انشا نویسی کی کوئی آسان صنف نہیں۔ اپنے کینوس اور حدود کے اعتبار سے یہ فوٹوگرافی، مصوری اور بُت تراشی سے بھی مشکل اور بڑا فن ہے۔ فوٹوگرافی سے کسی شخص کی محض ایک ادا اور ایک موڈ کو گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ مصوری میں تخیل کی سحر کاری امکانی حدود کو ذرا وسیع کر دیتی ہے۔ تقریباً یہی کیفیت بُت تراشی کی ہے لیکن اس میں فن ایک روحانی درجہ اختیار کر لیتا ہے اور انسان کا بت اپنی بشری سطح پر بہت کم دکھائی دیتا ہے، جبکہ خاکہ نگاری میں ایک طرف تو کینوس اتنا وسیع ہوتا ہے کہ متعلقہ شخص کی تمام عادات و اطوار، لب و لہجہ، حُسنِ ادا، رنگِ خلوت و جلوت، اُس کا برتاؤ، اُس سے برتاؤ، اس کے دُکھ، اس کے سُکھ، غرض سب کچھ بیان کرنے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن دُوسری طرف بیان کی حدود ہر دم یہ قدغن لگاتی ہیں کہ کوئی بات اصلیت سے نہ بڑھے۔ انسان جیسا تھا (یا ہے) ویسا ہی نظر آئے۔ نہ حق دوستی اتنا کہ انسان کو یزداں بنا دے، نہ کینہ پروری ایسی کہ انسان کو شیطان بنا دے۔ پھر فن ہر دم انسان کو ماضی کے گہرے پردوں اور بھُولی بسری یادوں یا مستقبل کے انجانے راستوں سے نکال کر لمحۂ موجود میں لا کھڑا کرنے کا تقاضا کرے تو خاکہ نگاری اور بھی مشکل قرار پاتی ہے۔ دراصل یہی وُہ مقام ہے جو خاکہ نگاری کو سوانح نگاری سے ممتاز کرتا ہے۔

"کشافِ تنقیدی اصطلاحات" میں خاکہ نگاری کی جو تعریف کی گئی ہے اُس کے مطابق "ادب کی جس صنف کے لیے انگریزی میں سکیچ یا پین پورٹریٹ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اردُو میں اسے خاکہ کہتے ہیں۔ خاکہ ایک سوانحی مضمون ہے جس میں کسی شخصیت کے اہم اور منفرد پہلو اس طرح اُجاگر کیے جاتے ہیں کہ اس شخصیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ خاکہ سوانح عمری سے مختلف چیز ہے۔ سوانح عمری میں خاکے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن خاکے میں سوانح عمری نہیں سماتی۔

خاکہ اُسی شخص کا لکھا جا سکتا ہے جس سے خاکہ نگار ذاتی طور پر واقف ہو اور اس نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہو۔ خاکے میں واقعات کو زمانی ترتیب سے پیش نہیں کیا جاتا بلکہ واقعات کی ایسی ترتیب لگائی جاتی ہے جو موضوعِ خاکہ کی تصویر کو روشن کرنے اور مطلوبہ تأثر کو گہرا کرنے میں معاون ثابت ہو۔

یہاں اس تعریف کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ محمد طفیل کے خاکے اس تعریف سے کچھ آگے ہیں اُن کے خاکے خاکہ نگاری کے مروّجہ اصولوں سے مثبت انحراف کرتے ہیں۔ یُوں ہمیں خاکہ نگاری کی مروجہ تعریف میں چند جملوں کا اضافہ

کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وُہ جملے یہ ہو سکتے ہیں:

"خاکہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ غیر اہم شخصیت کو بھی اہم اور سنجیدہ آدمی کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔"

اردو میں خاکہ نگاری کی روایت زیادہ قدیم نہیں۔ بعض تذکروں اور "آب حیات" میں کہیں کہیں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش اور بے قاعدہ اشارات ملتے ہیں لیکن ان میں خاکہ نگاری کے باقاعدہ فن اور الگ صنف کا شعور نہیں پایا جاتا۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری کو ایک الگ اور باقاعدہ صنف کے طور پر بیسویں صدی میں اپنایا گیا۔ اس کی بنیادیں مضبوط کرنے میں جو بڑے بڑے نام ہمارے سامنے آتے ہیں اُن میں فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، میرزا ادیب اور محمد طفیل شامل ہیں۔

محمد طفیل کو مذکورہ خاکہ نگاروں کی فہرست میں اس اعتبار سے امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے خاکہ نگاری قلم کا ذائقہ بدلنے یا محض دوستی نبھانے یا ازراہِ تفنن طبع یا محض "خاکہ نگار" کہلانے کے لیے نہیں کی بلکہ اسے باقاعدہ صنفِ ادب کے طور پر اختیار کیا ہے۔ محمد طفیل نے کاروبارِ ادارت کے علاوہ تخلیقی سطح پر خاکہ نگاری ہی کو ذریعۂ اظہار کے طور پر اپنایا ہے۔ خاکہ نگاری کی حیثیت ان کے نزدیک ضمنی نہیں۔ اسے انہوں نے پُوری اہمیت دی ہے۔ اس صنف کو باقاعدہ فن کا درجہ دیتے ہوئے انہوں نے اپنا نظریۂ فن بھی وضع کیا۔ اُن سے پہلے کسی نے بھی خاکہ نگاری کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اپنے نظریۂ فن کی وضاحت کرتے ہُوئے وُہ لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک خاکہ نگاری خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ یعنی جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہے، اُس کے عین مین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے!"

"ایک عجیب سی بات ذہن میں آتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خاکہ نگار صرف چار لفظوں کی زد میں ہوں، وہ چار لفظ یہ ہیں: "روکو مت جانے دو"۔ اب کون لفظ "روکو" کو باقی فقرے سے الگ کرتا ہے اور کون دو لفظوں (روکو مت) کو، مثال پامال سہی، مگر واقعہ یہی ہے کہ خاکہ نگاری کچھ ایسے ہی لفظوں کا کھیل ہے۔ شخصیت نگاری بہتوں نے کی۔ مگر تلوار کی دھار پر چلنا، اُن میں سے ہر ایک نے ضروری نہ جانا۔ واقعہ یہ ہے کہ شخصیت نگاری صرف اور صرف تلوار کی دھار پر چلنے کا نام ہے۔ ایسی تلوار، جس سے لکھنے والا بھی زخمی ہوتا ہے اور وُہ بھی جو لکھنے والے کی زد میں ہو۔ میری شامتِ اعمال کہ میں نے اسی موضوع کو اپنایا۔ بس حد تک کامیاب ہُوں اور کس حد تک ناکام، اس کا کچھ واضح پتہ نہیں چلتا۔ مگر یہ بالکل واضح ہے کہ اس "کھیل" میں خود بھی زخمی ہُوا، دُوسروں کو بھی زخمی کیا۔ آخر میں خود زخمی ہونے یا دوسروں کو زخمی کرنے کا خطرناک کھیل کیوں کھیلتا ہُوں؟ صرف اس لیے کہ کہیں شخصیت نگاری کے ضمن میں سچ بولنے کو گناہ نہ سمجھ لیا جائے۔"

"ہر انسان کی نظر میں، انسانیت کا معیار صرف اس کی ذاتی خواہشیں ہوتی ہیں۔ مگر دوسروں کی نظر میں، اس کا عمل، اس کی انسانیت کا معیار ہوتا ہے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں نے ذاتی خواہشوں کا خیال کبھی نہیں رکھا۔ بلکہ انسانیت کا معیار، اس کے عمل کو سمجھا۔ شخصیت نگاری میں ذاتی خواہشوں اور عمل کے ٹکراؤ میں، توازن کے برقرار رکھنے ہی کو مَیں فن سمجھتا ہوں۔"

ان اقتباسات میں اہم بات یہ ہے کہ محمد طفیل نے خاکہ نگاری کے لیے "شخصیت نگاری" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شخصیات کے بارے میں اُن کا مشاہدہ سرسری نہیں بلکہ وہ دوسرے کی ذات میں سرایت کر جانے کے قائل ہیں کہ دیانت دارانہ شخصیت نگاری کا تقاضا یہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ محمد طفیل نے فنِ خاکہ نگاری کے منصب کے بارے میں جن نظریات کا اظہار کیا ہے کیا اپنے خاکوں میں ان پر عمل بھی کیا ہے یا محض یہ باتیں فن کے نظریات ہی کی حد تک ہیں ؟

دیگر خاکہ نگاروں کی نسبت محمد طفیل اس اعتبار سے مختلف بھی ہیں اور ممتاز بھی کہ وہ جس کا خاکہ لکھنا چاہتے ہیں اُسی کا خاکہ لکھتے ہیں۔ یہ نہیں کہ خاکہ کسی اور کا ہو اور ذکر اذکار سب اپنا۔ وُہ دوسرے کے خاکے میں اپنی ذات کو کم سے کم شامل کرتے ہیں۔ یہ امر غیر ارادی نہیں بلکہ وہ اس سلسلے میں دانستہ طور پر نہایت محتاط ہیں۔ انہیں اس کا احساس بھی ہے اور پاس بھی۔ وہ لکھتے ہیں :

"..... ضروری ہے کہ لکھنے والا شخصیت میں گھُسا ہُوا نظر نہ آئے بلکہ شخصیت ہی رواں دواں دکھائی دے۔ اگر مصنّف خود کو لانے پر مجبور ہی ہو تو ایسے' جیسے قمیص میں بٹن، نہ کہ بٹن میں قمیص —— اور ان مضامین میں میری "شخصیت" ایک "وسیلۂ محض" ہے۔"

محمد طفیل کے لکھے ہُوئے خاکے آٹھ کتابوں پر مشتمل ہیں۔ مَیں نے اختصار کو ملحوظ رکھا ہے ورنہ ہر کتاب اور ہر کتاب کے ہر خاکے کا تجزیہ اگر کیا جائے تو اس مضمون میں مکمل کتاب جتنا مواد سما سکتا ہے۔

حتمی بات یہ ہے کہ فنِ خاکہ نگاری میں محمد طفیل کو محض "قابلِ قدر اضافہ" ہی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں اس کلیے سے ہٹ کر کوئی اور لفظ وضع کرنا پڑے گا۔ مثلاً ہم انہیں اس صنف کا "اکلوتا جن" قرار دے سکتے ہیں۔ "اِکلوتا" اس لیے کہ خاکہ نگاری کے داعیوں میں وہ اکلوتے شخصیت نگار ہیں اور "جِنّ" اس لیے کہ اس فن میں وہ واقعی ایک "جِنّ" ہیں۔

پُرانے نمبر

(۱) غزل نمبر — (مئی ۱۹۵۴ء) قیمت : ۱۰۰ رُوپے

(۲) افسانہ نمبر — (دسمبر ۱۹۵۵ء) قیمت : ۱۰۰ رُوپے

(۳) بیاضِ غالب نمبر — (اکتوبر ۱۹۶۹ء) قیمت : ۱۰۰ رُوپے

مندرجہ بالا نمبر

نایاب تھے، مگر اب ان کے نئے ایڈیشن چھپ گئے ہیں

○

اسٹاک میں یہ نمبر بھی موجود ہیں۔

(۱) خطوط نمبر (۲) ادبی معرکے نمبر (۳) انیس نمبر (۴) اقبال نمبر (۵) عصری ادب نمبر (۶) سالنامے

ادارۂ نقوش، لاہور

اُردو بازار


انتظاریہ

میرا بھیّا

شکیلہ اختر

طفیل! تم کیسے اچانک چپکے سے چلے گئے۔ کسی نے جاتے ہوئے تمہارے قدموں کی آہٹ بھی نہ سنی ۔ اور تم کسی سے ملے بغیر اتنے لمبے سفر پر چلے گئے ۔ میرے دل کو ابھی تک یقین نہیں آیا ہے کہ تم جیسا پیارا اور معصوم انسان ایسی بے رخی بھی دکھا سکتا تھا ۔؟ مگر پھر بھی لوگ یہی کہہ رہے ہیں کہ "تم سچ مچ ہمیشہ کے لیے ۔ اکیلے ۔ اتنے لمبے سفر پہ جا چکے ہو ۔!"

—طوفی — حیرت و حسرت کی بات تو یہ ہے کہ میں تم سے صرف دو فرلانگ کی دوری پر تھی مگر بدنصیبی کی انتہا تو یہ تھی کہ نہ تم کو اس بات کی خبر تھی کہ میں تم سے اتنی قریب ہوں، اور نہ میں ہی یہ جانتی تھی کہ تم لاہور سے اسلام آباد آئے ہوئے ہو! میں کراچی سے ۲۷ جون کی شام کو آ گئی تھی ۔ اور تم شاید ۲ یا ۳ جولائی کو اپنی کار سے اسلام آباد پہنچے تھے ۔!

۵ جولائی کی چھا جانے والی رات کے ۲ بجے پورٹ لینڈ اوریگن امریکہ سے اچانک شہلا کے نام سے فون آیا کہ میرے منجھلے بھائی ڈاکٹر خورشید کے ہارٹ کا بڑا کامیاب آپریشن ہو گیا ہے۔ پانچ بائی پاس ہوئے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ خورشید اچھے ہیں ۔ یہ میرے چھوٹے بھائی آفتاب کا فون تھا جو وہاں اوپن ہارٹ سرجن ہے ۔ دو سال پہلے بھی ہندوستان سے گئے اپنے بڑے بھائی پروفیسر عزیزہ کا آفتاب نے ہارٹ کا آپریشن کرایا تھا، ان کے تین بائی پاس ہوئے تھے اور پھر اتنا جلدی ایمرجنسی میں خورشید بھی آپریشن کرانے چلے گئے تھے ۲ بجے رات کو امریکہ سے خوشی کی یہ خبر آئی تھی ۔ ہمارے دلوں پہ سے فکر و غم کے سارے بوجھ اتر گئے تھے ۔

۵ جولائی کا سورج طلوع ہو چکا تھا — مگر نجانے کیوں دل پر ایک عجیب سی افسردگی طاری تھی —— ذہن پر غموں کے بادل چھائے جا رہے تھے ۔ ایک بھائی موت کے منہ سے کھینچ کر زندگی کے راستے پر لایا جا چکا تھا ۔ پانچ بائی پاس ۔ کچھ آسان آپریشن تو نہ تھا. پھر میں اتنی ناشکر گذار سی اپنے آپ کو کیوں محسوس کر رہی ہوں ۔؟ گھر بھر بڑا خوش ہو رہا تھا کہ آپریشن اتنا کامیاب ہوا — لیکن میں اپنے خدا کی شکر گذار ہو کر بھی ۔ نجانے کیوں بے چین بے چین سی تھی، —؟ جیسے دل کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو ۔ آنکھیں جلتی جا رہی تھیں، اور بار بار ایسا لگتا تھا کہ دل ڈوبا چلا جا رہا ہے۔ گھڑی گھڑی تکیہ میں منہ دیئے سوتی رہی ۔ نیند نہیں آنے پر بھی آنکھیں بند کئے دنیا سے کٹی —— اپنے آپ سے بیزار بیزار سی پڑی رہی ۔ شائد ہندوستان یاد آ رہا تھا۔ اپنا وطن چھوڑے کئی مہینے ہو رہے تھے ۔ سبھی لوگوں سے ملنا ملانا ہو چکا تھا ۔ اسلام آباد میں گرمی بھی تو بڑی شدید پڑ رہی تھی —" سوچا اسی تپش نے نڈھال کر رکھا ہے ۔ زمین و آسمان انگاروں کی طرح دھک رہے تھے ۔ کمال ہے ۔ اس جگہ کا بھی — سردی کی بھی انتہا ہوتی ہے ۔ اور اب گرمی بھی اس انتہا تک — اے کولر کے باوجود اوپر کی منزل میں "جل بن مچھلی" کی طرح تڑپ رہی تھی ۔!

شام کی چائے پی گئی ۔ گھر کے سارے لوگ نیچے تھے ۔ بس ایک اکیلی میں اوپر تھی ۔ نیچے شام کا نیوز ہو رہا تھا ۔ چند لمحوں کے بعد

زینے پر کئی قدموں کی دھمک سی ہوئی میرے پاس آتے آتے آہٹیں بڑی مدھم سی ہوتی گئیں۔ اپنی بیٹی نوشی کے ساتھ شہلا بھی سر جھکائے آکر میرے قریب کھڑی ہوگئی تھی — دونوں کے چہرے اداس تھے وہ ایک دوسرے کو خموش نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں "کیا ہے بھئی؟" میں نے اکتائی ہوئی آواز میں پوچھا —! نوشی گھبرا گئی بولی — "امی — ابھی ٹی وی کا نیوز بہت خراب تھا" "کیا ٹیلنہ میں دانشت ہو رہا ہے؟" میرا دل دھڑک اٹھا۔ "نہیں! — وہ طفیل ماموں" —!" نوشی اتنی سی بات کہہ کر خاموش ہوگئی ——

"کیا ہوا طفیل کو —؟ کیا بیمار ہوگئے ہیں؟ —!" شہلا اسی طرح سے خاموش تھی، مگر آنکھیں بھیگی بھیگی سی تھیں "آج صبح بہت سویرے — یہیں اسلام آباد میں — ان کا — . . . ہارٹ فیل ہوگیا —!" "کیا؟ — کیا طفیل چلا گیا —؟ ہارٹ فیل بھی ہو سکتا تھا — تو پھر — وہ —— وہ بائی پاس! —— تین اور پانچ بائی پاس فیل بھی ہو جاتے ہیں ——! میں کرسی پر گر پڑی — میرا دل ہواؤں کی طرح اڑا جا رہا تھا — مگر پھر بھی میرا ہارٹ فیل نہ ہوا — وہ چلتا ہی رہا — اور میں لمحوں میں دنیا سے کٹ کر اندھیری وادیوں میں ٹھوکریں کھاتی رہ گئی — طفیل سچ مچ چلا گیا — مگر وہ یہاں آیا کب تھا؟ ستارۂ امتیاز تو اس کو مارچ ہی میں مل چکا ہے۔ — اس کو یہاں آنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ کسی دشمن نے یہ غلط خبر اڑائی ہوگی —— ایک پل کے لیے دل کو قرار آگیا — مگر پھر وہی بےچینی —— وہی اضطراب — ٹی۔ وی پر ایسی خبر کہاں سے آسکتی ہے —— میرے خدا! یہ کیا ہوگیا — ابھی تو بہت سے ادھورے کاموں کو اُسے مکمل کرنا تھا — دل و دماغ میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی — جس آگ نے مجھ کو، میرے گھر کو، میرے آرام و آسائش، میری خوشیوں اور میری شخصیت تک کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ جبکہ لمحے لمحے کی موت مرتے ہوئے اختر نے آخر کار دائمی سکون حاصل کر لیا تھا اور میں — حقیقتوں کو جانتے ہوئے بھی مہینوں بیقرار سی تڑپ تڑپ کر اس بات پر یقین کرتی رہی کہ ۱۹۳۴ء میں اٹکی سینیٹوریم کے نوٹربی وارڈ کے برآمدے کے، ایک اسپیشل بیڈ پر خون تھوکتے ہوئے اپنے اختر کو جس طرح سے پایا تھا پھر سے پا لوں گی، —— !! میں سکھوا اور ساگوان کے گھنیرے جنگلوں میں سے پھر اپنے اختر کو ڈھونڈ لوں گی"! اور اب ٹی وی کی اس منحوس خبر کو سن کر بے اختیار میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں دیوانہ وار گڑھی شاہو کے اس مکان میں جا کر تمہیں پا لوں — گڑھی شاہو کے اسی مکان میں، میں نے تمہیں پایا تھا —— ۵۷ء کی گرمی میں پہلی بار میں پاکستان آئی تھی۔ چند سالوں سے میری تم سے خط و کتابت نقوش کے ذریعے ہو رہی تھی — تم مجھے "بہن" کہہ کر خط لکھا کرتے تھے — اور میں تم کو "طفیل صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی —! بڑے آداب والے خط ہوا کرتے تھے — اور تمہارے خط میں خلوص و آداب کی بڑی پیاری چاندنی چھٹکی رہتی تھی۔

—— آج وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں — لمحہ لمحہ نگاہوں کے آگے سے جھلکتا ہوا گذر رہا تھا۔

میری آنسوؤں بھری آنکھوں میں تمہارا گڑھی شاہو کا گھر تھا۔ تم لوگ اوپر کی منزل میں تھے۔ تمہارے چاروں بیٹے چھوٹے چھوٹے سے تھے سب سے چھوٹا اخلاق صرف ڈیڑھ دو سال کا تھا۔ دبلا پتلا جاوید سب سے نکلتا ہوا لگتا تھا۔ اس بچے کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ چھائی رہتی تھی —!

تم کو دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا تھا کہ، تم بہت بھولے بھالے اور سادہ سے انسان ہو —! خاموش رہ کر بھی تمہاری آنکھیں اور تمہارے لب بڑے گویا نظر آتے تھے، ہنستا، مسکراتا اور بہت ہی اپنائیت کا اظہار کرتے والا تمہارا چہرہ دیکھ کر۔

دل کو بڑی خوشی محسوس ہوتی تھی — میں نے تمھیں دیکھتے ہی سوچا کہ اب تک جو میں تم کو طفیل صاحب کہہ کر خط لکھا کرتی تھی، وہ بالکل غلط تھا — ! تم تو مجھ سے چھوٹے تھے — چند سال تو یقینی چھوٹے تھے، تمہاری بیوی بہت پیاری اور بہت معصوم سی تم پر جان چھڑکنے والی نظر آئیں — مجھ سے بڑے پیار سے ملیں — اخلاق کی پتلی — اور محبت کی دیوی ! گھر کے سارے لوگ چار چھوٹے بیٹوں کے ساتھ تم میاں بیوی، ایک تمہارا چھوٹا بھائی اکرم ایک اکرم کی بیوی جو کہ تمہاری بیوی کی سگی بہن تھی — بس یہی تھے — ! اور سب ہی پُرخلوص لوگ تھے اور بہت ہی سادہ سے !!

ایک دوسرے سے ملتے ہی ہم لوگ ایسے شیر و شکر ہوئے جیسے برسوں سے ملتے چلے آ رہے ہوں۔ تم نے بڑی خوشیوں کے ساتھ کہا تھا — میری کوئی اپنی بہن نہیں ہے — آج اللہ نے آپ کی صورت میں مجھے ایک بڑی بہن دے دی ہے اور اسی دن سے تم مجھے آپا کہنے لگے تھے —

تم صبح ناشتے کے بعد کبیر اسٹریٹ نقوش کے دفتر چلے جاتے تھے اور میں سارا دن تمہارے خاندان کے ساتھ ہنستی بولتی — گپیں کرتی رہتی تھی — ایک دن میں تمہارے ساتھ کہیں باہر سے آ رہی تھی — سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں نے تمہارے گھر والوں کی پنجابی زبان میں فراٹے سے باتیں کرتی ہوئی آوازوں کو سنتے ہوئے کہا تھا "یہ گھر نقوش والے طفیل کا نہیں لگتا — شاید ہم غلطی سے کسی دوسرے کے گھر پہنچ گئے ہیں" — ایک معصوم سی ہنسی تمہارے چہرے پر آئی "ہاں آپا — ! میں بھی جب نقوش میں گم رہتا ہوں تو اس گھر میں آ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ کسی اجنبی کے یہاں آ گیا ہوں —" ہم دونوں ایک ہی ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے —

کرشن شاہ کے مکان میں ایک ساتھ آگے پیچھے پانچ کمرے تھے جیسے آگے ایک کھلی چھت تھی، بس ! ایک چھوٹا سا کچن اور ایک باتھ روم تھا — اس گھر میں رہتے ہوئے تم کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ تم سے پہلے اس میں شوکت تھانوی رہا کرتے تھے۔

گرمیوں کے دن تھے سارے لوگ چھت پر سویا کرتے — لیکن میں کمرے میں سوتی تھی — رات تمہارے دفتر سے آ جانے کے بعد دیر دیر تک باتوں کا سلسلہ چلتا چلا جاتا تھا — تمہاری بیگم باتیں کرنے میں بہت تیز تھیں — پنجابی کی طرح اردو بھی بہت روانی سے بولتی تھیں — اور — اور طفیل ! تم بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے ہماری باتوں کو سنتے رہتے تھے کبھی کبھی — کوئی مزے دار فقرہ کہہ دیتے — میں بہار کے شہر اور دیہاتوں کے قصے سناتی — شادی کے لوک گیت بچوں کی پیدائش کے گانے — برہا (جدائی)، پھاگن اور چیت کے تڑپتے ہوئے گانے "بدیسیا" کے مشہور برہن کے گیت سناتی اور اُن کے معنی بتاتی — اپنے میاں اختر اورینوی کی باتیں کرتی، لکھنے پڑھنے، ہنسنے بولنے سے لے کر سارے خاندان کی باتیں کرتی رہتی — رات کے کبھی دو — دو بج جاتے تھے بازی لگا کر تاش کھیلتی — تم چائے بنانے پر سو سو روپے کے لالچ دیتے مگر تمہاری بیگم اپنی جگہ سے مس سے مس نہ ہوتیں — توبہ ! ان دنوں چولہے بھی بڑی مصیبتوں کے ہوا کرتے تھے — !

صبح سویرے بیگم طفیل اپنے دونوں ہاتھوں میں پیتل کی دو چمکتی ہوئی بالٹیاں پکڑے ہمارے درمیان آئیں — بڑے پیار سے بولیں — آپا — بتائیں — نمکین لسی دوں یا میٹھی —" ارے بیگم ! یہ لسی وسی نہیں چلے گی میں تو ناشتا پیوں گی نہیں بھئی !

کھاؤں گی"۔ یہ پینے والی بات ہمارے یہاں شام کو چلتی ہے۔ سمجھ گئیں نا؟ میں نے یہ بات مذاق سے انھیں چھیڑنے کو کہی تھی مگر دیکھا کہ تم لاہور کی مشہور گرما گرم پوریاں حلوے اور پتا نہیں کیا کیا لیتے چلے آ رہے ہو۔

ایک صبح میں سب لوگوں کے ساتھ تمہارے کچن میں بیٹھی تھی گرم گرم مزیدار پراٹھے پک رہے تھے چائے تیار ہو چکی تھی۔ اسکول جانے والے بچے وہیں پر چائے اور پراٹھے کا ناشتا کر رہے تھے۔ کچن کے اندر بڑی پُرلطف باتیں ہو رہی تھیں اچانک میں نے تمہاری بیگم سے پوچھا! تم نے کبھی طفیل کے پیسے چرائے ہیں؟ بھی بے اختیار ہنس پڑے۔" نہیں آپا جی! کبھی ڈھیلے کی بھی چوری نہیں کی ہے۔ سارے پیسے تو میرے ہی پاس ہوتے ہیں۔ پھر کیا ضرورت پڑی ہے۔؟ میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم زندگی کی بہت بڑی لذت سے اب تک محروم ہو" تمہاری بیوی بچاری حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگی "سنو جب کبھی موقعہ ملے میاں کے پیسے چرا لیا کرو۔ ارے —! اس چوری میں جو مزہ ملتا ہے۔ تم کیا جانو۔؟ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اختر صاحب نہانے کے لیے جیسے ہی باتھ روم گئے میری نگاہیں الماری کے اوپر رکھی ان کی چابی کے گچھا پر پڑیں — پھر مجھ سے رہا نہیں جاتا ہے۔ میں گھر کی کسی بچی یا کسی کو بھی لا کر اس سے الماری کھلواتی ہوں۔ کمبخت گوڈریج کی وہ الماری ہزار احتیاط پر بھی کھلنے کی آواز ضرور دیتی ہے۔ اندر سے پانی کے گرنے کی جب تیز آواز آنے لگتی ہے جب ہی الماری کی آواز باتھ روم میں سنائی نہیں دیتی ہے۔ بس پھر لا کر کھول کر نوٹوں سے بھرا ہوا ڈبہ نظر کے سامنے ہوتا ہے، اَب اپنی چوری چھپی رہنے کے لیے اتنا ہی نکالتی ہوں کہ پتا نہ چلے۔ الماری بند کر کے چابی وہیں پر رکھ دیا کرتی ہوں جہاں پہلے تھی — ان نوٹوں کو پا کر جو خوشی ہوتی ہے وہ ہزاروں روپے پانے پر بھی نہیں مل سکتی ہے، اگر یہ منحوس بجٹ —! اسی نے مجھے ہمیشہ سے تباہ کر رکھا ہے۔ کچھ ہفتوں کے بعد جب کبھی بجٹ پر اختر صاحب کی نظر جاتی ہے اور وہ حساب کا منہ سے منہ ملانے لگتے ہیں اس وقت ان کی پریشانی کا عالم بس دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ حساب در حساب کر لینے پر بھی جب اتنے غائب ہوئے روپوں کا پتا نہیں چلتا تو سیدھے میرے پاس آتے ہیں۔" تم نے میری الماری سے روپے نکالے ہیں؟ — صرف ہاں کہہ دو — پھر میری تسکین ہو جائے گی" وہ بچارے ایسی بیچارگی سے بولتے ہیں کہ افسوس آ جاتا ہے —" آپ مجھ سے قسم لے لیں۔ جو میں نے آپ کی الماری کھولی بھی ہو کبھی۔ اختر صاحب کی بدحواسی دیکھ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بجٹ اور حساب۔! مجھے انہی باتوں سے غصّہ آتا ہے۔ اور چوری — تو ویسے بھی میاں کی چوری جائز ہی ہوگی۔!"

باورچی خانہ ہنسی اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ اچانک تولیہ سے بال خشک کرتے ہوئے، تم ہنستے ہوئے آ گئے" آپا۔ میں باتھ روم میں آپ کی ساری باتیں سن رہا تھا — بڑی مہارت رکھتی ہیں آپ چوری کرنے میں" — ہنسی کے مارے تمہارا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔! میری بیوی کو تو چوری کرنا مت سکھائیے۔ ورنہ! اس غریب کی لٹیا ہی ڈوب جائے گی —!"

اتوار کا دن بڑا اچھا گزرتا تھا۔ کبھی لارنس گارڈن کبھی شملہ پہاڑی۔ کبھی ہاجرہ اور خدیجہ کے یہاں۔ ایک بار احمد ندیم کے گھر بھی گئے — جب تک تمہارے گھر میں رہی — روزانہ صبح سویرے، میری خاطر تم خود ہی بکرے کا گوشت لانے چلے جاتے تھے۔ مجھے اس بات سے بڑی تکلیف ہوتی تھی — بار بار تم کو منع کیا۔" طفیل — بھیا! ایسا مت کرو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ نقوش

کا خالق گوشت خریدتا پھر رہا ہے۔"

"— تو پھر کون سی اس میں بُری بات ہوئی — ! ؟ میں تو خاص طور پر قصاب سے کہتا ہوں — بھائی ! مجھے خوب عمدہ گوشت دینا میری آپا انڈیا سے آئی ہوئی ہے ! " اور میں تمہارے بھولے بھالے معصوم چہرے کو دیکھ کر یہی سوچتی رہ جاتی تھی کہ فرشتے اس سے زیادہ تو معصوم نہیں ہوتے ہوں گے — !

ایک دن تم مجھے اپنے ساتھ نقوش کے دفتر لے گئے۔ اُس کوٹھری کی زمین اور چاروں کونے قسم قسم کی کتابوں، رسالوں اور اخباروں سے اَٹے پڑے تھے۔ افسانوں، غزلوں اور مضامین سے سامنے کا میز بھرا ہوا تھا، ہم دونوں چائے پیتے رہے اور حالاتِ حاضرہ پر باتیں ہوتی رہیں — اس درمیان میں کئی شاعر اور ادیب آتے رہے، حفیظ جالندھری کو بھی میں نے پہلی بار وہیں دیکھا تھا۔ جب میں تمہارے ساتھ واپس جانے لگی تو تم نے اپنے نقوش کے کاتبوں کو دکھا کر مجھ سے کہا تھا — "آپا — اپنے والد کے فوت ہو جانے پر اپنی چھوٹی سی عمر میں ایک مشہور کاتب زرّیں رقم کے پاس بیٹھ کر اسی طرح میں بھی کتابت کا کام کیا کرتا تھا — ! دن بھر میں مجھے بارہ آنے مل جاتے تھے جو میں اپنی ماں کے ہاتھوں پہ رکھ دیا کرتا تھا۔" میں نے تمھیں سر سے پاؤں تک بڑی عقیدت کی نگاہوں سے دیکھا — بے اختیار میرا سر ربِ عظیم کے آگے جھک گیا — آقا ! — آج تو نے اپنے طفیل کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔" اور طفیل ! تم نے اُس چھوٹے سے کاتب لڑکے کو ابھی تک کتنے فخر کے ساتھ یاد رکھا ہے۔" آج تک خوشی سے دمکتا ہوا تمہارا چہرہ مجھے یاد ہے — ؟

پھر ۱۹۶۰ء کے نومبر کے اخیر میں ۱۲ بجے دن کو جب لاہور کے اسٹیشن پر انڈیا کی لال ٹرین رکنے لگی تو میں نے دور ہی سے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر تم اور سہیل مجھے لینے کو آئے ہوئے ہو۔ مجھ کو پہلے ہی تمہارے اور شہلا کے خط سے اس بات کی خوش خبری مل چکی تھی کہ شہلا کے میاں سہیل سے تم لوگوں کے بڑے اچھے تعلقات ہیں — تم دونوں کو دیکھ کر میرا دل خوشیوں سے جھوم اُٹھا —

تم لوگ مجھے مال پر مشہور ہوٹل نیڈوز کے ایک سوئٹ میں لے آئے تمہاری دلہن اور شہلا دونوں مجھ سے لپٹ گئیں — پاس ہی کوٹ پر ننھا بچہ سو رہا تھا — "خدا کا شکر ہے کہ میرے آنے سے پہلے یہ مرحلہ ختم ہو چکا تھا — میں نے بڑے سکون کی سانس لی — !

طفیل میں نے تم کو دو سالوں پہ دیکھا تھا — تم کچھ اور نکھر گئے تھے۔ مسکراہٹیں تمہارے چہرے پر سجی رہتی تھیں — آنکھوں میں پیار بھرا تھا — نقوش کے کتنے ہی شاندار نمبر اب تک تم نکال چکے تھے !

نیڈوز کے اس تین منزلہ ہوٹل میں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔ شہلا کا اک بڑا ہی مختصر سا خاندان تھا — دو میاں بیوی اور تین سال کا بیٹا منّو ——— اور ایک ننھا سا بچہ "بابا" — مکان کی قلت کی وجہ سے کچھ سی — ایس — پی افسروں کو اسی ہوٹل میں جگہ دے دی گئی تھی — سامنے کھلے میدان میں ہرے ہرے گھانس کا فرش بچھا تھا جس کے کناروں پر سیزن فلاور جھکے ہوئے تھے، ہوٹل سے قریب ہی الحمرا میں کرسنتھیم کی نمائش کا چہل پہل بڑا اچھا لگتا تھا۔

تم اپنی بیگم کے ساتھ ہر دو دنوں کے بعد ہلکا اندھیرا ہوتے ہی وکٹوریہ (جس کو ہم لوگ فٹن کہا کرتے ہیں) بابا بہت ہی اچھے تانگے پر آجاتے تھے — دسمبر کی کڑاکے والی سردی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی — لیکن شہلا اور تم لوگوں کو میرے آنے کی اس قدر خوشی تھی کہ میں اپنی سردی کی تکلیفوں کو بھی بھول جایا کرتی تھی — جب بھی تم لوگ آتے اپنے ساتھ — گرما گرم قیمے کا کباب

اور گاجر کا حلوہ ضرور لاتے ۔ کبھی ان کے ساتھ اور بھی بہت سی چیزیں ہوا کرتی تھیں ۔ ہم سب ایک ساتھ مل کر اُن چیزوں کا مزہ لے لے کر کھاتے تھے اور ساتھ ہی دنیا بھر کی باتیں بھی کرتے جاتے تمہارے نقوش کی باتیں ۔ اس کے یادگار نمبروں، شاعروں، ادیبوں کی، پنجابی اور بہاری کی باتیں ۔ جگہ جگہ کے رسم و رواج لہجے محاورے تہذیب و تمدن غرض کہ ساری دنیا کی باتیں کئے جاتے ۔ اسی طرح ایک دن تم نے مجھ سے کہا تھا ۔" آپ اپنے افسانوں میں بہت کم پیرا بدلتی ہیں ۔ کیا لکھتے لکھتے نیند آجاتی ہے ؟"

" ارے بھئی یہ سارا قصور میرے بیان کا ہے ۔ میں نہیں سوتی ۔ وہی سوئے رہتے ہیں ۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ مجھے ابھی تک اپنے اوپر اعتماد نہیں آیا ہے جو کچھ بھی لکھتی ہوں ، جب تک اختر کو سنا نہیں لیتی چین نہیں پڑتا ۔ ان کے افسانہ سننے کا وقت یونیورسٹی سے آنے کے بعد ریسٹ کرنے والا ہوتا ہے ۔ اگر داہنی طرف بیٹھ کر افسانہ سناتی ہوں تو وہ بائیں طرف کروٹ لے لیتے ہیں ۔ اور جو بائیں طرف بیٹھ گئی ۔ تو وہ داہنی طرف ہو جاتے ہیں ۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں ۔ کبھی ان کو سویا ہوا سمجھ کر پڑھنا بند کرتی ہوں تو فوراً ہی کہتے ہیں پڑھتی جاؤ ۔ بیچ بیچ میں کچھ ٹوکتے بھی جاتے ہیں ۔ مؤنث مذکر کی طرف بھی دھیان رکھتے ہیں ۔ پیرا بدلنے کا بھی پوچھ لیتے ہیں ۔ مگر اسی طرح سوئے سوئے سے ۔ اب میرا کیا قصور کہ کہاں کہاں پر اور پیرا بدلنا چاہیے تھا ۔؟

ہر ہفتہ اور کبھی دو چار دن پر تم لوگ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے ۔ دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی سردی ۔ نو بجتے ہی رات کا ایسا سناٹا ہو جاتا جیسے آدھی رات ہو گئی ہو ۔ جاڑوں کی ٹھنڈک اور دھلی ہوئی چاندنی میں، مال کی پرسکون چمکتی ہوئی سڑک پر تانگہ میں جتے صحت مند اونچے اور خوب صورت گھوڑے کے پُروقار ٹاپ کی آواز بہت پیاری لگتی تھی ۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم ستاروں کی دنیا میں جا رہے ہیں ۔

تم اس وقت بھی گرمی شاموں میں ہی رہتے تھے ۔ جہاں کا چپہ چپہ آج بھی میری نگاہوں میں بس رہا ہے ۔ تم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے عاشق تھے ۔ دونوں سادگی پسند بھولے بھالے، پُرخلوص ۔ خوش حالی اور اقبال کے طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ کر بھی ۔ تم لوگوں نے سر اٹھا کر چلنا نہیں سیکھا تھا ۔ !کتنا انکسار تھا تمہارے لہجے میں ۔ ایک دن میں نے تمہارے چھوٹے سے دفتر کے کونوں میں کتابوں کے بے ہنگم سے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے تم کو ڈانٹا تھا ۔" کمال ہے بھئی تمہارا ۔ ایسا ہی دفتر ہوتا ہے ؟ کیا کہتے ہوں گے لوگ اس کباڑ خانہ کو دیکھ کر ۔ ارے بابا اس چھوٹی سی کرسی پر بیٹھے ہوئے تم کچھ بھی اچھے لگ رہے ہو ۔ ؟ نقوش کے لائق اس کا دفتر بناؤ ۔" اور تم مجھ کو بڑی سنجیدگی سے یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ بس یہ بڑا اچھا دفتر ہے ۔ یہاں چوٹی کے ادیب دانشور آتے رہتے ہیں ۔ اگر کبھی فرصت ملی تو ان سب آنے والوں کی یاد میں ایک کتاب لکھوں گا ۔ عنوان رکھوں گا ۔ خوش آمدید ۔" ٹھیک ہے نا ۔" ۔ اور میں ۔ تم کو بڑے پیار ۔ اور کچھ عقیدت سے بھی دیکھتی ہوئی ۔ بولی ۔

طفیل ! تم جہاں بھی رہو گے بے حد اچھے رہو گے اور اس دفتر میں تم گدڑی کے لال ہی کہے جا سکتے ہو ۔

جنوری آتے آتے اختر صاحب نے میری واپسی کے لیے بہت شور مچا دیا ۔ پہلے خط پھر ٹیلیگراموں کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔

یہ سب دیکھ کر تم اختر صاحب سے ہی بیزار ہو گئے۔ یہیں گھبرا گئے۔ شہلا کے ٹپکتے آنسوؤں اور تمہاری ناراضگی کے باوجود آخر میرے جانے کا دن آ ہی گیا۔ تم ایک دن قبل اپنی بیگم کے ساتھ آئے تھے۔ کسی نے تم کو کہہ دیا تھا کہ میں کچھ دنوں کے لیے ٹھہر گئی ہوں۔ مگر جب تم کو معلوم ہوا کہ میں کل سچ مچ جا ہی رہی ہوں، پاسپورٹ میں ڈپارچر تک لکھا جا چکا ہے۔ یہ سن کر تمہارا چہرہ اتر گیا۔ پھر تم مجھ سے کچھ نہ بولے۔ میں نے تمھیں بڑی تاکید کی تھی کہ مجھے رخصت کرنے ضرور آؤ گے۔ جب تم جانے لگے تو بڑے دکھ سے بولے "اچھا ـ آپا ! ـ خدا حافظ ـ !

میں نے پھر یاد دلائی ـــ کل بھی خدا حافظ۔ کہنا یاد ہے نا؟ ـــ

انڈیا کے لیے لاہور سے ایک بجے دن کو ٹرین کھلتی تھی۔ میں نے صبح ہوتے ہی تم کو گھر پہ فون کیا۔ کوئی جواب نہیں ـــ پھر تمہاری بیوی کو فون کیا کہ طفیل سے کہہ دیں گی اگر وہ اسٹیشن نہ جا سکیں تو ابھی نیڈوز ہی میں تم لوگ آ کر مجھے مل لو معلوم ہوا وہ آفس جا چکے ہیں۔ دفتر میں فون کیا۔ کوئی جواب نہیں۔ شہلا نے طفیل کو فون کیا ـــ مگر وہی خموشی، آخر ۱۱ بج گئے ـــ میں نے دفتر میں پھر سے فون کیا مگر ریسیور سے سوں سوں کی آواز آتی رہی۔ تب میں نے سمجھا کہ تم نے گھر سے لے کر دفتر تک کے فون ڈیڈ کر کے رکھ دیئے تھے ـــ

میرا دل خود ہی بڑا پریشان تھا اتنی چھوٹی سی بہن دو چھوٹے چھوٹے بچوں اور تم لوگوں کو چھوڑ کر ایک ایسے ملک چلا جانا جہاں سے بار بار آنا ممکن نہیں تھا۔ آخر دل پہ بہت بڑا بوجھ لے کر میں لاہور سے رخصت ہو گئی ـ !

۶۱ء کے اخیر فروری میں تمہارا آنا دہلی سے آیا کہ تم پٹنہ پہنچ رہے ہو۔ اللہ ـــ طفیل وہ دن ہم لوگوں کے لئے کتنی خوشیوں کا تھا۔ صبح بہت سویرے ہم لوگ تم کو لینے اسٹیشن پہ گئے۔ رضا نقوی واہی بھی ہمارے ساتھ تھے پٹنہ سے پہلے آرہ اسٹیشن پہ میری چوتھی بہن عذرا تم سے ملنے آئی اور پھر تمہارے ساتھ ہی پٹنہ آ گئی۔ عذرا تم سے لاہور میں ۵۹ء ہی کو مل چکی تھی۔ بڑے آب و تاب کے ساتھ پلکوں کے سائے میں ہم لوگ تم کو لے کر آئے۔ نمبر ۸ چھجو باغ پٹنہ کی رونق بس دیکھنے کے لائق تھی۔ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا صرف ایک خوب صورت سا خواب۔ اختر بڑے پیار سے ملے۔ پھر دیر تک ملنے ملانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں بھی تم سے ملنے آ گئی تھیں، ایک دن یونیورسٹی میں تم بلائے گئے ـــ رضا نقوی نے اپنے گھر دعوت دی۔ گھر کے بچے اور بچیاں تم کو دیکھ کر اور تم سے مل کر نہال نہال ہو رہے تھے۔ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر آفتاب نے اردل کا پروگرام بنایا کیونکہ اباجان سے ملنا ضروری تھا۔ پٹنہ سے صرف ۵۰ میل پر ہم لوگوں کا گھر تھا دو گھنٹے میں ۱۰ بجے رات کو اردل پہنچ گئے۔ میرے منجھلے بھائی ڈاکٹر خورشید اور اباجان تم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اباجان نے تم کو اپنے بیٹے کی طرح بڑے پیار سے اپنے سینے سے لگایا۔

تم وہاں جو بھی بیٹے سمجھے جا رہے تھے۔ ہم لوگ چائے پیتے ہوئے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ سویرے ہی تم کو خورشید اور آفتاب نے سون ندی، نہر، کھیتوں کھلیانوں، شیشم کے جھنڈ، تاڑ کے قطاروں، آم کے باغوں اور ریت کے سنہرے ٹیلوں کی سیر کرا کرا کے تھکا دیا تھا۔ اباجان کے ساتھ ہم لوگوں نے مل کر ناشتا کیا۔ پھر اباجان کی بہت سی دعائیں لے کر ہم لوگ پٹنہ

واپس آگئے۔ اختر صاحب اور گھر کے سارے بچے گھر پر موجود تھے۔ شائد وہ اتوار کا دن تھا۔ یا کوئی چھٹی ہوگی۔ رات کو بچوں نے اپنے اسکولوں کا ایک انگریزی ڈرامہ کرکے تمہیں دکھایا۔ تمہاری اتنی تعریفیں سن کر وہ سب پھولے نہیں سمارہے تھے۔ یہی تمہاری میرے گھر میں آخری رات تھی۔ تم نے وعدہ تو بہت کیا تھا کہ "اطمینان سے اپنے خاندان کے ساتھ آؤں گا" مگر وہ مبارک دن کبھی نہ آیا۔ اختر صاحب کو بھی تمہاری اتنی جلدی واپسی کا بڑا افسوس تھا، تمہارے اعزاز میں وہ اپنے گھر پر بہت بڑی دعوت دینے والے تھے۔!

سب لوگوں کے ساتھ اپنے آنسوؤں کو روکے ہوئے تمہارے کمپارٹمنٹ کے پاس کھڑی تھی۔ مگر جب ٹرین کے دروازے پر سے تمہارا ہلتا ہوا ہاتھ او جھل ہوگیا تب ایک ہی دفعہ میری آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو بہت دیر تک بہتے چلے گئے۔!

ہمیشہ کی طرح تمہارے بہت اچھے بہت پیارے پیارے خطوط آتے رہے۔ اور وہ دو نقوش میرے اور اختر صاحب کے نام سے آتے رہے تھے، ۱۹۶۱ء کی جولائی میں سہیل کی ٹرانسفر ڈھاکہ ہوگئی۔ اور اسی ۱۹۶۱ء کے ۸ر اکتوبر کو ابا جان پٹنہ کے ہوسٹل میں ہم لوگوں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ ابا جان کے غم نے ہمارے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خصوصیت سے میں زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ شائد اس لیے کہ میں سب سے بڑی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں اماں جان کی موت نے ابا جان کے زمینداری کے شاہانہ مزاج کو بدل کر ان کے اندر ماں کی محبت بھی پیدا کر دی تھی۔ دس سالوں کے بعد ایک ہی بار ہم سارے نو بھائی بہنیں یتیم ہوگئے تھے!

ماموں جان پہلی بار پاکستان جارہے تھے۔ میں نے بھی ویزا منگا لیا تھا، اختر صاحب نے بھی چند ہفتوں کے لیے مجھے جانے کی اجازت دے دی تھی، ماموں جان اور ان کے بیٹے کے ساتھ امرت سر سے میں بھی پہلی بار بائی روڈ لاہور جارہی تھی معلوم ہوا کسٹم بہت سخت ہورہا ہے۔ یہاں تک کہ فاضل روپے بھی نہیں جانے دے رہے ہیں۔ اٹاری میں بڑی نرمی تھی۔ یہ واگہ کی بات تھی۔ جب میری باری آئی تو ایک کسٹم آفیسر نے کہا کہ "آپ اتنے جوڑے کپڑے نہیں لے جاسکتی ہیں۔ بس چار جوڑے رکھ کر سب یہاں جمع کرا دیں واپسی پر آپ کو مل جائیں گے"۔

"۔ کیا۔؟ میں ایک مفلس کی طرح آپ کے ملک میں پہنچوں؟۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا ہے۔ جائیے اپنے بڑے آفیسر کو بلا کر لائیے۔ میں جاؤں گی تو اپنے سارے کپڑوں کے ساتھ جاؤں گی"۔

اس نے کہا کہ "ابھی بوڈر سکیورٹی فورس کی میٹنگ ہورہی ہے۔ وہاں پر کوئی نہیں جا سکتا"۔

"جیسے ہی میٹنگ ختم ہو آپ میری باتیں وہاں پہنچائیں" میں نے کہا۔

وہ گیا اور کچھ دیر کے بعد آکر کہنے لگا "۔ جائیے آپ کو وہاں بلایا گیا ہے"۔ جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوئی دیکھا ایک بہت بڑی میز کے گرد پندرہ بیس ملٹری آفیسر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پوچھا "کیا شکایت ہے آپ کو؟"

"۔ ایک مہمان کی حیثیت سے چند ہفتوں کے لیے آپ کے ملک جارہی ہوں۔ کسٹم والے کہہ رہے ہیں کہ میں صرف چار جوڑے کپڑے لے کر جاؤں اور بقیہ کپڑے یہاں جمع کرا دوں"۔ اس پر ایک ملٹری افسر نے کہا "وہ ٹھیک ہی کہتا ہے"۔

"یہ کہاں کی مہمان نوازی ہے؟ میں بہار سے اتنا لمبا سفر کرکے آرہی ہوں۔ کیا یہی اسی ہزار بہاریوں کے خون کا بدلہ مجھے

مل رہا ہے ہمارے پاس قائدِ اعظمؒ کا تار ابھی تک بڑے حفاظت سے رکھا ہوا ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ "آج بہاریوں کے خون سے ہمیں پاکستان مل گیا ہے"۔ مگر آج ہم چند جوڑے کپڑے بھی نہیں لے جا سکتے۔ اس کے ساتھ یہ بھی سن لیجئے کہ آپ کی اسی فوج میں خود میرے کتنے عزیز اونچے سے اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔ اور میں ان کے نام اور عہدے بتاتی چلی گئی — بریگیڈیر سراج، کرنل عباس۔ لفٹیننٹ کرنل قمر الہدیٰ۔ کرنل صابر ملک۔ کرنل انصاری — غرض جتنے نام یاد تھے سبھی سنا دیئے ———

پھر میں نے ان سے کہا "آپ نے رسالہ 'نقوش' تو ضرور دیکھا ہوگا۔ اس کا اڈیٹر محمد طفیل میرا بھائی ہے — اب میں آپ کو اور کیا کیا بتاؤں؟

فوجیوں میں سے ایک نے کہا "ٹھیک ہے میں آپ کی شکائت دور کرنے کی کوشش کروں گا"۔

میں واپس آ گئی — دو منٹ کے بعد وہی کسٹم آفیسر آیا اور بولا "آپ کو اجازت ہے اپنا سارا سامان لے جا سکتی ہیں ——— !"

اسی وقت ٹیکسی سے ہم لوگ لاہور آ گئے ——— دن کے ۳ تین بج رہے تھے۔ میں نے ہوٹل کے فون سے تمہارے آفس میں فون کیا "طفیل صاحب ہیں"؟ میں نے اپنی آواز بدل دی تھی "ہاں جی — فرمائیے — بول رہا ہوں —" بس یہی پوچھنا تھا کہ آپ اس وقت کیا کر رہے ہیں؟" "گاجریں کھا رہا ہوں"۔ تمہاری ہنستی ہوئی آواز آئی — اسی وقت میں بھی بے اختیار ہنس پڑی۔ شام ہوتے ہوتے اچانک ماموں جان کے ساتھ تم میرے کمرے میں آ گئے "آپا! السلام علیکم" "ارے تم کیسے آ گئے؟"

"لاہور میں رہتا ہوں جی — اور آواز پہچاننا بھی جانتا ہوں"!

دوسرے روز ماموں جان اپنے بیٹے کے ساتھ کراچی چلے گئے اور تم مجھ کو اپنے ساتھ گڑھی شاہو لے آئے۔ میں نے بڑے اطمینان سے تم لوگوں کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا "اب تو بھئی سمجھو کہ میرا یہ آخری بار ہی آنا ہے کس مشکل سے لڑ جھگڑ کر آئی ہوں۔ پھر میں نے تم کو ساری کہانی سنا دی، تمہارے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ کھِل رہی تھی۔ اسی وقت تم نے اپنا فون اٹھایا۔ —ہلو — ارے بھئی حفیظ۔ یار! یہ کیا قصہ ہے —؟ میری آپا! انڈیا سے آئی ہے واہگہ ہو کر۔ بڑا تنگ کیا ہے تمہارے کسٹم والوں نے وہ بڑی ناراض ہے۔ کہہ رہی ہے۔ اب کبھی نہ آؤں گی۔ اچھا — ہاں تمہاری طرف سے معافی مانگ لوں۔ اچھا یار — بہت اچھا"۔

فون بند کرتے ہوئے تمہارا چہرہ دمک رہا تھا — "آپا! وہ میرا دوست حفیظ کسٹم کا سپرنٹنڈنٹ ہے بڑا شرمندہ ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ آپا کی واپسی پر پہلے سے مجھے خبر دینا۔ میں خود انھیں رخصت کرنے کو موجود رہوں گا۔"

تم نے اپنے ایک دوست حیدر ملک کا تذکرہ کیا تھا جو نہ صرف یہ کہ بہاری تھے بلکہ اختر صاحب کے شاگرد بھی تھے — ایک دن وہ اپنی ماڈرن سی پنجابی بیوی کے ساتھ، اپنی نئی لمبی سی سیاہ رنگ کی کار پر آ گئے۔ بڑی عقیدت اور خلوص سے مجھے ملے — دو ہفتے بعد جب میں انڈیا واپس جانے لگی تو حیدر ملک اور ان کی بیوی عذرا نے بڑی نیاز مندی سے بوڈر تک پہنچانے کے لیے اپنی گاڑی پیش کی — طفیل اس گاڑی پر تم تھے، تمہاری بیگم تھیں اور میں تھی، اگلی سیٹ پر حیدر ملک ڈرائیو کر

رہے تھے اور عذرا کے پہلو میں تھیں۔ لاہور کی دوپہر مجھ سے چھوٹ رہی تھی اور ہم تینوں پچھلی سیٹ پر بڑے غمزدہ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پاکستان کی زمین پھسلتی ہوئی کم ہوتی جا رہی تھی۔ گاڑی کے اندر سبھی لوگ خاموش تھے۔ جیسے کسی میت کو دفن کرنے جا رہے ہوں۔ مستقبل نجانے کیوں اندھیروں میں ڈوبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں تمہارا دیا ہوا تحفہ نرگس کے پھولوں کا گلدستہ اپنی تیز خوشبو سے میرے ذہن کو بے حد منتشر کر رہا تھا۔ اگرچہ یہ بہت پیارے ہاتھوں کا تحفہ دیا ہوا تھا مگر اس تحفے کے ساتھ تم جیسے عزیزوں کی جدائی بھی وابستہ تھی۔ شاید اسی لیے اس کی الوداعی خوشبو مجھے اس قدر مضطرب کر رہی تھی۔!

واہگہ آ گیا تھا۔ حفیظ صاحب اپنے اسٹاف کے ساتھ کسٹم آفس کے لان میں چائے کا اہتمام کئے موجود تھے۔ افسردہ چہروں کے ساتھ ہم لوگ لان کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ حفیظ صاحب نے سچ مچ بڑا اہتمام کر رکھا تھا کسٹم کے جن افسروں نے مجھے پریشان کیا تھا وہ بڑی حیران نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔! آج انہی کسٹم آفس کے لان میں خدا کے فضل سے میں اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔! NOMANSLAND تک سب ہی لوگ ساتھ ساتھ تھے۔ پھر چلتے چلتے رک گئے۔ شاید میری ہی طرح تم لوگوں کی آنکھیں بھی دھندلا گئی تھیں۔ مجھے تم لوگوں کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ جذبات سے کپکپاتی ہوئی آوازیں نکلیں۔ "خدا حافظ — خدا حافظ" میں ترنگے جھنڈے والے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی، پلٹ پلٹ کر تم لوگوں کی طرف ہاتھ ہلا رہی تھی۔ چاند تارہ والا ہرے رنگ کا جھنڈا دور ہوتا جا رہا تھا، اور تم لوگوں کے لہراتے ہوئے خدا حافظ کا پیغام دیتے ہوئے ہاتھ دھندلے دھندلے سے نظر آنے لگے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ دھندلکا بھی ختم ہو گیا۔ مٹی رنگ کی وردیوں والے سپاہیوں کی جگہ خاکی وردیوں اور کسی ہوئی پگڑیوں کے ساتھ انڈین اسٹاف مجھ سے نزدیک ہوتا چلا گیا۔ ابھی — ابھی تو تم لوگ میرے کتنے قریب تھے اور — اَب لگتا ہے کہ جیسے صدیوں کی دوری ہمارے درمیان حائل ہو چکی تھی —!

جنوری کی سردی میں ہوڑہ پنجاب میل کے اندر ساری رات کروٹیں بدلتی رہ گئی۔ اب تک ہمارے بیچ میں سیکڑوں میل کی دوری آ چکی تھی۔ مگر طفیل — تمہارے نرگس کے پھول سارے کمپارٹمنٹ میں اپنی خوشبو پھیلائے ہوئے تھے۔ اسی خوشبو کے ساتھ ہم لوگ جدا ہوئے تھے۔ یہی خوشبو ہم لوگوں کے بچھڑنے کی یادگار تھی اور اب یہی مرجھائے ہوئے پھول تم لوگوں کے اداس چہروں کی یاد دلا رہے تھے۔ کیا معلوم دو ملکوں کی دوریوں میں۔ سرحد کی خاردار لوہے کی دیواروں کے پیچھے زخموں سے بھرے ہوئے دلوں کے لیے۔ یہ آہنی گیٹ کب تک کھلتے رہیں گے؟

لاہور سے پٹنہ کی دوری کا اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ سیکڑوں میل کا فاصلہ تھا، زبان الگ لہجہ جدا — لباس، کھانا پینا غرضیکہ شب و روز ہی علیحدہ تھے۔ مگر جب آپس میں ملتے تھے دوئی کا احساس بھی کہیں پر سے نہ ہوتا تھا۔ اردو زبان کی حلاوتیں دو ملکوں کی اجنبیت کا احساس بھی نہ ہونے دیتی تھیں۔

تمہارے خط آتے رہے میں تمہیں افسانے بھیجتی اور تفصیلی خط لکھتی رہتی۔ سال گذرتے گئے۔ ۱۹۶۴ء میں میری چھوٹی بہن روحی کی شادی ہوئی اور وہ ڈھاکہ چلی گئی۔ شہلا کشتیہ میں تھی۔ دونوں بہنیں مشرقی پاکستان میں تھیں تم مغربی پاکستان میں تھے اور

میں انڈیا میں تھی ۔! زندگی کے جھمیلے بڑھتے جا رہے تھے بہت سے کام آپڑے تھے بہت ساری ذمہ داریوں کے شکنجے میں پڑ گئی تھی! میری بہنوں اور بھائیوں کے جو بچے اور بچیاں چار سال کی عمر سے پڑھنے کے لیے میرے پاس آئے تھے، وہ اب بڑے ہونے لگے تھے۔ اختر صاحب سردی اور گرمی کی لہروں سے اب جلدی جلدی بیمار ہو جاتے تھے۔ کمزور تو ہمیشہ ہی سے تھے اُس پر سے اپنے آپ کو ہتھیلی کا پھپھولا بھی بنا رکھا تھا۔ میں ایک ایسے شکنجے میں جکڑ کر رہ گئی تھی کہ پٹنہ سے کہیں باہر نکلنا بھی مشکل تھا۔ تم لوگ دل و نظر میں بستے ہوئے بھی بہت دور تھے۔ دیواروں پہ سال کے کیلنڈر بدلتے گئے۔ ۶۵ء کا اگست زلزلہ خیز تھا۔ زمین آسمان جیسے کانپ رہے تھے۔ سارے دلوں کی دھڑکنیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔ اخباروں کی سرخیاں اور ریڈیو کی خبریں بجلی بن کر گر رہی تھیں۔ آخر ۶ ستمبر کا منحوس دن ایک قیامت بن کر ٹوٹا — جن لوگوں کے جسم ادھر تھے اور روحیں سرحد پار چلی گئی تھیں وہ نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگے تھے ہمارے لیے زندگی کا مفہوم ہی معدوم ہو چکا تھا۔ سرحد سے لاہور کس قدر نزدیک تھا تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ نگاہوں میں گھومتا رہتا۔ ایک رسی بسی خوب صورت سی پیاری زندگی۔ چھوٹے چھوٹے پیارے بچے۔ نقوش کا دفتر — اور اُس طرف مشرقی پاکستان میں بوڈر کے قریب کشتیہ میں شہلا، روحی، دونوں بہنیں اکٹھی تھیں۔ کیسے قیامت کے دن تھے طفیل۔! سائرن کی آواز بلیک آؤٹ۔ بم و شل لے کر ہمارے سروں پہ سے گذرتے ہوئے جہازوں کی بھیانک آوازیں — خدایا — میرے بچے — میرے بھائی بہن سب ہی تیرے حوالے۔ تیرے سپرد ہیں میرے آقا! — آنکھوں سے آنسو بہتے بہتے اُن کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ خاندان بھر کے چہرے اُڑے ہوئے تھے مسلمانوں کے تقریباً سارے ہی گھروں میں ابتری پھیلی ہوئی تھی مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتیں، کپکپاتے لبوں پر بیقرار دعائیں تڑپتی اور آنکھوں میں جگر کے ٹکڑوں کی صورتیں آنسوؤں سے دھندلائی رہتیں۔ الٰہی! — کس قیامت کے دن گذر رہے ہیں۔ تڑپتے ہوئے پہاڑ سے دن اور بلکتے جہنم کی سی راتیں دونوں بوڈر انتہائی خطرناک حالت میں تھے — اور ریڈیو — پر دل و دماغ پر بجلیاں گرانے والی خبروں کو سنتے ہوئے بھی، میں زندہ تھی۔ فتوحات کے کیسے کیسے خیالی جھنڈے گاڑے جا رہے تھے۔ پھر بھی اس گھڑی میں جی رہی تھی۔ طوفی۔! انسان زندہ رہنے پر بھی کس قدر مجبور ہے …؟

ایک معجزہ ہی تھا۔ جو یہ قیامت کے دن ختم ہو گئے۔ سہمے ہوئے دل کو تھوڑا اقرار آ گیا — مگر ڈرا ہوا جی بے چین تھا کہ کون ہے؟ اور کون نہیں؟ اور جو نہیں ہو گا — تو پھر اس کے بغیر کیسے جیوں گی!؟ — خدا کا شکر ہے کہ آہستہ آہستہ سب کی خیریت ملتی گئی۔ آفتاب نے کناڈا سے بہنوں کی خیریت کا کیبل دیا پھر انہی نے تمہاری خیریت کا کیبل بھی دیا تھا۔ خدائے تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر کہ تم لوگ خیریت سے تھے اور ہر طرح سے اچھے تھے۔ مگر جلد ہی پھر ایسا لگا کہ ہم اور تم لوگ ایک ہی زمین پر نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ دوسرے کُرّوں پر جا بسے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے تم لوگوں کو کناڈا کی طرف سے خط لکھتی اور تم بھی مجھے کبھی کناڈا۔ کبھی کابل اور کبھی سیلون کی طرف سے خط لکھا کرتے تھے۔ تم لوگوں کی صورتیں آنکھوں میں دھندلا گئی تھیں۔

ایک شام کو میری تیسری بہن صوفیہ اپنے کچھ مہمانوں کے ساتھ میرے گھر آ گئیں۔ باتوں باتوں میں تازہ جنگ کا جو تذکرہ

چھڑا تو پھر بہت دیر تک باتوں کا سلسلہ چلتا چلا گیا۔ میں نے اپنے بیڈ روم میں دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے ہوئے دیکھا۔ سمجھ گئی مہمانوں کے ہیں۔ اتنے میں صوفیہ آگئیں اور بڑے درد سے بولیں۔ آپا! یہ بچے بچارے ابھی پاکستان کی جنگ میں یتیم ہو گئے ہیں۔ میں نے بڑے دکھ سے ان غریب بچوں کو دیکھا۔ یہ بچارے تو کسی سیاست کو جانتے بھی نہیں۔ جنگ کے دہکتے ہوئے شعلوں نے انھیں کیسا بے سہارا کر دیا ہے۔ ایسے ہی کتنے بچے اُس طرف بھی بلا کر ہو چکے ہوں گے۔ یہ ملکی حرص و ہوس۔ یہ آگ و خون کا کھیل، حکمرانوں کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ سیکڑوں بچے نیزے کی نوک پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہوتے رہتے ہیں، دہکتی آگ میں پتنگوں کی طرح بھسم ہوتے رہتے ہیں۔ کسی حاکم کو اس کا ذرہ بھر احساس تک نہیں ہوتا، یہی تو ان کی دولت و طاقت کا حسن و شباب ہے، اسی سے تو حکمرانی کے سنگھاسن پر رعب و رونق اور چمک دمک پیدا ہوا کرتی تھی۔!

— اب ان باتوں کو چھوڑو۔ دل تو کب کا خون ہو چکا ہے۔ اب تو ہم ایسی زندگی کے عادی ہو چکے ہیں۔ جمہوریت ہو کہ ڈکٹیٹر شپ ہر جگہ۔ ہر حکومت کا خونی پنجہ — دورِ جہالت سے لے کر اس نام نہاد مہذب زمانے میں بھی ابلیسی رقص کر رہا ہے اور کرتا چلا جائے گا

بوڈر کھلتے ہی شہلا کی بیماری کی خبر سن کر میں ڈھاکہ چلی گئی۔ یہ ندیوں، نالوں، دریاؤں، ساگروں جیسا ساگروں، جھیلوں دھانوں اور انسانی آبادیوں سے بھرا ہوا ملک بھی تمہارا ہی تھا۔ مگر — تم وہاں نہ تھے۔ تمہارے بغیر تمہارے ملک میں وہ دلکشی اور اپنا پن محسوس نہ ہوتا تھا، زبان اتنی، الگ تھی کہ اجنبیت کو دور کرنا انتہائی مشکل تھا۔ طور طریقے، رسم و رواج بالکل جداگانہ تھے، رہن سہن میں بہت فرق تھا، وہاں کے لوگوں کو پرستش کی حد تک اپنی زبان سے محبت تھی اور ان کے اندر اپنی قومی برتری کا متکبرانہ احساس بھی!

گھر کے اندر اپنی ہی دنیا ہوتی۔ مگر باہر نکلتے ہی لگتا جیسے کسی غیر جگہ آگئی ہوں۔ نجانے کیسے تمہارے وحید قریشی کو میرے آنے کی خبر مل گئی۔ وہ بچارے ہارٹ کے مریض تھے اور چلنے پھرنے سے مجبور — انہوں نے میرے نام سے اخبارِ خواتین اور روزنامہ اخبارِ جنگ جاری کر دیا تھا۔ فون پر دیر دیر تک ہماری باتیں ہوتیں۔ جن میں بس تمہارا ہی تذکرہ رہتا، تمہاری تعریفیں ہوتیں — تمہاری صلاحیتوں پر خوشیوں کا اظہار کیا جاتا۔ بس یہی سمجھو کہ ساری گفتگو پہ تم ہی چھائے رہتے تھے۔ وحید قریشی صاحب نے بتایا تھا کہ جب تم ڈھاکہ آئے تھے تو انہی کے پاس ٹھہرے تھے۔ میں جب بھی ان کے گھر کے پاس سے گزرتی تو ایسا لگتا جیسے تم انہی راستوں پر سے گذر رہے ہو۔

ایک رات میں نے تم کو فون کیا۔ "کیا کر رہے ہو طفیل؟" — آجاؤ نا یہاں، اس ہریالی دنیا میں جہاں کے چپے چپے پر رقص نغمے چل رہے ہیں۔ یہاں سورج کی پہلی کرن کی آرتیاں اُتاری جاتی ہیں۔ بھور بھئے رمنہ پارک میں کنواریوں کے پاؤں میں بندھے گھنگھروؤں کے بول سے دھرتی کے دلوں میں سنگیت کی لہریں جگائی جاتی ہیں۔ تم ہنس پڑے۔ "ارے آپا۔ شاعری چھوڑیں۔ ہاں! کام کی بات سنیں۔ بس ایک فلاسفی سے آجائیں۔ اب تو آپ کو بھوتا جا رہا ہوں۔ ہاں ایک خبر یہ ہے کہ اختر صاحب نے اپنی ایک بڑی

اچھی غزل بھیجی ہے، بس یہی اتنا سا شعر یاد ہے جو آپ کو سنا رہا ہوں ؎

"مجھے چراغ جلاؤ کہ رات بھاری ہے"

برسوں کے بعد تمہاری آواز سن کر بہت اچھا لگا۔ انڈیا لوٹ آنے پر بھی تمہاری چند لمحوں کی باتیں مجھے بہت تسکین پہنچاتی رہی ہیں۔! ۱۹۷۱ء کی ہولناکیوں نے بے دم کر رکھا تھا۔ ڈھاکہ اور راج شاہی کے خطرناک فتنوں میں میرے کئی دوری رشتہ دار مارے جا چکے تھے۔ شہلا روحی کے لیے سارا خاندان بدحواس تھا۔ کوئی صورت وہاں جانے کی نہیں تھی۔ راستے خون آشام ہو رہے تھے۔ آنا جانا ایک ناممکن سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ اللہ اللہ کر کے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شہلا تو اپنے خاندان کے ساتھ لاہور پہنچ گئی تھی۔ سہیل نے بڑی کوششوں سے اپنا تبادلہ لاہور کرا لیا تھا۔ مگر بچاری روحی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بڑی بیتامتوں سے گذرتی رہی تھی۔ سب کچھ لٹنے کے بعد زندگی اور عزت بچ گئی تھی۔ ۱۹۷۲ء کے جون میں جب وہ اپنے سسرالی لوگوں اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ آئی تو ان سب کو دیکھ کر ہم لوگ حیران رہ گئے۔ ان کا زندہ بچنا بھی ایک معجزہ ہی تھا۔ اسٹیٹ بنک کراچی نے ڈھاکہ سے اپنے آفیسروں کو اب کہیں جا کر بلایا تھا۔

۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء ذاتی طور سے مجھ پر اک قیامت کی طرح ٹوٹے تھے۔ مشرقی پاکستان کا المیہ اختر صاحب کے حساس دل و دماغ پر بجلی بن کر گرا تھا۔ اور یقین کرو کہ ان کی صحت اور زندگی کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ گیا تھا۔ وہ ایسے ٹوٹے تھے کہ کھیل کھیل ہو کر رہ گئے تھے۔ مشرقی پاکستان کے فسادات کے دوران مہینوں تک وہ اپنی آنکھیں بھی جھپکا نہ سکے تھے، ساری ساری رات بیقرار سے سجدوں میں پڑے مسلمانوں کے لیے دعائیں کرتے ہوئے روتے رہتے تھے ان ہی سارے قومی غموں اور ذلتوں کے احساس نے ان کے اعصاب کو بری طرح مجروح کر رکھا تھا۔

پھر وہی ہوا کہ دنیا کے نقشے سے مشرقی پاکستان مٹ کر بنگلہ دیش ابھر آیا تھا، دردناکیوں، بیدردیوں، ہولناکیوں کی خون آشام داستانیں تاریخوں کے صفحوں پر ابھرتی چلی گئیں۔ انسانی خون کی لالیوں سے بنگلہ دیش کا ذرہ ذرہ رنگین ہو اٹھا، انسانوں نے اپنی ذلت و خواری کی ایسی ایسی درندگی دنیا کو دکھائی کہ ابلیس بھی حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا!

۱۹۷۳ء کی جولائی میں اختر صاحب کو علاج کے لیے آفتاب کے یہاں کناڈا لے گئی۔ نئی زمین نیا آسمان اردو زبان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ہمت اور دعاؤں سے کام لیتی ہوئی ایک مریض کے ساتھ اکیلی جا رہی تھی۔ اکناڈا پہنچتے ہی تم کو خط لکھا۔ تم نے بہت پیارا سا تسکین سے بھرا ہوا خط لکھا تھا۔ خوشی ہوئی کہ اتنی دوری پر بھی تمہاری محبت بھری دعاؤں کا سہارا پا رہی تھی۔ کناڈا، نیویارک، شکاگو۔ کہیں بھی ان کی بیماری کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اتنا بڑا اہلِ قلم۔ ادیب، عالم اور دانشور۔ اپنی اک بے نام سی بیماری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ دماغ و ذہن پہلے ہی کی طرح روشن۔ اور جاگے ہوئے تھے، مگر اپنی وہ خود اعتمادی کھو چکے تھے اور اعصابی ہیجانوں پر قابو پانے سے معذور تھے۔ وہاں کے ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ سائیکلوجیکل ہی یہ مرض ہو سکتا ہے۔ اختر صاحب مسلسل سات سالوں تک بیمار رہے۔ اعصابی بے چینی۔ دم بھر کو قرار نہ تھا۔ جس کی ایک انگلی کی دکھن بھی مجھ سے برداشت نہ ہوتی تھی، اس کو میں ایسی بیقراری کے عالم میں دیکھ کر بھی اس کے لیے کچھ نہ کر سکتی تھی۔ دن مہینے اور سال بیتتے گئے۔

تم نے جاوید بیٹے کی شادی کا بہت خوب صورت کارڈ بھیجا تھا۔ میرا بھتیجا۔ جس کو میں اسکول میں پڑھتا چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ دولہا بن رہا تھا۔ اس کے سر پر سنہرا سہرا سجنے والا تھا۔ اپنی مجبور زندگی پر دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میں تو ایک لمحہ کے لئے اختر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی کارڈ کو پھر سے پڑھا۔ شادی کی ہماہمی نگاہوں میں جھلکنے لگی۔ تاریخ پر جب نظر پڑی تو پتہ چلا کہ اب تک شادی ہو چکی تھی۔ تھوڑی تسکین سی ہوئی۔ دلہا دلہن کی نئی زندگی کے لیے دعائیں کیں۔ تم لوگوں کو بہت یاد کیا اور پھر مبارکبادی کا ایک ٹیلی گرام تم کو دے کر دل کو اطمینان ہو گیا۔

تمہارے بہت اچھے اچھے خطوط آتے رہے میں بھی تم کو افسانے بھیجتی رہی لکھنے کی فرصت کہاں تھی۔ لکھے ہوئے افسانوں کو صاف کرا کے تم کو بھیجتی رہی۔ ہر سال عید پر تمہارا کارڈ آتا رہا اور میں بھی عید کی خوشیاں تلاش کرتی ہی رہ جاتی۔ کیسی عید؟ کہاں کی عید؟ آخر۔ ہوسٹل کے ایک کمرے میں ۳۱ مارچ ۸۶ء کی رات نے اختر کی مضطرب زندگی کے ٹمٹماتے چراغ کو ہمیشہ کے لیے بجھا دیا۔ وہ بڑے سکوں سے سو گئے تھے۔ نلکیاں اور ٹیوب نکلنے کے بعد وہ پہلے کی طرح بڑے حسین نظر آرہے تھے۔ زندگی کی ایک کہانی ختم ہو چکی تھی۔ مگر زمین و آسمان بالکل ویسے ہی تھے ان میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور میں۔ میں اب بھی جی رہی تھی۔

نوجوان تمناؤں، ارمانوں، آرزوؤں، دعاؤں، اور بہت سے خوبصورت خوابوں کو سجا کر ۶۳ء کی ۴ مئی کو میں نے اختر کو اور اختر نے مجھ کو پایا تھا۔ ۲۳ سالوں کے بعد وہ گھروندا ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ دو چڑیوں نے مل کر اپنا گھونسلہ سجایا تھا وہ بچارے دو کے بس دو ہی رہے تھے وہ ایک دوسرے کے لیے ایک حسین دنیا بنے ہوئے تھے۔ بہت خوش، ہر گھڑی چہچہاتے رہتے۔ آخر چڑا بچارا ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور کمزور سی بوڑھی بے سہارا چڑیا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حیران و پریشان سی سب کچھ دیکھتی رہی۔ اور پھڑ پھڑاتی رہی۔ اس کے شہ پر ٹوٹ گئے تھے وہ کہاں جاتی؟ اور کیا کرتی؟ ساری دنیا تو اس کی نگاہوں میں تاریک ہو چکی تھی۔

۸۹ء کے فروری میں ملتی پیٹی سی میں لاہور کے اسٹیشن پر اتری تو تم مجھے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے شہلا بھی آئی تھی۔ تم نے بڑے پیار سے مجھے اپنے کندھے سے لگا لیا میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ ”آپا۔ میں نے آپ کو لکھا تھا نا کہ رسول نمبر نکال رہا ہوں؟ خیال تھا چند جلد دن تک یہ کام چلے گا۔ مگر وہ تو چلتا ہی چلا جا رہا ہے ابھی پتا نہیں کہاں تک جائے گا۔“ میں نے تم سے کہا۔ ”یہ بات کیوں بھول رہے ہو کہ وہ نمبر کس کے نام کا ہے، اتنی عظیم الشان رسول اکرمؐ کے لیے ہی تو ساری کائنات بنی ہے، رسولؐ نمبر کی جتنی جلدیں بھی نکلیں گی انھیں کم ہی سمجھنا۔“

ہم اٹھارہ سالوں پر مل رہے تھے۔ رام اور سیتا جی کے بن باس سے بھی ہمارا بن باس آگے نکل گیا تھا طفیل! تم بالکل ویسے ہی تھے۔ اتنے گذرتے ہوئے سالوں نے تم پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔

تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے اور شہلا بضد تھی کہ طفیل بھائی ابھی آپا کو میرے ساتھ جانے دیجئے پھر جلد ہی آپ کو آپ کے پاس بھیج دوں گی۔ آخر تم نے کہا۔ ”شہلا تو چھوٹی بہن ہے اسی لئے تیری دلداری کر رہا ہوں ورنہ آپا پر میرا پہلا حق تھا۔“ تم ذرا اداس سے ہو گئے تھے۔ اسلام آباد پہنچ کر دوسرے دن میں نے تم کو فون کیا۔ تمہارا موڈ آف تھا۔

کہنے لگے "سوتیلا بھائی ہوں نا — کون مجھے پوچھے گا"۔ بڑی مشکلوں سے تم کو منایا — یہاں آتے ہی میں بہت بیمار پڑ گئی تھی سردی کی شدت نے مجھے بدحواس کر رکھا تھا۔ مارچ کے شروع ہفتہ میں میں تمہارے گھر پہنچ گئی — جس عمارت میں تمہارا نقوش پریس تھا تم نے وہ ساری عمارت خرید لی تھی۔ پریس، نقوش کا دفتر اور سارا عملہ نیچے رہتا — اوپر تم سب لوگوں کی رہائش تھی — اب سب کچھ پہلے سے بدل چکا تھا۔ تمہاری دو بہوئیں گھر میں آ گئی تھیں۔ بڑے بیٹے فاروق کی تین بچیاں تھیں — تم پوتیوں کے چاہنے والے دادا بن گئے تھے۔ تمہاری بیگم ویسی ہی پیاری اور محبت کرنے والی تھیں۔ سلیقہ مند۔ گھر کو بڑا اچھا سجا کر رکھنے والی۔ جاوید کی دلہن میں نئی دلہنوں جیسا حجاب ابھی تک موجود تھا۔ بڑی پیاری پیاری لڑکیاں تمہارے گھر کی رونق بن چکی تھیں تمہارے اندر ابھی بھی وہی سادگی تھی — وہی پرانا خلوص — ہاں سنجیدگی کچھ اور گہری ہو گئی تھی — ابھی تمہاری خوشی پر جھلا بھی اٹھتی تھی — اور تم میری جھلاہٹ پر کھل کھلا کر ہنس پڑتے تھے۔ "آپا۔ تو ذرا بھی نہیں بدلی ہے"۔

ایک دن میں نے تم سے کہا تھا "طفیل! سُن رہی ہوں کہ تم ماشاء اللہ سے لکھپتی ہو گئے ہو سا۔ سچ بھن؟"

تم نے بڑا سوکھا سا منہ بنا کر کہا "آپا۔ کماتا ضرور ہوں۔ مگر گنواتا بھی تو رہتا ہوں۔!"

"کمانے والی صورتیں تو دیکھ رہی ہوں۔ سمجھ رہی ہوں مگر۔ یہ گنوانے والی بات کہاں سے ٹپک پڑی"؟

تم ہنستے ہوئے بولے "نقوش کے ذریعے سے گنواتا ہی رہتا ہوں نا؟"

میں نے تم کو غصہ بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "کیسے بے ایمان ہو تم۔ خیر ہے؟ اسی لاہور میں ایک سے ایک ادب پتی پڑے ہوئے ہیں۔ جن کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ یہ آپ کا نقوش ہی ہے جس کی سیڑھیوں پر چڑھ کر آپ دنیا بھر کے پیارے طفیل بنے ہوئے ہیں"۔

بیگم طفیل نے بھی میرا ساتھ دیا۔

اب تم بہت مشغول رہنے لگے تھے۔ کبھی اسلام آباد چلے جاتے، کبھی کوئٹہ۔ جب دیکھو یہی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ میں اٹھارہ سالوں پر آئی تھی — جی بھر کے باتیں کرنا چاہتی تھی — میں نے ایک دن تم سے شکایت کی تھی "بھئی طفیل، تم تو اڑتے اڑتے پھرتے ہو۔ میں تمہارے پاس آئی تھی۔ لیکن تم مجھے ملتے ہی نہیں!

ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ آپا۔ میں پہلے صرف طفیل تھا۔ اب کوئی زیادہ دیر تک طفیل بنا رہنے نہیں دیتا۔ اسکول کی کتابیں لگوانی ہیں۔ بڑے مقابلے ہو رہے ہیں، چند گھنٹوں کی دیر سے لاکھوں کی مار کھا جاؤں گا۔ میں تو کم ہی دوڑتا ہوں بیچارہ جاوید سارا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ غریب پرویز بھی اتنی چھوٹی سی عمر میں بہت سا کام سنبھال رہا ہے"۔

میں جانتی تھی کہ تم کو ہارٹ کی تکلیف ہوئی تھی تم اس کے لیے انگلینڈ بھی گئے تھے۔ اب کسی قسم کی کوئی تکلیف تم کو نہیں تھی لیکن تم کو اپنی پوتیاں اتنی عزیز تھیں کہ جب نہ تب تم ان تینوں کو اپنے کندھوں پر سوار کر لیا کرتے تھے۔ بچیوں کا یہ بڑا من پسند کھیل تھا۔ اور تم کو بھی اسی ایک کھیل سے بڑی راحت ملا کرتی تھی — ! جہاں ایک دادا اور تین پوتیوں کا یہ کھیل شروع ہوتا پس میری جان نکل جاتی تھی۔ اوہ! بھئی طفیل۔ خدا کے واسطے اپنے دل پر اتنا بوجھ مت اٹھایا کرو۔ مگر کیا مجال! کہ تم اس کھیل

سے باز آجاؤ۔

انہی دنوں تمہاری بڑی شاندار کوٹھی نیو مسلم ٹاؤن میں بن رہی تھی۔ تمہاری بیوی بچاری کبھی سارا سارا دن وہاں جا کر مزدوروں کے پیچھے اپنا سر کھپاتی رہتیں۔ کبھی کبھی میں بھی ان کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ کوٹھی کے احاطے کو ہرے ہرے گھاس سے ڈھکایا جا چکا تھا۔ جس کے کنارے کنارے پھولوں کی کیاریاں تھیں اور کسی طرف پھولوں سے لدے ہوئے پودے ابھی سے بہار پر آرہے تھے۔ ایک دن ہم لوگوں کے ساتھ تم بھی آگئے تھے سب سے پہلے تم نے مجھے اپنا بیسمنٹ دکھا کر کہا تھا "آپا یہ جگہ بڑی پرسکون ہے خاص ادبی مجلسوں کے لئے اس کو بنایا ہے۔ اور یہ ہماری لائبریری ہے۔ پسند آئی نہ اس کی جگہ؟ جب بھی جی چاہا۔ لائبریری میں آ کر دنیا کو بھول گئے"۔ طفیل! تم کو خوش دیکھ میرا دل جھوم جھوم اٹھتا تھا۔

دن بھر کی مصروفیت کا بدلہ تم دو دو بجے رات تک مجلسیں جما کر پوری کرنی چاہتے تھے لیکن دو چار دنوں کے سوا میں زبردستی تم کو آرام کرنے کے لیے سویرے ہی بھیج دیا کرتی تھی۔

ایک مہینہ سے زیادہ دنوں کے بعد میں نے تم سے کہا طفیل! اب ردحی کے پاس کراچی جانے دو۔ صرف اجازت دے دو تو میں اپنی بکنگ کرالوں"۔ تم چونک پڑے۔ "آپا۔ آپ کیوں جائیں گی؟ ردحی کو بچوں کے ساتھ بلا لیں نا"۔ آخر بڑی مشکلوں سے لاہور سے کراچی جا سکی۔ ہر طرف یہی محبت تھی اور یہی پیار تھا اسلام آباد۔ لاہور۔ کراچی۔ یہی میری تین دنیا تھی۔ یہی میری خوشیوں کے چراغ تھے۔ اور میں جانتی تھی کہ ان سب کو چھوڑ کر مجھے ہندوستان واپس چلا جانا ہے۔ ویزا پر آیا ہوا انسان کب تک رہ سکے گا۔

میری بھی عجیب حالت تھی۔ پاکستان چھوڑنے ہوئے دل پہ آرے سے چلتے رہتے۔ یہاں میرا عزیز بھائی اور بہت پیاری چھوٹی بہنیں اور ان کے پیارے پیارے بچے تھے۔ اپنا دیور ڈاکٹر محسن کراچی کا مشہور ڈاکٹر محبت میں بچھا ہوا سگے چچازاد بھائیوں اور بہنوں کا خاندان بسا ہوا تھا۔ اختر کے کئی پیارے دوست تھے۔ بڑی پُر رونق چہکتی ہوئی ادبی مجلسیں تھیں، بہت ہی ہر دلعزیز پیاری شخصیتیں تھیں۔ ان سب سے بچھڑنا کچھ آسان نہ تھا۔ ملکی حالات ایسے سنگین دور سے گذر چکے تھے کہ ہر وقت خوف لگا رہتا تھا کہ سب نے پھر کب ملنا نصیب ہوگا۔ ہرے رنگ کا چاند ستارہ والا جھنڈا۔ محبت و خلوص کا اظہار کرتا رہتا۔ اور اس طرف اپنا ترنگا ملکی جھنڈا۔ جس نے ہمیں غلامی سے نجات دلائی تھی۔ جس جھنڈے کے پیچھے ہمارے اسلاف کسمساتے تھے، میرا اپنا گھر تھا۔ میرا اپنا وطن تھا۔ آم کے باغوں کے سلسلے تھے۔ شوخ ندی کی مچلتی لہریں تھیں، ہرے بھرے دھان کے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے کھیت تھے، گیہوں کے سنہرے کھیتوں کا پھیلا ہوا سلسلہ چلتا چلا گیا تھا۔ اپنے وطن کی سنہری مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبوئیں تھیں۔ انسان کیسے ان ساری چیزوں سے جدا رہ سکتا تھا؟ ہم دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ ہم کہاں تھے اور کہاں نہیں تھے۔ یہ کہنا بڑا مشکل تھا۔ آخری فیصلہ یہی تھا کہ ہر جگہ ہماری ہے اور ہر جگہ کے ہم ہیں اس کے بغیر ہمارہ زندہ رہنا مشکل تھا —!

۸۲ء کے دسمبر میں صوفیہ اور ان کے میاں کے ساتھ واہگہ روڈ سے گئی تھی۔ صوفیہ کے میاں اختر کے سگے بھائی ہیں۔ لاہور پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی تھی بے اختیار میرا جی چاہ رہا تھا کہ تمہارے گھر چلی جاؤں مگر اس دفعہ اکیلی اور خود مختار نہ تھی۔ میں نے بھی

سمجھا کہ "اچھا ہے تم ہمارے ریزیڈنشل پرمٹ وغیرہ کے چکر میں نہ پڑو۔ ٹھیک ہے — اسلام آباد کے بعد تمہارے ہاں آجاؤں گی — صوفیہ اور فضل کراچی وغیرہ ہوتے ہوئے جلد ہی واپس چلے گئے تھے۔ تم کو میرے آنے کی خبر مل گئی تھی، اس دفعہ تمہارا ہی فون آیا اسی طرح روٹھا روٹھا سا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے تم کو سمجھایا چکروں کی باتیں بتائیں — مگر تم اپنے اور سوتیلے رشتے کا راگ الاپتے ہی رہے مہینے بھر کے بعد — اچانک تمہارا اسلام آباد ہی سے فون آیا "آپا۔ میں یہیں ہوں! اختر جمال کے گھر سے بول رہا ہوں۔ گاڑی جا رہی ہے آپ آجائیں — اور جلدی! جمیلہ ہاشمی بھی یہیں پر ہیں — مجلس جمی ہوئی ہے شہلا کو بھی لیتی آئیں" —

احسن صاحب خود اپنی گاڑی لے کر آگئے — اختر جمال اپنی اکلوتی جوان اور خوب صورت بیٹی کی اچانک موت سے مردوں سے بدتر نظر آ رہی تھیں، احسن صاحب کا بھی یہی حال تھا گھر کے در و دیوار سسکنے کے عالم میں نظر آرہے تھے، پھر بھی دنیا اپنی جگہ پر تھی — جمیلہ ہاشمی اور اختر جمال سے ملی۔ اختر جمال سے کیا کہہ سکتی تھی۔ کون سے الفاظ میں اُن کو تسکین کے لئے کہتی — بیٹا بیچارہ بھی دشمنوں کی سازش سے بے قصور مقید تھا۔ اور یہ سارے غم و الم یہ بیچارے میاں بیوی اکیلے اٹھا رہے تھے۔ باتیں ہوتی رہیں۔ سیاست کی باتیں اور ادب کی باتیں۔ جمیلہ ہاشمی دھڑا دھڑ "مشہور" تاریخی ناول لکھتی چلی جا رہی تھیں — ان کے میاں بیچارے سفر میں بیٹھے بیٹھے جمیلہ کے کندھے پر سر رکھے ہمیشہ کے لیے راستے ہی سے رخصت ہو گئے تھے۔

جمیلہ ہاشمی سے میری ملاقات پہلے بھی ہو چکی تھی — بڑے خلوص سے ملیں طفیل سے وعدہ لے لیا کہ جیسے ہی شکیلہ بہن لاہور پہنچیں مجھے خبر کریں گے"۔

دوسرے دن طفیل تم شہلا کے گھر آ کر مجھ کو اپنے ساتھ لے گئے تم کو اپنے کسی دوست کے یہاں جانا تھا۔ کہا "آپ بھی مل لیں بہت اچھا آرٹسٹ ہے"۔

ہم لوگ اُن صاحب کے گھر پہنچے، انہوں نے بے تکلفی سے گھر کے اندر برآمدے ہی میں بلا لیا۔ مزے مزے کی باتیں ہونے لگیں۔ تم انہیں کچھ چھیڑ بھی رہے تھے مگر وہ بڑے پیارے انداز سے تمہارا ہر نشانہ خطا کرتے چلے جا رہے تھے۔ پتا نہیں کیسے کشمیر کی باتیں نکل آئیں۔ میں جو اتنی دیر سے چپ تھی۔ کچھ نہ کچھ بولنے کا موقع مل گیا تھا — پھر تو بس بات میں بات نکلتی ہی چلی گئی کشمیر کا حسن اپنی جگہ پر ہو تو ہو — مگر! — صدیوں کی غلامی نے ان کی ہمت جرأت سبھی کچھ ان سے چھین لیا تھا۔ دنیا بھر کی باتیں کرتی چلی گئی تم شہ پر شہ دیئے جا رہے تھے۔ ہنسی سے تمہارا چہرہ سرخ ہو رہا تھا — اور میں دل بھر کے سارے الزامات ان بیچاروں پر دھرتی چلی جا رہی تھی — پھر میں ذرا چونکی — صاحب خانہ کو دیکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں مگر "اخلاقاً" کہہ نہیں پا رہے ہیں — آخر تم نے ہنستے ہوئے بتایا کہ "ہمارے یہ ادیب کشمیری ہیں اور آپ نے خواہ مخواہ اتنی باتیں انھیں سنا ڈالیں"۔

مجھ پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا — میں نے آہستہ سے کہا "تم تو میرے پاس بیٹھے تھے، مجھے اشارے سے منع کر دیتے:

"— تو پھر۔ ان کو معلوم کیسے ہوتا کہ انڈیا والے انھیں کیسے اور کس طرح یاد رکھتے ہیں"۔

معافی مانگتے مانگتے میرا برا حال ہو گیا وہ بیچارے بڑے شریف انسان تھے جو یہ سب سن کر مجھے ناشتا بھی کھلایا اور بڑی اچھی چائے بھی پلائی۔ مگر کئی دنوں تک میں تم سے دل ہی دل میں بہت ناراض رہی تھی۔ توبہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ —

تم اپنی نئی اور خوب صورت کوٹھی میں آ گئے تھے ۔ بہت ہی شاندار کوٹھی تھی تمہاری ۔ میں تمہارے لاہور جانے کے ایک ہفتہ کے بعد اسلام آباد سے تمہارے یہاں پہنچ گئی تھی کار سے اتر کر ابھی چائے پی ہی جا رہی تھی کہ تمہارا فون بول اٹھا ۔ تم نے فون اٹھایا "ہلو ۔ ہاں ۔ آپا آ گئی ہیں ۔ بس بس یہی ۸ بجے ابھی پہنچی ہیں ۔ اگر تکلیف نہ ہو تو رات ہی کو آ جائیں "۱۰ بجے رات کو جمیلہ ہاشمی اپنی بچی کے ساتھ تمہارے یہاں آ گئیں ۔! اسلام آباد سے آنے میں دیل کار سے میں تھک کر چور چور ہو رہی تھی باتوں کا سلسلہ جاری تھا ۔ تمہاری بیوی نمایاں طور پر باتوں میں حصہ لے رہی تھیں ۔ میں نے کسی بات پر تمہیں طفیل ۔ کہہ کر مخاطب کیا تھا، جمیلہ ہاشمی ہنس پڑیں "طفیل صاحب آج پہلا موقع ہے کہ آپ کو صرف طفیل کہتے سن رہی ہوں" ——— تم نے بڑے پیار سے کہا "یہ ہماری آپا ——— جو بھی کہہ ڈالیں"۔ جمیلہ ہاشمی تم سے اجازت لے کر مجھے اپنے گھر لے جانا چاہ رہی تھیں ۔ تم اس وقت میرا جانا مناسب نہیں سمجھ رہے تھے ۔ میں چپ تھی، آخر بڑی مشکلوں سے تم نے اجازت دی ۱۲ بجے رات کو لاہور کینٹ جمیلہ کے گھر پہنچی ۔ وہ "تاریخی ناول" "منصور حلاج" مکمل کر چکی تھیں ۔ صرف پروف دیکھنا باقی رہ گیا تھا ۔ ساری رات جائے پیتے اور گپیں کرتے گذر گئی ۔ دوسرے دن دوپہر کو تمہارے پاس پہنچی ۔ تو ایک ہی ساتھ تمہاری بیوی اور تم دونوں مجھ سے ناراض تھے ۔ بڑی مشکلوں میں پھنس گئی تھی ۔ اللہ اللہ کر کے ——— گھنٹوں کے بعد تم لوگوں کو منایا ۔ تمہاری بیگم نے بتایا "کل آپ کے آنے پر ہم لوگ بہت سی باتیں کرنے کے موڈ میں تھے ——— ٹی وی تو پہنچ میں ایسی مدھم دشمنی ہو رہی تھی کہ آپ کو نہ جانے کا، اشارہ بھی نہیں کر سکتی تھی"۔

میں تم لوگوں کے پاس کئی ہفتے رہی ۔ اس دفعہ وینا کی پریشانی تھی کسی طرح بڑھ ہی نہیں رہا تھا ۔ کراچی سے میری بہن روحی بھی اپنے بچوں کے ساتھ تمہارے ہی گھر آ گئیں ۔ تم لوگوں کی محبت اور قدر دانی دیکھ کر بے اختیار دل سے دعائیں نکلتی تھیں ۔ تمہاری بہوئیں بھی بڑے اخلاق والی تھیں ۔

جاوید کی دلہن کی گود میں ایک بڑی پیاری گھونگھریالے بالوں والی بچی آ گئی تھی ۔ اور ہمارے فاروق کا بیٹا بھی گھر کی رونق بن گیا تھا ۔!

پھر تمہارے ہی گھر سے دیگن پر واہگہ روڈ سے ہوتی روحی کے ساتھ انڈیا چلی گئی تھی !

تمہارے خط پہلے کی نسبت کچھ بھی نہ رہے تھے نقوش بھی اتنے معرکے کے نمبر نکال رہا تھا کہ وہ بھی مہینوں کے بعد نظر آتا تھا ۔ پھر بھی تمہاری خیریت کسی نہ کسی طرح مجھے معلوم ہو ہی جاتی تھی ۔ ۸۶ء کی جنوری میں اچانک میں انڈیا سے لاہور پہنچی تھی ۔ شہلا بیمار تھی ۔ میں جلد سے جلد اسلام آباد پہنچنا چاہ رہی تھی، لاہور ٹھہر کر تم لوگوں سے نہ ملنا ایک قیامت سے کم نہ تھا مگر ۔ جانتی تھی کہ تم آسانی کے ساتھ اتنا جلدی اسلام آباد جانے نہیں دو گے ۔ فون سے شہلا کی خیریت پانچ منٹ میں آ جائے گی، مگر اسکو دکھ ہوگا کہ آپا ۔ بیماری میں بھی جلدی میرے پاس نہ آئیں"۔ ساری رات شہلا کی ایک دوست صفیہ کے یہاں تڑپ تڑپ کر کاٹی ۔ اور سویرے ہی اسلام آباد روانہ ہو گئی، فلائنگ کوچ کی چال بھی مردہ سی لگ رہی تھی ۔ صفیہ نے شہلا کو فون کر دیا تھا کہ آپا آ رہی ہیں ۔ اسلام آباد جانے میں یہی مصیبت تھی کہ پنڈی میں ہاتھ پاؤں توڑ کر گھر کی گاڑی

کا انتظار کرتے رہنا پڑتا تھا۔! شہلا کا ڈرائیور منٹو گاڑی لے کر آگیا تھا، معلوم ہوا شہلا اُسی بلڈ پریشر کے چکر میں پڑی ہوتی ہے اس کا بلڈ پریشر بھی عجیب تھا ۱۸ سال کی عمر سے یہ خواہ مخواہ کی بیماری اس کو پریشان کرتی چلی آرہی تھی — اور اس کے ساتھ ہم لوگ بھی چکر میں پڑ جاتے تھے۔

صفیہ کو میں نے منع کر دیا تھا کہ طفیل کو میرے آنے کی خبر نہ کرنا۔ شہلا کو بھی تاکید کر دی تھی کہ "دیکھو طفیل کو پتہ نہ چلے کہ میں لاہور سے ہوتی ہوئی، طفیل سے ملے بغیر یہاں آگئی ہوں"۔

فروری کے شروع ہفتہ میں میں اپنا سوٹ کیس لے کر فلائنگ کوچ سے لاہور چلی گئی۔ بچوں والا گھر تھا مٹھائی کا ڈبہ لے لیا تھا! — اور طفیل کی کوٹھی پر پہنچ گئی — گھر کے سارے لوگ بہت خوش ہو کر گلے سے لگ گئے۔ تم اپنے دفتر میں تھے۔ میں نے گھر والوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ کوئی میرے آنے کی خبر طفیل کو نہ دے۔ مگر آدھے گھنٹے میں فون کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ تمہاری بیگم نے فون اٹھایا — پھر مجھے کہنے لگیں — "آپ کا فون ہے"۔

"میرا؟" — پھر خیال آیا شہلا نے فون کیا ہوگا۔

"ہلو؟"

"آپا — سلام علیکم!"

"ارے طفیل! تم کو میرے آنے کی خبر کیسے ہو گئی؟" — بالکل غلط خبر ہے یہ! — میں نہیں آئی ہوں"۔

تم فون پر ہنستے چلے جا رہے تھے — "آ رہا ہوں آپا — اتنی خوشی کی خبر سن کر سب کچھ چھوڑ کر آ رہا ہوں"۔

تم اُسی پیارے انداز سے ہنستے مسکراتے چلے آئے — ہم لوگ فروری کی ٹھنڈک میں بھی باہر ہری گھاس پر کرسیاں بچھائے چائے پیتے رہے تھے۔ رات بہت دیر تک جاگ کر باتیں کرتے رہے "تو کب آئی ہے آپا —؟"

"بس آج ہی چلی آرہی ہوں"۔ "تم مجھے انڈیا سے سیدھی تمہارے پاس آئی ہوں — بہت خوش ہو رہے تھے۔ شہلا کو خبر کردو تم نے بڑے پیار سے کہا —" "ابھی کسی کو کچھ نہ کہو" میں اپنا پول کھلنے سے ڈر رہی تھی — "ٹھیک ہے آپا شہلا نے میرا بہت ساتھ مانا ہے — میں بھی — آپ کو ابھی نہیں جانے دوں گا — میرا دل شرم سے کٹا جا رہا تھا۔ کتنا معصوم ہے میرا بھائی — اس بچارے کو کیا خبر کہ تین ہفتے اسلام آباد میں گذار کر آ رہی ہوں۔ میں نے بڑی محبت بھری نگاہوں سے تم کو دیکھ کر دعا کی۔ خدایا۔ اس فرشتہ جیسے انسان کو بہت لمبی زندگی عطا کر دے"۔

ہم لوگ ایک ہی ساتھ ناشتا کرتے۔ تم سلائس صرف شہد کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔ انڈا چھوتے بھی نہیں تھے! صبح نو بجے تم دفتر چلے جاتے۔ اور میں تمہارے کمرے اور لائبریری میں کتابیں پڑھتی رہتی تھی — تمہاری دونوں بہوئیں اوپر کی منزل میں چلی گئی تھیں۔ تیسری نئی بہو پرویز کی دلہن نیچے تھی۔ یہ تمہارے بھائی اکرم اور تمہاری سالی بی بی کی اکلوتی بیٹی تھی — برسوں بعد پیدا ہوئی تھی اور بڑے ناز و نعم سے پالی گئی تھی — وہ بچاری اپنے ننھے سے بیٹے کے نزلہ بخار سے بے حد پریشان تھی — کبھی میکے میں رہتی کبھی سسرال میں دونوں ہی پاس پاس تھے —!

تم اندھیرا ہونے سے پہلے ہی آجاتے۔ تمہارے آجانے سے گھر کی رونق ہی کچھ اور ہو جاتی تھی۔ ہر طرف چہل پہل — جیسے زندگی سی دوڑ جاتی — پھر ہم تینوں تمہاری بیگم تم اور میں — اپنی منڈلی جما لیتے — تمہارا کام بس سنتے رہنا تھا مسکراتے جانا تھا اور ہم دونوں بولتے چلے جاتے تھے — بیچ بیچ میں ہمیشہ کی طرح بڑے مزیدار جملے تم کہہ دیا کرتے تھے۔ رات کا کھانا تمہارے ساتھ ہی کھایا کرتے تھے۔ تم کو معلوم تھا کہ مجھے مچھلی بہت پسند ہے اسی لیے ایک روز بہت سی مچھلیاں ساتھ لیتے چلے آئے تھے — اگرچہ شاہد میں تمہارے بچے بہت چھوٹے چھوٹے سے تھے اور ماشاءاللہ یہاں ان بچوں کے بچے بھی بڑے ہو رہے تھے تابندہ بڑی سمجھی ہوئی اور اردو ادب کی طرف مائل نظر آتی تھی! رات کے کھانے کے بعد کبھی کبھی گھنٹوں تم میاں بیوی ٹی۔ وی لونج میں ٹہلتے ہوئے اپنے بچوں کا انتظار کرتے رہتے تھے، ایک رات گیارہ بج رہے تھے میں نے کہا "طفیل تم جاکر اب آرام کرو" — کہنے لگے۔ "آپا! بچوں کے آئے بغیر — سکون مل سکے گا؟ بچے بھی یہی کہا کرتے ہیں کہ کام میں دیر سویر ہوتی ہی ہے۔ آپ پریشان نہ ہوا کریں — مگر — ان کو ابھی سے کیا پتا؟ کہ ماں باپ کا دل۔ اپنے سے جدا بچوں کے لئے ایک ایک لمحہ کتنا بے چین رہتا ہے" اسی وقت گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ تمہارا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا — بچے آگئے اور تم بڑے مطمئن انداز میں اپنے بیڈ روم کی طرف چلے گئے —!

ایک دن دفتر سے تم آئے — دیر تک وہی سوٹ پہنے بیٹھے رہے۔ میں نے ٹوکا "جاؤ بھئی۔ آرام سے کپڑے بدل کر آؤ"

کہنے لگے "نہیں آپا — آج سوچ رہا ہوں کہ تھوڑی دیر میں آپ کو لے کر کچھ ادیبوں سے ملانے کو جاؤں"

میں نے تمہارے چہرے پر تھکن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں دن بھر کے تھکے ہوئے ہو۔ کسی جمعہ کو چلنا۔ یا پھر جب ہندوستان جانے کے لیے میں تمہارے پاس آؤں گی اس وقت ملا دینا"

تمہارا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا — جیسے ایک بہت بڑا بوجھ تمہارے سر سے اتر گیا ہو —!

میں نے کہا "ہم یہیں بیٹھ کر جی بھر کے باتیں کریں گے۔ ایک دوسرے سے جھگڑا کریں گے۔ پھر تھک کر سو جائیں گے"۔ تم کھل کھلا کر ہنس پڑے —! "پروگرام تو بہت اچھا ہے!"

ایک شام تم جلد آگئے تھے — میں نے تم کو — بہار اردو اکیڈمی کا رسالہ "زبان و ادب" پڑھنے کو دیا۔ اس میں میرا ایک تازہ افسانہ چھپا ہوا تھا۔ میں نے کہا "میری اس کہانی کو پڑھ کر بتاؤ گے کہ تم کو کیسی لگی —؟ تمہارا تو بھئی معیار بہت اونچا ہے۔ اسی ترازو سے تولنا"

تم نے پرچہ لے کر دیکھا — اس کو اپنے تکیہ کے نیچے رکھا — اور بولے "آپا آئیے میں آپ کو اپنا کام دکھلاؤں۔ رسول نمبر تو خدا کا شکر ہے مکمل ہو گیا — اب میں "قرآن نمبر" نکال رہا ہوں"

"قرآن نمبر —؟ طفیل! — کیا کہہ رہے ہو؟ تم! یہ ساری کائنات، یہ سارے ارض و سما — یہ سارے اسرار و رموز — کیا تم ایک ایک حرف کے بوجھ کو اٹھا لینے کی صلاحیت رکھتے ہو؟ اللہ کی پناہ — ایک آئت ہی اتنی بڑی تفسیر رکھتی ہے کہ بڑے بڑوں کے پسینے چھوٹ گئے ہیں"۔

"آپا آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ دیکھئے یہ فہرست ہے!۔ یہ مضامین کے عنوان ہیں۔ اور۔ یہ لکھنے والے عالموں کے نام ہیں۔" تم نے مجھے بہت سے نوٹ دکھائے۔ بہت سی چھپی ہوئی لسٹیں تھیں۔ میں بدحواسی کے عالم میں سب کچھ دیکھتی جا رہی تھی۔ آخر ہمت کر کے بولی: "اللہ! یہ اتنی عظیم باتیں — یہ اتنے عظیم الشان ہونے والے کارنامے، مجھ جیسی جاہل کو کیوں سنا رہے ہو طفیل؟" تم نے کہا۔ "میں جانتا ہوں آپا کہ آپ کو ان متبرک باتوں اور کاموں سے دلچسپی ہے۔ اسی لیے صرف آپ ہی وہ پہلی خاتون ہیں جن کو میں یہ ساری چیزیں دکھا رہا ہوں۔"

میرا سر ندامت سے اپنے خالق کے آگے جھک گیا۔" خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔!

جمعہ کا دن تھا۔ تمہارے بیٹوں اور بہوؤں نے پروگرام بنایا کہ آج گھر میں کوئی خاص رونق ہو۔ تمہارا سسرال، جو تمہارا اور اکرم کا ننھیال بھی تھا۔ وہاں سے لوگ آنے لگے۔ کئی خاندان بچوں سمیت آ رہے تھے رات بڑی ہنگامہ خیز اور بڑی پُر رونق ہو چکی تھی۔ دسترخوان پر کئی بار کھانے کھلائے جاتے رہے تھے، ہنسی کی کھل کھلاہٹ، قہقہوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے چہل پہل کرتے لباسوں کی چمک دمک سے کسی تقریب کا گمان ہو رہا تھا ویڈیو پر انڈین کیسٹ میں ناچتی گاتی، اچھلتی کودتی فلمیں ہو رہی تھیں۔ مسلسل ایک طرح سے پنجابی باتوں کے درمیان اپنے آپ کو پنجابی ماحول میں اجنبی اجنبی سی محسوس کر رہی تھی۔ ۱۲ بجے رات تک اخلاقاً بیٹھی رہی آخر اکتا کر اٹھ گئی — "طفیل! — اب سونے کو جاؤ۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔" "ہاں آپا! آپ بھی جائیں۔" طفیل اپنے بڈ روم میں چلے گئے اور میں گسٹ روم میں آ گئی۔ باہر ٹی وی لونج سے ہنگم گانوں کی آوازیں آتی رہیں، جب بھی نیند ٹوٹتی فلمی دھنیں سنائی دیتیں۔ دبے دبے قہقہوں کی آوازیں آتیں۔ رات جاگتی رہی تھی۔ ہلتی رہی تھی اور خوشیاں بکھیرتی رہی تھی۔ صبح کو آنکھیں ذرا دیر سے کھلیں۔ اُٹھ کر دیکھا۔ ٹی وی لونج تھرڈ کلاس کا ڈائننگ ہال نظر آ رہا تھا۔ لوگ بے خبر زمین پر بچھے فرش پر سوئے ہوئے تھے۔ پرویز اور اخلاق مہمانوں کے لیے ناشتے کا اہتمام کر رہے تھے بڑے بڑے پراتوں میں دہی لائی گئی تھی۔ شیرمال ٹوکریوں میں تھے۔ سوجی کے پیلے رنگ کے حلوے تھے اور گرما گرم نہاری کی دیگچیاں۔

تم نہا کر سیدھے میرے پاس آ گئے۔ تمہاری بیگم بھی بڑی مصروف سی میرے پاس آئیں۔ تم نے کہا: "میں آپا کے ساتھ یہاں اکیلے ڈائننگ روم میں ناشتا کروں گا۔" تم نے میرے لیے اسپیشل نہاری منگائی تھی۔ باقر خوانی کے گرم گرم ٹکڑے نہاری کے ساتھ بہت مزیدار لگ رہے تھے۔ ادرک کے باریک باریک لچھے اور لیموں کا عرق ڈال کر تم نے اور بھی مزیدار بنا دیا تھا۔ تمہارے چہرے پر بڑی گہری اداسی تھی۔ میں کبھی کبھی نگاہیں اٹھا کر تم کو دیکھ لیا کرتی تھی۔ بجانے تم کس سوچ میں تھے۔ پھر۔ تم نے کہا: "آپا۔ کبھی کبھی میرے دل پر گزری باتوں کا کچھ ایسا دکھ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہفتوں بھر کے لیے ٹوٹ سا جاتا ہوں۔ چند سال قبل میں نے اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ دکھ دینے والوں کو بڑی خوشی ہوتی رہی ہے کہ میں ان کے ہاتھوں تڑپ رہا ہوں۔ ذہنی طور پر کرب میں مبتلا ہوں۔ میں ایک باپ ہوں۔ میری دنیا بس یہی چار بیٹے ہیں۔ میں ان سب کو ایک ساتھ محبت دپیار کی ڈور میں خلوص و اپنائیت کے ساتھ وابستہ

دیکھنا اور رکھنا چاہتا ہوں۔ یہی میری دولت ہیں، یہی میری ساری زندگی کے نچوڑ اور سرمایہ ہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسا ہونے نہیں دینا چاہتے۔ پھر تم نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔" آپا! میرا جی چاہتا تھا کہ کسی اپنے عزیز کے سامنے اپنے دل کی یہ ساری باتیں کہہ کر اپنے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کرتا ــ آج آپ کے پاس اپنے دکھ کہہ رہا ہوں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میرے بچے اور میری بہوئیں بہت اچھی ہیں۔ مگر۔ آپا زمانہ بہت بُرا ہے ــ میرے معصوم گھروندے کے لیے دعا کریں گی ــ میرے اس آشیانے کا ایک ایک تنکا بڑا عزیز ہے آپا۔ بہت انمول ہے ــــ بس زمانے کی بجلیوں سے ڈرتا ہوں ــ" میں حیران سی تم کو دیکھتی رہی۔ تمہیں سمجھاتی رہی ــ میں اب تک نہیں جانتی تھی طفیل کہ جس بات کو تم آج تک چھپاتے رہے تھے، وہ ساری باتیں مجھ سے کہہ کر ــ تم کو سکون مل رہا ہے! تم اس حد تک میری قدر کرتے تھے ــــ میرے دل میں تمہاری عظمتوں کے چراغ جل اٹھے، اس وقت بھی تمہاری بیوی تمہارے ساتھ ساتھ تھی، آج تک وہ تمہارے ہر اک زخم پر مرہم رکھتی آ رہی تھی ــــ اور ابھی بھی اس کی آنکھیں تمہارے درد سے پُرنم ہو رہی تھیں!

جب میں تمہارے گھر ــ تمہارے لاہور سے اسلام آباد واپس جا رہی تھی تو نجانے کیوں تمہارے لیے میرا دل گھبرانے لگا ــ اتنے دن تمہارے پاس رہ کر جانے کے خیال سے الجھن ہو رہی تھی ــــ میں نے تم سے کہا" اتنا لمبا سفر اکیلے بڑا کٹھن ہوگا ــ کوئی کتاب اچھی سی دیدو جو تم لوگوں کو بھلا سکے۔"

تم ہنستے ہوئے ایک کتاب لے کر آ گئے ــ یہ کتاب وزیر آغا کے تازہ افسانوں کا مجموعہ تھی ــ یہ تمہاری بڑی پسندیدہ کتاب تھی جو صرف میری خاطر دے رہے تھے ــ پھر مجھ سے کہا" آپا! میں نے آپ کا افسانہ پڑھا تھا ــ بہت اچھا تھا ــ زیادہ تعریف کروں گا تو آپ بھول جائیں گی ــ اس لیے بس اتنا ہی"

ہم لوگ ہنستے ہوئے رخصت ہوئے ــ تم کو ۲۲ مارچ کو ستارۂ امتیاز ملنے والا تھا ــ اس کو لینے کے لیے اسلام آباد تو آنا ہی تھا ــ پھر انڈیا جاتے کا کبٹ بھی تو تمہارا لاہور ہی تھا۔ تم وعدہ کر چکے تھے کہ میری واپسی کے وقت تم رسولؐ نمبر کی ساری جلدیں ایک کریٹ میں پہلے ہی سے پیک کر کے رکھو گے ــ پھر اور بھی بہت سی کتابیں تھیں ــ تمہارے پریس میں چھپے ہوئے اردو کے ابتدائی قاعدے بھی مجھے لے جانے تھے ــ

کراچی جانے کا پروگرام میں نے یہی بنایا تھا کہ تم کو ستارۂ امتیاز مل جائے اور تم لوگوں سے جب ملاقات ہو جائے گی تو بس اُسی رات کی فلائٹ سے کراچی چلی جاؤں گی ــ

تم آئے ــ بیگم بھی ساتھ تھیں ہمیشہ کی طرح اختر جمال کے یہاں ٹھہرے ــ ہم لوگوں نے سارے لوگوں کے ساتھ تم کو بھی ستارۂ امتیاز لیتے ہوئے ٹی ــ وی پر دیکھا ــ کالی شیروانی تمہارے جسم پر بڑی اچھی لگ رہی تھی ــــ ستارۂ امتیاز جب تمہیں پہنایا جا رہا تھا تو بس ایک لمحہ کے لیے مجھ کو ایسا لگا جیسے تمہارے ساتھ وہ عزت مجھے بھی بخشی گئی ہے میرا دل خوشیوں سے لہک اٹھا تھا ــ تم کو دلہا بنا ہوا نہیں دیکھا تھا اس وقت دلہا بنا تم کو ٹی ــ وی پر دیکھ رہی تھی!

ساری تقریبوں کے بعد تم مغرب کے بعد اختر جمال اپنی بیگم اور احسن صاحب کے ساتھ ہم لوگوں سے ملنے آ گئے ــ جی چاہ

رہا تھا کہ ہندوستانی رسم کے تحت جلتے ہوئے گھی کے چراغوں سے تمہاری آرتی اُتاروں — مگر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ سبھی لوگ بڑے خوش ہو رہے تھے سہیل امریکہ گئے ہوئے تھے شہلا اور اس کے بچے سارے ہی اس خوشی میں شریک تھے — بہت دیر تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے اور چائے پیتے رہے۔ تم کالا سوٹ پہن کر آئے تھے۔ تمہاری بیوی کھلی جا رہی تھیں، تم کو بنانے کا سنوارنے کا اور اس منزل تک پہنچانے کا سارا کریڈٹ انہی کو مل رہا تھا۔ رات بڑھتی جا رہی تھی — اٹھنے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا۔ اُس رات کو میں کراچی جا رہی تھی — آخر اٹھنا ہی تھا۔ احسن صاحب کی گاڑی گیٹ سے باہر تھی۔ ہم لوگ ایک ساتھ اُٹھے — اختر جمال اور احسن صاحب پہلے ہی گاڑی کے اندر بیٹھ گئے تھے۔ تمہاری بیگم ہم لوگوں سے مل کر آگے بڑھیں — تم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ شہلا اور اس کے بچوں سے مل کر میرے پاس آئے — زندگی میں پہلی بار میرے بائیں کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آپا — اپنا افسانہ جلدی سے بھیج دیں گی" — پھر اچانک بولے "آج تک آپ کی ایک کتاب بھی میں نے شائع نہیں کی ہے۔ ایسا کیوں ہوا — آپا —؟"

میں ہنس پڑی — "ابھی میری ایک کتاب لکھنؤ سے چھپ رہی ہے" "آخری سلام" — چھپنے سے کام ہے نام کہیں چھپے —!"

پھر تم مجھ سے بولے — "اچھا آپا — خدا حافظ —!"

کار اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ تم اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اپنا ہاتھ باہر نکال کر ہلاتے ہوئے پھر کہا "خدا حافظ" اور تمہارا ہاتھ ہلتا ہوا تھوڑی دور تک چلا گیا —!

میں صبح بہت سویرے کراچی ایرپورٹ پر پہنچ گئی تھی۔ — اسلام آباد سے کراچی کی دنیا ہی دوسری تھی۔ بڑی ہنگامی زندگی لگتا جیسے حشر کا میدان ہو۔ جس کو کبھی نہ دیکھنے کی اُمید ہوتی اس سے وہاں ملاقات ہو جاتی تھی — عزیزوں رشتہ داروں کا ایک سمندر تھا کراچی، نہ دن اپنا ہوتا نہ دوپہر اپنی۔ — بس ایک ملنا ملانا ہی تھا — ملتے ملاتے طبیعت گھبرا گئی تھی۔ اور کبھی بہت اچھا بھی لگتا تھا۔ زندگی ایسی پُر رونق طور پر گذر رہی تھی کہ کبھی کبھی چھپ کر بیٹھ رہنے کو بھی جی چاہنے لگتا تھا —! انہی ہنگاموں میں رمضان آیا۔ عید کی پُر مسرت گھڑیاں آئیں۔ — روحی ان کے میاں اور بچے بڑے خوش تھے کہ عید پر میں اُن کے پاس تھی۔ محسن کی دلہن اور اُن کے بچے مجھے اپنے پاس لے جایا کرتے تھے۔ ٹھٹھہ — حیدر آباد اور پتا نہیں کہاں کہاں پکڑ کر لے جایا کرتے۔

— پھر روحی اور ان کے بچوں کے ساتھ کراچی سے ۲۶ رجون کو اسلام آباد کے لیے چلی — لپکتی ہوئی دھوپ نے حیدر آباد پہنچتے پہنچتے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ رات بہتر گزری — بڑا لمبا سفر تھا۔ صبح ہوتے ہی مجھے لاہور کا انتظار تھا۔ ۱۱ بجے دن کو لاہور کا اسٹیشن آیا —! یہ وہی لاہور تھا جہاں تم تھے۔ — جہاں اُوپر کی منزل پر نقوش کا بہت بڑا اور خوبصورت دفتر تھا۔ — اس وقت بھی تم جھلکتی ہوئی، بڑی سی میز کے آگے کرسی پہ بیٹھے ہوئے اپنا کام کر رہے ہو گے — میرا جی بے اختیار چاہا کہ — لاہور میں اُتر جاؤں! مگر روحی اور اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے میرے پیروں کی بیڑیاں بنے ہوئے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی — جب بھی لاہور آئی کوئی نہ کوئی شکنجہ ایسا ہوتا جس میں پھنس کر رہ جاتی تھی۔ قدم آگے بڑھ جاتے اور — دل خون ہو کر رہ جاتا تھا!

تم لاہور میں تھے — لاہور کی اپنی اک پرانی عظمت تھی — لاہور کا دبدبہ تھا۔ وقار تھا — اس کی اپنی ایک تاریخ تھی — لیکن اُب ان ساری باتوں کے ہوتے ہوئے بھی ان ہی یادوں سے بڑھ کر بھی میرے لئے — لاہور اتنا عزیز — اور اتنا پیارا — اس لیے تھا کہ تم لاہور میں تھے — لاہور تمہارا تھا — تم نے لاہور نمبر نکالا تھا اور اس شہر کے ذرے ذرے پر سلامتی بھیجی تھی —!

میری نگاہوں میں لاہور سمٹ کر طفیل بن گیا تھا — اور طفیل کا پیارا نام بھیل کر لاہور ہو چکا تھا۔

میں اسلام آباد آکر — لاہور کے لئے تڑپ رہی تھی — لاہور کا حسن — لاہور کی ہریالی — سب کچھ نگاہوں میں جھلک رہا تھا!

پھر — پھر یہ کیا ہو گیا تھا — لاہور پر کیسی قیامت آگئی تھی — خدایا —! لاہور — مر گیا —! یہ کیا ہو گیا تھا — یہ کیوں ایسا ہو گیا —! — مگر نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا ہے — لاہور زندہ رہے گا۔ جب تک اُردو زبان و ادب قائم رہے گا — غالبؔ و اقبالؔ کے نام جب تک باقی رہیں گے —!

طفیل تمہارا نام روشن رہے گا — اُمر رہے گا — اردو ادب کے ہر دور میں تم زندہ رہو گے۔ اردو زبان و فن کے دلوں کی دھڑکنیں بن کر ہمیشہ ہنستے اور مسکراتے رہو گے —

زندہ باد طفیل — پائندہ باد نقوش !

حواشی

فساد	RIOT	۱ہ
بستر	BED	۲ہ
مختصر کمرہ	SUITE	۳ہ
آرام	REST	۴ہ
روانگی	DEPARTURE	۵ہ
بذریعہ سڑک	BY ROAD	۶ہ
سرحد	BOARDER	۷ہ
پرواز	FLIGHT	۸ہ
ناگواریٔ مزاج	MOOD OFF	۹ہ
جہاز	PLANE	۱۰ہ

محمدؐ طفیل

غلام رسول ازہر

یادش بخیر آج سے تقریباً تیس بتیس برس قبل ۲۵ - اے وارث روڈ لاہور میرے لیے کعبۂ دل و نظر تھی کہ وہاں پر قیامِ پاکستان کے بعد حضرت علامہ اقبال کے "ایک اِبتدائی ساتھی" ملک حبیب احمد خاں جالندھری اقامت گزیں تھے۔ جن کا تذکرہ ڈاکٹر ناشر نے بھی اپنے فاضلانہ مقالہ بعنوان "اسماء الرجال اقبالؒ" میں کیا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ملک صاحب ریاست جوناگڑھ اور بھوپال میں وزیرِ امورِ خانہ داری رہے تھے۔ وہ طبعاً حساس، انسان دوست، وارستہ مزاج اور مجمعِ خوبی تھے۔ اور باوجودیکہ عمر کے آخری خزاں دیدہ دور میں تھے۔ وہ جامہ زیب، خوش گل، خوش نفس، محفل آرا اور مجلس طراز تھے۔ جب بات کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے منہ سے پھول جھڑتے ہوں۔ ارذلِ عمر نے ان کی غیر معمولی یادداشت کو مطلق متاثر نہ کیا تھا۔ اُن کا سینہ احبابِ رفتہ کی یادوں کا خزینہ تھا۔ ابھی سید غلام بھیک نیرنگ کا تذکرہ ہے تو ابھی چوہدری خوشی محمد ناظر کا۔ ابھی سر عبدالقادر اور سر راس مسعود کا ذکرِ خیر ہے تو ابھی علامہ اقبالؒ، میر اعجاز حسین اور بیرسٹر حامد علیخان کا، ابھی خالدہ ادیب خانم موضوعِ گفتگو ہیں تو ابھی مس فرائی، مسز سروجنی نائیڈو اور عطیہ فیضی، الغرض ملک صاحب کی صحبت ہمعصر مشاہیر کی متحرک، جیتی جاگتی تصاویر کا دل آویز البم تھی اور یوں ملک صاحب میرے لیے ایک متاعِ بے بہا تھے اور میرا یہ معمول تھا کہ میں ہر روز عدالت سے فارغ ہو کر ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت سے بہرہ مند ہوتا۔

ایک شام میں ملک صاحب کے دولت کدہ کے بیرونی برآمدے میں بیٹھا اُن کی دلچسپ اور معلومات افزا ہزار داستان خوبیِ گفتار سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ کوٹھی کے صدر دروازہ کی جانب سے تیکھے نقوش کا ایک دھان پان چھیئی رنگ اور نکلتے ہوئے قد کا لجایا لجایا سا نوجوان، "آہستہ خرام بل مخرام" کے مصداق، خراماں خراماں، دبلے پاؤں قدم ناپتا ہوا ہمارے پاس آیا اور بصد نیازمندی سے ملک صاحب کو ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ سلام کر کے خاموش کھڑا ہو گیا، گویا عجزِ اظہار اور عقیدت و سعادت کا جاذبِ نظر مرقع ہو۔ ملک صاحب سراپا محبت بنے اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "تشریف رکھیے، طفیل صاحب!" طفیل صاحب نے "نقوش" کے حوالہ سے چند حرفوں میں اپنا مدعا بیان کیا اور چند منٹ بیٹھ کر چلے گئے۔

میری طفیل صاحب سے یہ پہلی رُوبرو ملاقات تھی۔ مجھے لمحہ بھر کے لیے حیرت بھی ہوئی کہ شخصیات کے باب میں وہ کس خاموشی اور آسانی کے ساتھ گوہرِ مراد تک آ پہنچے تھے۔ مجھے فی الفور وہ غزل یاد آئی جو بقول ملک حبیب احمد خاں سید غلام بھیک نیرنگ نے وفورِ محبت سے ان پر، ایک زمانہ ہوا کہی تھی اور جس کے ہر شعر کی اپنی ایک الگ کہانی

یہی ہے[1] مگر جس کا مطلع اور مقطع خود میری اور محمد طفیل کی کہانی بن کر رہ گیا۔ ؎

مطلع — مانوس کیوں نہ ہو دلِ وحشی حبیب سے
اک یارِ دلنواز ملا ہے نصیب سے

مقطع — تحسینِ حُسنِ یار میں میرا ہے ہمخیال
نیرنگؔ مجھ کو کیوں نہ ہو اُلفت رقیب سے

طفیل صاحب اس لحاظ سے میرے رقیب بن گئے کہ میرا ممدوح ان کا بھی ممدوح تھا اور یُوں ملک حبیب احمد خاں کے ناطے سے ہم دونوں لاشعوری طور پر، تحسینِ حُسنِ یار کی ہمخیالی کے باعث، ایک رشتۂ مودّت میں یک دم منسلک ہوگئے۔

طفیل صاحب بار آور ادب کے حیاتی دَور میں بظاہر ایک خاموش طبع، کم آمیز، مطلب سے مطلب رکھنے والے عام کارکن لگتے تھے اور ان کی عُزلت پسند شخصیت غیر مرئی اور غیر محسوس سی تھی مگر اس کے باوجود منقصد کی لگن، ان کی دلآویز مسکراہٹ اور دلنواز خاموش گویائی اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہتی تھی۔ وہ حلقۂ احباب میں ابریشم کی طرح نرم، پھُول سے نازک انداز میں بادِ نسیم کی طرح ہولے ہولے چند ساعتوں کے لیے آتے اور خلوص و محبت کی بہار آفرینیاں بکھیرتے ہوئے دبے پاؤں سمٹے سمٹائے چپ چاپ چلے جاتے۔ طفیل کے عنفوانِ شباب کا دور شعر و ادب، آرٹ، نقد و نظر، صحافت، خطابت اور سیاست کے اکابر مشاہیر کا دور تھا۔ علامہ اقبالؒ کے کوہ قامت ہمالیائی پس منظر میں اُدبا، و شعراء کی کھیپ کی کھیپ مختلف اصناف میں اپنے اپنے محاذوں پر خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابو الکلام، مولوی عبدالحق، جوش، جگر، حسرت موہانی، فانی بدایونی، پطرس، تاثیر، سالک، مجید ملک، عبدالرحمٰن چغتائی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، حکیم یوسف حسن، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، م۔ حسن لطیفی، اختر شیرانی، فیض، ن۔ م راشد، میراجی، سعادت حسن منٹو، مولانا غلام رسول مہر، مولانا چراغ حسن حسرت، آغائے مرتضیٰ احمد خان میکش، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا تاجور نجیب آبادی، علامہ سیماب اکبر آبادی، نیاز فتح پوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حامد علی خان، میاں بشیر احمد، پروفیسر حمید احمد خان، امتیاز علی تاج، حجاب امتیاز علی، ج ب صاحبہ، پروفیسر حافظ محمود شیرانی، پروفیسر علم الدین سالک، کرشن چندر، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، ہری چند اختر، میلا رام وفا، امرتا پریتم، راجندر سنگھ بیدی، جسونت سنگھ راز، سید عابد علی عابد اور ابو الاثر حفیظ جالندھری، الغرض کس کس صنف میں کس کس کا نام لیا جائے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اسلوب و فن میں ایک دُرِ نایاب اور گوہرِ یک دانہ ہے جو ایک بے بہا سلکِ مروارید میں پرویا ہوا نظر آتا ہے اور ایسے میں طفیل صاحب کے ہیولیٰ کا اُبھرنا اور پھر وہ بھی بے محسوس طور پر اُبھرنا یقیناً ایک معجزہ سے کم نظر نہیں آتا۔

---

[1] کرنل ملک حبیب احمد خاں" از غلام رسول اظہر۔ 'نقوش' شمارہ جُون ۱۹۵۸ء

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کہتے ہیں کہ طفیل صاحب کی عُرفِ عام میں تعلیم کچھ واجبی سی تھی اور وہ ابتدائی طور پر محض کاتب تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ میرے ذہن میں جب بھی کسی کاتب اور خطاط کا نقش اُبھرا ہے اس نے اس میں ایک گونہ سنوارپن اور تہذیبی اُجلے پن کا مرقع دیکھا۔ جیسے لفظوں اور حروف کے صحیح تناسب، تال میل اور خوش آہنگ حُسن کے احساس نے خود اُسے عرفانِ ذات کی نغمگی، اور حسنِ توازن کی برجستگی و دارستگی سے نوازا ہو اور بطور فن کار اُسے جینے اور زندگی کرنے کا سلیقہ اور قرینہ بخشا ہو میرے نزدیک ایک اصیل کاتب فطرۃً محبت آمیز، خوش آہنگ اور خوش نغمہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے فن کو محنت شاقہ اور ریاض کی صلیب پر چڑھا کر، خونِ جگر سے سینچ کر، نقطہ بہ نقطہ، مُو بہ مُو اپنانا پڑتا ہے۔ جو بالآخر اُسے ایک فنی مجذوب اور صوفی منش درویش کی منزلِ مراد تک کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تکمیلِ ذات کے باب میں طفیل صاحب کا ابتداءً کاتب ہونا کچھ عیب نہیں۔ بلکہ میرے نزدیک یہی فنِ شریف اُن کی خوش طینتی کا بنیادی عنصر ہے کہ اُن کے حروف کی طرح ان کی زندگی میں بھی کچھ جھول نہیں۔ اُنھوں نے ہر قدم پر خود کو محنت، امانت اور نکھار کے پیکرِ دلکش و دلنواز میں پیش کیا اور وہ گلشنِ ادب میں ایک خاموش پھول کی مانند عمر بھر اپنے ماحول کو اپنی لطافت، رنگ و نکہت اور جانفزا بھینی بھینی خوشبو سے معطر و معنبر کرتے رہے۔ مقامِ شکر ہے کہ طفیل صاحب کی خوش آب، نغمہ جُو اور نغمہ پرور فطرتِ سلیم کا خوش نفس کاتب، عمر بھر ان میں زندہ، جیتا جاگتا اور اُن کو کروٹ کروٹ جگاتا رہا تا آنکہ محمد طفیل 'محمد نقوش' بن کر ادبِ عالیہ کے جگمگاتے ہوئے مجلّاتی صحیفوں کے ایوان میں مُدیرانِ شہیر کی صفِ اوّلین میں مسند آرا ہو کر سرافراز و خوش انجام ہو گیا۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ؎

سر شیخ عبدالقادر، مولانا تاجور نجیب آبادی، حکیم یوسف حسن، مولانا صلاح الدین احمد، منصور احمد، شاہد احمد، میاں بشیر احمد اور مولانا حامد علی خاں بیک نظر ادبی صحیفوں کی اُجلی پیشانی کے دل آویز اور جاذبِ نظر جھومر ہیں۔ مگر رُوپ انُوپ کی اس رنگا رنگی کے سیلِ نور میں طفیل کا 'نقوش' بھی حُسنِ تالیف و ادارت کی جان بخش تازگی، ادب آموز والہانہ شیفتگی اور جنوں پرور تحقیقی تشنگی لیے، ادب کے تشنہ نظر درماندگانِ سفر کے لیے کچھ کم نظر نواز نہیں۔

طفیل صاحب خود کو ادب کے کسی گروہی متعصبانہ خول میں بند نہیں کرتے۔ ان کے دل کی طرح ان کی ادارت کا کینوس بھی بہت وسیع ہے، ان کی فطرتِ سلیم اور ان کی طبیعت بو قلموں، نیرنگ اور لا متناہی امکانات کی عکاس ہے۔ اُن کے ترتیب دیئے ہوئے نقوش کے لاتعداد ضخیم شمارے اس امر کے شاہد ہیں کہ وہ کسی صنف میں بھی بند نہیں بلکہ ادبِ عالیہ کے ہر قابلِ ذکر میدان میں بطور مدیرِ شہیر و خوش تدبیر، خلوص، سچائی، تحقیق و جستجو اور بے مثل انفرادیت کا علم اُٹھائے کچھ اس شان سے اِکا بِکا، پا پیادہ رواں دواں ہیں کہ ہر منزل ان کو ایک نئی منزل کا سراغ دیتی ہے اور پھر ہر نئی منزل ان کو ایک نیا جادہ عطا کرتی ہے اور پھر اسی واسطہ سے وہ اپنی بے پناہ تخلیقی و تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختلف راستوں اور مختلف منزلوں سے ہوتے ہوئے بالآخر سیرتِ مُطہّرہ کے رسُولؐ نمبر کے عشرِ مُبشّرہ سے مشرّف ہو کر اپنی منزلِ مقصود کو پالیتے ہیں اور یُوں

انجام کار دائمی یُمن و سعادت سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

سیرت النبی کے تیرہ شاہکار رسولؐ نمبر طفیل صاحب کی نہ صرف ادبی زندگی کی معراج ہیں بلکہ فی نفسہٖ ایک منفرد اور عظیم دینی کارنامہ بھی ہے۔ جہاں وہ اپنے انمول تحفہ کے ساتھ ؎ "ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب" کا عاجزانہ استفسار لیے لاریب بارگاہِ رسالت مآبؐ کی آخری صف میں آخری آدمی ہونے کی تمنا پر بجا طور پر ایک سعید رُوح کا قالب ڈھالے ہوئے ہیں۔

طفیلؔ بنیادی طور پر ایک حقیقت شناس عملی انسان تھے۔ اُنھوں نے زندگی کو امانت جانا اور اُسے نفس نفس کشید کیا تاکہ "جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی" کا کچھ نہ کچھ تو حق ادا ہو سکے۔ وہ ہر روز حریصانہ اور حریفانہ طور پر ایک نئی تمنا پالتے اور پھر اُسے پورا کرنے میں لمحہ بہ لمحہ کاوش کرتے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں دیوانہ وار سرگرداں اور سربہ گریباں رہتے۔ وہ ادب کے کوہِ بے ستون میں صبح و شام فرہادی اور کوہکنی، جاں کنی کی حد تک کرتے۔ کوشش کی ہر ضربتِ تیشہ اِن کو مزید تحریک و تکمیلِ عمل پر اُکساتی۔ شب و روز محنت ہی ان کا وظیفۂ زندگی تھا۔ وہ شعوری طور پر اس حدیثِ پاک: اَلْجِھَادُ خُلُقِیْ "کوششِ تام میرے خمیر میں ہے" پر کاربند رہے اور اُنھوں نے عمر بھر جدّ و جہد ہی کو سعادت و عبادت جان کر حرزِ جاں بنایا۔

علامہ طبریؔ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب اُن کا انتقال ہوا اور یومِ ولادت سے لے کر یومِ وفات تک اُن کی زندگی کے دنوں کو اُن کے مؤلفات کے صفحات پر تقسیم کیا گیا تو ہر روز کے حصہ میں چالیس صفحات آئے۔ مجھے بھی نقوش کے لاتعداد ضخیم شماروں کے قطب مینار کو دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ اگر طفیل صاحب کی عمر کے دنوں کو نقوش کے صفحات پر تقسیم کیا جائے تو شاید روزانہ اوسط یہی آئے اور یوں وہ کمیت و کیفیت کے ساتھ ساتھ وافر مقداریت کے ضمن میں بھی ویسے ہی محیر خرد نظر آئیں۔

طفیل صاحب سے میرا ملنا اگرچہ بر سہا برس پر محیط ہے مگر بالجملہ کے ساتھ ملنا نسبتاً کم کم رہا۔ جن دنوں میں لاہور میں بھی تعینات رہا (اور سالہا سال رہا) اُن ملاقاتوں میں بھی وہ اکثر لئے دیئے اور گریز پا ہی نظر آئے، جیسے کسی کے نت نئے مقاصدِ جلیل ہوں مگر جب تک ان کی تکمیل کی صورت رُونما نہ ہو جائے وہ انھیں افشا نہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہوں اور ساتھ ساتھ اس کو یہ شدید احساس بھی دامنگیر ہو کہ زندگی نسبتاً کم اور ادائے فریضۂ فن ایک غیر مختتم جہدِ مسلسل ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ عمر بھر روائتی قسم کی محفل آرائی اور "گوہرِ مقصود گفتگوست" کے سحر انگیز کیف پرور اور پُرلطف مگر مفاہلۂ آسان نسخہ پر عمداً عمل پیرا نہ ہوئے بلکہ جستجو و تحقیق کی وادیٔ سنگلاخ میں پا برہنہ اور پا خفتہ "سینہ کے زور پر، کسی خضرِ راہ کی راہنمائی کا بارِ منت اُٹھائے بغیر، بکمال استقامت شب و روز چلتے رہے۔ ؎

بوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت است

بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت است

یادوں کے حسین جھروکوں میں مجھے وہ لمحات بے حد غنیمت اور عزیز نظر آتے ہیں، جب محمد طفیل گاہ گاہ کرم فرماتے اور لبوں پر دل آویز مسکراہٹ لیے سراپا محبت بنے، پرستان کے شہزادے کی طرح معانقہ ہوتے اور اپنی کاوشوں کا انمول تحفہ لبصورت نقوش خاموشی سے ہاتھوں میں تھما دیتے اور لمسِ رفاقت کا زندگی بخش احساس بخشتے۔

محمد طفیل عزمِ صمیم سے عبارت تھے اور خوب جانتے تھے کہ ؎

برہنہ سر ہو تو عزمِ بلند پیدا کر
کہ یاں فقط سرِ شاہی کے واسطے ہے کلاہ

انھوں نے فلک کج رفتار کی بے مہریوں کا گلہ شکوہ کرنے اور زمانہ کو بُرا بھلا کہنے کی بجائے وقت کو زندگی جانا اور پھر اس کی پوری پوری قدر و منزلت کی اور کسی فرصت کو بھی رخصت نہ جانا بلکہ اُسے مزید کام میں لا کر اسے مزید خوش مصرف کیا۔ "کام، کام اور کام۔ فقط کام"، ہی کے زندگی بخش سنہری اصول پر کاربند ہو کر وہ اس حدیثِ قدسی :۔ لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ أَنَا الدَّهْرُ ، زمانہ کو مت بُرا کہو۔ میں خود زمانہ ہوں ، کی عملی تفسیر کرتے رہے۔ اور یُوں ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی ودیعت شدہ صلاحیتوں کو مسلسل ریاض اور خوش سلیقگی سے کام میں لا کر تکمیلِ ذات کرتے رہے :۔ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا - بے شک کان، آنکھ اور دل سب کے سب محسوب و مسئول ہوں گے۔

طفیل صاحب کے نزدیک یہ سوال نہیں تھا کہ انھیں فطرت سے کیا کچھ ملا اور کیا کچھ نہیں ملا۔ بلکہ ان کے نزدیک محض یہ سوال تھا کہ جو کچھ بھی انھیں ارزانی ہوا وہ دستِ دوست سے ہے اور وہی بہت ہے جس پر شکر لازم آتا ہے اور شکر کی ابھی محض یہی ایک صورت ہے کہ ودیعت شدہ صلاحیتوں کو پورے طور پر مصرف میں لایا جائے اور لبطور تحدیثِ نعمت کسی لمحہ بھی اس حق کی ادائیگی میں کوتاہی اور قضائے عمری نہ ہو اور یُوں اپنی ذمہ داریوں کو خدائے بخشندہ کے معیّنہ وقت میں ختم کرنے کے لیے انسان ہمہ وقت عجلت کوش اور زُود باش ہو ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بہ فکرِ سُود باش
اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زُود باش

محمد طفیل محض مؤلف ہی نہیں بلکہ ایک چونکا دینے والے مصنف بھی ہیں۔ وہ کم آمیز تھے، مگر خوش آمیز تھے۔ وہ خلوت پسند اور عزلت گزیں ہونے کے باوجود رشک کی حد تک کثیر الاحباب تھے اور پھر اُن احباب کے تجزیاتی حاصل پر بھی اُن کی نظر تھی۔ ان کے خاکوں کے مجموعے: "آپ"، "صاحب"، "جناب"، "محترم"، "مکرم"، "محبّی" اور "مخدومی" اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

طفیل صاحب نے رائٹرز گلڈ کو غیر معمولی حد تک مفید اور فعال بنایا اور اس کے ذریعے اُنھوں نے ادیبوں اور شاعروں کی ٹھوس خدمت کی۔ وہ ایک دلِ دردمند رکھتے تھے اور اس اعتبار سے ادیبوں اور شاعروں کے دُکھ درد کو سمجھتے تھے اور اس میں نہ صرف برابر کے شریک تھے بلکہ اس کے ازالہ کرنے کو بھی اپنا فرضِ اوّلیں سمجھتے تھے اور اس ضمن میں شہپر پرواز رکھتے تھے جو صدارت کے کاخ و کُو تک حاوی تھی" نقوش" طفیل صاحب کا پیشہ نہیں شوق تھا،

ایسا شوق جس کی تکمیل کے لیے انھوں نے ہرچہ بادا باد اپنے چھاپہ خانہ کی مشینیں تک بخوشی فروخت کر دیں۔ نقوش محمد طفیل کی رُوح میں اس قدر حلول کر گیا کہ "تو من شدی، من تو شدم" کے مصداق وہ باہمدگر ایک ہو گئے اور حضرت بابا بلھے شاہ کی سیف زبان میں: "رانجھا رانجھا کہندی، میں آپے رانجھا ہوئی"۔ اب محمد طفیل گویا 'محمد نقوش' ہو گئے اور یُوں 'نقوش' ان کی مستقل پہچان اور دمِ واپسیں تک حرزِ جاں بن کر رہ گیا۔

مجلاتی صحافت میں نقوش کا پایہ نیرنگِ خیال، عالمگیر، ہمایوں، ادبی دنیا، ساقی اور ادبِ لطیف سے بھی اس لحاظ سے منفرد اور ممیز ہے کہ نقوش نے جامع، منظم اور انسانی استطاعت و کاوش کی حد تک منتہی نمبر پیش کیے۔ نقوش کا ہر عام شمارہ بھی خاص ہے اور خاص شمارہ بالالتزام خاص الخاص ہے۔ جو مستند ادبی وقعت اور علمی توقیر و فضیلت لیے ہوئے ہے طفیل پہلے بے حد غور و خوض کے بعد اپنا موضوع اختیار کرتے ہیں اور پھر اپنے منتخب موضوع سے کماحقہٗ انصاف کرتے ہیں۔ ان کے جملہ شماروں کا مواد مستند، محققانہ اور معلومات افزا ہے جو موضوعات کے ماضی، حال اور استقبال تک محیط ہے۔ ان کا مرتبہ کوئی سا نمبر اُٹھا لیجیے: غزل نمبر، افسانہ نمبر، شخصیات نمبر، آپ بیتی نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح نمبر، لطیفس نمبر، شوکت تھانوی نمبر، سعادت حسن منٹو نمبر، لاہور نمبر، انیس نمبر، میر نمبر، غالب نمبر، ادبی معرکے نمبر، اقبال نمبر اور بالآخر رسولؐ نمبر، یہ سب کے سب نمبر اپنی مثال آپ ہیں اور ان میں جمع شدہ تحقیقی و علمی مواد پر آنے والے نقاد اور ادیب کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہے کہ محمد طفیل موضوع کے انتخاب کے بعد کس کس طرح اس کی تکمیل کرتے۔ کتنے ماہ و سال اور کتنے شب و روز بے حال اور بے خواب رہ کر دیدہ و دل کے چراغ جلاتے۔ کیسی کیسی تلاش اور تفحص سے اہلِ علم تک پہنچتے اور پھر اُن سے اُن کی عمر بھر کی کاوش کا حاصل کیسی کیسی جدوجہد سے بروقت حاصل کرنے کا اہتمام کرتے اور پھر اپنے اعلیٰ علمی مذاق اور حسنِ نظر کے ساتھ اُسے انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب انداز میں پیش کرتے کہ ہر شمارے کا حرف حرف بول اُٹھتا جیسے طفیل صاحب کے اندر کا فن کار کاتب ہمہ وقت زندہ و پائندہ اور احتسابا گر برسرِ کار رہا او خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہو۔

نقوش کے جملہ شمارے ادبِ عالیہ میں مُستند حوالے ہیں۔ وہ مستقل اور پائیدار مؤلفات ہیں اور ان کا مطالعہ غایت درجہ مفید اور ہمہ جہت جامع ہے۔ لاریب طفیل صاحبانِ توفیق اور ارباب ہمم میں سے ہیں جن کے حال پر اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بطورِ خاص کرم ہو۔ فی الحقیقت طفیل اپنے سچے جذبۂ شوق کی تکمیل میں اپنی منزلِ مراد کو پہنچ گئے۔ علی الخصوص ان کا جذبۂ عشقِ رسولؐ سرخرد اور طغرائے سعادت لیے ہوئے ہے۔ اور خواجہ کونین کی لازوال محبت کا پَرتو ہے جو خواجہ کونینؐ ؎

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

اور یُوں طفیل نے بندۂ عشقِ رسولؐ بن کر خود کو اُمر کر دیا اور جریدۂ عالم پر بہ توفیقِ ایزدی اور بفیضِ

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم اپنا نقشِ دوام ثبت کر دیا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اور بقول طفیل :

"آج میری وہ آرزو پوری ہوئی جس کے لیے برسوں بے کل رہا۔ آج میں کہہ سکتا ہوں کہ حضورؐ سے میری بھی کوئی نسبت ہے۔ اس اعزاز پر خدا کی بارگاہ میں جتنے بھی سجدے کروں وہ کم ہوں گے۔ کیونکہ آج میں بھی کسی شمار قطار میں ہوں!"

؎ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

نصف صدی کا قصّہ

محمود عالم قریشی

۱۹۴۱ عیسوی کی بات ہے جب مَیں تھرڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں میں اور عطاء اللہ قاضی جو فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا حکیم قریشی صاحب کے مطب کے نزدیک دل محمد روڈ پر ایک بیٹھک میں رہتے تھے۔ اسی زمانہ میں عطاء اللہ نے میری ملاقات لطیف فاروقی سے کرائی۔ یہ بچوں کا ایک رسالہ "سعادت" نکالتے تھے اور خود ہی اس رسالہ کے گل کوزہ اور کوزہ گر تھے۔ یعنی مدیر طابع اور ناشر سب کچھ خود ہی تھے۔ لطیف فاروقی کے ذریعہ چند اور لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں محمد طفیل بھی شامل تھے جو لطیف کے بہت اچھے دوست تھے۔ دل دادگان ادب کا یہ ایک چھوٹا سا حلقہ تھا جس میں ایک بزرگ مولانا حفظ الرحمٰن (پیسہ اخبار والے) اور نصیر احمد جامعی بھی شامل تھے ہم سب اکٹھے مل بیٹھتے خصوصاً تعطیل کے دن۔ ان نشستوں میں علمی ادبی گفتگو ہوتی۔ نصیر اور مولانا ادبی لطائف سناتے اور مولانا علمی باتوں کے ساتھ ساتھ علماء و مشاہیر کے حالات و واقعات بھی سناتے۔ میں طالبانہ ذوق کے ساتھ یہ باتیں سنتا۔ طفیل بھی خاموشی متانت اور سنجیدگی سے یہ گفتگو سنتے رہتے اور کبھی کبھی اچانک کوئی تیکھا جملہ بول کر پھلجھڑی سی چھوڑ دیتے۔ اس وقت تک طفیل چند دیگر ادیبوں اور شاعروں سے ذاتی میل ملاقات پیدا کر چکے تھے ان میں حفیظ جالندھری، سیف الدین سیف، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی اور حمید نسیم جیسے لوگ شامل تھے۔

کچھ ہی عرصہ میں طفیل، عطاء اللہ قاضی کے اچھے دوست بن گئے مگر مجھ سے اُن کا واجبی سا تعلق رہا۔ اس زمانہ میں طفیل آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ مستقبل میں ہم لڑکوں میں سے کون کیا بننے والا ہے۔ میں اور عطاء اللہ تو سرکاری ملازمت میں پڑ گئے مگر طفیل میدان ادب میں کود پڑے اور اُنہوں نے جو پَر پُرزے نکالے وہ ہم سب کے سامنے ہیں مگر ان کے اس وقت کے انداز اور حالات میں ہم میں سے کسی کو بھی اس کا سان گمان نہ تھا۔

۱۹۴۲ عیسوی میں ملازمت ملنے پر میں شملہ چلا گیا اور ان محفلوں سے محروم ہو گیا۔ لطیف فاروقی سے میری خط و کتابت چلتی رہی ۱۹۴۳ء یا ۴۴ء میں لطیف فاروقی کی شادی پر مجھے ایک بار پھر لاہور آنے کا اتفاق ہوا۔ اس موقع پر طفیل سے بھی ملاقات ہوئی۔ شادی پر طفیل نے لطیف کو دو سو روپے سلامی دی جو اس وقت کے لحاظ سے ایک بڑی رقم تھی۔ لطیف اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھے کیونکہ وہ طفیل کے مالی حالات سے پوری طرح واقف تھے مگر طفیل کے سامنے انہیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔

شملہ سے ہمارا دفتر ۱۹۴۶ء میں دہلی آ گیا۔ میں لودھی روڈ کوارٹرز میں ایک عزیز کے ہمراہ رہتا تھا عطاء اللہ بھی اسی بلاک میں سامنے ہی اپنے بھائی کے ہمراہ رہتا تھا۔ وہ ان دنوں محکمہ خوراک میں راشننگ انسپکٹر تھا۔ ۱۹۴۶ء کے آخر کی بات ہے ایک دن عطاء اللہ نے اطلاع دی کہ طفیل آئے ہوئے ہیں اور فتحپوری کے علاقہ کے ایک ہوٹل میں مقیم ہیں، اگلے

دن صبح میں اور عطاء اللہ ان سے ملنے ہوٹل پہنچے۔ یہ بیٹھے ناشتا کر رہے تھے اور شیخ محمد امین صاحب بھی اُن کے ہمراہ تھے شیخ صاحب میری طالب علمی کے زمانہ میں اسلامیہ کالج لاہور، ریلوے روڈ میں لائبریرین ہوتے تھے طفیل نے ہمارے لئے بھی ناشتا طلب کیا میں نے کہا "یہ تو مناسب نہیں، آپ ہمارے مہمان ہیں، ہمیں آپ کی خدمت کرنا چاہیئے۔" لیکن اُنہوں نے یہ کہہ کر ہمارا اعتراض مسترد کر دیا کہ "فی الحال تو ہم سب اس ہوٹل کے مہمان ہیں۔" یہ اُن کا کاروباری دورہ تھا اس وقت تک یہ ناشر کتب بن چکے تھے اور ادارہ فروغ اُردو کے نام سے معیاری اور خوبصورت کتابیں شائع کر رہے تھے۔ اس موقع پر غالباً یہ بعض قدیم کتب کی تلاش میں آئے تھے جس کے لئے شیخ محمد امین صاحب کی مدد انہیں درکار تھی۔ اسی لئے وہ اُن کے ہمراہ تھے۔

دو تین دن قیام کے بعد طفیل واپس لاہور چلے گئے وہاں سے میرے نام اُن کا خط آیا، میرے نام اُن کا یہ پہلا خط تھا جسے پڑھ کر حیران رہ گیا تھا یہ تو بعد میں پتا چلا کہ یہ حضرت لوگوں کو حیران کر دینے میں استاد ہیں۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس خط کے ساتھ سینکڑوں روپے مالیت کی اُن کی مطبوعات کی بلٹی منسلک تھی اور ان کتابوں کے نکاس کا بار میرے ناتجربہ کار کمزور کاندھوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ نہ کوئی ضمانت طلب کی گئی تھی نہ کتب کی قیمت کا فوری مطالبہ تھا بلکہ میری رہنمائی کے لئے ضروری اور مفید ہدایات لکھی تھیں اور میرے لئے اس سلسلہ میں کچھ کمشن بھی مقرر کیا تھا۔ یوں طفیل نے بلا میرے ارادہ اور پیشگی آگاہی کے مجھے اپنے کاروبار میں معاون بنا لیا میری حیرت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ طفیل نے عطاء اللہ جو ان کے زیادہ قریب اور دوست تھا کو چھوڑ کر مجھ ناچیز کو کیوں اس کام کے لئے منتخب کیا۔

اس پہلے خط کے ساتھ میرے لئے ان کا یہ پہلا التفات تھا اس کے بعد تو ان کے خطوط کا سلسلہ جاری ہو گیا جن میں کچھ باتیں کاروباری اور کچھ لگاوٹ کی ہوتیں ساتھ ہی ساتھ ان کے التفاتات کی بارش سی شروع ہو گئی اور طفیل مجھے مقناطیسی قوت سے اپنی طرف کھینچتے اور قریب تر کرتے چلے گئے یہاں تک کہ من تو شدم کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ دراصل طفیل ایک ایسی مرنجاں مرنج شخصیت تھی کہ ہر شخص جس سے اُن کی میل ملاقات قائم ہو جاتی خود کو ان کی طرف کھنچتا محسوس کرتا اور یوں محسوس کرتا جیسے وہ اُن کا عزیز ترین دوست ہے۔

پاکستان بن گیا۔ میں کراچی آگیا۔ یہاں بھی میرا اُن کا وہ کاروباری تعلق قائم رہا جو تقریباً سال بھر پہلے دہلی میں شروع ہوا تھا یہاں طفیل نے مجھے اپنے ادارہ کا واحد نمائندہ اور سول ایجنٹ مقرر کر دیا اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے کراچی کے کتب فروشوں کو اپنی مطبوعات براہ راست دینا بند کر دیں اور وہ سب اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اُن کی مطبوعات مجھ ہی سے لیں۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں اُنہوں نے احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں ماہنامہ "نقوش" جاری کیا تو کراچی کے لئے اس کی ایجنسی بھی میرے سپرد کر دی ان دنوں اُردو رسائل میں "سویرا" کا طوطی بولتا تھا جو ترقی پسند ادب کا نقیب تھا۔ "نقوش" کے مدیر خود ترقی پسند ادیب تھے لہٰذا یہ بھی اسی ادب کا نمائندہ بن کر جلوہ گر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُردو ادب کی دنیا پر چھا گیا اور اپنے ہم عصر جرائد کو پیچھے چھوڑ گیا۔

"نقوش" کے اجراء کو چند ماہ گزرے تھے کہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ادارہ فروغ اُردو کے منیجر عبدالسلام ندوی کے خط سے

معلوم ہوا کہ طفیل کو شدید قسم کا ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا، اب رو بصحت ہیں پھر طفیل کا خط آیا صحت تو ہو گئی ہے مگر کمزوری بہت زیادہ ہے، آرام کرنا چاہتا ہوں اور اس غرض سے آپ کے پاس کراچی آنا چاہتا ہوں" اور دسمبر ۱۹۴۸ء کے آخر میں میرے پاس کراچی آ گئے۔ اس وقت یہ تو بیوی بچوں والے تھے مگر میں ابھی مجرد تھا اور بزنس روڈ کے علاقہ میں گلی نمبر ۲ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ عطاء اللہ قاضی بھی اسی گلی میں ایک دوسری بلڈنگ میں اپنے بھائی کے ہمراہ رہتا تھا۔

صبح میں دفتر چلا جاتا اور طفیل آرام و مطالعہ کرتے رہتے۔ دوپہر کو وقفہ میں گھر آتا اور ہم دونوں جا کر کسی صاف ستھرے ریستوران میں کھانا کھاتے اور گپ لگاتے۔ میں پھر دفتر چلا جاتا اور یہ بستر پر۔ شام کو دفتر سے فارغ ہو کر میں آتا اور طفیل کو لے کر کہیں سیر کو نکل جاتا کبھی ہم بازاروں کے چکر لگاتے، کتب فروشوں سے ملتے" ادارۂ فروغ اُردو کی مطبوعات اور "نقوش" کی نکاسی کا کام کرتے، کچھ خریداری بھی کر لیتے۔ کبھی فریئر ہال کی سیر کرتے، کبھی سمندر کے کنارے کلفٹن، کیماڑی یا منوڑہ چلے جاتے کلفٹن کی سیر میں ایک دو مرتبہ "تاج بک ڈپو کے نیجر عبدالرشید، رئیس احمد جعفری اور رشید اختر ندوی بھی ہمارے ساتھ شریک رہے" ان دنوں رئیس احمد جعفری تاج بک ڈپو سے منسلک تھے اور رشید اختر ندوی کی ، بیٹھک بھی اُن کے ساتھ وہیں جمتی تھی۔ پہلی مرتبہ کلفٹن کا شام کا منظر دیکھ کر طفیل نے اس کی تحسین و تعریف کرتے ہوئے کہا" یار یہ تو بڑی حسین جگہ ہے جی چاہتا ہے یہیں ڈیرا ڈال لیا جائے اللہ میاں نے ہم سے ناحق جنت کا وعدہ کیا' اگر وہ کلفٹن جیسی جگہ کا ہی وعدہ کرتا تو میں ضرور زندگی میں کچھ اچھے اور نیک کام کرتا۔"

اس قیام کے دوران طفیل نے اپنی بیماری اور صحت یابی کا حال سنایا بخار آیا جو اترنے کا نام نہ لیتا تھا بھوک ختم ہوتی گئی حتیٰ کہ کھانے پینے سے طبیعت بیزار ہو گئی۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ چند دن بعد ڈاکٹر نے اعلان کر دیا کہ یہ ٹائیفائیڈ ہے آنتوں میں زخم ہو گئے ہیں۔ دوا اس کے مطابق بدلی گئی لیکن حالت بگڑتی گئی جس سے گھر والے ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ ایسے میں ایک صبح آنکھ کھولتے ہی طفیل نے حلوہ کھانے کی فرمائش کر دی۔ پہلے تو گھر والے خوب گرجے برسے اور بولے، کہ سا گو دانہ تو کھا نہیں سکتے اور چلے ہیں حلوہ کی فرمائش کرنے۔ یہ منہ اور مسور کی دال، کوئی حلوہ نہیں ملے گا۔ لیکن ان کی ضد قائم رہی آخر گھر والوں نے اس کو ان کی آخری خواہش خیال کرتے ہوئے ان کی مرضی کے مطابق کافی گھی ڈال کر تیلا تیلا حلوہ بنا کر انہیں کھلا دیا اس حلوہ نے اچھا اثر کیا ان کی بگڑتی حالت سنبھلنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے حلوہ نے ان کی آنتوں کے زخموں پر مرہم کا کام کیا اور یہ رو بصحت ہونے لگے۔ طفیل نے بتایا کہ ان کی حلوہ کھانے کی ضد ایک خواب کی بنا پر تھی اُنہوں نے دیکھا تھا کہ ایک بزرگ انہیں تیلا تیلا گرم حلوہ کھلا رہے ہیں جس سے یہ بہتر محسوس کر رہے ہیں

ایک روز میں دوپہر کو وقفہ میں گھر آیا تو طفیل کے سرہانے ایک دو میٹوں پر کچھ نوٹ کیا پڑا تھا۔ میں نے ڈانٹا" آپ یہاں آرام کرنے آئے ہیں یا دنیا جہان کے کام۔" بولے کہ لیٹے لیٹے کچھ خیال آیا سو نوٹ کر لیا۔ میں نے سلپیں اٹھا کر دیکھیں، ادبی قسم کے درجن بھر نام لکھے تھے۔ میں نے پوچھا کیا ان عنوانات پہ مضامین لکھنے یا لکھوانے کا ارادہ ہے یا یہ کچھ نئی مطبوعات کے نام تجویز ہوئے ہیں بولے ایسا کچھ نہیں ہے، ایک رسالہ نکالنے کا ارادہ ہے اس کے لئے جو نام ذہن میں آئے لکھ لئے۔ اب ان میں سے کوئی اچھا سا نام منتخب کرنا ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ "نقوش" کے ہوتے ہوئے ایک اور رسالہ چہ معنی دارد۔ طفیل نے اپنے

منصوبہ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ وہ انگریزی رسالہ "ریڈرس ڈائجسٹ" کے انداز کا ایک اُردو مجلہ نکالنے کا خیال مدت سے لئے پھر رہے ہیں، کافی غور وخوض کے بعد اب سوچا ہے کہ چونکہ برصغیر پاک و ہند کے تمام اُردو ادبی رسائل و جرائد ہر قاری کی دسترس میں نہیں اور اس کے مالی وسائل بھی تمام رسائل کی خرید اور مطالعہ کی اجازت نہیں دیتے لہٰذا ان تمام مجلوں سے ایک انتخاب ہر دو ماہ بعد شائع کیا جائے اس میں اندیشہ تھا کہ نقوش کے نکاس پر برا اثر پڑے گا اور اس میں خسارہ کا سامنا کرنا پڑے گا منصوبہ کے تمام پہلوؤں پر بحث و مباحثہ ہوا۔ آخر تمام پہلوؤں پر غور کے بعد فیصلہ ہوا کہ نقوش کا تھوڑا سا نقصان قبول کر لینا چاہئیے اور یہ نیا رسالہ جاری ہونا چاہئیے رسالہ کی نوعیت کے اعتبار سے مجوزہ ناموں پر تبادلۂ خیال ہوا اور "روح ادب" نام پر اتفاق رائے ہو گیا۔

جنوری ۱۹۴۹ء کے آخر میں "روح ادب" کی حتمی سکیم کے ساتھ طفیل واپس لاہور چلے گئے فروری ۱۹۴۹ء میں اُن کا خط آیا کہ وہ "روح ادب کی کتابت شدہ کاپیاں لے کر آ رہے ہیں یہ رسالہ کراچی سے شائع ہو گا پھر طفیل آئے۔ ڈیکلریشن وغیرہ کے ضروری مراحل طے کئے اور روح ادب کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہو گیا۔

روح ادب کے پہلے شمارہ کی پروف ریڈنگ میں نے اور طفیل نے مل کر کی اس کے دوران کاتبوں کی گلکاریوں پر ہم نے خوب خوب قہقہے لگائے اور لطف اُٹھایا اس شمارہ میں ابراہیم جلیس کا ایک مزاحیہ مضمون "ہاتھ ملائیے" بھی شامل تھا اس کی پروف ریڈنگ کے دوران تو ہم ہر ہر فقرہ پر بلند بانگ قہقہے اُڑاتے اور ہاتھ ملاتے رہے۔

"روح ادب" کی ادارت طفیل نے خود سنبھالی اور اپنے ساتھ خدیجہ مستور کو یوں شریک کیا۔ جیسے اصل مدیرہ وہی ہوں اور طفیل خود صرف پانچویں سوار۔ اس مجلہ کے طابع و ناشر بھی طفیل ہی تھے۔ مقامی طور پر "روح ادب" کی طباعت اور اشاعت اور دیگر انتظامی امور میرے ذمہ تھے۔

"روح ادب" کے اجراء کے موقع پر دو ایک معروف ادیبوں نے مدیر کو تہنیت اور مستقبل میں کامیابی کی تمنا کے خطوط لکھے ان میں ایک طفیل کے بے حد عزیز دوست بھی شامل تھے۔ ان دوست نے مدیر یا طفیل کے بجائے خدیجہ مستور کو ان کے نام سے مخاطب کر کے لکھا "اس قسم کے رسالہ کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی .... مجھے "روح ادب" کی کامیابی اور مقبولیت پر یقین ہے اس لئے کہ انتخاب اُردو کی ایک نامور اور ستھرے ذوق کی ادیبہ یعنی آپ کریں گی، اور رسالہ کی گیٹ اَپ برادرم طفیل کے سپرد ہو گی جو اس سے پہلے "نقوش" میں اپنے حسن ذوق کا ثبوت دے چکے ہیں"۔ ان الفاظ کے پردہ میں اس عزیز دوست نے نہ صرف طفیل کو مدیر تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ بلکہ ان کی ادبی صلاحیتوں اور ذوق کو بھی یک قلم مسترد کر دیا اور انہیں صرف ایک باذوق اور اچھا پبلشر شمار کیا۔

طفیل نے "روح ادب" کے تین شمارے شائع کئے۔ تیسرا شمارہ مرزا رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا" پر مشتمل تھا اس میں ناول پر عبدالسلام خورشید کا ایک مبسوط تبصرہ بھی شامل تھا۔ اس کے بعد "روح ادب" بند ہو گیا۔ وجہ پرچہ کو لاہور سے کتابت کرا کے اور مرتب کر کے کراچی بھجوانا اور وہاں سے وقت پر شائع کرنے کی دشواریوں کے علاوہ وہی وجہ تھی جو اکثر ادبی پرچوں کی موت کا باعث ہوتی ہے، یعنی مالی خسارہ۔

"روحِ ادب" میں امراؤ جان ادا کی اشاعت کے بعد ایک صاحب نے کراچی سے طفیل کو رائلٹی کے لئے نوٹس بھجوا دیا۔ ان صاحب نے خود کو مرزا رسوا کا پوتا اور واحد وارث و ناول کی اشاعت کے حقوق کا مالک ظاہر کیا تھا طفیل کے پاس کسی اور حقدار کی طرف سے باقاعدہ تحریری حقوق اشاعت موجود تھے۔ اس بنیاد پر طفیل ان صاحب کو لکھتے اور سمجھاتے رہے کہ آپ کا مطالبہ جائز نہیں مگر وہ صاحب بدستور اپنے حقوق جتاتے اور طفیل سے رائلٹی کا مطالبہ کرتے رہے۔ آخر کار طفیل تمام کاغذات لے کر کراچی آ گئے اور ان صاحب کو بھی میرے یہاں ملاقات کا وقت دے دیا کہ آ کر بالمشافہ گفتگو سے معاملہ طے کر لیں۔ ادھر مجھے بھی تاکید کر دی کہ اس وقت پر موجود رہوں۔ مرزا رسوا کے یہ پوتے تشریف لائے صورت پر غربت، مفلوک الحالی اور مسکینی برس رہی تھی، صحت تباہ نظر آ رہی تھی، لباس اور وضع قطع لٹی پٹی شرافت اور خاندانی وجاہت کی مکمل تصویر تھی۔ دیکھ کر ان پر ترس آ رہا تھا۔ طفیل نے دو ٹوک بات کی، دائمی حقوق اشاعت کی جو سند ان کے پاس تھی دکھائی اور واضح کر دیا کہ اس کے پیش نظر وہ ان سے کوئی مطالبہ نہیں کر سکتے اگر مقدمہ بازی کریں گے تو بھی کچھ حاصل نہ ہو گا سوائے پریشانی اور مالی زیر باری کے۔ تاہم انہیں ایک ضرورت مند جان کر طفیل نے ازراہ ہمدردی ان کو چار سو روپے کی پیش کش کی اور کہا کہ وہ اس کو اپنا حق نہیں بلکہ ایک تحفہ سمجھ کر قبول کر لیں اور اپنے فرضی حقوق سے دستبرداری کی تحریر لکھ دیں۔ وہ صاحب اس پر راضی ہو گئے چنانچہ میری گواہی میں انہوں نے تحریر لکھ دی اور رقم لے کر شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ مجھے ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ پاکستان بننے اور حیدر آباد دکن پر حکومت ہند کے قبضہ کے بعد ابراہیم جلیس جیسے تیسے جان کی امان کے لئے لاہور پہنچ گئے دوسرے علاقوں کے مہاجرین کی نسبت یہ زیادہ پریشاں حالی اور بے سرو سامانی کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ طفیل سے "نقوش" اور ناشر کتب کے حوالہ سے ملاقات ہوئی۔ باتیں کرتے کرتے ابراہیم جلیس بے ہوش ہو گئے۔ طفیل نے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے ان کو ہوش میں لائے پھر ہلکا گرم دودھ پلایا۔ دودھ پی کر تھوڑی دیر بعد جب جلیس کے حواس بجا ہوئے تو طفیل نے بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ حال اور چہرہ پر اُڑتی ہوائیوں کی وجہ دریافت کی تو جلیس کی خودداری کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ اس نے آب دیدہ ہو کر سارا راز اگل دیا اور بتایا کہ وہ تین دن کے فاقہ سے ہے جیب خالی ہے، کام کوئی ملا نہیں، سفید پوشی اور عزتِ نفس کسی دوست کے سامنے بھی ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہیں دیتی طفیل نے انہیں دلاسہ دیا نزدیک کے ایک ریستوران میں لے جا کر کھانا کھلایا اور خاموشی سے سو روپے جلیس کی جیب میں ڈال دیئے

ایک اور واقعہ سن لیجئے طفیل نے کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا۔ وہ تو سگریٹ تک نہیں پیتے تھے بلکہ پان بھی نہیں کھاتے تھے۔ لیکن ایک دن انہوں نے سعادت حسن منٹو کو ایسی حالتِ طلب میں دیکھا کہ اگر اسے فوری طور پر شراب نہ ملی تو وہ مر جائے گا ایسے میں انسانی جان کی حرمت و عظمت جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے ان پر ایسی غالب آئی کہ یہ شراب کی حرمت بھول گئے اور منٹو کی جان بچانے کے لئے خود شراب کی بوتل لا کر منٹو کو دی۔

طفیل ناشر کتب تو تھے ہی پھر انہوں نے ۱۹۴۸ء میں دو اور ناشر دوستوں مبارک علی اور عبدالسلام کے اشتراک سے ایک نئے ادارہ کی داغ بیل ڈالی جس کا نام "الناشر لمیٹڈ" رکھا گیا۔ وسط ۱۹۴۸ء میں اس ادارہ کے تحت بیک وقت تین کتابیں

شائع ہوئیں ان میں سے دو کے نام یاد رہ گئے ہیں ایک "رخسانہ" اور دوسرا رشید اختر ندوی کا ناول "۵ اگست" افسوس کہ اشتراک ان تین کتب کی اشاعت سے آگے نہ چل سکا وجہ دوستوں کے ساتھ کوئی تنازعہ یا سانجھے کی ہانڈی بیچ چوراہے میں پھوٹنے والی بات نہ تھی کہ طفیل صبح جلد اور سب سے پہلے آ کر "اناشر" کے دفتر میں بیٹھ جاتے اور شام کو مغرب سے پہلے ہی دفتر بند کر کے گھر چل دیتے ان کے ساتھی صبح دیر سے آتے اور چاہتے کہ شام کو دیر تک دفتر کھلا رہے اور طفیل بھی ان کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ طفیل اپنی خو نہ بدل سکے اور کند ہم جنس با ہم جنس پرواز پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ یہ شام کو دیر تک نہیں رک سکتے تھے۔ کیونکہ ان کی والدہ سر شام سے ہی ان کا انتظار کرتی تھیں۔ طفیل ماں کو انتظار کی کوفت میں مبتلا دیکھنا گوارہ نہ کرتے تھے۔ انہوں نے دوستوں کو اپنی مجبوری بتائی اور جب دوست اپنی خو نہ بدل سکے تو طفیل اس اشتراک سے الگ ہو گئے۔

جنوری ۱۹۴۹ء میں طفیل کے قیام کراچی کی یادگار کے طور پر ہم دونوں نے ایلفنسٹن سٹریٹ پر ایک مشہور فوٹو گرافر کی دوکان سے اکٹھے ایک تصویر کھنچوائی جو ان کے لاہور واپسی کے بعد تیار ہو کر ملی۔ جب میں نے اس تصویر کی ایک نقل طفیل کو بھیجی تو انہوں نے لکھا "تصویروں کے سلسلہ میں فوٹو گرافر کو گالیاں دے رہا ہوں اور نہ جانے اس سے پہلے اسے کتنی گالیاں دے چکا ہوں۔ میں تو ذرا صورت سے "جغد صحرائی" ہی معلوم ہوتا ہوں فوٹو گرافر نے تو تصویر میں آپ کو بھی یہی بنا کر رکھ دیا ہے"۔ اس اظہار ناپسندیدگی کے باوجود کچھ عرصہ بعد انہوں نے یہی تصویر "نقوش" کے ایک شمارہ میں شائع کر دی۔

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں میری شادی ہوئی۔ طفیل اس میں شرکت کے لئے کراچی آئے اس موقع پر انہوں نے ایک سہرا پیش کیا جس کی بہت سی کاپیاں یہ گلابی کاغذ پر سنہری حروف میں چھپوا کر ہمراہ لائے تھے جو نکاح کے بعد حاضرین مجلس میں تقسیم کی گئیں طفیل کے انکسار اور شرمیلے پن کی وجہ سے یہ سہرا عطاء اللہ قاسمی نے پڑھا تھا طفیل شاعر نہ تھے لہٰذا وہ یہ سہرا اپنے ایک عزیز دوست اور نامور شاعر و افسانہ نگار سے لکھوا کر لائے تھے۔ اس سہرے کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ یہ سہرے کے روایتی انداز سے ہٹ کر تھا اور اس میں "روح ادب" اور "نقوش" کے حوالہ سے بات کی گئی تھی نیز یہ ایک ایسے شاعر نے لکھا تھا جو کبھی کسی کی بھی فرمائش پر سہرا نہیں کہتے، طفیل نے انہیں نہ جانے کیسے رام کر لیا تھا غالباً موصوف کا کہا ہوا یہ واحد سہرا ہے اور خاکسار کو اس واحد ہستی ہونے کا فخر ہے جس کی شادی کے لئے موصوف نے سہرا کہا اور جس کی شادی پر طفیل نے سہرا پیش کیا۔

احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کے بعد وقار عظیم بھی "نقوش" کی ادارت سے دستبردار ہو گئے تو ۱۹۵۱ء میں طفیل ناشر کے ساتھ ساتھ بازعم خود مدیر "نقوش" بھی بن بیٹھے یہ جسارت کرنے سے پہلے انہوں نے دو ایک مخلص کرم فرماؤں سے مشورہ کیا کہ وقار عظیم کے بعد ان کے پایہ کے کس ادیب کو "مدیر نقوش" بنایا جائے۔ مختلف آراء تھیں، بڑے بڑے نام سامنے آئے لیکن طفیل کو ان میں سے کوئی بھی نہ جچا۔ انہوں نے ایک دن مولانا محمد اسماعیل پانی پتی سے بھی مشورہ کیا بلکہ وہ خود اس مشورہ میں شامل ہو گئے۔ ہوا یوں کہ جب مولانا ان سے ملنے آئے تو ان کو متفکر پا کر پوچھا بیٹا کس فکر میں غلطاں ہو کہ مرجھائے مرجھائے نظر آ رہے ہو طفیل نے اپنی مشکل بتائی۔ مولانا سن کر خاموش ہو گئے اور طفیل کو دوسری باتوں میں لگا لیا۔ جب جانے لگے تو آہستہ سے کہا "میری مانو تو اب تم "نقوش" کی ادارت کے لئے کسی ادیب کو تلاش نہ کرو اور یہ ذمہ داری خود سنبھال لو تمہارے اور "نقوش" کے لئے یہی بہتر

ہے"۔ بات دل لگتی تھی کیونکہ طفیل خود اسی انداز سے سوچ رہے تھے بس جرأت نہیں ہو رہی تھی مولانا محمد اسماعیل کی بات نے اُن کی جرأت کو تقویت بخشی اور طفیل نے "نقوش" کے اگلے شمارہ کی ترتیب و تدوین کرکے اسے شائع کردیا اور مدیر کی جگہ اپنا نام دے دیا۔ یہ اپریل ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب طفیل کو سیکڑوں خشمگیں نگاہوں اور چڑھے تیوروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ کسی کو بھی ان کا یہ زعم پسند نہ آیا تھا۔ بہت سے "ادیبوں" کی کڑوی کسیلی باتیں طفیل کے بدلہ مجھے سننا پڑیں، کچھ اس لئے کہ لاہور میں بیٹھے تھے اور کینے والے کراچی میں جہاں میں موجود تھا۔ کچھ اس لئے کہ ان لوگوں میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ براہ راست طفیل کو کچھ کہہ یا لکھ سکتے لہٰذا وہ مجھے سنا سنا کر کہتے تاکہ میں ان کی باتیں طفیل تک پہنچا دوں اور حق دوستی ادا کرتے ہوئے طفیل کی طرف سے ان لوگوں سے جھگڑا کروں۔ مگر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ بہتوں کے دل میں یہ تمنا کروٹیں لیتی رہی تھی کہ طفیل "نقوش" کی ادارت کے لئے ان کی خدمات حاصل کریں گے اور اس کے لئے ان کی منت سماجت اور خوشامد بھی کریں گے ان تمام آرزوؤں پر اوس پڑ گئی تھی لوگ زیادہ تر تو یہی کہتے تھے، کر لیجئے وہ کل کا لونڈا مدیر بن بیٹھا اور وہ بھی "نقوش" کا۔ ادب کی دنیا میں کیا برا وقت آن لگا ہے کہ کاتب مدیر بننے لگے ہیں وہ بھی ادبی رسائل کے۔ میں کہتا ہوں اس لڑکے کا دماغ خراب ہو گیا ہے، دو چار اچھی کتابیں کیا چھاپ لی ہیں کہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھنے لگا ہے۔ ادارت شروع کر دی ہے اور وہ بھی "نقوش" کی جسے احمد ندیم قاسمی اور وقار عظیم جیسے شہرۂ آفاق ادیبوں نے ایک معیار عطا کیا۔ یہ صاحبزادے تو نہ صرف "نقوش" کو لے ڈوبیں گے بلکہ ان ناموروں کے نام بھی ڈبو دیں گے۔

جب طفیل کی ادارت میں "نقوش" کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۵۱ء میں منظر عام پر آیا تو سب ہی نے دیکھا کہ یہ صاحبزادے نہ نقوش کو لے ڈوبے تھے اور نہ احمد ندیم قاسمی اور وقار عظیم کے نام کو کوئی بٹہ لگا تھا۔ ان دونوں کا عطا کردہ معیار "نقوش" کے اس شمارہ میں محفوظ رہا تھا۔ اب یہی معترضین انگشت بدنداں تھے کہ اس کل کے لونڈے سے یہ سب کچھ کیونکر ممکن ہوا۔ ان کے پہلے اعتراضات ہوا میں خاک و خاشاک کی طرح اڑ گئے تھے اُنہوں نے اپنی ہیٹی ہوتی دیکھی تو اب یوں پینترا بدلا اور باتیں بنانے لگے کہ پرچہ پر مدیر کی حیثیت سے تو طفیل ہی کا نام ہے لیکن درپردہ اسے وقار عظیم نے ہی مرتب کیا ہے وہ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اپنا نام اس پر نہیں دے سکے۔ بعض نے ایک اور مشہور نقاد اور ادب کے ڈاکٹر کا نام لیا کہ دراصل پرچہ وہ مرتب کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی اس حسن کارکردگی کا تمغہ اپنے سینے پر سجانے میں کسر نہ رکھی اور خود اپنے حلقہ احباب و اثر میں یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ وقار عظیم کے بعد وہ خود "نقوش" کی ادارت فرما رہے ہیں۔ اس بغض معاویہ میں یہ لوگ یہ بھی بھول بیٹھے کہ اس سے پہلے طفیل "روح ادب" کی ادارت کر چکے ہیں اور جو شخص اس رسالہ کے لئے اعلیٰ معیار کا مواد منتخب کر سکتا ہے وہ غیر مطبوعہ مواد کو پرکھ بھی سکتا ہے اور اس میں سے معیاری چیزیں انتخاب کر سکتا ہے بعض تو یہ بھی بھول گئے کہ یہ وہی طفیل ہے جو اس سے پہلے ان کی بعض نگارشات غیر معیاری قرار دے کر واپس کرتے رہے ہیں یہ تو میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ بعض لوگوں نے اپنی کہانی یا مضمون طفیل کو دستی میری موجودگی میں پیش کیا طفیل نے وہیں بیٹھے بیٹھے ان صاحب کی موجودگی ہی میں اسے دیکھا اور یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ ہلکا ہے نہ "نقوش" کے معیار کا ہے اور نہ خود مصنف کے اپنے معیار کا۔ بہر حال وقت گزرتا گیا اور معترض نہ صرف خاموش ہوتے گئے بلکہ "نقوش" کی تعریف و توصیف پر اتر آئے یہ تو آپ نے خود بھی دیکھا ہے میرے کہنے کی بات نہیں رہی کہ طفیل نے

"نقوش" نہ صرف ڈوبنے سے بچا لیا بلکہ اسے وہ چار چاند لگائے کہ جب تک اُردو زبان زندہ ہے "نقوش" اور طفیل کا نام بھی زندہ رہے گا۔

۱۹۵۱ء میں، میں بیوی اور بچہ کے ہمراہ لاہور آیا۔ اسٹیشن پر طفیل موجود تھے یہ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں ایک تنگ سی گلی میں یہ چھوٹا سا مکان تھا ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کمرہ نیچے تھا اور ایک کمرہ اور دالان جو دوسرے کمرہ کا کام دیتا تھا اوپر تھا ان کے سامنے مختصر سا صحن اور اس کے کونہ میں ننھا سا باورچی خانہ۔ ہم پہنچے تو طفیل کی والدہ نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ان دنوں بھابی مع بچوں کے سرگودھا گئی ہوئی تھیں۔ اس وقت ان کے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور جاوید۔ دو تین دن بعد بھابی آ گئیں۔ طفیل کے دو چھوٹے بھائی بھی اُن کے ساتھ ہی رہتے تھے چھوٹا اکرم اسکول میں پڑھتا تھا گرمی کا موسم تھا گھر میں بجلی نہیں تھی لالٹین اور ہاتھ کے پنکھے سے روشنی اور ہوا کا اہتمام ہوتا تھا۔ گھر چھوٹا تھا لیکن طفیل اُن کی والدہ اور دیگر اہل خانہ کا دل بہت بڑا تھا۔ خانہ بے تکلف کا سارا لطف ہمیں حاصل تھا۔ طفیل کی والدہ بے حد شفیق و خلیق تھیں بہت محبت سے پیش آتیں اور ہماری تواضع کرتیں۔ دوپہر کو ہم سو جاتے تو وہ خود آرام کرنے کے بجائے بیٹھ کر ہمیں پنکھا کرتی رہتیں، ہماری آنکھ کھلتی تو ہم شرمندہ ہوتے کہ ہماری وجہ سے انہیں یہ زحمت اُٹھانا پڑ رہی ہے۔

صبح ناشتہ کر کے میں اور طفیل مکتبہ (ادارہ فروغ اردو) چلے جاتے جو ایک روڈ پر وہیں واقع تھا جہاں اب بھی ہے دوپہر کو ہم گھر آ کر کھانا کھاتے، تھوڑا سا سستاتے گپ شپ کرتے طفیل پھر مکتبہ چلے جاتے اور سہ پہر کو سورج ڈھلے میں بیوی بچہ کو لے کر ان کے پاس پہنچ جاتا یا کسی اور دوست سے ملنے نکل جاتا۔ اگر ہم ان کے پاس پہنچتے تو طفیل مکتبہ منیجر کے سر پر چھوڑ کر ہمیں سیر کرانے لے جاتے مگر ہر حال میں مغرب تک واپس گھر پہنچ جاتے پھر وہیں چھت پر محفل جمتی۔ نشست چارپائیوں پر ہی ہوتی وہیں رات کا کھانا کھایا جاتا اور نیند کی آمد تک باتیں ہوتی رہتیں طفیل کا وہ گھر اب بھی موجود ہے اور اس میں ان کا منجھلا بھائی محمد اکبر رہتا ہے۔

انہی دنوں ایک رات کھانے کے بعد جو باتیں شروع ہوئیں تو طفیل نے اُن کا رخ اپنی ذات کی طرف موڑ دیا اور اپنی کتاب زندگی کے ورق الٹے معلوم ہوا یہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد محترم میاں عمر دین پھلوں کے باغات ٹھیکہ پر لیتے اور ان پھلوں کو منڈی میں فروخت کرتے اس کے ساتھ ہی ان کی پھلوں کی ایک چھوٹی سی دکان بھی تھی۔ اس کاروبار سے اتنی یافت ہو جاتی تھی کہ صبر و شکر سے کنبہ کی گزر بسر ہو جائے طفیل نے بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھا تو میاں صاحب کی صحت جواب دینے لگی تھی جس کے باعث انہیں باغات کا ٹھیکہ چھوڑنا پڑا۔ چھوٹی سی دکان کی آمدنی سارے کنبہ کی کفالت کے بار کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ بیمار باپ کے علاوہ ماں اور دو چھوٹے بھائیوں کی کفالت کا بھی سوال تھا لہٰذا طفیل نے پڑھائی چھوڑ چھاڑ باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا چند دن کی غیر حاضری کے بعد ماسٹر نے بلوا بھیجا اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی اُنہوں نے نہایت بے باکی سے جواب دیا۔ "میں نے پڑھائی چھوڑ دی ہے"۔ استاد نے کہا "تم ایک ہونہار طالب علم ہو، پڑھائی کیوں چھوڑتے ہو؟" یہ بولے "بس پڑھ نہیں سکتا" سوال ہوا "مگر کیوں؟" اُنہوں نے سر جھکا کر عرض کیا۔ "میرے گھر والے میری پڑھائی کا خرچ برداشت نہیں

کر سکتے"۔ استاد نے شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر حکم دیا: "مگر تم پڑھائی نہیں چھوڑو گے۔ خرچ کا بھی انتظام ہو جائے گا"۔ اسکول والوں نے فیس معاف کر دی اور طفیل نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتے تھے۔ میاں عبدالحکیم ان کے ہیڈ ماسٹر تھے جنہوں نے سکول سے سبکدوشی کے بعد کچہری روڈ پر "منصور بک ہاؤس" کے نام سے کتابوں کی دکان ڈال لی تھی۔ یہ دکان اب قانونی کتب کے لیے مخصوص ہے اور میاں صاحب کے صاحبزادے اسے چلا رہے ہیں۔

طفیل نے مڈل کا وظیفہ کا امتحان اعلیٰ پوزیشن سے پاس کیا۔ جب یہ دسویں میں پہنچے، تو اُن کے والد کی علالت نے اس حد تک شدت اختیار کر لی کہ طفیل نے مجبور ہو کر تعلیم کو خیرباد کہہ دیا، اور گھر کی کفالت کا مکمل بار اٹھا لیا۔ پھولوں کا کام ان کے ذوق کا نہ تھا، چنانچہ انہوں نے کتابت کا رُخ کیا اور استاد تاج زریں رقم کی شاگردی اختیار کر لی۔ رات رات بھر مشق کرتے۔ والدہ سمجھاتیں بیٹا اتنی محنت نہ کرو، صحت خراب ہو جائے گی اور نظر بھی۔ لیکن یہ باز نہ آئے اور یُوں ایک دو ماہ کی محنت سے اچھے کاتب بن گئے اور ان کی کارکردگی پر ان کے استاد نے اپنی دستی گھڑی اُتار کر انہیں انعام میں دے دی۔ اس طرح گھر کے اخراجات قدرے آرام سے پورے ہونے لگے۔ یوں طفیل میٹرک پاس کرنے سے بھی رہ گئے اور عملی زندگی میں کود پڑے۔

کچھ عرصہ میں طفیل نے کتنے ہی جتن کر کے تھوڑی سی رقم پس انداز کی اور اس سے ایک دوست کے ساتھ مل کر کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ کتابت کا شغل بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔ بلکہ اس ادارہ کی کتابوں کی کتابت بھی بیشتر طفیل نے ہی کی۔ اس ادارہ سے جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں سب سے زیادہ مولانا ابوالکلام آزاد کی کئی تصانیف تھیں۔ کاروبار خاصا چل رہا تھا کہ طفیل کے ان دوست کی شادی کا مرحلہ آ گیا۔ رشتہ خاندان میں ہی طے تھا لیکن ایک اڑچن آن پڑی تھی۔ لڑکی کے والدین لڑکے کے سلسلۂ روزگار سے مطمئن نہ تھے۔ انہیں یہ علم تھا۔ کہ لڑکے کا کتابوں کی نشر و اشاعت کا کاروبار ہے، لیکن اس کی آمدنی سے وہ مطمئن نہ تھے۔ ان صاحبزادے نے اس طرف سے انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی، تو اُنہوں نے کہہ دیا ہماری اطلاع یہ ہے کہ تمہارے اس کاروبار میں طفیل شریک ہے تم اپنا الگ کچھ کام کرو۔ ان حضرات نے جواب دیا، کہ طفیل اُن کے ادارہ کا کاتب ہے اجرت پر کام کرتا ہے کاروبار میں اس کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ اس کے پاس سرمایہ ہے نہ ایسے علمی کام کی اہلیت و صلاحیت۔ اس کے باوجود لڑکی والوں نے صاف کہہ دیا کہ طفیل سے لکھوا کر لاؤ کہ یہ کاروبار صرف تمہارا ہے وہ اس میں شریک نہیں تو شادی ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ دوست نے اپنی بپتا طفیل کے سامنے رکھ دی اُنہوں نے فوراً لکھ دیا کہ مذکورہ کاروبار کی ملکیت سے اُن کا کوئی تعلق نہیں نہ وہ اسمیں حصہ دار ہیں ان کے علم کے مطابق ان کا دوست ہی اس کا واحد مالک ہے اس تحریر کے ساتھ ہی طفیل عملاً اس کاروبار سے علیحدہ ہو گئے دوست کی شادی ہو گئی۔ دوستی اپنی جگہ رہی مگر طفیل نے کبھی دوست سے نہ حساب مانگا نہ اپنی اصل رقم۔

طفیل نے تو نقصان اُٹھایا ہی تھا لیکن قابل افسوس بات یہ ہوئی کہ وہ دوست بھی اس کاروبار سے زیادہ عرصہ فائدہ نہ اٹھا سکے کیونکہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بلا اجازت اُن کی تصانیف شائع کرنے کے ہرجانہ اور رائلٹی کا دعویٰ دائر کر دیا۔ یہ بوکھلا اُٹھے کیونکہ اتنا کمایا نہ تھا جتنے کا دعویٰ تھا مقدمہ کے اخراجات الگ۔ آخر اُنہوں نے ایک بزرگ دوست کو درمیان میں ڈالا جو مولانا ابوالکلام کے بھی دوست تھے۔ ان بزرگ نے مولانا سے کہا "ناسمجھ بچہ ہے غلطی کر بیٹھا۔ آپ بزرگ ہیں معاف فرما دیں یہ آئندہ ایسی غلطی نہ کرے گا"۔ چنانچہ اس

وعدہ پر کہ یہ اب مولانا کی کوئی کتاب ان کی رضامندی اور شرائط کے بغیر شائع نہیں کریں گے مولانا ابوالکلام نے رائلٹی کا اپنا مطالبہ اور مقدمہ واپس لے لیا۔ یوں ان کا کاروبار ٹھپ ہوگیا اور یہ بالآخر ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے اس شرکت سے اس طرح دستبرداری کے واقعہ نے طفیل کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا۔ طبیعت میں بیزاری آگئی دل اچاٹ سا ہوگیا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا مگر پیٹ پالنے کے لئے کام ضروری تھا چنانچہ کتابت کا کام جاری رکھا اس سے پہلے ۲ فروری ۱۹۴۳ء کو والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ چکا تھا منجھلا بھائی اکثر بیمار رہتا، چھوٹا اسکول میں پڑھ رہا تھا ان سب ضروریات کے لئے رقم درکار تھی چنانچہ طفیل نے دن رات محنت کی اور اپنی ذمہ داریاں نبھائیں کتابت کے مقابلہ میں اشاعت کتب کی سود مندی اور نفع بخشی کا انہیں شراکتی کاروبار میں اندازہ ہو چکا تھا چنانچہ انہوں نے ایک اشاعتی ادارہ کا منصوبہ اپنے ذہن میں مرتب کیا اور ایک دن بیگم سے پوچھا تمہارے پاس کچھ رقم ہے اس اللہ کی نیک بندی نے گھر خرچ میں سے تھوڑا تھوڑا کرکے کچھ رقم پس انداز کی تھی وہ اس نے ساری جمع پونجی نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دی یہ تقریباً تین سو روپے تھے اسی رقم سے طفیل نے ادارہ فروغ اُردو کی داغ بیل ڈال دی اور ناشر کتب بن گئے یہ واقعہ ۱۹۴۴ء کا ہے اشاعت کتب کے ساتھ کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا انہوں نے محنت اور معقول منصوبہ بندی سے ادارہ کی ترقی کے لئے کوشش کی اور ہر پیش آنے والی مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کیا اللہ کی رحمت اور ماں کی دعائیں ساتھ رہیں اور کامیابی اُن کے قدم چومتی رہی اس ادارہ سے طفیل نے بہت سی خوبصورت معیاری اور مقبول عام کتب شائع کیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شوکت تھانوی کی تصانیف تھیں۔ ان کے علاوہ نیاز فتحپوری اور احمد ندیم قاسمی کی چند کتابیں تھیں نیاز فتحپوری خود ناشر تھے اور اپنی کتب خود شائع کرتے تھے اس کے باوجود طفیل نے نجانے کیسے ان کی تصانیف اپنے ادارہ کے لئے حاصل کرلیں۔

میرے اسی قیام لاہور کے دوران ایک شب میں نے طفیل سے کہا بھائی "روح ادب" ایک مقبول رسالہ تھا آپ نے وہ بند کر دیا اگر آپ اسے دوبارہ جاری کرنا نہیں چاہتے تو مجھے اجازت دے دیں کہ میں اسے شائع کروں۔ طفیل نے کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر آپ سوچ لیں یہ بڑے گھاٹے کا کام ہے۔ ادبی رسالہ میں نفع نہیں اُلٹا مالی خسارہ ہی ہوتا ہے اور جان مفت میں کھپانا پڑتی ہے اس کے باوجود اگر آپ چاہتے ہی ہیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔ پھر بھی انہوں نے علیحدگی میں میری بیوی کو سمجھایا کہ وہ مجھے اس کام سے باز رکھے۔ "روح ادب" کے اجرا کی اجازت دیتے وقت طفیل نے اس کے نام اور ساکھ کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔

کراچی واپس پہنچ کر میں نے "روح ادب" کے ڈیکلیریشن کی تجدید اپنے نام سے کرائی اور رسالہ جاری کر دیا ادارت کے لئے انتصار حسین اور طفیل کے نام دیئے طفیل کا نام ان کی اجازت کے بغیر دے دیا تھا مگر انہوں نے اس پر کبھی اعتراض نہ کیا۔ پانچ شمارے اس طرح شائع ہوئے۔ پھر طفیل کراچی آئے اور مشورہ دیا کہ انتصار حسین کے بجائے کسی دوسرے نامور اور مؤثر ادیب کو مدیر بنایا جائے چنانچہ ان کے ایما اور توسط سے ممتاز حسین کو "روح ادب" کا مدیر مقرر کیا گیا اور صرف یہی ایک نام ادارت میں رہ گیا کچھ مدت بعد ممتاز حسین نے "روح ادب" کی ادارت سے معذرت کرلی اور دست بردار ہو گئے۔ ان کے بعد شوکت صدیقی کو مدیر مقرر کیا گیا اور پرچہ انہی کی ادارت میں نکلتا رہا یہاں تک کہ مالی خسارہ مجھے اور "روح ادب" دونوں کو لے ڈوبا اور اپریل ۱۹۵۴ء میں سالنامہ شائع کرنے کے بعد پرچہ بند کر دیا گیا۔

کتابوں کے جس کاروبار میں طفیل نے مجھے معاون بنایا تھا اس میں بھی میری ناتجربہ کاری اور بعض دکان داروں کی ہوشیاری و عیاری ہم دونوں کے لئے نقصان کا باعث ثابت ہوئی اور آخر چھ سات سال کے بعد ہمارا یہ کاروباری رشتہ منقطع ہوگیا۔ میری وجہ

سے طفیل کو بعض دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے دل پر میل نہیں آیا۔ میری زیادتیوں کے باوجود یہ مجھ سے ہمیشہ وہی حسن سلوک برتتے رہے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ روا رکھا۔

طفیل نے شروع سے اپنے خطوط میں مجھے "برادرم" کے القاب سے مخاطب کیا اور کبھی کبھی جوشِ محبت میں "بھیا" بھی لکھا، صرف لکھا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ بھائی بن کر اور بنا کر رکھا۔ یہ لوگوں کو کچھ اس طرح گرویدہ بنا لیتے تھے کہ اپنی اپنی جگہ ہر شخص محسوس کرتا کہ طفیل صرف اس کا ہے۔ اسی تاثر کے تحت کتنے ہی لوگ اُن کو بھائی سمجھتے اور طفیل بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ خواتین میں تو کئی ایسی ادیب ہیں جنہیں طفیل نے بہن کہا، بہن بنایا اور اس ناطے کو پوری طرح نبھایا وہ بھی ان سے بھائی جیسا سلوک کرتیں۔ دراصل طفیل کی اپنی کوئی بہن نہ تھی، چنانچہ انہوں نے اپنا ارمان پورا کرنے کے لئے اتنی بہت سی بہنیں بنا لیں اور یوں اپنے چاؤ پورے کئے۔ ان میں سے بعض بہنوں کو میں نے اُن کی وفات پر زار و قطار روتے دیکھا ہے۔

طفیل کی ایک ایسی ہی ایک منہ بولی بہن دہلی میں رہتی ہیں اُن کے کچھ بچے پاکستان آ چکے ہیں۔ ان میں سے ایک بیٹی کی شادی تھی یہ لوگ کراچی میں رہتے تھے۔ طفیل نے مجھے ان لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کو لکھا اور شادی کے سلسلہ میں اُن کی ضروریات درست کیں طفیل کی یہ بہن بعض دشواریوں کے باعث اس شادی میں شرکت کے لئے پاکستان نہیں آ رہی تھیں۔ طفیل بھی اپنی چند ناگزیر مصروفیات کے باعث شریک نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی بیگم کو بھیجا کہ لڑکی کی ماں کی جگہ کھڑی ہو کر شادی کریں اس موقع پر طفیل نے بیگم کے ہاتھ دو سیٹ سونے کے زیورات، جوڑا اور کچھ نقد بھی لڑکی کے لئے بھیجا۔

اللہ میاں نے طفیل کو کوئی بیٹی بھی نہ دی جس کا ان کو ارمان تھا۔ لہٰذا اُنہوں نے بعض رشتہ داروں اور عزیز دوستوں کی بیٹیوں سے شفقت و محبت برت کر اپنا یہ ارمان بھی پورا کیا یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں پوتی سے نوازا۔ جس کا نام انہوں نے تابندہ رکھا۔ اس بچی کی ولادت کے ساتھ ان کے یہاں خوشیوں کی بہار آ گئی! اس کے بعد اللہ نے انہیں دو اور پوتیاں عطا فرمائیں یہ ان سب کے ناز اٹھاتے رہے۔ بعد میں جاوید کو بھی اللہ نے ایک پیاری سی بیٹی دی اور یوں اُن کی پوتیوں میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا طفیل کا معمول تھا کہ روز شام کو گھر آتے وقت پوتیوں کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لے کر آتے کبھی پھل کبھی مٹھائی یا میوہ۔ یہ بھی شام کو ان کا انتظار کرتیں اور انہیں دروازہ میں داخل ہوتے دیکھ کر شور مچا دیتیں "ڈیڈی آ گئے"۔ "ڈیڈی آ گئے"۔ طفیل خیال رکھتے کہ ان میں سے کس کی سالگرہ آج ہے اور اس کے لئے اہتمام سے کیک لے کر آتے۔ ایک مرتبہ نہ جانے کس بنا پر بیکری والوں نے کیک سازی کی ہڑتال کر دی، ہڑتال کو تین چار دن ہو چکے تھے۔ اور آج ان کی ایک پوتی کی سالگرہ تھی چنانچہ پہلے تو یہ دفتر میں بیٹھے آدمی دوڑاتے رہے کہ کسی اچھی بیکری سے عمدہ سا کیک لائے لیکن کامیابی نہ ہوئی بنا بریں شام کو دفتر سے اُٹھ کر یہ خود مختلف بڑی بڑی بیکریوں پر کیک تلاش کرتے رہے اور آخر ایک جگہ انہیں عمدہ کیک مل ہی گیا۔ یہ کیک لے کر گھر پہنچے تو پوتی کی خوشی دیدنی تھی۔

یہ لاہور سے باہر جاتے تو عموماً گھر والوں کے لئے تحائف لاتے مگر اپنی ذات سے اتنے بے نیاز تھے کہ ایسے موقع پر بھی کچھ اپنے لئے کچھ نہ لاتے وہ تو اللہ بھلا کرے ہماری بھابی کا جو ان کا بے حد خیال رکھتیں ان کے لئے اپنی پسند کے کپڑے لاتیں اور خود درزی سے سلواتیں

صبح جب طفیل دفتر روانگی کے لیے تیاری کرتے تو ان کی بیگم اپنی مرضی سے ان کے لیے کپڑے اور سوٹ وغیرہ نکالتیں استری کرتیں اور انہیں پہننے کے لیے پیش کر دیتیں۔ یہ بھی بلا چون و چرا وہی کپڑے پہن کر خوش خوش روانہ ہو جاتے اس معاملہ میں بھابی کی پسند اور سلیقہ قابل داد ہے کھانے پینے میں بھی طفیل کسی اہتمام اور تکلف کے قائل نہ تھے جو وقت پر مل جاتا خوش ہو کر کھا لیتے خواہ دال سبزی ہی کیوں نہ ہو البتہ جو پکا ہو وہ خوش ذائقہ پکا ہونا چاہیے۔ کہتے تھے انسان ساری محنت مشقت اور جو پاپڑ بیلتا ہے سب اس پیٹ ہی کی خاطر تو کرتا ہے۔ لہٰذا اسے تو ذائقہ دار خوراک مل جانی چاہیے۔

میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ طفیل بھاٹی دروازہ کے اندر اپنے آبائی مکان میں رہتے تھے جہاں اب ان کا منجھلا بھائی محمد اکبر رہتا ہے۔ جب کنبہ بڑھا تو طفیل نے مزنگ میں ایک مکان کرایہ پر لیا اور کچھ عرصہ وہاں رہے۔ ان کی والدہ اور بھائی اپنے قدیم مکان میں رہتے رہے، بعد میں جب شوکت تھانوی کراچی منتقل ہوئے تو گڑھی شاہو کا وہ مکان جس میں وہ رہائش پذیر تھے طفیل کے سپرد کر گئے یوں طفیل مزنگ سے اٹھ کر گڑھی شاہو آ گئے۔ اور کئی سال اسی مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے رہے ان کا چھوٹا بھائی اکرم بھی ان کے ساتھ اسی مکان میں رہتا رہا پھر اس نے اسی بلڈنگ میں نیچے والا حصہ الگ سے کرایہ پر لے لیا۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے ایک صبح دیکھتا ہوں کہ گھوڑا گاڑی میں بیٹھے طفیل چلے آ رہے ہیں۔ نہ آنے کی کوئی اطلاع نہ کچھ یہ یکایک کیسے وارد ہو گئے۔ پتا چلا رات کو سندھ مدرسہ کے میدان میں ایک کل پاک و ہند مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ اور طفیل لاہور سے یہ مشاعرہ سننے آئے ہیں یہ پہلا موقع نہ تھا کہ طفیل مشاعرہ سننے لاہور سے باہر گئے ہوں اس سے پہلے بلکہ قیام پاکستان سے بھی پہلے سے یہ مشاعرے سننے، امرتسر، ہزارہ اور نہ جانے کہاں کہاں جاتے رہتے تھے اس مشاعرہ سے ہندوستان سے نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری نواب جعفر علی اثر اور جگر مراد آبادی جیسے نامور شعراء شرکت کے لیے آئے تھے رات کو دس بجے ہم دونوں مشاعرہ سننے گئے کیا اژدحام تھا، اللہ اللہ گیٹ پر بھیڑ اور دھکا پیل کا یہ عالم کہ راستہ ملنا تو کجا اپنی ہڈی پسلی محفوظ رکھنا مشکل۔ ٹکٹ کی کھڑکی تک رسائی ناممکن لیکن معلوم ہوا ہمیں ٹکٹ خریدنے کی زحمت نہیں کرنا ہے۔ طفیل "نقوش" کے حوالہ سے پاس ساتھ لائے تھے چنانچہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گیٹ پر جمع بھیڑ کو چیر کر راہ بنائی اور پنڈال میں داخل ہو گئے۔ یہاں ہماری نشستیں پریس گیلری میں تھیں۔ وہاں ابھی کوئی رپورٹر نظر نہ آ رہا تھا چنانچہ ہم دونوں سب سے پہلی قطار میں جا بیٹھے جو بالکل سٹیج سے ملحق تھی۔ مشاعرہ شروع ہوا اور تین بجے رات تک محفل گرم رہی۔ ہم اپنی نشست سے سٹیج پر براجمان شعراء کی نوک جھونک بھی سنتے اور اس سے محظوظ ہوتے جا رہے تھے۔ مشاعرہ کی صدارت نیاز فتحپوری نے کی تھی۔

اگلے دن تعطیل تھی مجھے دفتر نہیں جانا تھا۔ صبح ہی ناشتا سے فارغ ہو کر طفیل مجھے ہمراہ لے کر جوش سے ملنے چل دیئے۔ یہ برسٹل ہوٹل میں کینٹ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک قیام پذیر تھے۔ ہم پہنچے تو لگتا تھا کہ جوش ذرا دیر پہلے ہی نیند سے بیدار ہوئے ہیں فراق اور جوش ایک ہی کمرہ میں موجود تھے اور دونوں پلنگ پر ہی بیٹھے ناشتا شروع کرنے والے تھے کہ ہم پہنچ گئے جوش نے ہم دونوں کو دیکھ کر سوچا کسی کالج کے لڑکے آ گئے ہیں، اظہار عقیدت کرنے اور آٹو گراف لینے اپنی اس سوچ کا اظہار انہوں نے اس وقت کیا جب طفیل نے تعارف کے طور پر اپنا نام بتایا اور جوش کے دریافت کرنے پر کہ کون طفیل؟ انہوں نے کہا "مدیر نقوش" جوش کے تصور میں "مدیر نقوش" ایک معمر اور ادب کی خاک سے اٹا ہوا چہرہ تھا خیر دو ڈھائی گھنٹہ کی نشست رہی اس میں جوش اور فراق سے ادب اور شاعری پر گفتگو ہوتی رہی دونوں کے کلام پر بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ دونوں نے "نقوش" کی اٹھان کی تعریف کی۔ طفیل نے نقوش کے لیے دونوں کے تازہ کلام کی فرمائش

کی جو انہوں نے بخوشی عنایت فرمایا اگلے دن کراچی ریڈیو سٹیشن سے مشاعرہ نشر ہونا تھا۔ ہم دونوں بھی یہ مشاعرہ سننے ریڈیو سٹیشن گئے، یہ شعرا جان مشاعرہ تھے اسی مشاعرہ میں جوشؔ کی اپنی زبان سے میں نے سنا "جب سورج غروب ہوتا ہے" ان کے اس اظہار پر ریڈیو انتظامیہ نے جوشؔ اور فراقؔ کے لئے سٹوڈیو ہی میں دوران مشاعرہ شراب فراہم کی۔

جوشؔ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی نوشی شروع کرتے تھے اور یہ شغل رات گئے تک جاری رہتا تھا۔ اسی کو وہ اپنا طلوع کہتے تھے یاران ہم مشرب کی صحبت میسر آجاتی تو محفل خوب گرم رہتی ورنہ جوشؔ تنہا بوتل کو ہمراز بنائے پیتے رہتے۔ متذکرہ مشاعرہ کے چند سال بعد جوشؔ پاکستان منتقل ہو چکے تھے اور کراچی کے فیڈرل بی ایریا کی ایک کوٹھی میں رہتے تھے جس پر ایک گنبد بنا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ ابھی آہستہ آہستہ آباد ہو رہا تھا۔ اپنے مکان کی شناخت کے لئے جوشؔ صاحب فرماتے تھے کہ سارے علاقہ میں جس کوٹھی کے سر پر تاج نظر آئے وہی میری رہائش گاہ ہے یہ انفرادیت اس کوٹھی کو آج بھی حاصل ہے جبکہ یہ علاقہ پوری طرح آباد ہو چکا ہے غرض یہ کرنا تھا کہ طفیل کراچی آئے ہوئے تھے رات کو کھانے سے فارغ ہو کر جوشؔ سے ملاقات کے لئے چلنے کو کہا "میں نے کہا بھائی وقت تو جوشؔ کے طلوع کا ہے' ان سے ملاقات کے لئے یہ کچھ غلط نہیں" بولے کہ بات تو ٹھیک ہے لیکن پھر فرصت نہ مل پائے گی اور بھی کئی کام کرنے ہیں ہم چلے اور جوشؔ کا مکان تلاش کرتے جا رہے تھے کہ اچانک گنبد والی کوٹھی نظر آگئی ہم نے کال بیل بجائی۔ ملازم باہر آیا ہم نے کہا جوشؔ صاحب سے ملنا ہے اس نے جواب دیا اس وقت وہ کسی سے نہیں ملتے طفیل نے اپنا نام بتایا اور کہا تم جا کر انہیں اطلاع کر دو کہ میں ملنا چاہتا ہوں تھوڑی دیر بعد ہی وہ دروازہ کھلا جس کے سامنے ہم کھڑے تھے۔ جوشؔ خود دروازہ کھول کر ہمیں اندر آنے کی دعوت دے رہے تھے یہ ان کا ڈائننگ روم تھا۔ کھانے کی میز پر بوتل اور جام رکھا تھا ایک کرسی پر جوشؔ بیٹھ گئے، بوتل ذرا پرے کھسکا دی۔ اُن کے برابر ہم دونوں بھی بیٹھ گئے گھنٹہ بھر طفیل اور جوشؔ محو گفتگو رہے میں خاموش بیٹھا سنتا رہا اس کے بعد ہم نے اجازت چاہی اور واپس آگئے۔

جب طفیل متذکرہ پاک و ہند مشاعرہ سننے کراچی آئے تھے۔ تو ایک دن نیاز فتحپوری سے ملنے بھی گئے نیاز صاحب گاڑی کھاتہ میں اپنی سسرال میں قیام پذیر تھے ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر ایک بڑا سا فلیٹ تھا۔ ایک کمرہ زینہ کے ساتھ ہی تھا پھر تھوڑا سا صحن تھا اور اس کے آگے اصل فلیٹ۔ نیاز صاحب زینہ کے ساتھ والے کمرہ ہی میں مقیم تھے ہم وہاں اُن سے ملے نیاز صاحب کی ساس رشتہ میں میری خالہ تھیں چنانچہ میں طفیل کو نیاز صاحب کے ساتھ محو گفتگو چھوڑ کر خالہ اور دیگر عزیزوں سے ملنے زنان خانہ میں چلا گیا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد میں آیا تو ادب کا بونا ادب کے ایک جن سے بدستور دست و گریباں تھا اور کسی طرح ہار نہیں مان رہا تھا۔ ادب کے نشیب و فراز" بدلتی اقدار" نقوش" کا مقام" اس کی اٹھان اور اس دور میں اس کے مدیر کی ذمہ داریاں زیر بحث آئیں، نیاز صاحب نے کچھ مشورے بھی عنایت فرمائے اس سے قبل طفیل اور نیاز صاحب کے درمیان ایک ناشر اور مصنف کا تعلق موجود تھا طفیل ان کی ایک دو تصنیفات شائع کر چکے تھے۔

طفیل سے میری خط و کتابت ادارۂ فروغ اُردو کے پتا پر ہوتی تھی اس لئے اُن کی رہائش کا مکمل پتا مجھے معلوم نہ تھا بس اتنا جانتا تھا کہ یہ گڑھی شاہو میں رہتے ہیں۔ اسی دوران میں طفیل بیوی بچوں کے ہمراہ کراچی آئے۔ ایک شام ہم سینما دیکھنے گئے جو فلم دیکھی اس میں نیلو ہیروئن تھی اور ان دنوں فلمی افق پر ایک نئے درخشندہ ستارے کی مانند ابھر کر چھائی ہوئی تھی۔ گھر آ کر فلم

کی بات ہوئی تو اس ضمن میں بھابی نے بتایا کہ نیلو ان کے ساتھ والے گھر میں رہتی ہے اور ان کے گھر کے نیچے ایک ڈاکٹر کا مطب ہے کچھ عرصہ بعد میں بیوی بچوں کے ہمراہ لاہور آیا۔ طفیل کو اپنی آمد کی اطلاع نہ کی تھی۔ ہم ریل سے اتر کر سٹیشن کے باہر آئے اور ایک تانگہ میں بیٹھ گئے۔ تانگہ والے نے پوچھا کہاں چلوں جناب۔ طفیل کے گھر کا مندرجہ بالا حدود اربعہ میرے ذہن میں تھا۔ میں نے کہا میاں گڑھی شاہو نیلو کے گھر چلو۔ تانگہ والے نے گڑھی شاہو کے علاقہ میں ایک گلی کے سرے پر تانگہ روک دیا اور کہا یہ ہے بابو جی نیلو کا گھر۔ ہمیں اس کے یہاں تو جانا نہ تھا اس لئے تانگہ والے سے کہا تھوڑا اور آگے چلو چند قدم چل کر مجھے ڈاکٹر کا مطب نظر آیا۔ میں نے تانگہ رکوایا اور اتر کر ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "طفیل مدیر نقوش کہاں رہتے ہیں؟" ڈاکٹر نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا جبکہ بقول بھابی ڈاکٹر صاحب کے مطب کے اوپر ہی ان کی رہائش تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر تلاش جاری رکھی۔ چند قدم پر ہی ایک زینہ نظر آیا۔ اندازہ لگایا یہی طفیل کے گھر کا زینہ ہے۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ان کا بڑا بیٹا فاروق نیچے آیا ہم نے منزل پالی اپنے ہمسایہ میں یہ تھی شہرت اس شخص کی جو تین چار سے "نقوش" کا مدیر تھا اور سارے ملک میں مشہور تھا اور اپنے نام کے ڈنکے بجا رہا تھا۔ اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ نیلو کے ہمسایہ ہیں تو ہم رات کے وقت ان کا گھر تلاش نہ کر پاتے مجھے یوں لگا جیسے نیلو کہہ رہی ہو سہ

میرے پتا سے یوں خلق کو تیرا گھر ملے

جنوری ۱۹۵۵ء میں طفیل نے شخصیات نمبر کی پہلی جلد شائع کی اور کچھ دن بعد اس کی جلدیں لے کر یہ ہندوستان گئے دورہ خاصا طویل تھا اور دہلی میں بھی ایک ماہ کے قریب قیام رہا۔ اس قیام کے دوران طفیل نے وزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ملاقات کرنا چاہی چنانچہ یہ راشٹرپتی بھون پہنچے وہاں پتا چلا کہ ملاقات کے خواہش مندوں کے نام نوٹ کر کے روزانہ پنڈت جی کو پیش کر دیئے جاتے ہیں وہ جن کو ملاقات کے لئے وقت دینا چاہتے ہیں ان کے نام پر نشان لگا دیتے ہیں پھر یہ نام ملاقاتیوں کی ایک فہرست میں درج کر دیئے جاتے ہیں باری آنے پر ملاقاتی کو بلا لیا جاتا ہے۔ وزیراعظم اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باعث روزانہ صرف دو تین افراد کو ملاقات کا وقت دیتے ہیں۔ افسر رابطہ نے طفیل سے ان کی مدت قیام دریافت کرنے کے بعد فرمایا اگر پنڈت جی آپ کو ملاقات کے لئے وقت دیں بھی تو اس عرصہ میں ملاقات کی کوئی امید نہیں۔ جن لوگوں کے نام فی الوقت ملاقاتیوں کی فہرست میں درج ہیں ان میں سے آخری آدمی کی باری دو ڈھائی ماہ بعد آئے گی۔ اس کے باوجود طفیل اپنا نام لکھوا کر چلے آئے۔ اگلے ہی دن وزیراعظم کے سٹاف کا ایک افسران کے پتا پر پہنچا یہ وہاں موجود نہ تھے وہ ان کا کھوج لگاتا اور تعاقب کرتا ان تک پہنچ گیا اور مژدہ سنایا کہ جناب چلیے پنڈت جی آپ کو یاد فرما رہے ہیں دو ڈھائی ماہ کا فاصلہ ایک ہی دن میں طے ہو گیا۔ طفیل ملاقات کے لئے پہنچے تو افسر مہمان داری نے انہیں کچھ ہدایات دیں اور بتایا کہ پنڈت جی کسی کو ۵ منٹ سے زیادہ وقت نہیں دیتے، اپنی زبان سے چلے جانے کو بھی نہیں کہتے کہ یہ آداب میزبانی کے خلاف ہے لہٰذا وقت پورا ہونے پر آپ خود ہی اُٹھ کھڑے ہوں، ملاقات ہوئی، سلام دعا کے بعد طفیل نے نقوش کا تازہ شمارہ شخصیات نمبر کی ایک جلد پنڈت جواہر لال نہرو کو پیش کی پنڈت جی رسالہ لے کر اسے خاموشی سے دیکھتے رہے، کوئی حرف درمیان میں نہ آیا طفیل نے نظر گھڑی پر رکھی پانچ منٹ پورے ہوئے تو حسب ہدایت اُٹھ کھڑے ہونے اور رخصتی کی اجازت چاہی پنڈت جی چونکے اور بولے "ابھی سے کہاں چلے تشریف رکھیے" طفیل بیٹھ گئے اور افسر مہمانداری کی ہدایت دہرا دی، پنڈت نہرو مسکرائے اور

بولے "آپ سے تو ابھی بات ہی نہیں ہوئیں تو اتنی دیر سے یہی سوچ رہا تھا کہ اس معیار کا کوئی رسالہ ہمارے ملک میں بھی شائع ہوتا ہے یا نہیں۔ غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُردو ہی نہیں بلکہ کسی زبان میں بھی "نقوش" کے معیار کا کوئی رسالہ ہندوستان میں شائع نہیں ہوتا۔ پھر باتیں ہوتی رہیں وقت گزرتا گیا نہ جانے کتنے پانچ منٹ گزر گئے دوران گفتگو نہرو نے کہا "طفیل صاحب آپ ہندوستان آجائیں، ہم آپ کی ہر طرح خدمت کریں گے" طفیل نے یہ پیش کش مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ میں پاکستان میں ہی ٹھیک ہوں۔

اس واقعہ کے بعد جتنے دن دہلی میں رہے انہیں ہر تقریب میں مدعو کیا جاتا رہا جس میں پنڈت جواہر لال نہرو شریک ہوتے ہر ایسی محفل میں جب طفیل داخل ہوتے تو جواہر لال انہیں آتا دیکھ کر خلاف عادت اپنی جگہ سے اٹھتے اور آگے بڑھ کر طفیل کا استقبال کرتے ایسے ہی ایک موقع پر کسی نے طفیل کو بتایا کہ وزیر اعظم ہند، جیسا کہ آپ نے بھی غور کیا ہو گا کسی کی پذیرائی کے لئے اس طرح اُٹھ کر آگے نہیں بڑھتے۔ ہر ایک سے بیٹھے بیٹھے ہی ملتے ہیں یہ خصوصی برتاؤ وہ صرف دو ہستیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں، ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے آپ۔ طفیل نے وجہ دریافت کی تو بتایا گیا کہ یہ معلوم نہیں اور نہ کسی کو اتنی جرأت ہی ہے کہ نہرو سے اس کے متعلق پوچھ سکے طفیل کہاں چوکنے والے تھے انہوں نے اس جرأت کا مظاہرہ کیا جو کسی میں نہ تھی اور موقع پاتے ہی پنڈت جی سے اس خصوصی برتاؤ کی وجہ دریافت کر لی پنڈت جی نے بتایا کہ انہیں جب مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنا ہوتا ہے تو انہیں تکلیف نہیں دیتے بلکہ خود ان کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں۔ ایک دن مولانا کے بنگلہ پر ان سے ملنے گئے باہر سے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی تو مولانا آزاد کی آواز آئی وہ ملازم سے کہہ رہے تھے کہ کہہ دو میں مصروف ہوں اس وقت نہیں مل سکتا یہ سنکر نہرو نے سوچا دیکھیں تو ایسی کون سی اہم مصروفیت ہے جس کے باعث مولانا وزیر اعظم سے ملاقات سے انکار کر رہے ہیں چنانچہ پنڈت جی کمرہ میں داخل ہو گئے، دیکھتے کیا ہیں کہ مولانا ابوالکلام گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں ان کے ہاتھ میں "نقوش" ہے جسے وہ پڑھ رہے ہیں۔ لہٰذا جس رسالہ کا مطالعہ مولانا کی اتنی اہم مصروفیت ہو کہ وہ وزیر اعظم نہرو سے ملنے سے انکار کر دیں وہ رسالہ اور اس کا مدیر میرے لئے اتنے ہی محترم و معزز ہیں جتنے مولانا ابوالکلام آزاد۔

نقوش جاری کرنے کے بعد طفیل کو احساس ہوا کہ پرچہ کسی بھی پریس میں چھپوایا جائے اس کا وقت پر بازار میں لانا دشوار ہوتا ہے پریس والے کسی نہ کسی بہانہ رسالہ کی چھپائی میں دیر کر دیتے ہیں، اکثر چھپائی بھی حسب دلخواہ نہیں ہوتی ان مشکلات پر عبور حاصل کرنے کے لئے اُنہوں نے کئی پریس بدلے اور ایک وقت میں دو پریس میں پرچہ چھپوانے کی اجازت بھی حاصل کی مگر مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ آخر اُنہوں نے سوچا کیوں نہ اپنا ہی پریس لگایا جائے اس خیال کی آمد کے ساتھ ہی اُنہوں نے اپنے پریس کی منصوبہ بندی شروع کر دی، سوال کچھ رقم کا تھا اس مرحلہ پر ایک بار پھر ان کی بیگم نے ان کی مشکل آسان کی اور پس انداز کی ہوئی رقم نکال کر طفیل کے حوالہ کر دی اُنہوں نے ۱۹۵۰ء کے وسط میں کراچی کے ایک پریس سے جو عرصہ سے بند پڑا تھا تین لیتھو مشینیں خرید کر "نقوش پریس" کی ابتداء کر دی اور ادارہ فروغ اُردو کی جملہ کتب اور "نقوش" کی طباعت اسی پریس میں شروع کر دی چھپائی کا کچھ کام ان کو باہر سے بھی ملنے لگا۔ لیکن ابتدائی دور میں لگائی ہوئی رقم اور دوسرے اخراجات کے پیش نظر پریس سے خاطر خواہ نفع حاصل ہو رہا تھا۔ انہی دنوں ملک میں انتخابی فہرستوں کی چھپائی کا بے تحاشا کام تھا جو حکومت معینہ مدت کے اندر مکمل کرانا چاہتی تھی لہٰذا کام سرکاری پریسوں

کے علاوہ نجی پریسوں کو بھی دیا گیا تھا اور دیا جا رہا تھا۔ وہ سارے پریس والے جو سرکاری کام کے لئے منظور شدہ تھے۔ اسی بہتی گنگا میں ہاتھ ہی نہیں دھو رہے تھے بلکہ نہا بھی رہے تھے طفیل نے بھی یہ کام حاصل کرنے کی کوشش کی۔ معاملہ مرکزی حکومت کا تھا جس کا صدر مقام اس وقت کراچی ہی تھا چنانچہ طفیل کراچی آئے اور اپنی درخواست کی منظوری کے لئے کوشش کی پہلا مرحلہ تو ان کے پریس کو سرکاری کام کے لئے منظور کرانے کا تھا۔ متعلقہ محکمہ کا سربراہ ایک نیک سیرت بنگالی افسر تھا قدرے کوشش اور دو چار دن کی بھاگ دوڑ کے بعد "نقوش پریس" کا نام سرکاری کام کے لئے منظور شدہ پریسوں کی فہرست میں آ گیا اور انتخابی فہرستوں کا کچھ کام طفیل کو مل گیا۔ اس سلسلہ میں فضل کریم فضلی صاحب نے طفیل کی مدد کی۔ طفیل نے اپنی سلیقہ مندی اور محنت سے یہ کام وقت سے کچھ پہلے ہی اعلیٰ معیار کے ساتھ مکمل کر دیا۔ ان کی اس کارکردگی پر متعلقہ محکمہ سے انہیں سند استحسان ملی اور ان کا کام دوسرے پریسوں کو بطور نمونہ دکھایا گیا۔

ان کے پریس کی درجہ بندی بھی بہتر کر دی گئی اس کام سے معقول نفع حاصل ہوا اور "نقوش پریس" اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا

پریس کے قیام کے ساتھ ہی طفیل نے اپنا دفتر ادارہ فروغ اردو' ایبک روڈ سے پریس میں منتقل کر لیا اور ادارہ ایک منیجر کے سپرد کر دیا طفیل دن میں ایک چکر لگا کر ادارہ کے حالات اور کاروبار کا جائزہ لے آتے اور منیجر کو ضروری ہدایات دے آتے شام کو منیجر دفتر بند کر کے دن بھر کی آمد و خرچ کا حساب دینے ان کے پاس پریس آتا اور ضروری ڈاک بھی پیش کرتا۔ پریس میں طفیل پہلے ڈیوڑھی اور پھر اس کے بالمقابل والے کمرہ میں دفتر لگاتے رہے وفات سے چند ماہ قبل اُنہوں نے پریس کی عمارت کی پہلی منزل پر بڑے کمرہ میں جدید انداز پر دفتر قائم کیا جو بیک نظر کسی بڑی فرم کے چیف ایگزیکٹو کا دفتر دکھائی دیتا ہے۔

جب طفیل محض ناشر کتب تھے اس وقت بھی ان کا دفتر بعض نامور ادیبوں کی آماجگاہ تھا۔ "نقوش" کی اشاعت کے ساتھ یہ حلقہ وسیع تر ہوا اور اس میں خلیفہ شجاع الدین جیسے لوگ بھی نظر آنے لگے مگر اس حلقہ کی وہ وسعت دیدنی تھی جو طفیل کے خود "نقوش" کی ادارت سنبھالنے کے بعد پیدا ہوئی۔ خیر مولانا محمد اسماعیل پانی پتی تو پہلے سے ہی طفیل کے پاس آتے جاتے تھے اب حفیظ جالندھری حکیم یوسف حسن مدیر "نیرنگ خیال" مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر سے لے کر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اشفاق احمد اور نئی پود کے بہت سے لکھنے والے بھی ان کے دفتر میں اڈہ جمانے لگے یہ لوگ گھنٹوں طفیل کے ساتھ محو گفتگو رہتے اور چائے پیتے طفیل بھی ہر ایک کے ساتھ نہایت تپاک سے پیش آتے۔ آنے والے بھی ان کا احترام کرتے۔

طفیل کا دفتر ابھی ایبک روڈ پر ہی تھا کہ ایک دن سعادت حسن منٹو ان کے پاس آئے۔ بات منٹو کی زود نویسی کی چھڑ گئی طفیل نے پوچھا آپ اتنا بہت سا اور جلد جلد کیسے لکھ لیتے ہیں۔ جواب تھا کہ کاغذ قلم لے کر بیٹھتا ہوں اور جو لفظ ذہن میں آ جائے کاغذ پر لکھ دیتا ہوں اور اسی سے افسانہ شروع کر دیتا ہوں اور ایک ہی نشست میں اسے مکمل کر لیتا ہوں طفیل کہاں چوکنے والے تھے دراز سے کاغذ نکالا اس پر ایک لفظ لکھا اور منٹو کے آگے سرکا دیا کہ لیجیے مشق سخن فرمائیے۔ ذرا کے ذرا تو منٹو چونکے کہ ان کا امتحان شروع ہو گیا ہے۔ پھر اس نے قلم پکڑا اور لکھنا شروع کر دیا لکھتا گیا لکھتا گیا یہاں تک کہ افسانہ مکمل کر کے دم لیا۔ اس نے افسانہ طفیل کی طرف بڑھا دیا۔ اُنہوں نے پڑھا بہت اچھا افسانہ تھا لہٰذا "نقوش" کی آئندہ اشاعت کے لئے رکھ لیا گیا۔

جیسے جیسے مجھ سے طفیل کی خط و کتابت بڑھتی اور توانا ہوتی گئی ویسے ہی ویسے عطاء اللہ قاسمی سے اُن کی خط و کتابت

جو پہلے ہی خاصی سست رو تھی، مزید دھیمی پڑ گئی لیکن طفیل کو قاضی کا خیال بہت رہتا۔ اکثر مجھ سے اس کی خیریت اور حالات دریافت کرتے رہتے ایک مرتبہ مجھے لکھا " قاضی صاحب کا خط بھی ملا جو تحریر میں مہاتما گاندھی کے خط سے سو فیصد مشابہت رکھتا ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ میں نے باقاعدہ قسم کی نوکری چھوڑ دی ہے اور اب پرائیویٹ دھندا چل رہا ہے خدا کرے کہ ان کا یہ دھندا خوب چل نکلے .... یہ بھی بڑے مزے کے آدمی ہیں اگر ان کی صورت بھی اپنے دل و دماغ کی طرح خوبصورت ہوتی تو پھر ہم لوگوں کا تو خدا ہی حافظ تھا۔" کچھ عرصہ بعد عطاء اللہ اپنے حالات اور ملازمت میں کھو گیا طفیل اور دیگر دوستوں سے اس کی خط و کتابت کا پہیہ جام ہو گیا پھر وہ کراچی چھوڑ کر واہ چلا گیا ملازمت کی خاطر۔ طفیل اسے اکثر یاد کرتے اور آخر آخر میں تو کئی بار کہا کہ یار عطاء اللہ قاضی کو دیکھے مدت ہو گئی اسے ملنے کو بڑا جی چاہتا ہے افسوس کہ طفیل کی یہ خواہش آخر دم تک پوری نہ ہو سکی اور قاضی سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔

طفیل اپنی والدہ کا کس قدر حکم مانتے تھے اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے کہ اسی سبب سے اُنہوں نے الناشر لمیٹڈ سے اشتراک سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس تابعداری کے ساتھ انہیں اپنی والدہ سے والہانہ محبت تھی انہیں یقین کامل تھا کہ اُن کی ہر کامیابی اور ان پر اللہ کی ہر رحمت و نعمت اُن کی والدہ کی دعاؤں کے نتیجہ میں ان کو حاصل ہوتی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں اُن کی والدہ بیمار ہوئیں اور بھاٹی دروازہ سے ان کے پاس گڑھی شاہو آگئیں۔ طفیل اور اُن کی بیوی نے اُن کی ہر ممکن خدمت کی اور علاج کرایا وہ چند دن بیمار رہ کر ۵ جولائی کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں طفیل کو سخت صدمہ ہوا ایک عرصہ ملول و مضمحل رہے آخر اللہ نے صبر عطا فرمایا پھر بھی طفیل اور اُن کی بیگم مدت تک ہم جیسوں کو مرحومہ کی علالت اور آخری لمحات کے واقعات تفصیلاً سناتے رہے۔

والدہ کی وفات کے بعد طفیل نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ عید، بقر عید کو بعد نماز عید والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے یہ اُن کے انتقال کے بعد بھی اپنی ہر کامیابی اور خوشی کو ماں کی دعاؤں کا ثمرہ جانتے نیز جب انہیں کوئی مشکل درپیش ہوتی تب بھی والدہ کی قبر پر حاضری دیتے فاتحہ پڑھتے اور اللہ تعالیٰ سے مدد اور رہنمائی کی التجا کرتے اور کہتے کہ ماں زندہ تھی تو میرے لیے وہ دعا کرتی تھی اسے تو نے اپنے پاس بلا لیا اب میرے لئے کون اس خلوص و محبت سے دعا کرے گا۔ اب تو ہی میری مشکل حل فرما۔ یہ اپنی ہر خوشی کی خبر لے کر گھر والوں سے پہلے والدہ کی قبر پر حاضر ہوتے فاتحہ پڑھتے اور اپنی خوشی کا اظہار ان کی مٹی کے سامنے کرتے یہاں تک کہ جب نقوش کے رسول نمبر کے سلسلہ میں انہیں، ہجری ایوارڈ ملا اور کچھ عرصہ بعد ستارۂ امتیاز کا اعزاز ملا تو یہ اسلام آباد سے واپسی پر پہلے والدہ کی قبر پر حاضر ہوئے اور اپنی مسرتوں کو پھول بنا کر اُن کے قدموں پر رکھ آئے پھر کہیں گھر پہنچے۔ یہ شاید والدہ سے والہانہ محبت ہی کا اعجاز ہے کہ طفیل کی تاریخ وفات بھی وہی ہے جو ان کی والدہ کی تھی یعنی ۵ جولائی۔ اسی محبت کا ثمرہ یہ بھی ہے کہ مر کر طفیل کو جگہ بھی والدہ کے پہلو میں ہی نصیب ہوئی تاکہ ان کی روح تا قیامت اس قرب سے آسودہ رہے

۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ پر دوران جنگ بھی اور جنگ بندی کے بعد بھی دونوں ملکوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہندوستان میں تو اس موضوع پر فلمیں بھی بنیں جن میں پاکستان کو جارح ظاہر کیا گیا اور ہمارے فوجیوں کو بزدل اور فنون حرب سے خاصا نابلد بھی دکھایا گیا لیکن ان سب چیزوں پر ہماری حکومت کی طرف سے کسی لکھنے والے یا فلم بنانے والے کے خلاف کبھی کوئی احتجاج

اور معاندانہ کارروائی نہیں کی گئی طفیل نے اس جنگ سے متعلق تین جلدوں پر مشتمل "نقوش" کا جنگ نمبر اپریل ۱۹۶۶ء میں شائع کیا جب اس کی اطلاع حکومت ہند کو ملی تو ایوان حکومت میں تہلکہ مچ گیا خاصی لے دے ہوئی اور بالآخر فیصلہ ہوا کہ "نقوش" کے مدیر محمد طفیل کا ہندوستان میں داخلہ ممنوع قرار دیا جائے چنانچہ ہندوستان کے لئے ان کے ویزے پر ہمیشہ کے لئے پابندی لگ گئی طرفہ تماشہ یہ کہ یہ احکامات ایک ایسے وزیر اعظم کے ہاتھوں جاری اور نافذ ہوئے جس کا باپ وزیر اعظم ہوتے ہوئے بھی طفیل کے استقبال کے لئے اٹھ کر اور آگے بڑھ کر ان سے ملتا تھا۔

جب تک میں کراچی میں رہا طفیل جب بھی کراچی آتے میرے پاس ہی ٹھہرتے ان کے قیام کے دوران بعض لوگ ان سے ملنے بھی میرے یہاں ہی آکر ملتے ایک مرتبہ جگر مراد آبادی کا "شعلۂ طور" شائع کرنے کے بعد یہ کراچی آئے ان دنوں جگر بھی کراچی آئے ہوئے تھے اور ایم اے جناح روڈ پر اقتدار علی متقدا خاں تمباکو والوں کے یہاں قیام پذیر تھے۔ ایک صبح طفیل اور میں جگر سے ملنے گئے یہ حضرت بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ کچھ مختصر باتیں ہوئیں اور ایک بھرپور نشست کے لئے جگر سے وعدہ لیا کہ اگلے دن وہ صبح ہمارے یہاں تشریف لائیں گے ناشتا ہمارے ساتھ وہیں ہوگا چنانچہ اگلے دن میں جگر کو لینے پہنچا تو یہ پھر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے طفیل گھر پر ہی ان کے منتظر تھے۔ جگر ایسے اطمینان سے بیٹھے تھے جیسے انہیں کہیں نہ جانا ہو، میں نے کئی بار یاد دلایا مگر وہ تاش کی بازی میں مگن رہے اور ہاں ہوں کرتے رہے۔ میرے زیادہ اصرار پر انہوں نے جانے سے معذرت شروع کر دی۔ میں نے عرض کیا کہ جناب آپ کے انتظار میں ہم سب ناشتا کا انتظار کر رہے ہیں، تب خدا خدا کر کے وہ راضی ہوئے اور ایک بے دلی سے میرے ہمراہ آگئے۔ مگر پھر ان کا کچھ ایسا دل لگا کہ سارا دن وہیں محفل رہی۔

طفیل کے میرے پاس ٹھہرنے کے معمول میں صرف دو مرتبہ فرق آیا ایک ۱۹۶۲ء میں جب یہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے عرس میں شرکت سے واپسی پر کراچی آئے اور صہبا لکھنوی جو ان کے ہمسفر تھے انہیں اپنے گھر لے گئے دراصل ان دنوں میں ایک کورس کرنے فرانس گیا ہوا تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب "محترم" میں کیا ہے۔ اپنی اس بدعنوانی کے متعلق انہوں نے ایک خط مجھے فرانس بھی لکھا تھا۔ دوسری مرتبہ میرے کراچی میں ہوتے ہوئے بھی یہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع مجھے دے رکھی تھی چنانچہ میں انہیں لینے اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ ان کے ہمراہ احسان دانش اور ناصر زیدی کے علاوہ کچھ اور ادیب بھی تھے اور ان سب کو لینے کے لئے کراچی کے چند ادیب بھی اسٹیشن پر موجود تھے۔ جب میں نے کہا چلئے تو طفیل نے ایک احساس شرمندگی کے ساتھ معذرت کی اور مجھے سمجھایا کہ یہ اتنے لوگ ساتھ ہیں ہم سب ایک کام سے آئے ہیں اور ہمارا اکھٹے رہنا ضروری ہے۔ کام سے فارغ ہو کر میں آپ ہی کے پاس آؤں گا معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ رائٹرز گلڈ کے اجلاس اور الیکشن میں حصہ لینے آئے ہیں اور ان کے قیام و طعام کا انتظام گلڈ نے ہی کیا ہے۔ غرض یوں یہ حضرت ہوٹل چلے گئے۔ انہیں اور احسان دانش کو ایک ہی کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ جس ہوٹل میں ان کا قیام تھا وہ کیبرے کے لئے مشہور تھا۔ ان کو کمرہ بھی کیبرے کے پنڈال کے ساتھ ملا۔ تیز موسیقی کا شور صبح تین چار بجے تک جاری رہتا اور ان کی نیند حرام رکھتا۔ دن بھر گلڈ کے اجلاس کی مصروفیت آرام کا موقع نہ دیتی، یوں ان کے تین چار دن مسلسل جاگتے اور اذیت برداشت کرتے گذر گئے۔ مگر ادیبوں کے مفاد عام میں طفیل نے یہ سب

کچھ برداشت کیا۔ ہوٹل کے قیام کے دوران ان پر واضح ہوا کہ احسان دانش تھوڑی دیر سوتے ہیں اور پھر اٹھ بیٹھتے ہیں، ساری رات یہ عمل جاری رہتا ہے۔ طفیل نے احسان دانش کی یہ کیفیت ہم سے بیان کرتے ہوئے کہا "احسان صاحب تو قسطوں میں سوتے ہیں"۔

میرے پنڈی، اسلام آباد تبادلہ کے بعد بھی ان کا یہی معمول رہا، یہ جب بھی وہاں آتے میرے یہاں ہی قیام فرماتے میں بھی جب کبھی لاہور آتا تو طفیل ہی کے یہاں ٹھہرتا اور مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا جیسے میں اپنے ہی گھر میں ہوں دن میں اپنے کام سے فارغ ہو کر میں طفیل کے پاس ان کے دفتر میں آ بیٹھتا اور شام کو یہیں سے ان کے ہمراہ گھر چلا جاتا

نقوش پریس میں طفیل کے پاس بیٹھنے اور غور کرنے سے ان کی شخصیت کے بعض پہلو سامنے آئے ان کی کارکردگی اور کام کے معیار کو دیکھتے ہوئے عام خیال ہوتا ہے کہ یہ بہت سلیقہ مند اور اچھے منتظم ہیں خیر سلیقہ مند تو میں ان کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اچھا منتظم ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ میں آپ کو دو ایک واقعات بتاتا ہوں آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے۔ بھلا بتائیے یہ کون سی اچھی انتظامی صلاحیت ہے کہ پریس کا ایک کارکن ان کے پاس آتا ہے اور بیمار بیوی یا بچہ کی دوا کے لئے کچھ پیشگی تنخواہ مانگتا ہے، یہ تنخواہوں کا رجسٹر کھول کر دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں "تم اب تک آدھی تنخواہ پیشگی لے چکے ہو اور ابھی مہینہ آدھا بھی نہیں ہوا آئندہ مہینہ کیسے گزارہ کرو گے نہیں بھئی! میں تمہیں اب کوئی پیشگی رقم نہیں دے سکتا وہ منت سماجت کرتا ہے۔ لیکن طفیل کسی بڑے سرمایہ دار سیٹھ کے کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے انکار پر ڈٹے رہتے ہیں۔ غریب کاریگر مایوس ہو کر منہ لٹکائے چلا جاتا ہے اس کے جانے کے بعد یہ مجھے بتاتے ہیں کہ کمبخت بیوی کی بیماری کا بہانہ کر رہا تھا۔ دراصل یہ شام کو دوستوں کے ساتھ سینما دیکھے گا، اور ساری رقم اُڑا دے گا۔ کچھ دیر بعد دوسرا کاریگر آتا ہے اور کہتا ہے کہ بابو جی گھر میں آٹا ختم ہو گیا ہے پیشگی دے دیجئے یہ پھر وہی رجسٹر کھول کر اس کو حساب سمجھاتے ہیں کہ وہ اب تک کتنی پیشگی لے چکا ہے اور ہر ماہ اسی قسم کی حرکت کرتا ہے طفیل اسے بھی سختی سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کے جانے کے بعد بتاتے ہیں کہ آٹے کا تو بہانہ ہے یہ بدبخت افیون کھاتا ہے وہ ختم ہو گئی ہو گی جس کے لئے رقم مانگ رہا ہے۔ دن بھر میں تین چار کاریگر آتے ہیں اور کسی نہ کسی بہانہ سے پیشگی طلب کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک یونہی مایوس لوٹا دیا جاتا ہے شام کو جب پریس بند کرنے کا وقت آتا ہے تو طفیل گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو طلب کرتے ہیں اور اُن مایوس کاریگروں میں سے کسی ایک کو بلاتے ہیں جیب سے روپے نکالتے ہیں اور اس کی مطلوبہ پیشگی رقم اسے دیتے ہیں ساتھ ہی دھمکی بھی دیتے ہیں کہ اب تنخواہ کے دن تک اسے کوئی پیشگی نہیں ملے گی۔ پھر تنبیہ فرماتے ہیں کہ یہ اس کے ساتھ خصوصی رعایت ہے وہ اپنے کسی دوسرے ساتھی سے اس کا ذکر نہ کرے۔ رقم ہاتھ میں آتے ہی اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اظہار ممنونیت کے ساتھ سلام کر کے رخصت ہو جاتا ہے یہ دیکھتے رہتے ہیں جب وہ پریس سے باہر نکل جاتا ہے تو یہ پھر گھنٹی بجاتے ہیں، چپڑاسی حاضر ہوتا ہے یہ دوسرے پیشگی مانگنے والے کاریگر کو طلب کرتے ہیں اس کی باچھیں کھلاتے ہیں اور وہی دھمکی و تنبیہ اسے بھی کرتے ہیں یہ عمل یوں ہی دہرایا جاتا ہے یہاں تک کہ سارے پیشگی مانگنے والوں کی باچھیں کھل جاتی ہیں طفیل مسکراتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بھائی یہ بڑے ظالم اور خطرناک لوگ ہیں جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں اگر انہیں پیشگی نہ دی جائے تو یہ بددلی کا اظہار کریں گے اور کام میں سست رفتاری دکھائیں گے سو تو یہ کریں گے ہی لیکن ان سے یہ بھی بعید نہیں کہ اپنے غصہ کے

اظہار میں مشین ہی خراب کر دیں اور ہمیں نقصان پہنچائیں۔

اوپر ملاحظہ فرمایئے۔ طفیل ایک شخص کو معتبر جان کر پریس میں مینجر مقرر کرتے ہیں اس پر اعتماد کرتے ہوئے پریس کا لین دین اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں وہ ان کے اعتماد سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے اور موقع بموقع رقم خورد برد کرتا رہتا ہے۔ جب طفیل خواب غفلت سے جاگتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ تقریباً تیس ہزار کا ہیر پھیر ہو چکا ہے ابھی طفیل اس خسارہ کا حساب ہی لگا رہے ہوتے ہیں کہ منیجر صاحب کو بھی بھنک پڑ جاتی ہے کہ طفیل کو اس کی کارگزاری کا علم ہو گیا لہٰذا وہ خاموشی سے رخصت ہو جاتا ہے اور انہیں اظہار ناراضگی کا موقع بھی نہیں دیتا۔ اس کے جانے کے بعد یہ گھر والوں اور مجھ سے اس شخص کی زیادتیوں کا گلہ کرتے رہتے ہیں۔

ایک زمانہ میں پریس کا ایک مستری اور اس کے دو تین ساتھی طفیل کو بہت تنگ کرتے تھے۔ کام چوری کے ساتھ کام خراب بھی کرتے، آئے دن مشینیں خراب کر کے الگ نقصان پہنچاتے رہے کبھی پرزے نکال کرلے جاتے اور بیچ کھاتے۔ طفیل ان سے سخت نالاں تھے۔ مگر ان کو توفیق نہ ہوتی کہ ان لوگوں کو نکال باہر کرتے ان کو مزید نقصان سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی۔ یہ سیر و تفریح کے لئے انگلستان چلے گئے۔ پیچھے انتظام ان کے بیٹے جاوید نے سنبھالا۔ وہ بڑا منتظم ثابت ہوا۔ اس نے ان بدمعاشوں کے ٹولہ کو کسی قسم کی تنبیہ نہ کی بس کچھ انتظامی گر استعمال کر کے بہت سی چیزوں اور کام کے مراحل کی چیکنگ شروع کر دی جیسے انہوں نے طفیل کو عاجز کیا تھا۔ اس سے کچھ زیادہ ہی یہ لوگ جاوید کی چیکنگ سے عاجز آ گئے اور ہفتہ بھر میں مستری صاحب اپنے ٹولہ سمیت استعفا دے کر چل دیئے جب طفیل واپس آئے تو یہ معجزہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جاوید کو خوب خوب شاباش دی اور ایک عرصہ تک اس کا یہ کارنامہ خوش ہو ہو کر دوستوں کو سناتے رہے۔

رسالہ تو رسالہ کوئی روزنامہ بھی محض اپنی اشاعت کے بل بوتے پر نہیں چل سکتا نہ نفع بخش ہی ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ تقریباً ہر روزنامہ کے نصف صفحات اشتہاروں سے بھرے پاتے ہیں یہ اشتہار ہی اصل آمدنی ہوتے ہیں۔ بعض رسائل نے بھی تگ و دو کر کے معقول تعداد میں مستقل اشتہار حاصل کر لئے ہیں اور چین کی بنسی بجاتے ہیں ابتدا میں مشتہرین ادبی رسائل کو اشتہارات دینے کے حق میں نہ تھے اس وقت بھی چند رسائل کے مالکان نے ذاتی اثر و رسوخ سے کچھ اشتہارات حاصل کر لئے تھے ان کے لئے یہ اس لئے بھی ممکن ہو سکا کہ بعض اداروں میں ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد اس مقام پر بیٹھے تھے جہاں سے اشتہار جاری ہوتے تھے اسی زمانہ میں مولانا رازق الخیری اور شاہد احمد دہلوی نے بعض دیگر مالکان ادبی رسائل کے ساتھ مل کر انجمن ادبی رسائل قائم کی یہ پچاس کی دہائی کے شروع کی بات ہے۔ اس انجمن نے پاکستان بھر کے ادبی جرائد کے جملہ مسائل حل کرنے کی مہم چلائی۔ ان مسائل میں ادبی رسائل کے لئے اشتہارات حاصل کرنا بھی تھا طفیل مدتوں انجمن کی عاملہ کے رکن رہے اور سب کے ساتھ مل کر ادبی رسائل کی بہبود کے لئے جد و جہد کرتے رہے۔ انجمن کی کوششوں سے رسائل کو وافر اشتہار میسر آنے لگے۔ طفیل نے اس موقع سے بھی فائدہ نہ اٹھایا" اور "نقوش" کے لئے کوئی اشتہار حاصل نہ کیا۔

بعض ادارے مثلاً نیشنل بینک آف پاکستان اور یونائیٹڈ بینک چاہتے تھے کہ دیگر ادبی رسائل کے بجائے ان کے اشتہار "نقوش" میں شائع ہوں تاکہ بار بار قاری کی نظر سے گزریں اور زیادہ سود مند ثابت ہوں۔ انہی لوگوں کے ورغلانے اور اشتہار پیش کرنے

طفیل نقوش میں اشتہار جمع کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اس موقع پر انکا رابطہ کراچی میں ایک شخص سے قائم ہو گیا جو دو ایک دیگر رسائل کے لئے بھی کمشن پر اشتہار فراہم کرتا تھا۔ اس سے تھوڑی سی خط و کتابت کے بعد طفیل کراچی آئے اور اس شخص سے تفصیلی معاملے کیا۔ شرائط یہ تھیں کہ طفیل اسے ایک معقول تنخواہ ہر ماہ دیں گے اور جو اشتہار وہ فراہم کرے گا اس پر کچھ کمشن بھی دیں گے جو اس کمشن کے علاوہ ہو گا جو ایڈورٹائزنگ کمپنی لے گی۔ کام چلا اور اس نے نقوش کے لئے معقول اشتہار فراہم کئے۔ دو ایک ماہ بعد اس نے طفیل کو لکھا کہ اشتہار حاصل کرنے کے لئے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں بسوں میں دھکے کھانے میں زحمت بھی ہوتی ہے اور وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ اپنی سواری ہو تو بہت سا وقت بچ سکتا ہے اور زیادہ کام ہو سکتا ہے۔ یوں باتیں بنا کر اس نے طفیل سے رقم لے کر موٹر سائیکل خرید لیا۔ "نقوش" کی اشاعت ماہانہ نہیں رہی تھی اس لئے انتظام سے متوقع فائدہ حاصل نہ ہو سکا کیونکہ جتنا ایک شمارہ کے اشتہارات سے حاصل ہوتا اس سے زیادہ دوسرے شمارہ کی اشاعت تک اس شخص کی ماہانہ تنخواہ میں نکل جاتا۔ جب حساب لگایا گیا تو آمد کے مقابلہ میں خرچ زیادہ تھا چنانچہ یہ انتظام منقطع کر دیا گیا اور نقوش حسب سابق بغیر اشتہارات کے گزر کرنے لگا۔

اپنے کارندوں کے ساتھ طفیل ہمیشہ انسانیت اور ہمدردی کا سلوک روا رکھتے۔ ایک عورت ان کے یہاں گھر کا کام، جھاڑو برتن وغیرہ کرنے آتی۔ طفیل کو پتا چلا کہ اس کا ایک لڑکا چار پانچ سال کا ہے جو یونہی آوارہ پھرتا ہے۔ انہوں نے اس عورت کو سمجھایا اور ترغیب دی کہ بچہ کو تعلیم دلائے۔ کتابوں کاپیوں کا ذمہ خود لے لیا۔ کورس کی کتابیں تو چھاپتے ہی تھے ان میں بچوں کا ایک خوبصورت قاعدہ بھی شامل تھا۔ اس سستے زمانہ میں اس کی قیمت پچیس پیسے تھی۔ طفیل نے اس قاعدہ کی ایک جلد اس عورت کے بچہ کے لئے دے دی۔ دو چار دن بعد اس عورت نے طفیل سے کہا کہ بابو جی بچہ کا قاعدہ پھٹ گیا ہے انہوں نے اسے ایک اور جلد قاعدہ کی دے دی اس کے بعد اس عورت نے جیسے یہ دستور ہی بنا لیا ہو وہ ہر آٹھویں دسویں انہیں بچہ کے قاعدہ کے پھٹ جانے کا دکھڑا سناتی اور نیا قاعدہ لے جاتی۔ آخر تنگ آ کر ایک دن اس کے اس رویہ پر ناراض ہو کر بیگم طفیل نے اسے ڈانٹا کہ تم نے یہ کیا ڈھونگ رچا لیا ہے آئے دن تمہیں کہاں تک قاعدے دیئے جائیں یہ نہ آسمان سے ٹپکتے ہیں نہ کہیں سے مفت آتے ہیں آخر ان پر کچھ لاگت آتی ہے خریدنا پڑتا تو پتا چل جاتا۔ تم قاعدہ کیوں سنبھال کر نہیں رکھتیں اور بچہ کو کیوں اسے پھاڑ پھینکنے سے نہیں روکتیں۔ طفیل نے سنا تو بیوی کو روکا اور کہا کہ بچے ناسمجھ ہوتے ہیں۔ کوئی بات نہیں اگر اس سے قاعدہ پھٹ جاتا ہے۔ بیگم نے کہا کہ مجھے تو شک ہے یہ اس بہانہ قاعدہ لے جا کر بیچتی ہے۔ طفیل نے بیوی کو سمجھایا اس کا غصہ ٹھنڈا کیا اور اس عورت کو قاعدہ دے دیا۔

ایک غریب اور یتیم لڑکا محمد رشید خاں نامی طفیل کے بیٹے جاوید کے ساتھ پڑھتا تھا وہ جاوید کے ساتھ پریس میں آنے جانے لگا۔ طفیل نے اسے پریس میں ملازم رکھ لیا اور یوں اس کی کفالت کا انتظام کر دیا۔ ان کی محبت و شفقت سے متاثر ہو کر وہ بچوں کے ساتھ شام کو ان کے گھر بھی آنے لگا اکثر وہیں سو جاتا اور کچھ گھر کا کام بھی کر دیتا۔ اس طرح پریس کا کام خاطر خواہ سیکھ گیا پھر وہ ان کے یہاں سے چلا گیا جن دنوں میں راولپنڈی میں تھا یہ لڑکا رشید ہم سے ملنے گھر آتا رہتا ان دنوں یہ وہاں کسی بڑے پریس میں معقول تنخواہ پر ملازم تھا اور اب ایک عرصہ سے سعودی عرب میں رابطہ عالم اسلامی کے پریس میں ایک بڑے مشاہرے پر کام کر رہا ہے اور طفیل کو دعائیں دیتا ہے۔ وہ طفیل کے حسن سلوک سے اتنا متاثر تھا کہ ان کے بچوں کی طرح انہیں ابا جی کہتا تھا۔

بعض تعلیم یافتہ ملازمین سے تو طفیل کے دوستانہ مراسم ہوگئے تھے۔ عبدالسلام ندوی ان کے پاس ادارہ فروغِ اُردو میں منیجر ہو کر آئے تھے۔ یہ صوبہ سرحد کے رہنے والے سیدھے سچے آدمی تھے۔ ندوی ہونیکے ناطہ باریش مولویانہ شبیہ رکھتے تھے تن دتوش بھی بہت اچھا تھا ادارہ کی منیجری کرتے کرتے اُنہوں نے طفیل کے دل میں جگہ بنالی اور طفیل نے اُن کو اپنا گرویدہ بنالیا چند سال ادارہ فروغ اُردو میں کام کرنے کے بعد عبدالسلام نے کاغذ کے بڑے تجارتی ادارہ میں ملازمت کرلی اور کراچی چلے گئے۔ وہاں یہ اکثر مجھ سے ملنے آتے رہتے جب بھی طفیل کا ذکر آتا سلام ان کی تعریف ہی کرتے کچھ عرصہ بعد سلام پھر لاہور آگئے غالباً ۱۹۷۰ء میں میرا لاہور آنا ہوا تو عبدالسلام کو طفیل کے دفتر میں ایک کوچ پر لیٹے ہوئے پایا۔ یہ کافی جھٹک چکے تھے۔ چہرہ سے بھی نقاہت ٹپک رہی تھی۔ وہ مجھ سے علیک سلیک کرکے اور ہاتھ ملاکر معذرت کرتے ہوئے لیٹ گئے کہ وہ بیٹھ نہیں سکتے۔ معلوم ہوا کہ انہیں شدید ہائی بلڈ پریشر تھا جس کی وجہ سے چکر آتے تھے، وہ چلنے پھرنے اور بیٹھنے سے معذور تھے اس تکلیف نے اُن کے دل پر بھی اثر کیا تھا۔ اس بیماری نے انہیں اس لائق نہیں چھوڑا تھا کہ کوئی کام کرسکیں، ملازمت بھی اسی سلسلہ میں چھوٹ گئی تھی۔ بیروزگاری نے مالی مشکلات بھی پیدا کردی تھیں، بال بچوں کا ساتھ تھا اس لئے مشکلات کچھ سوا تھیں۔ اس موقع پر طفیل نے مولانا کی دستگیری کی، ان کے بال بچوں کا خیال رکھا، ان کی مالی مدد کی علاج کا اہتمام اپنے خرچ پر کیا دن بھر عبدالسلام کو اپنے ساتھ رکھتے اور ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتے، گھر سے ان کے لئے پرہیزی کھانا بنوا کر منگاتے اور دوپہر کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتے۔ خوبی اس تمام سلوک میں یہ تھی کہ سب اس انداز سے ہورہا تھا کہ مولانا کو زیر باریٔ احسان کا احساس نہ ہو۔

ایک دن میں طفیل کے پاس ان کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے اور بڑے احترام سے سلام کیا پھر فرداً فرداً ان کے بچوں کو پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ جاوید، پرویز اور اخلاق پریس ہی میں تھے انہیں بلا کر گلے لگایا، حال چال پوچھا اور یہ معلوم ہونے پر کہ یہ تینوں پریس میں طفیل کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں، اظہار مسرت کیا پھر انہیں یاد دلایا کہ یہ صاحب ایک زمانہ میں جب یہ تینوں بچے چھوٹے چھوٹے تھے اور اسکول جاتے تھے ایبک روڈ پر ادارۂ فروغ اُردو میں ڈیڑھ دو سال منیجر رہے تھے۔ اب برسوں بعد لاہور آئے تو طفیل کی یاد اور حسنِ اخلاق انہیں کشاں کشاں یہاں لے آیا۔

طفیل کے پاس ایک چپراسی تھا بھولا بھالا دیہاتی آدمی تھا، گرمی کا موسم تھا، طفیل نے اسے بلاکر ایک روپیہ دیا اور کہا، کہ گلاس صاف کرکے اس میں شربت لے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گاڑھے گاڑھے شربت سے لبریز گلاس لاکر طفیل کو پیش کردیا۔ اُنہوں نے ایک نظر گلاس پر ڈالی اور ایک چپراسی پر اور پوچھا یہ کیا ہے؟ بھولے آدمی نے جواب دیا "شربت ہے بابو جی!"
یہ سُن کر طفیل نے غصہ کرنے کے بجائے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور کہا کہ میاں مجھے شربت پینے کے لئے چاہئے تھا۔ چاٹنے کے لئے نہیں۔

ایک زمانہ میں طفیل نے ڈرائیونگ سیکھی اور خاصی مشق بہم پہنچالی۔ پھر اللہ نے اُن کو ذاتی موٹر کار عطا فرمائی اسے چلانے کے لئے اُنہوں نے ہمیشہ ڈرائیور رکھا خود اس پر کبھی مشق نازنہ فرمائی جب ان کے بیٹے پرویز نے گاڑی چلانا سیکھ لی اور لائسنس حاصل کرلیا تو ڈرائیور کی عدم موجودگی میں وہ خدمت انجام دینے لگا۔ اس سلسلہ میں طفیل کے پاس کئی ڈرائیور آئے اور گئے جو ایک مرتبہ گیا دوبا

نہیں آیا۔ البتہ ایک آدمی ایسا تھا جو بس اور ویگن چلاتے چلاتے طفیل کے پاس آگیا ڈرائیور وہ بہت اچھا تھا اس لئے طفیل اس کی قدر کرتے تھے وہ بھی اُن کا گرویدہ ہو گیا تھا اس کی صحت کمزور تھی اوپر سے عیال داری۔ جو زیادہ سے زیادہ تنخواہ طفیل اسے دے سکتے اور دیتے تھے اس میں اس کا گزارہ تنگی سے ہوتا تھا۔ جب وہ اس تنگ دستی سے تنگ آجاتا تو نوکری چھوڑ کر پھر ویگن یا بس چلانے لگتا وہاں صحت کی ضرورت کے مطابق آرام نہ ملتا لہٰذا کچھ دن بعد اسے چھوڑ چھاڑ کر پھر طفیل کے پاس آجاتا طفیل اسے قبول کر لیتے یوں وہ شخص کتنی ہی مرتبہ اُن کو چھوڑ کر گیا اور کتنی ہی مرتبہ پھر اُن کی خدمت میں آن لگا اس کی تنگ دستی کے پیش نظر طفیل نے اس کے ایک بیٹے کو بھی پریس میں ملازم رکھ لیا تھا۔

ایک صاحب طفیل کے یہاں جز وقتی ملازم تھے آدمی شریف اور پڑھے لکھے تھے چنانچہ دونوں میں دوستی ہو گئی اُن کی ملازمت اور اُن کی دوستی ساتھ ساتھ چلتی رہی اور اس میں افسری ماتحتی کا اظہار کبھی نہیں ہوا تعلقات اس قدر استوار ہوئے کہ ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا قائم ہو گیا ایک مرتبہ ان صاحب کے یہاں چوری ہو گئی طفیل کو علم ہوا تو ہمدردی کی اور اپنی سطح پر اپنے تعلقات سے کام لے کر ان کی چوری برآمد کرانے کی ممکنہ کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ مال مسروقہ میں موصوف کی بیوی کے زیور بھی شامل تھے جن کے لئے محترمہ روتی پیٹتی اور واویلا مچاتی رہتیں۔ موصوف نے اسے خود سمجھایا پھر طفیل سے کہا کہ وہ بھی سمجھائیں اُنہوں نے اس خاتون کو کئی بار تسلی دلا دیا کہ پولیس مال برآمد کرنے کی کوشش کر رہی ہے آپ صبر سے کام لیں ان شاءاللہ آپ کا زیور جلد مل جائے گا ہر مرتبہ خاتون فرماتیں کہ یہ تو میں اول دن سے سنتی آرہی ہوں مگر ابھی تک تو زیور واپس ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی آخر کب ملے گا۔ ان کی ان باتوں اور زیور کے لئے تڑپ سے متاثر ہو کر آخر ایک دن طفیل نے کہہ دیا کہ آپ تسلی رکھیں فلاں دن آپ کو اپنا زیور مل جائے گا پھر طفیل نے اپنی گرہ سے ویسا ہی زیور بازار سے لے کر تاریخ مقررہ پر خاتون کو پیش کر دیا۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا کچھ عرصہ بعد ان صاحب کے یہاں پھر چوری ہو گئی اور وہ زیور بھی چور لے گئے خاتون نے پھر زیور کے لئے واویلا مچایا اور حسب سابق طفیل نے انہیں تسلی دی کہ زیور فلاں تاریخ تک مل جائے گا اور دوبارہ ویسا ہی زیور بنوا کر مقررہ تاریخ پر خاتون کی خدمت میں پیش کر دیا۔

طفیل کے ایک دوست بے روزگار ہو گئے بال بچوں والے آدمی تھے دو چار دن ہی میں نانی نظر آنے لگی طفیل نے بلا طلب اس دوست کی مالی اعانت کی اور حتی المقدور اُن کا احساس بیروزگاری دُور کیا۔

یہ تو باتیں تھیں اس وقت کی جب طفیل صاحب حیثیت شمار ہوتے تھے مگر اُنہوں نے تو اپنی عسرت کے زمانہ میں بھی دوستیاں ایسے نبھائی ہیں کہ اُن کی مثال نہیں ملتی ایک صاحب اپنے عزیز و اقارب سے دُور لاہور آن پڑے تھے یہاں ان کی دوستی طفیل سے ہو گئی یہ صاحب میو روڈ پر رہتے تھے اور طفیل بھاٹی دروازہ کے اندر۔ طفیل دوست کی تنہائی اور غریب الوطنی کا خیال کرتے ہوئے روزانہ ان سے ملنے اور حال احوال لینے جاتے یہ سستے کا وہ زمانہ تھا کہ بھاٹی سے میو روڈ تک آدمی دو آنہ خرچ کر کے آرام سے تانگہ میں آجا سکتا تھا مگر طفیل کے پاس اس خرچ کی بھی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ یہ بارھوں مہینہ جاڑا گرمی، برسات ہر موسم میں روزانہ پیدل ہی دوست کے پاس پہنچتے گپ شپ سے ان کا دل بہلاتے یہی نہیں بلکہ اکثر گھر سے کچھ نہ کچھ پکوا کر ان کے لئے لے جاتے اس غریب الوطنی میں دوست پر لاہور کا پہلا جاڑا آیا تو طفیل نے تنگیٔ وسائل کے باوجود ایک خوبصورت لحاف تیار کرایا اور

لے جاکر دوست کی خدمت میں پیش کیا کہ محبت اور لحاف کی گرمی مل جل کر دوست کو موسم کی شدت کا احساس نہ ہونے دے۔

طفیل کے ایک دوست شدید علیل ہوگئے انہیں علم ہوا تو اُن کی عیادت کے لئے کوئٹہ پہنچے اس طرح ان کے ایک دوست فوت ہوگئے جس کے بیوی بچے راولپنڈی میں رہتے تھے۔ یہ اپنے دس کام چھوڑ کر راولپنڈی پہنچے مرحوم کی بیوی سے تعزیت کی اپنی دوستی کے حوالہ سے اپنے ذاتی رنج و محن کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اللہ کو پیارا ہوگیا لیکن جب تک طفیل زندہ ہے بیوہ اور بچوں کو ہر وقت اور ہر معاملہ میں اُن کا تعاون و مدد حاصل رہے گی مرحوم کی بیوی کو جب کسی مدد کی ضرورت ہو انہیں بھائی سمجھ کر فوراً مطلع کریں یہ ہر ممکن امداد کریں گے۔

طفیل یونہی اپنی محبت اور ہمدردیاں بانٹتے رہتے، کوئی انہیں اپنا کام بتاتا تو اس کے لئے مقدور بھر کوشش کرتے قریبی دوستوں کے لئے تو یہ بغیر ان کے کہے اور بتائے ہوئے اُن کی تکلیف کا احساس کرتے اور ضرورت کا خیال رکھتے بلکہ خاموشی سے اس کے لئے ضروری کوشش کرتے رہتے۔ کام بن جاتا تو کہتے اللہ کا شکر ہے آپ کا یہ کام ہوگیا ورنہ مجھے بڑی تشویش تھی اختر جمال کا بیٹا ایک معاملہ میں ملوث ہو کر گرفتار ہوگیا انہیں اختر کی دلگرفتگی کا شدید احساس ہوا اور اس لڑکے کی رہائی کے لئے تمام امکانی کوشش کی اور اس کی بیگناہی کی بات کسی نہ کسی ذریعہ سے صدر مملکت تک پہنچائی۔ خود میری ترقی کے لئے یہ ہمیشہ فکر مند رہتے اور چپکے چپکے کوشش کرتے رہتے اس سلسلہ میں اُنہوں نے دو تین بڑے افسروں سے جن سے ان کے بہت اچھے مراسم تھے میری ملاقات بھی کرائی اور ان کی توجہ میرے معاملات کی طرف دلائی تاکہ وہ میرے لئے کچھ کریں مگر میری تقدیر نے طفیل کی کوششوں کا ساتھ نہ دیا۔

ایک روز نصف شب کے بعد ٹیلیفون کی گھنٹی نے طفیل کو جگا دیا۔ اس طرف سے اختر جمال کی روہانسی آواز آرہی تھی پریشان ہوئے کیفیت دریافت کی معلوم ہوا اس کی بیٹی تزئین چند دن بخار میں مبتلا رہ کر تھوڑی دیر پہلے اچانک داغ مفارقت دے گئی طفیل نے اظہار ہمدردی کیا اور اختر کو تسلی دی، صبر کی تلقین کی۔ ٹیلیفون کا رابطہ منقطع ہوگیا اور اس کے ساتھ طفیل کی نیند کا سلسلہ بھی۔ اس کے بعد یہ صبح تک کمرہ میں ٹہلتے اور اختر کے غم میں شریک ہوتے رہے صبح ہوتے ہی طفیل پہلی پرواز سے راولپنڈی روانہ ہوگئے تاکہ تزئین کے جنازہ میں شرکت کرسکیں اور رو دررو اختر کو تسلی و تشفی دے سکیں۔

یہ حال تو اہل وطن کے ساتھ تھا۔ باہر والوں کی خاطر مدارات میں بھی طفیل پیچھے رہنے والے نہ تھے۔ ہندوستان سے آنے والے ادیب اُن سے ضرور ملنے آتے اور بعض تو ایسے بھی تھے جو انہی کے گھر قیام کرتے جو ان کے ساتھ قیام نہ کرتے ان کی مدارات بھی طفیل دل کھول کر کرتے، ان کے اعزاز میں دعوتیں منعقد کرکے کوئی اور تقریب بھی ممکن ہوتی تو کرتے۔ اس میں مذہب کی تخصیص نہ تھی۔ اگر ان آنے والوں میں سے کسی کو رقم کی ضرورت پیش آتی وہ بھی حاضر کرتے۔ بعض تو کئی کئی ہزار کی کتب خرید کر بل اور کتب کی ترسیل ان کے ذمہ لگا دیتے۔ یہ مسکرا مسکرا کر تمام اہتمام کرتے رہتے کبھی ماتھے پر شکن نہ آنے دیتے نہ دل پر میل۔

جب میرے چھوٹے بیٹے کو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ ملا اور ہوسٹل میں جگہ نہ مل سکی تو میں نے اسے طفیل کے سپرد کر دیا اُنہوں نے اسے اپنے یہاں رکھنے کی ذمہ داری بخوشی قبول کرلی۔ میاں بیوی دونوں نے کہا "بھائی آپ فکر نہ کریں جیسے ہمارے چار بیٹے ہیں۔ ویسے ہی یہ پانچواں بھی ہے" اور اُنہوں نے اسے بالکل اپنے بیٹوں کی طرح رکھا۔ اس کی تعلیم کا خیال

کرتے ہوئے اسے علیحدہ کمرہ فراہم کیا تین سال بعد جب اسے ہوسٹل میں کمرہ مل گیا اور وہاں منتقل ہوا تو طفیل اور ان کی بیگم دونوں ناراض ہوئے کہ گھر کا آرام چھوڑ کر بچہ ہوسٹل جا رہا ہے۔ یہ ہم سے غیریت برت رہا ہے بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا کہ ایسی بات نہیں بلکہ اب اس کی وارڈوں میں ڈیوٹی لگتی رہے گی کبھی دن میں کبھی رات میں۔ وقت بے وقت آنا جانا ہوگا آپ لوگوں کے آرام میں خلل پڑے گا دوسرے ہوسٹل میں ہم جماعتوں کے ساتھ مل کر پڑھائی کا بہتر موقع ملے گا تب خدا خدا کرکے یہ راضی ہوئے۔

طفیل نے لڑکپن سے والدہ کی ہدایت پر جو عادت مغرب کے وقت گھر آنے کی اختیار کی تھی وہی عادت اُنہوں نے اپنے بچوں میں بھی پیدا کی۔ جب تک بچے اسکول میں پڑھتے رہے وہ اسکول سے فارغ ہوکر ان کے دفتر آجاتے اور وہیں بیٹھ کر اپنا سبق وغیرہ یاد کرتے رہتے اور شام کو باپ کے ساتھ گھر لوٹ جاتے کالج کی تعلیم کے دوران بھی بیشتر یہی طریقہ کار رہا۔ جُوں جُوں بچے جوان ہوتے گئے اور تعلیم سے فارغ ہوتے گئے ان کے ساتھ ہی نشرواشاعت اور طباعت کے کام میں شریک ہوتے گئے۔ اس وقت سے اُن کا معمول ہوگیا کہ یہ اکٹھے صبح گھر سے آتے اور شام کو اکٹھے ہی واپس جاتے البتہ جن دنوں پریس میں کام زیادہ یا عجلت کا ہوتا خصوصاً کورس کی کتابوں کی طباعت کے زمانہ میں تو ان میں سے کوئی نہ کوئی حسب ضرورت دیر تک پریس میں رکا رہتا طفیل کو معلوم ہوتا کہ وہ کب تک گھر آئے گا پھر بھی فون کرکے پوچھ لیتے اور اس کے انتظار میں ٹہلتے رہتے اس طرح اگر کوئی بچہ دوستوں سے ملنے یا سینما چلا جاتا تو بتا کر جاتا کہاں جا رہا ہے اور کب تک واپس آجائے گا اس کی متوقع واپسی کے وقت تک تو اطمینان سے جاگتے اور کام کرتے رہتے پھر ان کے کان دستک کے منتظر ہو جاتے جوں جُوں دستک میں تاخیر ہو جاتی ان کی بے چینی بڑھتی جاتی، دل کام سے اچاٹ ہو جاتا اور یہ سب سمیٹ سماٹ کر بیٹے کے انتظار میں ٹہلنا شروع کردیتے اور انتظار کی گھڑیاں قدموں تلے روندتے رہتے۔

ایک مرتبہ طفیل بیوی بچوں کے ہمراہ کراچی آئے۔ ہم لوگ ایک کار میں صدر کی طرف جا رہے تھے ایک مشترکہ دوست بھی ہمراہ تھے اُنہوں نے پوچھا صدر میں کوئی خاص کام ہے؟ میرے منہ سے نکلا جی ہاں! کچھ خرید و فروخت کرنا ہے طفیل فوراً بولے بھئی ہم تو صرف کچھ خریدنے جا رہے ہیں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سُرخ اشارہ پاکر گاڑی ایک چوراہے پر رُک گئی بھیک مانگنے والوں نے فوراً گاڑیوں پر بلہ بول دیا۔ ایک مانگنے والی ہماری گاڑی کے قریب آئی اور دست سوال دراز کردیا وہ بیگم طفیل کے بائیں ہاتھ کھڑی مانگ رہی تھی اُنہوں نے اپنے پرس سے کچھ پیسے نکالے اور بائیں ہاتھ سے اسے دینے لگیں۔ طفیل نے سختی سے ٹوکا" اللہ کی بندی! جو کچھ دینا ہے دائیں ہاتھ سے دے بائیں ہاتھ کو خبر بھی نہ ہونے دے۔"

پریس میں طفیل کے پاس ایک شخص روزانہ آتا اور خاموشی سے ایک خاکی لفافہ پکڑا کر چلا جاتا۔ اس میں موسمی پھل ہوتے کبھی یہ لفافہ کھل جاتا اور پھل وہیں کھا اور دوستوں کو کھلا دیئے جاتے اور کبھی یہ جوں کا توں پڑا رہتا اور شام کو طفیل کے ساتھ گھر والوں کیلئے چلا جاتا جب گھر پہ مہمان آئے ہوتے تو طفیل لفافہ لانے والے سے مزید لفافہ طلب کرلیتے ایک اور شخص اسی طرح دوسرے تیسرے دن آتا اور ایک خاکی پیکٹ پکڑا جاتا اس میں تازہ خستہ خوش ذائقہ بسکٹ ہوتے جو عموماً چائے کے ساتھ ملاقاتیوں کو کھلائے جاتے۔ کسی کسی دن ایک سے زائد پیکٹ یہ خود مانگ لیتے، اور پوتیوں کے لئے گھر لے جاتے، یہ دونوں آدمی مال دیتے وقت اس کی قیمت کا مطالبہ نہ کرتے، طفیل بھی کبھی نہ پوچھتے کہ اس مال کی کیا قیمت یا بھاؤ ہے، اور نہ کبھی کوئی پیکٹ غیر ضروری،

قرار دے کر لوٹاتے یہ دونوں خوانچہ والے خود اپنی ضرورت پر آتے اپنی واجب رقم بتاتے اور لے جاتے۔ طفیل کبھی ان سے کوئی حساب فہمی نہ کرتے بس ان کی مطلوبہ رقم خاموشی سے دے دیتے۔

ہر رسالہ کی کچھ کاپیاں لکھنے والوں، ہمعصر رسالوں اور تبصرہ نگاروں وغیرہ کو اعزازی ہی دی جاتی ہیں۔ "نقوش" بھی ایسے لوگوں کو اعزازی دیا جاتا تھا۔ لیکن کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو "نقوش" خرید کر پڑھ سکتے تھے مگر طفیل سے صاحب سلامت رکھتے تھے لہٰذا ہر نیا شمارہ بازار میں آنے پر طفیل کے پاس ضرور حاضر ہوتے اور اس سے آگے پیچھے کبھی شکل بھی نہ دکھاتے یہ لوگ آتے ہی بڑے تپاک اور محبت کے ساتھ سلام دعا کرتے اور فرماتے سنا ہے نیا شمارہ شائع ہوگیا ہے اس کے دیدار تو کرائیے۔ کوئی کہتا ایک سٹال پر نیا شمارہ نظر آیا تھا بڑا خوبصورت پرچہ ہے ایک کاپی ہمیں بھی عنایت فرمائیے، یوں کوئی پرچہ کا دیدار کرتے کرتے اور کوئی عنایت سے سرفراز ہو کر رسالہ لے کر چل پڑتا۔ نہ وہ قیمت دیتا نہ طفیل کو اس کی طلب کی توفیق ہوتی اسی قسم کے ایک "مداح" ہمیشہ اس طرح پرچہ لے جاتے ایک مرتبہ تشریف لائے سلام دعا کے بعد فرمایا میں ہمیشہ آپ سے "نقوش" کا ایک پرچہ لے جاتا ہوں لیکن آج میں دو پرچے لوں گا طفیل نے شو سے پرچے نکلوا کر انہیں یوں پیش کر دیئے جیسے یہ ان پر قرض تھے۔

ایک مرتبہ طفیل کراچی آئے۔ ان دنوں "یا خدا" ناولٹ اور اس کے حوالہ سے اس کے مصنف قدرت اللہ شہاب کا بڑا شہرہ تھا موصوف وزارت اطلاعات میں ڈپٹی سیکرٹری تھے طفیل مجھے ساتھ لے کر شہاب صاحب سے ملنے ان کے دفتر گئے یہ ان سے پہلی ملاقات ہونے والی تھی اور تا حال طفیل ان کی صورت سے بھی آشنا نہ تھے۔ شہاب کے دفتر پہنچ کر طفیل نے ایک چٹ پر اپنا نام اور مدیر "نقوش" لکھ کر چپراسی کو دیا کہ صاحب کو اطلاع کر دے۔ یاد رہے یہ وہ وقت تھا جب طفیل کو قلمدان ادارت سنبھالے تھوڑا ہی وقت گذر رہا تھا اور ان کی اس جسارت پر لے دے ہو رہی تھی۔ چپراسی نے بتایا کہ صاحب فی الوقت ایک میٹنگ میں مصروف ہیں آپ انتظار فرمائیں وہاں کوئی انتظار گاہ نہ تھی چنانچہ ہم شہاب صاحب کے کمرہ کے باہر برآمدہ میں کھڑے میٹنگ ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے وقت گزرتا رہا۔ دس منٹ، پندرہ منٹ، آدھا گھنٹہ یہاں تک کہ پون گھنٹہ بیت گیا۔ چپراسی نے چٹ اندر پہنچا دی تھی ورنہ شاید اتنا انتظار نہ کیا جاتا۔ اس دوران میں طفیل نے چپراسی سے کئی مرتبہ دریافت کیا کہ آخر یہ میٹنگ کب تک ختم ہوگی۔ وہ غریب کیا بتا سکتا تھا۔ جب ہمیں انتظار کھینچتے تقریباً ایک گھنٹہ ہوگیا تو طفیل کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ اُنہوں نے ایک چٹ لکھی "ملنے حاضر ہوا تھا آپ بڑے آدمی ہیں، آپ کو میٹنگ سے فرصت نہیں اور مجھے انتظار کی فرصت نہیں" اور چپراسی کو تھما کر لوٹ آئے۔ اس واقعہ کو چند ماہ گذر گئے اور طفیل اسے بھول بھال چکے تھے کہ ایک دن ایک صاحب ان کے دفتر میں تشریف لائے سلام کے بعد اپنا تعارف کرایا "مجھے قدرت اللہ شہاب کہتے ہیں۔ میں صرف یہ عرض کرنے حاضر ہوا ہوں کہ میں بڑا آدمی نہیں ہوں۔ یوں طفیل کی شہاب صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی اور دوستی کی شکل اختیار کر گئی۔

طفیل کی ازدواجی زندگی الحمد للہ خوشگوار، پرسکون اور باہمی یگانگت کی حامل تھی اس لئے ایک دن جب انہوں نے بیویوں کے ہاتھوں میں ستائے ہوئے شوہروں کا ذکر کرتے ہوئے خود کو بھی اس زمرہ میں شمار کیا تو میں حیران رہ گیا۔ اسی ضمن میں معلوم ہوا کہ اُنہوں نے مظلوم شوہروں کی انجمن بھی بنائی ہوئی ہے جس کے یہ خود ساختہ صدر ہیں۔ سب سے پہلے اُنہوں نے برادران

نسیمؔ کو اس انجمن کا ممبر بنایا پھر چند دوستوں کو ورغلا کر اس میں شامل کیا ان میں لطیف الزماں بھی شامل تھے جب طفیل اس انجمن کے کسی ممبر کے ساتھ بے فکری کے لمحات میں بیٹھتے تو کرید کرید کر اس سے بیوی کی شکایات سنتے اور دوست کی مظلومیت پر اس سے ہمدردی کرتے۔ وہ ایک مرتبہ جب میں اور لطیف الزماں دونوں اس کے مہمان تھے طفیل نے اپنی بیگم کے سامنے انجمن کا ذکر چھیڑ دیا اور مجھے بھی اس کا ممبر بننے کی ترغیب دی۔ میں نے یونہی مذاقاً ہامی بھر لی مگر کہا کہ آپ کو اس انجمن کی کیا ضرورت ہے، بھابی تو بڑی نیک، خدمت گذار اور آپ کا خیال رکھنے والی خاتون ہیں طفیل بولے "توبہ توبہ اس جیسی ظالم عورت اور کون ہوگی آپ کو کیا معلوم ہیں تو اس کے مظالم سے عاجز آ گیا ہوں" بھابی نے قدرے مسکرا کر مجھ سے کہا "دیکھ لیں بھائی آپ بھی اتنے برس سے دیکھ رہی رہے ہیں، بتائیے ہیں نے ان پر کون سے مظالم کئے ہیں؟" یہ چہلیں اکثر ہوتی رہتیں یہاں تک کہ رسولؐ نمبر کی تدوین میں لگ کر طفیل گم ہو گئے اور یہ انجمن اور بیویوں کے مظالم کی داستانیں قصہ پارینہ ہو گئیں۔

ایک طرف یہ یوں بیوی کے ہاتھوں ستائے ہونے کا رونا روتے دوسری طرف اسی بیوی کے حج سے واپسی پر ان کی خوشی دیدنی تھی جیسے قدم زمین پر نہ ٹکتا ہو۔ صبح ہی سے پرواز کے منتظر تھے۔ خود بیگم کو لینے ہوائی اڈے گئے اس روز تمام عزیزوں کو جمع کیا اور انہیں دعوت طعام دی، جب لوگ کھانا کھا رہے تھے تو یہ ان کے ساتھ خود نہیں کھا رہے تھے البتہ ادھر سے ادھر تیز قدموں چلتے ہر مہمان کی خاطر مدارات کرتے پھر رہے تھے

ایک زمانہ میں طفیل لطیفہ پسند تھے لطائف و ظرائف پڑھتے اور دوستوں سے سن کر خوب قہقہے لگاتے۔ فرماتے ہنسنا اور قہقہے لگانا صحت کے لئے مفید ہے اس سے پھیپھڑوں کی ورزش بھی ہو جاتی ہے۔ اسی اصول کے تحت یہ گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر مدتوں گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ پھیپھڑوں کی ورزش کرتے اور زبردستی قہقہے لگاتے، اگر بچے خاموش ہو جاتے تو کہتے تم چپ کیوں ہو گئے قہقہہ لگاؤ اُن سے فرمائشی قہقہے لگواتے پھر ان پر آہستہ آہستہ سنجیدگی کا سایہ پھیلتا گیا اور قہقہے ماضی کے دھندلکوں میں پوشیدہ ہوتے گئے البتہ ان کی جگہ ایک پیاری سی مسکراہٹ نے لے لی۔

آپ نے طفیل کو صرف قلم سے کھیلتے اور انہماک کے ساتھ کرکٹ کمنٹری سنتے دیکھا ہوگا یا زیادہ سے زیادہ جذبہ قومی کے تحت بین الاقوامی ہاکی میچ کی کمنٹری بھی سنتے دیکھا ہو اس سے دیکھنے والوں کو اندازہ ہوتا ہوگا کہ ان کی زندگی کھیل کود سے دُور رہی ہے مگر ایسا نہیں، اسکول کے زمانہ میں طفیل نے خود بھی کرکٹ کھیلی ہے جہاں پاکستان کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان عبدالحفیظ کاردار ان کے ہم جماعت اور ساتھی ہوتے تھے اسکول چھوٹا تو یہ کھیل بھی چھوٹ گیا لیکن کہتے ہیں چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا چنانچہ ایک زمانہ میں یہ اپنے بھائیوں اور بڑے بیٹوں کے علاوہ دو ایک ہمسایہ لڑکوں پر مشتمل ایک ٹیم ترتیب دے کر ہر چھٹی کے دن کرکٹ کھیلتے ایسی ہی ایک ٹیم ان کے برادران نسبتی مرتب کرتے دونوں ٹیموں میں مقابلہ ہوتا ایک مرتبہ وہ لوگ ان کے علاقہ میں کھیلنے آتے اگلی مرتبہ یہ اپنی ٹیم لے کر اُن کے علاقہ میں پہنچ جاتے چند سال یونہی یہ مقابلے جاری رہے اور پھر بات کرکٹ میچ دیکھنے اور کمنٹری سننے تک رہ گئی۔

جب بھی کوئی بین الاقوامی کرکٹ میچ لاہور میں ہوتا طفیل پہلے ہی سے ٹکٹ حاصل کرتے اور میچ دیکھنے جاتے بلکہ اکثر

سیزن ٹکٹ لے لیتے اگر کسی دن خود نہ جا سکتے تو ان کا کوئی بچہ وہ ٹکٹ استعمال کر لیتا جب تک ٹی وی شروع نہیں ہوا تھا ایسے میچوں کی کمنٹری طفیل ریڈیو پر سنتے تعطیل کا دن نہ ہوتا تو ریڈیو دفتر میں ساتھ لے آتے اور بیٹھے کمنٹری سنتے رہتے کام جب معطل ہو جاتے، آنے جانے والوں کو بھی یہ اپنے ساتھ کمنٹری سننے میں لگا لیتے۔

جب ٹی وی شروع ہو گیا تو ریڈیو کے بجائے کمنٹری ٹی وی پر سنی جانے لگی اور میچ کے دنوں میں گھر سے ٹی وی دفتر آ جاتا اور دن بھر کمنٹری دیکھی جاتی۔ ہر اسٹروک اور ہر بال کی دل کھول کر یوں داد دیتے جیسے کوئی ماہر کھلاڑی خراب کھیل، خصوصاً اپنی ٹیم کے کسی کھلاڑی کا بالکل پسند نہ کرتے۔

ایسے موقع پر اپنی ناراضگی کا کھل کر اظہار کرتے اور ایسے کھلاڑی کو خوب خوب صلواتیں سناتے بین الاقوامی میچوں کے دنوں میں طفیل ضروری کام بھی پس پشت ڈال دیتے۔ میچ کے دوران کوئی ملنے آ جاتا' اپنی ٹیم کھیل رہی ہوتی اور آنے والا سلام دعا کے بعد خیریت پوچھتا تو جیتنے کے آثار کی صورت میں کہتے بہت اچھے ہیں' مزے آ رہے ہیں' جیت جائیں گے ان شاءاللہ اور اگر اپنی ٹیم خطرناک اور خراب صورتحال سے دوچار ہوتی تو طفیل کا جواب ہوتا" بہت برا حال ہے' بچنے کی کوئی امید نہیں" خیریت دریافت کرنے والا حیران ہوتا کہ یہ اچھے خلے ہمارے سامنے بیٹھے ہیں پھر ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں ذرا دیر بعد جب اسے اندازہ ہوتا کہ یہ تو میچ کا حال بتا رہے ہیں تو وہ ان کی محویت پر حیران رہ جاتا۔

طفیل تاش بھی بہت اچھا کھیلتے تھے۔ ایک زمانہ میں شام کو اور چھٹی کے دن گھر پر وقت گذاری کا یہی طریقہ تھا اس کھیل میں ساتھی بنانے کے لئے اُنہوں نے اپنی بیگم کو بھی تاش کھیلنا سکھایا ایک طرف طفیل اور اُن کی بیگم ہوتے اور دوسری طرف ان کا چھوٹا بھائی اور کوئی برادر نسبتی یا اُن کے سسر آ جاتے تو وہ شریک ہو جاتے۔ میں لاہور آتا تو ایسے موقع پر بھابی کے بجائے میں طفیل کا ساتھی بن جاتا اگر میرے ساتھ میری بیوی بھی ہوتی تو ایک طرف ہم دونوں اور دوسری طرف طفیل اور بھابی بیٹھ جاتے۔ بازی لگتی اور کبھی کبھی ساری ساری رات چلتی نیند بھگانے کے لئے درمیان میں چائے کا دور بھی چلتا طفیل کے کھیل کا کمال یہ تھا کہ یہ مخالف کے پتوں کا بڑا صحیح اندازہ لگا لیتے اور اسی لحاظ سے چال چلتے۔

اس کے علاوہ طفیل کیرم بہت عمدہ کھیلتے تھے اُنہوں نے گھر میں کیرم بورڈ بھی رکھا ہوا تھا میرے یہاں آتے تو میرے چھوٹے بھائی اور میری بیوی کے ساتھ کیرم کھیلتے اور اکثر بورڈ جیت لیتے۔ یہ عجیب و غریب اور نرالے زاویوں سے گوٹ لیتے اور پھنسی ہوئی گوٹیں آرام سے نکال لے جاتے اور ذرا دیر میں بورڈ جیت لیتے۔

طفیل کا دوسرا شوق پتنگ بازی تھا۔ اس کا مظاہرہ یہ بسنت پر کرتے۔ بڑے اہتمام سے اعلیٰ قسم کا مانجھا لاتے اسے چرخیوں پر چڑھاتے اچھی اچھی پتنگیں لاتے اور صبح سے اُڑانا شروع کر دیتے کبھی کسی میدان میں کبھی گھر کی چھت پر چڑھ کر سارا دن پتنگ اُڑاتے رہتے کھانا پینا سب ایک طرح سے بھول جاتے۔ مانجھے کی رگڑ سے انگلیاں فگار ہو جاتیں۔ خون رسنے لگتا یہ جب پتنگ میں پیچ ڈال دیتے عموماً اسے کاٹ دیتے۔ ان کا طریقہ دوسروں سے مختلف تھا۔ لوگ ڈور کھینچ کر مخالف کی پتنگ کاٹتے ہیں یہ ڈھیل دے کر ہی مقصد حاصل کرتے، ایک مرتبہ اُنہوں نے ایک ہی پتنگ سے ۵۰ پتنگیں کاٹیں اور اسے نوشیروان بنا کر اتار لیا اور سجا کر رکھ دیا ایک بسنت کے موقع پر جب یہ

گڑھی شاہو میں رہتے تھے اور حسب دستور پتنگ اُڑا رہے تھے۔ مقابلہ تو اُن کا کسی سے نہ تھا پھر بھی پیچ تو پڑ ہی رہے تھے۔ اُنہوں نے بھی ایک پتنگ میں پیچ ڈال دیا اور حسب عادت ڈھیل دیتے گئے یہاں تک کہ مخالف کی پتنگ کٹ گئی وہ کسی اور سے مقابلہ کر رہا تھا اس لئے تکرار منہ ہوا کہ اُنہوں نے کیوں پیچ ڈالا بات بڑھتی گئی اور معاملہ لڑائی بھڑائی تک آتے آتے بچا۔ اس دن سے طفیل نے پتنگ بازی کو خیرباد کہہ دیا

طفیل گڑھی شاہو میں کئی برس رہے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بادل اُن پر اسی گھر میں گذرے بلکہ ۱۹۷۱ء میں، مَیں لاہور آیا ہوا تھا جس روز رات دس بجے کی گاڑی سے میری واپسی تھی اسی روز مغرب سے ذرا قبل لاؤڈ سپیکر پر سول ڈیفنس والے اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ جنگ شروع ہو گئی ہے اور بلیک آؤٹ رہے گا آپ لوگ بتیاں نہ جلائیں۔ اعلان سنتے ہی طفیل فکرمند ہوئے، جنگ سے نہیں، میری وجہ سے۔ بولے آپ فوراً روانہ ہو جائیں ورنہ آپ کو اسٹیشن جانے کے لئے سواری نہ ملے گی۔ اُدھر بھابی کو تاکید کی کہ جلدی سے مجھے کھانا کھلا دیں اور اُنہوں نے مجھے مغرب کے وقت ہی اسٹیشن بھجوا دیا اسی زمانہ میں یہ کوشاں تھے کہ "نقوش" پریس کی بالائی منزل کرایہ داروں سے خالی کرالیں اس میں اللہ نے انہیں کامیابی عطا فرمائی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد جب میں لاہور آیا تو پریس کا یہ حصہ خالی ہو چکا تھا۔ اور طفیل سوچ رہے تھے کہ اس کو کس طرح استعمال کریں، بعض لوگ دفاتر کے لئے اس کے حصّے الگ الگ کرایہ پر لینا چاہتے تھے جو ان کے لئے معقول آمدنی کا ذریعہ بنتا تھا مگر بھابی کہتی تھیں کہ جگہ کو رنگ و روغن کرا کر اپنی رہائش وہاں منتقل کرلیں اور گھر کا کرایہ جو فی الوقت گڑھی شاہو میں دینا پڑ رہا ہے بچالیں تجاویز میرے سامنے بھی پیش کی گئیں میں بھابی سے متفق تھا۔ طفیل بھی راضی ہو گئے اور جگہ کو ٹھیک ٹھاک کرا کے پریس کے اوپر منتقل ہو گئے پھر اُنہوں نے موقع ملنے پر نیو مسلم ٹاؤن میں ایک پلاٹ اپنی بیگمؔ کے نام خرید لیا۔ اور اس پر تعمیر کا منصوبہ شروع کر دیا ایک بڑے آرکیٹکٹ سے اچھا سا نقشہ بنوایا اور تعمیر شروع کر دی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش فطرت انسانی ہے طفیل کو یہ فطرت ارزانی ہوئی تھی جس کا اظہار آپ "نقوش" کی ظاہری اور باطنی صورت میں دیکھ چکے ہیں بنگلہ کی تعمیر میں بھی یہ اسی پر عمل پیرا رہے اور منظور شدہ نقشہ میں خوب تر پیدا کرتے رہے یہ اپنے عزیزوں اور چند مخلص دوستوں کو وقتاً فوقتاً ساتھ لے جا کر زیر تعمیر عمارت دکھلاتے اس کی افادیت اور ظاہری حسن پر مشورہ کرتے اگر کوئی ان کو رائے دیتا کہ یہاں اس کے بجائے کچھ یوں ہوتا تو زیادہ مفید یا خوبصورت نظر آتا تو یہ غور کرتے انہیں بھی مجوزہ ترمیم میں بہتر صورت نظر آتی تو بنا بنایا حصّہ گروا دیتے اور مجوزہ ترمیم کے مطابق نئے سرے سے بنواتے، اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا بنگلہ مکمل ہونے میں ضرورت سے زائد وقت لگا اور رقم بھی زیادہ صرف ہوئی مگر طفیل خوش تھے کہ نقشہ سے بہتر تعمیر ہو گئی ہے ان کی اس جسارت پر ایل ڈی اے نے انہیں معاف نہیں کیا اور منظور شدہ نقشہ سے تجاوز کرنے پر بھاری جرمانہ عائد کر دیا۔ مگر یہ پھر بھی خوش تھے اس بنگلہ کی تعمیر کے بعد طفیل نقوش پریس کی عمارت سے اُٹھ کر نیو مسلم ٹاؤن آ گئے اور یہیں سے اپنی آخری آرام گاہ جا پہنچے۔

نقوش کی مقبولیت کے پیش نظر عام تأثر یہ رہا ہے کہ طفیل نے اس کے ذریعہ شہرت ہی نہیں کمائی بلکہ روپیہ بھی خوب بٹورا اور ان کا مالی استحکام اور حیثیت "نقوش" ہی کی رہین منت ہے۔ حقیقت حال تو خدا جانتا ہے یا طفیل جانتے تھے جن پر بیتی، مگر کچھ اندازہ راقم الحروف کو بھی ہے اپنی تمام تر مقبولیت کے باوجود "نقوش" کا ہر شمارہ طفیل کے لئے مالی خسارہ کا باعث رہا۔ معیاری تخلیقات کی قلت کے ساتھ یہ بڑی وجہ تھی کہ "نقوش" پابندی سے ہر ماہ شائع ہوتے ہوتے سال میں دو تین شمارہ پر آ گیا تھا۔ اس پر بھی ان کے نقصان کا اندازہ تیس پینتیس ہزار تھا۔ اتنے خسارہ کے ساتھ بڑے بڑے سرمایہ دار کام سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں لیکن طفیل کا دل گردہ

ملاحظہ ہو کہ بیوی بچوں تک کی مخالفت کے باوجود "نقوش" کو اسی آن بان سے جاری رکھا بلکہ نقوش" کے معیار اور شہرت کو چار چاند لگاتے رہے۔ ہوتا یوں تھا کہ طفیل ادارہ فروغ اُردو کی مطبوعات، نقوش پریس اور کورس کی کتب سے جو کماتے اور نفع حاصل کرتے اس میں سے خاندان کی گذر بسر کے بعد سب کچھ "نقوش" میں جھونک دیتے۔ یوں "نقوش" کے حسن میں طفیل کی محنت کے ساتھ ان کے خون جگر نے اصل رنگ پیدا کیا۔ ان تمام جتنوں کے باوجود وہ وقت بھی آیا جب رسول نمبر کی پہلی دو جلدوں کی اشاعت کے لئے انہیں سرمایہ کی ضرورت پیش آئی اور بینک سے قرض وغیرہ کے باوجود جب کام نہ بنا تو مجھے یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوا کہ طفیل نے پریس کی ایک مشین فروخت کر کے کام چلایا۔ یوں طفیل نے "نقوش" کو زندہ رکھا اور اسے زندہ رکھتے رکھتے خود اللہ کو پیارے ہو گئے۔

رسول نمبر کی پہلی چار جلدیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی تھیں، ایک دن میں پہنچا تو طفیل بڑے خوش تھے مسکرا کر بولے "یار اللہ کا شکر ہے اس مرتبہ خسارہ پیچھے نہیں ہوا نفع بھی نہیں ہوا، بس حساب برابر سرابر رہا۔" میں نے بھی خوشی کا اظہار کیا مبارک باد دی اور پوچھا کہ آپ نے یہ حساب کس طرح لگایا؟ پتا چلا اخراجات کی مد کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد بندی تک محدود ہے یہ تمام اخراجات اور آمدن برابر برابر ہیں میں نے ٹوکا بھائی! اور آپ کی دہ بارہ سالہ محنت مواد کی تلاش اور فراہمی کے سلسلہ میں آپ کے مختلف سفر کے اخراجات ڈاک کا خرچ، دیگر زبانوں سے تراجم کے معاوضے، مضمون نگاروں کو دیئے گئے معاوضے وغیرہ سب کس کھاتے میں گئے؛ کیا وہ اس نمبر کے اخراجات نہ تھے؟ فرمایا اگر وہ سب شمار کرنے بیٹھوں تو پھر خسارہ ہی خسارہ ہے۔ اس دنیاوی خسارہ کے مقابلہ میں طفیل نے رسول نمبر چھاپ کر جو توشۂ آخرت کمایا وہ گراں قدر ہے اس کے ساتھ انہیں دنیا میں نام مفت انعام ہوا۔

دیکھا جائے تو یہ حضرت "نقوش" کے بڑے بڑے معرکۃ الآرا نمبر مثلاً افسانہ نمبر، غزل نمبر، شخصیات نمبر، منٹو نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر، ادب عالیہ نمبر، شوکت تھانوی نمبر، آپ بیتی نمبر، جنگ نمبر، خطوط نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر، ادبی معرکے نمبر، انیس نمبر، عصری ادب نمبر اور رسول نمبر اور قرآن نمبر کا منصوبہ یوں ہی شان و شوکت سے پیش کرتے رہے اور گھر پھونک تماشا دیکھتے رہے اور تاریخ ادب اُردو میں اپنے نام کے جھنڈے گاڑتے اور سنگ میل کھڑے کرتے اس جہانِ فانی سے گذر گئے۔

مدیر کے فرائض میں لوگوں سے لکھوانا، اچھا مواد حاصل کرنا، تمام مواد کی قرینہ سے ترتیب و تدوین کرنا اور حسب ضرورت مضامین کی نوک پلک درست کرنا اور اُن میں گل بوٹے ٹانک کر ان کا رنگ نکھارنا بھی شامل ہے۔ طفیل کے پیش رو بڑے بڑے جغادری مدیر یہی سب کچھ کرتے گزرے، مولانا ظفر علی خاں، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، کس کس کا نام لیا جائے طفیل کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں تھے انہوں نے بھی اپنے یہ ادارتی فرائض نہایت خوش اسلوبی سے نبھائے۔

جہاں تک لوگوں سے لکھوانے کا تعلق ہے طفیل نے جو کچھ لکھوایا وہ "نقوش" کے صفحات پر پھیلا ہوا ہے یہ کس کس طرح لکھوایا اس کی ایک مثال منٹو سے متعلق اوپر عرض کر چکا ہوں یہاں میں ان کی ایک اور تدوین کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ میرا اشارہ طفیل کی کتاب "من آنم" کی طرف ہے یہ ان کی اپنی لکھی ہوئی کتاب نہیں بلکہ یہ اُنہوں نے لکھوائی ہے یہ فراق گورکھپوری کے چند خطوط کا مجموعہ ہے جو فراق نے طفیل کو لکھے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ یہ خطوط خود طفیل نے فراق سے اپنے نام لکھوائے اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ طفیل نے فراق سے سیدھے سادے سوال ہی نہیں کئے بلکہ کچھ ایسی چٹکیاں بھی لی ہیں، جن

کے طویل جواب میں فراق نے اپنی بہت سی آپ بیتی اور خانگی حالات بھی لکھ ڈالے اس کے علاوہ طفیل نے ان سے ان کے فن اور شاعری پر ایسی بحث بھی چھیڑی جس کا جواب دیئے بغیر فراق کو چارا نہ رہا فراق کے خطوط اس کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ طفیل نے کیسے کیسے ذاتی تیکھے اور علمی گہرائی کے سوال فرق سے کئے ہوں گے اس کا پتا چلانے کے لئے ضروری ہے کہ فراق کے نام طفیل کے وہ خطوط جن کا جواب "من آنم" میں ہے منظر عام پر آئیں۔ ان سے طفیل کی بہت سی علمی ادبی صلاحیتوں، اسلوب نامہ نگاری اور فراق سے ان کے ذاتی مراسم پر روشنی پڑے گی، کہتے ہیں آدمی کا اصل روپ اور بیساختہ انداز تحریر خطوط میں نظر آتا ہے۔ طفیل کے اس روپ اور انداز کو جاننے کے لئے فراق جیسے لوگوں کے نام ان کے خطوط جمع کر کے شائع کئے جانے چاہئیں۔

حصول مواد کا ایک تو یہی طریقہ تھا کہ لکھنے والے کو اکسایا جائے اور اس کے کچھ ایسی چٹکیاں لی جائیں کہ اس میں لکھنے کی تڑپ پیدا ہو۔ دوسرا نسبتاً آسان طریقہ یہ ہے کہ اچھے مواد کا سراغ لگایا جائے کہاں پڑا ہے پھر اسے حاصل کیا جائے اس میں بھی طفیل نے بڑے استادانہ ہاتھ دکھائے۔ اسی لئے وہ "نقوش" کے ذریعہ اردو ادب کو بے شمار نایاب اور نادر چیزیں دے گئے اور آئندہ نسلوں کے لئے ان چیزوں کو محفوظ کر گئے یہ ادب پارے اور نوادرات کن جان جوکھوں اور کہاں کہاں سے حاصل کئے گئے اس کا اندازہ لگانے کے لئے میں صرف "نقوش" کے مکاتیب نمبر اور خطوط نمبر کا ذکر کروں گا۔ اتنے بہت سے مشاہیر کے اتنے خطوط برصغیر کے کونے کونے سے اکٹھا کرنا ہی ہنسی کھیل نہ تھا اول تو یہ سراغ لگانا ہی مشکل تھا کہ کس کے پاس کن کن مشاہیر کے خطوط ہیں بہر حال طفیل نے خندہ پیشانی سے یہ مہم سر کی۔ اس سلسلہ میں اُنہوں نے پاکستان اور ہندوستان کے کونہ کونہ کے سفر کئے اور مواد تلاش کر کے لائے انہیں کوششوں میں طفیل کو پتا چلا کہ ہندوستان میں ایک صاحب کے پاس سیکڑوں قیمتی خطوط ہیں یہ وہاں پہنچے بہت سے خطوط کو خود دیکھا۔ ان کے مالک سے یہ خطوط یا ان کی فوٹو کاپی مانگی، ہر قسم کی ترغیب و تحریص سے کام لیا، خوشامد سے کام نہ چلا تو معقول معاوضہ پیش کیا مگر کوئی صورت کارگر نہ ہو سکی اور انہیں انکار ہی سننا پڑا، مایوسی کے اندھیروں میں اُنہوں نے تدبیر کا چراغ جلایا مذکورہ خطوط کے مالک کے ایک رشتہ دار کا پتا لگایا جو طفیل کے حلقۂ احباب میں ہی نکل آیا، آدمی کچھ عمر مگر پکی گوٹیاں کھیلا ہوا تھا۔ طفیل نے مسئلہ اس کے سامنے رکھا اور اس کے ہندوستان کے سفر کے خرچ کی پیش کش اس شرط پر کی کہ وہ انہیں مطلوبہ خطوط اپنے عزیز سے لادے وہ رضامند ہوا تو اس کے سفر کا اہتمام کیا اور روانہ کر دیا یہ صاحبزادے اپنے بزرگ کے پاس ہندوستان پہنچے ان کے مہمان رہے مشاہیر سے ان کے تعلقات کی تعریفیں کیں خط و کتابت کا ذکر کیا اور اُن کے اس ذخیرہ کی یوں تعریف کی کہ انہوں نے بہت سی چیزوں کی اسے زیارت کرائی مگر اصل مقصد کی طرف نہ آئے اور بات نہ بن پائی البتہ ان صاحبزادے نے اس سارے عمل میں یہ معلوم کر لیا کہ یہ نادر خزانہ کہاں چھپا کر رکھا جاتا ہے دو چار دن یہ موقع کی تلاش میں رہے اور ایک دن میزبان کی گھر سے عدم موجودگی میں سارے خزانہ پر ہاتھ صاف کیا تمام نادر خطوط سمیٹے سوٹ کیس میں بھرے اور وہاں سے فرار ہوئے سیدھے لاہور پہنچ کر دم لیا اور خطوط طفیل کے سامنے ڈھیر کر دیئے ان کے مالک کو جب پتا چلا تو سر پیٹ کر رہ گیا۔

اسی طرح طفیل کو پتا چلا کہ نیشنل میوزیم کراچی نے سرسید وغیرہ جیسے مشاہیر کے بہت سے خطوط خرید کر محفوظ کرلئے ہیں، ان کے حصول کے لئے طفیل نے متعلقہ حکام کے علاوہ میوزیم کی انتظامی کمیٹی کے سربراہ ممتاز حسن صاحب سے بھی رابطہ قائم کیا خود بھی کراچی آ کر ان لوگوں سے ملے بمشکل یہ طے پایا کہ طفیل اپنے خرچ پر جن خطوط کی چاہیں تصاویر لے سکتے ہیں اصل خطوط کسی حال میں بھی میوزیم سے

باہر نہیں جائیں گے اپنی لگن میں طفیل نے یہ شرائط قبول کرلیں۔ اب خطوط کی تصاویر لینے کا سالمہ تھا۔ طفیل نے ایک صاحب کو اس کام کے لئے تیار کیا جو اچھے فوٹوگرافر تھے انہیں کیمرہ، فلمیں اور سفر خرچ دے کر لاہور سے کراچی بھیجا۔ یہ موصوف دس بارہ دن کراچی رہے، میوزیم جاکر خطوط کی تصویر کشی کرتے رہے مگر معلوم ہوا کہ ان کی لی ہوئی ایک بھی تصویر اس قابل نہیں کہ اس سے خط کا متن یا عکس شائع کیا جا سکے ان کی محنت اور وقت کے ساتھ طفیل کی رقم بھی ضائع ہوئی اور کام نہ بنا۔

اس ناکامی کے بعد خطوط کی تصاویر حاصل کرنے کے لئے دوسرے ذرائع کی تلاش شروع ہوئی اور مہم میرے سپرد کی گئی۔ انہی دنوں حکومت کا ایک گشتی مراسلہ میری نظر سے گزرا جس میں تمام محکموں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اپنے اہم اور مستقل ریکارڈ مائیکرو فلم کراکے محفوظ کرلیں اس غرض کے لئے آثار قدیمہ کے تحت میوزیم کا ایک برادر محکمہ برائے مائیکرو فلم اور بطور محفوظ خانہ قائم کیا گیا تھا۔ میں نے اس محکمہ کے افسران مجاز سے رابطہ قائم کیا اور طفیل کے مشورہ سے یہ طے کیا کہ میوزیم میں محفوظ تمام مشاہیر کے خطوط جس میں سرسید کے تقریباً سو خط بھی شامل تھے فوری طور پر مائیکرو فلم کردیئے جائیں اور یہ فلم طفیل کو عاریتہً دے دی جائے جس سے وہ حسب خواہش خطوط کے عکس یا متن "نقوش" میں شائع کرنے کے بعد پرچہ کی ایک جلد کے ساتھ فلم واپس محکمہ کو دے دیں۔ میوزیم کے ذخیرہ کے بعد ہم نے اسی انتظام کے تحت ایسے ذاتی ذخائر سے بھی خطوط کی فلم حاصل کرلی۔ جو عاریتہً بھی یہ خطوط طفیل کو دینے کے روادار نہ تھے اس طرح پیر حسام الدین راشدی اور ڈاکٹر کرنل خواجہ عبدالرشید کے ذخائر سے بہت سے خطوط "نقوش" کے لئے حاصل ہوگئے۔

بیاض غالب جیسی دستاویز غالب نمبر کی شکل میں "نقوش" کی زینت بن چکی ہے یہ دیوان غالب کا وہ قدیم ترین قلمی نسخہ ہے جس کے گم ہوجانے کا غم غالب کو ساری عمر رہا۔ طفیل نے یہ نمبر غالب صدی کے موقع پر آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ حکومت ہند بھی اسی موقع پر دیوان غالب شائع کرنا چاہتی تھی لیکن طفیل اولیت لے گئے۔

ایسے ہی نہ جانے اور کتنے واقعات ہیں جن کا انکشاف وقتاً فوقتاً ہوتا رہے گا میں اس سلسلہ میں تجویز کروں گا کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو اس ضمن میں تحقیقاتی مقالات تیار کرانا چاہئیں اور محققین کو ادب اردو میں ڈاکٹریٹ دینا چاہیے، تاکہ شائقین ادب کو معلوم ہو اور تاریخ ادب میں ثبت ہوجائے کہ طفیل نے کہاں کہاں اور کس کس طرح خونِ جگر اور سرمایہ حیات کھپا کر ہمیں "نقوش" کے لازوال نمبروں سے نوازا ہے۔

جہاں تک بطور مُدیر لوگوں کی نگارشات کی نوک پلک درست کرنے کا معاملہ ہے۔ طفیل اس میدان میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔ اُردو ادب کے ایک ممتاز ڈاکٹر ہیں جن کے تنقیدی مضامین "نقوش" کی زینت ہوا کرتے تھے۔ طفیل کی ادارت کی ابھی ابتدا ہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا ایک مضمون "نقوش" میں اشاعت کے لیے آیا۔ طفیل نے مضمون میں چند تاریخی اور زبان کی اغلاط پائیں اور بلا ڈاکٹر صاحب کو اطلاع کیے ان کی اصلاح کرکے مضمون "نقوش" میں شائع کردیا جب پرچہ ڈاکٹر صاحب تک پہنچا انہوں نے طفیل کی اصلاح کو نوٹ کیا اور شکریہ کا خط لکھا کہ اگر آپ یہ اغلاط نہ پکڑتے اور انہیں درست نہ کرتے، تو اہل علم میں میری بھداڑتی اور میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ یہ واحد مثال نہیں طفیل نے بعض افسانہ نگاروں اور کہانی نویسوں کی نگارشات میں بھی قابلِ قدر اور قیمتی اصلاحات کیں۔ ایک دو مرتبہ تو اصلاح کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ یا یوں کہیے کہ کہانی کی اغلاط اور کمزوریوں کا دائرہ

اتنا وسیع تھا کہ اس نے طفیل کی اصلاح کے دائرہ کو اپنی لپیٹ میں یوں لے لیا کہ آخر میں کہانی تو وہی باقی تھی مگر اس کا جامۂ تحریر بالکل نیا ہو گیا تھا۔ جب یہ نگارشات شائع ہو کر قارئین کے سامنے آئیں تو خوب خوب داد و تحسین انہیں حاصل ہوئی احباب نے لکھنے والے کو مبارکباد دی اس کے اسلوب کی تعریف کی تو وہ ان تعریفوں کی خوشی میں اپنی تحریر کے اتنے بڑے آپریشن کا سارا دکھ بھول گیا۔

ایک مرتبہ ہندوستان سے ایک نامور افسانہ نگار کا جو افسانہ "نقوش" کے لیے آیا وہ خاصا کمزور تھا اور لکھنے والے کے نام کے ساتھ لگا نہ کھاتا تھا۔ تاہم کہانی کا مرکزی خیال اور ڈھانچہ اچھا تھا بس الفاظ کا لبادہ موزوں نہ تھا۔ طفیل نے سوچا افسانہ کی قدرے پلاسٹک سرجری کر دی جائے اور اس کے لبادہ میں پیوند لگا دیے جائیں، تو بات بن جائے گی۔ چنانچہ یہ قلمدان ادارت لے کر بیٹھ گئے اور عملِ جراحی شروع کر دیا۔ جب یہ اس عمل سے فارغ ہوئے اور افسانہ بھی اس جراحی کے بعد ہوش میں آیا، تو ایک بہت ہی خوبصورت نیا افسانہ جنم لے چکا تھا۔ طفیل نے یہ افسانہ ان افسانہ نگار کو بھیجا اور اجازت طلب کی کہ ان کے ہی نام سے نقوش میں شائع کر دیا جائے۔ افسانہ نگار نے جواباً لکھا کہ وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ طفیل کا افسانہ ان کے نام سے شائع ہو۔ البتہ طفیل کو اجازت ہے کہ ان کا اصل افسانہ اور یہ دونوں "نقوش" میں ایک دوسرے کے مقابل شائع کر دیں۔ یہ بات طفیل کو گوارا نہ ہوئی اور یوں قارئین دونوں ہی افسانوں کی لذت سے محروم رہ گئے۔

ویسے آپ کو حیران نہیں ہونا چاہیے۔ اگر میں یہ کہوں کہ طفیل نے خود اپنے نام سے بھی چند افسانے لکھے ہیں۔ انہوں نے نہ یہ کہیں شائع کیے نہ لوگوں کو انہیں پڑھنے کا موقع دیا۔ اگر کسی وقت یہ افسانے قارئین کے سامنے آئے، تو اردو ادب کے نقاد کو شاید یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہو کہ طفیل ایک اچھا خاکہ نگار تھا یا ایک اچھا افسانہ نگار۔ امید ہے کہ یہ بحث آخر کسی وقت چھڑ کر رہے گی۔

طفیل اردو ادب کے لئے جو کچھ کرتے رہے خصوصاً "نقوش" کے ذریعہ اس کے لئے انہوں نے نہ کبھی کسی صلہ کی تمنا کی نہ ستائش کی پروا لیکن انہیں یہ سب کچھ حاصل ہوتا رہا اور جو ملا انہوں نے جھولی میں سمیٹ لیا، اس کی کمی یا زیادتی کی طرف توجہ نہ کی اور جو نہ ملا اس کی کبھی پروا نہ کی، یہ اپنے کام کاج کی دھن میں لگے رہے۔ آخر وہ دن بھی آیا، جب میری نظر میں انہیں سب سے بڑا خراجِ تحسین ملا۔ ہوا یوں کہ ایک شب جب طفیل دیر تک کام کرنے کے بعد تقریباً ایک بجے بستر پر لیٹے اور ان کی جھپکی لگی، تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ طفیل نے ریسیور اٹھا کر اپنے مخصوص انداز میں کہا: "جی!" آپریٹر نے پوچھا "محمد طفیل صاحب ہیں؟" یہ بولے "جی! میں بات کر رہا ہوں۔" اس پر ادھر سے آواز آئی "ہولڈ کیجئے صدر صاحب آپ سے بات کریں گے۔" طفیل نے مسکرا کر کہا: "یار جانے دو، آدھی رات کو یہ مذاق کر کے کیوں نیند خراب کرتے ہو۔" آپریٹر کی آواز آئی "جناب! میں مذاق نہیں کر رہا، صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں....." طفیل بیچ ہی میں بول پڑے: "بھائی! میں ایک معمولی سا آدمی ہوں، صدر صاحب کو مجھ سے کیا غرض، وہ بھی آدھی رات کو، چھوڑو یار یہ مذاق دن میں کسی وقت کر لینا فی الحال تو سونے دو" طفیل ریسیور رکھنے والے تھے کہ ادھر سے سراسیمہ آپریٹر کی آواز آئی "جناب میں تو بالکل ہی معمولی آدمی ہوں، اگر آپ نے فون بند کر دیا، تو میری نوکری جاتی رہے گی، میں آپ سے مذاق نہیں کر رہا، آپ محمد طفیل مدیرِ نقوش ہی ہیں نا!" ان کا جواب تھا "جی ہاں!" اس نے کہا "تو جناب! صدر

صاحب آپ ہی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" میں بلا رہا ہوں" اور اُدھر سے صدرِ مملکت کی آواز اُبھری" طفیل صاحب! السّلام علیکم، آپ سو تو نہیں گئے تھے؟ میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی۔ میں "نقوش" کا پرانا قاری ہوں۔ آپ کے سارے ہی شمارے میرے پاس موجود ہیں۔ میں آپ کا دیرینہ مداح ہوں۔ مگر آج میں بہت خوش ہوں۔ ہمیں آپ پر فخر ہے۔ آپ نے پوری قوم اور پاکستان کا نام سربلند اور روشن کیا ہے۔ آج میرے پاس ہندوستان کا ایک وفد آیا تھا۔ انہوں نے کہا بھارت ہم سے ہر بات اور ہر چیز میں آگے ہے سوائے ایک چیز کے اور اگر ہم انہیں وہ چیز دے دیں، تو پھر وہ کسی چیز میں بھی پاکستان سے پیچھے نہ رہیں گے۔ جانتے ہیں آپ، انہوں نے کس چیز کا نام لیا! "نقوش" کا۔ ان کی بات سے میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ آپ کو مبارکباد دوں۔ میں آپ سے ملنا بھی چاہتا ہوں۔ کبھی راولپنڈی آنے کا اتفاق ہو تو مجھے ضرور ملیں"

اس کے بعد طفیل کی صدرِ مملکت سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ بار بار دریافت فرماتے، بتائیے ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں اور ہر مرتبہ طفیل جواباً رائٹرز گلڈ یا ادیبوں کی فلاح وبہبود کا کوئی نہ کوئی مسئلہ صدر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ اپنے یا نقوش کے لیے کبھی ان سے کچھ طلب نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بن مانگے بھی بہت کچھ دیتا ہے، سو طفیل کو بھی اس نے دیا۔

"نقوش" کے "ادبی معرکے" نمبر کے حوالہ سے فلیٹیز ہوٹل لاہور میں ایک تقریب ہو رہی تھی کہ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب تقریب میں تشریف لے آئے۔ یہ تقریب کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ ان دنوں "نقوش" کے "رسولؐ نمبر" کی ابتدائی دو جلدیں طباعت کے مراحل میں تھیں۔ اس تقریب میں کئی نامور ادیب "نقوش" اور طفیل کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے، اور "ادبی معرکے نمبر" پر اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ صدرِ پاکستان نے بھی کچھ ارشاد فرمانے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ سٹیج پر تشریف لائے اور اچھی خاصی تقریر کر ڈالی، جس میں انہوں نے طفیل کی کاوشوں کو سراہا، "نقوش" کی تعریف و توصیف فرمائی۔ آنے والے "رسولؐ نمبر" کے سلسلہ میں طفیل کو پہلے حج یا کم از کم عمرہ کرنے اور دربارِ رسولؐ میں حاضری کا مشورہ دیا۔ اسی موقع پر صدر صاحب نے "نقوش" کے اعلیٰ معیار کی قدر فرماتے ہوئے پچاس ہزار روپے سالانہ کے گراں قدر "نقوش ایوارڈ" کا اعلان فرمایا اور اسے "نقوش" میں ہر سال شائع ہونے والی بہترین نگارشات کے لیے مختص فرمایا۔

یہ تو صلہ کی بات تھی، جہاں تک انعام کا تعلق ہے وہ بھی سُن لیجیے۔ ایک دن طفیل کے قدر دان ایک افسر کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اُردو ادب میں حسنِ کارکردگی کے صدارتی انعام کے لیے نام تجویز ہو رہے ہیں۔ صوبائی حکومت سے صرف ایک نام صدرِ مملکت کو سفارش کے ساتھ بھیجا جائے گا۔ ہمارے سامنے صرف دو نام ہیں۔ اُن میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔ ہمیں دونوں میں سے صرف ایک ہی نام منتخب کرنا ہے۔ محکمہ کی رائے آپ کے حق میں ہے۔ میری ذاتی خواہش بھی یہی ہے کہ اس مرتبہ یہ اعزاز آپ کو ملے اور آپ کے کام کی قدر کا اظہار اعلیٰ ترین سرکاری سطح پر ہو جائے، جو دراصل بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ طفیل نے پوچھا کہ دوسرا نام کن صاحب کا زیرِ غور ہے؟ معلوم ہوا کہ وہ نام شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کا ہے۔ طفیل نے پورے وثوق سے کہا تو پھر آپ اس مرتبہ یہ اعزاز شیخ صاحب کو ہی ملنے دیں اور ان کی پُر زور سفارش کریں۔ ان کا تحقیقی اور تخلیقی کام بہت زیادہ ہے اور لمبے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے کہیں سینئر اور بزرگ ادیب ہیں۔ ویسے بھی ضعیف آدمی ہیں۔ اگر وہ اس مرتبہ اس اعزاز

سے رہ گئے، تو معلوم نہیں آئندہ موقع کے لیے ان کی عمر وفا کرتی ہے یا نہیں۔ افسر نے کہا شیخ صاحب کا نام تو آئندہ سال منظور ہو سکتا ہے، مگر آپ کا نام شاید پھر تجویز بھی نہ ہو پائے۔ اس پر بھی طفیل نے کہا کہ آپ میری بات مان لیں اور شیخ صاحب ہی کی سفارش کر دیں، انہیں یہ اعزاز مل گیا، تو مجھے خوشی ہو گی۔ چنانچہ اُس سال یوم آزادی پر انعام و اعزاز پانے والوں کی جو فہرست شائع ہوئی اس میں صدارتی اعزاز برائے حسنِ کارکردگی (ارد و ادب) شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کو ملا تھا اور طفیل اعلان کے بعد شیخ صاحب کو مبارکباد دے رہے تھے۔

طفیل کے دوست کی پیش گوئی ایک حد تک درست ثابت ہوئی۔ پھر ایک عرصہ تک کسی نے طفیل کا نام کسی اعزاز کے لیے نہ لیا۔ کئی سال بیت گئے۔ ایک ادیب اور ادب شناس افسر جو طفیل کے دوست تھے، ایسی آسامی پر آن لگے جہاں سے اعزاز کے لیے نام صدرِ مملکت کو بھجوائے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک دن طفیل کو فون کیا کہ میں آپ کا نام حسنِ کارکردگی کے صدارتی اعزاز کے لیے بھجوا رہا ہوں۔ اِدھر سے سوال ہوا کہ آپ کے پیشِ نظر کوئی اور نام بھی ہے؟ افسر نے کہا کہ آپ کو اس سے کیا غرض، نام تو کئی تجویز ہوتے ہیں اور ان میں سے صرف ایک ہی چنا جاتا ہے۔ طفیل نے کہا "پھر بھی، اب کیا صورتِ حال ہے" اِدھر سے جواب تھا، کہ مختلف مراحل سے گزر کر اس وقت ان کے سامنے صرف دو نام ہیں اور ان کا ووٹ طفیل کے حق میں ہے۔ طفیل نے دوسرا نام دریافت کیا، تو پتا چلا کہ اس مرتبہ اُن کے مدِ مقابل حکیم یوسف حسن، مدیر "نیرنگِ خیال" ہیں۔ طفیل نے کہا کہ آپ حکیم صاحب کی سفارش کریں تو بہتر ہو گا۔ افسر نے کہا، میں آپ کی سفارش کرنا چاہتا ہوں، اس مرتبہ آپ انکار نہیں کریں گے ورنہ پھر کسی نے آپ کو نہیں پوچھنا اُن کا جواب پھر حکیم صاحب کے حق میں تھا۔ افسر نے کہا کہ سوچ لیجیے آپ ایک مرتبہ پہلے بھی اس اعزاز سے انکار کر چکے ہیں۔ طفیل نے حیرانی سے پوچھا کہ یہ آپ کو کس نے کہہ دیا۔ افسر نے بتایا کہ جو فائل ان کے سامنے پڑا ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ آپ اس سے قبل شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کے حق میں دستبردار ہو چکے ہیں۔ طفیل نے اپنا فیصلہ سُنا دیا کہ وہ اس مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب کے حق میں دستبردار ہوتے ہیں، کیونکہ حکیم صاحب نہ صرف بزرگ ہیں، بلکہ اسّی کے پیٹے میں ہیں، ان کی صحت بھی جواب دے رہی ہے اگر انہیں اس مرتبہ اعزاز نہ ملا، تو شاید وہ افسر موصوف کی عنایت اور حکومت کی نظرِ کرم کا انتظار نہ کر سکیں گے۔ جب اعزازات کا اعلان ہوا اور یہ اعزاز حکیم صاحب کو ملا، تو طفیل نے حکیم صاحب کو خوب خوب مبارکباد دی۔

طفیل دوسروں کے حق میں اعزاز سے دستبردار کیا ہوئے سرکار دربار نے انہیں ہی مسترد کر دیا اور ان کے ادبی کارناموں کو فراموش اور نظرانداز کر دیا۔ اس کے باوجود طفیل اسی لگن، جوش و جذبہ سے اردو ادب کے میدان میں اپنی جولانیاں دکھاتے رہے یہاں تک کہ "نقوش" کے "رسولؐ نمبر" کی پہلی چار جلدیں منظرِ عام پر آ گئیں۔ اس وقت ایک دن مرکزی حکومت کے متعلقہ محکمہ کے ایک بہت بڑے افسر نے طفیل سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ حکومت انہیں ہجری تقریبات کے موقع پر "رسولؐ نمبر" کے حوالے سے انعام دینا چاہتی ہے۔ کیا طفیل اسے قبول کر لیں گے۔ یہ استفسار اس لیے کیا جا رہا ہے کہ آپ قبل ازیں انعام و اعزاز سے انکار کرتے اور دوسروں کے حق میں دستبردار ہوتے رہے ہیں۔ حکومت کی خواہش ہے کہ اس مرتبہ آپ انکار نہ کریں۔ صدرِ مملکت ذاتی طور پر اس معاملہ میں دلچسپی رکھتے ہیں، انعام آپ کی توقع سے بہتر ہو گا۔ طفیل خاموش ہو گئے۔ ہجری تقریبات ہوئیں اور پیغمبر آخر الزماں

رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے گزشتہ سن ہجری میں شائع ہونے والی مطبوعات پر حکومت کی طرف سے صدر مملکت نے مصنفین و مرتبین کو انعامات دیئے۔ اسی تقریب میں "رسولؐ نمبر" کے حوالہ سے طفیل کو بھی ایک لاکھ روپیہ انعام دیا گیا اس کے چند سال بعد اردو ادب میں طفیل کی مجموعی کارکردگی خصوصاً "نقوش" کے خاص نمبروں کے حوالہ سے جو کچھ سامنے آیا اس پر انہیں ستارۂ امتیاز کا اعزاز بھی ملا۔

طفیل کا خاندانی اور سماجی ماحول قطعاً غیر ادبی تھا۔ یہ ایک غریب عزت دار خاندان کے فرد تھے۔ جہاں اپنے کاروبار اور روزگار کے مطابق معمولی تعلیم کو ہی کافی جانا جاتا تھا اس ماحول سے طفیل کس طرح ابھرے، بساط ادب پر اپنا مقام پیدا کیا اور بڑے بڑے کارنامے ادب اُردو کے خزانہ میں اضافہ کر گئے۔ یہ موضوع تحقیق طلب ہے ہم صرف اتنا عرض کر سکتے ہیں کہ خدا کی دین ہے جو اس نے طفیل پر ارزانی فرمائی اور انہیں لڑکپن ہی سے ادبی ذوق و شعور بخشا۔ جہاں اُنہوں نے اس کچی عمر میں ادبی صحبتوں میں شرکت اور مشاعرے سننے کا شوق پیدا کیا وہیں ان محفلوں کے ذریعہ اپنے ذہن کو جلا دی۔ گھریلو حالات نے انہیں میٹرک کی سند بھی حاصل نہ کرنے دی مگر ان کے ذوق نے مطالعہ کتب و رسائل کی شکل اختیار کی اور طفیل چراغ نیم بشی کی روشنی میں جب ان کے ہم عمر خواب خرگوش کے مزے لیتے ہوئے مصروف مطالعہ رہ کر اپنی علمی و ادبی استعداد بڑھاتے رہے۔ اللہ نے ذہن اچھا دیا تھا اس لئے اچھے فقرے اور چست بندشیں، تیکھے انداز اظہار ان کے حافظہ میں ذخیرہ ہوتے گئے کس عالم و محقق کی کون سی کتاب اچھی ہے اس کا نفس مضمون کیا ہے اس کی خوبیاں کیا ہیں یہ سب ان کے ذہن میں گھر کرتی جاتیں۔ پھر نشر و اشاعت کے کام اور نقوش کی ادارت نے ان کی ادبی محفلوں کو وسعت دی۔ ان کے ادبی شعور کو نکھارا، اور یہ قدم بقدم اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں انہیں دیکھنے والے کو ٹوپی سنبھالنا پڑتی ہے۔

مجھے یاد ہے ہماری ملاقات ادبی لٹک ہی کے باعث ہوئی۔ میں تو اسی لٹک میں اٹک گیا اور طفیل قلانچیں بھرتے آگے بڑھ گئے۔ اکثر جب میں لاہور آتا اور کوئی اچھی ادبی محفل ہوتی تو یہ اس میں شرکت کرتے اور مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ ورنہ یہ تو اکثر ہوتا کہ شام کو کھانے کے بعد یہ کسی نہ کسی ادبی مباحثہ کا ٹیپ ریکارڈ سناتے جس میں طفیل خود بھی شریک ہوتے مباحثہ میں یہ اہم نکات اٹھاتے، بحث کو موضوع سے ہٹتا دیکھتے تو کوئی بات ایسی شروع کر دیتے۔ کہ اس کا سرشتہ دوبارہ موضوع سے جڑ جاتا۔ ان مباحث کو سن کر طفیل کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا۔ یہ ان کے علمی و ادبی ارتقاء کا ہی نتیجہ تھا کہ طفیل میٹرک کی سند نہ رکھتے ہوئے بھی پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے اُردو کے ممتحن مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ یہ فرائض خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔ اپنی ممتحنی کے دور میں یہ طلبہ کے بہت سے شگوفے بھی سناتے رہتے جواب یاد نہیں البتہ انہی دنوں میں نے طفیل سے کہا تھا کہ ایسے شگوفے نوٹ کر لیں اور کسی فرصت کے لمحے ان پر مزیدار سا مضمون لکھیں۔ قوی امید ہے کہ اُنہوں نے بہت سے شگوفے پرچہ ہائے امتحان سے نوٹ کر کے رکھے ہوں گے۔

طفیل کو "نقوش" کی ادارت کرتے دس سال بیت گئے تھے اور اس دوران میں ان کے خاکوں کے دو مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے تھے۔ دو کتابوں کا مصنف ہونا پاکستان رائٹرز گلڈ کی ممبری کی بنیادی شرط تھی طفیل یہ شرط پوری کرتے

تھے۔ اس لئے انہوں نے گلڈ کی ممبری کے لئے درخواست گزار دی۔ حسب قاعدہ یہ درخواست گلڈ کی علاقائی شاخ سے منظور ہو کر توثیق کے لئے مرکزی عاملہ میں پہنچ گئی۔ پہلے تو پنجاب ہی میں ان کی درخواست کی مخالفت ہوئی جو اصولی کے بجائے ذاتی بنیاد پر تھی اصول کی فتح ہوئی اور پنجاب شاخ نے انہیں ممبر بنانے کی سفارش کے ساتھ طفیل کی درخواست رائٹرز گلڈ کی مرکزی عاملہ کو کراچی بھیج دی۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی ایوان ادب میں زلزلہ سا آگیا۔ ابھی لوگوں نے اُن کی "نقوش" کی ادارت کو ہی دل سے قبول نہیں کیا تھا اور اس سلسلہ میں طفیل کے خلاف چہ میگوئیاں تو مدھم پڑ چکی تھیں لیکن دلوں کی کدورت ابھی باقی تھی۔ اور اب یہ پھر صف اول کے ادیبوں کا منہ چڑانے کھڑے ہو گئے تھے اور ان کا کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے کی جسارت کر رہے تھے لہٰذا کافی تلخیاں پیدا ہوئیں، مگر سب زبانی کلامی بالآخر کسی نے اس خیال سے کہ یہ ضروری شرائط پوری کرتے ہیں اور کسی نے انہیں بے ضرر خیال کرتے ہوئے اور کسی نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے ان کے حق میں رائے دے دی اور یوں ان کی ممبری کی توثیق گلڈ کے مرکز سے بھی ہو گئی، اور طفیل ۲۱ جنوری ۱۹۶۱ء کو رائٹرز گلڈ کے ممبر بن گئے۔

طفیل کو رائٹرز گلڈ کے خیمہ میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور وہی کیا جو ایک اونٹ نے خیمہ میں سر چھپانے کی اجازت پر عربی کے خیمہ کے ساتھ کیا تھا۔ یہ کھسکتے کھسکتے زیادہ سے زیادہ اس خیمہ میں داخل ہوتے گئے اور جلد ہی پنجاب شاخ کی عاملہ کی سیڑھی کے نچلے قدم پر جا بیٹھے اور پھر اوپر والوں کے پیروں تلے سے سیڑھی کھینچ لی اور خود اچک کر اوپر جا بیٹھے۔ جنہوں نے انہیں بے ضرر آدمی سمجھ کر ووٹ دیا تھا وہ حیران تھے اور اب ان سے ڈر رہے تھے۔ ادھر طفیل نے گلڈ کی عاملہ میں جو سیندھ لگائی تھی یہ اس کے راستہ آگے بڑھے اور جلد ہی سیکرٹری جنرل کی کرسی پر قابض ہو گئے۔ بڑے بڑے ادیب جو مدتوں سے اس کرسی پر براجمان تھے۔ چاروں شانے چت جا پڑے تھے اور حیران تھے کہ انتخاب میں اس نووارد نے کیسے انہیں شکست دیدی طفیل نے اپنی جنرلی کے زمانہ میں پوری گرفت اور زور کے ساتھ گلڈ پر حکومت کی اور کچھ ایسے اقدام کئے کہ ان کے مخالفین بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے دور حکومت میں بعض کام ایسے ہوئے جو نہ صرف یاد رہیں گے بلکہ ادیب ان سے آئندہ فائدہ اُٹھاتے رہیں گے۔ طفیل نے گلڈ کی پنجاب شاخ کی عمارت ناجائز قابضین سے چھڑائی، پہلے ان سے مقدمہ بازی ہوئی اور جب اعلیٰ ترین سطح پر بھی فیصلہ گلڈ ہی کے حق میں برقرار رہا تو بھی یہ قابضین عمارت خالی کرنے اور قبضہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ طفیل نے اس دھاندلی اور غنڈہ گردی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنی جان تک خطرہ میں ڈال کر ان قابضین کو عمارت سے نکال باہر کیا۔ یہ ایک پرانی بوسیدہ سی عمارت ہے، عمارت ویسے خاصی بڑی ہے اور اس کے پلاٹ کا رقبہ اور بھی زیادہ ہے۔ طفیل کی خواہش تھی کہ اس جگہ پر ایک جدید طرز کی نئی عمارت تعمیر کرائی جائے جس میں جلسہ کے لئے ایک بڑا ہال اور گلڈ کے دفاتر کے لئے ضروری کمروں کے علاوہ ایک عمدہ اور بڑا شاپنگ سنٹر ہو جس کی آمدنی سے گلڈ خود کفیل ہو جائے اس تجویز کے تحت طفیل نے ایک ماہر تعمیرات سے کچھ نقشے بھی بنوائے اور بعض بنکوں سے بھی بات کی کہ وہ اس اسکیم میں گلڈ کی مدد کریں اور تعمیر کے لئے قرض دیں لیکن بات بننے سے پہلے ہی طفیل نے عدم کی راہ لی۔ اب کوئی اسی جذبۂ لگن کا فعال آدمی گلڈ کی عاملہ کو مل گیا تو یہ کام ہو جائے گا، ورنہ عمارت امتداد زمانہ کے ساتھ کھنڈر ہوتی جائے گی اور گلڈ کو اپنے دفتر کے لئے بھی کوئی کرایہ کی جگہ تلاش کرنا پڑ جائے گی۔

پنجاب رائٹرز گلڈ نے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی تشکیل دی تھی اور کوشش ہو رہی تھی کہ سوسائٹی کو ممبران کے لئے رہائشی زمین حاصل ہو جائے۔ ایسے موقع پر سوسائٹی کی باگ ڈور بھی طفیل کے ہاتھ آگئی۔ انہی دنوں ایل ڈی اے کی علامہ اقبال ٹاؤن سکیم تیار ہو رہی تھی طفیل نے متعلقہ محکموں اور افسروں سے رابطہ قائم کیا اور کوشش کی کہ سوسائٹی کے ممبران کو رہائشی پلاٹ حسب خواہش مل سکیں افسران مجوزہ سکیم میں کچھ پلاٹ ادیبوں کو دینے کے لئے تیار تھے اور طفیل کی ضد تھی کہ پلاٹ سوسائٹی کے تمام ادیبوں کو ملیں۔ اس وقت ان ممبران کی تعداد تین سو تھی چنانچہ طفیل نے بااختیارات حضرات سے صاف کہہ دیا کہ ہم یا تو تین سو پلاٹ لیں گے یا ایک بھی نہ لیں گے افسران نے ہتھیار ڈال دیئے اور سوسائٹی کے تمام ممبران کو علامہ اقبال ٹاؤن میں پلاٹ الاٹ ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی جب طفیل نے ادیبوں کی اس بستی کی طرح ڈال دی تو ان کی فلاح و بہبود کا خیال کرتے ہوئے تقریباً تین کنال کا ایک پلاٹ ایل ڈی اے سے ادیبوں کی اس بستی میں ایک لائبریری کی تعمیر کے لئے حاصل کیا پھر اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور کوشش سے اس لائبریری کی تعمیر کے لئے حکومت پنجاب سے چار لاکھ روپے کی خطیر رقم منظور کرائی ایک معروف آرکیٹیکٹ سے اس کا نقشہ بنوا کر منظور کرایا اور اللہ کا نام لے کر تعمیر شروع کرا دی جبکہ معلوم تھا کہ مجوزہ لائبریری پر بیس پچیس لاکھ لاگت آئے گی اور چار لاکھ کی رقم جو ہاتھ میں ہے اس سے کام کسی سرے نہ لگ پائے گا مگر طفیل ایک باہمت آدمی تھے ان کا خیال تھا کہ تعمیر شروع ہونے کے بعد بعض مخیر حضرات سے مزید ضروری رقم حاصل ہو جائے گی اور کام رکنا نہیں پڑے گا انہوں نے اس ضمن میں کوششیں بھی کیں اور کچھ صاحب ثروت مخیر حضرات سے مدد کی درخواست کی لیکن امید بر نہ آئی اور طفیل اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ لائبریری کی ادھوری عمارت اپنے کھڑے ستونوں کے ہاتھ پھیلائے رب ذوالجلال کے حضور دعا کر رہی ہے کہ یا الٰہی طفیل جیسا کوئی اور مرد مجاہد بھیج جو خلوص نیت کے ساتھ تگ و دو کرے اور میری تکمیل کا سامان بہم پہنچائے۔

کچھ ادارے مثلاً آدم جی، نیشنل بینک وغیرہ اپنے اپنے طور پر ہر سال اپنی صوابدید پر جس کتاب کو بہترین قرار دیتے انعام دے دیتے۔ طفیل نے ان سب کو ترغیب دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنی یہ رقوم سال بسال رائٹرز گلڈ کے حوالہ کر دیں اور پھر گلڈ خود ان کو مختلف نوعیت کی بہترین کتب پر انعام میں تقسیم کرتی رہے۔ اس طرح افسانہ و شاعری کی کتابوں کے علاوہ دیگر موضوعات اور فنون کی کتابیں، بلکہ بچوں کا ادب اور تکنیکی کتب بھی انعام کی مستحق ٹھہرنے لگیں اُردو کے علاوہ علاقائی زبانوں کی کتب کو بھی گلڈ نے اس سکیم میں شامل کر لیا۔

یہ تو تھے ادیبوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے کام جو رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے طفیل نے کئے ان کے علاوہ کچھ کام ایسے بھی ہیں جو انہوں نے بعض افراد کی بہبود کے لئے کئے۔ کتنے ہی غریب و تنگدست یا ضعیف ادیب ایسے تھے، جن کا معقول ذریعہ آمدنی نہ تھا اور قویٰ بھی جواب دے چکے تھے لہٰذا وہ کام کاج کرنے کے لائق نہ تھے طفیل نے ان کے لئے امدادی وظائف اور علاج کے لئے رقوم حکومت سے دلوائیں اور ان کے علاج کا معقول انتظام کرایا۔ اس کام کے لئے انہیں افسران متعلقہ کو کئی کئی خط لکھنے پڑے اور بعض دفعہ اپنے ذاتی کام چھوڑ کر سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے ان کے پاس جانا اور سامنے بیٹھ کر معاملہ کی اہمیت اور نوعیت پر بات کرنا پڑی۔ یہ طفیل ہی کا مرتبہ تھا کہ ایک معمر ادیب کے وظیفہ کی کوشش میں جب منظوری

آنے میں غیر ضروری تاخیر ہوئی تو انہوں نے افسر متعلقہ کو لکھا کہ معلوم ہوتا ہے آپ موصوف کی رحلت کے منتظر ہیں تاکہ بعد میں ان کی قبر پر پھول چڑھا سکیں اور زندگی میں انہیں کوئی آسائش بہم پہنچانا آپ کے اصول کے خلاف ہے" پورا خط ایسے ہی سخت لہجہ میں تھا طفیل کے اس خط نے بہتر بیں جو نمک لگا دی اور ان بزرگ ادیب کے لئے وظیفہ ان کی حیات ہی میں مقرر ہو گیا۔ طفیل دوسروں کے درد کو اپنے درد کی شدت کی طرح محسوس کرتے تھے۔

تعجب ہے کہ ہماری اتنی دوستی اور تعلقات کے باوجود مجھے طفیل کی تاریخ پیدائش معلوم نہ تھی، کبھی اس کی ضرورت بھی محسوس نہ کی، ۱۹۸۱ء کی بات ہے ڈاکٹر وحید قریشی طفیل کے گھر آنے میں بھی ان دنوں ان کا مہمان تھا۔ رائٹرز گلڈ کے الیکشن ہونے والے تھے اور ڈاکٹر صاحب اسی سلسلہ میں بات کرنے آئے تھے باتوں باتوں میں گفتگو کا رخ عمروں اور تاریخ پیدائش کی طرف مڑ گیا اس وقت ڈاکٹر صاحب کے استفسار پر طفیل نے اپنی تاریخ پیدائش ۱۴ اگست ۱۹۲۳ء بتائی، یہ سنتے ہی ڈاکٹر وحید قریشی بولے "اسی لئے آپ توڑ پھوڑ مچائے رکھتے ہیں"۔ طفیل نے کہا "تعمیر نو کے لئے توڑ پھوڑ ضروری ہے، ویسے میری تاریخ پیدائش یوم آزادی کی مناسبت سے ہمیشہ یاد رہنے والی اور حریت کا درس دینے والی ہے۔"

عمر کے لحاظ سے ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ مشہور تو یہ ہے کہ عورتیں اپنی اصل عمر چھپاتی ہیں، یہی بات ایک دن چند بزرگوں میں زیر بحث تھی کہ ایک نے دوسرے سے پوچھ لیا کہ آپ کی عمر کتنی ہوگی؟ یہ بزرگ نوے کے پیٹے میں تھے جواباً فوراً بولے ایسی ہی کوئی ساٹھ سال کے قریب ہو گی" دوسرے بزرگ جنہوں نے سوال کیا تھا اور خود عمر عزیز کی سات دہائیاں کاٹ چکے تھے بولے میں تو خیر آپ سے چھوٹا ہوں۔ اس حساب سے میری عمر تقریباً چالیس کی ہو گی تیسرے بزرگ جو پینتالیس، پچاس کے تھے، خود ہی بول پڑے یوں حساب لگایا جائے تو میں تو ابھی لڑکپن سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ رہا ہوں۔ طفیل سے نہ رہا گیا اور بولے "پھر میں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔"

طفیل کے معاملہ میں میری بے خبری کا ایک اور واقعہ سن لیجئے۔ میں کراچی میں تعینات تھا۔ ایک دن ان کا فون آیا کہ فلاں گاڑی سے ماموں صاحب کراچی پہنچ رہے ہیں ان کے ساتھ ایک دو افراد اور بھی ہوں گے اسٹیشن پر ان کا خیر مقدم کر لینا۔ وہ دراصل حج پر جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کی مگر بھائی میں آپ کے ماموں کو کیونکر پہچانوں گا۔ فرمایا "یار! تم انہیں پہچان لو گے۔" فون بند ہو گیا۔ میں حیران کہ سٹیشن پر اگر ماموں صاحب کو نہ پہچان سکا تو بڑی سبکی ہو گی اور انہیں پتا نہیں کتنی تکلیف ہو۔ اسی تذبذب میں سٹیشن پہنچا۔ گاڑی میں طفیل کے سسر نظر آ گئے میں ان کے پاس پہنچا اُن کے ہمراہ طفیل کی ساس اور دو برادران نسبتی ڈبہ سے برآمد ہوئے میں نے پوچھا اور کوئی بھی آیا ہے وہ بولے نہیں بس ہم لوگ ہی ہیں۔ میں نے ان سب کو گھر پہنچایا اور واپس دفتر آ کر طفیل کو فون کیا کہ بھائی وہ بھابی کے ابا، اماں وغیرہ پہنچ گئے ہیں۔ (ہم ان بزرگ کو بھابی کے ابا کی حیثیت سے اباجی ہی کہتے ہیں) اور وہ آپ کے ماموں صاحب تو نہیں آئے "طفیل نے ہنس کر کہا یہی ہیں، یوں برسوں بعد انکشاف ہوا کہ اباجی طفیل کے سسر ہی نہیں ماموں بھی ہیں۔

خواب سب ہی دیکھتے ہیں، سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی۔ مگر میں یہاں ان خوابوں کے حوالے سے بات کر رہا ہوں

جو سوتے میں دیکھے جاتے ہیں، لوگوں کے خواب مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں، کچھ بے مقصد، کچھ مبہم، ڈراؤنے، بعض سچے اور بعض جھوٹے۔ بعض خوابوں کی تعبیر سے لوگ اپنی آئندہ زندگی کے لئے پیش گوئی بھی کر لیتے ہیں۔ طفیل عموماً خواب نہیں دیکھتے تھے وہ عملی زندگی کے آدمی تھے انہیں خوابوں سے کیا واسطہ تھا۔ اس کے باوجود طفیل بھولے بھٹکے خواب دیکھ لیتے تھے ایسے موقع پر انہیں اپنے خواب کی تعبیر تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی کیونکہ اگر انہوں نے دیکھا ہے کہ آپ ان سے ملنے تشریف لائے ہیں تو دن میں یہ حادثہ واقع ہو جائے گا اور آپ اسی لباس میں ملنے پہنچیں گے جس میں انہوں نے آپ کو دیکھا تھا گفتگو بھی وہی ہو گی جو خواب میں طفیل نے دیکھی تھی۔ اس لحاظ سے ان کے خواب خطرناک بھی ہوتے ہوں گے اور ہمارے آپ کے بہت سے راز ان پر خوابوں میں ہی عیاں ہوئے ہوں گے۔

یہاں میں ان کے ایک خواب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خاصی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ طفیل نے خواب دیکھا کہ ان کے ایک دوست کسی بات پر اپنی بیوی سے جھگڑ رہے ہیں دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں، دونوں ہی تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے ہیں بات بڑھتی چلی جا رہی ہے یہاں تک کہ طیش میں آکر موصوف بیوی کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیتے ہیں وہ رونے بیٹھ جاتی ہے اور صبح گھر سے چلے جانے کی دھمکی دیتی ہے اور میاں سے روٹھ کر صبح طفیل کے گھر آ جاتی ہے۔ جب طفیل صبح بیدار ہوتے ہیں تو اپنی بیوی سے کہتے ہیں کہ فلاں محترمہ آج آئیں گی وہ آزردہ ہوں گی تم ان کا خیال رکھنا۔ بیگم دریافت کرتی ہیں کہ کیا ان محترمہ کے میاں کا فون آیا تھا اور انہوں نے یہ اطلاع دی تو طفیل بیوی کو بتاتے ہیں کہ رات ان میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ میاں نے بیوی کو مارا ہے۔ بیگم طفیل حیران ہوتی ہیں اور سوال کرتی ہیں کہ رات جھگڑا ہوا ہے اور صبح صبح ہی آپ کو علم بھی ہو گیا۔ تب طفیل بیگم کو اپنا خواب سناتے ہیں۔

بیگم کو ہدایت دے کر طفیل حسب معمول دفتر چلے گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ان کے دوست کی بیگم منہ بسورے وارد ہو گئیں۔ دعا سلام کے بعد بیگم طفیل نے بڑی ملائمت اور اپنایت سے پوچھا کہ بہن آج صبح ہی صبح کیسے گھر سے فرصت مل گئی، انہوں نے بات ٹالی اور منہ لٹکائے رہیں تو بیگم طفیل نے ایک بار پھر کہا کیا بات ہے، آپ چپ چپ ہیں، چہرہ بھی اداس نظر آتا ہے، خیریت تو ہے۔ وہ خاتون ان کی ہمدردی سے متاثر ہو کر پھوٹ پڑیں اور رونے لگیں مگر بتایا کچھ نہیں اس پر بیگم طفیل نے کہا دل کیوں چھوٹا کرتی ہیں، کیا بھائی سے جھگڑا ہو گیا ہے، چھوڑیئے درگزر کیجئے گھروں میں جھگڑے تو ہو ہی جاتے ہیں۔ محترمہ چونکیں کہ آپ کو کیسے پتا چلا جھگڑا ہو گیا ہے، اسی بے شرم نے بتایا ہو گا۔ جھگڑتا ہے اور پھر دوستوں کو بھی بتاتا پھرتا ہے۔ بیگم طفیل نے کہا آپ تو بہت ہی ناراض ہیں کیا خدانخواستہ مار پیٹ تک بات پہنچ گئی تھی بس یہ سننا تھا کہ وہ بپھر گئیں کہ وہ بہت ہی خراب آدمی ہے ایک تو بیوی پر ہاتھ اٹھاتا ہے دوسرے گھر کی عزت کا خیال کئے بغیر دوستوں کو بتاتا بھی پھرتا ہے کہ میں نے بیوی کو مارا ہے۔ بیگم طفیل نے انہیں تسلی دی اور سمجھایا کہ تمہارے میاں نے ہمیں کوئی ایسی بات نہیں بتائی۔ خاتون کو کیسے یقین آتا اس نے تصدیق کرنے کے لئے فوراً میاں کو دفتر میں فون کیا کہ تم نے کیوں رات کے جھگڑے کی تفصیل طفیل اور ان کی بیگم کو بتائی اس غریب نے اپنی مدافعت میں کہا میری تو ان سے ایک ہفتہ سے نہ ملاقات ہوئی ہے نہ فون پر بات۔ بیوی تنک کر بولیں پھر

انہیں کیسے سب کچھ معلوم ہوگیا وہ بھی حیران تھا آخر طفیل کو فون کیا گیا۔ اُنہوں نے بھی اپنے دوست کی تصدیق کی اور ان محترمہ سے معذرت کے ساتھ اپنے خواب کا قصہ بیان کیا یوں میاں بیوی کے درمیان مزید جھگڑا ہونے سے رکا اور صلاح صفائی ہوگئی۔

ان کا ایک خواب وہ بھی تھا جس کی تعبیر میں یہ گرم گرم حلوہ کھاکر ٹائیفائڈ سے صحت یاب ہوگئے تھے اور جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ان کا ایک اور سچا خواب وہ بھی تھا جس کی تعبیر "نقوش" کے رسول نمبر کی شکل میں ہمارے آپ کے سامنے ہے، اس خواب کی تفصیل ان کے بیٹے جاوید اقبال نے ایک جگہ بیان کردی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

طفیل ایک اچھے خاکہ نگار اور مدیر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ہومیو پیتھی کے غیر مستند ڈاکٹر بھی تھے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب یہ گڑھی شاہو میں رہائش پذیر تھے میرا لاہور آنا ہوا۔ طفیل کو مصروف مطالعہ چھوڑ کر میں تو سو گیا۔ مگر تمام رات مجھے احساس رہا جیسے طفیل بے چین ہوں، یہ کبھی روشنی گل کرتے کبھی پھر جلاتے۔ وقفہ وقفہ سے تمام رات یہی کھیل ہوتا رہا۔ صبح اُٹھ کر میں نے پوچھا" بھائی خیر تو ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے آپ رات بھر بے چین رہے، کیا بات ہے؟

کبھی آپ بتی جلاتے تھے کبھی بجھاتے تھے"۔ بولے "یار! نیند نہیں آرہی تھی' میں سوچتا تھا کچھ لکھ پڑھ ہی لوں اس لئے بتی جلا لیتا تھا مگر پھر ڈر جاتا تھا کہ آپ کی نیند خراب ہوگی اس لئے روشنی گل کر دیتا تھا تھوڑی دیر کروٹیں بدلتا تھا اور آخر اندھیرے کے خوف سے پھر بتی روشن کر لیتا اور کچھ لکھنے پڑھنے لگتا تھا" میں نے پوچھا کوئی خاص فکر تھی یا کسی کام کا بوجھ سونے نہیں دے رہا تھا۔ کہنے لگے کوئی ایسی فکر بھی نہیں ویسے آج کل حکیم یوسف حسن کا خاکہ لکھ رہا ہوں۔ نیند تو ویسے ہی تقریباً دو ہفتہ سے غائب ہے، سب ساری رات ہی جاگ کر گزر جاتی ہے پوچھا کوئی دوا استعمال کی؟ بولے ہاں محلہ کے ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا دوا دے رہا ہے۔ میں نے کالی فاس تجویز کی اور اس کے فوائد گنوا ڈالے۔ دفتر جاتے ہوئے راستہ میں کالی فاس خریدی گئی اور اس کا استعمال شروع ہوگیا۔ میں نے ایک خوراک زیادہ طاقت کی رات کو سوتے وقت کے لئے بھی تجویز کی تھی وہ بھی لی گئی۔ اس رات طفیل کچھ دیر سو لئے۔ دوا جاری تھی' میں دوسرے دن کراچی واپس چلا گیا۔ تقریباً دو ہفتہ بعد میرا دوبارہ لاہور آنا ہوا۔ حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ طفیل کی بے خوابی دور ہو چکی ہے اور وہ سکون سے سوتے ہیں۔ کالی فاس ابھی جاری ہے۔ پھر خود ہی سنایا کہ میرے جانے کے بعد جب ڈاکٹر کی دی ہوئی پڑیاں ختم ہوگئیں تو پھر اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کی دوا سے کچھ افاقہ محسوس نہیں ہوا البتہ ایک دوست نے کالی فاس تجویز کی تھی اس سے کچھ فائدہ ہوا ڈاکٹر نے کہا کہ وہ بھی انہیں کالی فاس ہی دے رہا تھا۔ یہ سن کر طفیل نے دل میں کہا اگر کالی فاس ہی کھانا ہے تو پھر آپ کے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے۔

پھر کالی فاس کے خواص اور ہومیو پیتھک طریقۂ علاج پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا ہومیو پیتھی ہی کی ایک شاخ بائیوکیمک ادویات ہیں۔ ان کی تعداد کل بارہ ہے اگر ان بارہ ادویات کے خواص پر عبور حاصل کر لیا جائے تو گھر میں روزمرہ کی چھوٹی موٹی تکالیف کا علاج آدمی ہی کر سکتا ہے اور ڈاکٹر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس سلسلہ میں ایک کتاب بھی تجویز ہوئی طفیل نے یہ کتاب حاصل کی، عمیق نظر سے اس کا مطالعہ کیا اور بارہ ادویات پر خاصا عبور حاصل کر لیا۔ ہماری آئندہ ملاقاتوں میں بات آگے بڑھی،

بائیوکیمک سے آگے قدم بڑھے ہومیوپیتھی کی کچھ کتب خریدی گئیں اور ان کا مطالعہ شروع ہوگیا۔ یوں میں نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے طفیل کو ہومیوپیتھی کی لت لگادی۔

طفیل نے ہومیوپیتھی کی کتب کے مطالعہ سے اس طریقہ علاج میں معقول دسترس بہم پہنچائی عام استعمال کی دواؤں کا ذخیرہ بھی کرلیا اور اپنی ذات سے شروع کرکے تمام اہل خانہ کو اپنا تختہ مشق بنالیا ذرا کسی کی طبیعت گڑبڑ ہوئی اور اُنہوں نے فوراً دوا تجویز کی اور نکال کر استعمال کرڈالی۔ یوں طفیل اپنے ذیابیطس کا علاج خود ہی کرتے اور شکر کو قابو میں رکھتے۔ آخر میں جب ان کی کوششوں کے باوجود یہ تکلیف بڑھ گئی تو اُنہوں نے ایک معروف ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے رجوع کیا اور اس کا علاج کراتے رہے حکیم یوسف حسن، مدیر نیرنگ خیال مستند حکیم بھی تھے اور ہومیوپیتھ بھی۔ جب وہ آتے تو حسب ضرورت طفیل اُن سے بھی ہومیوپیتھی میں مشورہ کرتے اور اُن کے بتائے ہوئے مجرب نسخے گرہ میں باندھ لیتے آہستہ آہستہ طفیل نے اس فن سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے پریس کے کارندوں اور اُن کے اہل خانہ کو بھی اپنے مشوروں اور مفت دواؤں سے نوازا پھر یہ سلسلہ بعض احباب اور عزیز و اقارب تک دراز ہوگیا اس کے باوجود جب میں آتا اور گھر میں کسی کو تکلیف ہوتی تو طفیل کہتے کہ لو بھئی اب بڑے ڈاکٹر آگئے ہیں تم اپنا حال بتاؤ۔

طفیل نے بعض معرکتہ الآرا علاج بھی کئے۔ مثلاً جب یہ گڑھی شاہو میں رہتے تھے تو اکثر تانگہ پر دفتر آتے جاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں انہیں ایک تانگہ والا ٹکرا گیا جسے اُنہوں نے ماہانہ حساب پر اس کام کے لئے لگا لیا۔ وہ اُن کے وقت پر صبح اُن کے دروازہ پر موجود ہوتا ایک مرتبہ وہ بغیر اطلاع غائب رہا، ایک دن، دو دن کئی دن گزر گئے یہ خاصے پریشان تھے کہ غریب پر نہ جانے کیا افتاد پڑی ہے کہ وہ آگیا۔ طفیل نے حال، احوال اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ وہ بیمار تھا بلکہ کئی دن بے ہوش رہا اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے اس قسم کے دورے اکثر پڑتے رہتے ہیں بہت علاج کرایا مگر افاقہ نہیں ہوا۔ طفیل نے اس کے مرض کی علامات کرید کیں پھر اس کی ذات پر توجہ مرکوز کی اور نوٹ کیا کہ وہ شخص بہت گندا رہتا ہے اور اس کے جسم سے پسینہ کی سڑی بو ہر وقت آتی رہتی ہے۔ اُنہوں نے پوچھا تم نہاتے نہیں جو پسینہ کی اتنی بدبو تمہارے پاس سے آتی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنی یادداشت میں برسوں سے نہیں نہایا نہانے کے خیال اور پانی کے تصور ہی سے اسے خوف آتا ہے یہ علامت طفیل نے خاص طور پر ذہن نشین کرلی اور تانگہ والے کو پیش کش کی کہ اگر میں تمہیں دوا دوں تو تم کھاؤ گے۔ وہ راضی ہوگیا اگلے دن طفیل نے چند پڑیاں بنا کر اسے پیش کردیں اور طریقہ استعمال سمجھا دیا دو چار دن کے علاج کے بعد وہ پھر دو تین دن غائب رہا مگر جب آیا تو اس کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ وہ صاف ستھرے کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھا اور اس کے پاس سے پسینہ کی بدبو بھی نہیں آرہی تھی اس نے خود ہی بتایا کہ وہ اُن کی دی ہوئی دوا کھاتا رہا پھر اُسے بخار چڑھا بہت تیز۔ اس کے دوران اسے خوب پسینہ آتا رہا۔ آخر جب دو دن بعد بخار اترا تو بے تحاشا اس کا دل نہانے کو چاہا اور وہ اپنی یاد میں پہلی مرتبہ دل کھول کر گھڑوں پانی سے نہایا جس کے بعد اسے بڑی تازگی اور فرحت کا احساس ہوا اور وہ ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہے۔ اس نے طفیل کو ہزاروں دعائیں دیں اور دیتا رہا۔

اسی طرح اُن کے ہمسایہ میں ایک بزرگ رہتے تھے اُن کی ٹانگوں پر خارش ہوتی اور دانے نکل آتے ان دانوں میں پیپ پڑتی اور جب دانے خشک ہوتے تو ان کی جگہ نئے دانے نکل آتے ڈاکٹری علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ مرہم لگانے سے مزید

تکلیف بڑھ جاتی۔ خارش کی وجہ سے سخت بے چینی تھی۔ طفیل عیادت کے لئے گئے اور معالج بن بیٹھے، اُنہوں نے ہومیو پیتھک دوا دی، بزرگ کی بے چینی میں خاطر خواہ فرق پڑا۔ رفتہ رفتہ وہ صحت یاب ہو گئے۔

طفیل نے جتنے فنون حاصل کئے ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ مثلاً کتابت سیکھی تو اس کو ایک عرصہ تک ذریعہ معاش بنائے رکھا اور اس فن میں معتدبہ استعداد حاصل کی پھر اس ذریعہ معاش کو ترک کیا تو اپنے فن کتابت کو کسوٹی بنا کر گرہ میں باندھ لیا اور بقیہ عمر اپنی مطبوعات اور "نقوش" کی کتابت کو اسی کسوٹی پر پرکھتے رہے۔ ہومیو پیتھی کے فن کا حال آپ نے اوپر ملاحظہ فرما لیا۔ ڈرائیوری البتہ ایک ایسا فن تھا جو اُنہوں نے سیکھ کر چھوڑ دیا اور بھولے سے بھی اس سے کبھی کام نہ لیا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے طفیل کے متعلق اتنی باتیں کر ڈالیں مگر ان کی جوانی دیوانی کا ذکر گول کر گیا اور حق دوستی ادا کرتے ہوئے ان کی عمر کے اس حصہ کی پردہ پوشی کر گیا یعنی میں یہ پردہ اٹھا دیتا ہوں۔ آپ خود ہی ملاحظہ فرما لیجئے کہ پس پردہ کچھ بھی تو نہیں۔ جو طفیل آپ کو پردہ کے سامنے نظر آتا ہے وہی پس پردہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ یہ حضرت شروع سے ہی شرمیلے شرمیلے تھے اس لحاظ سے اُن کا نام ورنہ کم از کم عرفیت تو "شرمیلا" ہونا چاہئے تھی مگر نہ ہو سکی۔

جب طفیل سے میری ملاقات ہوئی تو ان کا سبزہ آغاز تھا اور جوانی دبے پاؤں چپکے چپکے ان کی زندگی میں کسی چور دروازہ سے داخل ہو رہی تھی بس اتنا تو ہم نے بھی دیکھا مگر پھر تماشا نہ ہوا پتا ہی نہ چلا کہ کب ان پر جوانی آئی کب تک رہی اور کب رخصت ہو گئی جوانی دیوانی مشہور ہے اور مشاہدہ ہے کہ ہر شخص کی جوانی کچھ نہ کچھ گل ضرور کھلاتی ہے۔ بعض جوش جیسے جرأت مند ہوتے ہیں جو آخری عمر میں اپنی جوانی کے باسی اور پژمردہ گل عوام کے منہ پر دے مارتے ہیں اور بعض انہیں یادوں کے تہدار پردوں میں چھپائے قبر میں اتر جاتے ہیں طفیل نہ اتنے جرأت مند تھے نہ اتنے پردہ دار۔ ہاں انہیں دوسروں کی یادوں کی خاکستر کو کریدنے اور اُن کی زندگی کے پردوں کے پیچھے جھانکنے کی بری عادت ضرور تھی۔ لہٰذا اُنہوں نے نہایت چالاکی اور صفائی سے ہمیں آپ کو، سب کو جل دیا' اپنی جوانی کی کہیں بات نہیں کی مگر دوسروں کی یادوں کی خاکستر سے چنگاریاں چنیں اور ان چنگاریوں کو گل بوٹے بنا کر ان کے خاکہ میں سجا دیں، آیئے میں آپ کو ان کی جوانی کی داستان بھی سنا دوں۔

طفیل اپنے شرمیلے پن کی آڑ میں نہایت فرزانہ انسان تھے یہی وجہ ہے کہ وہ جوانی کی دیوانگی کی عمر کی حدود میں بھی اپنی فرزانگی کے سبب مجنوں نہ بن سکے۔ شرم و حیا اور خاندانی شرافت نے ان میں اتنی جرأت ہی پیدا نہ ہونے دی کہ یہ کسی لڑکی سے اظہار عشق کرتے مگر لڑکیوں پر تو ایسی کوئی پابندی عائد کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا چنانچہ نہ معلوم ان کی اس ادا پہ فدا ہو کر یا خود اپنی جوانی کے ہاتھوں مجبور ہو کر محلہ کی ایک لڑکی نے انہیں ایک ایسا ویسا خط لکھ ڈالا۔ خط پا کر طفیل چونکے، خوب خوب شرمائے سوچتے رہے جواب دیں نہ دیں، آخر اُنہوں نے جواب کی جرأت کی، اس وقت طفیل کے اندر کا بوڑھا ناصح مشفق بیدار ہو چکا تھا لہٰذا جواباً اُنہوں نے اس لڑکی کو اخلاقیات کا سبق دے ڈالا اور اس نے اس مٹی کو نم نہ پا کر اور زمین کو بنجر جان کر ادھر سے منہ موڑ لیا اور اس زمین کی مزید آبیاری سے دستبردار ہو گئی۔

اس واقعہ سے متاثر ہو کر یا جوانی کی امنگوں کے اُلجھاؤ میں پھنس کر طفیل پر آخر وہ وقت بھی آیا جب ان کے دل

میں خلش ہوئی کہ کوئی ان سے اظہارِ عشق کرے۔ اظہارِ عشق کرنے والی کو تو یہ پہلے ہی ڈانٹ کر دھتکار چکے تھے اب کون ان سے اظہارِ عشق کی جرأت کرتی۔ طفیل نے سوچا کیوں نہ میں خود ہی کسی لڑکی سے اظہارِ عشق کروں۔ چنانچہ انہوں نے چوری چوری ایک لڑکی کو کئی عشقیہ خط لکھ ڈالے۔ ادھر سے کوئی جواب نہ تھا ایک گمبھیر خاموشی تھی جس سے بے چین ہو کر طفیل نے خود ہی اس لڑکی کی طرف سے جواباً اپنے نام خط لکھے جن میں جذبات کا بھرپور انداز اخلاقیات کے دائرہ کے اندر قائم رکھا۔ وہ لڑکی مجبور تھی طفیل کے خطوط کا جواب خود نہ دے سکتی تھی کیونکہ طفیل کو اتنی جرأت ہی نہ تھی کہ اپنے خطوط تک پہنچاتے یہ لکھتے رہتے اور انہیں قیمتی خزانہ کی طرح چھپا چھپا کر رکھتے جاتے یہی کچھ انہوں نے ان خطوط کے ساتھ کیا جو اس لڑکی کی طرف سے جواباً لکھے۔ یہ خزانہ اُن کے پاس محفوظ تھا کہ اُن کی سوچ نے انہیں سمجھایا کہ اگر یہ خطوط کسی کی نظر پڑ جائیں تو مفت میں ایک لڑکی بدنام ہو جائے گی۔ اس لڑکی کا وجود اس دنیا میں نہ سہی ان کے ذہن کے نہاں خانہ میں تو ہے۔ اس لحاظ سے ایک ہستی، فرضی ہی سہی، بدنام ہو جائے گی اور کچھ نہیں تو ایک نسوانی نام تو داغدار ہو ہی جائے گا اس خیال کے ساتھ ہی طفیل نے وہ تمام خطوط نذرِ آتش کر دیئے۔ اگر وہ خطوط اُن کی اس سوچ سے بچ رہتے اور منظرِ عام پر آ جاتے تو لوگ ان کو پڑھ کر قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" کو بھول جاتے اور اُردو ادب میں اس کتاب کی لاثانیت ختم ہو کر رہ جاتی۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ طفیل کی جوانی یونہی بغیر کوئی گل کھلائے یا غنچہ چٹکائے بے بہار گزر گئی ہو نہیں، ان کی جوانی بڑی پُر بہار گزری لوگوں کو بڑھاپے میں جوانی کی ہوس ہوتی ہے۔ طفیل نے کوئی ایسی ہوس نہیں کی اس کے باوجود اُن کی جوانی، اترتی جوانی اور جوان ہوتا بڑھاپا، عام آدمی کی جوانی سے زیادہ پُر بہار اور گل کھلاتے گذرا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی بہار کا میدان جداگانہ تھا چنانچہ طفیل کے کھلائے ہوئے گل بوٹے ہمارے آپ کے سامنے بکھرے پڑے ہیں اور یہ وقت گزرنے کے باوجود سرسبز و شاداب ہیں اور اُن کی تازگی اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک اُردو ادب زندہ ہے۔

طفیل کا المیہ یہ ہے کہ عین عالمِ شباب میں ان کی سوچیں بوڑھی تھیں دوسرے اسی زمانہ میں یہ بوڑھوں میں گھر گئے مولانا حفظ الرحمان، حفیظ جالندھری، مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا غلام رسول مہر عبدالمجید سالک اور حکیم یوسف حسن جیسے بوڑھوں نے عنفوانِ شباب سے ہی طفیل کو اپنے نرغہ میں ایسا لیا کہ ان کو جوانی کی ہوا ہی نہ لگنے دی اور یوں طفیل قبل از وقت بوڑھے ہو گئے۔

ایک مرتبہ اباجی (طفیل کے ماموں) نے مجھ سے پوچھا کہ میاں تمہاری طفیل سے کتنی پرانی ملاقات ہے میرے جواب پر فرمانے لگے تبھی آپ دونوں میں اتنا پیار ہے۔ میں نے اس پیار کی وضاحت چاہی تو فرمایا کہ ایک دن کسی بات پر تنازعہ تھا اس سلسلہ میں طفیل بولے کہ اگر آپ لوگ مجھے زیادہ تنگ کریں گے تو میں محمود بھائی کے پاس چلا جاؤں گا اباجی کا کہنا تھا کہ میں طفیل کی اس بات سے بہت حیران ہوا کہ آپ ان کو ہم سے بھی زیادہ عزیز ہیں اب اندازہ ہوا کہ آپ کی اتنی پرانی ملت ہے۔ اباجی کی بات نے طفیل کے لئے میرے دل میں مزید گیرائی پیدا کر دی۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میری اور طفیل کی ملاقات ادبی لنک کے باعث ہوئی وقت کے ساتھ طفیل کا یہ ذوق پروان چڑھتا اور جلا پاتا گیا یہاں تک کہ انہیں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوا اور میں اس میدان میں کچی جماعت کا طالب علم ہی رہا طفیل ناشر و طابع اور مدیر بنے میں اس میدان میں اتر نہ سکا اور پیشۂ ملازمت میں عمر تباہ دی۔ طفیل ایک منفرد طرزِ تحریر کے ادیب

تھے جبکہ میری تحریر کا دائرہ سرکاری فائلوں پر نوٹ اور مسودوں تک محدود تھا طفیل لوگوں کی خدمت کرکے خوش ہوتے تھے مجھ سے یہ بھی نہ بن پڑتا تھا۔ البتہ لطیفہ بازی ہمارا مشترک شوق تھا۔ ہم دونوں ہی اچھے لطیفوں کی تلاش میں رہتے اور ایک دوسرے کو سنا کر قہقہے لگاتے۔ طفیل نے اپنے اسی شوق ' کا جلوہ "نقوش" کے طنز و مزاح نمبر کی شکل میں دکھایا۔ بچوں سے محبت خواہ وہ اپنے بچے ہوں یا دوسروں کے، ہماری قدر مشترک تھی بچے ہم دونوں سے جلد مانوس ہو جاتے تھے سگریٹ نہ طفیل پیتے تھے نہ میں، وہ تو پان بھی نہیں کھاتے تھے جبکہ میں ایک زمانہ میں باقاعدگی سے پان کھاتا تھا اور اب گاہے گاہے کھاتا ہوں۔ اسی طرح پینے کی کچھ اور چیزیں ہیں جن کا پینا بڑے پن کی علامت ہے ہم دونوں میں بڑے پن کی ایسی کوئی علامت نہیں تھی۔ میں فطرتاً ایک سست اور کاہل آدمی ہوں مگر اتنا بھی نہیں کہ کام کاج سے کوئی تعلق نہ رکھوں۔ جب میں کام کرنے پر آتا ہوں تو نہ دن دیکھتا ہوں، نہ رات کام میں جٹ جاتا ہوں اور اسے ختم کرکے ہی دم لیتا ہوں۔ اس سلسلہ میں اکثر میں الٹی منصوبہ بندی بھی کر گزرتا ہوں یعنی گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے سے بھی گریز نہیں کرتا طفیل میں بھی میں نے اسی قسم کی عادت پائی ہم دونوں جب کام کرنے پر آتے تو دن رات ایک کر دیتے نہ ہمیں تھکن کا پتا نہ چلتا نہ نیند کا۔ بلکہ بڑے مزے کی بات یہ تھی کہ جتنا کام کا دباؤ بڑھتا اور وقت کی قلت ہوتی اتنی ہی ہماری کارکردگی تیز اور ذہنی صلاحیتیں اجاگر ہوتی چلی جاتیں۔ طفیل کی منصوبہ بندی کا یہ عالم تھا کہ وہ جو کچھ شائع کرکے ہمارے لئے چھوڑ گئے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ مواد اکٹھا کرکے، کتابت کرا کے اور بعض کی تدوین کرکے پیچھے چھوڑ گئے۔ اس میں قابل ذکر اقبال پر ایک نمبر اور قرآن نمبر کی کچھ جلدیں ہیں جو ابھی منظر عام پر آنا باقی ہیں۔

میں جب لاہور آ کر واپس جانے لگتا تو اکثر طفیل کہتے ایار' دو ایک دن اور ٹھہر جاتے تو اچھا تھا اور کبھی کہتے تم لاہور کیوں نہیں آ جاتے۔ کیا تمہارا یہاں تبادلہ ہو سکتا ہے؟ میں اس کے لئے کچھ کوشش کروں۔ میرا تعلق مرکزی حکومت کے ایسے محکمہ سے تھا جس کی کوئی شاخ لاہور میں نہ تھی اس لئے یہ بات نہیں بن سکتی تھی۔ پھر ملازمت سے میری سبکدوشی کے دن قریب آگئے تو ایک دن ہمارے ایک مشترکہ دوست لاہور میں طفیل سے مل کر واپس اسلام آباد پہنچے اور مجھے ملے اور انہوں نے میری سبکدوشی کے متعلق دریافت کیا کہ کب تک ہونے والی ہے ابھی دو ڈھائی سال باقی تھے میں نے انہیں یہ بتایا تو بولے کہ طفیل ابھی سے تمہاری سبکدوشی کے منتظر ہیں کہتے ہیں کہ تم آ جاؤ تو دونوں بھائی مل کر کام کریں میں ۱۹۸۰ء کے آخر میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ محکمہ والے مجھے مزید دو سال کے لئے ملازم رکھنا چاہتے تھے ان کی یہ پیش کش میں نے قبول نہ کی اور جلد جلد اپنے پنشن کے کاغذات مکمل کرا کر اور پنشن منظور کرا کر اوائل ۱۹۸۱ء میں لاہور آ گیا اور حسب دستور طفیل کے یہاں قیام کیا اور اپنا مکان تعمیر کرایا اسی عرصہ میں ایک کمپنی نے مجھ سے رابطہ قائم کیا یہ لوگ اسلام آباد میں ایک بڑا ہوٹل بنوانا چاہتے تھے میرا ان سے معاملہ طے ہو گیا اس عرصہ میں میرا مکان سر چھپانے کے قابل ہو گیا تھا اور ہم اس میں منتقل ہو گئے تھے۔ ایک جمعہ کو میں اپنی بیوی کے ہمراہ طفیل کے یہاں گیا صبح کا وقت تھا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد طفیل نے پوچھا کیا کرنے کا ارادہ ہے میں نے کہا پنشن میں تو گزارہ نہیں ہو گا اس لئے کچھ کام کرنا پڑے گا میں نے بطور وکیل رجسٹریشن کرالی ہے کچھ وکالت کروں گا محدود طریقہ پر دوسرے میں نے انہیں ہوٹل والوں کی بات بتائی طفیل نے بڑی محبت سے مجھے سمجھایا کہ میں ہوٹل والوں کو انکار کر دوں اُن کے ساتھ مل کر کام کردں

یہ مجھے اتنی ہی رقم ہر ماہ دیں گے جتنی ہوٹل والے دینے کو تیار ہیں مجھے تذبذب دیکھ کر وہ بہت دیر تک اور بڑے ہی پیار سے سمجھاتے رہے اور اپنی پیش کش قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتے رہے۔ میری بیوی سے بھی اُنہوں نے کہا کہ مجھے سمجھائیں ہم دونوں بھائی مل کر کام کریں گے چلتے وقت بھی اُنہوں نے کہا کہ میں ان کی بات پر غور کرلوں اور جلد ان کے ساتھ شریک ہو جاؤں۔ مجھے طفیل کے ساتھ مل کر کام کرنے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر میں ان سے کوئی معاوضہ بھی نہیں لے سکتا تھا اور یہ بات اُن سے صاف کہہ بھی نہیں پا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے ایک بڑے وکیل کے ساتھ کام کرنے کا انتظام کیا ہوٹل والے اس عرصہ میں منحرف ہو چکے تھے لہذا وکیل صاحب کے کام سے فارغ ہو کر میں دوپہر کے بعد کا وقت طفیل کو دے سکتا تھا چنانچہ میں انہیں یہ بتائے بغیر کہ میں نے وکالت شروع کر دی ہے دوپہر بعد ان کے پاس حاضری دی اور کام دریافت کیا طفیل نے کہا دو چار دن ٹھہریئے میں منصوبہ تیار کرتا ہوں وہ منصوبہ بندی کرتے رہے اور میں بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کا حکم لگا دیا چنانچہ میں نے وکالت کو بھی ضرورت کے تحت چھوڑا اور بستر سنبھال لیا طفیل کو میری علالت کا پتا چلا تو خیریت معلوم کرنے آتے رہے تین چار ماہ بعد جب ڈاکٹر نے کام کی اجازت دی تو میں نے پھر وکالت کا رخ کیا ابھی اتنی سکت نہ تھی کہ دوپہر کو ادھر سے فارغ ہو کر بعد دوپہر کا وقت طفیل کو دے سکتا۔ چنانچہ میں نے مناسب موقع پا کر انہیں بتا دیا کہ میں اضافی آمدنی کی خاطر وکالت کرنے لگا ہوں طفیل نے مجھے کامیابی کی دعا دی اور گلہ شکوہ کا کوئی حرف کبھی زبان پر نہیں لائے لیکن میں ان کی پیش کش قبول نہ کر کے ان سے شرمندہ ہوں۔

دسوںؔ نمبر کی ۱۳ جلدیں چھپ چکی ہیں
مزید ۲ جلدیں چھپیں گی۔ اس طرح کُل
۱۵ جلدیں ہوں گی جن کے مجموعی صفحات
۱۲،۰۰۰
سے زائد ہوں گے اِن شاء اللہ العزیز!
آخری ۲ جلدیں تمام عالمِ اسلام کے
سیرتی ادب سے متعلق ہوں گی



انتخاب

رسائل

اخبارات

تعزیتی تقریبات

منظوم نذرانۂ عقیدت

(۵ جولائی ۱۹۸۶ء کے بعد)

طفیل بھائی کا آخری سفر

اختر جمال

طفیل بھائی کی رحلت ادب کا نقصانِ عظیم ہے! مگر ہم دونوں تو اپنے لیے روئے! طفیل بھائی کا پہلی بار اپنے گھر آنا آج بھی اچھی طرح سے ہم سب کو یاد ہے طفیل بھائی سے "نقوش" کی وساطت سے رسمی سی خط و کتابت تھی جیسی ایڈیٹروں اور لکھنے والوں کے مابین ہوا کرتی ہے۔ ایک بار طفیل بھائی نے اپنے ایک خط میں لاہور کی گرمی کی شدت سے شکایت کی اور لکھا کہ "گرمی لکھنے پڑھنے کا کوئی کام نہیں کرنے دیتی۔" میں نے جواب میں لکھا کہ "کاکول" کا موسم بہت اچھا ہے اور ہمارا گھر بھی بہت بڑا ہے اس لیے آپ مع اپنی فیملی کے آیئے اور ہمارے ہاں گرمیاں گذاریے ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہو گی۔

طفیل بھائی کسی وجہ سے اس سال تو نہ آسکے غالباً وہ لوگ کچھ عرصہ کے لیے مری چلے گئے لیکن اگلے سال انہوں نے لکھا کہ "اگر اس بار بلایا ہوتا تو ہم لوگ پہنچ چکے ہوتے۔" میں نے دوبارہ دعوت دی اور طفیل بھائی مع بھابی اور بچوں کے کاکول آئے۔ ہم سب کو ان کے آنے سے بہت خوشی ہوئی۔ طارق چھوٹا سا تھا اور تزئین گود میں تھی۔ طارق کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی تھی کہ "سب کے گھر تو ان کے انکل اور آنٹیاں آتے ہیں اور اتنے بچے جمع ہوتے ہیں سب لوگ چھٹیوں میں اتنے مزے کرتے ہیں ہمارے گھر کوئی نہیں آتا ہم اکیلے رہتے ہیں۔"

طفیل بھائی کے آنے کے بعد میں نے طارق سے کہا "جاؤ اب تم بھی سب کو بتاؤ کہ تمہارے ماموں آئے ہیں ممانی آئی ہیں اور اپنے بھائیوں کو دوستوں سے ملواؤ۔"

طارق نے حیران اور خوش ہو کر پوچھا "امی یہ میرے ماموں ہیں؟"

جواب میں طفیل بھائی نے اسے پیار کیا اور کہا "ہاں بیٹے ہم تمہارے ماموں ہیں!"

ذرا سی دیر میں محلہ میں ہر طرف چرچا ہو گیا کہ اختر کے بھائی ہندوستان سے آئے ہیں۔ اور پھر مجھے سب کو بتانا پڑا کہ میرے ایک بھائی لاہور میں بھی رہتے ہیں۔ طفیل بھائی ہمارے ہاں پندرہ دن رہے مگر ان کے گھرانے سے رشتہ استوار ہو گیا۔ طفیل بھائی کی کوئی سگی بہن نہ تھی اور میرے سب خون کے رشتے سرحد پار تھے! شاید غیر شعوری طور پر ہم نے یہ خلا پُر کرنے کی کوشش کی تھی۔ رفتہ رفتہ ہم لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا اور بھائی بھاوج نے ہمیشہ یہی باور کرایا کہ میرے میکے کا ایک گھر لاہور میں بھی ہے۔

طفیل بھائی ان دنوں گڑھی شاہو میں رہتے تھے اگر ہم لوگ کبھی لاہور جانے میں سستی کرتے تو بچے تقاضا کرتے۔ اس دوران ہم ان کے کنبہ ہی کو نہیں سارے خاندان کو جان گئے۔

طفیل بھائی اور بھابی نے غم اور خوشی میں ہمیشہ ساتھ دیا ہم پر بعض ایسی کڑی آزمائش کے موقع بھی آئے جب ہمارے بیٹے کی اسیری کی وجہ سے کچھ لوگ ہمارے گھر آنے اور ہم سے میل جول رکھنے میں خوف محسوس کرتے تھے۔ طفیل بھائی ان دنوں میں

بھی ہم سے ملتے رہے اور ہم لوگوں کی دلجوئی کرتے رہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان کو کڑی آزمائش میں ہی دوستوں کا پتہ چلتا ہے ۔ اس دور میں جو لوگ ہمارے قریب آئے وہ زیادہ تر طارق کے دوست تھے یا ہمارے چند ایسے دوست جن کی پہچان ان آڑے دنوں نے ہی کرائی ۔ بہر حال طفیل بھائی اور بھابی اس زمانے میں اور زیادہ ملتے رہے اور طفیل بھائی نے کئی بار طارق سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے کہا: "واہ طفیل بھائی شام کو ایوانِ صدر اور صبح کو جیل خانہ یہ بات کچھ اچھی نہیں لگتی ۔ میں آپ کو جیل خانے کا دروازہ نہیں دکھاؤں گی ۔"

کہنے لگے: "اچھا پھر تم اپنی بھابی کو ہی لے جاؤ ۔ یہ طارق کو دیکھ کر آئے اور مجھے بتائے ۔"

ان دنوں ہمیں کئی کئی گھنٹے جیل کے احاطے میں بیٹھ کر باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا ۔ بھابی میرے ساتھ گئیں اور طارق سے مل کر آئیں ۔ طارق انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوا ۔

طفیل بھائی نے اپنے طور پر طارق کی رہائی کی بھی کافی کوشش کی مگر اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی ۔ بہر حال ملٹری کورٹ کی پوری سزا کاٹنے اور جرمانہ بھرنے کے بعد جب طارق کی رہائی ہوئی تو طفیل بھائی اور بھابی خبر پڑھتے ہی ہمارے پاس آئے ۔ طفیل بھائی نے دعا دی کہ "ان برسوں میں جتنے دکھ اور پریشانیاں دیکھی ہیں خدا اتنی ہی خوشیاں دکھلائے ۔"

طفیل بھائی سیاسی آدمی نہ تھے ۔ قطعی غیر سیاسی تھے ۔ ان معنوں میں جیسے کہ سرکاری ملازم غیر سیاسی ہوا کرتے ہیں ۔ فرق اتنا ہے کہ سرکاری ملازموں کے سامنے ملازمت کا مسئلہ ہوتا ہے اور طفیل بھائی کے سامنے نقوش اور اس کی بہبود کا کام تھا ۔ بڑے بڑے منصوبے تھے جنہیں عملی جامہ پہنانے کو وہ شب و روز محنت کر رہے تھے ۔ طفیل بھائی کو اپنی عظیم خدمات کے صلہ میں جو انعام اور اعزاز ملا وہ ان کا حق تھا ۔

طفیل بھائی ان موقعہ پرست سیاسی لوگوں سے بہت بلند تھے جو چہرے بدلتے ہیں یا پھر ظلم و عتاب کے خوف سے قلم کو زنگ لگا لیتے ہیں وہ وسیع دل و دماغ کے انسان تھے ۔ ہر مسلک اور ہر مشرب کے لوگوں کے لیے ان کا دروازہ اور نقوش کے صفحات کھلے تھے ۔ گذشتہ سالوں کے نقوش اٹھا کر دیکھئے ترقی پسند ادب کی بہترین تخلیقات نقوش کے ہی صفحات پر ملیں گی ۔ ہندوستان کے لکھنے والے بھی باقاعدگی سے نقوش میں لکھا کرتے تھے اور اردو کے ادیب نقوش پر فخر کرتے تھے ۔ طفیل بھائی نے ایک بار میرے ہاتھ کچھ لوگوں کو نقوش کے شمارے پہنچائے تھے ۔ کرشن چندر نے نقوش لے کر کہا تھا کہ "پاکستان سے اردو کا اتنا اعلیٰ اور خوب صورت رسالہ شائع ہوتا ہے اس کے مقابل کا ہندوستان کی کسی بھی زبان میں کوئی رسالہ نہیں ہے ہم نقوش پر فخر کرتے ہیں ۔"

طفیل بھائی ذاتی گروہ بندی سے دور تھے ۔ تنگ دلی اور تنگ نظری ان میں نام کو نہ تھی ۔ غنیمت ان کے منہ سے کبھی نہ سنی یہ ضرور ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کی تنگ دلی سے آزردہ ہو جاتے تھے ۔ لیکن اس کا جواب تنگ دلی سے نہ دیتے تھے ۔ بلکہ معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے ۔

طفیل بھائی کی کیا کیا باتیں بیان کی جائیں لِن شاء اللہ کبھی اطمینان سے لکھوں گی ۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا یوں تو آپ لکھیں گی نہیں آپ سے تو زبردستی لکھوانا پڑے گا ۔ اور اب واقعی وہ زبردستی ہی لکھوا رہے ہیں ۔

۲ر جولائی کو بدھ کے روز دہ ایک بجے کے قریب اسلام آباد پہنچے ۔ میں نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا "طفیل بھائی ۔ اکیلے

ہی آئے ہیں۔ بھابی کو نہیں لائے؟" انہوں نے جواب دیا "میں نے تو بہت کہا مگر وہ آئی نہیں۔ دراصل اس کی طبیعت آجکل کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔"

میں نے پوچھا "کیا پئیں گے۔ ٹھنڈا یا چائے؟"

"پہلے ایک گلاس سادہ پانی پھر چائے۔"

وہ دیوان پر بیٹھ گئے۔ بہت تھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو بلا کر سامان باہر کے کمرے میں رکھوایا۔ پھر چائے بنا کر لائی۔

طفیل بھائی نے لاہور کی گرمی کا ذکر کیا۔ بہت تکلیف دہ سفر تھا اسلام آباد کا موسم تو بڑا اچھا ہے"۔

"طفیل بھائی آپ کو ہوائی جہاز سے آنا چاہیے تھا۔ پچھلے دنوں آپ بیمار بھی رہے ہیں"

بولے "ڈاکٹر سے اجازت لے کر سفر کیا ہے۔ ذرا گاڑی پاس ہو تو آسانی ہوتی ہے۔ دراصل پشاور ایک ضروری کام سے جانا ہے! وہاں بھی گاڑی کی ضرورت پڑے گی"

اس دوران اذان کی آواز آئی تو میں نے کہا "طفیل بھائی کھانا بالکل تیار ہے۔ بس میں نماز پڑھ کے اتارتی ہوں"

بولے "کوئی حرج نہ ہو تو پہلے کھانا کھا لیا جائے اس لیے کہ میں بہت تھک گیا ہوں اور کھانا کھا کر آرام کرنا چاہتا ہوں"۔

کھانے کے دوران وہ اپنی بیماری کے متعلق بتلاتے رہے کہ عید سے پہلے اور عید کے بعد ملیریا کا زور رہا۔ کئی دن بعد اب دفتر جانا شروع کیا ہے۔ گھر میں پڑے پڑے جی گھبرا گیا تھا"

میں نے کہا یہ آپ نے خط میں کیا لکھا تھا کہ اگر خون کا رشتہ ہوتا تو بہن ملے بغیر نہ جاتیں"

کہنے لگے ہاں مجھے یہ سوچ کر غصہ آیا کہ آپ کی بہن ہندوستان سے آئیں اور مجھ سے ملے بغیر چلی گئیں"

میں نے کہا "طفیل بھائی آئندہ یہ خون کی بات نہ سوچیئے گا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے جب اپنے سگے بھائیوں کے لیے دعا کی ہے آپ کا نام بھی لیا ہے۔ ہاں لاہور آنے کا پورا ارادہ تھا مگر کچھ حالات ایسے ہوئے کہ انھیں جلدی جانا پڑا۔ فرحان کے داخلہ کا مسئلہ تھا"

طفیل بھائی نے ہنس کر کہا "چلئے اب غصہ دور کیجئے۔ دل میں ملال رکھنا اچھا نہیں ہوتا اس لئے میں نے لکھ دیا تھا"

پھر طارق اور نوشیں کو پوچھا۔ میں نے ان کے متعلق بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر ہاجرہ مسرور کا ذکر کرنے لگے۔ طفیل بھائی ان کے لکھنؤ کے گھر گئے تھے۔ کہنے لگے انہوں نے کہا "ہم آپ کو پھلکیاں کھلائیں گے" ہم نے سوچا جانے کیا چیز کھلائیں گی"۔ جب پھلکیاں سامنے آئیں تو پتا چلا کہ پکوڑے ہیں"۔ اس پر میں نے فرحت اللہ بیگ کا وہ لطیفہ سنایا کہ انہوں نے نذیر احمد کی ناک کے متعلق لکھا ہے کہ "دہلی والے اسے پھلکی اور لاہور والے پکوڑا کہتے ہیں"

طفیل بھائی نے ہاتھ روک لیا تو میں نے کہا اور لیجیے۔ میں نے پرہیزی سا مرغ مسلم بنایا تھا۔ کہنے لگے "بہت مزیدار ہے لیکن آج کل میں ایک روٹی ہی کھاتا ہوں"

میں نے کہا " ہمارے ہاں کے چار پھلکے آپ کے ہاں کی ایک روٹی کے برابر ہوتے ہیں"۔ بولے " یہ تو ٹھیک ہے" اور تھوڑا سا پھلکا اور لیا۔ پھر انہوں نے پوچھا " احسن کب تک آتے ہیں؟" میں نے کہا " چار بجے کے بعد آتے ہیں"۔

وہ بولے " اچھا پھر اب میں آرام کرتا ہوں۔ ان سے چار بجے ملاقات ہوگی"۔

شام کو احسن دفتر سے لوٹے تو پوچھا " طفیل بھائی آ گئے؟"

" ہاں آرام کر رہے ہیں تھکے ہوئے ہیں۔ وہ اٹھ کر آئیں تو پھر چائے بناؤں گی"۔

میری بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ طفیل بھائی کمرے سے آتے نظر آئے۔ کہا " میں آپ کی گھنٹی کی آواز سے ہی جاگ گیا تھا"۔ وہ اور احسن گلے ملے اور پھر باتیں کرنے لگے۔

چائے کے بعد دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے پھر طفیل بھائی نے کہا " اچھا اب میں رات کے کھانے تک آرام کروں گا"۔

احسن نے کہا معلوم ہوتا ہے " بہت تھک گئے ہیں"۔

بولے " ہاں — پھر کل صبح صبح پشاور جانا ہے دراصل پریس کا ایک ضروری کام تھا اسی سلسلہ میں آیا ہوں سوچا آتے جاتے ایک دن آپ لوگوں کے پاس رک جاؤں گا۔ ملاقات بھی ہو جائے گی۔ اور تھکن بھی اتر جائے گی"۔

میں نے کہا " طفیل بھائی اب دوڑ بھاگ کے سب کام لڑکوں کے سپرد کیجئے"۔

بولے " لڑکے بھی بہت کام کرتے ہیں مگر کچھ کام میرے ہی کرنے کے ہوتے ہیں"۔

احسن نے کہا " اچھا تو پھر آپ آرام کیجیے اور میں قضا نمازیں پڑھ لوں۔ پھر عصر کا وقت ہو جائے گا"۔

آٹھ بجے کے قریب طفیل بھائی کمرے سے باہر آ گئے۔ اور ہمارے ساتھ ڈرامہ دیکھنے لگے۔ " آسمان تک دیوار " کی اس روز آخری قسط دکھائی جا رہی تھی۔ ڈرامہ ختم ہوا تو انھیں بہت کوفت ہوئی۔ بھیانک انجام کسی کو اچھا نہ لگا۔ طفیل بھائی نے کہا " اس ڈرامے نے سب ادیبوں اور شاعروں کے منہ پر کالک مل دی ہے"۔

میں نے کہا " طفیل بھائی آخر ایسے کردار بھی ہوتے تو ہیں"۔

احسن نے کہا " یہ ڈرامہ دیکھ کر لڑکیاں اب شاعروں سے ہرگز شادی نہیں کریں گی"۔

میں نے کہا " لڑکیاں شاعروں سے شادی بھی کرتی ہیں اور نبھاتی بھی ہیں"۔

احسن نے کہا " میں تو ڈرامہ کے بعد کی بات کر رہا ہوں"۔

طفیل بھائی بولے " ہمارے ہاں جب یہ ڈرامہ شروع ہوتا ہے تو دیکھنے کا منظر ہوتا ہے سب چھوٹے بڑے گردن موڑ کر ایک دفعہ میری طرف ضرور دیکھتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں کہ یہ آپ کے ٹولے کے لوگ ہیں۔ اور اس وقت مجھے بڑی شرم آتی ہے"۔

میں نے کہا " خدانخواستہ آپ لوگ تو ایسے نہیں ہیں۔ بلکہ شاعر اور ادیب اپنے کنبے کے لیے اور بھی زیادہ محسوس کرتے تھے۔ اس میں واقعی کچھ زیادتی کی گئی ہے" طفیل بھائی بولے " کچھ زیادتی نہیں۔ بہت زیادتی — !"

کھانے کے بعد خبریں سنیں پھر دس بجے کے قریب کہا اچھا اب آپ لوگ فلم دیکھئے گا۔ صبح صبح سفر کرنا ہے ہم تو اب جا کر لیٹتے ہیں"۔

پھر کہا "صبح چھ بجے تک نکل جائیں گے۔ کوشش کروں گا کہ کل ہی لوٹ آؤں دیر ہوگئی تو شاید رات رک جاؤں۔"

صبح ساڑھے پانچ بجے وہ ناشتا کرتے ہی روانہ ہو گئے۔ اور پھر اسی سہ پہر کو ساڑھے چار بجے تک لوٹ آئے تبایا کہ "پشاور میں سخت گرمی تھی اس لیئے نہ رکا نہ کسی سے ملا۔ بس کام ختم کرتے ہی اُلٹے قدموں لوٹ آیا۔ میں نے سوچا اسلام آباد جا کر ہی آرام کیا جائے۔"

چائے کے بعد کہا "اچھا اب میں رات کو کھانے تک آرام کروں گا۔ آپ لوگ کھانا کس وقت تک کھائیں گے۔"

احسن نے کہا "کوئی بات نہیں کھانا دیر سے ہی کھالیں گے آپ جب تک چاہیں آرام کیجئے۔"

کھانے کے لیے جب وہ اُٹھ کر آئے تو کہا "اب تھکن کچھ اتر گئی ہے۔" باتیں کرتے رہے۔ ٹی وی دیکھتے رہے۔ میں نے پوچھا "نقوش کا نیا شمارہ کب آ رہا ہے" کہا "میری بیماری کی وجہ سے لیٹ ہوگیا بالکل تیار ہے۔"

پھر افکار کا اختر حسین رات پوری نمبر کر آرام کرنے چلے گئے۔ ہم دونوں ٹی وی دیکھتے رہے۔

جمعہ کی صبح آٹھ بجے کے قریب ناشتے کی میز پر آ گئے ہم اخباروں کی ہی باتیں کر رہے تھے۔ طفیل بھائی بھی گفتگو میں شریک ہو گئے اور کہا "۵ جولائی دور ہی کتنی ہے کل پتا چل ہی جائے گا۔!"

میں نے کہا "آپ نے کل سفر ٹھیک نہیں رکھا راستے بند نہ ہوں۔"

کہنے لگے ہاں پچھلی مرتبہ بھی بے نظیر کی آمد پر راستے کئی کئی گھنٹے بند رہے یہ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ راستہ میں دشواری نہ ہو۔ لیکن کوئی بات نہیں صبح بہت سویرے نکل جائیں گے۔"

ناشتا کے بعد میں نے کہا "اچھا اب میں تو ذرا جمعہ بازار کا چکر لگا آؤں آپ لوگ باتیں کیجیے۔"

طفیل بھائی نے کہا "اگر اچھی قسم کے گلاس مل جائیں تو ایک درجن لیتی آیئے گا۔ آپ کی بھابی نے فرمائش کی تھی پشاور میں تو مجھے وقت ہی نہ ملا۔ فوراً واپس ہو گیا۔"

میں نے کہا "طفیل بھائی میں کوشش کروں گی مگر جمعہ بازار میں اچھی قسم کے گلاس نہیں ملتے۔"

جمعہ بازار سے لوٹی تو طفیل بھائی اور احسن ابھی تک سیاست سے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

احسن نے میرے دروازے میں قدم رکھتے ہی چائے کی فرمائش کی تو طفیل بھائی نے کہا "اسے سانس تو لینے دو۔ پسینہ خشک ہو جانے دو۔"

میں نے دل میں سوچا یہ بات بھائی ہی سوچ سکتا ہے۔

چائے لائی تو موضوع سیاست سے ادب کی طرف آ چکا تھا۔ بہت سے زندہ اور مردہ ادیبوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ طفیل بھائی کو اس بات کا بہت افسوس تھا کہ جوش صاحب کی آخری عمر کی غیر مطبوعہ چیزیں شائع کرنے کے سلسلہ میں ان کے عزیز خاموش ہیں۔ کہیں وہ چیزیں ضائع نہ ہو جائیں۔ جوش صاحب کی پوتی سے طفیل بھائی نے میرے ذریعہ رابطہ بھی قائم کیا تھا مگر ان لوگوں نے اب تک اس سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی تھی اور طفیل بھائی بتا رہے تھے کہ ان کے خط کا جواب بھی نہیں دیا۔

پھر میں ان کو یہاں کی ادبی محفل "رابطہ" کے متعلق بتاتی رہی "سلسلہ" کا بھی ذکر نکلا۔ طفیل بھائی نے ادا بھن کے بارے میں بتایا کہ

آجکل وہ امریکہ گئی ہوئی ہیں"۔

میں نے کہا"ادا بہن کے جانے کے بعد سے اسلام آباد سونا لگنے لگا"۔

کہنے لگے :"ہاں وہ بہت مخلص اور اچھی ہیں"۔ پھر حنیدا اور رادیہوں کا ذکر نکلا۔ طفیل بھائی نے فیض صاحب کو بھی یاد کیا میں نے کہا۔

"طفیل بھائی فیض صاحب کو میں نے اتنے فاصلہ سے دیکھا ہے کہ مجھے ۔ ان کی کوئی اچھائی معلوم ہے نہ برائی ؟"

بولے"برائی کا کیا ذکر ہے ان میں بہت خوبیاں تھیں"۔ احسن نے بھی ان کی تائید کی میں نے کہا"اچھا میں تو اب باورچی خانہ کا رخ کرتی ہوں"۔

بھائی نے پوچھا"کیا اب کیا شروع ہوگا"میں نے کہا"نہیں کڑھی تو صبح سویرے ہی چڑھادی تھی اب صرف تلفے کا ساگ اور سلاد بنانا ہے پھر لوگوں کو ٹھیک ایک بجے کھانا مل جائے گا"۔

طفیل بھائی اور احسن جمعہ کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میں نے پوچھا"مولوی صاحب بہت زور زور سے بول رہے تھے ۔

احسن نے کہا"ہاں شریعت بل کے سلسلہ میں یوم منا رہے ہیں۔ چھ جولائی کو"۔

طفیل بھائی نے کہا"مولوی صاحب بڑے جوش میں تھے۔ دیکھئے یہ لوگ کیا کرتے ہیں"۔

احسن اور طفیل بھائی نے کھانا شروع کیا میں گرم گرم پھلکے ڈال کر لاتی رہی۔ طفیل بھائی نے کڑھی بہت پسند کی اور شوق سے کھائی"۔ بہت پھلکے پک گئے آپ بھی آجائیے"۔ بھائی نے کہا۔

پھر کھانے کے بعد جب طفیل بھائی اپنے کمرے میں جانے لگے تو میں نے پوچھا"آپ کا شام کا کیا پروگرام ہے"۔

بولے"جو پروگرام آپ لوگ بنالیں"۔

میں نے کہا"شام کو ہم لوگ شہاب صاحب کے ہاں جانا چاہتے ہیں مبارک باد کے لیے"۔

پوچھا کس بات کی مبارک باد؟"میں نے ثاقب کی کامیابی کا بتایا تو انھیں بہت خوشی ہوئی اور کہا"بس پھر شام کو شہاب صاحب کے ہاں ضرور چلیں گے میرا بھی ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے"۔

شام کی چائے کے بعد ہم لوگ شہاب صاحب کے ہاں روانہ ہوئے۔ وہاں تقریباً آدھ گھنٹہ بیٹھے ۔شہاب صاحب اور طفیل بھائی قرآن نمبر کے سلسلہ میں باتیں کرتے رہے۔ پھر شہاب صاحب نے کہا"طفیل صاحب خدا آپ کی عمر دراز کرے مگر میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی زندگی میں ایک کتاب آپ کے کاموں کے بارے میں شائع ہونا چاہیئے۔ کچھ لوگوں سے میری اس سلسلہ میں بات بھی ہوئی ہے"۔

طفیل بھائی نے حسبِ عادت انکسار سے نظریں جھکالیں اور خاموش رہے۔

وہاں سے ہم لوگ بری امام جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈرائیور صاحب نے بری امام جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا طفیل بھائی نے کہا چلو ہم بھی فاتحہ پڑھ لیں ہم پہلے کبھی وہاں نہیں گئے۔ ہم تو بس داتا صاحب ہی جایا کرتے ہیں"۔

راستہ میں قبرستان میں رک کر ہم نے تزئین کی فاتحہ پڑھی طفیل بھائی کو تزئین کی قبر کا کتبہ بہت پسند آیا انہوں نے کہا کسی اچھے خوشنویس نے لکھا ہے میں نے بتایا کہ طارق نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ ملتان سے بنوایا تھا۔ راستہ چلتے ہوئے میں انھیں تزئین کی بات سنانے لگی

"وہ کہا کرتی تھی کہ اگر گھر نہ ہوتے اور دیواریں نہ ہوتیں تو کتنا اچھا لگتا۔ ساری عمارتیں اسلام آباد کی خوبصورتی ختم کرتی جا رہی ہیں! کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ سب لوگ رہتے اور دیواریں نہ ہوتیں۔؟"

طفیل بھائی نے کہا "تم مُنی بہت اچھی باتیں کیا کرتی تھی۔"

میں نے کہا "اس کی اس بات کا مطلب اب میری سمجھ میں آیا دیکھئے یہاں سب رہ رہے ہیں اور دیواریں نہیں ہیں!"

طفیل بھائی نے چلتے ہوئے کہا "آپ دونوں بہت اداس رہتے ہیں آپ ایک چکر طارق کے پاس ضرور لگا آئیے۔ سیر بھی ہو جائے گی یہ آپ لوگوں کے لئے بہت ضروری ہے۔" یہ بات طفیل بھائی ان دنوں جب بھی آتے ضرور کہتے۔

پھر میں نے طفیل بھائی کو ممتاز شیریں کی قبر دکھائی۔ "آپ کی ادبی برادری کی ایک بہن یہاں بھی ہیں۔" انہوں نے فاتحہ پڑھی اور پھر آخر میں قبرستان کے دروازے سے نکلتے ہوئے۔ جوش صاحب کی فاتحہ پڑھی۔

بری امام کا مزار دیکھ کر طفیل بھائی نے کہا "اتفاق سے ہمارا کبھی اس طرف آنا نہ ہوا تھا۔ خوبصورت جگہ ہے۔" مغرب کی نماز کے بعد ہم لوگ وہاں سے لوٹ آئے۔

سپر مارکیٹ جمعہ کی وجہ سے بند تھی۔ طفیل بھائی کو بچوں کے لیے چیزیں خریدنا تھیں۔ ایک دو دکانیں جو کھلی ہوئی تھیں ان پر سے انہوں نے کچھ خرید و فروخت کی جب وہ اور احسن واپس آئے تو میں نے پوچھا "دکانیں کھلی ہیں؟" طفیل بھائی نے کہا۔ "ہاں کچھ نہ کچھ مل ہی گیا ہے۔ مگر اب کے جب ہم جائیں گے تو بچے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوں گے۔"

میں نے کہا "کیوں بھائی خوش کیوں نہ ہوں گے؟"

کہنے لگے "ہم جیسی چیزیں ان کے لئے لے جایا کرتے تھے اس بار نہیں لے جا رہے اور تمہاری بھابی کی فرمائش بھی رہ گئی۔" طفیل بھائی کو بھابی کی چھوٹی سے چھوٹی فرمائش کا بھی بہت خیال رہتا تھا۔

گھر آئے تو میں نے کہا "اب میں کھانا لگاتی ہوں۔"

انہوں نے کہا "آپ کھانا لگا لیجے جب تک ہم پیٹرول ڈلوا آئیں آتے ہوئے ہمیں یاد نہیں رہا سویرے دقت ہو گی۔ میں بہت سویرے نکلنا چاہتا ہوں۔"

طفیل بھائی نے ہلکا پھلکا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ٹی وی دیکھتے رہے اس دوران کچھ یاد کر کے بولے "ہاں بہن دو کام آپ کے سپرد کئے جا رہا ہوں۔ ایک رسولؐ نمبر کا پارسل ایوب محسن صاحب کو دینا ہے وہ مجھے پیشگی پیسے دے گئے تھے۔ دوسرا صادق صاحب کو دینا ہے ان سے نمبر ادھار لے کر میں نے کسی کو دیا تھا۔ میں لاہور جا کر دونوں کو خط ڈال دوں گا وہ خود ہی آ کر لے جائیں گے۔"

میں نے کہا "اگر دونوں کے فون نمبر دے دیں تو میں خود اطلاع دے دوں گی۔"

انہوں نے کہا "نہیں آپ کو دقّت ہو گی میں خط ہی ڈال دوں گا۔ دونوں پارسل طارق کے کمرے میں ہی رکھے ہیں۔"

"ہاں طفیل بھائی میں نے کیریاں تڑوا کر رکھی ہیں۔ میٹھی کیریاں ہیں بچیاں شوق سے کھائیں گی ضرور لیتے جائیے گا۔ ڈگی میں رکھوا دوں؟"

"نہیں مجھے یاد رہے گا میں نے دیکھ لی ہیں؟" پھر کیریوں کے ذکر پر بتایا کہ "اب کے ہمارے آم میں بھی دس کیریاں لگی تھیں ایک دن بہت آندھی بارش آئی تو میں نے رات کو ٹارچ ڈال کر کیریاں دیکھیں کہ گری تو نہیں۔ سب بچ گئیں درخت میں آم لگے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

فون کی گھنٹی بجی تو میں نے کہا: "رانگ نمبر ہو گا کیونکہ کل ہی تو فون نمبر بدلا ہے اور ابھی تک کسی کو نیا نمبر معلوم ہی نہیں۔"

طفیل بھائی نے تعجب سے کہا: "آپ نے اب تک فون نمبر بدلنے کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔ چھاپ کر اطلاع کرا دیجئے یا پھر خط کے ذریعہ اور اسلام آباد میں تو فون کر ہی دیجئے۔"

میں نے کہا: طفیل بھائی "ہم گوشہ نشین لوگ ہیں نہ خود کسی کو فون کرتے ہیں اور نہ کوئی ہمیں فون کرتا ہے۔ کالج فون کر کے کل بتا دوں گی۔ ساتھیوں کو دھیرے دھیرے پتا چل جائے گا۔ ہاں کل طارق کو ضرور بتانا ہے وہ گھبرا نہ جائے۔"

کہنے لگے: "طارق کو تو آپ ضرور ہی بتا دیجئے اتنی دور کی بات ہے۔"

میں نے کہا: "طفیل بھائی جمیلہ کو میرا نیا فون نمبر کل جاتے ہی بتا دیجئے گا وہ اکثر فون کرتی ہے۔"

"اچھا ضرور بتا دوں گا۔" انہوں نے کہا۔

میں نے کہا: "ہاں بھائی آپ لاہور فون کر لیجئے بچوں کو نیا نمبر نہیں معلوم شاید انھیں آپ سے بات کرنی ہو۔"

کہنے لگے پشاور سے فون کر ہی دیا ہے اب کوئی ضرورت تو نہیں ہے کال بک کرا کے پھر انتظار کرنا پڑے گا۔ اب کل وہاں پہنچ ہی جائیں گے۔

ٹینس میچ شروع ہوا تو میں نے کہا: "آپ لوگ میچ دیکھئے میں تو اب نماز پڑھ کے لیٹتی ہوں۔"

بھائی نے پوچھا: "صبح کب اُٹھ جاتی ہیں؟"

میں نے کہا: "فجر کے وقت ——!"

"اچھا پھر ساڑھے چار بجے مجھے ضرور جگا دیجئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ صبح پانچ بجے گھر سے نکل جاؤں تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے سفر ہو۔"

میں خدا حافظ کہہ کر جب اپنے کمرے میں آئی تو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ یہ آخری "خدا حافظ" ہے۔

احسن اور وہ دیر تک ٹی وی پر میچ دیکھتے رہے۔ صبح جب نماز کے بعد میں نے احسن کو جگایا کہ طفیل بھائی کو اٹھا دیں تو انہوں نے کہا رات گیارہ بجے تک تو ہم لوگ میچ دیکھتے رہے۔ میں نے کہا: "انہوں نے ساڑھے چار جگانے کو کہا تھا۔ آپ انھیں جگا ہی دیجئے میں ناشتا بناتی ہوں، میں نے باورچی خانے جاتے ہوئے طفیل بھائی کے دروازے پر KNOCK بھی کی پھر احسن کو آواز دے کر کہا: "شاید انہوں نے دستک نہیں سنی۔ اندر جا کر اٹھائیے۔"

احسن دروازے میں داخل ہوئے تو پہلے انہوں نے زور سے آواز دے کر بلایا اور پھر کچھ دیر بعد ان کی زور زور سے چلانے کی آواز آئی: "ابا کو طفیل بھائی نہیں جاگتے۔ طفیل بھائی نہیں اٹھتے۔" میں نے ابھی چولہا بھی نہ جلایا تھا میں باورچی خانے سے دوڑتی

ہوئی کمرے میں گئی تو احسن انھیں ہلا رہے تھے۔ اور طفیل بھائی گہری نیند سے جاگتے ہی نہ تھے۔
گہری نیند میں ان کا منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو آواز دی وہ طفیل بھائی کے کمرے کے سامنے ہی لان میں سو رہا تھا ——— وہ بھی اندر آکر انھیں جگانے میں مدد کرنے لگا۔ اس لمحہ میں نے سوچا کہ وہ بیہوش ہیں۔ میں نے دوڑ کر ڈاکٹر ثمین کو فون کیا اور ان سے کہا کہ فوراً آجائیں طفیل بھائی بیہوش پڑے ہیں پھر دوسرا فون میں نے شہاب صاحب کے ہاں کیا اور تیسرا فون منشا یاد کو کیا کہ ہمارا فون ڈائریکٹ نہیں ہے طفیل بھائی کے گھر اطلاع دیجئے کہ وہ بیہوش ہیں اور گھر سے کوئی بیٹیا آجائے۔ پھر میں دوڑ کر پڑوس میں گئی کہ "طفیل بھائی کو اٹھوا کر پولی کلینک لے جانے میں مدد کریں۔" ان کی بے ہوشی کا سُن کر پڑوسی فوراً آگئے۔ دس منٹ کے اندر ڈاکٹر ثمین بھی آگئے۔ اور شہاب صاحب کے بھانجے بھی آچکے تھے۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کے بعد بتایا کہ ان کی سوتے ہوئے موت واقع ہوگئی ہے۔ تقریباً دو گھنٹے قبل حرکتِ قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

یہ سن کر ہمارے ہوش اڑ گئے۔ بھابی اور بچوں کے چہرے میرے سامنے آگئے۔

ڈاکٹر ثمین نے پوچھا "کیا یہ ہارٹ اور ذیابیطس کے پرانے مریض تھے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ڈاکٹر نے کہا "اس میں اکثر اسی طرح ہوتا ہے۔"

اس دوران محلہ پڑوس کے کافی لوگ آچکے تھے۔ منشا یاد نے ادیبوں کو اطلاع دے دی تھی۔ وہ خود بھی آچکے تھے۔ مجھے اس وقت احسن کہیں نظر نہ آئے تو میں ان کے کمرے میں گئی۔ احسن بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے میں نے انھیں پہلی مرتبہ اس طرح روتے دیکھا تھا۔ "ہمت سے کام لیجئے۔ باہر چل کر لوگوں کے درمیان بیٹھئے۔" کچھ دیر بعد وہ خود کو سنبھال کر سب کے ساتھ آگئے۔

محلہ پڑوس کی عورتیں جو جمع ہو گئی تھیں وہ طفیل بھائی کے اطراف بیٹھ کر قرآن شریف پڑھنے لگیں۔

جو لوگ بھی طفیل بھائی کا آخری دیدار کرنا چاہتے تھے وہ خبر ملتے ہی آگئے تھے۔ میں لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام کرنے لگی۔ میں نے اپنی ساری ہمت اور طاقت کو سمیٹ رکھا تھا۔ آہ مگر مجھے اس وقت ایک نہیں دو جنازے نظر آرہے تھے طفیل بھائی نے سفید چادر اوڑھ کر مجھے تزئین کی بھی سفید چادر میں لپٹی ہوئی صورت یاد کرا دی۔ اسی کمرے سے اسے بھی ڈولے میں رخصت کیا تھا!

ہماری کوشش تھی کہ طفیل بھائی کی میت جلد سے جلد لاہور پہنچانے کا انتظام ہو جائے اور ہم جاوید کا انتظار کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ہوائی جہاز اور ایمبولینس وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کی جا رہی تھیں۔ منشا یاد نے اس موقعہ پر ساری دوڑ بھاگ میں بہت ساتھ دیا۔ دوسرے آئے ہوئے لوگ بھی جنازے کو جلد سے جلد لے جانے کی تجاویز پیش کر رہے تھے۔ اسی وقت جاوید دروازے میں داخل ہوئے۔ جاوید کو دیکھ کر اب میری وہ ہمت جسے میں بڑی مشکل سے یکجا کئے ہوئے تھی۔ ساتھ چھوڑ گئی اور میں اپنے آنسو قابو میں نہ رکھ سکی۔

پھر میں نے چپکے سے جاوید سے کہا۔ "جاوید سب لوگ طرح طرح کی تجاویز پیش کر رہے ہیں اب تم آگئے ہو تم فیصلہ کرو کہ کیسے لے جانا ہے اور جلد لے جانا چاہیے۔"

اسی وقت طفیل بھائی کے ایک عزیز مصطفٰے نے کہا کہ ان کی " ایئر کنڈیشنڈ ویگن ہے اور وہ اس میں آرام سے ہوائی جہاز سے پہلے پہنچا دیں گے ۔"

میں نے کہا " جلدی کیجئے ۔" اور پھر طفیل بھائی کے آخری سفر کے لیے فوم کا وہی گدا بچھایا گیا جس پر وہ رات سوئے تھے۔ چاروں طرف تکیے سہارے کے لئے لگا کر انھیں آرام سے لٹا دیا گیا۔ ان کی گہری نیند میں خلل نہ آئے ۔ اتنی گہری اور اتنی میٹھی نیند ——— اتنی پرسکون نیند ۔ کہ جیسے یہ میٹھی اور پرسکون نیند ان کی عمر بھر کی تھکن کا حاصل ہو ! اتنا سکون اور اتنی آسودگی ان کے چہرے پر تھی کہ کوئی یہ یقین نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ مر چکے ہیں۔

طفیل بھائی کے جنازے کے پیچھے طفیل بھائی کی کار میں ہم دونوں اور صادق صاحب مع اپنی بیگم کے تھے۔ ڈرائیور جو تین دن پہلے طفیل بھائی کو لے کر آیا تھا اپنے چہرے پر دکھ اور کرب لئے ان کی میت کے پیچھے گاڑی چلا رہا تھا اور مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا۔ کہ صبح جب دوسرا فون پہنچا ہوگا تو گھر میں اس وقت سے کیسا کہرام برپا ہوگا۔ اور جب جنازہ پہنچے گا تو بھابی اور بچوں پر کیا گزرے گی۔ طفیل بھائی کی پوتیوں کے پیارے پیارے معصوم چہرے میری نظروں کے سامنے تھے ۔"

موت برحق ہے مگر کاش خدا انھیں چند گھنٹوں کی مہلت ہی اور دے دیتا۔ وہ صبح ۵ بجے حسبِ خواہش لاہور کے لیے روانہ ہوتے اور بچوں کے درمیان زندہ سلامت پہنچ سکتے ۔ ! آہ پشاور میں ان کا کام جیسے موت کا بہانہ تھا جو انھیں لایا تھا اس لئے کہ کہتے ہیں کہ وقت اور جگہ دونوں معین ہیں۔

صبح سے بار بار میرے جی میں یہ خیال آتا کہ کاش بھابی ساتھ آئی ہوتیں ! شاید رات کے کسی حصہ میں طفیل بھائی کی آنکھ کھلی ہو۔ یا انھیں کوئی تکلیف محسوس ہوئی ہو !

صبح جب میں یہ بات کہہ رہی تھی اس وقت مسز وحید قریشی نے مجھے بہت تسلی دی تھی اور کہا تھا کہ " مہمان کی اس طرح موت کا سانحہ ہمارے ہاں بھی ایسے ہی گزرا ، طفیل بھائی تو اکیلے تھے مگر ہمارے ہاں آنے والے مہمان تین تھے فرش پر اکٹھے ہی سوتے ہوئے تھے اور ایک چل بسا اور باقی دو کو خبر تک نہ ہوئی ۔"

طفیل بھائی جس گاڑی میں آگے روانہ ہوئے تھے وہ بہت آگے نکل چکی تھی راستہ میں رک کر ہم نے پولی کلینک سے ان کی موت کا سرٹیفکیٹ لیا۔ بتایا گیا تھا کہ راستہ میں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے ۔ اس طرح ہم لوگ پیچھے رہ گئے ۔ اور آگے جانے والی گاڑی پھر ہمیں نظر نہ آئی ڈرائیور نے بتایا وہ لوگ بہت تیز نکل گئے ۔"

احسن غم کی تصویر بنے بالکل خاموش بیٹھے تھے ۔ مسز صادق اور میں کبھی کبھی آپس میں بات کر لیتے ۔ راستہ بہت مشکل بن گیا تھا بہت لمبا اور کٹھن ——— ! اور وہاں بھی سب کے لئے انتظار کا ایک ایک لمحہ بوجھ بنا ہوگا ——— طفیل بھائی کا کنبہ اور ان کے گھر کے در و دیوار اور ان کا شہر لاہور ان کا منتظر ہوگا۔

طفیل بھائی نے اپنا سفر کتنا مختصر اور آسان بنا لیا ہے

تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

طفیل بھائی زادِ راہ میں صرف نیکیاں اور ادبی کارنامے ہی نہیں۔ عشقِ رسولؐ کے روشن چراغ بھی ساتھ لے گئے ہیں جن کی روشنی یہاں بھی رہے گی اور وہاں بھی —— ! عالمِ نور میں وہ نور کا ہی توشہ لے کر گئے ہیں۔ اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے! خدا ان کے بیٹوں کی مدد کرے اور وہ ان کے عظیم منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

محمد طفیل

مالک رام

۵ جولائی ۱۹۸۶ء صبح ساڑھے چھ بجے ریڈیو پر خبر نشر ہوئی۔

آج صبح "نقوش" کے مدیر محمد طفیل کا حرکت قلب بند ہو جانے سے اسلام آباد میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میری طرح آپ نے بھی اُردو کا محاورہ بجلی گرنا، بجلی گر جانا بارہا سنا ہو گا لیکن اس کے صحیح معنی مجھ پر خبر سننے کے بعد واضح ہوئے، یہ اتنی اچانک اور غیر متوقع خبر تھی کہ میں چند لمحے کے لئے سُن ہو گیا، اور میرے دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ میرا ماحول اور سب چیزیں جوں کی توں اپنی اپنی جگہ پر موجود تھیں لیکن میں احساس سے عاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر گلی سے کسی موٹر گاڑی کے یک لخت رکنے کی کریہہ اور بھیانک آواز سنی، تو میں دھچکے سے دوبارہ ہوش میں آیا۔

اب مجھ پر کھلا کہ کبھی کبھی کسی ناگہانی واقعے کی خبر سن کر بعض لوگوں کی جو موت ہو جاتی ہے، تو یہ کیونکر ہوتا ہے۔

محمد طفیل سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء-۱۹۵۷ء کے جاڑوں میں ہوئی۔ "نقوش" کے دونوں شخصیات نمبر شائع ہو چکے تھے۔ بلکہ اس کا دوسرا حصہ اس سے کچھ ہی پہلے شائع ہوا تھا بیسیوں اور پڑھنے والوں کی طرح میں نے بھی انہیں تعریف کا خط لکھا اور بتایا تھا کہ یہ تاریخی کارنامہ ہے، تاریخ ادب اُردو کا طالب علم ہمیشہ ان سے استفادہ کرے گا اور ان کا ممنونِ احسان رہے گا غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ دلّی آئے تو مجھ سے بھی ملنے کے لئے تشریف لائے۔

شام کا وقت تھا۔ میں کمرے میں بیٹھا، کوئی کتاب دیکھ رہا تھا کہ لڑکے نے آکر اطلاع دی کہ کوئی صاحب ملنے کو آئے ہیں میں فوراً اٹھا اور دروازے پر جا کر ان کا استقبال کیا۔ چھریرا جسم، نکلتا ہوا قد، کھلتا گندمی رنگ، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، چمکدار آنکھیں، گھنی بھویں، ستواں ناک جو پھننگ پر ذرا بھاری تھی، لبوں پر ایسا ہلکا تبسم کہ اگر دیکھنے والا توجہ نہ کرے تو شاید اسے محسوس بھی نہ ہوا انہوں نے شرماتے ہوئے اپنا نام محمد طفیل بتایا۔

جب اُنہوں نے نام بتایا تو میرے ذہن میں معاً نقوش کے موٹے موٹے "اینٹ البحر" قسم کے دونوں شخصیات نمبر اُبھر آئے۔ اس پر میں نے سوالیہ انداز میں صرف ایک لفظ کہا:۔

"نقوش؟"

"جی ہاں"

مجھ میں ایک کمزوری یا نقص ہے کہ جہاں میرے مذاق کی کوئی چیز سامنے آئے یا کوئی ہم خیال آدمی مل جائے، تو میں بے تحاشا بولنے لگتا ہوں اب تو عمر کے ساتھ یہ عادت کم ہو گئی ہے، پہلے بہت زیادہ تھی۔ اس موقعے پر بھی یہی ہوا۔ میں نے نقوش کی تعریف میں بولنا شروع کر دیا۔ وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے البتہ ان کی مسکراہٹ ذرا نمایاں ہو گئی کوئی دو منٹ بعد مجھے خیال آیا کہ میں ہی بولے جا رہا ہوں اور ان کو نہ بولنے کا موقع دیا، نہ خوش آمدید کہا چنانچہ میں یکایک خاموش ہو گیا وہ مسکرائے اور شکریے

کے دو ایک نقطے

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ۳۰-۳۲ کے پیٹے میں ہوں گے اس پر مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ جس سلیقے اور دیدہ دری سے اُنہوں نے آج تک نقوش کی ادارت کی تھی میں انہیں اس سے زیادہ عمر کا سمجھے ہوئے تھا جب میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو فرمایا کہ احباب کی ذرہ نوازی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری حقیر کوشش کو قبولیت کا درجہ عطا کیا۔

"نقوش ۱۹۴۹ء کے نصف آخر میں احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور نے جاری کیا تھا بعد کو وقار عظیم نے بھی چند شمارے مرتب کئے۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں پرچہ محمد طفیل کی تحویل میں آیا۔ ان کی رسمی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی اُنہوں نے اپنی زندگی خوشنویسی کے پیشے سے شروع کی تھی۔ اس لئے جب اُنہوں نے "نقوش" کے سے بلند معیار ادبی پرچے کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی، تو ہر کسی کو بجا طور پر اندیشہ تھا کہ کیا وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو بھی سکیں گے یا نہیں! لیکن جس سوجھ بوجھ اور کاوش سے اُنہوں نے رسالے کو چلایا اور اسے ترقی دی، اس سے نہ صرف سب لوگ مطمئن ہو گئے، بلکہ عش عش کر اُٹھے۔ اور کئی لوگوں کے دل میں تو رشک و حسد کی آگ بھڑک اٹھی، یہ خدا کی دین ہے جسے چاہتا ہے، معزز بنا دیتا ہے، اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے اور ہر حالت میں حاسد ہونے سے محسود ہونا مرجح اور قابلِ فخر ہے۔

شب کے کھانے کے بعد بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں، میں نے تجویز پیش کی کہ ہو سکے تو "نقوش" کے موضوعاتی نمبر شائع کئے جائیں مثلاً طنز و مزاح نمبر ہو، غزل نمبر ہو، مثنوی نمبر ہو، پھر ان کی تفصیلات پر گفتگو ہوتی رہی۔

اس کے بعد اُنہوں نے "نقوش" کے جو نمبر شائع کئے، وہ کسی کے وہم و گمان میں نہیں آ سکتے تھے مثلاً اس کا "آپ بیتی نمبر" دیکھئے۔ اس کے لئے صرف علمی اور ادبی شخصیتوں کو ہی نہیں لیا بلکہ سیاسی لوگوں کو بھی اور اس میں ملکوں کے حکمرانوں اور سلطنتوں کے سربراہوں تک کو اپنے جال میں گرفتار کر لیا۔ یقیناً ان کا یہ اکیلا کارنامہ ہی ایسا منفرد ہے کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔

لیکن اُنہوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں "نقوش" کا "رسول نمبر" شائع کر کے دین و دنیا کی جو سعادت سمیٹی، وہ انہیں کا حصہ تھی اس کے تیرہ حصے شائع ہوئے ہیں۔ ان کا ارادہ پندرہ حصے شائع کرنے کا تھا۔ یقیناً بقیہ جلدوں کا مواد بھی جمع کر رہے ہوں گے یا شاید کر لیا ہو اور انہیں بعد کو منظرِ عام پر لانا چاہتے ہوں۔ اب وہ "قرآن نمبر" کی تیاری میں لگ گئے تھے۔ ان کا اسلام آباد کا سفر بھی اسی سلسلے میں تھا وہاں وہ احباب سے اس کے بارے میں مشورہ کرنے کو گئے تھے کہ وہیں سفرِ آخرت پیش آ گیا کہا جا سکتا ہے کہ ان کے آخری خیالات اور تصورات قرآن ہی سے متعلق تھے جن کو لئے ہوئے وہ خود قرآن کے خالق کے حضور میں پیش ہو گئے۔ انما الاعمال بالنیات۔ ایسے میں ان کی نجات میں شبہہ ہو سکتا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

اُردو میں بیسیوں رسالے نکلے، اور آئندہ بھی نکلتے رہیں گے۔ لیکن یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ آج تک کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلا، جو ادب کا اور تاریخ ادب کا حصہ بن گیا ہو "نقوش" سے پہلے بھی بعض رسائل نے خاص نمبر نکالے تھے لیکن نیرنگ خیال کے "اقبال نمبر" اور "نگار" کے بعض نمبروں کے سوائے کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔ ہر ایک رسالے نے یہ کیا کہ عام نمبر کے مختلف اصناف میں مشمولات میں اضافہ کر کے اس کا حجم زیادہ کر دیا اور اسے خاص نمبر کا نام دے دیا۔ یعنی عام نمبر کی بہ نسبت افسانے زیادہ ہو گئے یا منظومات زیادہ ہو گئیں ورنہ اس کی کوئی مستقل یا دیرپا حیثیت نہیں تھی۔ لیکن

"نقوش" نے یہ کر دکھایا۔ اس کے بعض نمبر تو ایسے ہیں کہ ان سے تاریخ ادب کی ترتیب و تدوین کے لئے بنیادی مواد فراہم ہوتا ہے مثلاً مکاتیب نمبر (۲) خطوط نمبر ۳ شخصیات نمبر (۲) آپ بیتی نمبر (۲)، غالب نمبر ۲، اقبال نمبر (۳) بعض مشاہیر سے متعلق خاص نمبر اس کے علاوہ ہیں۔ مثلاً شوکت تھانوی نمبر، منٹو نمبر، پطرس نمبر۔ ان اصحاب سے متعلق مکمل نمبر شائع ہوئے۔

غرض یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ جو اندیشہ محمد طفیل کے "نقوش" کی ادارت ہاتھ میں لیتے وقت ان کے بعض احباب نے ظاہر کیا تھا نہ صرف وہ بالکل غلط ثابت ہوا بلکہ انہوں نے ایسی غیر معمولی کامیابی حاصل کی کہ نقوش اور ادبی صحافت کو چار چاند لگ گئے اور "نقوش" اور "طفیل" مرادف کے طور پر استعمال ہونے لگے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

طفیل کی یادیں

آل احمد سرور

طفیل کے انتقال پر ملال کی خبر سب سے پہلے ہماری زبان میں چھپی کچھ دن پہلے طفیل کا خط آیا تھا جس میں یہ خبر تھی کہ وہ بہتر ہو رہے ہیں اُنہوں نے نقوش کے خاص نمبر کے لئے مضمون کی فرمائش کی تھی جس میں نقوش کے اقبال نمبروں پر تبصرہ کرنے کی خواہش تھی میں نے اُن سے وعدہ کر لیا تھا یہ خط یاددہانی کیلئے تھا اس سے پہلے کے خط میں اپنی صحت کی طرف سے بے اطمینانی کا ذکر تھا اور اسی لئے وہ نقوش کا یہ خاص نمبر نکالنا چاہتے تھے کیا خبر تھی کہ وہ پشاور اور اسلام آباد کے سفر کے بعد اس سفر پر روانہ ہو جائیں گے، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

مولوی عبدالحق نے طفیل کو محمد نقوش کا نام دیا تھا۔ نقوش کو اُنہوں نے اپنی مسلسل محنت اور جانفشانی سے ایک ادبی رسالے کی جگہ ایک ادبی ادارہ بنا دیا۔ اُنہوں نے جب اس کی ادارت سنبھالی تو یہ اُردو کے رسالوں میں ایک قابل قدر رسالہ تھا اور بس۔ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ ایک ادبی ادارہ' ایک روایت' ایک خاص نام ایک علامت بن چکا تھا اس سے پہلے نیاز فتحپوری نے "نگار" کو تن تنہا ایک خصوصی کردار عطا کر دیا تھا اس کے بعد طفیل نے نقوش کو ایک کردار عطا کیا اُنہوں نے ایسے ایسے خاص نمبر نکالے کہ وہ ایک دستاویز بن گئے وہ ایک ایسے مدیر تھے جو سارے ادبی حلقوں اور مختلف دبستانوں سے تعاون حاصل کر سکتے تھے اُنہوں نے کسی خاص نظریے کی ترویج و اشاعت نہ کی وہ اچھے ادب کے فروغ میں لگے رہے اور ان کی بدولت ایک ایسا ادبی سرمایہ جمع ہو گیا جو بیسویں صدی کے ادب میں گرانقدر اضافہ ہے اور جس کی مدد سے برسوں تک محقق' اسکالر' ادیب اور اہل ذوق ادب کے گلستاں میں نئے پھول کھلاتے رہیں گے۔

طفیل سے میری خط و کتابت تیس سال سے اوپر تک رہی ملاقات چند بار ہی ہوئی پہلی بار لکھنؤ میں غالباً ۱۹۵۰ء میں' دوسری بار ۱۹۷۷ء میں لاہور میں پہلی اقبال انٹرنیشنل کانفرنس کے موقع پر' اور پھر تیسری دفعہ لاہور ہی میں ۱۹۸۳ء میں دوسری اقبال انٹرنیشنل کانفرنس کے موقع پر لکھنؤ یہ اس لئے آئے تھے کہ ان کے ادارے فروغ اُردو کی وہ کتابیں جو شوکت تھانوی نے لکھی تھیں۔ لکھنؤ کے ایک ادارے نسیم بک ڈپو نے بلا اجازت چھاپ لی تھیں اس زمانے میں لکھنؤ میں صدیق حسن صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ یہ آئی سی ایس کے ایک سینئر افسر اور ادب اور ادیبوں کے بڑے قدرداں تھے خود بھی شعر کہتے تھے۔ آخر زمانے میں اُنہوں نے جگر صاحب کی بڑی مدد کی میں طفیل صاحب کو صدیق حسن صاحب کے پاس لے گیا اُنہوں نے نسیم انہونوی کو بلوایا اور اُن سے کہا کہ آپ طفیل صاحب کو ان کتابوں پر مناسب رقم دیں' ورنہ وہ آپ پر مقدمہ دائر کریں گے۔ اُنہوں نے صاف کہا کہ مقدمہ دائر کرنے سے کچھ نہ ہوگا قانون ایسا ہے کہ طفیل صاحب یہ ثابت ہی نہیں کر پائیں گے کہ کتابیں میں نے چھاپی ہیں۔ پھر اُنہوں نے ایک حقیر رقم کی پیش کش کی جو طفیل

صاحب نے نامنظور کر دی۔ غرض طفیل صاحب کی یہ مہم تو میرے نزدیک ناکام ہی رہی۔ مگر اس بہانے سے انہیں لکھنؤ کے ادیبوں سے ملنے کا موقع مل گیا میں کئی دفعہ انہیں کافی ہاؤس لے گیا جو اس زمانے میں شاعروں اور ادیبوں کا اڈہ بنا ہوا تھا طفیل صاحب خاموش طبع آدمی تھے ان کی بات ایک دو جملے سے آگے نہ بڑھتی مگر میں نے یہ ضرور نوٹ کیا کہ وہ بہت غور سے ادیبوں کی گفتگو سنتے تھے ہاں کبھی کبھار ایک آدھ معنی خیز جملہ خود بھی کہہ دیتے تھے ایک دفعہ کافی ہاؤس گیا تو مجاز ایک دوسری میز پر بیٹھے ہوئے تھے میں نے انہیں بلایا طفیل صاحب سے ملوایا اور کافی کی پیش کش کی۔ مجاز اس وقت موڈ میں تھے کہنے لگے سرور صاحب کافی مجھے سوٹ نہیں کرتی۔ طفیل اس جملے سے بہت محظوظ ہوئے پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں مجاز نے کئی لطیفے سنائے، جن سے ہم سب بہت لطف اندوز ہوئے مگر طفیل خاموش بیٹھے رہے۔ ہاں یہ لگتا تھا کہ وہ شاید ذہن میں کوئی اسکیچ بنا رہے ہیں۔

طفیل نے جو خاص نمبر نکالے ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ان کی فہرست خاصی لمبی ہے۔ ان نمبروں کے لئے وہ برسوں پہلے سے تیاری کر رہے تھے۔ لکھنے والوں کو خطوط کے ذریعہ یاد دہانی کرانے کے علاوہ تار بھی دیتے شاید ہی کوئی ادیب یا اسکالر ایسا ہو جو ان کے دام میں نہ آیا ہو طفیل کے خلوص، ان کے اصرار کے سامنے سبھی کو سپر ڈالنی پڑتی تھی، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ باوجود اتنی دوستی اور خلوص کے، میں نے طفیل کی فرمائشیں کم ہی پوری کیں۔ وہ کئی دفعہ آزردہ بھی ہوئے اور دوستی ختم کرنے کی دھمکی بھی دی مگر میں نے انہیں منا لیا ۱۹۶۵ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں ڈاک کا سلسلہ بند ہو گیا تھا جب کھلا تو سب سے پہلے خط طفیل کا آیا یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

۱۹۷۷ء میں جب لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی صحت اچھی نہ تھی مگر وہ کئی دفعہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں مجھ سے ملنے آئے۔ اقبال کانگریس کے جلسوں کے دوران اُنہوں نے لاہور کے ایک ہوٹل میں نقوش کی طرف سے کانگریس کے مندوبین کو ایک استقبالیہ دیا تھا صدر اٹلی کے پروفیسر بوسانی تھے جو مشہور مستشرق تھے اور میں جنہیں (SAINT) کہتا ہوں۔ ہندوستان کی طرف سے میں نے اور سردار جعفری نے تقریر کی تھی۔ اپنی تقریر میں میں نے طفیل کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا تھا کہ کام کرنے میں وہ بھوت ہیں اور ان تھک محنت کرتے ہیں۔ تقریریں ٹیپ کی جا رہی تھیں۔ مگر بعد میں طفیل نے لکھا کہ غلطی سے یہ ٹیپ خراب نکلا اور آپ اپنی یادداشت کی بنا پر اپنی تقریر لکھ کر بھیج دیجئے، مجھے جو کہنا ہوتا ہے وہ زیادہ تر ایک دفعہ لکھتا ہوں دوبارہ لکھنے یا صاف کرنے میں مجھے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔ چنانچہ میں طفیل کو یہ تقریر لکھ کر نہ بھیج سکا اس کا افسوس رہا۔ جب میں لاہور سے روانہ ہوا تو ہوائی اڈے پر الوداع کہنے طفیل بھی موجود تھے۔

۱۹۸۲ء میں دوبارہ گیا تو طفیل سے ملنے ان کے انار کلی کے دفتر پہنچا۔ بہت خوش ہوئے اب کے مجھے وہ کچھ زیادہ بیمار لگے مگر بڑی شگفتگی سے باتیں کرتے رہے۔ دو تین دن بعد اُنہوں نے اپنے گھر چائے پر بلایا اور لاہور کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو بھی جمع کر دیا بڑی پر تکلف صحبت رہی جگن ناتھ آزاد بھی ساتھ تھے۔ میری بیوی نے طفیل کو چھیڑا کہ یہ آپ کے دوست کیسے ہیں جو آپ کے نقوش کے لئے باوجود تقاضوں کے نہیں لکھتے۔ ہنس کر کہنے لگے۔ کیا کیا جائے۔ دوستی جب ہو جاتی ہے تو ختم تو نہیں کی جا سکتی۔

مجھے معلوم ہے کہ طفیل نقوش کے اقبال نمبر ۳ کے لئے بہت سا مواد جمع کر چکے تھے "انہوں نے خاصی تعداد میں اقبال کے بہت سے غیر مطبوعہ خطوط بھی ڈھونڈ نکالے تھے۔ برمنگھم کے سعید درانی نے انہیں کچھ نیا مواد بھی دیا تھا مگر طفیل یہ نمبر شائع نہ کر پائے رسول" نمبر کی تیاری میں لگ گئے جو ۱۳ جلدوں میں ہے اور ایک بڑا کارنامہ ہے امسال انہیں یہ خیال آیا کہ نقوش کے خاص نمبروں پر مختلف حضرات سے تبصرے لکھوائے جائیں مجھ سے بھی انہوں نے فرمائش کی۔ میں نے اقبال نمبر ا اور نمبر ۲ پر تبصرہ کرنے کا وعدہ کر لیا اس خط میں انہوں نے خرابی صحت کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ یہ ان کا آخری کارنامہ ہو گا مئی میں خط آیا کہ اب طبیعت بہتر ہے اور جون تک مضمون بھیجنے کی تاکید کی تھی پھر خاموشی اور اس کے بعد ان کی اچانک موت کی خبر۔ خدا کی مرضی یہی تھی اس میں کون دخل دے سکتا ہے۔

طفیل کے خاکوں کے سات[1] مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں مشاہیر اور ہم عصروں کی شخصیت اور کارناموں پر ان کے تاثرات بڑی دلکش اور جاندار زبان میں بیان ہوئے ہیں فرحت اللہ بیگ، چراغ حسن حسرت عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے خاکوں کے ساتھ طفیل کے خاکے بھی یادگار رہیں گے۔ ان میں نہ تو قصیدہ ہے، نہ ہجو۔ نکتہ سنجی ہے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے پتے کی باتیں کہہ گئے صاحب، جناب میں شوخی کی ایک زیریں لہر اور شخصیت کی پرتوں تک پہنچنے میں ان کی دیدہ دری کی وجہ سے ان خاکوں میں آب و تاب آگئی ہے یہ خاکے بار بار پڑھے جا سکتے ہیں۔

طفیل اچھے انسان تھے مخلص دوست تھے۔ ممتاز مدیر تھے، منفرد خاکہ نویس تھے انہوں نے عمر تو زیادہ نہیں پائی مگر کام بہت کیا وہ کام جو ادب میں یادگار رہے گا اور ان کے نام کو روشن رکھے گا۔

---

[1] سات نہیں بلکہ آٹھ (ادارہ)

محمد طفیل ــــــ وہ موت میں بھی نصیبے ور نکلے

رضا علی عابدی بی بی سی ۔ لندن

(یہ مضمون ۲۲ اگست ۱۹۸۶ء کو اردو مرکز لندن کے تعزیتی اجلاس
میں بھی پڑھا گیا)

جب کوئی نامور شخص جہاں سے اٹھتا ہے لوگ طرح طرح کی باتوں سے اپنی عقیدت کا خراج پیش کرتے ہیں، ایک عہد تمام ہوا، ایک باب ختم ہو گیا، ایک بساط لپیٹ دی گئی، ایک خلا رہ گیا جسے اب کوئی پُر نہ کر سکے گا' وغیرہ وغیرہ۔

سنجیدگی سے سوچا جائے تو ایسی موت سراسر خسارے کی موت ہے۔ مرنے والے مر جاتے ہیں اور دنیا ایک خلا میں گھورتی رہ جاتی ہے، وہ بھی سناٹے کا تاریک خلا!

لیکن محمد طفیل کی موت نے اس قسم کی سوچ کو ایک نیا رُخ اور ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ اپنی ساٹھ باسٹھ برس کی عمر میں وہ جو کام کر گئے ہیں اس پر ایک سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو احساس کے نئے نئے دریچے کھلتے ہیں، وہ بھی جیتے جاگتے روشن دریچے۔ 'نقوش' کے نام سے ادب، معاشرت، تاریخ اور تحقیق کے راستوں میں وہ اتنے بہت سے اور ایسے چمکتے دمکتے چراغ جلا گئے ہیں کہ ان کے پیچھے کسی تاریکی کا شائبہ تک نہیں۔

انہوں نے عہد تمام نہیں کیا، وہ ایک عہد کی بنیاد رکھ گئے ہیں۔ اُن کے جانے سے باب ختم نہیں ہُوا، وہ ایک باب کا آغاز کر کے گئے ہیں۔ انہوں نے بساط لپیٹی نہیں، وہ بساط پر ایسی چال چل کر گئے ہیں کہ اس کے بعد میدان کھلے ہیں اور دعوتِ عام ہے کہ کوئی اُٹھے اور اگلی چال چلے۔ وہ خلا چھوڑ کر نہیں گئے بلکہ ان سے پہلے جو خلا تھا اُسے پُر کر کے گئے ہیں۔

لوگوں کو زندگی میں خوش قسمتی ملتی ہے، وہ موت میں بھی نصیبے ور نکلے۔ لوگ اپنی نیکیاں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں وہ اپنی نیکیاں پیچھے آنے والوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں، ثواب کسی کے حصے میں آئے تو یوں آئے۔

ہم اب مڑ کر دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ انہوں نے کیسی شخصیت پائی تھی۔ کچھ عرصہ ہوا کسی کام سے لندن آئے، کہاں رہے، کس کے پاس رہے، کس سے ملے اور کب چلے گئے، کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ چھُپے رہے کہ کوئی ان کا جلسہ نہ کرا دے، دبکے بیٹھے رہے کہ کوئی انٹرویو انٹرویو پکارتا ہُوا نہ آ جائے۔ اس کے باوجود آج ہمیں یُوں لگتا ہے کہ جیسے کہیں ان سے ملاقات ضرور ہوئی ہے، کہیں ان سے کچھ باتیں یقیناً ہُوئی ہیں، ایک چہرہ ہے جو آنکھوں میں آ کر بس گیا ہے، ایک ایسا چہرہ جو کبھی دیکھا بھی نہیں۔

اُن کا 'نقوش' نکلا تو بہت سے دوسرے ادبی رسالوں جیسا تھا۔ اُس وقت کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایک شخص

اپنی دُھن میں مگن، جریدہ سازی کے فن کو ایک سلیقہ اور ایک قرینہ عطا کرنے کی ٹھانے ہوئے ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس رسالہ نویسی اور پرچہ نگاری کے کُوچے میں تحقیق اور تجسس کے کواڑ کھلنے لگے۔ پہلے غزل نمبر نکلا، پھر افسانہ نمبر چھپا اور پھر تو یہ سلسلہ ایسا چلا کہ کُل ادب پہ پڑے ہوتے پردے اُٹھتے گئے، تحقیق انکشاف کے مرحلے سے بڑھی اور کشف بن گئی اور بالآخر کرامت کا ظہور ہوا۔

محمد طفیل کو کسی نے پیار سے محمد نقوش کہا تھا۔ وہ شاید محمدؐ اور نقوش کے درمیان ایک پیمان کی نوید تھی۔ مقامِ شکر ہے کہ ہماری نسل نے وُہ پیمان پُورا ہوتے دیکھا اور ہماری مطالعہ گاہیں 'نقوش' کے ایسے نمبر سے آراستہ ہوئیں جس نے محمد طفیل کے لیے دونوں جہانوں میں اللہ جانے کیسے کیسے اعلیٰ مقام آراستہ کیے ہوں گے۔

وہ سیرتِ سرورِ کونینؐ لکھنے بیٹھے تو ان کا رواں دواں قلم رُکنے لگا۔ شخصیات کو لفظوں کے قالب میں ڈھالنے والا ہاتھ ایسا قاصر ہوا کہ بس۔ بالآخر محبتیں سرخرو ہو کر رہیں، رحمتیں حرف بن کر برسیں اور ہاتف نے کہا: "تو پھر لکھ۔"

'طلوع' کے عنوان سے ان کی عبارت کی آخری سطریں یہی ہیں کہ:

جسم تھر تھر کانپنے لگا۔
تب میں نے گھر والوں سے کہا: مجھے چادر اُڑھا دو کہ یہ سنّت
میرے رسولؐ کی ہے۔

وہ تو چادر اوڑھ کر سو گئے ہیں مگر حرفوں کا نزول ابھی بند نہیں ہُوا ہے کوئی ہے جو اٹھ کر انھیں سمیٹے اور آراستہ کرے؟

نقوشِ محترم

بشریٰ رحمٰن

"نقوش" کے خالق، خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ خالق کی ہر تخلیق خاک ہو کر اپنے خالق سے ملتی ہے۔ وصالِ دوست کے لیے خاک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ پر اس خاک ہونے کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔ کوئی مجذوب بن کے خاک ہوتا ہے۔ کوئی جوگی بن کے، کوئی صوفی بن کے اور کوئی سادھو بن کے..... مگر کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی آتے ہیں جو کسی مقصد کی لگن کی مالا گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ ایک خاص منزل کا تعین کر لیتے ہیں۔ کسی آدرش کا سائبان تان لیتے ہیں اور محنت کے مصلے پر بیٹھ کر دل کا دیا روشن کر لیتے ہیں۔ یوں وہ بس کام کیے جاتے ہیں۔ اسی سے لو لگاتے ہیں اسی سے لو حاصل کرتے ہیں۔ اسی کے نام پر زندگی لگا دیتے ہیں..... اور اسی کے نام پر زندگی لٹا دیتے ہیں..... اسی کو عرفِ عام میں عشق کی انتہا کہتے ہیں..... ایسے لوگ نہ تو صوفی ہوتے ہیں نہ مجذوب..... بیچارے اور جوگی بھی نہیں ہوتے۔ بس دیکھنے میں عام سے انسان دکھائی دیتے ہیں..... اور جب ایک روز یہ وہ ہستی موہوم اُٹھ جاتا ہے تو ان کے آنگن میں بستی چاندنیاں ہر ذی نفس کو دکھائی دینے لگتی ہیں۔

مگر محمد طفیل ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے ادب کی دنیا میں کبھی نہ مٹ سکنے والے "نقوش" ہیں بے تحاشا، بیشمار ضخیم نمبروں کے باوجود، رسولؐ نمبر کی خوشبودار مہکتی ہوئی، نور لٹاتی ہوئی جلدیں ہیں، جو عاشقِ صادق کی فگار انگلیوں سے ترتیب دی ہوئی محبت کی دستاویزیں بھی ہیں، اہلِ ایمان کی راہوں کی قندیلیں بھی، اہلِ علم کے لیے علم کے دفینے بھی..... اور محمد طفیل کے لیے صدقہ جاریہ بھی.....

میں سوچتی ہوں۔ اگر میری ملاقات محمد طفیل مدیرِ "نقوش" سے نہ بھی ہوتی تو کیا فرق پڑتا..... آج اچانک ان کی رحلت کی خبر سن کر میں بھی اُن ہزاروں نفوس کی طرح مغموم سی بیٹھی ہوتی جنھیں بس ایک عظیم انسان کے اُٹھ جانے کا دُکھ ہوتا۔ مگر میری یہ حالت نہ ہوتی۔

ابھی ہفتہ بھی نہیں گذرا۔ ۲۰ جون کی شام کو میرے گھر آئے تھے اور پہلی بار تفصیلی ملاقات ہوئی..... پھر پتہ نہیں کب وہ اسلام آباد چلے گئے اور ۵ جولائی کی صبح کو عدم آباد کا شارٹ کٹ اختیار کیا۔ اُفوہ!..... اخبار سامنے پھیلا ہے..... اور میں چار پانچ دن پہلے کی ساری باتیں یاد کر رہی ہوں۔ یوں تو پاکستان میں اُردو ادب کا شاذ ہی کوئی قاری ہوگا جس نے نقوش کا مطالعہ نہ کیا ہوگا۔ جو نقوش آشنا ہے وہ طفیل صاحب کو جانتا ہے۔ اس طرح بہت عرصہ پہلے وہ محمد نقوش بن گئے تھے اور انھیں اپنا یہ نام بہت پسند تھا۔

میں اُردو ادب کی ایک ادنیٰ سی قاری ہوں اور بزرگ ادیبوں کو دیوہیکل سمجھتی ہوں اور ڈر کے مارے اکثر ان سے

ملتی نہیں کہ شاید عقیدتوں کے اظہار میں کہیں جھول پڑ جائے...... پچھلے سال اہلِ قلم کانفرنس میں غالباً ۲۶ جون ۱۹۸۵ء کو بہت سے ادیبوں اور دانشوروں کے اجتماع میں میں چپ چاپ ایک کونے میں کھڑی تھی۔ ایک نستعلیق سے بزرگ قریب آئے اور سلام کیا۔ میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ میں انھیں پہچان گئی تھی۔ مگر میں نے سوچا یہ کسی مغالطے میں مجھے سلام کر بیٹھے ہیں۔ میں نے ان کے اعلیٰ اخلاق سے مرعوب ہو کر بہت ہی خجل مندی سے اپنا نام بتایا۔ مسکرا کر کہنے لگے۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ تنہا کھڑی تھیں میں نے سوچا اپنا تعارف کرا دوں مجھے محمد طفیل کہتے ہیں ......اُف میری شرمندگی کا وہ عالم......میں نے عرض کیا۔ طفیل صاحب آپ کو کون نہیں جانتا۔ ہم جیسے ادب کے قاریوں نے نقوش میں آنکھ کھولی۔ نقوش سے شعور حاصل کیا، نقوش ہی سے لکھنے کی لگن پائی۔ بچپن کے اس زمانے میں پیسہ پیسہ جوڑ کے نقوش کے ضخیم نمبر خریدا کرتی تھی اور جب میری شادی ہوئی تو جہیز کی چیزوں کا اتنا فکر نہیں تھا جتنا ان اَن گنت کتابوں کا فکر تھا کہ میرے ساتھ آجائیں جن میں زیادہ تعداد نقوش کے نمبروں کی تھی......اس پر وہ بے اختیار ہنسنے لگے۔

یہ میری ان سے بالمشافہ پہلی ملاقات تھی۔ ایک خاتون نے عرصہ ہوا، مجھے ان کے بارے میں یہ کہہ کر ڈرایا تھا......کہ وہ بڑے مزاج والے ہیں۔ مزاج والے اور انا کے بھاری چھوٹوں کو خود آکے سلام نہیں کرتے۔ بعد ازاں لاہور کی کسی ادبی محفل میں بس سلام دُعا ہو جاتی۔ زیادہ تر رابطہ خط و کتابت کے ذریعے رہا۔ محمد طفیل کم گو، کم آمیز، منکسر المزاج، حلیم الطبع سچی لگن اور خوف خدا والے انسان تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں اس سے پہلے ان سے کیوں نہیں ملی؟ وہ تو اندر سے ایک بہت ہی میٹھے انسان تھے۔ بلند قامتی کے پربت دراصل ہم جیسے چھوٹے انسانوں کو ڈرا دیتے ہیں اور پھر ادیب برادری کی وہ قبیح رسم کہ کسی کو اپنے سے آگے جاتا دیکھا تو اس کے بارے میں بے پَر کی اُڑانے لگے۔ میں نے جب جب انھیں فون کیا۔ شفقت سے بولے۔ جب بھی خط لکھا۔ خوبصورت جواب آیا۔

پچھلے مہینے انھوں نے نقوش کے عام شمارے کے لیے مجھ سے سفرنامہ مانگا تھا، اور وہی اس آخری فون کا سبب بن گیا میں نے کہا مجھے آپ سے ایک مشورہ لینا ہے......؟

"کہنے لگے خود ہی آجاؤں گا" میں نے پوچھا، آپ کے دفتری اوقات کیا ہیں۔ فرمانے لگے صبح آٹھ بجے آتا ہوں اور مغرب کے بعد اٹھتا ہوں۔" میں نے کہا آپ کو دل کی تکلیف ہے پھر اتنا کام کیوں کرتے ہیں؟ کہنے لگے، کیا کروں کام کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"نقوش صاحب! ابھی تو آپ کا بے شمار کام ادھورا پڑا ہے! ابھی تو رسول ؐ نمبر کی باقی جلدوں کی تڑپ اور خوشبو آپ کے سینہ میں تھی......اس روز آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ کتنے کام ابھی باقی ہیں۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ کام کیے بنا زندہ نہیں رہ سکتا......تو پھر اتنا کام چھوڑ کر آپ مر کیسے گئے......؟ آپ لوگ بھی عجیب دیوانے ہوتے ہیں۔ کبھی رو رو کر عمر تباہ دیتے ہیں، اور کبھی ہنس کر پل میں مر جاتے ہیں۔؟

میں نے اس شام طفیل صاحب سے کہا۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کے زمانے میں قحط الرجال کیوں ہے؟ آپ جیسے

قدآور لوگ جو اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک تربیت گاہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے شاگرد پیدا کرنے پر توجہ نہیں دیتے... اگر اپنے فیلڈ میں ہر بڑا آدمی اپنے جیسا ایک شاگرد اس دنیا کو دے جائے تو یہاں کسی شعبے میں بھی اتنا قحط نہ ہو۔...... وہ اپنی اسی ازلی انکساری میں نرمی سے بولے "میں خود ابھی شاگرد ہوں۔ ابھی سیکھ رہا ہوں" خدا کے واسطے طفیل صاحب میری عرضداشت پر غور کیجئے۔ آپ لوگوں کے پاس امانتیں ہوتی ہیں۔ زمانہ آپ کو تسلیم کرتا ہے۔ انکساری اچھی ہے مگر اس طرح کی نہیں ......"

پھر وہ دھیرے دھیرے اپنی زندگی کی کہانی سنانے لگے...... ابتدائی ناساعد حالات کی، بے مہری یاراں کی...... گردش دوراں کی......

کم گو سے طفیل صاحب...... نپے تلے جواب دینے والے طفیل صاحب...... کبھی فالتو بات نہ کہنے والے طفیل صاحب۔ ہوں ہاں میں گفتگو کرنے والے طفیل صاحب لکھو کھہا صفحات کو قوت گویائی بخشنے والے طفیل صاحب...... کتب خانوں کو مالا مال کرنے والے طفیل صاحب...... دھیرے دھیرے باتیں کرتے کرتے اطمینان سے سو گئے......

تینوں عشق کہوں، تینوں علم کہوں
تینوں وہم یقین گمان کہوں
تینوں حسن قوی ادراک کہوں
تینوں ذوق کہوں وجدان کہوں

(جنگ لاہور، مورخہ ۸ جولائی ۱۹۸۶ء)

زندہ کون رہتا ہے اور مرتا کون ہے؟

عبدالقادر حسن

نقوش کے محمد طفیل نے اپنی ناموری زندگی کا آغاز ادب سے کیا، اس لیے ہم اخبار نویسوں کے ساتھ ان کا رابطہ بہت کم رہا۔ میری ان کے ساتھ بے شمار ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن یہ تمام ملاقاتیں بہت مختصر اور خیر و عافیت معلوم کرنے تک محدود ہیں۔ ان کی جن باتوں اور کاموں پر ہم لوگ رشک کرتے رہے وہ بہت سے تھے۔ ہم اخبار نویسوں نے بہت لکھا جو دوسرے روز اخبار کے ساتھ ردی میں چلا گیا، محمد طفیل نے جو لکھا یا مرتب کیا وہ جلدوں میں محفوظ ہو کر ان کی محنت اور جذبے کی صداقت کی زندہ رہنے والی علامت بن گیا۔ گزشتہ دنوں ابوظہبی سے ایک صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے ایک بڑا سا پیکیٹ اٹھا رکھا تھا۔ انھوں نے پیکیٹ میرے حوالے کیا تو میں نے کہا، آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی، پاکستان کے سمگلروں کی کوششوں سے یہاں کیا نہیں ملتا۔ انھوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کوئی بات نہیں آپ قبول کریں اور جب میں نے یہ تحفہ کھولا تو نقوش کے رسولؐ نمبر کی جلدیں تھیں کہنے لگے میں آپ کے لیے جو تحفے لایا تھا وہ غیر ملکی چیزوں کے شوقین رشتہ داروں کو دے دیئے، کیونکہ پاکستان میں مجھے آپ کے لائق ایک ایسا تحفہ مل گیا جس کا ثانی ابوظہبی میں نہیں ہے۔ اس وقت میں جہاں بیٹھ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے سامنے الماری میں یہ لافانی تحفہ محفوظ ہے۔ مرتے ہم جیسے لوگ ہیں جو جیتے جی دوسرے روز ردی کے بھاؤ بک جاتے ہیں۔ محمد طفیل کے نقوش کا کوئی شمارہ میں نے ردی میں بکتا نہیں دیکھا۔ طفیل صاحب نے اپنے رسالے کو جوان کا ہم نام یا وہ اُس کے ہم نام بن گئے تھے، یادگار دستاویز بنا دیا۔ نقوش کے ہر صفحے پر ان کی جانفشانی اور ذہانت کی روشنی نظر آتی ہے۔

میں ایک اخبار نویس ہوں، میرا ادب اور اُس کی تاریخ کا مطالعہ بہت محدود ہے لیکن مجھے اتنا ضرور یاد پڑتا ہے کہ طفیل صاحب نے ادب کو اسلامی بنانے میں جو کردار ادا کیا وہ بڑے بڑے ادارے اور جماعتیں نہ کر سکیں۔ گستاخی نہ ہو تو عرض کروں کہ انھوں نے ادب کو ترقی پسندوں سے چھین لیا اور یہ کارنامہ انھوں نے اپنی مسلسل محنت اور استقامت کی طاقت سے سرانجام دیا۔ آج نقوش ادب میں ایک بڑا نام ہے۔ زندہ نام جو کاغذ کا ایک مجموعہ نہیں لگتا، ایک جیتا جاگتا ادیب اور عالم دکھائی دیتا ہے۔

محمد طفیل نہ کسی بڑے آدمی کے بیٹے تھے اور نہ کسی بڑے ادارے کے رکن تھے۔ انھوں نے نہایت معمولی حیثیت سے کام شروع کیا، لیکن رفتار جو بھی تھی اُسے قائم رکھا، تیز بھاگنے والے ہانپ کر رہ گئے وہ اپنی نارمل رفتار سے چلتے رہے اور علم و ادب کی منزلوں پر منزلیں مارتے چلے گئے۔ قدرت نے انھیں مال و منال بھی بہت دیا لیکن سب کچھ ان کی محنت کا پھل تھا۔ لوگوں نے اعتراض کیا کہ صدر ضیاء الحق نے ان کی بہت زیادہ سرپرستی کی، لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ سرپرستی کے لیے محمد طفیل نے کچھ سامان او

اسباب بھی فراہم کیے تھے زیادہ یا تھوڑے کچھ کرنسی نوٹ بہرحال ان کاغذوں سے زیادہ وقیع نہیں تھے جن کو محمد طفیل نے آراستہ کیا تھا۔ انھوں نے ادب میں جو مواد یکجا کر دیا ہے اس کی قدر و قیمت ہر عہد اپنی اپنی بساط اور ضرورت کے مطابق لگاتا رہے گا۔ اور محمد طفیل کو یاد کرتا رہے گا سادیب اور نقاد محمد طفیل کے کام کا جائزہ لیتے رہیں گے اور توقع ہے وہ ان کے کام کے اس پہلو کا جائزہ بھی ضرور لیں گے جو انھوں نے ادب کے رجحان کو بدلنے میں کیا ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ اسلامی ادب سے شروع ہوتی ہے اور اُردو زبان میں پائیدار کام علماء اور دینی راہنماؤں نے کیا لیکن اسلامی قوتوں کے اضمحلال کے ساتھ اُردو ادب میں اسلامی ذہن رکھنے والوں کا کنٹری بیوشن کم ہوتا گیا۔ اور ایک زمانہ آیا جب اُردو ادب پر ترقی پسند قلم اور ذہن چھا گیا یہ قلم بڑا طاقتور تھا لیکن نقوش کے وہی صفحات جن پر ترقی پسند ادب کا رُخ تھا محمد طفیل نے اس راج کا تختہ اُلٹ دیا اور نقوش ایک صاف ستھرے خدا پرست ذہن کی راج دھانی بن گیا اُسے حسد کہیے یا محمد طفیل کے نظریات کی مخالفت کہ اس کی کوششوں کو ایک کاروبار کہا گیا۔ اور اس کے کام کو نفع و نقصان کے بازار میں لانے کی کوشش کی گئی، لیکن اگر یہ کاروبار ہی تھا تو نیک آدمیوں کو دُعا کرنی چاہیے کہ ایسے کاروباری لوگ پیدا ہوتے رہیں۔ (جنگ، لاہور، ۹ جولائی ۱۹۸۶ء)

طفیل اور نقوش، من تو شُدم تو من شُدی

ادبی رسالوں کی دُنیا میں ایک اہم جو مدیر

اِنتظار حُسین

محمد طفیل نے پشاور سے لوٹتے ہوئے اسلام آباد میں پڑاؤ کیا، رات گئے تک دوستوں سے ہنستے بولتے رہے، ٹی وی دیکھتے رہے پھر میزبانوں سے یہ کہہ کر سو گئے کہ مجھے صبح جلدی جگا دینا کہ میں یہاں سے ٹھنڈے ٹھنڈے نکل جاؤں میزبانوں نے اپنی طرف سے تو انھیں جلدی ہی جگانا چاہا تھا، مگر محمد طفیل نے زیادہ جلدی دکھائی، ان کے جگانے سے پہلے ہی وہ ٹھنڈے ٹھنڈے یہیں دُور نکل گئے۔

محمد نقوش شروع میں صرف اور خالی محمد طفیل تھے۔ نقوش کے وہ صرف ناشر تھے مدیر نہیں تھے۔ نقوش چند سال تک ایک ترقی پسند رسالے کی حیثیت سے احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں نکلتا رہا، پھر پروفیسر وقار عظیم اس کے مدیر بنے، مگر پھر جلد ہی طفیل صاحب نے خود اس کی ادارت سنبھال لی اس وقت یاروں کو کتنا عجیب لگا تھا کہ نامی گرامی ادیبوں کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ناشر کی ادارت میں چلا گیا۔ ناشر کا مدیر بن جانا اس وقت اس پرچے کے لیے بُری فال سمجھا گیا تھا مگر اس ادارت میں اس پرچے کو دیکھتے دیکھتے شہرت اور مقبولیت کے پَر لگ گئے اور طفیل صاحب کی ادارت کے ساتھ رسالہ اس طرح پیوست ہو گیا کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے خوش ہو کر محمد طفیل کو محمد نقوش کہہ کر مخاطب کیا اور طفیل صاحب نے خوشدلی کے ساتھ اس نئے نام کو سینہ سے لگا لیا۔

طفیل صاحب کی ادارت میں آنے کے بعد نقوش کا دامن اچانک بہت وسیع ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے قارئین کا حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا پہلے تو اس کے صفحات میں ان نگارشات کو ترجیح حاصل ہوتی تھی جن پر ایک نظریے کی چھاپ ہوتی تھی، اب یہ تمیز اُٹھا دی گئی اور تحریر کے ادبی معیار کے حساب سے ترجیح روا رکھی گئی۔ یوں پورے ہمعصر ادب کے لیے بھی نقوش نے اپنا ادب پھیلانا شروع کر دیا۔ اور پھر ہمعصر ادب سے بڑھ کر کلاسکی ادب کے لیے بھی نقوش نے اپنا دامن پھیلانا شروع کر دیا شاید ہمارے ادب میں بھی ایسا موڑ آ گیا تھا جب قارئین کا جی نظریاتی ادب سے بھر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی کلاسیکی ادب کے لیے پھر سے مذاق پیدا ہو رہا تھا طفیل صاحب اُردو رسالوں کے باقی تمام مدیروں سے بڑھ کر ذہین ثابت ہوئے۔ ان کی ذہانت یہ تھی کہ ادبی فضا میں اس تبدیلی کو انھوں نے سب سے پہلے سونگھا اور اس کے حساب سے نقوش کو ایک نئے سانچے میں ڈالا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے دیکھتے وہ رسالے جن کا ترقی پسند تحریک کے زمانے میں طوطی بولتا تھا پس منظر میں چلے گئے۔ اب پاکستان سے ہندوستان تک پوری دنیائے ادب میں نقوش کا ڈنکا بجنے لگا۔

طفیل صاحب بڑے مہم جو قسم کے مدیر نکلے۔ اس مہم جو مدیر نے ایسے ایسے خصوصی نمبر نکالے جن کا اب سے پہلے کسی ادبی رسالے کے مدیر نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ طفیل صاحب کی کوئی مہم ناکام نہیں ہوئی اور نقوش کا کوئی خصوصی نمبر فلاپ نہیں ہوا اور رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ نقوش کے خصوصی نمبر بالعموم نکلتے تھے عمومی نمبر کبھی کبھی نکلتا تھا اور یہ خصوصی نمبر اتنے مقبول ہوئے کہ ادب کے اچھے خاصے فیشن میگزین بن گئے کلچرڈ سمجھے جانے کے شوق میں نودولتیوں نے انھیں اپنے ڈرائنگ روموں کی زینت بنا لیا۔ اب تک ادبی رسالہ ادب کا ذوق رکھنے والے ایک محدود حلقہ کی چیز ہوا کرتا تھا، اب وہ نقوش کی صورت میں خاص و عام کی پسند کی چیز بن گیا۔

اس مہم جو مدیر نے ہمعصر ادب پر تابڑ توڑ خصوصی نمبر نکالتے نکالتے کلاسیکی ادب کا رُخ کیا۔ اب مضامین کے مارے وہاں نئے جوڑے جانے لگے۔ نقوش کے خصوصی نمبروں میں ایک نیا ذائقہ پیدا ہو گیا۔ کلاسیکی ادب کے علماء و فضلاء نے شروع میں ان نمبروں پر ناک بھوں چڑھائی، ان میں غلطیاں نکالیں مگر پھر یہی نمبر مستند ٹھہرے اور نقوش ہماری آنکھوں دیکھتے دیکھتے محققوں کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ نقوش ایک وقت میں ہمعصر ادب کا سب سے بڑھ کر ترجمان تھا پھر وہ وقت آیا کہ ہمعصر ادب سے بڑھ کر وہ تحقیقی کاوشوں کا ترجمان بن گیا۔

اس میدان میں بھی طفیل صاحب نے بہت مہمات سر کیں ان کا ایک ایڈونچر اس میدان میں یہ ہے کہ غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر دیوانِ غالب کا ایک نسخہ جو نسخہ امروہہ کہلاتا ہے۔ ہندوستان سے سات تالوں سے نکل کر ان کے ہاتھوں میں پہنچا اور نقوش کے ایک خصوصی نمبر کی شکل میں شائع ہو کر تہلکہ خیز ثابت ہوا۔

اس مدیر کا تازہ ترین کارنامہ نقوش کا رسولؐ نمبر ہے جو جلد در جلد شائع ہوا، اس نمبر کی اشاعت کے ساتھ طفیل صاحب نے ایک نیا علاقہ تسخیر کیا اور مداحوں کا ایک نیا حلقہ پیدا کیا۔ سی ایس پی افسروں کے حلقوں میں تو وہ پہلے ہی مقبول تھے سی ایس پی افسر میدانِ ادب میں اُترتا تھا وہ نقوش کے صفحات میں نمودار ہو کر اپنے سفر کا آغاز کرتا تھا یا یہاں پہنچ کر اپنا سفر پورا کرتا تھا۔ رسولؐ نمبر کی اشاعت کے ساتھ طفیل صاحب اور نقوش کا نام مذہبی حلقوں سے ہوتا ہوا ایوان صدر تک پہنچا، نقوش کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی۔

طفیل صاحب نے اپنے نقوش کے ساتھ علم و ادب کے کتنے علاقے تسخیر کیے، کتنے حلقوں کو اپنا گرویدہ بنایا اور ان کے واسطے سے علم و ادب کی کتنی ترویج ہوئی، ہماری کلاسیکی روایت کے کتنے گوشے جو پس منظر میں چلے گئے تھے پھر سے نمایاں ہوئے۔ طفیل صاحب اور نقوش لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ ایسے رسالے جو اپنے مدیر کے ساتھ اس طرح پیوست ہو گئے ہوں۔ اس کے گزرنے کے بعد پنپا نہیں کرتے۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ نقوش کے ساتھ یہ واقعہ نہ گزرے، کتنا اچھا ہو کہ نقوش جاری رہے محض طفیل صاحب کی یادگار کے طور پر نہیں بلکہ اسی مہم جویانہ قوت کے ساتھ جو طفیل صاحب کی ادارت میں اس کا امتیازی وصف بن گئی تھی۔

(مشرق لاہور، ۱۰ جولائی ۱۹۸۶ء)

محمّد طفیل کی اپنے بارے میں آرار

قدرت اللہ شہاب

میں جب زمانے میں وزارت اطلاعات و نشریات میں سیکرٹری کے طور پر کام کر رہا تھا، ایک روز میرے کمرے میں کابینہ کی اہم میٹنگ ہو رہی تھی طفیل صاحب پہلی بار ملنے آئے اور ایک چٹ پر اپنا نام لکھ کر اندر بھیجا۔ میں نے انھیں پیغام بھجوایا کہ وہ تھوڑی دیر تشریف رکھیں، میں میٹنگ سے فارغ ہوتے ہی حاضر ہو جاؤں گا۔ میٹنگ توقع سے زیادہ طویل ہو گئی۔ اس سے فارغ ہو کر طفیل صاحب کو تلاش کیا تو میرے پی اے نے بتایا کہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ ناراض ہو کر چلے گئے ہیں کہ یہ کیا بد دماغ اور متکبر شخص ہے جو اتنا انتظار کروانے کے باوجود ابھی تک نہیں ملا، مجھے پریشانی بھی ہوئی اور ندامت بھی، چند روز بعد میں خود لاہور گیا، اور انارکلی کی بغل میں ایبک روڈ پر "ادارہ فروغِ اُردو" پہنچا طفیل صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ میری طرف آنکھ اٹھائے بغیر انھوں نے پوچھا "جی فرمایئے، کیا چاہیے"

میں نے اپنا نام بتا کر کہا "میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں" اپنی میٹنگ کے حوالے سے انھیں اپنی معذوری سنائی، تو وہ اُٹھ کر مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور خوشدلی سے میری معذرت قبول کر لی۔

طفیل صاحب سے میری پہلی اور آخری ملاقات :

اس روز سے ۴ جولائی ۱۹۸۶ء تک ہمارے تعلقات نہایت خوشگوار اور برادرانہ رہے۔ ۴ جولائی کو جمعہ تھا شام کے وقت وہ اچانک احسن علی خاں اور بیگم اختر جمال کے ہمراہ میرے ہاں تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں شکوہ کیا "پچھلی بار تم لاہور آئے تھے تو مجھے ملے بغیر واپس چلے گئے تھے میری طرف دیکھو ڈیڑھ دن کے لیے اسلام آباد آیا ہوں لیکن تمھیں ملنا نہیں بھولا" کچھ دیر تک نقوش کے قرآن نمبر کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر اُٹھ کر جانے لگے تو بتایا کہ کل صبح پانچ بجے لاہور روانہ ہو جاؤں گا اس وقت ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ صبح پانچ بجے سے چند گھنٹے پہلے وہ لاہور کی بجائے نیند ہی نیند میں خاموشی سے سفرِ آخرت پر روانہ ہو جائیں گے۔

طفیل صاحب کا ذہن "نقوش" کے بارے میں نت نئے منصوبے بنانے اور رنبھانے میں ہمہ وقت مصروف رہتا تھا جب انھیں خبر ملی کہ مجھے انجمن ترقی اُردو پاکستان کا صدر منتخب کیا گیا ہے تو انھوں نے فوراً ٹیلیفون کر کے مجھے اطلاع دی کہ انجمن کے کتب خانہ خاص کی نایاب کتابوں اور مخطوطات کی بنیاد پر نقوش کا ایک "مولوی عبدالحق نمبر" شائع کرنے کا سوچ رہے ہیں، لیکن زندگی نے انھیں اپنی اس آرزو کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔

طفیل صاحب کی کتابوں سے اقتباسات

غم و غصّہ :

قدرت اللہ شہاب غالباً ۱۹۵۰ء میں نشریات کے سکریٹری تھے۔ میں نیاز مندی کے شوق میں اُن کے پاس پہنچا۔ کارڈ بھجوایا۔ جواب ملا۔ انتظار کیجیے۔ انتظار کیا، بلاوا نہ آیا۔ خون کھولنے لگا۔

یہ رقعہ لکھ کر چلا آیا۔

یہ ناچیز آپ ایسے لاٹ صاحب سے ملنے چلا آیا۔ آپ کو فرصت نہیں مجھے تابِ انتظار نہیں۔

پندرہ دن کے بعد یہ لاٹ صاحب خود میرے دفتر میں آگئے۔ کہنے لگے معذرت کرنے آیا ہوں۔ ایس کی وز میٹنگ ہو رہی تھی۔ آپ سے ملنا مشکل ہو گیا تھا۔

(جناب) ۱۹۶۱ء۔

آج کل :

میرے بارے میں دو رائیں بنتی چلی گئیں۔ کچھ لوگ مجھ سے ارادت رکھتے ہیں یہ ان کی فیاضی ہے کچھ لوگ مجھے دشنام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ ان کے دل کی ناراضگی ہے۔ میں کیا ہوں، کیا نہیں ہوں، اس کا فیصلہ آج نہیں کل ہو گا۔ (جناب)

بُری عادت

میری ایک بُری عادت ہے کہ میں ہمیشہ اُونچے ہاتھ مارتا ہوں۔ مثلاً اپنے زمانہ ادارت کے پہلے ہی دن میں نے چاہا کہ سوائے خدا کے دنیا کے ہر مصنف کی چیز میرے پرچے میں چھپے، یہی وجہ ہے کہ میں نے جان نہ پہچان بڑی بی سلام کے مصداق مولوی عبدالحق کو بھی گرامی نامہ لکھ ڈالا، عرض کیا بندہ نقوش کا ایڈیٹر بن گیا ہے اس لیے آپ کا مضمون بھی اس پرچے میں چھپنا چاہیے

(جناب)

کم فرصتی :

جب میں نے اشفاق احمد صاحب پر چند بے تکلف سطریں لکھی تھیں، اس وقت وہ میری ہی سطح کے آدمی تھے۔ اب یہ مجھ سے اُونچے ہو گئے ہیں اس لیے مجھے ان پر نیا مضمون لکھنا چاہیے تھا۔ جس میں کچھ زیادہ رکھ رکھاؤ ہوتا۔

ہائے کم فرصتی، (جناب)

میں نے شکیلہ سے کہا قصہ یہ ہے کہ میں کسی سے بولتا نہیں ہوں۔ شام آیا صبح چلا گیا۔ یہ سب پڑوسی مجھے صورتاً جانتے ہیں،

کوئی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں، کیا کرتا ہوں کیا نام ہے۔

شکیلہ نے کہا کہ آپ نے اپنے گھر کے باہر اپنے نام کی تختی ہی لگائی ہوتی تاکہ مجھے آپ کے مکان کی تلاش میں دقت نہ ہو۔ میں نے کہا یہ سمجھو کہ نہیں لگائی، اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔

(حبابی)

انکار نہ ہو سکا تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ شکیلہ کو یہ گھمنڈ تھا کہ میں اچھا کھیلنے والی ہوں۔ ادھر اپنی قسمت کہ میں کسی بھی مقابلے میں نہیں ہارا۔ اس سے مات ہوتی تو کیسے ہوتی۔

اُس نے کہا آپ بڑے چپ چپ رہتے ہیں۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ بالکل چپ شاہ ہیں۔ آپ کی خاموشی نے مجھے بور کر دیا ہے۔ اب یہ طے کریں کہ ہم گھڑی سامنے رکھ کر باتیں کریں گے۔ ایک گھنٹہ تم بولو ایک گھنٹہ میں بولوں گی۔ میں نے سراسیمہ ہو کر جواب میں کہا آپا آپ ہی بولتی جائیں مجھے حالات نے بولنا سکھایا ہی نہیں۔ اب تو آپ کے حالات بہت اچھے ہیں انھوں نے کہا میں ماضی کی بات کرتا ہوں بچپن ہی میں آدمی بولنا سیکھتا ہے۔

(حباب)

لکھنے کا انداز:

لکھنے کا ایک انداز تو یہ ہے کہ وہ اتنا سچا ہو کہ پڑھنے والا اُسے جھوٹ ہی جھوٹ جانے۔ ایک انداز وہ ہے کہ وہ اِتنا جھوٹا ہو کہ پڑھنے والا اسے سچ ہی سچ جانے۔ میری دقت یہ ہے کہ میں نہ ایسا جھوٹ بول سکتا ہوں نہ ایسا سچ۔

(مجتبیٰ)

ایسے لوگ جن کے کارنامے موجود اور زندہ ہوں۔ وہ مر نہیں سکتے روپوش ہوتے ہیں، مرتے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں محض اپنے لیے آتے ہیں، جو لوگ دوسروں کے لیے جیتے ہیں وہ نہیں مرا کرتے، بھگت کبیر کہتے ہیں:

کہت کبیر سن دی میری لوئی
ہم نے نہیں مرنا رہے نہ کوئی

اپنی مرضی سے لکھنا:

لکھنا اور لکھتے رہنا میرا مقدر بن چکا ہے۔ مگر ایسا وقت کم ملتا ہے کہ اپنی مرضی سے چند سطریں لکھ سکوں۔ اگر مجھے اپنی مرضی سے چند سطریں لکھنے کی مہلت مل سکتی تو میرا آج بہت سا لکھا آپ کے سامنے ہوتا۔

(مجتبیٰ)

میں بونا ہوں :

اگر شخصیت اور شخصیت نگار دونوں ہی قدآور ہوں گے تو پھر بے چاری شخصیت دم توڑ دے گی شخصیت نگار اُسے پچھاڑ دے گا۔ میں بونا ہوں۔ (جنگ راولپنڈی، مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۶ء)

محمّد طفیل کے خطوط بنام ممتاز مفتی

قدرت اللہ شہاب

عالیجاہ !

سلام مسنون !

آپ نے بڑا تنبیہہ آمیز خط لکھا۔ آپ اپنی طرز پر سوچتے رہیں، مجھے تو وہ خدا خدا نہیں لگتا۔ جو میرا اپنا نہ ہو، جس سے میں اپنے دُکھ سُکھ نہ کرسکوں۔ جس سے میں محوِ گفتگو نہ ہوسکوں۔ پہلے لوگ خدا سے ہم کلام ہونے کے لیے کوہِ طور پر جاتے تھے، مگر کلام تو کرتے تھے۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ میں گناہ گار ہوں۔ اس لیے مجھے ایسا طریقہ استعمال نہیں کرنا چاہیے تو صاحب سُن لیجیے کہ اللہ کے حضور زیادہ تر وہی لوگ زیادہ جاتے ہیں جو زیادہ گناہ گار ہوتے ہیں۔

اللہ مجھ جیسوں سے کہتا ہے میرے پاس آؤ میں تمھارے سارے گناہ معاف کردوں گا۔ اللہ ہم سے ہم کلام ہوتا ہے تبھی ہم جواب دیتے ہیں!..... اے اللہ میں حاضر ہوں۔!

آپ چپ چاپ رہیں، میری عبادت میں خلل نہ ڈالیں۔

محمد طفیل

۱۲ر۱۰ر۸۵

برادرم !

سلام مسنون !

مجھے ارضِ القرآن تک جانا تھا، چلا گیا۔ لوگ تو حج اس لیے کرتے ہیں کہ گناہ دُھل جائیں۔ لیکن جن کے گناہ کثیر ہوں وہ کیا کریں۔؟

مجھے تو ایسا لگتا ہے، جیسا گیا تھا ویسا واپس آگیا۔ البتہ وہ غفور الرحیم ہے میرا کام ختم اس کا شروع ہوگیا۔ بہر حال میرے اعمال خدا کو کتی بار سوچنے پر آمادہ کریں گے کہ یہ کیسا شخص بیچ میں آگیا۔!

آپ کو ستارہ امتیاز سے نوازا گیا، مجھے خوشی ہوئی۔ میرے بجائے آپ صدرِ محترم کے نزدیک ہیں فیتہ اُٹھا لیجیے اور ناپ لیجیے۔

آپ کا محمد طفیل، ۲۳ر۹ر۸۵

بندہ نواز !　　　　سلام شوق !

آپ نے مجھے یاد کیا۔ حج کی سعادت پر ستارہ اِمتیاز ملنے پر یہ سب اس بندہ عاجز پر اللہ کی نوازشیں ہیں ورنہ ناچیز

تو کسی قابل نہیں!

اس دور میں کسی کے لیے کلمۂ خیر کہنا ان ہی کے حصے میں آیا ہے جو اعلیٰ قدروں کے امین ہوتے ہیں۔
میرے لیے دُعا کیجیے گا کہ میں اپنی زندگی کے مشن کو پورا کر سکوں ابھی بڑی پیاس باقی ہے۔!

فقط آپ کا
محمد طفیل ۱۴ر۱۰ر۸۵

بندہ نواز

سلام مسنون!

ان دنوں "قرآن نمبر" کے ساتھ ایک عام شمارہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔ چاہتا ہوں کہ آپ کی کوئی تخلیق عام شمارے کی زینت بنے۔
کیا ایسا ممکن ہے؟
اگر ممکن ہے تو کرم کریں میں انتظار کروں گا۔ مگر زیادہ انتظار نہ کرائیے گا۔
سالنامہ ملا تھا۔ کیسا لگا؟

آپ کا محمد طفیل
۴ر۱۰ر۸۵

(جنگ راولپنڈی ۱۴ر جولائی ۱۹۸۶ء)

انوکھے لوگ

ممتاز مفتی

کام کے لحاظ محمد طفیل اُردو ادب کا الٰہ دین ہے۔ نقوش ان کا دیا ہے جن باہر سے نہیں محمد طفیل کے اندر سے نکلتا ہے۔ بول میرے آقا میں تیرے لیے کیا کروں تو میرے لیے وہ کر دکھا جو دوسرے نے نہ کر دکھایا ہو۔ محمد طفیل عام کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اس جن کو وہ کام چاہیے۔ جس میں چیلنج ہو ان میں ارادہ ہے، عزم ہے ہٹ ہے زیا ہٹ۔ اُردو ادب میں اس نے خاکہ کی بنیاد ڈالی۔ اس صنف کو رائج کیا اس میں پھول پتیاں لگائیں شخصیت کے لحاظ سے محمد طفیل ایک معمہ ہے وہ ایک ایسی آگ ہے جو دھواں نہیں دیتی سلگتی ہے۔ بھڑک کر نہیں جلتی۔

وہ گپت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات اظہار سے بے نیاز ہیں۔ ان کی شخصیت کو سنگھاڑے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اوپر پتے ہی پتے۔ پھل نیچے جو دکھائی نہیں دیتا، دروازے چوپٹ کھلے ہیں، اندر داخل ہونا مشکل ہے۔

شخصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے طفیل چپکے سے چٹی اُٹھاتے ہیں اور زیرلب کہتے ہیں "میں خاکسار ہوں" "میں تو کودن ہی رہا" "شرفا میں سے نہیں ہوں" "معقول نہ بن سکا" "تعصبات میں گھرا ہوا ہوں" "میری خام خیالی یہ ہے" "میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ طفیل کی ذات کے متعلق خام خیالیوں ناچیز راؤں بن آنمیوں سے بچیے۔ ان مجہول بھبیوں میں کھو کر آپ پا نہیں سکتے صرف کھو سکتے ہیں طفیل کو راستہ تلاش کرو قسم کا گورکھ دھندا بننے کا شوق ہے۔ قاری کو جستجو پر آمادہ کرنے کے لیے انھوں نے "میں تو کچھ بھی نہیں میرا کیا ہے" "میری بات چھوڑیے" قسم کے انوکھے سنگار ایجاد کر رکھے ہیں یہ سب توجہ طلبی کے ہتھکنڈے ہیں۔ طفیل کا خلوص مسلم ہے شرط یہ ہے کہ بات ان کی ذات کے متعلق نہ ہو۔

علم نجوم کے متعلق طفیل میں شیر اور دوشیزہ کا اختلاط ہے بلطفیل میں شیر کی دبی دبی تندی ہے غصہ ہے، خود اعتمادی ہے۔ آگے بڑھنے کا جنون ہے۔ نقوش خو لیہ ہے۔ ایسا کام ہاتھ میں لینے اور اسے تکمیل دینے کا جذبہ ہے جو کوئی دوسرا نہ کر سکتا ہو۔ دوسروں کو کھری کھری سنانے کی جرأت ہے اگرچہ الفاظ مخملی ہوں۔

اس کے ساتھ طفیل میں دوشیزہ ایسی جھجک ہے۔ رنگین بیانی ہے حُسن پسندی ہے، لاج کا احساس ہے عجز ہے، قوت برداشت ہے توجہ طلبی ہے لو آف پوزیشن ہے۔ (جنگ راولپنڈی۔ ۱۴ جولائی ۱۹۸۶ء)

A one-man institution

THE death of a dedicated literary figure like Muhammad Tufail, editor of *Nuqoosh*, would have engendered a keen sense of loss in our literary circles at any time but what adds poignancy to it is the suddenness of the tragic event and the fact that Mr. Tufail has left the scene when he was so very actively involved in his literary pursuits. His extraordinary career as the publisher and promoter of a periodical that has acquired a singular position reached its high watermark with the production of a 13-volume Rasool Number—a truly monumental work. This outstanding labour of love and devotion earned him a Sitara-e-Imtiaz and a Hijra Award last year. He was lately reported to hava been busy planning a Quran Special on a similar pattern as the Seerat Number which would have been an equally great contribution. To complete this unfinished work will undoubtedly be the best homage one can pay to his remarkably inspired and noble spirit and the most appropriate prayer for the departed soul.

Tha new path blazed by *Nuqoosh* in taking out voluminous Special Numbers on various aspects of Urdu literature and literary personalities represents an immortal contribution by Muhammad Tufail who will be remembered with great affection and admiration for his dedicated service to our literary journalism. By his untiring efforts and singleminded determination he added a dimension of respectability and permanence to the genre of periodical literature which is generally supposed to be of a passing character. Whether it pertained to Shakhsiat (personalities) or Maktoobat (letters), literary encounters of epic proportions, ghazal selections or short stories, *Nuqoosh* under Mr. Tufail's competent and creative editorship presented a wealth of varied and well-chosen fare rarely found elsewhere. Mr. Tufail's indefatigable energy, disarming humility and persuasive charm worked wonders for the magazine he edited for nearly 35 years. These qualities were also instrumental in providing an effective vehicle of literary expression for many writers of the contemporary times. He has left behind an admirable record of creativity and dedication in the service of Urdu literary journalism—a tradition which deserves to be carried forward if newer possibilities in this field have to be realised and the base of populist literature strengthened.

DAWN KARACHI
July 6, 1986

LITERARY ROUND-UP

MOHAMMAD TUFAIL
THE LEGEND THAT WAS

By Ariel

With the passing away of Mohammad Tufail—alias Mohammad Nuqoosh —Urdu literature has lost one of its most successful publisher—editors.

Mohammad Tufail was one of those publishers who kept himself away from the new trends of literature from the sixties onwards. For him it was the established

writer or poet who could be approached for contributions to his journal. Nuqoosh is one journal which has published number after number.

Mohammad Tufail was the kind of editor who wanted to be sure of the durability of a writers' reputation before deciding whether he could be considered for the honour. He didn't pay much attention to 'modern' writers of the '60s who are now occupying the 'front' seats. Nuqoosh was more for a world which was sought to be elbowed out by the wind of change. Yet, he put up a grand fight.

Dovoted

For the last few years he devoted himself to *Rusool Number* which extended his area of interest as well. He was a perfectionist. He hardly touched a theme without the thought of gaining immortality.

During the last days of his life, as he wrote to me in a letter, he was a bit unhappy over not being invited to the Golden Jubilee Conference of the Progressive Writers held in Karachi in April '86. He wrote to me that "Nuqoosh has always stood by the Progressives and it really pains me to note that it was so easy for the organisers to forget me."

This is only one side of Mohammad Tufail, the editor of Nuqoosh, which had the distinction of being edited by Ahmed Nadeem Qasmi and Hajra Masroor in its early days and it goes without saying that the character of Nuqoosh changed in the porcess.

Nuqoosh was more a research-scholars' journal as far as its prose section was concerned. Hardly any modern or modernist writer has ever appeared in Nuqoosh. Mohammad Tufail didn't like the idea that any writer of eminence should have got his share of eminence without Nuqoosh's helping hand.

One hopes that his son, Javaid Tufail, would keep the torch burning. It is only befitting that Mohammad Tufail's memory should live on. Young Javaid Tufail could make his stamp felt by bringing this magazine in line with modern taste and making its pages available for the new writings which would be reckoned as a departure from the classical or neo-classical character of the magazine.

There is no doubt that the contemporary scene of our literature is dominated by progressive and liberal writers, and there is hardly any journal—including Mushfiq Khwaja's 'Asloob'—which doesn't confirm this impression. Even the Government of Pakistan's 'Urdu' monthly, being edited by Kishwar Naheed doesn't ignore the ruling trends.

'Afkar' is also a progressive periodical as most of its writings represent the healthy trend which respects change. Literature is, in the final analysis, an intellectual activity of identifying the thought-processes of writers embracing, opposing, or ignoring change itself. And, it is only those writers who move from one triad of dialectical movement into another who testify to their existence as relevant to a period. The others recede into the shade and render themselves inconsequential.

Nuqoosh has performed a very important service. It has tried its best to preserve for us some meaningful interactions with the classics, and it has upheld those contemporary attitudes which look down upon change and are reverential towards it. It means that the journal tries to steer itself clear of experimentalism while sticking to healthy notions of life and literature.

I do not want to go into details of numbers, but no library could afford to be complete without Nuqoosh's Numbers. Had others competed with Muhammad Tufail in this

onerous task, it would have been possible to compare his contribution. At the moment there is no one except Muhammad Tufail to undertake a work of such a gigantic proportions. He did it with a lot of gusto. Sometimes his contemporaries fell foul of him on this score, but he kept his cool without caring whether others took his indifference as casually as he would have liked.

What could be the best way of honouring his memory is a simple declaration from the Government that Muhammad Tufail's views on the sustenance and promotion of literature, along with his solid opposition to moves requiring writers to obtain NOCs in the event of their official visits to foreign countries, have been upheld. It is not merely honouring his dead body with floral wreaths which matters, but honouring his endeavours for a completely independent literature which deserved acceptance and implementation.

I know from my few contacts with him that he held the cause of literature very dear to his heart. One may not agree with his views on certain issues, but it is not important compared with the intensity with which he believed in the inalienable right of writers to express themselves.

So, the loss is all the more. Someone who could achieve further heights of glory has gone. Quite a few classical poets needed Nuqoosh's attention. After all, it is not only Mir, Ghalib, Anis and Iqbal who merit our attention. We haven't had any contemporary evaluation of many important poets and writers and the bodies which were supposed to be looking after this particular field are engrossed in contemporary literature and writings.

It is with this feeling of regret that we would have liked to see Mohammad Tufail continue his labour of love in the same meticulous manner with which he undertook all the assignments.

Translations

Anwar Enayetullah is a wellknown writer. He is known for dramas, short stories, music critiques, theatre and some translations. He has been in the field for more than four decades and there is no doubt that he was more popular in the fiftees and early '60s than at present. The reasons could be many but they were not convincing.

It is perhaps his emergence as a free lance writer in English that sapped his creative energies in Urdu. The more he wrote in English, the more he distanced himself from Urdu. It is difficult to remain a bilingul writer in Pakistan. A time comes when one finds constrained to meeting those obligations which bring in money, along with the kudos. That's why the Urdu output of some of our well-known writers in the English language has either come to a grinding halt or is on the last leg of a creative spurt. It is the writers alone who could judge whether they have benefitted more or their readers. But in the case of Anwar Enayetullah, I could say with a bit of confidence that he by choosing to translate Urdu and other Pakistani languages short stories didn't allow his creative faculties to dwindle.

Not much of Urdu—or for that matter other languages' literatures—has managed to elicit attention of English readers and there is hardly any learned body which has devoted its attention to this task. Our neighbouring country—India—has fared better in this regard and there is hardly any good work in any of its national languages which has not found its way in other languages particularly English. Some of the well-known Indian writers are bilingual. They express themselves in English with as much ease as in their own mother tongue. English—in spite of the growing number of English-medium schools—is however, having a lean time in Pakistan and the lead has gone, in

the process, to those writers whose command of English doesn't compare favourably with their command of the indigenous languages, with the result that it is quite seldom that we come across writers competent enough to undertake the task of translating their own work—much less others' work.

Anwar Enayetullah's collection of translations of Urdu stories—This Also Happened—comprising 18 stories is a good work in that a short story writer of repute has lent his creative faculties pressed into service for others. He has translated stories—one each of Ahmed Nadeem Qasmi, Akhtar Husain Raipuri, Amar Jaleel, Anwer Enayetullah, Ashfaq Ahmed, Aziz Ahmed, Ghulam Abbas, Ghulam Rabbani Agro, Hajra Masroor, Intezar Husain, Khadija Mastur, Masud Mufti, Naseem Kharal, Qudrutullah Shahab, Saadat Hassan Manto, Sayyed Anwer, Shafiq-ur-Rehman and Umrao Tariq.

Apart from the fact that some other short story writers could also lay their claims for inclusion in this list it is also in the realm of possibilities that some writers might have been left out not because they were singled out for the purpose, but for the simple reason that their representative work was not accessible.

Anwer has done a good job. As I went on reading and re-reading these translations, I realised that it is exactly endeavours like these which are needed all the more. Some of the short stories of Urdu and Sindhi compare favourably with most languages of the world and that's why long before translations from Urdu poetry could click with foreign readers, the short story had created a room for itself.

Anwer's translations have appeared in New York's quarterly magazine Short Story International. Some important Indian publications have also included Anwer's translations. One wonders why Anwer doesn't undertake more translations—preferably of some novels—and go down in the history of our language as some one who did his best to share the charm and candour of some of our best pens in the field.

EDITORIAL
DAWN KARACHI

July 10, 1986

محمد طفیل — ادبی ریفرنس

دائرہ اسلام آباد

۱۴ر جولائی ۱۹۸۶ء

غضنفر مہدی

میں دائرہ کی طرف سے اس سوگوار تقریب میں آپ کی شرکت کا خیر مقدم کرتا ہوں خصوصی طور پر جناب ملک نسیم احمد آہیر اور جانشینِ طفیل جناب جاوید اقبال کا اور دعا بھی کرتا ہوں کہ خداوندِ کریم انہیں حیاتِ خضر عطا فرمائے اور اپنے عظیم باپ کے نقشِ قدم پر چلیں کہ آپ اس خصوصی ادبی ریفرنس میں تشریف لائے۔ ان ادبی ریفرنسوں کا سلسلہ ادبی تنظیم دائرہ نے ہی شروع کیا تھا اور اس وقت ہم اپنے عظیم دوست اور ادبیات کے عظیم مُجاہد اور ادبی قافلے کے سالار محمد طفیل مرحوم و مغفور کی یاد میں یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ایڈیٹر نقوش کی حیثیت سے اور سالارِ قافلۂ ادبا کی حیثیت سے محمد طفیل مرحوم کا نام ہمیشہ ہمیشہ ادبی برادری میں یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے اتنے اَمٹ نقوش چھوڑے ہیں کہ ان کا ایک ایک نقش ادیبوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا رہے گا، خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اس ریفرنس کا مدعا و مقصد یہ ہے کہ جتنے بھی احباب اُٹھے ہیں۔ وہ کم سے کم وقت میں انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یہاں سے تشریف لے جائیں اور اس ریفرنس کا دائرہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک مقرر کے لیے دو منٹ اور اس سے بڑھ کر تین منٹ۔ جناب صدیق سالک کا نام اکثر مقررین میں شامل نہیں ہوتا، اس لیے میں نے انہیں ۳ منٹ کا وقت دیا ہے، لیکن باقی احباب کے لیے اور جتنے میرے بزرگ بھی ہیں اس گستاخی پر معاف فرمائیں کیونکہ انکے لاہور سے احباب بھی یہاں تشریف لائے ہیں، اور مقصد یہ کہ ہم اس ثواب میں بھی شریک ہو سکیں اور مرحوم کو خراجِ عقیدت بھی پیش کر سکیں اور میں نے جو مضمون لکھا تھا، وقت کی قلت کے پیشِ نظر اسے نہیں پڑھتا۔

اَب میں سب سے پہلے دائرہ کے صدر جناب عنایت کبریا سے کہوں گا کہ وہ تشریف لائیں اور اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں۔

عنایت کبریا

جناب جاوید طفیل صاحب، جناب نسیم آہیر صاحب وزیرِ تعلیم اور خواتین و حضرات! مجھے طفیل صاحب سے ملنے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ادب سے کٹا ہوا ایک انسان ہوں، لیکن جب بھی ملا۔ اُنہوں نے بڑی

شفقت کے ساتھ مجھے حوصلہ دیا اور میں ہمیشہ ان کو یاد کرتا رہوں گا احسان مندی کے ساتھ، مجھے یہ کہنا ہے کہ طفیل صاحب کی یادوں کے طفیل ہم آج یہاں ہیں اور جب تک اردو ادب میں اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ مبارک زندہ رہے گا، اس حوالے سے اور بالخصوص سیرتِ رسولؐ کے حوالوں سے طفیل صاحب کا ذکر ہمیشہ ہمیشہ اس دنیا میں جاری رہے گا۔ دوسری جہت جو مجھے طفیل صاحب کے بہت قریب لے آتی ہے اور مجھے ان پر رشک بھی آتا ہے وہ یہ ہے کہ میرے دل میں بھی ایک عرصہ سے یہ تمنا رہی ہے کہ خدا تعالیٰ مجھے ۶۳ سال کی عمر میں اس جہان سے اُٹھا لے، لیکن ان میں بھی اس کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی کہ مجھے اور زندہ رہنے کا موقع دیا ہو لیکن طفیل صاحب فقط ۶۲ سال اس دنیا میں گزار کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں، اور یہ ان کی رسولِ مقبولؐ کے ساتھ ایک نسبت قائم ہے، جو میرے نزدیک بڑی اہمیت کی حامل ہے، تیسری جہت طفیل صاحب کے بارے میں یہ بنتی ہے کہ انہوں نے احیائے اسلاف کا جو بھی کام کیا ہے، تو وہ حکومت کی سرپرستی سے علیحدہ ہو کر کیا ہے اور اس لیے ان کی یہی بات میرے لیے باعثِ فخر ہے۔

محسن احسان

ایک ایک کر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئے

ہائے کیا لوگ میرے حلقۂ احباب میں تھے

محمد طفیل کو میں ۱۹۴۸ء سے جانتا تھا۔ اس وقت یہ نقوش کے ایڈیٹر نہیں تھے بلکہ جناب احمد ندیم قاسمی صاحب تھے۔ محترمہ حاجرہ مسرور بھی ان کے ساتھ کام کرتی تھیں۔

میں نقوش میں غالباً ۱۹۵۱ء یا ۱۹۵۲ء سے چھپنا شروع ہوا، اور اس وقت سے لے کر آخری وقت تک میرے ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات استوار رہے۔ ان کی ساری زندگی محنت و مشقت اور کاوشوں سے بھرپور زندگی ہے۔ انہوں نے بہت معمولی کام سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن ادبی دنیا میں بہت بڑے کارنامے سرانجام دیے۔ ایک طرح سے نقوش کو ادب کی انجیل کہا جا سکتا ہے، انہوں نے کئی اہم ادبی دستاویز مختلف اوقات میں مرتب کیں اور ادب کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ ان کے کارناموں میں کئی خاص ادبی نمبر ہیں، غزل نمبر، مکاتیب نمبر، لاہور نمبر، منٹو نمبر، پطرس نمبر، کئی افسانے نمبر، عصری ادب نمبر اور آخری ان کا کارنامہ رسولؐ نمبر ہماری فکری تاریخ کی بہت بڑی دستاویز ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا رخصت ہونا نہ صرف ادبی جرائد کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا کرتا ہے بلکہ ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی ہم ایک بہت اچھے خاکہ نگار سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان کی کتابیں آپ، جناب، مکرم، محترم، آپ معظم، محبی اور مخدومی ان کے ہمعصر ادیبوں کی دلچسپ اور دلکش خاکے تھے، جن کو جاننے کے باوجود ان خاکوں میں ایک نیا انداز، ایک نئی فکر اور ایک نیا رجحان ہمیں ملتا ہے۔

انہوں نے بعض شخصیتوں کے ایسے نرم و نازک گوشے پڑھنے والوں کے سامنے رکھے، جو اس شخصیت کو جاننے کے باوجود ان کے احباب کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے، یہ محمد طفیل صاحب کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے' جو انہوں نے اُردو خاکہ نگاری کو ایک نیا رُخ عطا کیا اور آخر میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

عبدالکافی ادیب

مہمانانِ گرامی! معزز خواتین و حضرات!

مَیں محمد طفیل مرحوم کی عمر بھر شناسائی کا دعوے دار تو نہیں ہوں۔ البتہ نقوش کے توسط سے میرے اور طفیل مرحوم کے درمیان ایک پیارا سا رشتہ ضرور قائم تھا جس کی وجہ سے مجھے ان سے ملاقات کرنے کا شوق تھا، اور میری یہ آرزو ۱۹۷۴ء میں پوری ہوئی، جب مَیں پاکستان رائٹرز گلڈ کے انتخابات میں پشاور زون کے لیے مجلس عاملہ کا رکن منتخب ہُوا تھا۔ جبکہ پنجاب زون سے جناب محمد طفیل صاحب کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ ان دنوں میرا اسلام آباد میں ایک سرکاری پرچے سے رابطہ تھا۔ ایک دن اخبارات کے ذریعے مجھے معلوم ہُوا کہ لاہور کے چند ادیبوں نے جناب محمد طفیل کو گلڈ کے سیکرٹری جنرل کے عہدے کے لیے نامزد کیا ہے، تو مَیں نے طفیل صاحب کو پہلی مرتبہ خط لکھا کہ سیکرٹری جنرل کے عہدے کے لیے لاہور کے ادیبوں کے حسنِ انتخاب کی داد میں بھی دیتا ہُوں۔ براہِ کرم مجھے بھی ان میں شامل سمجھیے گا چوتھے یا پانچویں روز میرے دفتر میں دو حضرات آئے جو میرے لیے اجنبی تھے۔ ان میں ایک نے اپنا تعارف محمد طفیل کہہ کر کرایا طفیل صاحب نے کہا کہ آپ کا خط مِلا، تو میں نے یہ سوچا کہ آدھی ملاقات کی بجائے مَیں پوری ملاقات سے کیوں نہ فیض یاب ہو جاؤں۔ سو چلا آیا اور اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اس موقع پر بہت ساری باتیں ہوئیں۔ جاتے ہوئے طفیل صاحب نے کہا کہ مجھے سرحد کے ادیب بے حد عزیز ہیں' ان میں اب آپ بھی اپنے آپ کو شامل سمجھیے۔ مَیں نے اپنے طور پر انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا کہ جناب میں بھی وفاداری بشرطِ استواری کے اصول کا پابند ہوں' بعد میں آنے والے چند برسوں میں ہم دونوں نے اپنے اپنے وعدے پورے کر کے دکھائے۔ محمد طفیل مرحوم نے جو گلڈ کی خدمت کی ہے۔ وہ گلڈ کی تاریخ کا ایک سنہری باب بن چکا ہے اور میں نے اپنے طور پر وفاداری کا بھرم قائم رکھا۔ طفیل صاحب مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کے کام آئے۔ جی تو چاہتا ہے کہ ان کی تمام خوبیوں کو گنتا چلا جاؤں اگر مجھ کو وقت کا پابند کر دیا گیا ہے

سرفراز اقبال

سکھ سانجھے ہوتے ہیں، جبکہ دکھ اپنے اپنے ہوتے ہیں' محمد طفیل کی موت کے دکھ کو ہر کسی نے اپنے قلمکار کی نوعیت کے لحاظ سے محسوس کیا ہوگا، لیکن اردو ادب اس دکھ کو کیسے برداشت کرے گا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتلائے گا۔ محمد طفیل ایک بہت بڑا اسکالر تھا، مصنف تھا خوبصورت ادب کو ایک ایک جگہ جمع کرنے کا اسے خوب ڈھنگ آتا تھا، جو محمد طفیل

سے محمد نقوش بن کر اردو ادب میں سدا کے نقوش چھوڑ کر نقوش کو بیوہ کر گیا ہے۔ دائم آباد رہے گی یہ دنیا، ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا، لیکن طفیل جیسا شخص مشکل سے ہی پیدا ہوگا۔

اختر امان

جنابِ صدر، طفیل صاحب کے بارے میں جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ تو میں کسی حد تک کہہ چکا ہوں، لکھ کر بھی کہہ چکا ہوں پھر بھی عضنفر مہدی صاحب نے یاد کیا اور میری اپنی بھی خواہش تھی کہ میں اس موضوع پہ کچھ بات کروں۔ دو باتیں کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ جب بھی پاکستان میں کوئی ادیب یا فنکار وفات پاتا ہے، تو بالعموم ہم یہ کہتے ہیں کہ ادب میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ کسی حد تک تو یہ بیان بہت سے ادیبوں کا، دوستوں کا درست ہوتا ہے، لیکن مجموعی طور پر جس طرح خدا کا یہ نظام ہے۔ اس میں ہر آدمی کی اپنی حیثیت ہوتے کے باوجود کسی کے چلے جانے سے کوئی خلا پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ کوئی نہ کوئی انسان ضرور پیدا ہوتا ہے، جو اپنے سے پہلے انسانوں کی قائم کردہ روایات کو آگے لے کر چلتا ہے اور پھر اس میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، لیکن طفیل مرحوم کے بارے میں جب میں یہ سوچتا ہوں، تو مجھے یہ فقرہ کسی حد تک صحیح محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے وفات پا جانے سے واقعتاً ادب اور بالخصوص ادب کی صحافت میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے اسکی وضاحت میں کچھ اس طرح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے ادبی منظر کو دیکھیں، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پاکستان کا ادبی منظر کچھ خالی خالی کچھ سونا سونا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کیونکہ قیامِ پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک پاکستان کے جتنے بھی بڑے بڑے سُپر سٹار تھے، جنہوں نے آزادی سے پہلے زندگی گزاری تھی اور آزادی کے بعد انہوں نے مختلف حالات کو دیکھا تھا جدوجہد کے ذریعے انہوں نے اپنی اور دوسروں کی زندگی پہ گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ توفیق صاحب کو دیکھ لیں۔ حفیظ جالندھری مرحوم کو دیکھ لیجیے۔ احسان دانش تھے۔ اس کے بعد جوش ملیح آبادی میں مختلف نظریات کے مختلف خیالات کے لوگ تھے۔ لیکن یہ لوگ پاکستان کا ایک بہت بڑا ادبی سرمایہ تھے۔ اب طفیل صاحب ہم سے رخصت ہوئے ہیں، تو آپ یقین کریں کہ وہ خلا جو پہلے ان سے جانے والوں کی وجہ سے محسوس ہو رہا تھا، وہ اب اور زیادہ گہرا اور زیادہ سونا ہو گیا ہے، معلوم نہیں کہ میں اب کن الفاظ میں اس موضوع پر بات کروں، جیسا کہ ابھی ابھی میرے بھائی جاوید صاحب فرما رہے تھے کہ انہوں نے نقوش کے حوالے سے جو خدمات انجام دی ہیں، بطورِ ادیب تو بہت سی باتیں ہوں گی اور ہوتی رہیں گی کہ بطورِ ادیب کے بطورِ خاکہ نگار کے ان کا کیا مقام تھا، وہ تو ایسی باتیں ہیں، جو چلتی رہتی ہیں اور چلتی رہیں گی۔ لیکن بطورِ ایک ایڈیٹر کے اور نقوش کے مدیر کے ان کا جو مقام ہے، وہ انتہائی UNDISPUTED مقام ہے اور شاید یہ خلا ہم میں سے کوئی بھی پُر نہ کر سکے گا۔

آغا ناصر

ایک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ جب سے یہ دنیا قائم ہے موت اور زندگی کا کھیل جاری ہے۔ روز

ہی لوگ مرتے ہیں، لیکن جب کوئی بڑا آدمی مرتا ہے، جب کوئی ایسا آدمی مرتا ہے، جس نے اپنی قوم، اپنی ملت، اپنے ملک اور اپنے معاشرے کے لیے کچھ ایسے کام کیے ہوں، جو یاد رکھے جانے چاہئیں، تو پھر سوگواروں کی ایک ایسی محفل منعقد ہوتی ہے جیسی آج منعقد ہے طفیل صاحب کا نام ان کی شخصیت ان کا کام پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات ان حلقوں میں شدید صدمے کا باعث ہوئی طفیل صاحب سے ہماری یاد اللہ پچھلے بیس پچیس سال سے ہے لاہور میں بھی ملاقاتیں ہوئیں اسلام آباد میں بھی وہ آتے تو تب بھی ان سے ملاقات رہتی تھی، ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں اور یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے لیکن دو تین باتیں وہ سب کو معلوم ہیں لیکن ان کا اعادہ اتنا غلط بھی نہ ہوگا کہ سب سے پہلے آج سے کوئی تیس بتیس برس پہلے بحیثیت ایک ایڈیٹر کے وہ علمی اور ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے اور اس وقت ان کے ساتھ ادارت میں بڑے بڑے نام شامل تھے اور بڑی بڑی ادبی شخصیتیں اور مقبول ادیب لیکن رفتہ رفتہ یہ بوجھ انہوں نے تنہا اُٹھایا اور پھر ایک نئی روایت اور ایک نئی طرح ڈالی اور بحیثیت ایک ایڈیٹر کے متعارف ہوئے لیکن یہیں یہ بات ختم نہیں ہوتی پھر کچھ عرصے بعد وہ ایک ادیب کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں ایک ایسا ادیب جو ہلکے پھلکے خاکے بھی لکھتا ہے اور پھر سنجیدہ تحریروں کی طرف بھی جاتا ہے یہ ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو تھا اور پھر ایک ایسے آدمی کی حیثیت سے جس میں بڑی تنظیمی صلاحیتیں ہوں بڑے اچھے منتظم کی حیثیت سے "پاکستان رائٹرز گلڈ" کے سیکرٹری جنرل ہونے کے بعد جو خدمات انہوں نے انجام دیں یہ کچھ ایسی خصوصیات تھیں جو ایک عام آدمی میں نہیں ہوا کرتیں کوئی نہ کوئی پہلو ہر ایک انسان میں کمزور ضرور ہوتا ہے لیکن ان کے ہاں یہ بات میں نے دیکھی اور محسوس کی کہ ان تینوں پہلوؤں سے آپ ان کی شخصیت کو دیکھیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ وہ ہر سمت میں ایک انتہائی کامیاب انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں بہت سی تقریریں ہوئیں ہیں بہت سے مقالے پڑھے گئے ہیں اور پڑھے جائیں گے اور لکھے جائیں گے اور یہ کہا گیا کہ خلا پیدا ہو گیا اور یقیناً یہ ایک خلا پیدا ہو گیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی جب مرجاتا ہے جو پیچھے اتنا کچھ چھوڑ کے گیا ہو، تو یہ بڑی تسلی کی بات ہوتی ہے ان لوگوں کے لئے بھی جو پیچھے رہ گئے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے پیچھے اتنا کچھ ابھی چھوڑ گئے ہیں کہ اگر لوگ کام کرنا چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ چونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ وہ کرتے تھے وہ ایک شخص کے کرنے کا کام نہیں تھا انفرادی کام نہیں تھا بلکہ انہوں نے ہمیشہ ایسے کام اپنے ذمے لئے جو اداروں کے ذمے ہونے چاہئیں۔ مثلاً ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ جو رسول نمبر کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اس طرح کے کام بڑے بڑے (INSTITUTIONS) اور بڑے بڑے ادارے کیا کرتے ہیں اور اب جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں اور ہمارے سامنے ان کے وہ بہت سے منصوبے ہیں جو وہ کرنا چاہتے تھے اور مکمل نہیں ہو سکے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس خلا کو پُر کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان کاموں کو جن کو وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں یا ان کاموں کو جن کی وہ منصوبہ بندی کر رہے تھے ان کاموں کو پاکستان کے ادبی حلقوں سے علمی حلقوں سے جو کہ اس قابل ہیں کہ انہیں مکمل کر سکیں۔ وہ اسے مکمل کریں اور میرا خیال ہے یہی سب سے بڑی خدمت اور یہی سب سے بڑا خراج عقیدت ہوگا طفیل صاحب کے لئے۔

پروفیسر کرم حیدری

جناب محمد طفیل کی زندگی کے متعلق جب میں غور کرتا ہوں کہ اُنہوں نے ایک طویل زندگی گزاری ایک بھرپور زندگی گزاری ایک شب و روز محنت کی زندگی گزار میرے خیال میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے جس کام کو اپنایا اس کام میں اتنی محنت کی جتنی کہ طفیل صاحب نے ادب کے لئے اور بالخصوص نقوش کے لئے ادب کی خدمت کی ہے یہ تو سب کو معلوم ہے کہ نقوش اور طفیل دونوں ایک ہی چیز ہیں اور عام طور پر لوگ انہیں محمد نقوش بھی کہا کرتے تھے میرا ان سے تعلق آج سے تقریباً چوبیس سال پہلے کا ہے جبکہ پہلی بار وہ رائٹرز گلڈ کے الیکشن کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہوئے اور اُنہوں نے مجھے بھی ایک خط ازراہ نوازش لکھا اور اس سے پہلے میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس کے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی لیکن میں ان کے کام کو جانتا تھا۔ ان کے نام کو جانتا تھا ان کی شخصیت سے واقف تھا۔ اور مجھے یہ خوشی ہے کہ ہمیشہ جب اُنہوں نے رائٹرز گلڈ کے لئے یا کسی ELECTION کے لئے اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کیا تو میں نے بلا پس و پیش اپنا ایک ووٹ اپنے ایک دوست کو دیا۔ اور پچھلی مرتبہ میرے ایک دوست ڈاکٹر مطلوب حسین نے مجھ سے پوچھا کہ یار ووٹ آپ نے کس کو دیا میں نے کہا جو شخص طفیل محمد ہمارے پاس آتا ہے ہم اس کے سوا اور کس کو ووٹ دے سکتے ہیں۔ وہ محمد طفیل تھے مگر میں سمجھتا ہوں کہ طفیل محمدی وہ بخشے جائیں گے کیونکہ اُنہوں نے عظیم کارنامہ نقوش کے رسولؐ نمبر کی صورت میں سرانجام دیا ہے وہ ایک فرد واحد کا کارنامہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک پورے ادارے کا کارنامہ ہے جو اس فرد واحد نے انجام دیا ہے اور یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ میں بعض اوقات سوچتا ہوں کہ اس شخص کو اللہ نے کس طرح اتنی ہمت دی کہ تیرہ ضخیم جلدوں میں رسولؐ نمبر مرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہم سمجھتے تھے کہ اس سے پہلے سیرت النبیؐ لکھی مولانا شبلی نعمانی اور سلیمان ندوی نے۔ تو وہ بہت بڑا کارنامہ تھا لیکن وہ بھی اتنا ضخیم کارنامہ نہیں جتنا کہ نقوش کا رسولؐ نمبر کا ہے اور پھر اپنی زندگی میں اُنہوں نے ادب کی بڑی خدمت کی، نقوش کے نمبر نکالے۔ میر نمبر ہے غالب نمبر ہے شخصیات نمبر ہے۔ مکتوبات نمبر ہے کیا کیا نمبر ہیں جو اُنہوں نے نکالے اور کتنے خوبصورت انداز میں اور پھر یہ ہے کہ رسالہ اس انداز سے مرتب کرتے تھے کہ اس میں کتابت کی غلطی جو ہے، وہ بھی نہیں نکلتی تھی۔

مجھے کم از کم بہت کم نظر آئی ان کے ہاں کتابت کی کوئی غلطی ہو گی کیونکہ اسے نہایت محنت سے وہ دیکھتے تھے پروف ریڈنگ بھی خود کرتے تھے اور اول سے لے کر آخر تک تمام کام اپنی نگرانی میں سرانجام دیتے تھے جس کی وجہ سے اتنے خوبصورت رسالے انہوں نے نکالے کہ نہ صرف پاکستان میں نہ صرف برصغیر میں بلکہ میرا خیال ہے کہ عالمی ادب میں اُنہوں نے ایک نہایت اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ اردو ادب کا وہ نمونہ جو ہے آج بھی ہمارے لئے باعث فخر ہے میں مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح علامہ شبلی نعمانی نے کہا تھا۔ وہی بات طفیل صاحب پر بھی صادق آتی ہے کہ اُنہوں نے عرب کی مدح لکھی۔ عجم کی مدح لکھی۔ عباسیوں کی داستانیں بھی لکھیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

صدیق سالک

صدرِ محترم اور عزیزم جاوید اور خواتین و حضرات، میری خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی کہ مجھے زندگی میں جتنے بھی لوگ ملے، پکی عمر کے ملے۔ بہت عرصہ پہلے میں نے ضمیر جعفری پر ایک مضمون پڑھتے ہوئے کہا تھا کہ ضمیر جعفری کا نام ہم نے اس وقت سنا کہ جب ہمارے دانت دودھ کے تھے لیکن ضمیر جعفری سے دوستی کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب ان کے مضبوط دانت بھی گرنے لگے اس جملے کا یہ مقام تو نہیں ہے کیونکہ یہ ایک بڑا سوگوار جلسہ ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جتنے بھی دوست دیئے وہ سارے کے سارے ہی عمر میں اور ادب میں مجھ سے سینئر تھے۔

ممتاز مفتی۔ ضمیر جعفری۔ شفیق الرحمٰن۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ بریگیڈیر گلزار اور کرنل محمد خان اللہ تعالیٰ ان سب کو زندہ اور سلامت رکھے۔ لیکن ان میں سے چند ایک یکے بعد دیگرے اُٹھتے جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے، اس تمہید سے یہ مقصد تھا کہ میں طفیل صاحب سے عمر بھر کی دوستی کا دعویدار نہیں ہوں۔ تعلق ضرور تھا واقفیت ضرور تھی لیکن تعلقات میں گہرائی پچھلے دس پندرہ سال میں آئی۔ اور میں جو دو تین باتیں مختصر طور پہ عرض کرنے لگا ہوں وہ صرف ان دس پندرہ سالوں پر محیط ہیں اس سے پہلے کی ابتدائی زندگی کے بارے میں میرا علم بہت قلیل ہے۔ میں نے ان دس پندرہ سالوں میں محسوس کیا کہ طفیل صاحب نے بڑے بڑے کام کئے لیکن اُنہوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا رسولؐ نمبر ترتیب دیتے وقت جاوید صاحب گواہ ہیں کہ ان پر کچھ مشکلات آگئیں مالی طور پہ اتنے خوشحال نہیں تھے کہ تیرہ جلدوں پر مشتمل رسولؐ نمبر بیک وقت چھاپ سکتے تو ایک دن ذکر ہوا تو میں نے اشارۃً کہا کہ آپ اس کے لئے حکومت سے یا کسی شعبے سے یا کسی بنک سے کسی طرح کی معاونت کیوں نہیں لے لیتے تو اُنہوں نے کہا کہ رہنے دیں۔ میں نے بہت پہلے تہیہ کیا تھا کہ ایک دفعہ رسولؐ نمبر ضرور نکالوں گا اور غالباً اللہ تعالیٰ نے مجھے مہلت بھی اس لئے دے رکھی ہے کہ میں رسولؐ نمبر چھاپ کر یہاں سے جاؤں۔ میں ان شاء اللہ ضرور چھاپوں گا۔ ہاں اگر حکومتِ وقت اس کارِ ثواب میں شریک ہونا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں کسی طرح کی مالی امداد کا خواہشمند نہیں ہوں تیرہ جلدیں چھاپنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور یہ کام اُنہوں نے تن تنہا انجام دیا۔ تنہا صرف مرتب کرنے کی حد تک نہیں بلکہ اسے شائع کرنے کی حد تک اسے بیچنے کی حد تک اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کی حد تک۔

جیسا کہ اس اجلاس میں پہلے بھی ذکر ہوا کہ اہنوں نے زندگی کی دوڑ بہت پیچھے سے شروع کی تھی لیکن وہ ہم سب سے آگے نکل گئے۔ اور ہم سب گواہ ہیں کہ جب اُنہوں نے زندگی کی یہ دوڑ شروع کی تھی تو ان کے پاس زندگی کے مروجہ سہارے نہیں تھے یعنی دولت نہیں تھی مروجہ قسم کی روایتی تعلیم بھی نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے زندگی میں بہت کام کیا دنیائے ادب میں اپنا اونچا مقام پیدا کیا اور میرے خیال میں اس میں ان کے کل اثاثے دو تھے۔ ایک ان کی ذہانت۔ دوسری ان کی محنت، اور کوئی تیسرا اثاثہ نظر نہیں آتا۔ اور کبھی کبھی ان کی زندگی کو پڑھتے ہوئے اور دیکھتے ہوئے مجھے فرہاد کا

قصہ یاد آجاتا ہے کہ جس نے تیشے کے سہارے جوئے شیر کا کٹھن کام انجام دیا لیکن یہ فرہاد سے زیادہ خوش قسمت نکلے لیکن اسے تو اپنی محبوبہ نہ مل سکی۔ لیکن طفیل صاحب نے جس مشن کے لئے اپنی زندگی وقف کی تھی اس کو انہوں نے اپنی زندگی میں پورا کر دکھایا اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت خوش قسمت انسان تھے ذاتی طور پر جو کچھ میں نے دیکھا اس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے لیکن میں اُن کا ایک نیا رخ پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یوں ہے کہ عام طور پر ہر مرنے والوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت عظیم انسان تھے کہ وہ ہر قسم کی نفرتوں اور محبتوں سے بالاتر تھے وہ کسی کی پروا نہیں کرتے تھے طفیل صاحب ایک نارمل انسان کی طرح اپنے بہت سے دوست اور دشمن رکھتے تھے۔ ان کے دل میں محبتیں، امیدیں، حسرتیں، امنگیں ہوتی تھیں۔ اور ان پر پتھر پھینکنے والے بھی بہت تھے اور پھول پھینکنے والے بھی۔ لیکن جب بھی کبھی نفرت کی کنکریاں پھینکی گئیں۔ وہ ساری کی ساری براہ راست ان کی محبت کے سمندر کی تہ میں جذب ہو جاتی تھیں جب بھی انہیں دیکھا کہ وہ سطح آب کو ہموار رکھنے کے قائل تھے کسی نے کوئی بات کہہ بھی دی تو اسے نظر انداز کر دیا۔ اور جتنی دفعہ بھی میرا ان سے ملنا ہوا نجی ڈرائیوران کے ہاں یا میرے ہاں میں نے ان کے منہ سے کسی کے خلاف کوئی کلمہ نہیں سنا۔ حالانکہ ادبی سیاست، دوسری سیاست کی طرح ایک ایسا خاردار میدان ہے۔ کہ یہاں کوئی بھی کسی کو SPARE نہیں کرتا حالانکہ وہ الیکشن بھی لڑے اور گلڈ کے جھمیلوں میں بھی پڑے۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے کبھی بھی کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کہی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑے ظرف کی بات ہے اور آخری گذارش یہ ہے کہ یہاں ان کو بہت ہی اچھے اچھے الفاظ میں خراج پیش کیا گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کو خراج پیش کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ نقوش کو زندہ رکھا جائے۔ قرآن نمبر کے متعلق ان کے منصوبے بہت عظیم تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ رسول نمبر سے بڑھ کر قرآن نمبر شائع کریں گے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ہم ادیب یا قلمکار قرآن نمبر کو مرتب کرنے میں ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں لیکن نقوش بنیادی طور پر ایک ادبی پرچہ ہے اور اسے زندہ رکھنے میں یقیناً ادیب بہت بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ایک کمیٹی بنی تھی، نقوش ایوارڈ کمیٹی جس میں بڑی برگزیدہ ہستیاں موجود ہیں، میری تجویز یہ ہے کہ نقوش ایوارڈ کمیٹی کو اپنا کام ختم نہیں کرنا چاہئیے بلکہ اس پر غور کرنا چاہئیے کہ جس کے لئے یہ ایوارڈ مقرر ہوا تھا اگر وہ مر گیا تو یہ ایوارڈ کیسے زندہ رہے گا۔

لہٰذا نقوش کو زندہ رکھیئے اور پھر نقوش ایوارڈ کی رسم بھی جاری رہ سکے گی لہٰذا پہلی میٹنگ میں نقوش ایوارڈ کمیٹی صرف اس بات کے لئے وقف کر دے کہ نقوش کو زندہ رکھنے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ طفیل مرحوم کو یہ سب سے بڑا خراج ہو گا۔

احمد سعید کرمانی

شروع کرتا ہوں اللہ کے پاک نام سے۔

جناب صدر معزز خواتین و حضرات مجھے اعتراف ہے کہ میں عظیم نہیں ہوں میں ایک بے عمل دینی رجحانات رکھنے والا شخص ہوں لیکن میں اس محفل میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے حاضر ہوا ہوں جب میں نے طفیل مرحوم کے متعلق سنا کہ وہ انتقال فرما گئے ہیں تو جو مجھ پر گزری اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں آج کی اس محفل میں شرکت کروں۔ جناب صدر

کا ارشاد یہ ہے کہ مختصر بات کی جائے اور طویل بات نہ کی جائے طویل بات کتنی آسان کام ہے مختصر بات کرنی بڑا مشکل کام ہے میں کوشش کروں گا کہ اس مشکل کام کو اپنے لئے آسان کر پاؤں طفیل صاحب سے میرا تعلق کافی عرصے کا نہیں ہے میں ان کو پہچانتا ضرور تھا اب ایک دو سال سے انہیں جانتا تھا ایک روز عدالت میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد میں ہائی کورٹ کی ساتھ والی مسجد میں گیا دیوار پر میں نے پڑھا کہ نقوش نے رسول نمبر مکمل کر لئے ہیں میں اس سلسلے میں ان کے دفتر گیا اور باتوں باتوں میں، میں نے انہیں کہا کہ میری زندگی میں ایک ایسا شخص گذرا ہے جو رسولؐ پاک کی حیات طیبہ پر گھنٹوں نہیں، دنوں نہیں مہینوں بول سکتا ہے طفیل صاحب نے فرمایا وہ کون صاحب ہیں، میں نے کہا مرحوم سردار عبدالرب نشتر باتیں چلتی رہیں ان کا تذکرہ کرتا رہا تو میں نے محسوس کیا ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں ان کی زبان آنکھیں بھی تھیں وہ آنکھوں میں بات کرتے تھے پھر میں کبھی کبھار اپنی معروفیات سے جان چھڑا کر ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ اور پھر میں نے باقاعدگی کے ساتھ ان کی دیگر کتابوں کا مطالعہ شروع کیا میں نے محسوس کیا کہ وہ تحریر میں تقریر نہیں کرتے تھے بلکہ گفتگو کرتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو تحریر میں بھی تقریر کرتے تھے میری مراد دی گریٹ، مولانا ظفر علی خاں۔ دی گریٹ محمد علی جوہر۔ لیکن جن لوگوں نے تحریر میں تقریر نہیں کی بلکہ گفتگو کی ہے ان میں آپ آسانی کے ساتھ طفیل صاحب اور سر عبدالقادر کا نام لے سکتے ہیں انہوں نے بھی تحریر میں گفتگو کی ہے اور اپنا اثر چھوڑا ہے۔ انہوں نے رسولؐ نمبر چھاپ کر نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی خدمت انجام دی ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک قیمتی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ان نوجوانوں کو اپنی منزل اور اپنی راہ و منزل متعین کرنے کے لئے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئے گی یوں تو ایک زمانے کی تحریروں کو اکٹھا اور یکجا کرنا اتنا سہل کام نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی کٹھن اور مشکل کام ہے کہ وہ تحریریں جو صدیوں پہ پھیلی ہوں ان کو یکجا کیا جائے کہنے والے کہتے ہیں کہ حضورؐ پاک کی حیات طیبہ کے متعلق اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ابن ہشام کی کتاب سمیت اس کا مقام اس سے بھی بہت اونچا ہے شبلی نعمانی کا کام خوب تھا سلمان منصور پوری نے بھی خوب کام کیا ہے پھر مولانا مودودی نے سرور دو عالم کے نام سے کتاب لکھی نعیم صدیقی نے محسن انسانیت کے نام پر اور سید وحید الدین نے محسن اعظم کے نام پر۔ سب لوگوں نے کتابیں لکھیں لیکن ان کا اپنا مقام ہے دراصل میں نے ایک دن غور کیا کہ یہ تو ایک شعر و شاعری کی دنیا کے آدمی تھے رنگ و بو کی باتیں کرنے والے تھے اس میدان میں کیسے نکل آئے جواب ملا غور کے بعد کہ وہ بھاٹی گیٹ میں پیدا ہوئے لاہور کا بھاٹی گیٹ کیا تھا۔ بھاٹی گیٹ وہ تھا جہاں اقبال نے ملی نغمے الاپے۔ جہاں منشی احمد دین ایڈووکیٹ نے ——— ایک ضخیم لغت ترتیب ہی نہیں دی بلکہ شائع کی اور وہیں خلیفہ احمد شجاع مرحوم بھی پیدا ہوئے اور جوان ہوئے اور بھاٹی گیٹ کے اپنے گھر پر ادبی محفلوں کا انعقاد کیا اور پھر فقیر سید وحید الدین کا بھی مکان اسی علاقے میں تھا اور ان کے والد سے علامہ اقبال کے بڑے مراسم تھے تو اس فضا میں انہوں نے اپنی آنکھ کھولی اور بھاٹی گیٹ کی فضا نے ان کے ذہن کو اتنا متاثر کیا کہ آخری دنوں میں انہوں نے ملی سطح پر بلند و اعلیٰ کام سرانجام دیا جو رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی

جنابِ صدر، خواتین و حضرات!

طفیل صاحب سے میرا تعلق ۱۹۴۵ء سے قائم ہوا اور پہلا تعارف اردو بک سٹال پر قیوم نظر صاحب نے کروایا۔ اس کے بعد زیادہ قریبی تعلقات ۱۹۵۱ء کے آس پاس قائم ہوئے، جب انہوں نے خصوصی نمبروں کا ڈول ڈالا۔ اس وقت سے لے کر اگلے دس برس روابط روانی میں رہے مگر ان میں گہرائی نہیں تھی۔ ان کی زندگی کے آخری دس گیارہ برس میں ہمارے تعلقات آپس میں بہت قریبی ہوگئے۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے کا اور قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ان کی شخصیت کے دو تین پہلو ایسے ہیں، جن کا مختصراً ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ جس کام پر لگ جاتے تھے پیچھے نہیں ہٹتے تھے اور جبراً بھی دوسروں سے چیزیں لکھوانے کا فن جانتے تھے۔ مجھے یاد ہے چند برس پہلے ایک موقع پر جب میں خاصا بیمار تھا، تو بیمار پرسی کے لیے دونوں میاں بیوی تشریف لائے۔ اس زمانے میں وہ اقبال نمبروں کا سلسلہ شروع کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے اس طرح جکڑ لیا کہ بیماری کے باوجود میں نے وعدہ کر لیا۔ خیال تھا کہ اس طرح کے وعدے جو دیباچوں اور مضامین کے سلسلے میں اکثر ہم ادیب کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وعدہ لینے والے بھی بھول جاتے ہیں۔ تنگ آکر چھوڑ جاتے ہیں، لیکن طفیل صاحب کی لگن کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے تین مہینے کے لیے ایک باقاعدہ آدمی تنخواہ دے کر ملازم رکھا جو روزانہ آکے مجھ سے DICTATION لیتا تھا اور اس طرح انہوں نے ایک چھوڑ دو مضمون مجھ سے مکمل کرائے۔ یہی طریقۂ کار ان کا باقی دوستوں کے ساتھ بھی تھا۔ ان کے مزاج کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ پہلا تاثر جو دوسرے پر ان کا ہوتا تھا، وہ ایک جارحانہ حملے کا ہوتا تھا، جو بالعموم بعد میں دوستی میں بدل جایا کرتا تھا۔ چنانچہ خط و کتابت میں بھی اس طرح تیز جملے لکھنے کے قائل تھے۔ میرے ذخیرے میں طفیل صاحب کے کوئی سو سے زیادہ خطوط ہوں گے جو بیس بائیس برس کے زمانے میں مجھے لکھے اور کبھی رقعے کی صورت میں اور کبھی خط کی صورت میں۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے کہ گرمی شاہو میں انہوں نے مجھے کھانے پر بلایا اور شیخ اسماعیل پانی پتی مرحوم کو اور جب ہم پہنچے، تو اس سے چند منٹ پہلے ان کو دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور وہ یہ گھر پر باقاعدہ حکم دے کر گئے تھے کہ انہیں بتانا نہیں ہے، پہلے انہیں کھانا کھلایا جائے اور یہ کہا جائے کہ میں کہیں کام سے گیا ہوں۔ اس کے بعد یہ بات واضح کی جائے۔ لیکن بہرحال ہمیں خبر لگ گئی اور ہم کھانا کھائے بغیر ہی وہاں سے نکل آئے۔ اگلے دن جب لاہور ہسپتال سمن آباد میں جہاں وہ "ڈاکٹر سعید" کے کلینک میں دل کا پہلا دورہ پڑنے پر ADMIT ہوئے تھے۔ وہاں پر انہوں نے سب سے پہلے جو بات ہم سے کی، وہ شکایت کی کہ آپ میرے گھر سے کھانا کھائے بغیر کیوں چلے آئے۔ ان کی شخصیت میں ایک تیسری DIMENSION بھی تھی اور وہ بہت بڑی تبدیلی ہے، جس سے وہ گزرے۔ زندگی کے ابتدائی جو برس تھے۔ ان کے مخالفین کا بھی زور خاصا رہا۔ ہر مخالفت کا انہوں نے مقابلہ بھی کیا اور وہ ادبی سیاست جو انسان اپنے دفاع میں استعمال کر سکتا ہے، انہوں نے کی۔ لیکن رسولؐ نمبروں کا جب انہوں نے ڈول ڈالا تو اس کے بعد

ایک بہت بڑی تبدیلی ان کے مزاج میں آگئی۔ چنانچہ برسوں سے روٹھے ہوئے لوگوں کو منایا اور ان سے انہوں نے دوستانہ مراسم بحال کیے۔ اس مقصد کے لیے وہ دو دفعہ کراچی بھی گئے اور ایک سلسلے میں مَیں خود بھی شامل تھا۔ ان کی صلح کی کوشش میں کامیابی ہوئی۔ دوسری صلح جو ہے وہ مشفق خواجہ نے کرائی اور وہ ان کے انتقال سے کچھ ہی پہلے جمیل الدین عالی سے ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے اور اس خرابی کا سبب بھی مرحوم کی اپنی کوئی خواہش کا دخل اس میں نہیں تھا بلکہ ہم جیسے دو چار دوستوں نے مل کر ان کو گلڈ کی سیکرٹری شپ پر اکسایا تھا اور اس کے بیچ تک دَو کی اور یہ گرہ اس طرح پڑی تھی، جو آخر عمر میں انہوں نے کھولی۔ وہ بظاہر دھیمے مزاج کے تھے لیکن بڑے تند و تیز جملے کہہ جاتے تھے اور دوسروں کے مزاج کو خوب جانتے تھے اور اپنی اس خداداد بصیرت کی بناء پر انہوں نے باوجود انتہائی مشکلات کے ہمیشہ اپنے لیے راستہ بنایا اور انہیں اس طرح قریب سے دیکھنے کے نتیجے میں اپنے قریبی دوستوں پر ان کا آشنا اعتماد ہو گیا تھا انہیں۔ مثلاً نقوش ایوارڈ کے سلسلے میں مجھے بتلائے بغیر میرا نام لے آئے تھے اور انہیں پتا تھا کہ اب یہ انکار نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح دو بار گلڈ کے انعامات کے سلسلے میں میرے انکار پر انہوں نے باقاعدہ خط لکھے۔ مجھ سے ملے اور مجھ کو آمادہ کیا کہ آپ نے یہ کام ضرور کرنا ہے۔ یہ تعلقات کی نوعیت تھی، جس کی وجہ سے میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میں کس طرح اختتام کو پہنچاؤں۔ نقوش ان کی شخصیت کی صرف ایک جہت ہے اور بہت بڑی جہت ہے اور اسے زندہ رکھنا فرض ہے۔ صاحبِ نقوش کی اولاد کا ان کی یادگار کے طور پر ان کے مشن کو آگے بڑھانا ان کا فرض ہے۔ اس سلسلے میں دوست جو کچھ کر سکتے ہیں، اس سے گریز نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ وہ ایک صاحبِ طرز شخصیت نگار تھے اور مجھے یاد آتا ہے کہ لاہور میں ایک دفعہ گیا تو مجھے کہنے لگے کہ صرف اب تم بچ گئے ہو دوستوں میں، جس پر مَیں نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا اور اس لیے بھی نہیں لکھا کہ پہلے تم میرے بارے میں کچھ لکھو۔ مَیں وہ قرض ابھی تک اپنے شانوں پر رکھتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ مَیں اسے ادا کر سکوں۔

وفاقی وزیرِ تعلیم ملک نسیم احمد آہیر

جناب جاوید طفیل صاحب، معزز خواتین و حضرات! سچی بات تو یہ ہے کہ محمد طفیل کی شخصیت سے ذاتی طور پر تو کبھی ان خوش نصیبوں میں سے نہیں ہوں، جن کا ان سے رابطہ رہا ہو لیکن ان بدنصیبوں میں سے بھی نہیں ہوں۔ جن کا طفیل صاحب سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ نقوش کے واسطے سے میں جناب محمد طفیل کی شخصیت سے واقف تھا اور ان کے مختلف نمبر جو وقتاً فوقتاً نکلتے رہے تھے۔ یہ دعوےٰ نہیں کہ مَیں ایک ادب کا طالب علم ہوں، لیکن بالکل بے ادب بھی کبھی نہیں رہا۔ تو اس سے کچھ نہ کچھ میرا رابطہ رہا ہے اور اتفاق سے جب نقوش کی بنیاد رکھی گئی، اس میں جناب احمد ندیم قاسمی بھی شامل تھے، جن کا تعلق اتفاق سے میرے علاقے سے ہے اور جن کی ذات سے میرا ذاتی تعلق بھی ہے، تو بعد میں جب ان کی دونوں کی راہیں جدا ہوئیں۔ کیونکہ اس زمانے میں ادب کا اپنا ایک خاص رُخ تھا۔ جس کو آپ ترقی پسند

تحریک سے منسوب کرتے تھے اور پھر یہ جو کچھ آپس کی صف بندی ہوئی، تو ان کی راہیں جُدا جُدا ہو گئیں، تو محمد طفیل کے جو نقش تھے وہ نقوش کی شکل میں ظاہر ہونے شروع ہوئے اور احمد ندیم کا جو فن تھا، اس نے فنون کی صورت اختیار کر لی محمد طفیل کا جو سب سے بڑا کارنامہ اس وقت سامنے آیا، وہ باقی نمبروں کے علاوہ جہاں انہوں نے ادبی خدمات انجام دی ہیں یہاں ادب کے ساتھ انہوں نے دین کی بھی بہت بڑی خدمت کی ہے اور وہ رسول نمبروں کی تیرہ جلدوں پر مشتمل انہوں نے ایک اتنی بڑی کاوش کی ہے، جو قوم کے لیے ایک بہت بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ میرے چند ساتھیوں نے یہاں پر بات بھی کی ہے کہ خلا کچھ ایسے ہوتے ہیں، جو پُر نہیں کیے جا سکتے، لیکن محمد طفیل نے کچھ ایسے کام کیے جن میں انہوں نے کوئی خلا نہیں چھوڑا، جو کام انہوں نے کیا، اس کو انہوں نے تکمیل تک پہنچایا اور اس میں کسی قسم کا خلا آپ کو نظر نہیں آئے گا۔ البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ جو کام ابھی وہ نامکمل چھوڑ گئے ہیں اس میں خلا باقی ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ خلا پُر ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ ہمارے پنجابی میں ایک کہاوت بہت مشہور ہے کہ کسی بڑے باپ کے بیٹے کو زندہ رہنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، چونکہ اس کو ماپنے یا ناپنے کا جو پیمانہ ہوتا ہے اس کے باپ کی عظمت ہوتی ہے، تو اب میرا خیال ہے کہ جاوید طفیل ایک بہت بڑے امتحان سے گزریں گے، کیونکہ انہوں نے محمد طفیل کی جہاں ان کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ جہاں وہ محمد طفیل کے صاحبزادے کی حیثیت سے جانے پہچانے جائیں گے، تو وہاں ان کے حصے میں یہ بات بھی آئے گی کہ جس مقام پر وہ تھے اس مقام سے یہ کتنا پیچھے رہ جاتے ہیں یا اس کام کو یہ کتنا آگے بڑھا سکتے ہیں، اور یہ آنے والا وقت ہی ثابت کرے گا۔ اور میری ڈھیر ساری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

محمد طفیل — موجودہ دور کی ناقابلِ فراموش شخصیت

پاکستان رائٹرز گلڈ ۔ راولپنڈی

۱۵ر جولائی ۱۹۸۶ء:

سلطان رشک:

برادرم جاوید اقبال ۔ جناب محترم احسن علی خاں صاحب جناب سیکرٹری انوار فیروز صاحب نے درست ہی فرمایا ہے کہ طفیل صاحب کا غم بہت بڑا غم ہے اور الفاظ بہت چھوٹے ۔ یہ سچ ہے اور یہ میرے دل کی آواز ہے تاہم ؎

صبر کرتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ عرض کرتا چلوں کہ محمد طفیل صاحب نے اُردو کے ایوان میں تعمیراتی زبان میں ، بات کروں تو بہت بڑے بڑے تاج محل اور بہت سی بلند پایہ عمارتیں جو تعمیر کی ہیں ، جن کا جواب ممکن ہی نہیں ، بلکہ انتہائی دشوار بھی ہے ۔ وہ تاج محل ان کی فکر کے نادر نمونے تھے ۔ شعر کی زبان میں کہوں تو میر کی خود سپردگی ۔ غالبؔ کی بلند تخیلی ۔ اور اقبال کی بلند آہنگی ان کے ہاں موجود تھی ۔ ان کے کردار میں ۔ ان کے عمل میں ۔۔ ان کی گفتار میں ، اُنھوں نے اپنے کردار سے اس قدر شاندار حسنِ سلوک پیش کیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو ادب میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے وہ دشمنوں کو ہمیشہ معاف کر دیتے تھے بلکہ انھیں سینے سے بھی لگاتے تھے ۔ اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ وہ انھیں دوست بنا تے تھے ۔ ان کی مخاصمت کی وجہ کوئی ذاتی مخاصمت نہیں ہوتی تھی ۔ وہ ہمیشہ غریب ، غیور اور بیمار ادیبوں کے حقوق کے لیے لڑے ۔ اُنہوں نے رائٹرز گلڈ کے پلیٹ فارم سے وہ خوبصورت کام کیے ہیں جو بہت بڑی بڑی اکادمیاں اور بہت بڑے بڑے اِدارے بھی آج تک نہ کر سکے ۔

اب رسالوں کی بات آتی ہے ۔ کیونکہ وقت کی پابندی ملحوظِ خاطر ہے ، لمبی بات نہیں ہو سکتی ۔ میں بہت ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ "نقوش" نے جس قدر شاندار خدمات اُردو ادب میں انجام دی ہیں ، اس کی مثال اس دنیا میں شاید ہی مل سکے گی ۔ ان کا ہر نمبر انتہائی خوبصورت ، ضخیم ، شاندار اور ہر اعتبار سے پُر وقار ہوتا تھا ۔ ان کو برِّصغیر پاک و ہند کے علاوہ بیرونی دنیا کے بلند پایہ ادیبوں ، شاعروں اور دانشوروں کی اعانت حاصل تھی ۔ پتا نہیں کہ ان میں کون سی ایسی خوبی یا کشش تھی ، جو کوئی بھی ایک مرتبہ محمد طفیل سے ملا اُن کا ہی ہو گیا ۔ گلڈ کی بات چلی ہے تو ایک مرتبہ میں بھی ان کے مخالف کیمپ میں تھا ۔ ایک دوسرے گروپ سے وابستہ تھا ۔ ایک دفعہ اتفاق سے ایسا واقعہ ہوا ، اُنھیں بھی حیرت ہوئی اس پر اور مجھے بھی ، لیکن ان کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں تھی ، ان کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ تھا ۔ میں نے ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا ۔ جاوید اقبال

گواہ ہیں کہ جب میں لاہور جاتا تھا گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھتا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ادارت کے رموز کو وہ جتنا اچھا سمجھتے تھے شاید ہی کوئی دوسرا ایسا سمجھتا ہو۔ جہاں تک ان کی خاکہ نگاری اور ادارتی تحریروں کی بات ہے ہیں کہا نیاز فتح پوری، ماجد دریا بادی اور جناب قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی صاحب اور اُس پایہ کے بیشمار مشاہیر ادب نے ان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

مجھے یقینِ واثق ہے کہ اُن کے ہونہار فرزند جاوید اقبال صاحب اُن کے نقشِ قدم پر چل کر اس روایت کو جو مرحوم چھوڑ گئے ہیں زندہ و تابندہ رکھیں گے۔

سیّد فیضی صاحب :

جناب محمد طفیل کی وفات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ سننے میں آیا ہے اور ان کی وفات سے ہمارے ادب اُردو میں اور ادبی جرائد کے مدیر جو ہیں ان کی دنیا میں جو خلاء پیدا ہو گیا ہے آیا یہ خلاء پُر بھی ہو گا یا نہیں۔ اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا، ادب اُردو کے پرستار اور قلمکار یہ فیصلہ کریں گے یا ادبی جرائد کے مدیران کا فرض ہے کہ وہ اس بات کو سوچیں کہ آیا یہ خلاء پُر بھی ہو سکے گا۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ محمد طفیل مرحوم گو اپنی ذات میں ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ادارے کی حیثیت سے، ایک انجمن کی حیثیت سے اور ایک تحریک کی حیثیت سے نہ بھلائے جا سکیں گے۔ تحریک ایسی جو ادبی جرائد کو معنوی حسن عطا کرنے میں جاری و ساری ہے۔ ادارہ ایسا جس نے ادبی رسائل کی اشاعت کو اور زیادہ حسن دے کر باوقار بنا دیا اور خود ایک ایسی انجمن کی شمع تھے جس کے گرد ادیب و شاعر جمع رہتے تھے اور محمد طفیل رائٹرز گلڈ کی حیثیت سے بھی اور ایک عام اپنی انفرادی حیثیت سے بھی ان کے دکھ درد میں مدادا ثابت ہوتے تھے۔ ہمدردی اور ایثار کا پیکر بن کر اُبھرے۔ محمد طفیل ایک ادیب، ایک خطاط، ایک شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اگر آپ اس پر ایک انسان کی حیثیت سے نظر ڈالیں گے تو وہ غریبوں کا دوست۔ ادیبوں کا ہمدرد اور قلمکاروں کا سچا بہی خواہ تھا۔ میری ان سے ملاقات ۶۴ء یا ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ جب میں کراچی سے یہاں راولپنڈی منتقل ہوا۔ غالباً فیروز سنز کا جلسہ تھا، جس میں ان سے ملاقات ہوئی۔ پھر ان سے کئی ایک ملاقاتیں ہوئیں لیکن یہ انکشاف میں نے ان کے اندر دیکھا کہ جب بھی نقوش شائع ہوا، انھوں نے ایک جلد میرے نام ضرور بھجوائی۔ یہاں آتے دن ملاقاتیں ہوئیں اور ان ملاقاتوں سے جو تاثر اس کا قائم رہا، اُسے میں نے یوں کہا ہے کہ وہ میرا دوست تھا، ساتھی تھا، وفا پرور تھا۔ ——————— حسن و اخلاق کا پیکر تھا۔ اس کی فطرت میں دلآویزی تھی اور جوش و جذبہ کی بلاخیزی تھی۔ میں سمجھتا ہوں طفیل ادب و شعر کی زینت ہے۔ وہ رعنائی ہے جس نے سیرت کے نقوش اُجاگر کر کے سایہ رحمت یزداں میں جگہ پائی ہے۔

ڈاکٹر مطلوب حسین سیّد:

ذکر محمد طفیل نقوش جیسی عظیم شخصیت کا اور بات کرنے والا مجھ جیسا طالب علم تاریخ کا جب یہ دونوں عناصر مل جائیں تو پھر وقت کسی کے حصے میں نہیں آنا چاہیے۔ لہٰذا میں یہ سوچتا ہوں کہ میں وقت کو گھٹاؤں یا موضوع کو گھٹاؤں بات بنتی نہیں میں نہ وقت کو گھٹا سکتا ہوں اور نہ ہی موضوع کو۔ اس لیے میں ہیرے سے کوئی موضوع اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ ایک حقیقت کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں اور اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ جناب نقوش نے سیرت کی تیرہ جلدیں جو نکالیں پہلے چار پھر چھ۔ پھر تین۔ اس کے بعد ان کا پروگرام تھا کہ عالمی ادب سے بھی کچھ سیرت کے مضامین اکٹھے کئے جائیں۔ ان کے تراجم کیے جائیں۔ یہ ان کے پروگرام میں شامل تھا۔ دوسرا ان کا پروگرام تھا قرآن نمبر کا ـــــ اور ان دونوں پر وہ کام کر رہے تھے۔ عالمی ادب سے بھی مضامین اکٹھے ہو رہے تھے اور قرآن نمبر کے چھ ہزار صفحات کتابت ہو چکے تھے، لیکن اس عالم میں غیر شعوری طور پر انہوں نے ایک کام کیا کہ جب تیرھویں جلد لکھی تو اس میں ان کا وہ انڈکس بھی لکھ گئے۔ انڈکس تتمہ ہوتا ہے کسی کتاب کا گویا کہ غیر شعوری طور پر انھوں نے جو کام اپنے ذمے لیا تھا وہ پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اس کے بعد وہ وقت بھی آگیا جس کا انھیں مدتوں انتظار تھا' آخرکار وہ وقت بھی آگیا جس کے لیے انھوں نے غیر شعوری طور پر اپنی موت کا وقت بھی ـــــ خود ہی متعین کر لیا تھا۔ یہی ایک بات مجھے عرض کرنا تھی۔

خدا حافظ!

بریگیڈیئر گلزار احمد:

آج ذکر جناب طفیل مرحوم کا اور اُن کو مرحوم کہتے ہوئے بھی سخت افسوس ہو رہا ہے۔ وہ ادیب تھے، شاعر تھے، مجھے چونکہ ادب سے خاص تعلق نہیں رہا ـــ نہ میں شاعر ہوں، نہ ادیب، نہ افسانہ نگار اور نہ ہی ناول نگار۔ اس لیے نقوش کے نمبر تو خیر نظر سے گذرتے رہے ہیں، مگر جب میں نے غزواتِ نبی کریمؐ پر لکھنا شروع کیا تو محمد طفیل (خدا انھیں غریقِ رحمت کرے) انھوں نے خود میرے قریب آنا شروع کر دیا۔ اُس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ رسولؐ نمبر کی تیاری میں مصروف ہیں۔ گلڈ کا رکن تو میں اس روز بنا تھا جس روز گلڈ کی بنیاد رکھی گئی تھی کراچی میں۔ مگر میں نے کوئی دلچسپی نہیں لی تھی اس میں۔ پھر مجھے ایک روز ایک خط ملا طفیل مرحوم کی طرف سے کہ گلڈ کی جو سب کمیٹی ہے ویلفیئر والی، اس کی ایک میٹنگ ہے اور اس کے لیے تم لاہور آ جاؤ تو اس روز سے پھر شروع ہوا کچھ زیادہ قُرب نقوش کے لیے۔ رسولؐ نمبر کے لیے اُنھوں نے اشارہ کیا۔ میں نے غزواتِ نبیؐ کریم پر ایک مضمون بھیجا ـــــــ مضمون کو دیکھ کر انھوں نے کہا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے کہا ہے کہ حضورؐ کے بچپن پر کچھ مضمون لکھو اور علماء دین سے بھی کہا ہے مگر کوئی اس موضوع پر لکھنے کے لیے تیار نہیں ہوا تم ہو تو فوجی، شاید تمھارا مطالعہ اس طرف نہ ہو مگر کوشش کرنا کہ حضورؐ کے بچپن پر ایک مضمون لکھو اور جب وہ مضمون میں نے انھیں دے دیا تو

بعد میں اُنھوں نے کہا کہ اگر تم یہی کچھ لکھ جاتے تو بہت کافی تھا۔ تمھارے لیے اس لیے کہ وہ عاشقِ رسول ؐ تھے تو آج آپ حضرات عاشقِ رسول ؐ کا ذکر کر رہے ہیں۔

ان کا یہ کارنامہ جیسے کہ سبھی کہہ رہے ہیں۔ دراصل سیرت پر اگر کوئی لکھنے بیٹھتا ہے اور اسے اپنے دل سے لکھتا ہے تو اس کے بعد وہ اپنا خاتمہ کا فیصلہ بھی اُسی وقت کر دیتا ہے۔ علامہ شبلی مرحوم کا بھی تو یہی حال تھا کہ وہ بھی اپنی جانب سے سیرت کو مکمل کر کے نہیں گئے تھے۔ اپنے دوست کے حوالے کچھ کر گئے تھے۔ جیسے کہ ابھی کچھ ذکر آیا ہے کہ جو عالمی ادب میں جو کچھ سیرت میں ہے وہ بھی ان کے خیال میں تھا۔ مگر وہ بات رہ گئی تو میں سیرت کے لکھنے والوں کو ذرا اس بات سے متنبہ کروں کہ جب وہ سیرت پر لکھنے کا عزم کرتے ہیں تو ساتھ وہ اس بات کا بھی عزم کرتے ہیں کہ اپنا بھی چل چلاؤ ہے اور تھوڑی سی کسر باقی رہ جائے گی ان کے اپنے دل کے مطابق جب ان کا بُلاوا بھی آ جائے گا۔

ڈاکٹر سبطِ حسن :

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں مدت کے اعتبار سے طفیل دوستی میں سب سے کم ہوں اور نقوش خانے میں بھی شاید بہت سے شائقینِ ادب سے کمتر ہوں لیکن وہ چند ملاقاتیں اور باتیں جو ان سے آخری دور میں ہوئیں وہ ان یادوں کا سرمایہ ہیں۔ اصل میں درخت کی صحیح اونچائی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ گر جاتا ہے۔ محمد طفیل کے ادبی کارنامے علمی کارنامے، تحقیقی کارنامے اتنے ہیں کہ ان کا حساب نہیں کیا جا سکتا اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہر دست کے لیے تازہ اور ندرت لیے ہوئے ہوں گی لیکن وقت بہت کم ہے اصل میں وہ محقق نہ تھے بلکہ محقق گر تھے۔ پی ایچ ڈی نہ تھے بلکہ پی ایچ ڈی گر تھے۔ ادیب تھے بلکہ ادیب گر تھے اور انہوں نے یورنیورسٹی ادبیاتِ اردو میں جتنا ضخیم اور عظیم کام کیا ہے میری نظر میں بعض احباب کی نظر کی طرح وسیع نہیں ہے میں فارسی ادب کا طالب علم ہوں۔ لیکن اگر ضخامت کے اعتبار سے مقابلہ کیا جائے اگر معنویت کے اعتبار سے مقابلہ کیا جائے، اگر مقصدیت کے اعتبار سے بامقصد ادب کے تخلیق کے اعتبار سے مقابلہ کیا جائے تو اس میں وہ سرفہرست نظر آتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ادب برائے زندگی، ادب برائے شکم، ادب برائے ارتقاء، لیکن انھوں نے میری دانست میں ایک نیا شعار اور مزاج دیا ادب کو۔ ادب برائے ادیب اور انھوں نے اپنے ادبی کارناموں میں جس طرح ادیبوں کو روشناس کرایا کہ اصل تو وہ ہے جو چمن سے پھولوں کو چنتی ہے اور ویرانوں میں لا کر رکھ دیتی ہے مگر محمد طفیل کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ویرانوں سے پھولوں کو چنتے ہیں اور لالہ ہائے صحرائی کو گلہائے چمنستانی بنا دیتے ہیں۔ اپنے نقوش کے ذریعے سے ایسے ایسے حضرات کا انھوں نے تعارف کروایا۔ بہت سے ایسے بھی جو اس سے پیشتر روشناس تھے، لیکن ایسے ایسے حضرات کا انھوں نے تعارف کروایا جو اس وقت آسمان ادب پر ستارے بن کر درخشاں ہیں۔ اس سے ان کے حسن انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔

——— انھوں نے ادیبوں کے حقوق کی حمایت

اور حفاظت کی ہے۔ بالواسطہ طور سے انھوں نے وہ امور انجام دیئے ہیں کہ اگر ان کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا جائے تو اب ادیبوں کے حقوق پر کوئی دوسرا شخص حقوق کے میدان میں تجاوز نہیں کر سکتا۔ بلکہ ادب کا سب سے پہلا فائدہ ادیب کو ملنے کی ضرورت ہے اور اس کے وہ میرے خیال میں بہت بڑے مستحق ہیں۔ دوسری اور آخری بات اس مختصر سے وقت میں کہ جس طرح کہ رسُول اکرمؐ نے چالیس سال کردار سازی، سیرت سازی، اخلاق سازی انفرادی طور پر کی اور اس کے بعد تئیس سال انھوں نے اجتماع کے اخلاق کو، کردار کو، سیرت کو، شخصیت کو نکھارنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ادب کے میدان میں طفیل صاحب نے پچاس سال خاموش سیرت سازی کی ——— دنیا بھر کے نمبر لکھ چکے۔ چونکہ ایک بڑا مقدس کام ان کے پیشِ نظر تھا اور جو بہت بڑا مقدس تھا پچاس سال کی پیہم کاوشوں کے بعد جس میں کتابت بھی ہے، ادارت بھی، نظارت بھی ہے، نظامت بھی ہے، صحافت بھی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کام کو شروع کیا اور ان کی وجہ سے تالیفات کو تصنیفات پر ترجیح دی گئی اور رسالوں کو کتابوں پر ترجیح دی گئی۔

احسن علی خان :

جناب صدر۔ خواتین و حضرات !

دراصل میں اس سانحے سے اتنا ہل گیا ہوں کہ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کہوں اور کیسے کہوں۔ طفیل بھائی نے ایک دفعہ اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ میرے مرجانے کے بعد صرف اتنا ہی لکھا جاتے گا کہ ان صاحب نے بڑے اچھے اچھے نمبر نکالے، غور کیجئے کہ اس ایک جملے کے لیے میں نے دنیا تک تیاگ دی۔ دنیا کی کوئی خوشی میرے لیے نہیں رہی دن رات کام کرتا ہوں دن رات مرتا ہوں۔ پھر میں نے اس کا جواب دیا تھا اور میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے اس میں ایک بہت ہی زیادہ قنوطیت نظر آئی تو میں نے ان سے یہ عرض کیا تھا کہ یہ صحیح ہے کہ ہمارے لوگوں میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن ہمارے لوگ اتنے بھی احسان فراموش نہیں ہیں کہ اپنے محسنوں کے کارہائے نمایاں کو بھول جائیں۔

قدرت اللہ شہاب :

پاکستان رائٹرز گلڈ اسلام آباد برانچ نے محمد طفیل مرحوم پر یہ منعقد کر کے ایک اہم فریضہ نبھایا ہے۔ طفیل صاحب گلڈ کے آغاز ہی سے اس ادارے کے نہایت فعال اور وفادار کارکن تھے۔ وہ کئی بار گلڈ کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے اور اس کے استحکام اور فروغ کے لیے گراں بہا خدمات سرانجام دیں۔ وہ ادب نواز بھی تھے اور ادیب نواز بھی۔ گلڈ کے سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے ان دونوں کو خوب نکھارا۔ عام طور پر یہ بہم زمانہ ہی ہے کہ مرنے والے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو خلا وہ چھوڑ گیا ہے۔ وہ دیر تک پُر نہ ہو سکے گا۔ یہ محض ایک طفل تسلی ہے انسان بڑا ہو یا چھوٹا اہم ہو یا غیر اہم حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص اپنی موت سے جو خلاء چھوڑ جاتا ہے۔ وہ کبھی پُر نہیں ہوتا جس طرح

ہر نیا لمحہ گزرے ہوئے لمحے کا نعم البدل نہیں ہوتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو خلا ہم فوری طور پر محسوس کرتے ہیں، رفتہ رفتہ ہماری توجہ اس سے بھٹک کر یا تو اسے نظر انداز کر دیتی ہے یا شرما شرمی یا طوعاً و کرہاً ہم اپنی عقیدت کا بھرم رکھنے پر ڈھونگ رچاتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ محمد طفیل مرحوم کی یاد میں کچھ ایسا ہی رنگ اختیار کریں میری درخواست ہے کہ ہم انگریزی زبان کی اس ضرب المثل سے کام لیں جس میں یہ تلقین ہے: HIT IRON WHEN IT IS HOT

جہاں تک مجھے علم ہے۔ وفات سے پہلے نقوش کے بارے میں طفیل صاحب کی دو خواہشیں سرِ فہرست تھیں۔ پہلی خواہش کا علم مجھے غالب والے ڈاکٹر آفتاب احمد کی زبانی حاصل ہوا ہے۔ مرحوم کے ذہن میں نقوش کا 'نقوش' نمبر شائع کرنے کا منصوبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ بڑا اچھوتا اور زرخیز خیال تھا اور 'نقوش' کے تمام نمبروں کا مکمل احاطہ کر کے ایک گراں قدر علمی ذخیرہ بن سکتا ہے۔ طفیل صاحب کی دوسری خواہش کا علم مجھے ذاتی طور پر تھا۔ کچھ عرصہ سے وہ فکرمند تھے کہ 'نقوش' کے خاص نمبر رفتہ رفتہ 'آؤٹ آف پرنٹ' ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض خاص نمبروں کی ایک جلد تک ان کے پاس محفوظ نہیں ہے۔ اگر یہی صورتِ حال جاری رہی تو عنقریب علم و ادب کا ایک FUTURE اور اہم سرمایہ معدوم ہو جائے گا۔ اسے بچانے کے لیے اب وہ خود تو موجود نہیں رہے لیکن علم و ادب کی خدمت گزار کسی نہ کسی تنظیم کو یہ اثاثہ محفوظ کرنے کا بیڑہ اٹھانے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

میری ناچیز رائے میں ذرائع اور وسائل کے اعتبار سے اس کارِ خیر کو پورا کرنے کی صدارت اکیڈمی آف لیٹرز کے حصے میں آنی چاہیے۔ اگر ہم طفیل صاحب کی ان آخری خواہشات کو کسی حد تک پورا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مرنے والے کے لیے اس سے بڑا خراجِ عقیدت اور کیا ہو سکتا ہے۔

موت کی آغوش میں ایک اور سفینہ ڈوب گیا

جمیلہ ہاشمی

رائیٹرز بک کلب لاہور — مورخہ ۱۹ جولائی ۱۹۸۶ء

محمد طفیل مُدیر نقوش نہیں رہے۔ موت اپنا جھنڈا لہراتی زود یا بدیر ایوانوں سے باہر اور اندر جاری و ساری رہتی ہے کیونکہ وہ ایک بار زندگی کو شکست دینے اور پھر اُسے قائم کرنے کی قوت کا نام بھی ہے۔ موت فنا کا نام نہیں رُک کر پھر رواں ہونے کا نام ہے اور محمد طفیل ایک لمحۂ گزراں میں ٹھہرنے کے بعد پھر زندہ ہو گئے ہیں۔

اُن سے محبت کرنے والے انہیں جاننے والے اُن کے متعلق متجسس رہنے والے ان کے لیے حسد کی مشقت اُٹھانے والے لوگ اب ان پر قلم اُٹھائیں گے اور ان سب کاموں کا تذکرہ کرنا مستند درج کریں گے جو انہوں نے اپنی اس مختصر ادبی زندگی میں انجام دیے ہیں۔

وُہ لوگ جنہوں نے اُنہیں محنتِ شاقہ کرتے دیکھا اور نقوش کو ذرّے سے آفتاب بناتے پایا۔ اُن کے معاون ہُوئے اور اُن کی اس ساری کاوش کو سراہا، اس کے واسطے سے انہیں پہچانا۔ ان کی برتری کا اعتراف کیا اور کریں گے۔

نقوش کے بڑے عظیم اور لافانی نمبر نکالنے کے لیے ادب میں گراں قدر اضافے کرنے کے لیے اس کام کو جانچنے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے والے لوگ اپنا قلم اُٹھائیں گے اور باریک بینی اور نیک نیتی سے اس شخصیت کو بھی خراجِ عقیدت پیش کریں گے جس نے تن تنہا اُردو بازار کے ایک کمرے میں بیٹھ کر مافوق الفطرت کام کیے۔ مَیں ان کو مافوق الفطرت اس لیے کہہ رہی ہوں کہ وہ اکیلے ایک بورڈ کی کارکردگی سے بھی زیادہ کی اہلیت سے کام کرتے تھے۔ جو یہ خزانہ جمع کر پائے ہوں گے۔

وہ لکھنے والے بھی نقوش کے مُدیر کو یاد کریں گے جن کی کہانیوں کی نوک پلک سنوار کر اُسے قابلِ اشاعت بنانے کا کام بھی خاموشی سے طفیل صاحب کرتے تھے اور میرا خیال ہے انہیں کبھی کسی پر یہ احسان دہرانے کا خیال بھی نہیں آیا ہوگا کہ اُن سے ذکر ہی کریں کہ کہانی اور ادب پارے میں زندگی کی روح دوڑانے کے لیے انہیں اسے کتنا بدلنا پڑا۔ اگر لوگ احسان فراموش نہ ہوں تو یہ احسانِ عظیم ہے کہ نقوش نے اُردو ادب کو بڑے بڑے ادیب دیے۔

شہر لاہور کو بھی ان کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انہوں نے ساری تاریخ کو ایک نمبر میں جمع کر کے جہاں تحقیق کرنے والوں کو سہولت فراہم کی، وہاں سارے معلوم اور غیر معلوم سوتوں کو ایک رودِ نغمہ بنا دیا۔ لاہور کو محمد طفیل پر ہمیشہ ناز رہے گا۔

بڑے بڑے افسران کو بھی ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ انہوں نے نقوش کے صفحات میں ان کی ایسی تخلیقات کو چھاپ کر دوام بخشا کہ جو اگر کہیں اور چھپتیں تو تیسرے درجے کی تحریریں شمار کی جاتیں۔ نقوش نے ان کو رعنائی اور توانائی اور زور بخشا۔ لکھنے کا حوصلہ عطا کیا۔ ان سے لکھوایا۔ ان کو چھاپا اور ان کو بڑا آدمی بنایا ان کے نام کے ساتھ روشنیاں آویزاں کیں۔

اور حاسد بھی ان پر قلم اُٹھائیں گے یہ کہنے کے لیے کہ ان کے کام میں قینچی کا زور زیادہ تھا، وہ بس چیزوں کو جمع کرتے تھے اور یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ یہ کہ طاقت کا اصل منبع تو حاسد صاحبان ہیں اور ان کی تعبیر انہوں نے کی ہے۔ وہ اس بات پر فخر کریں گے کہ ایک نابغۂ روزگار کو انہوں نے دریافت کیا تھا اُسے کام کرنے کی قوت عطا کی تھی۔ راہ دکھائی تھی۔ پگڈنڈیاں سجھائی تھیں اور یہ کہ نقوش جو کچھ بھی ہے۔ اُن کے دم قدم سے ہے۔

ہر رنگ کے لوگ اُن کے اچھے بُرے کی چھان پھٹک کریں گے کیونکہ طفیل جو خود چھان پھٹک کرنے کے ماہر تھے۔ اب چُپ رہیں گے کہ وہ اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ عرش کی طرف محوِ پرواز جنت کے چشموں کے کنارے۔ جی بھر میں اتنے وثوق سے کہہ رہی ہوں کہ وہ جنتی ہی ہوں گے۔ یہاں اس دنیا میں بھی انہوں نے اپنی محنت سے اپنی ریاضت سے ایک جنت تخلیق کی تھی اور وہ اُن کا اپنا گھر تھا۔

مجھے جب بھی اُن کے ہاں جانے کا اتفاق ہُوا ہے، میں نے ایسا صاف سُتھرا اور اتنا پُر سکون گھر کم ہی دیکھا ہے۔ میاں بیوی میں حد درجے کی مفاہمت بیوی میں بے پناہ حوصلہ برداشت کی قوت دُنیا داری کی بے پناہ سمجھ بوجھ۔ اولاد اور شوہر کی تعمیر میں جان کھپا دینے والی وہ عورت بھی خراجِ تحسین پیش کیے جانے کے لائق ہے جس کی شخصیت اور محبت نے محمد طفیل کو مدیر نقوش بنایا اور ایک کامیاب اور بامُراد شخص جو بڑے بڑے معرکے سر کرنے کے قابل تھا اور جس کی قوت ارادہ آہنی تھی۔ تاریک دنوں میں مشقت کے مختتم جان لیوا سالوں میں اس خاتون نے ایک ایک اینٹ جو ڑی بلندی کی طرف جاتی۔ اس عمارت کی پاسبانی کی ہے اگر طفیل صاحب کی زندگی میں نرم چشمے کی سی محبت سے بہنے والی ہستی نہ ہوتی، تو آج وہ اس مقام پر نہ ہوتے، جہاں پر ہیں۔ لکھنے والوں کا جو قبیلہ اکثر و بیشتر ان کے ہاں پڑاؤ کرتا تھا۔ اُن کے لیے دِل اور گھر کے دروازے وا کیے رکھنے والی وہ خاتون گھر کو جنت بنانے والی وہی تو تھی۔ جس نے طفیل صاحب کو ہم چشموں میں قابلِ محبت بنایا۔ ان کے ذہن میں اگر کوئی خلفشار ہوتا، تو وہ اُلجھے رہتے اور گھر سے باہر اپنے لیے تسلیاں اور سہارے ڈھونڈتے کام اُس یکتائی سے نہ کر پاتے۔ طوفان کی زد پہ آئی رہنے والی برباد شُدہ گھریلو زندگی میں کام ممکن ہی نہیں ہوتا۔ طفیل صاحب ملنے والوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونے والے ایک نہایت وضع دار اور اچھے دوست تھے، جو ان کی خوب صورت گھریلو زندگی کے جنت ہونے کی دلیل ہے۔

جب سردار احمد فوت ہوئے ہیں اور میں اپنے گاؤں انہیں لے کر پہنچی ہوں، تو یہ میاں بیوی بھی میرے دُکھ میں شریک ہونے کے لیے لاہور سے چلے اور راستے میں موٹر کے حادثے میں زخمی ہو کر دس دن نشتر ہسپتال میں رہے۔ مَیں ہمیشہ تہ دل سے ان کی اس تکلیف کی شُکر گزار رہی ہُوں۔ میری مصیبت کے دنوں میں انہوں نے میرے لیے جو ممکن ہو سکتا تھا کیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ جب جب مجھ پر پریشانیوں اور مقدمات کی یورش ہُوئی انہوں نے ہر طرح سے مدد کی۔ خدا انہیں ضرور اس کی جزائے خیر دے گا۔

اور اسی طرح اختر جمال کو انہوں نے بہن کہا اور اس کو بھائی بن کر میکے کا گھر دیا۔ اُن کے سٹینڈرڈ دوہرے نہ تھے وہ مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ رشتوں کے تقدس کو روا رکھتے تھے کہ اُن میں بنیادی اچھائیاں تھیں، جو کسی کے کردار کو روشنی اور چمک

اور چہرے کو جلا عطا کرتی ہیں۔

اُن کی کمزوریوں کو اور لوگ جانتے ہوں گے، جو ان کے بہت قریب رہے ہوں گے مگر میں نے اُن کو ہمیشہ اپنے کام میں ایماندار اور نہایت ہی مستعد پایا ہے۔ نقوش کے لافانی بنانے میں انہیں نہایت اُلجھے ہوئے راستوں پہ سفر کرنا پڑا ہوگا۔ مگر جس مسافت کا انجام بخیر اور خوش ہو تو وہ مسافر کی خوش بختی کی دلیل ہوتا ہے، جیسے آدمی کام کرتے کرتے تھک کر سو جائے۔

یوں اس خوش بخت آدمی کے سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔ موت اور اس سے ماورا کیا ہے۔ یہ کون جانے۔ موت اچھے لوگوں کے لیے خوش خبری ہوتی ہے۔ اس کا بلاوا جس کی چاہت میں بھی شدت ہوتی ہے، تو وہ پکار لیتا ہے۔ ہاں اس کی قسم وہ پکارتا ہے اور اس کی پسند اور ناپسند بھی پکار ہوتی ہے اور پھر ایک لمحہ گزراں میں ٹھہر کر آدمی اگلے سفر پہ جو اس کی طرف ہے اور مشقت طلب نہیں اور سیدھا ہے اور صعود کی طرف ہے، رواں ہو جاتا ہے۔

قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

عبدالعزیز خالد

محمد طفیل "نقوش"

سرِ قلم کا قلم ہُوا خالد　　دیدۂ حرف نم ہُوا خالد

زندہ رودِ جرائد ادبی　　راہگرائے عدم ہُوا خالد

قہقہے گونجتے تھے جس گھر میں　　وقفِ حرمان و غم ہُوا خالد

تازہ دم جس کے دم سے بزمِ سخن　　وہی محرومِ دم ہُوا خالد

جانِ اُردو پہ کوہِ غم ٹوٹا　　کیا کہیں کیا ستم ہُوا خالد

آفتابِ "نقوش" گہنایا　　واژگوں جامِ جم ہُوا خالد

عاشقانِ رسولؐ کی مد میں　　نام جس کا رقم ہُوا خالد

بہ طفیلِ فروغِ نامِ نبیؐ　　خود بھی جو محترم ہُوا خالد

بنی گنجِ جناں لحد اس کی

کیسا اس پر کرم ہُوا خالد!

○

غلام رسول ازہر

بآں گروہے کہ از ساغر وفا مستند

بیاد محمد طفیل، مدیر نقوش

خوشا مرے، اِداروں پر بھی بھاری کام ہے جس کا
فقط جہدِ مُسلسل سے عبارت نام ہے جس کا

وہ جس سے پُوچھئے کہتا ہے، میرا یارِ جانی ہے
محبّت سے بھرا ہر دم لبالب جام ہے جس کا

اَدَب کی وادیوں کو نت نئے کشمیر جو بخشے
نظارہ گاہِ عالم، رفعتوں کا بام ہے جس کا

بظاہر دیکھنے میں بھولا بھالا، چُپ، غریب آسا
بباطن شوخ ہے، ہر اک اسیرِ دام ہے جس کا

ہمیں بھی میکشوں کی صف میں لایا کھینچ کر اکثر
وہ پیرِ میکدہ، جامِ مئے گلفام ہے جس کا

کبھی پطرس بخاری سے، کبھی منٹو سے یاری ہے
کبھی لاہور نمبر سے مزیّن نام ہے جس کا

کبھی وہ غالب و اقبال کی مجلس کا رسیا ہے
کبھی پھر میر کی صحبت میں لطفِ عام ہے جس کا

حقائق پر نظر اُس کی، انیسِ ہر یگانہ ہے
سخنداں ہے، ہر اک صنفِ سخن پر کام ہے جس کا

اَدَب کے معرکوں کا دیدباں معلوم ہوتا ہے
عَلَم جنگاہ میں گلبار صبح و شام ہے جس کا

وہ لوٹ آیا ہر اک وادی سے سامانِ نظر لے کر
وہ بنجارہ، وہ بختاور، مبارک نام ہے جس کا

نقوشِ شوق کا راہی، رواں سُوئے مدینہ ہے
محمدؐ ہی وظیفہ اب تو صبح و شام ہے جس کا

رسولؐ اللہ کے در پر لئے سیرت کا خوش تحفہ
وہ حاضر ہو گیا آخر نکو انجام ہے جس کا

"خدا کا شکر ہے یُوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا"
کہ محبُوبِ خدا کا لطف ہی انعام ہے جس کا

ردائے شب کو اوڑھے، دُوریوں میں جا چُھپا ازہر
وہی مہتاب کی مانند روشن نام ہے جس کا

○

سیّد عطاحسین کلیم

محمد طفیل

طفیل سالکِ راہِ وفا، شہیدِ ادب ۔۔۔ تمام عمر جو دیتا رہا نویدِ ادب
فدائے ختمِ رسلؐ، حق کا دوستدار رہا ۔۔۔ چمن بدوش تھا، جاندادۂ بہار رہا
قدم قدم پہ لٹا کر نقوشِ حسنِ نگار ۔۔۔ وطن میں کر گیا روشن ادب کی راہگذار
سمجھائے اس نے کچھ ایسے نکات سیرت کے ۔۔۔ ورق ورق ہوئے تاباں نجوم عظمت کے
وطن سے عشق تھا اور "گلڈ" سے تھا پیار اسے ۔۔۔ ڈرا سکے نہ ستم ہائے روزگار اسے
رہِ حیات میں گرتا رہا، سنبھلتا رہا ۔۔۔ کمین گاہوں کے تیروں سے بچ کے چلتا رہا
ثباتِ عزم بھی، جوشِ جنوں بھی ساتھ رہا ۔۔۔ ہزار غم سہے، صبر و سکوں بھی ساتھ رہا
پکارتی رہی وحشتِ جنوں سے موت اسے ۔۔۔ مگر جب آئی، تو آئی سکوں سے موت اسے
بھنور میں تھا کبھی، منزل پہ آ گیا آخر ۔۔۔ نشانِ منزلِ مقصود پا گیا آخر
خوشا یہ خدمتِ اسلام و ذکرِ خیرِ انامؐ ۔۔۔ مقیمِ خلد ہو یارب طفیل خوش انجام
جو نقش اُبھرے گا آخر کو وہ فنا ہوگا ۔۔۔ مگر "نقوش"، چراغِ رہِ بقا ہوگا

حیاتِ فانی سے رشتہ اگرچہ توڑ گیا
طفیل لوحِ جہاں پر "نقوش" چھوڑ گیا

○

جمیل ملک

پیشوائی

(محمد طفیل کے لیے ایک نظم)

کیسی تھکن تھی، نیند تھی کیسی
تو جس کی آغوش میں جا کر
سوتے سوتے، سو ہی گیا ہے
— کس کو خبر ہے نیند سے پہلے
کتنے پیاروں، دلداروں کو
کتنے یاروں، غمخواروں کو
تُو نے پیار سے ہولے ہولے
آخری بار پکارا ہو گا
لیکن تو خود اُٹھ کر جائے
میٹھی نیند سے اُن کو جگائے
اُن کو اپنا درد بتائے
اُن کو ساری رات جگائے
تُو نے یہ کب سوچا ہو گا
تُو نے یہ کب چاہا ہو گا
— وہ جو سب تیرے اپنے تھے
وہ تو سب تیرے سپنے تھے

وہ تو تیرے ساتھ ہی ہوں گے
گہری نیند میں جا کر بھی تو
سرگوشی کے پیرائے میں
اُن سے باتیں کرتا ہوگا
——— سوتے سوتے خواب سے تیری
جس وادی میں آنکھ کُھلے گی
اُس وادی میں نُور بہت ہے
نورِ خدا کا ، نورِ نبیؐ کا
جو تیرا ایمان تھا پہلے
لیکن اب پہچان ہے تیری
——— تُو نے نیند سے پہلے پہلے
ایسا توشہ ساتھ رکھا ہے
اِس دنیا میں ، اُس دنیا میں
سب کے دل میں سب کی زباں پر
جس کی چاہت کا چرچا ہے
——— یہ چاہت انمول ہے تیری
پیار کی خوشبو کب مرتی ہے
نقش ترے سب پائندہ ہیں
تیرے بعد بھی یہ زندہ ہیں
——— مر کر بھی تیرے چہرے پر
نورِ ابد کا لہرایا ہے
یہ تجھ کو لینے آیا ہے

طاہر شادانی

محمد طفیل مدیرِ "نقوش" کی یاد میں

داغِ فرقت دے گیا ہم کو طفیل — تھا جو اردو کا ادیبِ نامدار
وہ کہ تھا ملکِ معانی کا سفیر — وہ کہ تھا اقلیمِ فن کا تاجدار
وہ کہ ایک شیوا بیاں نثار تھا — وہ کہ تھا اک منفرد خاکہ نگار
وہ کہ تھا نورِ نگاہِ دوستاں — وہ کہ تھا احباب کے دل کا قرار
تھا وہ اپنی ذات میں اک انجمن — زندگی کی عظمتیں اس پہ نثار
بے نیازِ شہرت و نام و نمود — خامشی سے روز و شب سرگرمِ کار
وہ سراپا صدق و اخلاص و وفا — پیکرِ ایثار و عجز و انکسار
کام سیرت پر وُہ ایسا کر گیا — جو زمانے میں رہے گا یادگار
رو رہے ہیں آج اسے اہلِ نظر — اہلِ دل ہیں اس کے غم میں سوگوار
آہ ویراں ہو گئی بزمِ قلم — لُٹ گئی گلزارِ اردو کی بہار

○

محفلِ احباب سے رخصت ہُوا — محفلِ احباب کا رُوح و رواں
چل دیا ہے کارواں کو چھوڑ کر — اہلِ دانش کا امیرِ کارواں
جس نے کی اردو کی خدمت عمر بھر — چل بسا وہ محسنِ اُردو زباں
وہ کہ تھی تحریر جس کی کاٹ دار — وہ کہ تھا جس کا قلم گوہر فشاں
آہ! لُوٹا موت کے قزاق نے — علم و فن کا ایک گنجِ شائگاں

ہے زوالِ علم و دانش اس کی موت ہے قیامت اس کی مرگِ ناگہاں
ثبت ہیں تاریخ کے اوراق پر اس کی عظمت کے نقوشِ جاوداں
زندگی آموز تھا اس کا عمل زندۂ جاوید ہے وُہ بے گماں
ہو گا ہر محفل میں اس کا تذکرہ لوگ دُہرائیں گے اُس کی داستاں

نور کی بارش ہو اس کی قبر پر
طائرِ جاں اس کا ہو خلد آشیاں

ڈاکٹر اقبال سرھندی

محمد طفیل نقوش

"آپ" کا اور "مِرا" "محترم" کھو گیا   کل جو موجود تھا ایک دم کھو گیا
"صاحبِ" عزّ و جاہ و حشم کھو گیا   ہر "محبّی" کے دل کا بھرم کھو گیا
وہ "جنابِ" ادب کا صنم کھو گیا
موت کے جھپٹے میں قلم کھو گیا

⊙

تھا وقارِ اہلِ دانش کا جس کے طفیل   دیدۂ شہر بینا تھا جس کے طفیل
حوصلہ مجھ میں در آیا جس کے طفیل   لفظ کا زخم گہنایا جس کے طفیل
درد کے گھر کا بابِ کرم کھو گیا
تھا جو بالائے تو، میں، کہ ہم کھو گیا

زرد پتّوں کو دے کر "نقوشِ" وفا   لی بچا اس نے سارے چمن کی انا
شوکتِ میر و غالب کو دے کر بقا   اوڑھ لا فانیت خود کہاں چل دیا
ہر "مکرّم" کو دے کے وہ غم کھو گیا
وہ "معظّم" تھا سر کر کے خم کھو گیا

⊙

قابلِ صد مبارک تھا اُس کا اصول　　حاصلِ زندگی جس کا عشقِ رسولؐ
دُور جو نہی ہوتی اُس کے شیشے کی دھول　　منزلِ عشق پر موت کر لی قبول

گوہرِ اہلِ دل یم بہ یم کھو گیا
مثلِ اقبالؔ و فیضؔ و عدمؔ کھو گیا

○

رزّاق افسر

نذرِ نقوش

۱۴۰۶ھ

اُف طفیلِ علم پرور اُٹھ گیا — فکر و فن کا نقشِ بہتر اُٹھ گیا
ذات جس کی تھی محیطِ فکر و فن — اُف ادب کا کیسا دفتر اُٹھ گیا
جو صحافت میں کِھلاتے گُل نئے — وہ بہارِ نو کا منظر اُٹھ گیا
اُس کا مرنا، گویا ہند و پاک سے — فکر و فن کا ہائے لشکر اُٹھ گیا
فکرِ اُردو کی حسیں ترسیل کا — ہائے اک انمول شہپر اُٹھ گیا
میر و منٹو، غالب و اقبال کے — نمبروں کا رنگِ احمر اُٹھ گیا
شخصیات و پطرس و لاہور کے — نمبروں کا حرفِ آخر اُٹھ گیا
یوں غزل نمبر ہوا ماتم کُناں — حیف قدرِ فن کا امبر اُٹھ گیا
ہیں مکاتیبِ ادب محوِ فغاں — کیسا نکتہ بینِ اشہر اُٹھ گیا
تیرہ[۱۳] جلدوں میں چھپا ذکرِ رسولؐ — شاہدِ حُسنِ پیمبرؐ اُٹھ گیا
سندھ و گنگا کے یہ ادبی فاصلے — پاٹنے والا قلندر اُٹھ گیا

چیخ اُٹھے ندرتِ فن کے نقوش
حیف کب تاریخی آذر اُٹھ گیا

۱۹۸۶ء

○

ماجد صدیقی

مجھے محمد نقوش کہیے

وہ شہد کی جستجو میں نکلا
تو گُل بہ گُل گھومتا گھماتا
پھلوں سے ہوتا
شکر بھری بوریوں کے کونوں تلک بھی پہنچا
وہ تتلیوں سا گلوں کا رسیا
مہک کے بیوپار میں لپکتا
نجانے کتنے ہی زاویوں سے
طلب کی پرواز کو بڑھاتا
زمیں سے تا آسماں گیا وُہ
ہُنر بیئے کا سا
اُس کو آتا تھا جو، اُسے وسعتیں دلاتا
جہانِ معنی بنا گیا وُہ
امام تھا وہ بصحنِ گلشن
تمام بھنوروں کی آرزو کا
وہ کوہکن تھا مگر نہ ایسا
کہ اپنے تیشے کو اپنے سر میں اُتار لیتا

وہ رُوح سیماب سی تھی جس کی
وہ جس کے اعصاب آہنی تھے
گزر چکا وہ ـــــ مگر یہی اب بھی کہہ رہا ہے
"کہ میں ہمیشہ تھا مستقل جہد اور طلب کا
نہیں جو دنیا میں اب محمد طفیل ہے وہ
کہ میں تو زندہ ہوں جب تلک حرف کو بقا ہے
مجھے محمد نقوش کہیے
کہ جس کا مینار میرے ہونے کا مدعا ہے"

نذیر احمد ناظر

محمد طفیل

ہے دل میں آج غم و درد کی فراوانی
وفورِ رنج و الم سے جگر ہُوا پانی
جہاں سے چل بسا واحسرتا! مدیرِ نقوش
ادب میں شخصیت اس کی تھی جانی پہچانی
جنابِ رحمتِ عالم کی پاک سیرت پر
مرتّب اس نے ہیں کی تیرہ جلدیں لاثانی
کیا پھر ان کو کمال اہتمام سے شائع
نظر کو کرتی منوّر ہے جن کی تابانی
دریغا! دے گیا احباب کو وہ داغِ فراق
نہیں ہے تھمتی عزیزوں کی اشک افشانی
الٰہی! بندۂ عاجز کی مغفرت فرما!
کر اس پہ رحم دعا گو ہے بزمِ انسانی
ہے ایک بندۂ نیک اپنے پیچھے چھوڑ گیا
طفیلِ عشقِ محمدؐ نقوشِ لافانی

○

سلمان سعید

محمد نقوش کے لیے ایک نظم

طفیل کی موت سے
ہر اک سُو
ادب کی دُنیا ہے ویراں ویراں
تمام حُرفوں
تمام لفظوں کی بھیگی آنکھیں ہیں
حیراں حیراں،
مگر ———
خوشی کی یہ بات ہے کہ
'بجھی ہوتی اس شمع کو جاوید نے نئے عزم و حوصلے سے
کیا ہے پھر اک بار روشن'
خدا کرے کہ
ہمیشہ قائم رہے ضیا یہ!
ہمیشہ دائم رہے ضیا یہ!!

○

بشیر حسین ناظم

تیرے دم سے تھا فروزاں دیدۂ کِلک و قلم

(اردو)

اے طفیل اے نوشۂ باراتِ اہلِ فکر و فن　　اِعتبارِ حلقۂ علم و ادب، جانانِ من[1]
تیری یادوں سے مزیّن ہے دِلوں کی انجمن　　تیری ہستی بے گماں تھی، گُلبنِ سرو و سمن

تیرے دم سے تھا فروزاں دیدۂ کِلک و قلم
تجھ سے مثلِ کیواں تھے صحافت کے عَلم

تُو جنابِ مصطفیٰؐ کے عشق کی تصویر تھا　　تو ادب کے رُخ کا غازہ، یُوسفِ تحریر تھا
تُو شبستانِ وفا و شوق کی تنویر تھا　　اہلِ دانش، صاحبانِ عزم کی جاگیر تھا

تیرے جوہر صالحیت، تقویٰ و تدبیر تھے
جو دیارِ خیر کی تشریف تھے تقدیر تھے

تیرا پیمانہ رحیقِ ناب سے معمور تھا　　تو ادب کی خدمتِ بے لوث پر مامُور تھا
غلغلۂ شوق تیرا ہم نوائے صُور تھا　　تیرا ہر عزم و عمل مبروک تھا مبرور تھا

طبع تیری حُسن کے نیرنگ سے مسحور تھی
تیرے اِک اِک لفظ سے خلقِ خدا مسرور تھی

معترف خدمات کے تیری حریف و یار سب　　یار تو قربان ہیں، اعدا بھی کرتے ہیں ادب
زُلفِ لیلیٰٔ ادب تُو نے سنواری روز و شب　　آئیں نظم و نثر میں رعنائیاں تیرے سبب

تُو نے نکتہ پروری کا عہد تازہ کر دیا
لُولوئے لالہ سے ہر نمبر کا دامن بھر دیا

---

[1] طفیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے پاس تشریف لاتے تو میں انہیں "معشوقِ من" کہتا اور اُن کے چہرے پر بشاشت و انبساط کے آثار پاتا اور وہ کہتے : تُو جی ناظم صاحب اِسا نوں دی......

سیرتِ خیرالبشرؐ کا لے کے تو اُٹھا عَلَم — کاروانِ خیر میں شامل کیے اہلِ قلم
تیری ہمت پر ہُوئے حیران سب اہلِ ہمم — کام کی تکمیل سے پہلے لیا نہ تُو نے دم

صاحبِؐ سیرت کو تیری اس طرح بھائی ادا
تجھ کو سب سیرت نگاروں سے مفضل کر دیا

اپنے در کی حاضری کی بھی تجھے توفیق دی — عزت و تمکین دی، توقیر دی، ترفیق دی
اور پھر قرآن نمبر کی تجھے تشویق دی — پیش کرنے کے لیے اک طرزِ نستعلیق دی

لیک تو اس خاکداں سے اِس طرح سے چل دیا
جیسے خوشبو پھول سے گلشن میں ہوتی ہے جُدا

پر، ہمیں کاملِ یقین، تُکلان ہے اُمید ہے — تیرا اِک اِک بچہ باہمت و خورشید ہے
جن کے قلب و جان میں روشن تری تجدید ہے — اور حاصل سب کو تیری رُوح کی تائید ہے

کام تیرا جاری و ساری رہے گا اے طُفیلؔ
نام بھی روشن رہے گا حشر تک مثلِ سُہیل

○

سُوجھوان وِدوان طُفیلؔ ہَیسی

(پنجابی)

اُردو ادب دی شان ودھان والا میرا یار ذیشان طفیل ہَیسی
عِلمی سَنگتاں، مجلساں محفلاں دی جِنّد، جان، روان طفیل ہَیسی

لہ دینِ اسلام جو کہ بقولِ کلام ان الدین عند اللہ الاسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔

گُتھلا خُوبیاں دا، پُتلا اُلفتاں دا، حق سچ دا مان طفیل ہیسی
اُنس، حِلم، محبت، صداقتاں دا، اُچا سُچا نشان طفیل ہیسی
نہیں سی سندھی بلوچی اکھوان والا، نہ پنجابی پٹھان طفیل ہیسی
پاکستان ای اوہدی پچھان ہیسی، مُسلمان ہر آن طفیل ہیسی

اوہدی ہمت دی داد جہان دِتّی، اوہدا عزم دی کوہ الوندؔ ہیسی
اساں اکو ادیب اریب ڈِٹھا، ہند سندھ نوں جہڑا پسند ہیسی
اوہدا قلب سی وطن پیار بھریا، اوہدے فکر دی موج بلند ہیسی
دین بارے جس ذرا اکواس کیتی اوہدے نال پاندا ڈاہڈا پھند ہیسی
اکھ نال سی گل سمجھا دیندا، سُوجھوان ودوان طفیل ہیسی
دلاں چھلاں داویری سی رج کے تے ڈاہڈا سچا انسان طفیل ہیسی

بڑی مدت طفیلؒ اُپکار کر کے اُردو ادب دا رُوپ سنگاریا سی
ہر اک صنف دی پیلی نوں رت دے کے پتے پتے نوں خوب گلزاریا سی
جہڑی صنف نوں ڈِیندا اودس ڈِٹھا، اوہنوں دے تلہ ہتھیں تاریا سی
تسی دستو لکھاریو سونہہ کھا کے کہڑے پڑ اندر کدی ہاریا سی؟
سچ پچھو تے میرا ایہہ فیصلہ جے وڈی قلم دی شان طفیلؒ ہیسی
جہدا یار اجو کے سنسار اندر نہیں سی جوڑ تے ہان طفیلؒ ہیسی

کرماں والی شبھ گھڑی سی جدوں اوہنے سیرت لکھن لکھان دا آہر کیتا
اپنا ناں حضورؐ دے خادماں وچ جلی حرفیں لکھوان دا آہر کیتا
بخشش مغفرت دی سوہنی سند لے کے فضل رب رحمان دا آہر کیتا
تیراں جلداں وچ کڈھ "رسولؐ نمبر" سِدھا جنتیں جان دا آہر کیتا
خوف اللہ رسولؐ دا جہدا ناظم ہیسی سازو سامان طفیلؒ ہیسی
اوہدی رُوح تے لکھ سلام ہوون، علم حلم دی کان طفیلؒ ہیسی

○

سوزِ دل

(فارسی)

آہ! شمسِ بزمِ ما مہرِ وفا — آفتابِ خُلق خورشیدِ صفا
مثلِ شعلہ تو فسردی از جہاں — بر خلافِ رسم شمس آسماں
کمتر از نورش نبُودہ نورِ تو — خور بداماں بود شمعِ طُورِ تو
گرچہ تو پنہاں شُدی اندر حجاب — لیک تابی در دلم چوں ماہتاب
اے طفیل اے بندۂ ربِ رحیم — مردِ مومن صاحبِ قلبِ سلیم
اے جمال و غازۂ رُوئے ادب — اے قسیمِ دولتِ مہر و طرب
والہ و شیدائے ختم المرسلین — جاں نثارِ رحمۃٌ للعالمین
مثلِ بُوئے برفتی از جہاں — جنّت الفردوس را کردی مکاں
خاطرم ناشاد کردہ رفتہ ای — باغِ دلِ ویراں کردہ رفتہ ای
دردِ دل دادی جگر را سوختی — نارِ ہجراں اندراں افروختی
رنجِ ہجرِ تو کشم شام و سحر — ہست ایں شاخِ محبت را ثمر
ایکہ ذکرت دلنواز و دلپذیر — اے بیادت کوکبِ جاں مستنیر
چوں بیاد آرم ہمہ الطافِ تو — خوبہائے تو ہمہ اوصافِ تو

مضطرب باشم، طپم ہمچو سَمک
آنکہ بیروں باشد از آبِ خنک

چوں سکوں یابم ز کربِ درد و غم — دست بکشائم بگویم دمبدم

اے مکین و ساکنِ دارالسّلام
باد از ما بر روانت صد سلام

○

عَلٰی اِرْتِحَالِ الطُّفَیْل

(عربی)

اِذَا مَاتَ الطُّفَیْلُ بَکَیْتُ جِدًّا   فَصَارَ الْقَلْبُ الْمَحْزُوْنُ طُرًّا
جَزِعْتُ عَلٰی رَحِیْلِ الْمُرْتَحَالِ   سَئَلْتُ الْخَالِقَ الْمَوْلَی الْمُعَالِیْ
یَغُوْرُ النَّجْمُ قَطُّ فِیْ تُرَابِ ؟   جَوَابُ جَاءَنِیْ مِنْ ذِی الْجَلَال
وَکَانَ" لِکُلِّ شَیْئٍ یَوْمُ مَوْتٍ

ترجمہ: جب طفیلؔ رخصت ہوئے
تو میں زار و قطار رویا
میرا دل پیکرِ حزن و ملال بن گیا
میں نے رحلت کرنے والے کی رحلت پر
اظہارِ دردمندی کیا
اور عظمتوں والے خالق و مولیٰ سے پوچھا:
کیا ستارا بھی کبھی مٹی میں چھپ جاتا ہے؟
تو ربِّ ذوالجلال کی طرف سے مجھے جواب ملا
جو یہ تھا:
"ہر شے کے لیے
موت کا ایک دن معین ہے"

○

TO TUFAIL

(ENGLISH)

Ah: icy hand of death,
snatched from us,
A man of excellence,
whom the lips of eminence,
used to kiss and buss.

Ah: A pearl of literature,
A cherisher of knowledge and ken,
A protector of Prestige of Pen,
A sign of nobility,
A mark of capability,
In a mood of exasperation,
Departed, showing indignation,
To the ephemeral world –
Which is meant to beguile
The men of understanding – imbecile.

O: You living in the chambers,
of Divine lights and Juxtaposition,
The pangs of your separation,
Make our hearts and souls pulsate.
We see towards you,
With yearning wishes and wistful eyes,
Come back: if you can,
But in reality,
You cannot revert to this locality,
Defying Providential Decree.
ONLY your Remembrance,
Will ameliorate and embalm,
My injured heart and wounded soul.

O

اُردُو ترجمہ از کیپٹن ڈاکٹر محمد مکرم بشیر

طفیل کی یاد میں

واحسرتا!
موت کے آہنی پنجے نے
ایک صاحب فضیلت کو چھین لیا
جس کے لبہائے کمال
استلام کرتے تھے

واحسرتا!
ادب کا گُلِ نوخیز لالہ
علم و دانش کا مُربّی
آبروئے قلم کا محافظ
علامتِ شرافت
نشانِ اہلیت
فانی دنیا سے
جو ضعیف الفہم لوگوں کو
دامِ تزویر میں لاتی ہے
ناراض ہو کر چلا گیا؛
اے تقربِ ربانی
اور انوارِ رحمانی

کے حجلوں میں رہنے والے
تیرے ہجراں کے درد
ہمارے قلوب وارواح کو
تڑپاتے ہیں
ہم تیری طرف
ترستی ہوئی آشاؤں سے
حسرت بھری نگاہوں سے
دیکھتے ہیں

ممکن ہو تو واپس آجاؤ
لیکن اب اس جگہ
امرِ مشیت کے خلاف
تیرا آنا مشکل ہے
اب تیری یادوں سے ہی
میرے مجروح قلب و جاں
وقتِ ارتحال تک
خوشتر و معطر ہوتے رہیں گے

○

تنویر بخاری

کیتا عشقِ رسولؐ دا حق پورا

جھاکن پے "نقوش" چوں نقش اوہدے
نقش حق دا جیس جما دِتّا
جلداں تیراںؔ وچ سیرت نُوں جمع کر کے
"سیرت نمبر" نُوں امر بنا دِتّا
ہویا نہیں سی کم جو اج تیکن
کر کے اوہ طفیل وکھا دِتّا
کیتا عشقِ رسولؐ دا حق پُورا
حقّی فرض تنویرؔ بجا دِتّا

○

علی احمد جلیلی

قطعۂ تاریخِ رحلت

تاریخِ ارتحال کی فکرِ بلیغ میں
امدادِ غیب سے جو ہوئی حسبِ ذیل ہے
نکلا سرِ زباں سے یہ مصرعِ وفات کا
انمٹ ہر ایک نقشِ محمد طفیل ہے
۱۴۰۷ھ

دیگر

کر گئے کُوچ دارِ فانی سے
چھپ گئی صورتِ مدیرِ نقوش
انجمن اُن کی ہو گئی ویراں
اب کہاں صحبتِ مدیرِ نقوش
وہ ادیب و صحافی و نقّاد
ثبت ہے عظمتِ مدیرِ نقوش
دیکھیے پڑھ کے ان کے خاکوں کو
ندرت و جدّتِ مدیرِ نقوش
ڈھونڈ کر اب کہاں سے لے آئیں
وہ قد و قامتِ مدیرِ نقوش
فرد و نادر نقوش کے نمبر
مظہرِ محنتِ مدیرِ نقوش
قابلِ قدر و لائقِ تقلید
ہمت و جرأتِ مدیرِ نقوش
یاد اردو زبان رکھے گی
مدتوں خدمتِ مدیرِ نقوش
اس روایت کو ہم رکھیں قائم
ہے یہی قیمتِ مدیرِ نقوش
جس قدر بھی کریں علیؔ کم ہے
ماتمِ حضرتِ مدیرِ نقوش
ایک نکلا یہ مصرعِ تاریخ
حسرتا رحلتِ مدیرِ نقوش
۱۹۸۶ء

○

کسریٰ منہاس

قطعاتِ تاریخ بر وفاتِ جناب محمد طفیل

چل بسے اس دیارِ فانی سے　　اُف! محمد طفیل فخرِ جہاں
سیدالمرسلینؐ کے عاشق تھے　　نام پر ان کے جان و دل قرباں
آلِ و اولادِ مصطفیٰؐ کے لئے　　ان کے دل میں تھا حُبِ بے پایاں
کم سخن دلنواز نیک نہاد　　تھے فرشتے کی شکل میں انساں
راہِ حق میں رضا کے طالب تھے　　تھے مشیّت کے تابعِ فرماں
سب کو دل سے عزیز رکھتے تھے　　ہائے وہ ان کی طبعِ فیض رساں
وضعداری میں فردِ کامل تھے　　اس زمانے میں ایسے لوگ کہاں
وہ فراست کہ اک جہاں ششدر　　وُہ تدبّر کہ عقل ہو حیراں
گوشہ ہائے ادب کے محرمِ راز　　طرز و اسلوب کی وہ روحِ رواں
وہ ادب کے تھے والا و شیدا　　اور ادب ان کے نام پہ نازاں
جن میں چرچے تھے ان کی دانش کے　　اب وہ پرلطف صحبتیں ہیں کہاں
صاف سادہ سلیس نثر ان کی　　ہر عبارت خلوصِ فکر کی جاں
جو کہاوٹ کے پاسداری سے　　ان کے خاکے ہیں ان کے دل کی زباں
ان کے ذہنِ رسا کے آئینے　　دیکھ لو وہ ’طلوع‘ میں ہیں عیاں
قدرداں سب ادیبِ ہند و پاک　　فن کے نقّاد ان کے مرتبہ داں
ایک سے ایک بڑھ کے کام کیا　　ایک سے ایک کی ہے عالی شاں
جس نے دیکھے نقوش کے نمبر　　دی ہے محنت کی دادِ بے پایاں

دیکھ کر ان کے کارناموں کو — خردہ گیرانِ وقت ہیں حیراں
کام جو ان کے نا تمام رہے — ہوں گے سب ان کی شان کے شایاں
راہ دکھلائیں گے ہمیں بڑھ کر — ان کے چھوڑے ہوئے قدم کے نشاں
ہم نے کی جب سنِ وفات کی فکر — طبعِ موزوں کا ہوگیا احساں

سالِ تاریخ سے ہُوا کسریٰ!
انکشافِ طفیلِ شستہ زباں
٦ ٠ ۴ ١ ھ

ولہ

"خدا جانے کس کی نظر کھا گئی" — ابھی تو نہ تھا ان کے مرنے کا سِن
ہے اب سُونی سُونی وہ بزمِ نقوش — اُداسی اُداسی ہے اب اُن کے بِن
جو علم و ادب کی فضا میں کٹے — پلٹ کر نہ آئیں گے پھر ایسے دِن
جو سیرت کے نمبر مرتّب کئے — دل ان کا تھا اس کام سے مطمئن
کہا فکرِ کسریٰ نے سالِ وفات — سنِ عیسوی میں عدد اس کے گِن
طفیلِ محمدؐ محمد طفیل — وہ باغِ ارم میں گئے مطمئن

٦ ٨ ۲ ٩ ١

ولہ

بزمِ دُنیا سے وہ رخصت ہو گئے — خلد میں ہیں اب طفیلِ خوش خصال
دل ہیں بریاں، چشم گریاں آہ آہ! — ان کے مرنے کا سبھی کو ہے ملال
ان کی شہرت لازوال و بے پناہ — کام ان کے بے عدیل و بے مثال
سحر تھا، اعجاز تھا، حُسنِ بیاں — پُرکشش ان کی انوکھی بول چال
ان کی ہر صنفِ ادب پر تھی نظر — ہوں گے نکتہ سنج ایسے خال خال

نقشِ جاں ہے اک سے اک نقشِ نقوش　　کس قدر ان کے اچھوتے تھے خیال
خونِ دل سے سینچ دی کشتِ ادب　　ہمسری ان کی کرے کس کی مجال
تھے مجلاتی صحافت کے زعیم　　اس حقیقت میں نہیں کچھ قیل و قال
دیدنی ہے حُسنِ ترتیبِ نقوش　　ہے جو ان کی کارفرمائی پہ دال
ایک طرزِ خاص کے مُوجد تھے وُہ　　ساتھ اپنے لے گئے اپنا کمال
آج کسریٰ! ہو گئے ہم سے جُدا
وہ ادیبِ خوش قلم دریا نوال
۶　۰　۴　۱　ھ

ولہ

زندہ رہے گی یادِ محمد طفیل کی　　تا زندگی نہ ہوں گے فراموش وُہ کبھی
وا حسرتا! وہ خاک کے پردے میں چھپ گئے　　روشن جو کل تلک تھی وہ قندیل بجھ گئی
دیکھو اٹھا کے صاحب و مخدومی و جناب　　وہ جن کی جان و دل سے ادیبوں نے قدر کی
پڑھئے معظم اور مجتبیٰ بھی دیکھئے　　ہیں خوب محترم بھی مجتبیٰ بھی آپ کی
الفاظ ان کے، ان کی عبارت گواہ ہے　　بھر دی ہے کیسی خاکہ نگاری میں زندگی
اسلوب منفرد ہے، نگارش لطیف ہے　　پاکیزہ ہے بیاں، زباں ہے دُھلی ہوئی
جو بھی کہا ہے، پاس رکھا اس کا عمر بھر　　وعدے کے تھے امین، بھروسے کے آدمی
یارب! رہے بہار پہ گلشن نقوش کا　　یارب! رہے یہ شاخ ہمیشہ ہری بھری
نکلا "عجیب" سال یہ کسریٰ دعائیہ
تربت بہشت میں ہو محمد طفیل کی
۶　۸　۹　۱　ء

ولہ

روزِ شنبہ، صبحدم چھبیسویں شوّال کی   چل دیے اس دارِ فانی سے سُوئے ملکِ جناں
سالِ ہجری کہہ دیا کسرؔی نے بہرِ یادگار   وہ طفیل نیک باطن، نکتہ سنج و نکتہ داں
۶   ۴   ۱   ھ

○

(مطابق ۵ جولائی ۱۹۸۶ء)

قطعاتِ تاریخ

بر وفات جناب محمد طفیل مرحوم مدیر "نقوش"

شان الحق حقی

کیا سخت سانحہ ہے محمد طفیل کا　　دل پر رہے گا داغ یہ برسوں تلک ہرا
تنہا نہ وُہ جریدہ نگاری میں طاق تھا　　سیرت کے باب میں بھی عجب کام کر گیا
محکم شد از طفیلِ محمدؐ مقامِ اُو
"ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ اُو"
۲ ۱ ۹ ۸ ۶

○

عبد الصمد صارم

شد طفیلِ ما اجل را بر ہدف　　اے تلف! وائے تلف! وائے تلف!
بود آں مانندِ پر گوھر صدف　　فخرِ کشور، اخترِ برجِ شرف
۱۴۰۶ھ　۲ ۱ ۹ ۸ ۶

○

مغیث الدین فریدی

نقوش کے جتنے خاص نمبر، طفیل کی زندگی میں نکلے
بہارِ دانش کے آئنے ہیں، چراغ ہیں علم و آگہی کے
وہ اس جہاں سے چلے گئے ہیں، مگر دلوں سے نہ جا سکیں گے
نقوش ہیں لازوال اُن کے، رہیں گے زندہ یہ کارنامے

جو مرقد پاکؐ پر یہ مصرع پڑھو تو سالِ وفات نکلے
طفیل دربارِ مصطفیٰؐ میں "رسولؐ" نمبر کو لے کے پہنچے

۱۹۸۶ء = ۱۶۱۹ + ۳۶۷

○

سیّد عارف محمود مہجور رضوی

ذی علم ذی شعور جنابِ طفیل آہ
دُنیا سے اُٹھ گئے ہیں وہ عالی صفات، کیسے

حاصل اُنہیں تھی علم میں یک گُونہ دسترس
اک انجمن تھی آپ کی اپنی ہی ذات، کیسے

ان کے "نقوش" کے سبھی انمٹ نقوش ہیں
سرچشمۂ کمال تھی ان کی حیات، کیسے

سیرتِ رسول پاکؐ کی تالیف کر کے وُہ
لے کر جہان سے سندِ نجات، کیسے

ہے "فخرِ بوستانِ ادب" صوتِ قدسیاں
مہجورؔ اُن کا آپ یہ سالِ وفات، کیسے

۱۴۰۶ھ

○

صاحبزادہ خضر عباسی نوشاھی

محمد طفیل آنکہ دانا سے ملّت
مدیرِ نقوش و سفیرِ محبت

محال است یادش فراموش کردن
عطا کرد ما را "نقوش" حقیقت

چوں ترحیل از دارِ فانی بہ عقبےٰ
ہماں وقت رفت از جہاں سُوے جنّت

بگو خضرِ نوشاہی تاریخِ مرگش
بخلدِ بریں جا ے زادہ عزت

۱۴۰۶

○

بصد افسوس می گویم کہ آں مردِ حُریت رفت
مگر گویم بشُکرِ حق، ازیں دنیا بہ عزت رفت

ؐ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

پرید آں مُرغِ علم و آگہی از شاخِ ایں عالم
بگو ای خضرِ نوشاہی کہ "آں طایرِ بجنت رفت"
۱۴۰۶ھ

○

فوت شد آں مردِ حق، ایمان بکف
آہ! زیرِ خاک او پنہاں گشت
ای خضر تاریخ ہای مرگِ او
"مجمع الحسنات ، عالی منقبت"
۱۴۰۶ھ

بود از عشاقِ طیبہ و نجف
بیش قیمت اعلیٰ و نادر صدف
از خرد بیروں آمد صعت بہ صفت
"فخرِ کشور"، "اخترِ بُرجِ شرف"
۱۴۰۶ھ ۱۹۸۶ء

○

آہ! اُس انسان نے پائی وفات
کرگیا ہے ثبت کچھ ایسے "نقوش"
مستفیض ہوگا جہاں ان سے مدام
تا ابد پُورا نہ ہوگا یہ خلا
اے خضر تاریخِ مردِ حق پرست

وقفِ اہلِ علم تھی جس کی حیات
ہے مزیّن جن سے لوحِ کائنات
دے گیا ہے ایسے وُہ علمی نکات
کرگئی پیدا جواب اُس کی ممات
"مجمع الحسنات ، سنجیدہ صفات"
۱۴۰۶ھ

○

محمد عالم مختار حق

بر رفتنِ طفیل زدُنیاے رنگ و بُو
آمد ندا زغیب کہ مختارِ حق بگو

کردم براے سالِ وصالش چوں جستجو
"ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ اُو"
۱۹۸۶ء

○

محبوب احمد تھابل

"نقوش" بے خزاں بخشے ہیں اس نے کرے گا اک زمانہ تا ابد یاد
کہو تاریخِ رحلت ان کی تھابلؔ ! "فروغِ اردو" سے خارج ہو "فواد"

۱۴۹۷ (−) ۹۱ = ۱۴۰۶

○

محمد شریف گل خوشنویس

مرگِ طفیلؔ پر مرے آنسو ٹپک پڑے
ان کے غم و فراق میں ملتا نہیں سکوں
خوشبو میں ہیں بسے ہوئے "نمبر" سبھی مگر
سیرت کی تیرہ[۱۳] جلدیں چھپ کے آگئیں یہ خوب!
"ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ او"

۲ ۱ ۹ ۸ ۲

تازہ رہے گا داغ یہ دل پہ ابد تلک
سوکھی نہیں ہے تر ہے مری آج تک پلک
سیرت کے "نمبروں" میں ہے کیسی عجب مہک
عشقِ محمدی کی ہے جن میں رچی جھلک
آمد ندائے دم بدم اے گلؔ ز نُہ فلک

⊙

مادہ ہائے تاریخ وفات جناب محمد طفیل مرحوم

مادہ ہائے تاریخ ہجری

صاحبزادہ خضر عباسی نوشاہی

زبدۂ اساتذہ محمد طفیل = ۱۴۰۶ھ

مدیرِ نقوش دور افتاد = ۱۴۰۶ھ

نقوش خالی شدہ = ۱۴۰۶ھ

خلد آسا مدیرِ نقوش = ۱۴۰۶ھ

بعونِ ایزدی بباغِ ارم = ۱۴۰۶ھ

طوطیِ اعجاز بیاں باغِ عدن میں = ۱۴۰۶ھ

گُلِ لطیف باغِ عدن میں = ۱۴۰۶ھ

ادیبِ آفاق باغِ جناں میں = ۱۴۰۶ھ

بسوئے باغِ جناں محمد طفیل = ۱۴۰۶ھ

میاں سعید الرحمٰن

ویعلمکم ما لم تکونوا تعلمون

۱۴۰۶ھ

محافظِ ادب ولیِ زمانہ محمد طفیل

۱۰۳۶ + ۱۴۹ + ۲۲۱ = ۱۴۰۶ھ

مرقدِ محبوبِ زماں، فدائے رسولؐ محمد طفیل مرحوم

۱۴۰۶ھ

مادہ ہائے تاریخ عیسوی

صاحبزادہ خضر عباسی نوشاہی

مغفرت ایزدی ہو بطفیلِ محمدؐ = ۱۹۸۶ء
بحکمِ خدا در باغِ جناں = ۱۹۸۶ء
زہے پاکباز بہ باغِ ارم رفت = ۱۹۸۶ء
مدیرِ نقوش دفن شد زیرِ خاک = ۱۹۸۶ء
خوشا بحرِ رحمت طفیلِ محمدؐ = ۱۹۸۶ء
حضورِ خواجۂ کونین محمد طفیل = ۱۹۸۶ء
لبِ باغِ ارم مدیرِ نقوش = ۱۹۸۶ء

میاں سعید الرحمٰن

تواریخ محمد طفیل محمد نقوش
۱۲۱۷ + ۲۲۱ + ۵۴۸ = ۱۹۸۶ء

آہ وصد آہ، محمد نقوش مغفور
۱۱۲ + ۵۴۸ + ۱۳۲۶ = ۱۹۸۶ء

از تاریخ رحلت طفیلؒ
۱ ۹ ۸ ۶

اختر برج شرف
۱ ۹ ۸ ۶

محسن شیریں سخن، محمد نقوش
۱۴۳۸ + ۵۴۸ = ۱۹۸۶ء

○


اشاریہ

اشاریۂ نقوش

مرتّبہ

سیّد جمیل احمد رضوی

تعارف

آئندہ صفحات میں نقوش کا اشاریہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس کام کو محمد طفیل مرحوم کی خواہش پر شروع کیا۔ ان کے مشورے سے اس کا خاکہ تیار کیا گیا۔ ان کا انتقال ۵ جولائی ۱۹۸۶ء کو ہو گیا۔ وقت نے انہیں مہلت نہ دی کہ وہ اپنے بہت سے دوسرے منصوبوں کی طرح اس کو مرتبہ صورت میں دیکھ سکیں۔ اس اشاریے کے "دو" حصے ہیں۔ پہلا حصہ شمارہ ۱ تا ۱۸ پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ شمارہ ۱۹ تا ۱۳۳ پر محیط ہے۔ اول الذکر حصے میں نقوش کے دو دور شامل ہیں۔ پہلے دور میں ادارت کے فرائض ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی نے سرانجام دیئے۔ یہ دور دسویں شمارے پر ختم ہو جاتا ہے۔ ۱۱ - ۱۲ ویں شمارے پر وقار عظیم مدیر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ یہ دور ۱۸ ویں شمارے پر ختم ہو جاتا ہے۔ شمارہ ۱۹ - ۲۰ محمد طفیل کی ادارت میں شائع ہوا۔ ان کی زندگی میں آخری شمارہ ۱۳۲ منظرِ عام پر آیا۔ شمارہ ۱۳۳ ستمبر ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا، اس پر جاوید طفیل کا نام مدیر کی حیثیت سے درج ہے۔ اس میں ابنِ محمد طفیل (مدیر) لکھتے ہیں، "چند صفحات اور ایک مضمون کے علاوہ تمام پرچہ محمد نقوش نے اپنی زندگی میں مرتب کیا تھا۔" اس بنا پر اشاریے میں اس پرچے کو تیسرے دور میں شامل کر لیا گیا ہے۔

نقوش کے جزوی اشاریے کے سلسلے میں پہلے بھی کام ہوا ہے۔ اس کا ادب عالیہ نمبر (دس سالہ تحریروں کا انتخاب) اپریل ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ اس شمارے کے آخر میں اس مجلّے کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست دی گئی ہے۔ اس میں عنوان اور لکھنے والے کا نام درج کیا گیا ہے۔ حوالے کے باقی ضروری حصے موجود نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اس کو صفحہ نمبر کے بغیر فہرست مندرجات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خطوط نمبر بیسویں سالگرہ کے موقع پر اپریل، مئی ۱۹۶۸ میں تین جلدوں میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کی تیسری جلد کے آخر میں ملک احمد نواز کا ترتیب دیا ہوا اشاریہ موجود ہے۔ اس میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ اشاریہ شمارہ ۱ سے ۱۰۸ (۱۹۴۸ء — ۱۹۶۷ء) تک صرف مضامین کی حد تک ہے۔ اشاریے میں خطوط بھی شامل کئے گئے ہیں۔ شمارہ ۱۳۰ رسولؐ نمبر ہے۔ یہ تیرہ جلدوں میں دسمبر ۱۹۸۲ء سے لے کر جنوری ۱۹۸۵ء تک شائع ہوا۔ اس کی بارہ جلدوں کا اشاریہ راقم نے مرتب کیا۔ یہ پانچ عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا۔ مقالہ نگاران، مقالات، موضوعات، مقامات اور کتب۔ رسولؐ نمبر کے حوالے سے اس کو جامع اشاریہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ اس نمبر کی ۱۲ ویں جلد کے آخر میں موجود ہے۔

اس پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ اشاریے نقوش کے جزوی مندرجات پر محیط تھے۔ نقوش کے تمام مطبوعہ شماروں کے ایک جامع اشاریے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ محمد طفیل مرحوم چاہتے تھے کہ ایک ایسا اشاریہ بنایا جائے جو کم سے کم تمام لکھنے والوں کی حد تک رسائی فراہم کرتا ہو۔ اس کے خاکے کی تشکیل کے آغاز میں فیصلہ کیا گیا کہ اس میں ادارئے شامل

نہ کئے جائیں۔ کتابوں پر تبصرے بھی اشاریے کا حصہ نہ ہوں گے۔ اشتہارات کو بھی چھوڑ دیا جائے گا۔ چنانچہ خاکے کے مطابق یہ عنوانات اس میں شامل نہیں کیے گئے۔ پہلے حصے کے عنوانات درج ذیل ہیں :

۱۔ مقالات
۲۔ نظمیں، غزلیں
۳۔ افسانے، ڈرامے
۴۔ خاکے، طنز و مزاح
۵۔ سمپوزیم
۶۔ متفرقات

مقالات کے تحت اندراجات کی ترتیب لکھنے والے کے نام سے الفبائی ہے۔ اندراج کے عناصر ترکیبی اس طرح ہیں، مقالہ نگار کا نام، عنوان مقالہ، شمارہ نمبر، خاص شمارے کا نام (اگر موجود ہے) قوسین میں تاریخ اشاعت اور آخر میں وہ صفحات جن پر مقالہ موجود ہے۔ باقی عنوانات کے ذیل میں بھی اندراجات کی ترتیب اسی طرح ہے۔ نظم اور غزل کی صورت میں شاعر کے نام کے بعد نظم کا نام اور غزل کے مطلع کا پہلا مصرع درج کر دیا ہے۔ پہلے اٹھارہ شماروں میں کئی ایسے شمارے موجود ہیں جن پر تاریخ اشاعت درج نہیں۔ اس صورت میں شمارہ نمبر کے بعد صفحہ یا صفحات کا اندراج کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ شمارہ ۱۹ ۔ ۲۰ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ محمد طفیل مرحوم کی زیر ادارت شائع ہونے والے شماروں پر مشتمل ہے۔ اس دور میں موضوعات کا تنوع وسیع ہو گیا۔ پرچے کی ضخامت میں بھی خاصا اضافہ ہو گیا۔ خاص نمبر بھی کثیر تعداد میں شائع ہونے لگے۔ اشاریے کا بڑا حصہ انہی مندرجات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس حصے کے عنوانات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

۱۔ مقالات
دینی مقالات
ادبی مقالات اور مضامین
۲۔ منظومات
حمد و نعت
نظمیں، غزلیں
۳۔ شخصیات (بشمول آپ بیتی)
۴۔ مکاتیب
۵۔ افسانے، ڈرامے (بشمول ناولٹ)

۶۔ خاکے، طنز و مزاح
۷۔ سمپوزیم
۸۔ رپورتاژ
۹۔ سفرنامہ
۱۰۔ انٹرویو
۱۱۔ متفرقات

اس حصے میں بھی ہر عنوان کے تحت اندراجات کی ترتیب لکھنے والے کے نام سے الفبائی ہے۔ ہر اندراج کے عناصر ترکیبی بھی پہلے حصے میں مذکورہ ترتیب سے ہیں۔ مقالات کو دو حصوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ رسولؐ نمبر کے مقالات کی اشاریہ سازی کے لیے یہ ضروری تھا۔ دینی مقالات کے عنوان کے نیچے ایک وضاحتی نوٹ دے دیا ہے جو اس کے مشمولات اور اندراج کے عناصر کی ترتیب پر روشنی ڈالتا ہے۔ منظومات کے تین حصے ہیں: حمد، نعت اور نظمیں غزلیں حمد و نعت کے ذیل میں بھی ایک وضاحتی نوٹ درج کر دیا ہے۔ یہ بھی اندراج کی ترتیب کے متعلق ہے۔

شمارہ ۴۱ ـ ۴۲ غزل نمبر ہے جو مئی ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس کو ترمیم و اضافہ کے ساتھ بعد میں بھی شائع کیا جاتا رہا۔ اس کی طباعت چہارم اکتوبر ۱۹۸۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اشاریہ سازی کے وقت پہلی اشاعت کو بنیاد بنایا گیا۔ بعد میں اس کا مقابلہ اکتوبر ۱۹۸۵ء والی اشاعت سے کیا گیا۔ جو اضافے نظر آئے، ان کے اندراجات بھی اشاریے میں شامل کر دیے ہیں۔ شمارہ ۴۹ ـ ۵۰ منٹو نمبر ہے، اس پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ نقوش کے اشاعتی خاکے میں اس کا سالِ اشاعت ۱۹۵۵ء لکھا ہے۔ اس حوالے سے متعلقہ اندراجات میں یہ سال درج کر دیا ہے۔ ادارۂ نقوش نے اقبال نمبر نومبر، ۱۹۷۷ء میں پیش کیا۔ یہ "نیرنگِ خیال" کا وہ تاریخی نمبر ہے جو حکیم یوسف حسن کی ادارت میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ ادارہ نقوش نے اس کو اضافہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس پر شمارہ نمبر درج نہیں ہے۔ اس بارے میں مدیر نقوش محمد طفیل مرحوم نے صفحہ ۲۹۰ پر لکھا: "شمارہ نمبر کے اعتبار سے ۱۲۲ شمارے چھپ چکے ہیں مگر میں اسے شمارہ نمبر ۱۲۳ نہیں کہوں گا، کیونکہ خاکسار اس نمبر کی خوشی میں شریک تو ہے، مگر کسی قسم کے کریڈٹ میں حصہ دار بننا نہیں چاہتا، میں نے جو کچھ کیا حکیم صاحب کی محبت میں کیا۔" اشاریہ سازی کے وقت اس نمبر کو شمارہ ۱۲۲ الف سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح اندراجات کے حوالے کی نوعیت میں یکسانیت رہے گی۔

سید جمیل احمد رضوی

ابواب کی ترتیب

پہلا حصہ

دُوسرا حصہ

پہلا حصّہ

شمارہ ۱ تا ۱۸

مارچ ۱۹۵۰ء

مقالات

ا

ب

نظمیں، غزلیں

نظمیں، غزلیں

(۳) موت سے پہلے، ۱۰ (۱۹۴۹ء) ۲۶
(۴) میں اکیلا رہ نہ جاؤں!، ۷، عالمگیر امن نمبر، ۶۶ - ۶۷
(۵) میں آج آئینہ لے کے نکلا ہوں، ۸، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ۶۷ - ۶۸
(۶) والپسی، ۱۷ - ۱۸، ناولٹ نمبر، ۲۵۸ - ۲۶۴
(۷) ہوا زمانے کی ساقی! بدل تو سکتی ہے، ۱۵ - ۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۱۰۶

سوامی مارہروی، پنجرے کے وہ دوار کھلے، ۱۳، ۳۶
(۲) پنچوں ہاتھوں پٹا دوالا، ۶، ۴۲
(۳) شانت سندیش، عالمگیر امن نمبر، ۶۰
(۴) کرِشنک بنتی (کسانوں کی فریاد)، ۸، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ۷۹

سیف، سیف الدین: چلن اب مجھ کو ترے دام تو لینے دیتے، ۴، جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء، ۲۱۳
(۲) رواں ہے سفینہ، ۳، ۳۲
(۳) کیا منزلِ غم سمٹ گئی ہے، ۱، ۶۲

سیماب اکبر آبادی، رباعیات، ۱، ۲۳

ش

شاد، نرلیش کمار: طلوع، ۹ (۱۹۴۹ء) ۳۲

شاد عارفی: بندگی کے باب میں لفظیں نہ برتا کیجئے، ۹ (۱۹۴۹ء) ۳۴
(۲) تری نگاہ میں انسان کا لہو پاکر، ۲، ۵۸
(۳) ساقی ہو۔ دریا دل ساقی۔ تھوڑی سی پلانا کیا جانو، ۷، عالمگیر امن نمبر، ۱۲۸
(۴) قطعات، ۸، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ۷۳
(۵) میں نے کانٹوں میں لچک پائی ہے، ۴، جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء، ۲۱۰

شاعر لکھنوی: آنسو شعلوں میں ڈھل رہے ہیں، ۱۱-۱۲ (مئی ۱۹۵۰ء) ۱۹
(۲) بنا کے لغزشِ پیہم کو زندگی میں نے، ۱۳، ۴۱
(۳) جشنِ عید یا جشنِ ماتم؟ ۱۴، ۴۵
(۴) نفس نفس ہے فسردہ نظر نظر غم ہے، ۱۵-۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۱۱۰

شاہد، مجید: جو کائنات کو خود میں سمو نہیں سکتے، ۱۰ (۱۹۴۹ء) ۳۷
(۲) چلے ہیں وہ بھی غموں سے فراغ پانے کو، ۶، ۹۰
(۳) منزل کا تعین کیا معنی، منزل ہے زوالِ فکر و نظر، ۸، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ۲۰۵
(۴) مے وہی ہے یہ جام بدلے ہیں، ۱۱-۱۲ (مئی ۱۹۵۰ء) ۲۰

شریف کنجاہی: آمریت کی قربان گاہ پر، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ۷۸

شفیق الرحمٰن: خرّاٹے، ۱۱-۱۲ (مئی ۱۹۵۰ء) ۱۰۶-۱۰۷
(۲) کون (نظم)، ۴، جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء، ۲۱-۲۲

شہاب انصاری: دلوں کی ٹیس کو سمجھے ہیں لوگ افسانے،

ق

ک

سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۱۱۲
ندیم قاسمی، احمد : پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے، ۸،
آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ۱۹۹
(۲) ثواب سے گناہ تک، ۳، ۳۶-۳۷
(۳) جدید تر، ۴، جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء،
۱۰۸
(۴) چراغاں، ۸، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ۷۲
(۵) چنگ کنگ سے چلّی تک، ۷، عالمگیر امن نمبر،
۵۵-۵۶
(۶) دستِ گلچیں میں کھِل رہی ہے کلی، ۳، ۸۶
(۷) ظلم کے خلاف لڑنے والے فن کاروں کے
نام، ۵، ۹۶-۱۰۱
(۸) رباعیات، ۱، ۲۴
(۹) رس میں جو بات ہے وہ مس میں نہیں،
۲، ۶۲
(۱۰) عنفوانِ شباب، ۲، ۳۷
(۱۱) فریب رنگ عیاں ہے، جدھر نگاہ کردں،
۱، ۶۱
(۱۲) قطعہ، ۲، ۴۳
(۱۳) وقت، ۱۰ (۱۹۴۹ء) ۳۳
(۱۴) نہاں ہے محشرِ آہنگ زیرِ پردۂ ساز،
۹ (۱۹۴۹ء) ۳۷
نظر، ظہور : پیار کی ساکت جھیل میں جب بھی تیری یاد نے
کنکر پھینکے، ۸، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ۲۰۶
(۲) حیات وقفِ غمِ روزگار کیوں کرتے، ۷،
عالمگیر امن نمبر، ۱۳۰

(۳) سیلِ انوار، ۷، عالمگیر امن نمبر، ۶۲
(۴) میں ترا کون ؟، ۹ (۱۹۴۹ء) ۳۱
نظر، قیوم : اک موت ہے سہارا، ۴، جشنِ آزادی نمبر
۱۹۴۸ء، ۲۱۲
(۲) ایک دن، ۱۵-۱۶، سالنامہ (دسمبر
۱۹۵۰ء) ۱۳۰
(۳) پھر کوئی شعلہ کارگر سے ہے، ۲، ۶۱
(۴) دل ٹوٹے ہے میرے سہارو، ۱۵-
۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۱۰۲
(۵) گیت، ۵، ۹۵
(۶) مناجات، ۱، ۲۶
(۷) یہ بھول، ۳، ۳۱
نظر حیدر آبادی : کیسے ہیں بادِ صبا اہلِ چمن میرے بعد،
۱۵-۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۱۱۸
نظیر صدیقی : ہمدم! ابھی نہ چھیڑ مہ و کہکشاں کی بات، ۱۴، ۲۴
نفیس چغتائی : مل گئی جس کو فطرتِ شہباز، ۱۵-۱۶،
سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۱۲۱
"نمو" : میں تے توں (ایک پنجابی نظم)، ۸، آزادی نمبر
۱۹۴۹ء، ۲۳۰
نہال سیوہاروی : اک شخص جواں خاک بسر یاد تو ہوگا،
۱۵-۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۱۰۷

و

وحشت، رضا علی : کوئی مایوس ہوتا ہے کوئی دلشاد ہوتا ہے،
۱۵-۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۹۵
وحشت کلکتوی : کسی طرح دن تو کٹ رہے ہیں فریبِ امید
کھا رہا ہوں، ۱۴، ۳۶-۳۷

افسانے، ڈرامے

افسانے ڈرامے

ت

تاثیر، ڈاکٹر: کھیل، ۴، جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء، ۱۶۹ - ۱۷۹

تبسم، صوفی: چودھری، ۱۵-۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۲۰۵ - ۲۰۷

ج

جاوید اقبال: ہیلو، ۳، ۶۵ - ۸۰

جلیس، ابراہیم: پرمٹ، ۵، ۱۲۹ - ۱۳۳

(۲) سکینہ زوجہ...؟، ۹ (۱۹۴۹ء) ۵۲ - ۵۸

(۳) منزل ہے کہاں تیری، ۷، عالمگیر امن نمبر، ۱۱۳ - ۱۱۹

ح

حبیب اشعر: دیکھیے اشعر، حبیب

حمید، اے: ایک رات، ۹ (۱۹۴۹ء) ۵۹ - ۶۷

(۲) جہاں برف گرتی ہے، ۱۷-۱۸، ناولٹ نمبر، ۱۳۵ - ۱۷۵

(۳) حسن اور روٹی، ۶، ۵۰ - ۵۸

(۴) صحرا، صحرا، ۱۱-۱۲ (مئی ۱۹۵۰ء) ۱۴۰ - ۱۴۴

(۵) وہ ڈالیاں چمن کی، ۱۵-۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۲۱۸ - ۲۳۱

حمید اختر (مترجم): جدوجہد از کوبایاشی، ۱۰ (۱۹۴۹ء) ۴۱ - ۵۰

خ

خدیجہ مستور: ٹامک ٹوئیے، ۲، ۳۸ - ۴۳

(۲) چلی پی کو ملن، ۸، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، ۹۳ - ۱۰۲

(۳) محاذ سے دُور، عالمگیر امن نمبر، ۱۰۴ - ۱۱۲

(۴) نیا سفر، ۵، ۱۱۷ - ۱۲۳

د

دھیر، سنتوکھ سنگھ: ڈاکو، ۱۰ (۱۹۴۹ء)، ۵۶

س

سعادت حسن منٹو: (؟)، ۴، جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء، ۱۳۳

سلطان الحسن: نقوش، ۷، عالمگیر امن نمبر، ۱۲۴ - ۱۲۷

سلیم بانڈلے: گرتے گھر، ۱۳، ۶۴ - ۶۷

سینسم، ولیم: فاختائیں، ترجمہ نمو، ۱، ۵۲ - ۵۵

ش

شکیلہ اختر: آخری سہارا، ۴، جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء، ۱۵۹ - ۱۶۸

(۲) جھنڈا اونچا رہے ہمارا، ۷، عالمگیر امن نمبر، ۱۲۰ - ۱۲۳

(۳) گھر یا ویرانہ، ۱۱-۱۲ (مئی ۱۹۵۰ء) ۱۴۵ - ۱۵۶

شوکت تھانوی: سانچ کو آنچ، ۱۵-۱۶، سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) ۱۹۵ - ۱۹۸

(۲) سسرال، ۱۷-۱۸، ناولٹ نمبر، ۴۹ - ۹۲

(۳) لحاف اندر لحاف، ۲، ۵۰ - ۵۲

خاکے، طنز و مزاح

خاکے، طنز و مزاح

سمپوزیم

سمپوزیم

ل

ادارہ : ہماری زبان، ۱، ۶۴

حصہ لینے والے : ڈاکٹر عبدالحق، سیماب اکبر آبادی، خواجہ احمد فاروقی، احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی اور خدیجہ مستور۔

ادارہ : ہماری زبان، ۲، ۶۳ - ۶۴

حصہ لینے والے : نیاز فتحپوری، آل احمد سرور، اختر اورینوی، عزیز احمد، معین احسن جذبی اور خواجہ احمد عباس۔

ادارہ : ہماری زبان، ۳، ۸۷ - ۸۸

حصہ لینے والے : ڈاکٹر باقر، عبادت بریلوی اور آغا محمد اشرف۔

ادارہ : ہماری زبان، ۴، جشن آزادی نمبر ۱۹۴۸ء، ۲۱۷ - ۲۲۱

حصہ لینے والے : آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، اثر لکھنوی، میاں بشیر احمد، اپیندر ناتھ اشک، اختر الایمان، جاں نثار اختر اور انجم فاروقی۔

ع

عبداللہ سید و باری علیگ : پاکستان کی قومی زبان (ایک مباحثہ)، ۳، ۱۵ - ۱۷

متفرقات

متفرقات

دُوسرا حصّہ

شمارہ ۱۹ تا ۱۳۳

اپریل ۱۹۵۱ء ــــــ ستمبر ۱۹۸۶ء

مقالات

دینی مقالات

اس عنوان کے تحت چھ مقالات کے سوا باقی تمام اندراجات رسولؐ نمبر کے ہیں۔ اس کا شمارہ ۱۳۰ اور جلدیں ۱۳ ہیں جو دسمبر ۱۹۸۲ء سے جنوری ۱۹۸۵ء تک شائع ہوئیں۔ اندراج میں مقالہ نگار کے بعد شمارہ، جلد نمبر، قوسین میں تاریخِ اشاعت اور آخر میں صفحات درج کر دئیے ہیں۔ ۶ مقالات دُوسرے نمبروں سے ہیں۔ ان کے مکمل حوالے دے دیے ہیں۔

ا

آزاد، ابوالکلام : پیغامِ محمدؐ، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۳۰۶ - ۳۳۷

(۲) حضرت عمرؓ کے آخری لمحات، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۶۹۶ - ۶۹۹

(۳) سیرت اور مطالعۂ سیرت، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۱۰۹ - ۱۲۸

(۴) کارنامۂ سیرت 'بے رحم تاریخ کی کسوٹی پر'، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۲۸۹ - ۳۰۵

آزاد، محمد اسمٰعیل : اسلامی معاشرہ اور نابینا افراد'، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۴۷۶ - ۴۹۸

آفتاب حسین، شیخ : رسول اکرمؐ بحیثیت مظہر ختم نبوت، ۱۳۰ : ۸ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۶۶۱ - ۶۸۵

(۲) وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۲۹۱ - ۲۹۵

آل احمد رضوی، سید : ادب قبل از اسلام میں ذکرِ رسولؐ، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۲۶ - ۵۰

ابن اسحٰق : سیرۃ ابن اسحٰق مسماۃ بکتاب المبتداء والمبعث و المغازی، تحقیق و تعلیق از محمد حمید اللہ۔ ترجمہ از نور الٰہی ۱۳۰ : ۱۱ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷ - ۳۵۴

ابن حکیم غلام مصطفیٰ : رحمۃ للعالمینؐ کی قائم کردہ چراگاہیں، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۱۸۳ - ۱۸۶

ابنِ ہشام العافری : بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے والے وفود۔ ترجمہ از محمد عبدالحکیم شرف قادری، ۱۳۰ : ۷ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۶۶۰ - ۷۲۰

ابوالاعلیٰ مودودی، سید : دیکھیے مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔

ابوبکر غزنوی، سید : رحمتِ عالم کا ہمہ گیر انقلاب، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۲۳ - ۳۹

ابوالحسن علی ندوی، سید : دیکھئے ندوی، سید ابوالحسن علی

ابوسلمان شاہجہان پوری : الدفاع فی الاسلام، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۲۸۷ - ۲۹۷

ابوالکلام آزاد : دیکھیے آزاد، ابوالکلام

ابومحمد ثاقب کانپوری : دیکھیے ثاقب کانپوری، ابو محمد

ابونعیم احمد اصبہانی : اصحابِ صُفّہ، ترجمہ از حافظ محمد سعد اللہؒ، ۱۳۰ : ۸ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۴۵۱ - ۵۱۷

ابوالنصر، عمر : خلفائے محمدؐ، ترجمہ از محمود احمد۔ نظر ثانی از

(۲) عہدِ جدید کے مسائل اور آنحضرتؐ کا پیغام، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۷۰۳ - ۷۱۱

اصلاحی، ضیاءُ الدین : حدیثوں کی جمع و تدوین، ۱۳۰ : ۶ ۲۱۵ - ۲۲۵

اصلاحی، محمد اجمل : ابنِ ہشام اور سیرت ابنِ ہشام، ۱۳۰ : ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۲ - ۴۹۷

اصلاحی، محمد اجمل (مترجم) : پہلے سیرت نگار۔ حضرت عروہ بن الزبیر از خلیل ابراہیم، ۱۳۰ : ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۳۹۷ - ۴۰۹

(۲) الدُّرر فی اختصار المغازی والسیَر از شوقی ضیف، ۱۳۰ : ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۶۱۵ - ۲۳۵

اظہر، ظہور احمد : ارشاداتِ نبویؐ (جوامع الکلم)، ۱۳۰ : ۸ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۵۴۹ - ۵۶۵

(۲) فصاحتِ نبویؐ، ۱۳۰ : ۸ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۳۳۷ - ۳۹۲

اعجاز الحق قدوسی : دیکھیے قدوسی، اعجاز الحق

افضل حق : ظہور قدسی، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ص ۷۰ - ۷۰۷

اقبال، علامہ ڈاکٹر محمد : جناب رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۶۴۷ - ۶۴۸

(۲) محفل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۶۴۹ - ۶۵۰

اقبال احمد نوری : دیکھیے نوری، اقبال احمد

الٰہی بخش کاندھلوی : شیم الحبیب، ترجمہ از اشرف علی تھانوی، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۲۴۹ - ۲۶۸

امیر علی، سید : دنیائے قبل از اسلام پر ایک نظر، ترجمہ از محمد ہادی حسن، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۲۱ - ۴۰

امین الدین، سید : طبِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۹۲ - ۱۰۰

انوار الحق، محمد : اوصافِ رسولؐ، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۱۶۳ - ۲۲۷

ب

بٹمی، اے - جی : محمدؐ اور عیسٰیؑ، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۵۴۸ - ۵۴۹

برق، غلام جیلانی : ابن الجوزی اور سوانح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ۱۳۰ : ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۷۰۱ - ۷۰۸

(۲) رسالتؐ نامہ - دریا بہ حباب اندر، ۱۳۰ : ۲ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۴۳ - ۵۰

(۳) مہماتِ رسولؐ، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۳۷۳ - ۴۳۲

بشیر الدین پنڈت : ہندوؤں کی کتب مقدسہ میں بشاراتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۵۵۵ - ۵۵۹

البوصیری، محمد شرف الدین : قصیدہ بردہ شریف، فارسی ترجمہ از ملا محمد عبدالرحمٰن جامی، اردو ترجمہ از محمد فیاض الدین نظامی بہزاد دکن، ۱۳۰ : ۲ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۷۴۰ - ۷۶۰

ت

تائب، حفیظ : اُردو نعت، ۱۳۰ : ۱۰ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۱۶۹ - ۱۹۲

تحسین فراقی (مترجم) : ابن اسحٰق اور سیرۃ الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، از الفرڈ گیوم، ۱۳۰ : ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۴۱۰ - ۴۵۱

حمیداللہ، محمد: عہدِ نبویؐ کا نظامِ تعلیم، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۱۱۵ - ۱۲۷

(۲) عہدِ نبویؐ کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۵۵۵ - ۵۶۱

(۳) عہدِ نبویؐ کے اصولِ سیاسیات، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۶۴۴ - ۶۵۱

(۴) عہدِ نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۶۳۴ - ۶۴۳

(۵) سرورِ کائنات کی حکومت، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۶۰۷ - ۶۲۲

(۶) محاکمہ سیرت ابن اسحٰق، ۱۳۰ : ۱۱ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۳۵۵ - ۳۹۶

(۷) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ترجمہ از نذیر حق، ۱۳۰ : ۲ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۵۱۳ - ۶۸۲

حمیداللہ، محمد (مرتب): سیرت ابن اسحٰق مسماۃ بکتاب المبتدا والمبعث والمغازی، ترجمہ از نورالٰہی، ۱۳۰ : ۱۱ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷ - ۳۵۴

حمید یزدانی، خواجہ: فارسی نعت - سرسری جائزہ، ۱۳۰ : ۱۰ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۱۴۶ - ۱۶۸

حیدر زماں صدیقی: عہد نبوت کے عرانی اور تمدنی مسائل، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۷۳۴ - ۷۴۸

خ

خازن مجددی، محمد نصراللہ خاں: رسول اکرمؐ کے کلام کی فصاحت و بلاغت، ۱۳۰ : ۸ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۴۴۱ - ۴۴۹

خالد کمال مبارک پوری: برناڈ شا اور عرب، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۵۵۰ - ۵۵۴

خالد مسعود: سیاست نبویؐ کا ایک اہم پہلو، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۵۷۳ - ۵۷۵

خدیجۃ النسآ، ایم سراج: رسول اللہؐ اور طبقہ نسواں، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۵۰۷ - ۵۱۷

الخطیب، محمد عجاج: صدرِ اسلام میں حدیث کی کتابت و تدوین، ترجمہ از احمد خاں، ۱۳۰ : ۶ (دسمبر ۱۹۸۳ء) ۲۲۶ - ۲۳۸

خلیق دہلوی: معجزانہ قوتِ انقلاب کا داعی، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۲۸۶ - ۲۹۰

خلیق نقوی (مترجم): کتابت احادیث، عہدِ نبویؐ میں از محمد زبیر صدیقی، ۱۳۰ : ۶ (دسمبر ۱۹۸۴ء) ۲۳۹ - ۲۴۵

خلیل ابراہیم: پہلے سیرت نگار حضرت عروہ بن الزبیر، ترجمہ محمد اجمل اصلاحی، ۱۳۰ : ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۳۹۷ - ۴۰۹

خلیل احمد: دُنیا کا آخری پیغمبرؐ، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۳۳۲ - ۳۵۲

خلیل حامدی: عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہ کی تعلیمی سرگرمیاں، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۱۳۷ - ۱۴۰

خورشید احمد، پروفیسر: نبی اکرمؐ بحیثیت داعی الی الحق، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۳۹۶ - ۴۰۱

خورشید احمد گیلانی، سیّد (مترجم): معمولاتِ رسولؐ، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۴۲۳ - ۵۰۷

د

درو، رگھوناتھ راؤ: ظہورِ قدرت، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۴۳۳ - ۴۳۷

ر

رحمٰن، ایس اے: رسول اللہؐ کے عہد میں نظامِ عدل، ۱۳۰ : ۳

ص

ض

ظ

(صلّی اللہ علیہ وسلم) ترجمہ از ڈاکٹر سید مطلوب حسین، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۲۲۸ - ۲۳۱

محمود عالم قریشی (مترجم)، خلفاءِ محمدؐ (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے عہد میں عدلیہ اور انتظامیہ از ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، ۱۳۰ : ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۵۲۳ - ۶۲۶

(۲) عہدِ نبویؐ میں عدلیہ اور انتظامیہ از ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، ۱۳۰ : ۱۱ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۵۶۷ - ۷۶۳

مرتضیٰ حسین فاضل، سید، آنحضرتؐ کی پہلی سیاسی فتح (ہجرتِ حبشہ)، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۵۷۶ - ۵۹۶

مرتضیٰ المطہری، شہید، النبی الاُمّی، ترجمہ از نور الٰہی، ۱۳۰ : ۷ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۷۲۱ - ۷۵۲

مسعد سویلم الشامان - دیکھیے الشامان مسعد سویلم

مسعود الرحمٰن خاں ندوی، دیکھیے ندوی، مسعود الرحمٰن خاں

مسعود مشہدی، سید، جنّت البقیع، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۱۶۴ - ۱۶۸

(۲) شہدائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم (جنھوں نے حضورؐ کے پیغام پر لبیک کہا)، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۲۰۶ - ۲۲۸

مسعود مشہدی (مترجم): عظیم یادیں (جنھیں حضورؐ سے نسبت ہے)، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۱۸۷ - ۲۰۵

(۲) مدینۃ الرسولؐ، بزبانِ محمد رسول اللہ، ۱۳۰ : ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۱۲۹ - ۱۴۰

(۳) ہجرتِ نبویؐ (قیام، راہیں، منزلیں) از عبدالقدوس انصاری، ۱۳۰ : ۸ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۳۲۱ - ۳۳۶

مطلوب حسین، سید: کائنات، انسان، ضرورتِ نبوت اور ختمِ نبوت کی اہمیت، ۱۳۰ : ۸ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۶۸۶ - ۷۳۱

(۲) واقعۂ ہجرت کی عالمگیر اہمیت، ۱۳۰ : ۸ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۲۰۹ - ۲۳۳

مطلوب حسین، سید (مترجم): جوہرِ خُلقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) از شیخ الازہر عبدالحلیم محمود، ۱۳۰ : ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۲۲۸ - ۲۳۱

منظہر الدین صدیقی، محمد: اسلام اور جنسی مساوات، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۴۹۹ - ۵۰۶

(۲) انسانیت اسلام سے پہلے، ۱۳۰ : ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۷ - ۲۰

منظہر صدیقی، محمد یٰسین: تاریخ یعقوبی - سیرتِ نبویؐ کا ایک قدیم ماخذ، ۱۳۰ : ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۵۶۳ - ۵۹۴

(۲) تعلیقات و حواشی (متعلقہ "عہدِ نبویؐ میں تنظیمِ ریاست و حکومت"۔ بقایا جلد پنجم)، ۱۳۰ : ۱۲ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۱۰۰ - ۲۷۹

(۳) ضمائم (متعلقہ "عہدِ نبویؐ میں تنظیمِ ریاست و حکومت"۔ بقایا جلد پنجم)، ۱۳۰ : ۱۲ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۸ - ۹۹

(۴) عہدِ نبویؐ کی ابتدائی مُہمیں - محرکات، مسائل

ن

۱۹۸۴ء) ۲۶۰-۲۶۸

(۲) عہدِ نبویؐ میں ریاست کا نشوو ارتقاء، ۱۳۰: ۵ (دسمبر ۱۹۸۳ء) ۱۱-۳۴۰

(۳) مستشرقین اور مطالعۂ سیرت، ۱۳۰: ۱۱ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۴۸۱-۵۶۵

(۴) مواخاتِ صحابہ، ۱۳۰: ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۵۲۳-۵۴۲

(۵) ہجرتِ مدینہ کے اسباب و محرکات، ۱۳۰: ۸ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۲۳۴-۲۴۵

نثار احمد فاروقی: انسانیت کا منشورِ آزادی، ۱۳۰: ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۷۴۳-۷۴۶

(۲) الرسالات النبویہ یعنی رسولِ اکرم فخرِ عالم و آدم محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے منتخب مکتوبات و فرامین کا عربی متن مع ترجمہ و مختصر حواشی، ۱۳۰: ۲ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۲۰۵-۲۶۶

(۳) طبقات ابنِ سعد (سیرتِ نبویؐ کا قدیم ماخذ)، ۱۳۰: ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۴۹۸-۵۶۲

نجار، غلام قادر (مترجم): عثمانؓ پر کیے گئے مراقی کا ذکر، ۱۳۰: ۹ (جنوری ۱۹۸۴ء) ۷۰۸-۷۱۲

ندوی، ابوالجلال: فخرِ موجودات (آنحضرتؐ کی زندگی)، ۱۳۰: ۲ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۴۶۹-۴۹۰

ندوی، سید ابوالحسن علی: بارگاہِ نبویؐ میں، ترجمہ از سید محمد الحسنی، ۱۳۰: ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۷۱۵-۷۲۳

(۲) بعثتِ محمدیؐ سے پہلے، ۱۳۰: ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۹۳-۱۲۷

(۳) پندرھویں صدی ہجری — ماضی و حال کے آئینے میں، ۱۳۰: ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۹-۳۷

(۴) سیرت نگاری کی ذمہ داریاں، ۱۳۰: ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۸۱-۸۸

(۵) عالمِ عربی کی قیادت، ۱۳۰: ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۵۶۲-۵۷۲

(۶) نبوت کا عطیہ، ۱۳۰: ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۳۷۵-۳۸۴

ندوی، عبدالرحمٰن: اسمِ پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ۱۳۰: ۳ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۱۶۷-۱۷۱

ندوی، محمد حنیف: آنحضرتؐ کا اسلوبِ دعوت و ارشاد، ۱۳۰: ۴ (جنوری ۱۹۸۳ء) ۴۴-۴۷

(۲) قرآنِ حکیم اور اطاعتِ رسولؐ، ۱۳۰: ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۲۰۳-۳۱۱

(۳) قرآن سے مظہرِ نبوت کی تشریح، ۱۳۰: ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۲۲۱-۲۳۱

ندوی، مسعود الرحمٰن خاں: ابنِ کثیر (سیرت نگار رسول صلی اللہ علیہ وسلم)، ۱۳۰: ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۶۴۶-۶۹۰

ندیم الواجدی: سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو، ۱۳۰: ۱ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۵۲-۶۹

نظامی، محمد فیاض الدین (مترجم): قصیدہ بُردہ شریف از محمد شرف الدین البوصیری، ۱۳۰: ۲ (دسمبر ۱۹۸۲ء) ۷۴۰-۷۶۰

نعیم صدیقی: رسولؐ اللہ — ایک نظر میں، ۱۳۰: ۲ (دسمبر

ادبی مقالات و مضامین

(۳) کربل کتھا، مختار الدین آرزو و مالک رام، ۱۰۵،
سالنامہ، پہلا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء)
۲۵ - ۵۱
(۴) مصر کا ایک نامور مصنف - احمد امین (تاثرات)،
۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۲۶ - ۳۰
آزاد، جگن ناتھ: اقبال کا مثالی انسان، ۱۲۱، اقبال نمبر
(ستمبر ۱۹۷۷ء) ۲۷۵ - ۲۸۹
(۲) اقبال کی اپنے کلام پر نظر ثانی، ۱۲۱، اقبال نمبر
(ستمبر ۱۹۷۷ء) ۲۳۴ - ۲۶۵
(۳) اقبال مغربی خاور شناسوں کی نظر میں، ۱۲۳،
اقبال نمبر ۲ (دسمبر ۱۹۷۷ء) ۲۰۲ - ۲۱۵
(۴) برٹش میوزیم اور اسکول آف اورینٹل سٹڈیز،
۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۱۴۱ - ۱۴۶
(۵) عبد القادر سروری، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی
۱۹۷۳ء) ۱۰۹ - ۱۱۷
(۶) غالب اور اقبال، ۱۱۶، غالب نمبر ۳
(۱۹۷۱ء) ۳۰۷ - ۳۲۶
(۷) میرے والد، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۱۸۱
- ۱۹۲
آزاد، محمد حسین: عبد الرحیم خان خانخاناں، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء)
۲۰۵ - ۲۱۰
آسی، مولوی عبد الباری: شخصی معرکے (تذکرہ معرکۂ سخن)،
۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۲ (ستمبر ۱۹۸۱ء)
۵۱۹ - ۵۵۵
(۲) کلیاتِ میر (دیباچہ)، ۱۲۶، میر تقی میر نمبر ۲
(نومبر ۱۹۸۰ء) ۷ - ۵۱
آصف ہمایوں (مترجم) ایک ہندوستانی کا ای ایم فارسٹر
سے اظہارِ عقیدت، از پطرس بخاری ۱۳۳ (ستمبر
۱۹۸۶ء) ۷۱ - ۷۵
آفاق احمد: غالب کے نودریافت خطوط، ۱۱۶، غالب نمبر ۳
(۱۹۷۱ء) ۹۵ - ۹۹
آفتاب احمد: بنام مرشد نازک خیالاں، ۳۳ - ۳۴
(اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۸ - ۱۴
(۲) غالب اور جدید شعرا، ۶۹ - ۷۰ (اکتوبر
۱۹۵۸ء) ۲۳۵ - ۲۳۶
(۳) قدیم مشاعرے کی ادبی اہمیت، ۶۱ - ۶۲،
سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۷۵ء) ۲۸۲ -
۲۸۵
آفتاب احمد، ڈاکٹر: زندگی میں ادب اور فن کی اہمیت،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۶۵ - ۷۴
(۲) فیض اور غالب، ۱۳۲، سالنامہ (جون
۱۹۸۵ء) ۴۰۶ - ۴۱۲
آفتاب احمد، شیخ: علامہ سر اقبال کے استاذ شمس العلماء
مولوی میر حسن مرحوم، ۱۲۲، اقبال نمبر (نومبر
۱۹۷۷ء)
ابو الخیر کشفی: اقبال کے ساتھ ساتھ، ۱۲۳، اقبال نمبر ۲
(دسمبر ۱۹۷۷ء) ۴۷۳ - ۴۸۸
ابو سعید قریشی: حبیب شعر کے خیمے راکھ ہوئے، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۴۵ - ۶۲۵
(۲) یہ لاہور ہے، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء)
۲۲۴ - ۲۲۶
ابو سلمان شاہجہانپوری: مولانا آزاد اور مولانا عبد الماجد
کے معرکے، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۲ (ستمبر
۱۹۸۱ء) ۵۶۹ - ۵۹۵
ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر: اردو غزل، ۳۵ - ۳۶

احمد عباس، خواجہ: بیدی کی چند یادیں، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۲۷ - ۴۳۰

احمد علی خاں دُرّانی: علامہ اقبالؒ، ترجمہ از مجازی لکھنوی، ۱۲۶ و، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۱۷۳ - ۱۷۹

احمد فاروقی، خواجہ: صدرالدین آزردہ کے غیر مطبوعہ خطوط، ۲۹ - ۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۷۴ - ۷۸

(۲) غالب کا مقدمہ پنشن، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۸۳۰ - ۸۳۹

(۳) غدر کی ادبی تاریخ کا ایک ورق، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۲۰۲ - ۲۰۳

(۴) فانی کی شاعری، ۲۳ - ۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۹۳ - ۲۰۳

(۵) مثنوی بہارِ عشق، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۷۹ - ۱۰۵

احمد محی الدین جدی: اردو ادب کے جدید ترین رجحانات، ۵۷ - ۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۸۷ - ۱۹۴

احمد نواز، ملک: اشاریہ رسالہ نقوش (مصنف وار) شمارہ ۱ تا ۱۰۸، ۱۹۴۸ء تا ۱۹۶۷ء، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۶۷ - ۶۱۱ اس اشاریے میں صرف مضامین اور خطوط شامل ہیں۔

احوال ایک تقریب کا، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۱ - ۴

اختر، ڈاکٹر محمد سلیم: مجمع الشعرائے جہانگیر شاہی، عہد جہانگیری کا ایک غیر معروف تذکرہ، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۳۵ - ۷۵

اختر انصاری: گوئٹے (پیدائش، خاندان اور شخصیت)، ۸۳ - ۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۸۳ - ۸۷

(۲) ناول اور افسانے سے پہلے اردو میں قصہ نگاری، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۶۸ - ۷۳

اختر الایمان: میراجی کے آخری لمحے، ۲۷ - ۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۲۲

اختر اورینوی: بہار میں اردو، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۲۲۳ - ۲۵۳

(۲) غالب کے ناشنیدہ اشعار، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۹۸ - ۱۰۴

(۳) فقہ ہندی، ۶۱ - ۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۲۳۷ - ۲۴۳

(۴) نقاش و نقوش، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۴ - ۱۵

اختر جمال: راجندر سنگھ بیدی کی یاد میں، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۵۶ - ۴۵۸

اختر راہی: شاہ ولی اللہؒ اور اقبالؒ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۴۳۳ - ۴۳۹

اخلاق احمد دہلوی: ادب برائے عاقبت، ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۲۰ - ۲۶

(۲) سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۷۵ - ۱۷۸

ادارہ: ادبی کاموں کی نشان دہی، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۴۵۸ - ۴۶۴ حفیظ ہوشیار پوری کے متعلق ہے

ارشد میر: اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط (مع اصل)، ۱۲۱، اقبال نمبر (ستمبر ۱۹۷۷ء) ۵۲۳ - ۵۳۰

ازہر، غلام رسول: ملک حبیب احمد خاں، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۲۸۵ - ۲۹۸

استفسار، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ا (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۵۱۶ - ۵۳۰

معرکہ آرا: وصل بلگرامی، امجد علی اشہری، ارشد بلگرامی، ذکاء اللہ، احمد علی شوق قدوائی، متین مچھلی شہری۔

استفسارات ادبی وشعری (ایک تحقیقی معرکہ)، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ا (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۵۰۵ - ۵۱۵

معرکہ آرا: اثیم خیر آبادی، شاداں بلگرامی، آہ امیٹھوی، حمد لکھنوی۔

اسر، دیوندر: ادب اور نفسیاتی تاریخ، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۵۱ - ۲۵۴

(۲) جدید افسانے کا ذہنی ارتقاء، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۳۲ - ۱۳۶

(۳) جدید ادبی فکر، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۲۵۴ - ۲۶۴

(۴) کہانی کا فن، ۵۷ - ۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۹۵ - ۲۰۰

اسلامی ادب کا مسئلہ، ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۴۱ - ۵۰

اس میں درج ذیل حضرات کے خطوط شامل ہیں: آفتاب احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی، حامد حسن قادری، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

اسلم کمال: صادقین، ۱۱۳، غالب نمبر، حصہ دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء) ۸ کے بعد

اسلوب احمد انصاری: ادب میں روایت اور تجربہ، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۷۳ - ۷۷

(۲) ادبی تاریخ اور ادبی تنقید، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۵۵ - ۶۲

(۳) جاوید نامہ کا ایک پہلو، ۱۲۱، اقبال نمبر (ستمبر ۱۹۷۷ء) ۳۲۸ - ۳۴۳

(۴) شکنتلا، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۶۹ - ۷۳

(۵) گنج ہائے گرانمایہ، ۴۵ - ۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۹۵ - ۱۹۹

اسمٰعیل حسن خاں، ملک: غالب کے اردو قصائد، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۶ء) ۶۸ - ۱۱۶

(۲) یگانہ بہ حیثیت غزل گو، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۲۷۵ - ۳۰۰

اسمٰعیل حسن، سید: اقبال کے فلسفہ کی ایک جھلک، ۱۲۲، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۵۳۹ - ۵۴۴

اسمٰعیل خاں، ڈاکٹر ملک: اردو کا ایک ممتاز واسوخت (جواب نک قعرِ گمنامی میں تھا)، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۷۹ - ۱۰۰

اسیر، فدا حسین: مندر، ۹۲، لاہور نمبر (فروری ۱۹۶۲ء) ۶۷۵ - ۶۸۲

اطہر پرویز: ڈرامے کا فن، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۸۱ - ۹۱

اطہر ہاپڑوی، علامہ: محاکمہ تذکرۂ معرکۂ سخن، ۱۲۷،

(۷) غالب کے آخری ایام، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۶۵۷ - ۶۶۵

(۸) قاطع برہان کی حمایت میں ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۵۲۹ - ۵۳۵

(۹) کلیاتِ انشا کے دو قدیم مخطوطے، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۷۶ - ۹۹

(۱۰) مقدمہ (دیوانِ میر)، ۱۲۵، میر تقی میر نمبر ۱ (اکتوبر ۱۹۸۰ء) ۳۶ - ۱۶۵

(۱۱) میر کا دیوان چہارم (نسخہ محمود آباد)، ۱۳۱، میر تقی میر ۳ (اگست ۱۹۸۳ء) ۴۸۹ - ۵۰۰

(۱۲) میر کا دیوانِ فارسی، قلمی و غیر مطبوعہ — ایک تعارف، ۱۳۱، میر تقی میر ۳ (اگست ۱۹۸۳ء) ۲۲ - ۳۴

(۱۳) میرزا غالب اور شاہانِ اودھ، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۳۴۳ - ۳۶۲

(۱۴) میرزا غالب اور فنِ تاریخ گوئی، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۷۲ - ۸۲

اکبر الدین صدیقی، محمد: ڈاکٹر زور صاحب، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۵۷ - ۲۶۵

(۲) شامِ غریباں، ایک نادر نسخہ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۲۶۱ - ۲۶۸

(۳) شاہ صادق کا ایک نایاب دیوان، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۳۲۷ - ۳۳۵

(۴) مرزا محمد عظیم بیگ شاگردِ غالب اور رسوا، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۸۸ - ۹۹

(۵) میر کا کلیاتِ فارسی، ۱۳۱، میر تقی میر نمبر ۳ (اگست ۱۹۸۳ء) ۲۷۷ - ۲۸۴

اکبر علی خاں: ضمیمہ نسخۂ عرشی، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۱۸۶ - ۲۰۴

(۲) رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۲۶۱ - ۲۷۲

(۳) غالب کے بارے میں معاصر اخبارات کی رائے، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۶۳۷ - ۶۵۶

(۴) نکات و رقعات، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۲۷ - ۲۳۶

اکرام، ڈاکٹر سید محمد اکرم، قولِ فیصل اور اس کا پس منظر، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۲ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۵۱۱ - ۵۱۸

الطاف علی بریلوی، سید: اقبال — شاعرِ مستقبل، ۱۲۳، اقبال نمبر ۲ (دسمبر ۱۹۷۷ء) ۲۴۳ - ۲۵۸

الطاف گوہر، سوجان باز، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۹۱۷ - ۹۲۱

(۲) نیا ادبی محاذ، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۹۴۵ - ۹۴۶

امجد علی بیگ، ڈاکٹر مرزا: اقبال اور اقتصادیات، ۱۲۱، اقبال نمبر (ستمبر ۱۹۷۷ء) ۳۶۰ - ۳۶۷

امداد صابری: حجاز کی صحافت، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۶ء) ۱۱۷ - ۱۳۳

امرناتھ جھا: میر تقی میر، ۱۲۶، میر تقی میر نمبر ۲ (نومبر ۱۹۸۰ء) ۲۹۶ - ۳۲۱

ب

۱۹۶۵ء) ۳۰۱ - ۳۱۰

برنی، ضیاء الدین: میں نے جو لڑائیاں دیکھیں، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۲۶ - ۱۱۳۱

بشیر احمد ڈار: دیکھیے ڈار، بشیر احمد

بصیر عالم: افریقہ کی سیاست، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۳۰۷ - ۳۲۰

(۲) افریقہ کی سیاست، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۶ء) ۵۸۴ - ۵۹۲

(۳) دنیائے عرب، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۴۳۳ - ۴۴۴؛ ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۵۳۸ - ۵۴۷؛ ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۴۹۰ - ۵۰۴

بنگال میں اردو، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۲۵۴ - ۲۶۷

معرکہ آراء: سید وقار عظیم، وفا راشدی، سینتی کمار چیٹرجی، مسعود شہریار، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر شہید اللہ، گلکرسٹ، اعجاز الحق قدوسی اور دوسرے محققین و مصنفین۔

بہار میں اردو، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۲۲۳ - ۲۵۳

معرکہ آراء: اختر اورینوی

بوشانی، پروفیسر السنیڈرو: اقبال کا الٰہیاتی فلسفہ، ترجمہ از یوسف جمال انصاری، ۱۲۲، و، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۳۶۰ - ۳۷۵

بیدار، عابد رضا: میر ناصر علی کا صلائے عام، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۲۶۲ - ۲۸۱

پ

پرویز، غلام احمد: متفاول اقبال، ۱۲۲، و، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۱۱۸ - ۱۳۰

پطرس: آسمان، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۷۱

(۲) انارکلی، مخلص صاحب اور ہم نیاز مند، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۵۴۴ - ۵۵۰

(۳) انگلستان کا جدید تھیٹر، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۳۴ - ۳۴۰

(۴) ایڈیٹنگ کا فن، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۲۲ - ۳۳۳

(۵) ایران میں اجنبی، ن۔م۔ راشد کی نظموں کے دوسرے مجموعہ کی تمہید، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۸۰ - ۳۸۶

(۶) ایک رات، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۶۲ - ۳۷۳

(۷) ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۷۴ - ۳۷۵

(۸) ایک ہندوستانی کا ای۔ ایم فورسٹر سے اظہارِ عقیدت، ترجمہ از آصف ہمایوں، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۷۱ - ۷۵

(۹) پاکستان میں تعلیم کا مستقبل، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۱۶ - ۳۲۱

(۱۰) جھولنے، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی کتاب کا

دیباچہ، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۷۹

(۱۱) چمپا اور دوسرے افسانے (دیباچہ)، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۷۶ - ۳۷۷

(۱۲) چھپے چوری، ہاجرہ مسرور کی کتاب "چھپے چوری" کا دیباچہ، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۸۷ - ۳۹۱

(۱۳) سر محمد اقبال ــ وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن بخشا، اردو ترجمہ از ریاض حسین ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۵۷۷ - ۵۷۹

(۱۴) سر محمد اقبال (وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن بخشا)، مترجم صوفی ریاض حسین، ۱۲۲ د، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۳۲۸ - ۳۳۰

(۱۵) سید سجاد حیدر، ترجمہ از قرۃ العین، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۸۱-۳۸۳

(۱۶) "غنچۂ تبسم" کے دیباچوں پہ ایک نظر، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۵۳۵-۵۴۳

(۱۷) قدیم یونانی حکماء اور ان کے خیالات، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۵۶۶ — ۵۷۶

(۱۸) کاغذی روپیہ، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۵۹۷ - ۵۹۹

(۱۹) کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۵۱ - ۳۶۰

(۲۰) ماڈل جنرل اسمبلی (تقریر)، ترجمہ از غلام رسول مہر، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۶۲۷ - ۶۳۱

(۲۱) مسئلہ تونیسیہ (تقریر)، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۶۰۳-۶۲۶

(۲۲) مضحک اشیاء کے متعلق چند عام اصول (پروفیسر ہنری برگسان کا فلسفۂ خندہ)، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۱۰

(۲۳) مینہ برس رہا ہے، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۶۰۲

(۲۴) نغمہ زار، ابو الاثر حفیظ جالندھری کی کتاب کا دیباچہ، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۷۸

(۲۵) نوعِ انسان کی کہانی، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۲۸۰-۲۸۳
ماخوذ از کتاب "نوعِ انسان کی کہانی" مصنفہ ہینڈرک فان لون۔

(۲۶) وارفتگیٔ جذبات، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۶۶ - ۳۶۷

(۲۷) ہمارے زمانے کا اردو ادیب، ترجمہ از مظفر علی سید، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۴۶ - ۳۵۰

(۲۸) ہیبت ناک افسانے، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۶۱ - ۳۶۵

(۲۹) یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں، نیاز مندانِ لاہور، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر

(ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۴۱ - ۳۴۵
پطرس (مترجم) : بچّے کا پہلا سال از برٹرنڈ رسل، ۷۵ -
۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۲۸۴ - ۲۸۹
(۲) ہیروئن از عصمت چغتائی، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر
(ستمبر ۱۹۵۹ء) ۵۵۱ - ۵۶۴
اُردو ترجمہ ۵۵۱ سے ۵۵۶ صفحات تک ہے -
اصل انگریزی متن ۵۵۷ سے ۵۶۴ صفحات پہ ہے.
پنجاب میں اُردو، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء)
۱۰۹ - ۱۳۰
معرکہ آراء : حافظ محمود شیرانی، حکیم شمس اللہ قادری،
نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین زور، پروفیسر
عبدالقادر سروری -

ت

تاج، سیّد امتیاز علی : اُردو کا پُرانا تھیٹر (دوسری قسط)،
۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۶ء) ۹ - ۱۶
(۲) اردو کا پرانا تھیٹر، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ
(اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۹ - ۲۴
تاثیر، محمد الدین : اسمأ الرجال، اقبال، ۱۲۲ ا، اقبال نمبر
(نومبر ۱۹۷۷ء) ۳۶۳ - ۳۶۹
(۲) فارسی ادب کے چند گمشدہ اوراق، ۲۷ - ۲۸
(نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۲۸ - ۳۹
(۳) فلسفۂ اقبال (اقبال اور ٹیگور)، ۱۲۲ و،
اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۳۵۷ - ۳۶۲
(۴) فلسفۂ اقبال، ۱۲۲ و، اقبال نمبر (نومبر
۱۹۷۷ء) ۳۴۸ - ۳۵۶
تبسم، صوفی غلام مصطفیٰ : سرودِ انجم، ۱۲۱، اقبال نمبر
(ستمبر ۱۹۷۷ء) ۳۰۵ - ۳۱۳
(۲) علامہ اقبال کی شاعری، ۱۲۲ و، اقبال نمبر
(نومبر ۱۹۷۷ء) ۱۸۷ - ۲۰۵
تبسم کاشمیری، ڈاکٹر : مصحفی اور انشا کا معرکہ، ۱۲۷، ادبی
معرکے نمبر ۲ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۳۶۵ - ۳۸۱
(۲) مصحفی اور سودا کا معرکہ، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۲
(ستمبر ۱۹۸۱ء) ۸۷ - ۹۲
ترکیب اضافی میں "کی" (حرفِ اضافت مؤنث) کی بجائے
"کے" (حرفِ اضافت مذکر) کا استعمال، ۱۲۷،
ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۳۳۳ - ۳۵۴
معرکہ آراء : مولوی عبدالحق، ڈاکٹر شوکت سبزواری،
سلیم جعفر، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، حبیب اللہ غضنفر -
تسہیل البلاغت پر ایک نظر، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر
۱۹۸۱ء) ۴۸۶ - ۵۰۴
معرکہ آراء : مرزا محمد سجاد، اثر لکھنوی، جبرئیل -
تلہری، اختر علی : میر کا فارسی کلام، ۱۲۶، میر تقی میر نمبر ۲ (نومبر
۱۹۸۰ء) ۵۳۱ - ۵۳۷
تمکین کاظمی : داغ دہلوی، ۷۳ - ۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء)
۱۰۹ - ۱۲۰
(۲) ڈاکٹر نذیر احمد بہ حیثیت مصلح، ۵۷ - ۵۸
(جون ۱۹۵۶ء) ۲۰۸ - ۲۲۹
(۳) محفوظ علی بدایونی، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء)
۵۷ - ۶۷
(۴) مضامین پطرس کا مطالعہ، ۷۵ - ۷۶،
پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۳۳ - ۱۵۶
(۵) واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط، ۶۷ -

خ

(جون ۱۹۸۵ء) ۱۰۳ – ۱۴۵

خاطر غزنوی: فتح خان، رابعہ، ۱۹–۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۲۲۵ – ۲۳۲

خدیجہ مستور، ٹھنڈا میٹھا پانی، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۱۰۰۰ – ۱۰۰۴

(۲) نقوش کے خاص نمبر، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۱۶ – ۱۸

خلیق انجم، ڈاکٹر: سودا کی مرثیہ نگاری، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۳۱ – ۴۹

(۲) غالب اور بے خبر، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۴۵۲ – ۴۶۱

(۳) مرقع دہلی، عہدِ محمد شاہ کی ایک تالیف، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۴۱ – ۵۶

(۴) معارضہ مظہر و آرزو، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۴۳ – ۵۷

خورشید، عبدالسلام: اردو صحافت (۱۸۵۱ء سے ۱۹۶۲ء تک، ۹۲، لاہور نمبر (فروری ۱۹۶۲ء) ۸۳۹ – ۸۵۸

(۲) اقبال اور پاکستان، ۱۲۱، اقبال نمبر (ستمبر ۱۹۷۷ء) ۵۳۸ – ۵۴۹

(۳) اقبال ایک مستقبل شناس سیاستدان، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۱۴۸ – ۱۵۱

(۴) ذہنی انقلاب، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۹۴۱ – ۹۴۴

(۵) سالک، ماجرائے عشق، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۹۳ – ۱۰۹

(۶) سالک کے خطوط ابنِ سالک کے نام، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۱۰۰ – ۱۲۲

(۷) سالک کی اداریہ نگاری کا اوّلیں دور، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۵۳۶ – ۵۴۶

(۸) طنز و ظرافت، ۷۱ – ۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۱۷ – ۲۴

(۹) عبدالمجید سالک (یادیں)، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۳۲ – ۴۹

(۱۰) غالب کی ازدواجی زندگی، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۳۶۳ – ۳۷۲

(۱۱) فانوسِ خیال — (نصف صدی پہلے کا ایک ادبی مجلّہ)، سالنامہ، پہلا حصّہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۱۸۳ – ۱۹۸

(۱۲) کہکشاں، تاج اور سالک، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۶ء) ۱۸۲ – ۲۱۰

(۱۳) مجلّاتی صحافت میں 'نقوش' کا مقام، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۱۶ – ۱۸

(۱۴) مجلّاتی صحافت میں 'نقوش' کا مقام، ۱۳۰، رسول نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۷۲۶ – ۷۳۰

(۱۵) مہر اور اقبال، ۱۲۳، اقبال نمبر ۲ (دسمبر ۱۹۷۷ء) ۵۲۷ – ۵۴۲

د

داغ خطوط کی روشنی میں، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۲ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۱۹۷ – ۲۱۲

معرکہ آراء: داغ دہلوی، کیفی و تاتریہ، تمکین کاظمی۔

۴۳۴ - ۴۵۶

ذوالفقار علی، سید: اقبال کا نظریۂ خودی، ۱۲۲و، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۴۷۱ - ۴۹۶
۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۲۸۴ - ۲۸۹

رسل، رالف: خورشید الاسلام: میر کی عشقیہ شاعری، ترجمہ از خالد اقبال یاسر، ۱۳۱، میر تقی میر نمبر ۳ (اگست ۱۹۸۳ء) ۵۳۹ - ۵۸۲

رشدی، محمد حبیب اللہ: کوہ نور اور شاہ شجاع، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۶ء) ۴۳ - ۶۱

رشید احمد صابر، ابو طاہر: اقبال پر بعض فضلا کی حرف گیری کی حقیقت، ۱۲۲و، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۵۴۹ - ۵۵۹

رشید احمد صدیقی: خطبۂ تقسیمِ اسناد، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۷ - ۱۸
(۲) عزیزانِ ندوہ کے نام، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۷ - ۵۶
(۳) غالب کی شاعری، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۱۴۲ - ۱۶۶
(۴) غالب کی شخصیت، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۱۱۹ - ۱۴۱
(۵) کچھ اقبال کے بارے میں (غیر مطبوعہ) متعارفہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۱۲۳، اقبال نمبر ۲ (دسمبر ۱۹۷۷ء) ۴۸ - ۵۲
(۶) کچھ فسانۂ عجائب کے بارے میں، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۲۰۰ - ۲۰۳

رشید حسن خاں: تنقیدی جانب داری کے اسباب اور اثرات، ۸۶ (فروری ۱۹۶۱ء) ۵۰ - ۵۸
(۲) زبان و بیان کے بعض پہلو، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء)
۷۳ - ۹۲
(۳) مشترک الفاظ، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۱۱۰ - ۱۱۷

رشید الدین: حیدر آباد، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۱۲۸ - ۱۵۰

رضا، راہی معصوم: حکیم ناشاد عرف مہندر ناتھ، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۶۷ - ۴۶۸

رضوان الحق ندوی، ڈاکٹر محمد: جلال لکھنوی اور شوق نیموی کے معرکے، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۲ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۳۸۲ - ۴۰۱

رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر: اقبال کا نظامِ فکر، ۱۲۱، اقبال نمبر (ستمبر ۱۹۷۷ء) ۲۰۱ - ۲۰۹

رفعت، مبارز الدین: اردو کا ایک اچھوتا ناول، ۸۳ - ۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۴۸ - ۶۳
(۲) تلوک چند کی فارسی شاعری، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۶ء) ۲۱۸ - ۲۲۶

رفیع الدین ہاشمی: اقبال کی موعودہ تصانیف، ۱۲۳، اقبال نمبر ۲ (دسمبر ۱۹۷۷ء) ۱۴۷ - ۱۶۵
(۲) حیات نامۂ اقبال، ۱۲۱، اقبال نمبر (ستمبر ۱۹۷۷ء) ۹ - ۲۵

رہبر، ہنس راج: بچوں کا شاعر، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۶ء) ۲۲۷ - ۲۳۱

ریاض حسین، صوفی (مترجم): سر محمد اقبال — وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن بخشا، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۵۷۷ - ۵۷۹
(۲) سر محمد اقبال (وہ انسان جس نے اردو شاعری کو مردانہ پن دیا)، از سید احمد شاہ، ۱۲۲و،

۱۸۹-۱۶۵

عنایت اللہ : کچھ باتیں، کچھ اشتہارات، ۹۲، لاہور نمبر (فروری ۱۹۶۲ء) ۱۱۸۱ - ۱۱۹۳

عنایت اللہ دہلوی، مولوی : تاریخِ مغل، ۹۰ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۲۶۰ - ۲۷۳

(۲) سنسکرت کے شاعر کالیداس کا مقام ولادت، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۲۵ - ۸۲۸

عنایت اللہ دہلوی (مترجم) : تاریخ مغل از سر ہنری ہوورتھ، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۰-۵۱

(۲) تاریخ مغل از سر ہنری ہوورتھ، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۳۲۸ - ۳۳۹

عنایت الٰہی ملک : موسیقی بہ طور موضوعِ سخن، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۱۵۳ - ۱۶۰

عندلیب شادانی : حالی اور اس کی شاعری، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۳۶ - ۱۴۲

(۲) ناسخ کی جذبات نگاری، ۲۹ - ۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۱۸ - ۱۲۶

غ

غالب، اسد اللہ خاں : ایک لفافہ پر غالب کی تحریر، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۱۱۸ عطیہ اطہر شبیر

(۲) دیوانِ غالب کے حاشیے پر غالب کی تحریر، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۱۱۶ عطیہ خدا بخش لائبریری

(۳) صوفی منیری کے کلام پر غالب کی تحریر، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء)، ۱۱۷ عطیہ اطہر شبیر

(۴) کلیاتِ غالب پر غالب کی تحریر، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۱۱۵ عطیہ خدا بخش لائبریری

غزل اور متغزلین، ۴۳ - ۴۴، مع ضمیمہ غزل نمبر (جولائی، اگست ۱۹۵۴ء) ۱۵۷ - ۲۲۹

اس مضمون کے دو حصے ہیں :

"پہلے حصہ میں غزل پر جتنے ممتاز اہل قلم کی آرا مل سکی ہیں، انہیں یکجا کر دیا ہے .... دوسرے حصے میں تذکرہ نویسوں نے ممتاز شعرا کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اُسے بھی یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ شاعر کے بارے میں تمام ناقدین کی آرا کا ایک نظر میں علم ہو جائے۔"

(ص ۱۵۷)

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر : کشورِ پنجاب اور اقبال، ۱۲۳، اقبال نمبر ۲ (دسمبر ۱۹۷۷ء) ۲۹۶ - ۳۰۴

غلام حسین مصطفےٰ، ڈاکٹر : علامہ ڈاکٹر محمد شفیع کے چند علمی مکتوبات، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۵۴ - ۶۲

غلام علی چودھری : میں وطن سے دُور تھا، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۲۲ - ۱۱۲۵

غلام مرشد، مولانا : علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۳۰۱ - ۳۲۷

غلام مصطفےٰ خاں : شہزادی زیب النسا کے نام چند غیر مطبوعہ خطوط، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۷۰ - ۷۵

(۲) علّامہ اقبال بارگاہِ رسالت میں، ۱۲۱، اقبال نمبر (ستمبر ۱۹۷۷ء) ۴۸ - ۷۰

(۴) اقبال کی دُعائیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۹ء) ۴۷۶ - ۵۰۸

(۵) تحقیقاتِ امیر مینائی (خطوط کی روشنی میں)، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۳۰ - ۲۴۶

(۶) تاریخ گوئی کے متنازعہ مسائل (مخلص تسلیم کی روشنی میں)، ۸۱ - ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۰۲ - ۱۱۳

(۷) تنظیم الحیات، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۵۸ - ۶۸

(۸) جلال، تسلیم اور ولا کی معرکہ آرائی (تاریخ گوئی)، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۲ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۱۶۸ - ۱۸۳

(۹) جلیل غزل کے آئینے میں، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصّہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۲۲۷ - ۲۵۷

(۱۰) جنون و غالب، ۱۰۹، خطوط نمبر، حصّہ اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۷۶ - ۹۰

(۱۱) رڈیارڈ کپلنگ، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۲۶۹ - ۲۷۴

(۱۲) رفعتِ تاریخ، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۰۸ - ۱۱۴

(۱۳) زُبر و بیّنات، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۵۸ - ۲۷۷

(۱۴) غالب اور تاریخ گوئی، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۵۸۹ - ۵۹۵

(۱۵) غالب کی اصلاحیں، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۲۱۴ - ۲۴۱

(۱۶) لاہور کا ایک مورّخ (دیوان امرناتھ اکبری)، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۱۴۱ - ۱۴۹

(۱۷) مؤرخینِ لاہور، ۹۲، لاہور نمبر (فروری ۱۹۶۲ء) ۹۵۶ - ۱۰۲۳

(۱۸) میر کی اصلاحیں، ۱۳۱، میر تقی میر نمبر ۳ (اگست ۱۹۸۳ء) ۵۸۳ - ۶۲۲

(۱۹) میر کے شاگرد، ۱۲۶، میر تقی میر نمبر ۲ (نومبر ۱۹۸۰ء) ۴۷۶ - ۴۹۳

(۲۰) نثرِ احسان، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۵۳۴ - ۵۵۸

کلیم الدین احمد: احتشام حسین کی تنقید، ۶۱ - ۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۲۱۵ - ۲۲۶

(۲) اردو ادب میں طنز و ظرافت، ۷۱ - ۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۴۹ - ۸۴

(۳) تنقید کیا ہے؟، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصّہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۱ - ۸

(۴) میر کے دو ہمعصر شعرا (درد و سودا)، ۱۲۶، میر تقی میر نمبر ۲ (نومبر ۱۹۸۰ء) ۳۳۷ - ۳۵۷

کوثر چاندپوری: غالب کے خطوط، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۵۹۶ - ۶۱۶

کیفی، برجموہن دتاتریہ: اردو اور دیسی زبان، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۲۷۶ - ۲۸۰

گ

گارساں دتاسی کا تذکرہ شعرائے اردو، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۲۸۹ -

معرکہ آراء: مولوی محفوظ الحق، قاضی عبدالودود۔

گجرات میں اردو، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۱۶۲ - ۱۷۷

معرکہ آراء: سید سلیمان ندوی، حامد حسن قادری، حکیم شمس اللہ قادری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، ڈاکٹر محی الدین زور

گنجینۂ تحقیق، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۳۵۵ - ۳۸۲

معرکہ آرا: سید محمد احمد، بیخود موہانی، مولوی اقبال سہیل احمد اور قدیم ادبا و شعرا۔

گوہر نوشاہی: امتیاز علی تاج کے حضور، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۳۷۹ - ۳۸۲

گیان چند، ڈاکٹر: ادب اور زندگی، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۱۱۸ - ۱۲۸

(۲) اردو کے اصوات اور صوتیے، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۷ - ۲۷

(۳) اقبال کے اردو کلام کا عروضی مطالعہ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۳۲۸ - ۳۴۸

(۴) بیاضِ غالب کی اصلاحیں، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۳۷۹ - ۴۰۴

(۵) فضلی کی کربل کتھا، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر، دسمبر ۱۹۶۶ء) ۵۲۲ - ۵۳۳

(۶) نسخۂ عرشی - طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۱۹۹ - ۲۱۳

(۷) مثنویاتِ رنگین، ۹۰، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۱۳۵ - ۱۴۴

(۸) میر کی عشقیہ مثنویاں، ۱۲۶، میر تقی میر نمبر ۲ (نومبر ۱۹۸۰ء) ۴۲۰ - ۴۲۵

گیان چند (مرتب): کیا نو دریافت بیاض کا کاتب غالب ہے؟ ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۵۱۹ - ۵۹۷

ل

لاہور، ۹۲، لاہور نمبر (فروری ۱۹۶۲ء)

لکھنے والے: ابو الاثر حفیظ جالندھری، محمد رستم کیانی، شاہد احمد دہلوی، نیاز فتحپوری، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، احسان دانش، خواجہ احمد عباس، ہوش ترمذی، راجہ مہدی علی خاں، مصطفیٰ زیدی، شیخ عبدالشکور، ڈاکٹر سید صفدر حسین، نصیر انور۔

لطیف الزمان خاں (مترجم): غالب ایک انفرادیت پسند شاعر از ممتاز حسن، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۳۳۲ - ۳۴۴

لطیف عارف: بیاضِ غالب کی تصحیح از مبارک اکمل گیلانی و لطیف عارف، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۶ - ۳۰

م

مالک رام: اردو کے منفرد مکتوب نگار، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۳۹ - ۵۶

(۲) تبصرہ دیوان غالب، نسخۂ عرشی، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۱۶۵ - ۱۷۳

(۳) ذکرِ عرشی، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۰ - ۱۲۴

(۴) غالب اور رقیب، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۴۰۳ - ۴۰۵

(۵) غالب کے ادبی معرکے، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۲ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۳۴۲ - ۳۶۴

(۶) غالب کے فارسی قصیدے، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۲۱ - ۳۷

(۷) کربل کتھا از مختار الدین آرزو و مالک رام، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۲۵ - ۵۱

معرکہ آرا: پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر راجندر پرشاد، مولوی عبدالحق، بیرسٹر آصف علی۔

مشتاق احمد خاں: میری ڈائری کے چند اوراق، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۱۰۰-۱۰۹

(۲) میری ڈائری کے چند اوراق، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۵۷۷-۵۸۳

(۳) میری ڈائری کے چند اوراق، ۱۰۷، (مئی ۱۹۶۷ء) ۷۵-۸۹

(۴) میری ڈائری، ۱۰۸، (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۸۲-۹۳

(۵) میری ڈائری، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۹۰-۹۹

مظفر بخاری: صدیق کلیم اور ان کا فن، ۱۲۰، (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۲۲-۴۲۷

مظفر علی سید: اردو ادب اور تحقیق، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۲۳۳-۲۴۴

(۲) نئے زاویے کا پرانا غزل گو، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۳۷۰-۳۸۱

(۳) میر کی فارسی سخن گوئی، برِصغیر کے تہذیبی پس منظر میں، ۱۳۱، میر تقی میر نمبر ۳ (اگست ۱۹۸۳ء) ۶۲۳-۶۷۲

مظفر علی سید (مترجم): ہمارے زمانے کا اردو ادب از پطرس، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۴۶-۳۵۰

مظہر الاسلام: ان کہی باتوں کی تفہیم، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۱۳-۳۱۸

مظہر صدیقی، ڈاکٹر محمد یٰسین: امیر خسرو کا تاریخی شعور، ایک توقیتی مطالعہ، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۱-۲۷

معرکہ اصلاحِ سخن، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۵۶۱-۵۸۵

دس غزلوں پر بیالیس اساتذہ کی اصلاحیں

معین الرحمٰن، سید: غالب کے بعد، ان پر پہلا مضمون، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۶۶۲-۶۷۵

(۲) غالبیات کا سرمایہ (عصرِ غالب سے سالِ غالب ۱۹۶۹ء تک)، ۱۳۲، سالنامہ، (جون ۱۹۸۵ء) ۶۷۹-۶۸۸

(۳) نسخۂ گلِ رعنا (بہ خطِ غالب)، ۱۱۳، غالب نمبر، حصہ دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء) ۳۲۷-۳۳۳

ملتان سے لکھنؤ، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۵۴۳-۵۶۰

معرکہ آرا: ڈاکٹر تاثیر، سید سلیمان ندوی، اسد ملتانی، مولانا سید ابوظفر ندوی۔

ممتاز حسن: اقبالؒ کی شاعری پر قیامِ یورپ کا اثر، ۱۲۲ الف، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۱۸۰-۱۸۶

(۲) غالب ایک انفرادیت پسند شاعر، ترجمہ لطیف الزماں خاں، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۳۳۲-۳۴۴

ممتاز حسن احسن: اقبال اور فلسفۂ مغرب، ترجمہ از یوسف سلیم چشتی، ۱۲۲ الف، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۲۶۰-۲۷۲

ممتاز حسین، سعادت حسن منٹو کی یادیں، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۲۸۹-۲۹۵

(۲) ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق۔ ۷۹-۸۰،
ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۳۴۰-۳۵۰
(۳) نیا منصور، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۵۸-۶۲

ممتاز شیریں، دوسرا گناہ - قابیل کا قتل ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۲۶۳-۲۶۶
(۲) مغربی افسانہ کا اثر اردو افسانہ پر، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۱۰۰۵-۱۰۲۱
(۳) منٹو کی فنی تکمیل، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۲۱۷-۲۲۱

ممتاز مفتی: پاکستان، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۹۴۷-۹۶۱

منٹو، سعادت حسن: باری صاحب، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۹۱-۲۰۳

منظور الٰہی: بنگلہ دیش، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۶۶-۲۷۶
(۲) رفتید و لے نہ از دلِ ما، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۹۴-۱۰۰
(۳) طاؤس و رباب آخر، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۹۷-۴۱۵
(۴) قرۃ العین طاہرہ ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۴۴۶-۴۵۱
(۵) غروب عظمت، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۵۸-۲۷۲
(۶) کوئی ستارا نہیں اُبھرتا، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۹۸۹-۹۹۹
(۷) ہم جلیس، ہم صفیر، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۲۸۸-۲۹۲

مہر، غلام رسول: آپ بیتیوں کی اہمیت، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر (جون ۱۹۶۴ء) ۳۶-۳۹
(۲) ابو الکلام آزاد الہلال کے آئینے میں، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۹-۳۴
(۳) ۱۸۵۷ء کے تین بنیادی پہلو، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۲۹۹-۳۰۳
(۴) اشاریۂ غالب، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۲۰۳-۲۱۴
(۵) بیاضِ غالب کی دریافت، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۵۰۹-۵۱۴
(۶) بیاضِ غالب کی دریافت، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۱۱-۱۸
(۷) پروفیسر آرنلڈ کا انتقال، ۱۲۳، اقبال نمبر ۲ (دسمبر ۱۹۷۷ء) ۶۵۰
(۸) حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ، ۱۲۳، اقبال نمبر ۲ (دسمبر ۱۹۷۷ء) ۶۵۱-۶۵۳
(۹) "داغ حسرت" کا تعارف، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۵۱۹-۵۲۶
(۱۰) چند خونچکاں مناظر، ۹۲، لاہور نمبر (فروری ۱۹۶۲ء) ۱۰۲۴-۱۰۳۲
(۱۱) شمس العلماء علامہ سید میر حسن سیالکوٹی کا انتقال، ۱۲۳، اقبال نمبر ۲ (دسمبر ۱۹۷۷ء)

۱۹۶۰ء) ۱۶-۳۱

(۶) قصہ ہیر و رانجھا، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۱۰-۲۱

(۷) نئی شاعری اور اسمِ اعظم، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۲۶-۲۳۵

ناصر کاظمی: میر تقی میر، ۱۲۶، میر تقی میر نمبر ۲ (نومبر ۱۹۸۰ء) ۴۵۷-۴۷۵

نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر: اقبال ایک دیدہ ور، ۱۲۱، اقبال نمبر (ستمبر ۱۹۷۷ء) ۲۱۰-۲۱۱

نبی بخش قاضی، ڈاکٹر: غالب کا جمالیاتی تجربہ، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۴۱۵-۴۲۰

نثار احمد فاروقی: اردو میں خاکہ نگاری، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۷۴-۱۰۸

(۲) اردو کا ایک ہندبرطانوی شاعر اور اس کا روزنامچہ، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۷-۳۶

(۳) اسلوب کیا ہے، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۵۵-۷۲

(۴) بیاضِ غالب کے بارے میں، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۱۹-۲۵

(۵) تلامذۂ غالب پر ایک نظر، ۷۷-۸۰، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۴۶-۲۵۷

(۶) حادثۂ اسیری اور غالب، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۲۸-۳۰

(۷) دیوان قصائد مصحفی، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۲۱۹-۲۳۷

(۸) شہر آشوب، قائم چاندپوری، ۸۹ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۹۵-۱۰۰

(۹) مثنویات، قائم چاندپوری، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۲۵۳-۲۶۱

(۱۰) غالب اور تذکرہ بحر زخار، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۴۳-۵۸

(۱۱) مرزا محمد حسن قتیل اور ہفت تماشا، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۳۱-۵۴

(۱۲) مطالعۂ غالب کے نئے امکانات، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء) ۲۱۵-۲۲۱

(۱۳) مطالعۂ میر کے امکانات، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۵۱۲-۵۲۸

(۱۴) مکرم، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۸۰-۲۸۶

(۱۵) میر بہادر علی واحق، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۲۲۷-۲۳۴

(۱۶) میر کی مثنوی "شعلہ شوق" کا ماخذ ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۸۲-۲۹۸

(۱۷) میر کا آرٹ (پس منظر اور عناصر ترکیبی)، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۱۷-۴۲

(۱۸) میر کا آرٹ (پس منظر اور عناصر ترکیبی)، ۱۲۶، میر تقی میر نمبر ۲ (نومبر ۱۹۸۰ء) ۳۵۸-۳۸۳

(۱۹) نقوش کے خاص نمبر، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۶-۳۲

نجم الاسلام: بیاضِ مرزا جان طپش، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۸۱-۹۲

(۲) تین نثری نوادر، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۱۴۴-۱۶۳

(۳) دو آہنگ، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ

(۳) پہلا نسوانی اردو دیوان، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء)
۲۴۶ - ۲۵۲

(۴) حیدر آباد کے مزاح اور طنز نگار، ۸۳ - ۸۴ - ۸
(اگست ۱۹۶۰ء) ۶۴ - ۸۲

(۵) قطب شاہی دور میں اردو ادب کی رفتار، ۶۷
- ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۴۲۸ -
۴۳۴

(۶) غالب اور حیدر آباد، ۲۹ - ۳۰، پنج سالہ نمبر
(فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۵۸ - ۱۶۷

(۷) ماہ لقا بائی چندا، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء)
۲۱۸ - ۲۲۴

نظر، قیوم: ابتدائی کلمات، ۱۱۶، غالب نمبر ۳ (۱۹۷۱ء)
۵۰۷ - ۵۰۸

نظیر صدیقی: عندلیب شادانی کا تغزل، ۳۳ - ۳۴ (اگست،
ستمبر ۱۹۵۳ء) ۴۳ - ۵۸

(۲) غالب کے رد کردہ اشعار، ۱۱۱، غالب نمبر
(فروری ۱۹۶۹ء) ۱۱۰ - ۱۲۱

نغمہ گانا، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۴۶۲ - ۴۸۵

معرکہ آراء: یگانہ چنگیزی، کسریٰ منہاس، سیماب
اکبر آبادی، جلیل مانکپوری، صفی لکھنوی، اثر لکھنوی

نقد متروکات، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء)
۳۱۴ - ۳۲۲

معرکہ آراء: پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، احسن
مارہروی، منوہر لال زشتی

نقوش کا اشاعتی خاکہ، ۱۳۰، رسول ﷺ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری
۱۹۸۵ء) ۷۲۲ - ۷۲۵

نقوش کی دس سالہ تحریروں کی مکمل فہرست، ۹۰ - ۸۰،
ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۲۰۹ - ۱۲۴۵

نقوش میں شائع ہونے والی تخلیقات کا خاکہ۔ ۱۹۴۸ء سے
۱۹۵۸ء تک، ۹۰ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل
۱۹۶۰ء) ۱۲۴۶ - ۱۲۴۷

نکلسن: پیام مشرق، ترجمہ از محمد عبداللہ، ۱۲۲ و، اقبال نمبر
(نومبر ۱۹۷۷ء) ۲۲۵ - ۲۳۵

نگم، دیانرائن: اقبال کا پیغام، ۱۲۲ و، اقبال نمبر
(نومبر ۱۹۷۷ء) ۳۳۱ - ۳۳۲

نور الٰہی: کتب خانے، ۹۲، لاہور نمبر (فروری ۱۹۶۲ء)
۵۹۸ - ۶۳۵

نور الٰہی، محمد عمر: حسنِ عقیدت (حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ
تعالیٰ علیہ کی ایک غیر معروف رباعی)، ۱۲۲ و،
اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۲۴۷

نور محمد قادری، سید: دیوانِ غنیمت کا ایک نادر مخطوطہ،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۱۴۶ -
۱۶۶

نورانی، امیر حسن: ادبی معرکوں کی کہانی، ۱۲۷، ادبی معرکے
نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء) ۵۹۸ - ۶۰۷

نواحِ دہلی کی اردو کی دو قدیم کتابیں، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱
(ستمبر ۱۹۸۱ء) ۳۰۶ - ۳۱۳

معرکہ آراء: ڈاکٹر رشید الدین، نصیر الدین ہاشمی،
محمد خلیل تجادری، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔

نئی قومی زبان، ۱۲۷، ادبی معرکے نمبر ۱ (ستمبر ۱۹۸۱ء)
۲۸۱ - ۲۸۸

نیاز فتحپوری: دیباچہ، شوکت نمبر (ستمبر ۱۹۶۳ء) ۲۸ - ۳۲

ھ

سالنامہ (جنوری، فروری ۵۰ ۱۹ء) ۲۸۶ – ۲۹۸

(۲) میر کا کلام، ۱۲۶، میر تقی میر نمبر ۲ (نومبر ۱۹۸۰ء) ۳۴۴ – ۳۸۸

یگانہ چنگیزی؛ غالب ایک گونگا شاعر، ۱۱۱، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) ۵۲۵ – ۵۲۹

یمین، آغا؛ عشقی ہمدانی، ۶۹ – ۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۲۴۰ – ۲۴۵

منظومات

۱۔ حمد و نعت
۲۔ نظمیں غزلیں

حمد و نعت

شمارہ ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۰، مطبوعہ جنوری ۱۹۸۴ء میں عربی، فارسی اور اردو نعتوں کا انتخاب بھی شامل ہے۔ اس حصّے میں ۱۵ کے علاوہ تمام حوالے اسی جلد کے ہیں۔ اندراجات میں تکرار سے بچنے کے لیے شمارہ، جلد اور تاریخِ اشاعت کو حذف کر دیا ہے۔ باقی ۱۵ کے اندراجات کے مکمل حوالے (شمارہ اور تاریخِ اشاعت) دے دیے ہیں۔ اس حصّے میں 'حمد' کے تحت ۵ اندراجات ہیں، ان کو پہلے درج کر دیا ہے۔ باقی نعت کا حصّہ ہے۔ ترتیب میں شاعر کا نام، پہلا مصرع اور صفحہ یا صفحات نمبر درج کر دئے ہیں۔

حمد

ا

انجم، انوار، رگوں میں پھیلتی جاتی ہے زہرِ بن کے حیات،
۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۶۵

ت

تائب، حفیظ، حمد کب آدمی کے بس میں ہے، ۱۳۲، سالنامہ
(جون ۱۹۸۵ء) ۴۶۳

ف

فیض، فیض احمد: ملکہ شہرِ زندگی تیرا شکر کس طور سے ادا کیجیے،
۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء)
۱۵۷

م

محروم، تلوک چند: اے خالقِ افلاک و مہ و مہر و ثریا، ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۷-۲۵۸

مصطفیٰ زیدی، ہم نے اس قوتِ محسوس کو دیکھا نہ سُنا،
۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۴

نعت

ا

آثم، حافظ حضور احمد خاں، المتوفی دور ۱۸۸۶ء: مدت سے ہوں الٰہی! میں بیمارِ مصطفیٰؐ، ۶۵۰

(۲) یا رب میں مدح خواں ہوں محمدؐ کی ذات کا،
۶۵۰

آزاد، محی الدین احمد ابوالکلام، المتوفی ۱۹۵۸ء: موزوں

(۲) وہ پیامِ آخری، اسلام جس کا نام تھا،
۵۹۹ - ۶۰۰

حفیظ جالندھری، المتوفیٰ ۱۹۸۲ء: زباں پر اسے خوشا صلِّ علیٰ
یہ کس کا نام آیا، ۵۴۰

(۲) سلام اسے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی،
۴۱۹ - ۴۲۰

حفیظ ہوشیارپوری، المتوفیٰ ۱۹۷۳ء: ظہورِ نورِ ازل کو نیا
بہانہ ملا، ۱۴۷

حمزہ، منشی شمس الدین امیر، المتوفیٰ ۱۹۱۹ء: آنکھ میں
شکلِ نبیؐ دل میں مکانِ مصطفیٰؐ، ۶۷۷

حمزہؓ بن عبدالمطلب بن ہاشم، حضرت الشہید، ۶۲۵ء:
حَمِدْتُ اللّٰہَ حِیْنَ فُؤَادِی، ۲۳۲

حمید صدیقی لکھنوی۔ المتوفیٰ ۱۹۶۵ء: کونین میں شہرت ہے
سرکارِ دو عالم کی، ۲۸۷

خ

خاطر غزنوی: جاگتے میں بھی وہی ہے جو مرے خواب میں ہے،
۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۳۱

(۲) دل و نظر کی سب آلائشوں کو دُور کیا ۱۳۲، سالنامہ
(جون ۱۹۸۵ء) ۵۲۴

(۳) فضا کا ذرّہ ذرّہ عشق کی تصویر تھا کل شب
جہاں میں تھا (نعت) ۱۳۲، سالنامہ (جون
۱۹۸۵ء) ۵۲۵

خاقانی، شروانی، حکیم، المتوفیٰ ۵۹۵ھ/ ۱۱۹۹ء:
آں شاہد "لعمرک" و شاگرد "فاستقم"،
۳۰۵

(۲) زریں صدفی جواہر افزای، ۳۰۳ - ۳۰۴

(۳) ہر صبح سرز گلشن سودا بر آورم، ۳۰۴ -
۳۰۵

خالد عبدالعزیز: تو برگزیدہ ترین فردِ نوعِ آدمؐ ہے،
۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۲۳-۲۴

(۲) مرا دل ہے مشغوفِ محبتِ محمدؐ، ۱۳۳ (ستمبر
۱۹۸۶ء) ۳۰۷ - ۳۱۳

عنوانِ نعت: حرفِ مدحت

خاور، عبداللہ: حضور دشتِ بلا میں ہے شامِ غم کا ظہور،
۶۲۱ - ۶۲۲

خسرو دہلوی، امیر، المتوفیٰ ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء: اے
دل و جاں ماندہ خیزرہ سوے جاناں طلب،
۳۲۶

(۲) محمدؐ است چو دریائے رحمت اندر پیش، ۳۲۷
-۳۲۸

خلق، نواب بہادر یار جنگ، المتوفیٰ ۱۹۴۴ء: اے کہ
ترے وجود پر خالقِ دو جہاں کو ناز، ۷۰۱

خواجہ کرمانی، المتوفیٰ ۱۳۴۹ء: صلِّ علیٰ محمدؐ درہ تاج الاصطفا،
۳۲۹ - ۳۳۰

د

داغ دہلوی، المتوفیٰ ۱۹۰۵ء: کرد غم سے آزاد یا
مصطفیٰؐ، ۶۶۲

(۲) میں کلمہ گو ہوں خاص خدا اور رسولؐ کا،
۶۶۳

دانش، احسان، المتوفیٰ ۱۹۸۲ء: تجھ پہ سلام صاحبِ
اسرارِ شش جہات، ۵۰۹ - ۵۱۰

(۲) کعبۂ جاں قبلۂ قلب و نظر پیدا ہوئے، ۵۵۷

س

ع

ک

گ

ل

م

نظمیں، غزلیں

ا

۱۵۶ - ۱۶۲

(۲۶) عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۹۵

(۲۷) غالب، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۹۰

(۲۸) غزل آں شے، ۲۹ - ۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۸۶

(۲۹) فکر و فن کا یُوں تو ٹھاٹھیں مارتا دریا ہوں میں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۰۴

(۳۰) کبھی گزشتہ جو دن رات یاد آتے ہیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۹۲

(۳۱) کراچی سے ایک تار، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۸۵

(۳۲) کس متاعِ شوق کی ہم جستجو کرتے رہے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۹۳

(۳۳) گران کو جُوئے خوں سے گزرنے کا شوق تھا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۰۱

(۳۴) گیے برطارمِ اعلیٰ نشینم، ۸۳ - ۸۴ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۱۲ - ۱۱۵

(۳۵) مُرسیہ، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۹۵

(۳۶) مشرقی بنگال، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۳۰

(۳۷) ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۵۶

(۳۸) نذرِ فراق، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۶

(۳۹) نہ عشق کا نہ کوئی حسن کا فسانہ چلے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۰۰

(۴۰) ہر کلی مونس و دمساز نظر آتی ہے، ۲۷ - ۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۳۳

(۴۱) ہم کہ ظاہر میں نظر آتے ہیں فرحاں کتنے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۰۳

(۴۲) ہمارے اوّلیں اجداد، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۸۵

(۴۳) یورپ کی پہلی جھلک، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۰۸ - ۲۰۹

(۴۴) یُوں تو ملنے کو جہاں میں ہمیں کیا کیا نہ ملا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۹۴

آزاد، محمد حسین: رُخِ رنگیں کی جو یاد میں ہوں خُوں بار آنکھیں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۸۴۴

آزاد انصاری: اُمید، سوو مفقود - ارماں، سود معدوم، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۲۰

(۲) تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۲۳

(۳) جو حال دیکھتے ہو، وہ خود عرضِ حال ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۲۲

(۴) سخت مشکل ہے کہ اس کا جاننا ممکن نہیں،

۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۱۲۱

(۵) کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ! ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۲۰

(۶) لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا! ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۹

(۷) مے پی، دل کو غم سے نہ پاٹ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۹

(۸) نہ پوچھو! کون ہیں، کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۱۲۱

(۹) بے خبرا وجہ بناتے دوسرا ابھی عشق ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۱۲۳

(۱۰) وہ تیرا دل میں رہ کر، آنکھ سے مستور ہو جانا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۱۲۲

آزردہ، مفتی صدرالدین: یہ کہہ کے رخنہ ڈالیے ان کے حجاب میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۷

ازل، منشی عبدالحمید: اس نے مژگاں کا تان کہ بھالا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۵

آسی، عبدالباری: سالی کے نام ایک خط (منظوم) ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۱۶-۸۱۹

آسی، عبدالعلیم: تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۰

آسی الدنی: قید سے پہلے بھی آزادی مری خطرے میں تھی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۳۲۷

(۲) ہزاروں طرح اپنا درد ہم اس کو سناتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۳۲۵

آسی غازی پوری: تاب دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۴۸

آشفتہ، بھورے خاں: جام گدائی ہاتھ میں، نت سانج سویرے پھرتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۸

آشفتہ، مرزا رضا قلی: یہ جوشش غم ہے کہ سینہ میں خوں اُبلتا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۸

آصف، آصف الدولہ بہادر: جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۹

آفاق صدیقی: لاہور کے نام، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۱۲۰۳

(۲) محبت بے نیاز عہد و پیماں ہے جہاں میں ہوں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۵۹

(۳) مقبوضہ کشمیر، ۱۰۵، تیسرا حصّہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۱۲۰۴

آفتاب، شاہ عالم بادشاہ دہلی، بعدِ مجنوں کیوں نہ ہوں میں کار فرمائے جنوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۰

ابنِ انشاءؔ، اداس رات کے آنگن میں، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۲۶-۱۲۷

(۲) اس بستی کے اک کوچے میں، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۴۰-۱۴۲

(۳) اک بار کہو تم میری ہو، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۴۳-۳۴۴

(۴) امن کا آخری دن، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۴۱-۱۴۴

(۵) اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۲

(۶) اے متوالو! ناقوں والو، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۸۲-۸۳

(۷) پیت کئے دکھ ہوئے، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۸۲-۱۸۴

(۸) جلسی سی اک بستی میں، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصّہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۸۸

(۹) خاموش رہو، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۸۲

(۱۰) دل اک کٹیا، دشت کنارے، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۸۶-۱۸۸

(۱۱) دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۳

(۱۲) دوستو! فرصت دلداریِ دنیا تھی کہاں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۳۷۸

(۱۳) سانحہ ہم پہ یہ پہلا ہے مری جاں کوئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۲

(۱۴) ساون بھادوں ساٹھ ہی دن ہیں پھر وہ رُت کی بات کہاں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۳

(۱۵) سب مایا ہے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۴۱-۳۴۲

(۱۶) سرا ہے، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۰۲-۱۰۳

(۱۷) عرش کے تارے توڑ کے لائیں کاوش لوگ ہزار کریں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۳۷۷

(۱۸) کبھی ان کے ملنے کی آشا نے اک جوت جگادی تھی من میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۴

(۱۹) مغرب کی اذاں، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۷۱-۱۷۲

(۲۰) واپسی، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۶۷

(۲۱) وہ نہ جو قیدِ وصال میں آیا، جس نے جو چاہا سمجھا، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۳۷۷

(۲۲) ہم اس دل کے محرم ٹھہرے، والیِ مصر کا

زنداں تھا، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۳۷۹

(۲۳) ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں کی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۵

(۲۴) یا تو یہ شخص، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۰۹

(۲۵) یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۶۸-۱۶۹

(۲۶) یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، ۷۹-۸۰، ادبِ عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۹۴-۶۹۵

ابنِ انشا (مترجم): برف کا گالا از سوچہ مو، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۵۲

(۲) جگنو سے ازلی یو، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۴۹

(۳) سُرخ رنگ دھو ڈنہیں از ہیوچی فینگ، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۵۱

(۴) کوچ از کنفیوشس، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۵۰

(۵) کیسے کیسے لوگ از پائن چی لن، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۴۸

ابوسعید قریشی: بے خد و خال ہجوم، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۴۴۳-۴۴۵

(۲) سندباد جہازی کا سفرِ آخرت، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۳۹-۲۵۲

(۳) عالمی اسلحہ نمائش، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۲۲

(۴) فرصت، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۳۵

اثر، سیّد امداد امام: اپنی آنکھوں میں کبھے خود رُخِ زیبا ہو کر، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۲۵۷-۲۵۸

(۲) سنا حالِ دل، پر کہا کچھ نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۱

اثر، میرؔ: دل میں ہے جو رتبے از سرِ نو یاد کریں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۷۹

(۲) ہم ہیں بے دل، دل اپنے پاس نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۷۹

اثر صہبائی: گو سکوں کی جستجو بھی عمر بھر ہوتی رہی، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۳۶۴

اثر لکھنوی: آواز بیکسی میں بھی تجھ کو کوئی نہ دے، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۷۷

(۲) بات کھوتے جو التجا کرتے، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۷۷

(۳) بجا ہے جتنا بھی پامالیوں پہ ناز کرے، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۱۹۱

(۴) بے منتِ ذوقِ تشنہ لبی تسکین نہیں آرام نہیں، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۶۳

(۵) پرچھائیاں، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۸۰

(۶) پرچھائیاں، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۷ء) ۱۳۷

(۷) پیچ پر پیچ خم کے اندر خم، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۲۶

(۸) تعاقب، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۳۰-۱۳۴

(۹) تمنا کشتگانِ شوق کی جانوں پہ کیا گزری،

۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۷۶

(۱۰) جس دم خیال نرگس مستانہ آگیا، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۶۴

(۱۱) جس قدر غم ہُوا ہے خوشی کی ہے، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۹۴

(۱۲) جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۵۴ ۱۹ء) ۱۹۸۳

(۱۳) حیا میں اک ادا نکلی، اداؤں سے حجاب آیا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸۰

(۱۴) خمخانۂ خیال، ۶۹ - ۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۸۱ - ۱۸۲

(۱۵) دل کا ہے رونا، کھیل نہیں ہے، منہ کو کلیجا آنے دو، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸۲

(۱۶) دلہن بنی ہُوئی اب کی چمن میں آئی ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸۴

(۱۷) رزم و بزم، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۱۶ - ۱۱۷

(۱۸) روز اک رنگ نیا، روپ نرالا دیکھا، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۷۲ - ۷۳

(۱۹) سوائے نام کے تیرا نشاں نہیں معلوم، ۴۵ - ۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۲۱

(۲۰) صبح نے انگڑائی لی چھلکا وُہ نور آفتاب، ۵۱ - ۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۷۱

(۲۱) صحرا سے چلے ہیں سُوئے گلشن، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸۱

(۲۲) صلہ جاں بازیوں کا پا رہے ہیں، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۸۲

(۲۳) صلہ جاں بازیوں کا پا رہے ہیں، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۵۷

(۲۴) فقط یہی نہیں حال بلاکشاں نہ کہو، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۱۵

(۲۵) قطعہ ہمطرح غزل، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۵۹

(۲۶) کاہے کو ایسے ڈھیٹ تھے پہلے، جھُوٹی قسم جو کھاتے تم، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸۱

(۲۷) کچھ نشیمن تو گلوں سے چھا گئے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸۴

(۲۸) کمر ہر قدم پر لچکتی رہی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸۳

(۲۹) کھوئے ہُوئے سے رہنا دن کو، رستے پھرنا راتوں کو، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸۲

(۳۰) گزشتہ عیش کے ہم ہیں امیدوار ابھی، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۵۲

(۳۱) گلچینِ جمال کا لپکا ابھی چھوڑ دے، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۸۳

(۳۲) مبارک رہے تم کو خوابوں کی دنیا، ۲۳ - ۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۶۸

(۳۳) مثالِ برگ خزاں رسیدہ ہوا ہے زرد آفتاب کیسا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸۰

(۳۴) مژہ پہ جو ٹھہرا ہوا اشک تر ہے، ۲۹-۳۰
پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۴ء) ۱۷۵
(۳۵) ملا کیا کہہ کے اک بار لے دل حسرت نشاں پھر بھی، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۵۳

احسان، منشی احسان علی: اس کو نہ سوچئے کہ ستم یا کرم ہوا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۹

احسن علی خاں: بلبل کو الم، گل کو مسرت ہی بہت ہے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۴۲۸
(۲) بہت اجڑا ہوا ہے دل، پر ایسا بھی نہیں ہے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۸۳
(۳) تزئینِ غم، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۷۹-۴۸۲
(۴) چار نظمیں، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۲۹-۵۳۰
(۵) خوشیاں ملیں تو ان کو بھی غم آشنا کیا، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۵۴
(۶) شعر گوئی کی میسر ہو جو فرصت اے دوست، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۰۹
(۷) کب تک تری بیداد کا غم کرتے رہیں گے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۱۳
(۸) کس کے نام کروں؟، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۱۲
(۹) کیا کہیے کہ کیا جور و ستم ٹوٹ گئے ہیں، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۰۷
(۱۰) میں کیوں جی رہا ہوں، میں زندہ ہوں کیسے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۶۳
(۱۱) میں نے سوچا کہ تو بھی ملے گا مجھے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۲۸
(۱۲) نہ پوچھو ہم سے ناصح کہ پھر ان کی باتوں میں کیوں آ گئے ہیں، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶۱
(۱۳) نیلگوں وسعتِ گماں ہوں میں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۸۴
(۱۴) وُہ ہم کو لگتے ہیں اجنبی سے، ہم ان کو لگتے ہیں غیر جیسے، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۵۵
(۱۵) ہم کہہ نہ سکیں گے تو یہ حالات کہیں گے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۶۲
(۱۶) یہ اپنی بیچارگی کا عالم، گُنہ نہیں ہے تو اور کیا ہے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۱۳
(۱۷) یہ ہست و بود نقوش، طفلِ ہوا کا اِک مشغلہ ہو جیسے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۸۵

احسن لکھنوی، مہدی حسن، دل کی وحشت نہ گئی خاک میں مل جانے سے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۹۶

احسن مارہروی: ادا میں بانکپن، انداز میں اک آن پیدا کر، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۹
(۲) ساقی و واعظ میں ضد ہے بادہ کش چکر میں ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۹

احسن، میرزا احسن: نہ نالہ ہے دل میں نہ آہِ حزیں ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۰

احمد، خان احمد حسین خان : مجھے ڈھونڈے نہ کوئی اے مقدر
اشکباروں میں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے
ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۷
احمد علی، مغربی شعرا کے ترجمے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۴۲
احمد ندیم قاسمی : دیکھیے ندیم قاسمی، احمد
احمد وصی : تیرا وجود، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۲۰۰
(۲) امتحان، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر۔دسمبر
۱۹۶۶ء) ۲۸۶
اختر، جاں نثار : قطعات، ۷۹۔۸۰، ادب عالیہ نمبر
(اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۷۲
(۲) ہر سمت افق پہ ہیں دھندلکے، غزل نمبر
(ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر
۱۹۸۵ء) ۴۶۷
اختر، علی : حریم کعبہ بنادی وہ سرزمیں میں نے، ۴۱۔۴۲،
غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۲
(۲) زندگی کیا ہے، جو دل ہو تشنۂ ذوقِ وفا،
۴۱۔۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۲
اختر، قاضی صادق : جب پردہ رُخ سے دور کرے وہ نقاب
کا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع
چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۵۰
اختر، محمد صادق خاں : عجب ڈھب کی یہ تعمیرِ خراب آبادِ ہستی ہے،
غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر
۱۹۸۵ء) ۴۸۶
اختر، نواب اختر محل : اک آہِ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا،
۴۱۔۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۴
اختر، نواب واجد علی شاہ : چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا
تھا، سو ہوا، ۴۱۔۴۲، غزل نمبر (مئی، جون
۱۹۵۴ء) ۳۸۱
اختر، ہری چند : شباب آیا کسی بت پہ فدا ہونے کا وقت
آیا، ۴۱۔۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۴۲۳
اختر انصاری : بہار آئی زمانہ ہوا خرابا تی، ۴۱۔۴۲،
غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۹
(۲) بطونِ زلیست سے کٹ کر اٹھا جو فرد تو کیا،
۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۸۸
(۳) پُرکیف ضیائیں ہوتی ہیں، پُرنور اجالے
ہوتے ہیں، ۷۷۔۷۸، خاص نمبر (دسمبر
۱۹۵۹ء) ۱۶۲
(۴) چل گیا کرب تمنا کا فسوں، مارے گئے، ۳۳
۔۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۶۶
(۵) حلاوتیں نہ ہمیں مل سکیں تکلم کی، ۴۱۔۴۲،
غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۹
(۶) خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں، ۲۹۔
۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۷۹
—— ۴۱۔۴۲، غزل نمبر (مئی جون ۱۹۵۴ء)
۲۱۸
(۷) خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں، ۷۹۔
۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۷۳
(۸) رباعیات، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ
(اپریل۔جون ۱۹۶۶ء) ۳۴۴
(۹) رباعیات، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۴۵۔۱۴۶؛
۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۹۰؛ ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء)
۳۷۲۔۳۷۴

(۱۰) سہاروں کی تلاش، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری فروری ۱۹۵۷ء) ۱۶۵

(۱۱) صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۸

(۱۲) فیصلہ، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۳۴-۳۳۶

(۱۳) قطعات، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۰۹؛ ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۴۱؛ ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۶۶؛ ۶۷-۶۸ دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۱۹؛ ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۸۸؛ ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۳۸؛ ۸۱-۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۳۲؛ ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۶۵

(۱۴) کسی سے لڑائیں نظر اور جھیلیں محبت کے غم اتنی فرصت کہاں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۷

(۱۵) کوئی مآلِ محبت مجھے بتاؤ نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۷

(۱۶) معبدِ ویراں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۴۳

(۱۷) مہرباں مارے گئے نامہرباں مارے گئے، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۳۱

(۱۸) مے نوشی، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۴۱

(۱۹) نصیب آج تک ایسی کوئی خوشی نہ ہوتی، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۲۴

(۲۰) وفورِ شوق کی بنیاد آرزو تیری، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۷۶

(۲۱) وقت کی بانہوں میں (قطعات)، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۸۹-۱۹۱

(۲۲) ہم البیلے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۴۲

(۲۳) یہ صنم روایت و نقل کے ہبل و منات سے کم نہیں، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۳۷

اختر انصاری اکبرآبادی: اپنی بہار پہ نہ ہنسنے والو! کتنے چمن خاشاک ہوئے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۹۷

(۲) نہیں یہ وقت کہ ہم گلرخوں کی بات کریں، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۰۵

(۳) ہم اہلِ شوق تماشائے رنگ و بو کرتے، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۸۲

اختر اورینوی، ڈاکٹر: افسردگیٔ سوختہ جاناں، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۴۲

(۲) اے دوست، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۳۲

(۳) پہلے تو بہت نادان تھے وہ اب کی شرارت کیا کہئے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۲۰

(۴) حسن گریزاں، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۳۳

(۵) غمِ شبانہ، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۲۰

(۶) قصیدہ بحضورِ غالب، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۵۶-۳۵۷

(۷) کبھی تو خواب میں آؤ کہ رات بھاری ہے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۳۱

(۸) وارفتگی، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۳۰
(۹) یہ جمالِ جاں فزائی بہ کمالِ دل ربائی، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۷۸

اختر الایمان: آخری ملاقات، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۷۸
(۲) آگہی، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۹۱
(۳) پس منظر، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۸۰
(۴) تبدیلی، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۲۲
(۵) سلسلے، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۸۱
(۶) وہ مکان، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۳۹
(۷) یہ دور، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۲۱

اختر شیرانی: غزلیں، آرزو وصل کی رکھتی ہے پریشاں کیا کیا، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۰
(۲) اٹھا ساغر کہ دنیا درپئے آزار ہے ساقی، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۵۵
(۳) تمناؤں کو زندہ آرزوؤں کو جواں کر لوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۰
(۴) جھوم کر بدلی اُٹھی چھا گئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۲
(۵) کون آیا ہے مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ؟ ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۱
(۶) نہ ساز و مطرب نہ جام و ساقی نہ وہ بہار چمن ہے باقی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۲
(۷) وُہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بُھلا دیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۱

اختر علی تلہری، سید: نجومِ چرخ ہیں گہنائے گلستاں میں نہیں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۶۱۴

اختر لکھنوی: اک ہمیں نہیں ساقی کرم تنہا، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۹۱
(۲) ہر رنگ میں جوان کے وفادار رہے ہیں، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۵۸
(۳) ہشیار کر رہا ہے گجر جاگتے رہو، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۸۴

اختر ہوشیار پوری: اپنے اندر کا آدمی نہ رہا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۰
(۲) احساں ہیں دھوپ پر شجر کے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۳
(۳) اک آفتابِ نو کی طرح جلوہ گر رہے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۴۵۵
(۴) اک عمر ہو گئی ہے یہی خواب دیکھتے، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۱۶
(۵) انہی راہوں میں خراماں ہو گی، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۱۱۰
(۶) ایک ہم تو نہیں آبلہ پا آوارہ، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۹۹

(۷) پلٹ کر بھی جو دیکھوں ایک منظر دیکھتا ہوں، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۴۰

(۸) پھر ابر برس کے کھل گیا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۰

(۹) پے بہ پے شیشے سے ابھرا ہے مرنیم شبی، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۲ء) ۹۲

(۱۰) تجھ سے کوئی شکوہ کیا تو جانِ وفا ہو گا، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۳۹

(۱۱) تصویر میں رنگ بھر رہا ہوں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۱

(۱۲) تغیر، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۸۹

(۱۳) تھا کسی ذات کا پیکر کہ کوئی سایہ تھا، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۳۳

(۱۴) تری نگاہ کا آئنہ دیکھتا بھی نہیں، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۰۹

(۱۵) جب تک کسی منزل کا تصور ہو نظر میں، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۸۶

(۱۶) جب راز خود ہی فاش ہو غمخوار کیا کرے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۸۹

(۱۷) جب عشق کی راہ پر گئے ہم، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۲۶

(۱۸) دم بخود ہوں عالمِ خونِ گلستاں دیکھ کر، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۴۵۶

(۱۹) دولت قرار آئے نکہت نگار آئے، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۲۵

(۲۰) روشن چراغِ راہِ تمنا اگر نہ ہو، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۷۶

(۲۱) زخم مہکے ہیں کہ پھولوں سے صبا ملتی ہے، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۲۳

(۲۲) سنتے ہیں نہ لوگ بولتے ہیں، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۴۰

(۲۳) قدم قدم پہ ساتھ دیا ہے قدم قدم اب ساتھ رہو، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۸۱

(۲۴) کوئے جاناں کا وہی موڑ نشاں ٹھہرے گا، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۱۸

(۲۵) گھر سے میں ہی نہ اکیلا نکلا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۲

(۲۶) مری بستی کو دو رویہ قطاریں ہیں درختوں کی، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۳۹

(۲۷) مری نگاہ کا پیغام بے صدا جو ہوا، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۲۴

(۲۸) مرے پڑوس میں ایسے بھی لوگ بستے ہیں، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۱۵

(۲۹) میں نے یوں دیکھا اسے جیسے کبھی دیکھا نہ تھا، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۵۵

(۳۰) نہ کہکشاں نہ بہاریں نہ بیخودی نہ سرور، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۶۲

(۳۱) ہم سے پوچھو کہ بیکراں تھے پھول، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۹۷

(۳۲) یُوں تو خود کو کبھی آوارہ و رُسوا کرتے، ۹۶،
سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۲۰

ادا جعفری، اندھیری راہ میں مسافر کہیں نہ بھٹکا تھا، ۱۲۹،
عصری ادب نمبر (ستمبر ۸۲ ۱۹ء) ۳۹۲

(۲) بے آس ساعتوں میں ترا نام یُوں لیا، ۱۳۳
(ستمبر ۱۹۸۶) ۳۲۲

(۳) تالیفِ غم، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۷۷

(۴) تضادِ رنگ، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۸۴

(۵) توفیق سے کب کوئی سروکار چلے ہے، ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۷۶

(۶) تھا دل کو انتظارِ بہاراں نہ سو سکے، ۱۰۳
(ستمبر ۱۹۶۵ء) ۱۴

(۷) چشمۂ حیواں، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۵۳-
۱۵۴

(۸) حال کھلتا نہیں جبینوں سے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء)
۳۷۷

(۹) خامشی سے ہُوئی فغاں سے ہُوئی، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۸۵ ۱۹ء) ۴۷۱

(۱۰) داستاں ختم ہُوئی ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا
حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۹۱

(۱۱) داستانِ لب و رخسار سے آگے نہ بڑھو، ۱۰۵،
سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء)
۳۸۴

(۱۲) دستک، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر
۱۹۸۲ء) ۳۹۰

(۱۳) دل اپنا جلایا ہے کسی نے بھی خوشی سے،
۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۱۱

(۱۴) دل دکھاتے رہے، جی جلاتے رہے،
۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون
۱۹۶۶ء) ۳۸۳

(۱۵) دل زدوں کے بس میں کیا تھا بے بسی بڑھتی گئی،
۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۲۹

(۱۶) دل کو شیشہ کہنے والو! ۱۰۸ (ستمبر
۱۹۶۷ء) ۵۷۸

(۱۷) ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے، ۴۱ - ۴۲،
غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۵۴۴

(۱۸) ذوقِ تقصیر کہو، حیلۂ تعزیر کہو، ۱۰۳
(ستمبر ۱۹۶۵ء) ۱۲

(۱۹) راستہ روک رہی ہو جیسے، ۱۲۰ (جنوری
۱۹۷۶ء) ۳۷۵

(۲۰) راہزن ہے نہ کوئی سنگ گراں، ۱۰۵،
سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء)
۳۸۹

(۲۱) رہنے کو تو ہم تجھ سے بھی آزردہ رہے ہیں،
۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون
۱۹۶۶ء) ۳۸۲

(۲۲) سانجھ بھئی پردیس، ۱۰۵، سالنامہ،
دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۸۷

(۲۳) سترہ دن، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ
(اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۸۹ — ۱۱۹۰

(۲۴) سوادِ شب، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء)
۱۸۵-۱۸۶

(۲۵) شکوہ بھی کیجیے تو کہاں سے روا نہیں، ۱۰۷، (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۵۵

(۲۶) صبر آیا، نہ تاب آوے ہے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۷۲

(۲۷) طلب کی آنچ سے دل کو کبھی جُدائی نہ دے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۷۳

(۲۸) عالم ہی اور تھا جو شناسائیوں میں تھا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۳۹۱

(۲۹) فریب کاریٔ تخیّل پہ جو اتراسے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۵

(۳۰) قطعات، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۴۲

(۳۱) کرن نگاہ کی بہلا گئی تو کیا ہوگا، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۴۸

(۳۲) کرن نگاہ کی بہلا گئی تو کیا ہوگا، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۹۶

(۳۳) کیا پُوچھتے ہو لالہ عذاروں کی داستاں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۸۵

(۳۴) گھر کا رستہ بھی ملا تھا شاید، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۷۷

(۳۵) معذرت، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۵۶

(۳۶) مگر مجھے بتاؤ کیوں، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۷۶

(۳۷) وہی شعلہ، وہی شعلہ کی لپک ہے کہ نہیں، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۱۵

(۳۸) ویسے ہی خیال آگیا ہے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۷۴

(۳۹) ہم سفر، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۵۲

ارشد، میرزا عبدالغنی گورگانی: الٰہی! جان دی ہے مَیں نے کس کے رشتۂ روشن پہ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۲

اسد، میر امانی: پی کر خراب، دُردِ تہِ جام دے گیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۲

اسد، نواب سلیمان خان: کچھ بھی نہ تھے، سب کچھ ہوتے، پھر کچھ بھی نہ ہوں گے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۸۱

اسد ملتانی: رہیں نہ رند یہ واعظ کے بس کی بات نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۳۴

اسرار زیدی: آنے والی کل کی دے کر خبر گیا یہ دن بھی، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۷۸

(۲) گم ہوتی ہوئی فصلِ شبِ ماہ نہ دیکھو، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۷۷

اسیر، منظفر علی، آہ کب لب پر نہیں ہے داغ کب دل میں نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۳

اسماعیل میرٹھی: جو بھلے برے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۳

اشتیاق، ولی اللہ سرہندی: خیال دل کو ہے اس گل سے آشنائی کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی،

جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۴

اشعر، جبیب: بے نیازی سے، مدارات سے ڈر لگتا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۸

(۲) دل کے ہاتھوں کہیں دنیا میں گزارا نہ رہا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۸

اشک رامپوری: اک دن وہ مل گئے تھے سر رہگذر کہیں، ۵۰-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۴۵

——— غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۹

——— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۷۹

(۲) حسرتیں اور تباہی میری، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۹۶

(۳) سرد مہری سے تری دل جو تپاں رکھتے ہیں، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۷۱

اصغر گونڈوی: آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۲

(۲) ترے جلووں کے آگے ہمت شرح و بیاں رکھ دی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۰

(۳) جان بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۱

(۴) جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشمِ بشر سے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۳

(۵) زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۰

(۶) صحن حرم نہیں، یہ کوئے بتاں نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۲

(۷) کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۴

(۸) کیا کہئے جاں نوازیٔ پیکان یار کو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۱

(۹) نہ ہوگا کاوشِ بے مدعا کا رازداں برسوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۳

(۱۰) وہ نغمہ، بلبل رنگیں نوا اک بار ہو جائے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۴

اطہر ہاپڑوی، سید معشوق حسین: تاریخ ہائے وفات مولانا سید علی نقی صفی لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۰۶-۴۰۷

اطہر ہاپوڑی: وہ حسنِ حیرت افزا اک نظر دیکھا نہیں جاتا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) ۴۵۹

اظہر ضمیر: آنکھوں میں رنگ جن کے دائم سجے ہوتے ہیں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۸۹

(۲) اے پاک وطن! ہم تیرے ہیں، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۱۲۰۹

(۳) اے یار! تری خاطر سب قرض چکا بیٹھے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۹۲

(۴) بن پڑی دل پہ تو غم کام نہ آیا کوئی، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۹۲

(۵) تنہا تنہا، غمگیں غمگیں، چپ چپ، گم صم

رہتا ہوں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء)
۴۹۰
(۶) دیوانگی میں کیا ہیں صحرا ہی جانتا ہے، ۱۰۶،
خاص نمبر (اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۸۵
(۷) کامل ہے خود نمود سے تکمیل کیا کریں، ۱۰۳
(ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۸۲
(۸) کچھ بھی نہیں زباں پر اک نام کے علاوہ، ۱۰۷ (مئی
۱۹۶۷ء) ۱۹۱
(۹) کون ؟ ۵۱ - ۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۹۶
(۱۰) کوئی چارہ گر جو ملتا دل و جاں لہو نہ کرتے، ۱۰۲،
(مئی ۱۹۶۵ء) ۲۲۸
(۱۱) وطن کے پاسباں، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا
حصہ (اپریل۔ جون ۱۹۶۶ء) ۱۲۰۷ - ۱۲۰۸
اظہر امرتسری، خدا بخش: یہ روز قیامت ہے تکمیل تمنّا کر،
غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم
(اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۹
اعجاز فاروقی: خزاں کا نور، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۵۲
- ۳۵۳
اعظم، مرزا اعظم علی: ساقی نے دیا جام مئے بے خبری کا،
غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم
(اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۸۰
اعظمی، خلیل الرحمٰن: آتے ہیں اور گزرتے ہیں کتنے ہی ماہ و
سال، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۰
(۲) آنچل کی چھاؤں میں، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر
(جون ۱۹۵۸ء) ۳۳۵
(۳) اب کے آئی جو مری رہ میں تو پامال رہی، ۷۴،
- ۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۵۴
(۴) ایک سی بے رنگ صبحیں، ایک سی بے کیف
شام، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۰۷
(۵) پینا نہیں حرام، ہے زہر وفا کی شرط، ۹۴
(جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۰۴
(۶) تنہائی سے آگے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۵۳
(۷) خوابوں سے ڈر لگتا ہے، ۹۶، سالنامہ
(جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۰۸
(۸) دوسری ملاقات، ۷۷ - ۸۰، خاص نمبر
(دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸۳
(۹) ذاتیات، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۰۷
(۱۰) زندگی، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۷۷
(۱۱) گلی گلی کی ٹھوکر کھائی، کب سے خوار و پریشان
ہیں، ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۷۲
———— ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۴۳۶
(۱۲) کون لے گیا؟، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۹۶
(۱۳) ملے ہیں زخم بائے، توبہ تو ساری خدائی سے،
۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون
۱۹۶۶ء) ۳۹۲
(۱۴) میرے شعروں سے بھی بڑھ کر تری صورت
ہے حسین، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۰۲
(۱۵) واپسی، ۵۵ - ۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء)
۱۲۳
(۱۶) ہم سے شا کی شہر کے سب عالم فاضل ہوئے،
۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۶۵

یاد نہیں، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۷۹

(۳) حیا کے بار سے نظریں جھکی جھکی جیسے، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۱۰۲

(۴) دامنِ دل ہے تار تار اپنا، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۰۸

(۵) رائیگاں ہوگیا تبسم بھی، ۲۳ - ۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۸۰

(۶) رگ رگ میں اس مست نظر کا کیف مجسم آج بھی ہے، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء) ۸۷

(۷) شعور منزل رسی کی حد تک جنوں کے تیور بدل گئے ہیں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۰۶

(۸) غرور تشنہ لبی کام آ ہی جاتا ہے، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۱۹

(۹) غم میں تسکیں کے پہلو بدلتے رہے، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۱۱

(۱۰) کیسے اظہارِ تمنا ہوگا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۵۱۰

(۱۱) گردش میں بھی ہم راستہ پا گئے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۰۴

(۱۲) گزر گئی جو چمن پر وہ کوئی کیا جانے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰۴

(۱۳) لبوں پہ ساغر و صہبا کی بات جب آئی، ۳۱ - ۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۸۷

(۱۴) محبت مجھ کو لے آئی کہاں تک، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۳۲

(۱۵) وہ نگاہوں کو جیب بدلتے ہیں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۰۵

(۱۶) ہر موڑ نئی اک الجھن ہے، قدموں کا سنبھلنا مشکل ہے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۰۷

(۱۷) ہم چل تو پڑے ہیں جذبۂ دل جاتا ہے کدھر معلوم نہیں، ۷۳ - ۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۵۳

اکبر، جلال الدین: اقبال، ۱۲۲و، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۲۷۸

(۲) خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۹

(۳) ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۹

اکبر الٰہ آبادی: آہ جو دل سے نکال جائے گی، ۴۱ - ۴۲، (غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۶

(۲) اودھ پنچ، ۷۱ - ۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۲۶۰ - ۲۶۴

(۳) تیرے سحرِ نظر سے ہوا یہ جنوں میرے دل کی تو اس میں خطا ہی نہ تھی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۶

(۴) چمن کی یہ کیسی ہوا ہوگئی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۵

(۲۷) کارِ خیر، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۱۹۹
(۲۸) کوسٹے تنک، ۴۳-۴۷ (مئی ۱۹۵۹ء)
۱۴۳
(۲۹) کہانی ایک ملک کی، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۵۱
(۳۰) کیا روپ دوستی کا کیا رنگ دشمنی کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۵۳
(۳۱) گدلے پانی، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۰۶
(۳۲) لیکتے، میٹھے، مسلسنے زمانے، ۳۳-۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۷۱
(۳۳) محاذِ وطن، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۸۲
(۳۴) مرے خدا، مرے دل، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۳۶-۲۳۷
(۳۵) مسیحا، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۴۹-۳۵۱
(۳۶) منزل، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۲۴
(۳۷) موجِ صبا، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۷۰
(۳۸) موجودگی، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء)
۱۵۴
(۳۹) نرگس، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء)
۱۵۵
(۴۰) ہری بھری فصلو، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۷۸
(۴۱) ہیولیٰ، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۹۲-
۹۳

امجد حیدر آبادی: کام کب حسب مدعانہ ہوا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۳۵۳

امجد، یحییٰ: باغوں میں آئے گی کب بہار، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۸۴
(۲) خدا گواہ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء)
۲۸۶
(۳) شب کے سب اسرار تمہارے ہیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۸۵

امید، قزلباش خاں: یارب گھر میں عجب صحبت ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۳۸۶

امید فاضلی: اپنی فضا سے اپنے زمانوں سے کٹ گیا، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۱۱
(۲) بُجھا تو ہے مگر جل کر بُجھا ہے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۱۳
(۳) وہ خواب ہی سہی پیشِ نظر تو اب بھی ہے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۳۶
(۴) ہر خواہشِ حیات سے صرفِ نظر کیا، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۱۲

امیر، نواب محمد یار خاں، سرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے بیداری سے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۷

امیر عارفی: ضیا عارض رنگیں چراغِ خانہ بنی، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۲۷

امیر مینائی: آنکھ اس کے حضور رو رہی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۳

(۲) اچھے عیسٰی ہو، مریضوں کا خیال اچھا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۳

(۳) اس کی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۰

(۴) جب سے بلبل تُو نے دو تنکے لئے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۲

(۵) رہے تصویر حیرانی ہم ان کے روبرو برسوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۰

(۶) صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھ کو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۱

(۷) کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۲

(۸) گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۹

(۹) ناوکِ ناز سے ہے مشکل بچانا دل کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۹

(۱۰) یہ تو میں کیوں کر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۱

امین، خواجہ امین الدین: جس کا دل آپ نے لیا ہوگا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۷

انتخاب سید: خواہش، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۹۰

انجام، عمدۃ الملک امیر خاں: ٹک تو دے فرصت کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۸

انجم، انوار: اک بوند لہو کی، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۶۶

(۲) جہاں بھر سے نہ یوں میرا تذکرہ کیجے، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۲۶

(۳) میری بستی میں جو سورج کبھی اترا ہوتا، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۷۹

انجم اعظمی: جب محبت میں کبھی اپنی خبر ہوتی ہے، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۰۶

انجم رومانی: ازبسکہ تہ گنبد افلاک رہے ہم، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۹۱

(۲) اسی باعث ہمیں اہلِ چمن برباد رکھتے ہیں، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۴۶

(۳) پیہم دامن کشائیاں ہیں، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۷۷

(۴) جہاں تک گیا کاروانِ خیال، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۵

(۵) خرقہ سبز سے نے پیرہن سرخ سے ہے، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۰۵

(۶) جز خار ہوس دامنِ تدبیر میں کیا ہے، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۷۶

(۷) دن ہو کہ رات کنجِ قفس ہو کہ صحن باغ، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۷۷

(۸) دن ہو کہ رات، کنجِ قفس ہو کہ صحنِ باغ، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۷۰۲

ب

(۷) اس زخمی پیاسے کو اس طرح پلا دینا، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۵۵

(۸) بستر دل پہ خوں اگلتے خواب، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۸۶

(۹) بیتاب ہے رنگت کے لیے پیار کی خوشبو، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۱۰

(۱۰) پاس سے دیکھو جگنو آنسو، دور سے دیکھو تارا آنسو، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۴۵

(۱۱) پتھر کے جگر والو! غم میں وہ روانی ہے، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۱۰۹

(۱۲) پھول برسے، کہیں شبنم، کہیں گوہر برسے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۳۵

(۱۳) پھول سا کچھ کلام، اور سہی، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۵۶

(۱۴) تاروں بھری پلکوں کی برساتی ہوئی غزلیں، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۴۴

(۱۵) تلوار سے کاٹا ہے پھولوں بھری ڈالی کو، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۴۳

(۱۶) تمام آگ ہے دل راہ خار و خس کی نہیں، ۱۲۴ سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۴۱

(۱۷) جب تک نگارِ دوست کا سینہ دکھا نہ تھا، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۱۸

(۱۸) جب سحر چپ ہو، ہنسا لو ہم کو، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۳۶

(۱۹) جگنو کوئی ستاروں کی محفل میں کھو گیا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۴۲

(۲۰) جھنجلا کے کسی لمحے وہ توڑ بھی سکتا ہے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶۴

(۲۱) چاند سورج کے آنے جانے سے کچھ کمی زیادتی نہیں ہوتی، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۱۷-۲۱۸

(۲۲) خون پتوں سے جما ہو جیسے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۶۱

(۲۳) دکھلا کے یہی منظر بادل چلا جاتا ہے، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۴۴

(۲۴) رات اک خواب ہم نے دیکھا ہے، ۸۱ - ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۴۶

(۲۵) راتوں کے مسافر ہو اندھیروں میں رہو گے، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۴۵

(۲۶) روشنی کے مقدر میں نیندیں کہاں، چاندنیں، طاق پر، وہ سجائیں کہاں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۳۳

(۲۷) سادہ ورق پہ اُبھرے گا شاید قلم کا چاند، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۱۸ - ۱۱۹

(۲۸) سر پہ سایہ سا دستِ دعا یاد ہے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۴۰

(۲۹) سر سے چادر بدن سے قبا لے گئی، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۴۱

(۳۰) سرکش پہاڑیوں میں جھرنوں کا بانکپن ہے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶۶

(۳۱) سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں، ۹۱

(دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۹۴

(۳۲) سورج مکھی کے گالوں پہ تازہ گلاب ہے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۸۴

(۳۳) سیاہیوں کے بنے حرف حرف دھوتے ہیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۴۲

(۳۴) فضائے نیم شبی ہے برِ حسن صبحِ حیات، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۲۰

(۳۵) فن اگر رُوح و دل کی ریاضت نہ ہو، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۴۰

(۳۶) قدم جمانا ہے اور سب کے ساتھ چلنا بھی، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۹۲

(۳۷) 'کتابِ دل' دکانوں پہ بکے گی، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۲۰

(۳۸) قدم سے آگے آگے چل رہی ہے، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۹۲

(۳۹) کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۳۹

(۴۰) کوئی امید کوئی آس رہے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۸۵

(۴۱) کوئی نہ جان سکا وہ کہاں سے آیا تھا، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۹۲

(۴۲) مجبورِ جفا کار کو پہچان نہ پایا، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۱۰۰

(۴۳) مجروح بہت ہے دل پھر بھی شگفتساں ہے، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۴۰

(۴۴) مجھ کو براہِ راست کوئی تجربہ نہیں، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۲۴

(۴۵) مسافر کے رستے بدلتے رہے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۴۳

(۴۶) مسکراتی ہوئی دھنک ہے وہی، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۴۳

(۴۷) من کی اداس بینا کے سب تار کس گئے، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۷۱

(۴۸) میرے سینے پہ وہ سر رکھے ہوئے سوتا رہا، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۴۵

(۴۹) میں نے تری آنکھوں میں پڑھا اللہ ہی اللہ، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۴۶

(۵۰) نظر سے گفتگو - خاموشی لب - تمہاری طرح، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۴۳۴

(۵۱) وہ صورت گردِ غم میں چھپ گئی، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶۵

(۵۲) ہر بات میں مہکے ہوئے جذبات کی خوشبو، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۴۴

(۵۳) ہم کو کافی ہیں یہی حلقۂ زنجیرِ سخن، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۱۹

(۵۴) ہماری شہرتوں کی موت بے نام و نشاں ہوگی، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۹۱

(۵۵) یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۴۶

برق، جوالا پرشاد: بہار، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری فروری ۱۹۵۹ء) ۳۳۱-۳۳۶

برق دہلوی: تابشِ حسن، حجابِ رُخِ پُر نور نہیں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء)
۴۵۶

برق صدیقی فتحپوری، ساقی! ہے میکدہ کی فضا اب بہت خراب، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶۹

برق لکھنوی، کیا کیا ہُوا نہ دامنِ دولت سے چھوٹ کر، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۸۹

بزم اکبر آبادی، مزے اب ان کی الفت میں وہ حاصل ہوتے جاتے ہیں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۵۱

بسمل، سید امین الحسن موہانی، پہلے سے دیکھنا کہیں بہتر بتائیں گے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹۰

بسمل سعیدی، تم اپنے قول تم اپنے قرار یاد کرو، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۸۹

(۲) خدا کرے مجھے دم بھر کو بھی نصیب نہ ہو، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۴۳

(۳) شبِ تاریک میں پیدا سحر کرنا بھی آتا ہے، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۴۲

(۴) محکومِ مشیت آدمی ہے، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۴۰-۱۴۱

(۵) نہ ملے نشاطِ بہشت کیوں مجھے اپنی عرضِ نیاز میں، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۸۸

(۶) وُہ جس سے ہم کو کچھ ایسے ستم نصیب ہُوئے، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۴۴

بشیر، بشیر احمد: تو بھی خاموش ہے اے شمعِ شبستاں ہم بھی، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۹۸

(۲) چل پڑی پورب کی پھر خود ہوا دل ڈر گیا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۸۶

بشیر رحمانی: شہرِ دل میں ترا مکاں ڈھونڈا، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء)
۲۸۴

بقا، شیخ بقاء اللہ: وہ رواں کہتے ہیں جس کو، جرس محمل ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹۰

بلراج کومل: بھٹکا ہوا مسافر، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء)
۱۸۷

بہار، گلشن الدولہ: اُٹھو گلے سے لپٹ جاؤ، پھر نکھر لینا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹۱

بہزاد لکھنوی: عشق تیری راہ میں کیا وجود کیا عدم، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۶۳

بے نظیر شاہ: نہ رہا حجاب نیاز بھی جو نگاہِ اہلِ نیاز میں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۵۰

بیان، خواجہ احسن اللہ: جو ہوتا ہے ریحان و سنبل کے صدقے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۲۷۵

(۲) میں ترے ڈر سے رو نہیں سکتا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۷۵

بیان یزدانی: ترا کشتہ اٹھایا اقربا نے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۷

(۲) جھونکے آتے ہیں بُوئے الفت کے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۷

بیباک، سید حسین احمد شاہجہانپوری: ہر ایک سانس ہے

(۱۳) زندگی ہے تو بہرحال بسر بھی ہوگی، ۸۰ (مئی ۱۹۶۱ء) ۷۷

(۱۴) شریکِ محفل دار و رسن کچھ اور بھی ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲۹

(۱۵) مرنے کی دُعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنّا کون کرے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۱

(۱۶) مقابل، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۹۵

(۱۷) ملے مجھے غم سے فرصت تو سناؤں وُہ فسانہ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۰

(۱۸) ہر اشکِ دل عکسِ رُخِ گلبدن لیے، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۱۸

(۱۹) ہر جورِ ناروا کے مقابل رہے ہیں ہم، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۱۹۷

(۲۰) ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲۹

(۲۱) ہمارا نالۂ شب کامیاب ہے کہ نہیں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۳۸۹

جرأت، شیخ قلندر بخش: بیٹھ آ دصل میں مُک لطف اٹھانے دے مجھے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۲

(۲) جب یہ سُنتے ہیں کہ ہمسائے میں آپ آئے ہُئے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۲

(۳) خیالِ وصل میں اُوس کے عجب باتیں بناتا ہوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰

(۴) دل میں کیا کیا آتے ہے بات اور کیا کیا جائے ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۳

(۵) ذرا ہم اس سے لگ چلنے کے سو سو ڈھب لگاتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۱

(۶) سچ تو یہ ہے بے جگہ ربط ان دنوں پیدا کیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰

(۷) سنا ہے وُہ خدا ناکردہ ہے بیمار کیا کیجے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹

(۸) نہ تنہا دل خرامِ ناز پر ہر آن لوٹے ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۳

(۹) ہمیں دیکھے سے وہ جیتا تھا اور ہم اس پہ مرتے تھے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹-۴۲

(۱۰) ہے غضب اپنی طبیعت اُوس پہ ہے آئی ہوئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۱

جگر، سید شاہ نصیر الدین (بہاری): اس قدر میں سب کی نظروں میں جو بے توقیر ہوں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۲۰

جگر بریلوی: دل اکیلا رہ کے اجڑ گیا مجھے میہماں کی تلاش ہے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۵۳

جگر بسوانی، حکیم محمد افتخار علی خاں: وار کرتے ہیں وہ شمشیرِ ادا سے پہلے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۲

جگر مراد آبادی، آج بھی یُوں تو، ہر اک رند جواں ہے ساقی،

۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۷۹

(۲) اک یہی حسن یقین تسکینِ جان و دل سہی، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۵۸

(۳) اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۱۷

———، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۳۶

(۴) تیرا تصور شب ہمہ شب، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۰

(۵) جہل خرد نے، دن یہ دکھائے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۱

(۶) حقیقت و مجاز، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۳۷

(۷) دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۰

(۸) سراپا، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۱۸

(۹) سراپا حقیقت، مجسم فسانہ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۲

(۱۰) عجب عالم سا دل پر چھا رہا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۴

(۱۱) کسی صورت نمود سوز پنہانی نہیں جاتی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۳

(۱۲) کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۲

(۱۳) محبت زندگی ہی زندگی ہے، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۱۱

(۱۴) محبت صلح بھی، پیکار بھی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۳

(۱۵) یہ ترا جمال کاکل، یہ شباب کا زمانہ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۳

(۱۶) یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء) ۶۹

———۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۱

———۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۳۷

(۱۷) یہ میخانہ ہے بزم جم نہیں ہے، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۲۹

جلال لکھنوی، نہ ٹھیری جب کوئی تسکین دل کی شکل یاروں میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۳

(۲) وہ دل نصیب ہوا، جس کو داغ بھی نہ ملا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۳

جلال حشمی: جو تیری افشاں سنواریں زندگی اسے زندگی، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۲۰۰

(۲) جوت کی کلیاں چٹکا دیتا ہے دل کے مدھوبن میں چاند، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۹۷

(۳) یوسف گم گشتہ، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۶۵

جلیل قدوائی: بے سبب رہتے ہیں جو برہم سے، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۹۲

(۱۳) تم بھی برسات کے بادل نہ ہوئے، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۱۶

(۱۴) تمہارے دل میں، مرے دل کی آگ جلتی ہے، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۳۸

(۱۵) جستجو حسن و آبرو کی ہے، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۹۰

(۱۶) جسم شاداب، لپکتے ہوئے لب دیکھیں گے، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۸۰

(۱۷) جمیل چاند میں مستور جتنے جوہر ہیں، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۴۳

(۱۸) جمیل ہوں مرکز جلال و جمال ہوں میں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۳۱

(۱۹) جنوں میں کیا نہ کیا، بےخودی میں کیا نہ کہا، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۹۶

(۲۰) جو دیکھئے تو ہمیں زندگی نے کیا نہ دیا، ۸۱-۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۴۳

(۲۱) حسن میرے ہی دلِ آئینہ بردار میں ہے، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۲۷

(۲۲) خدا سے ہم نے دو عالم خریدے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۳۵

(۲۳) خوشبو سے پیرہن سے سلگتے رہے دماغ، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۲۶

(۲۴) دل کی دل نے نہ کہی یوں تو کئی بار ملے، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۹۴

(۲۵) ڈوبا ہوا ہوں دل کی گہرائیوں میں بھی، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۵۲

(۲۶) رستے میں لٹ گیا ہے تو کیا قافلہ تو ہے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۵۴

(۲۷) رنگ رنگ خوشبو، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۱۳

(۲۸) رو رو آنسو خشک ہوئے، برسات آئی، برسات آئی، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۱۱

(۲۹) زباں ملے تو ہزار باتیں کہا کریں ہم، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۳۰

(۳۰) زمیں حدت سے جل رہی ہے کہیں سے کوئی سحاب اترے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۱۴

(۳۱) زندگی، موت، زندگی، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۷۷

(۳۲) زیرِ زمیں ملا نہ تہِ آسماں ملا، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۱۰

(۳۳) سدا بہار، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۲۰

(۳۴) صلۂ وفا کا فقط وفا ہے، یہ مختصر سا جواب لکھ دوں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۳۴

(۳۵) عود و عنبر کی طرح دل میں سلگتا ہوا پل، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۱۷

(۳۶) فنکار، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۶

(۳۷) کعبہ و دَیر سے پتھر کے صنم نکلیں گے، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۱۶

(۳۸) کون ہمارا درد بٹائے، کون ہمارا تھامے ہات، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۵

(۳۹) کوئی ہم زباں ہو تو بولے، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۹۸

(۴۰) کھِلا کھِلا سا ہر اک گام پر چمن دیکھا، ۶۱-۶۲،

سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۹۶

(۴۱) گل پیرہن رہے کہ دریدہ قبا رہے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۹ء) ۲۵۳

(۴۲) منزل پہ جا کے بھی نہ ہمیں روشنی ملی، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۹۴

(۴۳) میں گلشن تو باد صبا ہے، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۲۰

(۴۴) نمو، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۹۹

(۴۵) نہ پوچھو مہرباں ہم پہ نگاہِ قہر کتنی ہے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۳۲

(۴۶) وہ سمجھتے ہیں ہمیں ان کی جفا یاد نہیں، ۳۳ - ۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۸۰

(۴۷) وہی جو کل میرے کھیتوں میں تھے کپاس کے پھول، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۳۳

(۴۸) ہر گھر کے آس پاس سمندر لگا مجھے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۹ء) ۲۵۵

(۴۹) ہم تو مرتے رہے بقا کے لیے، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۴۴

(۵۰) ہوگا، مگر ایسا رخِ زیبا تو نہیں ہے، ۴۵ - ۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۳۹

(۵۱) یہ منظر یہ روپ انوکھے سب شہکار ہمارے ہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۵

(۵۲) یہ سہارے، یہ سوت کے دھاگے، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۳۵

(۵۳) یہ زندگی جو بہر سمت کا مگار گئی، ۲۹ - ۳۰ (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۱۳

جوان، مرزا العیم بیگ: یہ ان دنوں جو ہم سے اتنی رکھائیاں ہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹۵

جنوں، نواب سراج الدولہ سراج جنگ علی خاں: لا دوا تھا مرضِ عشق دوا کیا کرتا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۸۳

جوشش، نواب احمد خان: سچ کہتے ہیں کہ نام محبت کا ہے بُرا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۸۲

جوش ملسیانی: بلا سے کوئی ہاتھ ملتا رہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۸

(۲) تری یاد میں کب قیامت نہ ٹوٹی ترے غم میں کب حشر برپا نہ دیکھا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۸

(۳) حسن کا جور ہو نا روا تو نہیں، ۱۰۸ (دسمبر ۱۹۶۷ء) ۲۸۸

(۴) صبر سے اب تو گزارا ہوگا، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۲۸

جوش ملیح آبادی: آغاز انجام، ۲۷ - ۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۹۴

(۲) آمد بہار، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۳۷

(۳) آواز، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۹۳ - ۹۴

(۴) اُٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۸

(۵) اختلالِ دماغ، ۲۹ - ۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۶۹

(۶) ازالہ، ۳۱ - ۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۷۲

(۷) الحذر، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۱۹۲ - ۱۹۵

(۸) ان آنکھوں کی یہی ہے لیکھ، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۲۵-۳۲۹

(۹) ایک یاد اور صدہا پہلو، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۰۵

(۱۰) بازارِ حسن کی صبح، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۱۳ - ۲۱۴

(۱۱) برق جہندہ، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۱۹۱

(۱۲) پہچان گیا، سیلاب ہے، اس کے سینے میں ارمانوں کا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۶

(۱۳) جہاں ہے شوق، وہاں کیف وکم کی بات نہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۹

(۱۴) جہنم سر پہ ہے، جنت کے در کھلوائے جاتے ہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۷

(۱۵) جھومتی برسات، ۴۵ - ۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۰۵-۱۰۸

——— ۷۹ - ۸۰، ادبِ عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۳۲ - ۶۳۵

(۱۶) چشم بستہ بیداری، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۱۰ - ۲۱۱

(۱۷) خاکِ مسلخ، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۱۰

(۱۸) دعوتِ خیر، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۸۲-۸۷

(۱۹) دعوتِ سفر، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۸۱

(۲۰) ذہنِ مشرق، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۱۹۷

(۲۱) رباعیات، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۷۹؛ ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۱۶؛ ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۵۱ - ۵۲؛ ۵۱ - ۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۷۰؛ ۵۵ - ۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۰۱؛ ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۶۳

(۲۲) زودِ انتقامی، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۱۲

(۲۳) سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۵

(۲۴) شش و پنج، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۱۹۸ - ۱۹۹

(۲۵) شعلۂ رقصاں، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۷۹-۸۰

(۲۶) شکستِ زنداں، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۶۷

(۲۷) طلوعِ صبح، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۱۸۴

(۲۸) عشووں کو چین ہی نہیں آفت کئے بغیر، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۷

(۲۹) فن کار، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۱۱

(۳۰) قدمِ انساں کا راہِ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵۸

(۳۱) قطعات، ۷۹ - ۸۰، ادبِ عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۳۱

(۳۲) کارواں میرا، ۲۳ - ۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۳۴

(۳۳) مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے، ۵۱ - ۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۶۵ - ۱۶۶

(۳۴) معلوم نہ تھا، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۴۷ - ۴۸

(۳۵) مقدمِ بہار، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۹۲ - ۹۳

(۳۶) ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون

(۵) حق وفا کے جو ہم جتانے لگے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۲

(۶) دو رباعیاں انیس کی شان میں، ۱۲۸، انیس نمبر (نومبر ۱۹۸۱ء) ۲۸

(۷) دھوم تھی اپنی پارسائی کی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۳

(۸) رنج اور رنج بھی تنہائی کا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۹

(۹) قلق اور دل میں سوا ہو گیا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۰

(۱۰) کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۲

(۱۱) ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۱

حامد عزیز مدنی: اک رم خوردہ دریا، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۸۸

(۲) ہزار وقت کے پرتو نظر میں ہوتے ہیں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۶۹

حامد علی خاں: اقبال، ۱۲۲، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۲۷۵

حامی، پیروزیر علی شاہ: ستم کر، ظلم کر، جور و جفا کر، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۴

حرماں خیر آبادی، فرید احمد: آہ اس گھڑی مجھ کو آپ یاد آتے ہیں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۵

حزیں: شعیب احمد: یوں غرق تھا ان جلدوں میں حزیں نظریں بھی اٹھانا بھول گیا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۳۷

حزیں، میر محمد باقر: مری رنگیں کلامی کا ہے وہ گل پیرہن باعث، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹۶

حزیں کاشمیری: ایک آواز، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۴۸ - ۴۵۲

حزیں لدھیانوی: نیا شعور، نئی منزلوں کا سورج ہے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۹۶

(۲) وقت ایسا اے حزیں کبھی ہم پر نہ پڑا تھا، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۳۴

(۳) ہجوم شب میں گھری روشنی کو پہچانو، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۹۵

حسامی، مرزا حسام الدین: گئی یک بیک جو ہوا پلٹ، نہیں دل کو اپنے قرار ہے، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹۷

حسرت، چراغ حسن: آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۰

(۲) اس طرح کر گیا دل کو مرے ویراں کوئی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۰۹

(۳) جب سے تیرا کرم ہے بندہ نواز، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۰۸

(۴) دل بلا سے نثار ہو جائے، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر

(اپریل ۱۹۶۰ء) ۴۵۶

(۵) محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۰۹

(۶) یارب! غم ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۰۸

حسرت، جعفر علی: خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۰

(۲) کس کا ہے جگر، جس پہ یہ بیداد کرو گے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۰

حسرت موہانی، سید فضل الحسن: اے وجہ سرور بادہ نوشاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۳۴

(۲) بھلاتا لاکھ ہُوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳۵

(۳) پنہاں شدہ نقش دوگونہ شد خوب، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۴۲ - ۱۴۳

(۴) تجھ کو پاس وفا ذرا نہ ہُوا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳۸

(۵) توڑ کر عہدِ کرم ناآشنا ہو جائیے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳۶

(۶) چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳۷

(۷) درسِ حق جاری ہے یاں بھی حسرت آزاد کا، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۴۶

(۸) دستگیری کا طلب گار ہُوں شیأ ًللہ، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۳۸

(۹) ڈرے کیا قہرِ دشمن سے بھلا دل، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۲۹

(۱۰) تا قیامت رہے قائم مرے سرکار کا باغ، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۳۴ - ۱۳۵

(۱۱) سرگرم ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳۴

(۱۲) سر یہ حاضر ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۲۸-۱۲۹

(۱۳) سیہ کار تھے باصفا ہو گئے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳۹

(۱۴) میرا ایماں عجب کیا ہے جو ایمان تصوف ہے، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۴۸ - ۱۴۹

(۱۵) لایا ہے دل پر کتنی خرابی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳۴

(۱۶) وقفِ حق ہے یہیں مرید مراد، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۳۶

(۱۷) وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳۵

(۱۸) وُہ رنگینیِ گلِ گلشن رہ نمائی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۳۵

(۱۹) ہم حال انہیں یُوں دل کا سنانے میں لگے ہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹

(۲۰) یاد ہیں سارے وہ عیش بافراغت کے مزے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳۸

حسن، خواجہ حسن: یہی سوزشِ عشق ہے تو الٰہی! غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر

(۶) جوانی کے ترانے گا رہا ہوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۷

(۷) جگہ اد انے پانی کا ہے، دام وقفس کی بات نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۶

(۸) دورِ رفتہ دیکھ لیتا ہوں گلستاں دیکھ کر، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۱۲

(۹) سروکش غیب یا خدا کی مار، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۶

(۱۰) غم موجود ہے، آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں، پی تو رہا ہوں، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۱۱

(۱۱) کوئی دوا نہ دے سکے، مشورہ دعا دیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۵

(۱۲) کہ جب ہم جواں تھے مناظر جواں تھے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۳۰-۳۳۱

(۱۳) کہہ گئے الفراق یار ا سنے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۸

(۱۴) مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۷

(۱۵) ناکامیِ عشق یا کامیابی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۸

(۱۶) محض لفافے، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۳۸

(۱۷) مفردات ذات، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۱۲

(۱۸) میرے تازہ نقوش غزل، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۲۱-۳۲۴

(۱۹) وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۹

(۲۰) ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۹

(۲۱) یار کچھ بتا، یار کچھ نہ پوچھ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۶۵

(۲۲) یہ ملاقات، ملاقات نہیں ہوتی ہے، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۰۰

حفیظ جون پوری: بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۸

(۲) دل اس لیے ہے دوست کہ دل میں ہے جائے دوست، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۸

حفیظ ہوشیارپوری: آدمی کو زندگی بخشی گئی، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۱۴۱

(۲) آہ مرگِ آدمی پہ آدمی روئے بہت، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۱۳۲

(۳) اک نظر اور سوادِ منزلِ دوست، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۳۸

(۴) انتخاب کلام، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۱۴۶

(۵) ایسی بھی کیا جلدی پیارے، جانے ملیں پھر یا

(۱۹) وہ جسے دیدہ وری کہتے ہیں، ۸۱ - ۸۲
(جون ۱۹۶۰ء) ۱۴۰
(۲۰) وہی، سچ تو یہ ہے کچھ پا گئے، ۹۴ (جولائی
۱۹۶۲ء) ۱۰۵
حیرت شملوی: اب بھی اگر کوشش کی جائے، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء)
۱۲۹
(۲) ایک تو خود اپنی غمگینی، ۹۱ - ۹۲، سالنامہ
(جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۷۶
(۳) پاس رہ کر بھی وہی دُوری ہے، ۹۸
(جون ۱۹۶۳ء) ۱۰۳
(۴) غم رُبا بھی، غم آفریں بھی ہے، ۱۰۱ (نومبر
۱۹۶۴ء) ۲۴۳
(۵) کیا سُنیں گے گفتگو مجازی کی، ۱۹ - ۲۰
(اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۵۹
(۶) کیوں ہوں نہ مغفرت کا طلب گار بھی بہت،
۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء)
۲۹۱
(۷) نوحے یا نغمے بلبل کے، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر،
نومبر ۱۹۵۳ء) ۸۲

خ

خاطر غزنوی: انسان ہوں گھر گیا ہوں زمیں کے خداؤں میں،
۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۳
(۲) سہن، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۳۳
(۳) تتلیاں اُڑ گئیں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر
(ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۶۳
(۴) جان پہچان، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء)
۳۱۳ - ۳۱۴
(۵) جب اِس زُلف کی بات چلی، ۴۱ - ۴۲،
غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۱
(۶) خمارِ گندم، ۲۹ - ۳۰، پنج سالہ نمبر
(فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۰۳
(۷) رازِ دل جو تری محفل میں بھی افشانہ ہُوا، ۷۳
- ۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۶۲
(۸) رُت کی ریت، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۱۵
(۹) سنہرے خواب کا معمار، ۱۲۹، عصری ادب نمبر
(ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۶۴
(۱۰) فریاد بھی ہے سوءِ ادب اپنے شہر میں، ۶۷ -
۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۳۹
(۱۱) قربتیں اور فاصلے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر
(ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۶۲
(۱۲) وا چشم تماشا لب اظہار سلا ہے، ۱۲۴،
سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۴
خاکسار، محمد یار: تھا زلیخا کو جو جاں سے مہِ کنعاں عزیز،
۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۹۹
خالد، انور محمود: تو کہ چھایا ہُوا ہے مری روح پر بادلوں
کی طرح، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۳۵
خالد، عبدالعزیز: ابن انشاءؒ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری
۱۹۷۹ء) ۲۱۱ - ۲۱۲
(۲) بیادِ احسان دانش، ۱۲۹، عصری
ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۵۲۱ - ۵۲۲
(۳) بیادِ جوش ملیح آبادی، ۱۲۹، عصری
ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۵۱۴ - ۵۱۵

کے ساتھ)' طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۷۱

خلیل، دوست علی: بہتی کشتی کو صنم آپ کے آنے کی توقع، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)' طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۷۹

د

داغ، نواب مرزا خاں، اب دل ہے مقام بیکسی کا، ۴۱-۴۲' غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۴

(۲) اشک خوں رنگ لائے جاتا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۸

(۳) اللہ رے مرتبہ، میرے عجز و نیاز کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۴

(۴) چاک ہو پردہ وحشت، مجھے منظور نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۷

(۵) پکارتی ہے خموشی مری، فغاں کی طرح، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۵

(۶) خاطر سے 'یا لحاظ سے' میں مان تو گیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۵

(۷) ساز، یہ کینہ ساز کیا جانیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۶

(۸) سبق ایسا پڑھا دیا تُو نے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۸

(۹) سوز و گداز عشق کا لذت چشیدہ ہُوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۶

(۱۰) شوخی نے تیری کام کیا اک نگاہ میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹۷

دانش، احسان: آمد، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۹ء) ۱۷۲

(۲) اب کہو کارواں کدھر کو چلے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۱

(۳) اچھا ہے کوئی تیرا شناسا بھی نہیں ہے' ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۹۱

(۴) اشک افشانی کو شغلِ زندگانی کر دیا، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۶۵

(۵) اعلان بیداری، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۷۸-۱۱۷۹

(۶) اوّل سے آدمی ہے خدا کی تلاش میں، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۶۶

(۷) بزم میں جب وہ وفا ناآشنا بھی آئے گا، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۶۹

(۸) بزم میں جب وہ وفا ناآشنا بھی آئے گا، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۷۰

(۹) پرسشِ غم کا شکریہ! کیا تجھے آگہی نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۳

(۱۰) تصویر خیالی، ۱۲۲، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۲۷۶

(۱۱) تھی کس کو خبر اوج پہ قسمت نہ رہے گی' ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۰۶

(۱۲) جب جوانی کی دُھوپ ڈھلتی ہے، ۴۱-۴۲' غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۲

(۱۳) جو ترے آستاں سے لوٹ آئے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۲

(۱۴) جو گزر رہی ہے دل پہ کوئی ترجماں نہیں ہے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۶۹

(۱۵) چلمن کی دُھوپ راہگزر تک پہنچ گئی، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۱۸

(۱۶) دعوت نامہ، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۷۶

(۱۷) دنیا کا دُوں، نہ خواہشِ دنیا کا ساتھ دُوں، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۰۲

(۱۸) دل اب بہ حسن شام و سحر مطمئن نہیں، ۴۵-۴۶ (ستمبر- اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۲۵

(۱۹) زُلفِ بُتاں سے چھاؤں ہے رشتے بتاں سے دھوپ، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل- جون ۱۹۶۶ء) ۳۶۴

(۲۰) عشق نے حسن کو تن ہی نہیں من بیچ دیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۱

(۲۱) کُھل کر جو برس چکا ہے بادل، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۷۱

(۲۲) لاہور (دورانِ جنگ)، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصّہ (اپریل- جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۸۰

(۲۳) نظر فریب قضا کھا گئی تو کیا ہوگا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۳

(۲۴) وُہ نہیں تو ڈستا ہے بام و در کا سناٹا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۷۰

(۲۵) ہر چند دُورِ عشق کی منزل ہے دوستو، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل- جون ۱۹۶۶ء) ۳۶۵

(۲۶) ہم عقیدہ نہیں رکھتے کسی سادھو کی طرح، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۶۴

(۲۷) یُوں نہ مِل ہم سے خفا ہو جیسے، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر- دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۴۴

(۲۸) جو ترے آستاں سے لوٹ آئے، ۳۹، ۴۰- (مارچ ۱۹۵۴ء) ۵۷

دبیر، مرزا سلامت علی: قطعۂ تاریخ، ۱۲۸، انیس نمبر (نومبر ۱۹۸۱ء) ۷۰۹

درد، خواجہ میر: ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۷

(۲) اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ سے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸

(۳) تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵

(۴) تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸

(۵) سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴

(۶) قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دُور نہ تھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴

(۷) ہر طرح زمانہ کے ہاتھوں سے ستم دیدہ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۷

(۸) سمجھنا فہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶

(۹) مژگانِ تر ہوں، یا رگِ تاک بریدہ ہوں،

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۵۲

راز یزدانی، جنوں سے حلقۂ دانش کے درمیاں پہنچی، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۹۷

(۲) حساب ہوش میں اب تک شمار ہو نہ سکا، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۱۰۰

(۳) سوچئے ہم سے تغافل بھی بجا ہے کہ نہیں، ۸۱ - ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۴۲

حافظ عبد الرحمٰن، کہاں تھے شب؟ اِدھر دیکھو حیا کیوں ہے نگاہوں میں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۱

راسخ عرفانی، سکوتِ شب سے کہ آوازۂ سحر سے ملے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۹۹

راسخ عظیم آبادی، مرا سینہ اسے محبت جو بنے تو باغ کرنا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۹۴۴

راشد، ن-م، انقلابی، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۱۹

(۲) انقلابی، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۶۷ - ۶۶۸

(۳) پلا ساقیا مئے جاں پلا کر میں لاؤں پھر خبر جنوں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۶۶

(۴) ترے کرم سے خدائی میں یُوں تو کیا نہ ملا، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۶۶

راقم، بندرابن، نامہ کا میرے اس سے سلے کہ جواب پھرنا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۹۰

راقم، خواجہ قمر الدین، بات کیونکر بنے، امید بر آئے کیوں کر، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۱

راہی، احمد، غم حیات میں کوئی کمی نہیں آئی، ۱۹ - ۲۰، اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۶۱

——— ۴۱، ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۱

(۲) کبھی تری کبھی اپنی حیات کا غم ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۱

راہی، جمنا پرشاد، سمجھ سکا نہ کوئی رازہائے خاموشی، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۱۴

(۲) کہسار تغافل کو صدا کاٹ رہی ہے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۱۴

رحمٰن، ایس - اے، آؤ کوئی علاج غم آرزو کریں، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۶۲

(۲) سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۶۳

(۳) صدا، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۶۰

(۴) میں دیکھتا رہ گیا، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۵۹

(۵) ہُوئے صیدِ ستم چپ، چشم نم چپ، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۶۰

رحمٰن کیانی، یہ وہی صبح ہے، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۳۶ - ۲۳۷

رخشاں، نواب ضیاءُ الدین خاں، پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون

۱۹۵۴ء) ۴۰۲

رسا رامپوری، ساقی جو دئے جاتے یہ کہہ کر پئے جا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۲

رسا، محمد کبیر خان، فردِ رسا، ۱۲۲ و، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۲۸۰

رسا جالندھری، کبیر خاں، لرزاں ہے ایک برق سی جلوہ کہیں جسے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۲

رسا، منشی حیات بخش، خم میکدے میں آکر واعظ نے چھوڑ ڈالے، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۲۲۴

(۲) ساقی جو دئے جائے یہ کہہ کے پئے جا، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۲۲۳

رسوا، مرزا ہادی، نالہ رکتا ہے، تو سرگرم خفا ہوتا ہے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۹۴۴

رشک، میر علی اوسط، جو رنج نوشتہ میں ہے کیوں کر نہ ملے گا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۳

رشکی، نواب محمد علی خاں، غصہ آتا ہے پیار آتا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۳

رشید قیصرانی، آیا افق کی سیج تک آکر پلٹ گیا، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۵۴

(۲) کون کہتا ہے ترے دل میں اُتر جاؤں گا، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۵۳

رضا زیدی، اک کیف سا طاری ہے اک نشہ سا چھایا ہے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۸۱

(۲) پھیکا ہے کائنات کا ہر نقش رنگ و بو، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۳۰

(۳) وہ حسنِ جہاں سوز جو گفتار میں آئے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۵۸

رضا ہمدانی، پھولوں کی ہنسی لوٹ کے مغرور ہیں کانٹے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۳۹

(۲) کام کوئی آسان نہیں ہے، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۰۴

(۳) کسی صورت تو اب سکوں پائیں، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۹۰

(۴) ہر ایک گھر کا دریچہ کھلا ہے میرے لئے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۳۸

(۵) یہ درد محبت یہ تیور تمہارے، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۶۴

(۶) یہ دورِ مسرت یہ تیور تمہارے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴۴

رفعت سلطان، اگرچہ سایہ فگن دشت کے ببول رہے، ۷۳ - ۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۵۸

(۲) ان سے ملنے کی کوئی آس نہیں، ۷۳ - ۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۵۹

(۳) بجا کہ مجھ پہ نہ وہ لطف کی نظر ہوگی، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۷۶

(۴) بہار آئی ہے اس شوخ گلبدن کی طرح، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۲۲

(۵) تو جو مجھ سے بھی کبھی برہم ہوگا، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۸۸

(۶) تو مجھے وہ نظر عطا کر دے، ۱۲۴، سالنامہ

(جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۹۰

(۷) جب کوئی مائل گفتار رہوا، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۵۰

(۸) جس بے درد نے ساری عمر نہ بھول کے ہم کو یاد کیا، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۸۰

(۹) جو چاہتا ہو کہ ان کو کبھی خفا نہ کرے، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۱۶

(۱۰) چراغاں، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصّہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۱۲۰۶

(۱۱) حسنِ فطرت کی جستجو ہے مجھے، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۴۳

(۱۲) دیکھ کر حسن گلعذاروں کا، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸۶

(۱۳) رُخِ ہستی کو نکھارا میں نے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶۸

(۱۴) زندگی وقفِ انتظار نہ کر، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۸۹

(۱۵) زہر بھی اب نہیں پیمانے میں، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۱۶

(۱۶) سر فروشانِ وطن سے، ۱۰۵، سالنامہ تیسرا حصّہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۱۲۰۵

(۱۷) سوئے منزل نہ جو رواں ہوں گے، ۸۱-۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۴۱

(۱۸) عشق کا ظرف آزما تو سہی، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۹۲

(۱۹) عمر بھر جس کی جفاؤں نے کیا خوار ہمیں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۴۳۸

(۲۰) ناداں دل، فریبِ محبت نہ کھا کبھی، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸۶

(۲۱) نصفِ شب یہ ہوا کا جھونکا ہے، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۴۲

(۲۲) نہ جانے کس لیے کہتے ہیں کا مگار آئے، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۲۰

(۲۳) نہ کوئی دوست نہ دنیا میں ہے کوئی دشمن، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۱۴

(۲۴) وہ ہے مرا خدا کہ صنم سوچتا ہوں میں، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۱۹

(۲۵) وہی ہے موجب تسکین جاں بھی، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۳۰

(۲۶) ہم اگر صورتِ سوال آئے، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۰۸

(۲۷) ہو جو ہر وقت حیلہ جو کوئی، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۴۳۷

رند لکھنوی: رکھو خدمت میں مجھ سے کام تو لو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۸

(۲) مجھے دے کے دل، جان کھونا پڑا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۸

رنگین، سعادت یار خاں: تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۱

(۲) دل میں تھا جو بساط اپنی سو گذران یک مد

رواں، جگت موہن لال، گلِ ویرانہ ہُوں کوئی نہیں ہے قدرداں میرا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۵۸

روحی کنجاہی: خود کو ایسی کڑی سزا دوں گا، ۱۰۵، سالنامہ دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۶۴

روشن صدیقی: عمرِ ابد سے خضر کو بیزار دیکھ کر، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۶

(۲) اس سے بڑھ کر تو کوئی بے سرو ساماں نہ ملا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۶

(۳) ہم سفر، جام شکن، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۷۵

رونق، میر غلام حیدر: اس قدر بھی نہ ہم کو ایذا دو، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۰۰۴

ریاض، احمد: بہ صدِ شوق بھی دل کا کہا نہیں کرتے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۰

(۲) تین زمانے، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۷۴

(۳) خلاؤں سے اترو، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۷۴

(۴) دیپ سے دیپ جلے، ۲۹، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۰۸

(۵) ذکرِ ستم سے کیا ہوگا، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۴۰

(۶) زنجیرِ گراں، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۳۸

(۷) زندگی غم کی آنچ سہہ سہہ کر، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۹۰

(۸) شیشے کے صنم، پتھر کے صنم، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۵۶

(۹) کیا کیا محبتوں کے زمانے بدل گئے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۰

(۱۰) میں اور تو، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۹۷-۱۹۸

(۱۱) یہ اونچے دریچے، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۹۱

(۱۲) یہ کس ظالم کی بزمِ ناز سے نکلے ہیں دیوانے، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۹۵

(۱۳) یہ لوگ، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۴۴

ریاض انور: یہ قربتیں، یہ فاصلے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۷۴

ریاض خیرآبادی: او کوسنے والے اب دُعا دے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۶

(۲) بیل کی سرگزشت، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۳۷۵-۳۷۷

(۳) پی لی ہم نے شراب پی لی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۵

(۴) جب سے حرام ہو گئی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۸

(۵) جی اُٹھے حشر میں پھر جی سے گزرنے والے،

(۲) پتہ کیسے چلے دنیا کو قصروں کے جلنے کا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۵۸

(۳) جاگتا ہے اِس میں رنگوں کا مقدر ہر طرف، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۶۰

(۴) دنیا کی کیا مجال چمن سے نکال دے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۹۸

(۵) سُرخ لہو سے یہ پھلواڑی کرتا ہُوں، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۰۰

(۶) سر سبز اپنی کوئی خواہش نہیں ہُوئی، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۵۹

(۷) عارض کی آنچ، گرمیٔ لب اس سے چھین لے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۰۰

(۸) کچھ کہنا بھی ایک گناہ، چُپ رہنا بھی ایک گناہ، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۵۹

(۹) کھلتے ہیں جستجو کے یہ در کس کے واسطے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۹۹

(۱۰) کیا اُن کا ذکر، انا بھی شہید کی، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۹۹

(۱۱) لکھی برہنہ سوچ تو شہرت بہت ہُوئی، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۵۷

(۱۲) ہر کسی کو یُوں بھلا کب مسترد کرتا ہُوں میں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۵۶

ساجد، غلام حسین: آسماں ہے اپنی وحشت میں کسی گھر کی طرح، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۵۰۲

ساجدہ زیدی: ترے بغیر ہر اک آرزو ادھوری ہے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶۸ - ۲۶۹

(۲) وقت اور انجام، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۷۷

ساحر، امرناتھ: بھلا ہے کس قدر دل ذوقِ کاوش ٹوٹے مژگاں پہ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۰

(۲) رسوائے عشق ہے تیرا شیدا کہیں جسے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۰

(۳) ایک والیٔ ریاست کے مکتوبِ گرامی کے جواب میں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۵۴ - ۵۵۵

(۴) جرأت عشق کا مقام تیشہ و سنگ بے ستوں، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۷۲

(۵) جلوہ دکھا کے کون سے پردوں میں چھپ گیا ہے تو، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۳۱

(۶) خرابات، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۳۹

(۷) اوجِ فضا میں عزم کو شمس و قمر کی ہے تلاش، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۷۱

(۸) کبھی اس سے بے وفائی کبھی اس سے بے وفائی، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جُون ۱۹۶۶ء) ۳۵۹

(۹) کسے تاب تھی کہ سُنتا اور پھر مری زباں، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۲۸

(۱۰) کوئی چارہ ہی نہیں عشق کی بیماری کا، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۵۸

(۱۱) کہتا ہے کون درد کے درماں کی بات کر،

(۱۰) ساون کی رُت آ پہنچی، کالے بادل چھائیں گے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۶

(۱۱) سبو و جام تو کیا ڈوب جائیں مے خانے، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۱۴

(۱۲) صدیوں کی شب غم کو سحر ہم نے بنایا، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۱۰

(۱۳) کافر گیسو والوں کی رات بسر یُوں ہوتی ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۵

(۱۴) مدد کہ ہمت بے چارگی نہیں ہوتی، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۱۳

(۱۵) نظر میں روح میں، دل میں سمائے جاتے ہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۵

(۱۶) نغمے ہوا نے چھیڑے فطرت کی بانسری میں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱۴

(۱۷) وہ دردِ عشق دے کر ظرفِ ہستی آزماتے ہیں، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۱۲

سالک، عبدالمجید: مرے جی میں ہے کہ پوچھوں کبھی مرشدِ مغاں سے، ۷۹ - ۸۰، ادبِ عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۵۲

(۲) چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۸

(۳) خرد میں مبتلا ہے سالکِ دیوانہ برسوں سے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۷

(۴) غم کے ہاتھوں مسے دل پہ جو سماں گزرا ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۸

(۵) نہ تھی اُمید نہ وعدے پہ اعتبار کیا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۶

(۶) نہ محتسب کی نہ حور و جناں کی بات کرو، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۷

(۷) ہم نفسو اُجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۶

سالک دہلوی: کچھ تغیر مرے احوالِ پریشاں میں نہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۱

(۲) مجھ ناتواں پہ حشر میں وہم فغاں غلط، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۱

سائل دہلوی: ملے غیروں سے، مجھ سے رنج، غم یُوں بھی ہے اور یُوں بھی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۱

(۲) سُنا بھی کبھی ماجرا دردِ غم کا کسی دل جلے کی زبانی، کہو تو، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۱

سجاد، سجاد علی انصاری: آنکھ جب تک فریب کار نہ تھی،

غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم
(اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۷

سجاد، عطاء اللہ: درمان قاتل، ۱۳۲، سالنامہ (جون
۱۹۸۵ء) ۴۸۰

(۲) سبک سری سے کہاں عشق سرگراں جائے،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۷۹

(۳) میرا میکدہ ہو ویراں، یہ نہ تھا مرا ارادہ،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۷۸

(۴) میں گدائے درِ غیراں ہوں تو اس کا الزام،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۷۷

سجاد، میر سجاد اکبر آبادی: دل ہو گیا پھپھولا پیار سے
تمام جل کے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون
۱۹۵۴ء) ۴۰۴

سجاد رضوی: غالب ہوئے ہیں خستہ و ناچاراں دنوں،
۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۰۶-۴۰۸

سحر، اقبال بہادر ورما: کسی رنگ میں دلستانی نہیں ہے،
غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم
(اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۹۵

سحر، شیخ امان علی: آسماں کو غبار ہے ہم سے، غزل نمبر
(ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر
۱۹۸۵ء) ۴۷۶

سحر، نواب علی خاں: دل ترے زلفِ مسلسل کا گرفتار
ہُوا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)،
طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۷۸

سحر بھوپالی: سینہ میں دل ہے دل میں داغ داغ میں سوز و
سازِ عشق، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون
۱۹۵۴ء) ۴۰۵

سراج دکنی: خبر تحیّرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی،
۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۲۶۷

(۲) لیا ہے نقدِ جانِ بلبلاں، یعنی خراج اپنا،
۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۲۶۷

سراج لکھنوی: فطرتِ عشق گنہگار ہوتی جاتی ہے،
۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری
۱۹۵۷ء) ۱۶۲

سردار جعفری، علی: بُوئے گل لائی ہے، گلشن کی ہوا سے
خوش ہیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء)
۱۸۶

(۲) جلا کے لحن کی قندیل نور بار چلو، ۱۲۴،
سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۸۷

(۳) سکوں میسر جو ہو تو کیونکر، ہجومِ رنج و محن
وہی ہے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)،
طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۶۷

(۴) وہی حُسنِ یار میں ہے، وہی لالہ زار میں ہے،
۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۸۵

سرفراز قریشی، نہ جانے دن کے اجالوں پہ آج کیا گزری،
۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۹۶

(۲) یہ کہسار کے بادل فلک کے ہمسائے، ۱۲۴،
سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۹۶

سرور، آل احمد: بالآخر رنج میں بھی راحت کے پہلو
نکل آئے، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر

۱۹۵۳ء) ۷۴

(۲) غیرتِ عشق کا یہ ایک سہارا نہ گیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۰

(۳) نگاہِ لطف کی دریا دلی گو کم نہیں ہوتی، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۵۰

(۴) نہ شمع رہگزر ہے نہ نقشِ پا کوئی، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۷۴

(۵) ہم برقِ شرر کو کبھی خاطر میں نہ لائے، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۶۶

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۰

سرور، منشی درگا سہائے جہاں آبادی: کسی مست ناز کا ہے عبث انتظار سوجا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۹۶

سعادت نظیر: نہ پوچھ، گزری ہے کیا دل پہ گلستاں کے قریب، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۸۰

سعید، تاج: بند دریچوں کے کمرے سے پُروائیوں ٹکرائی ہے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۹۴

(۲) جی میں آتا ہے کہ چل کر جنگلوں میں جا رہیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۹۵

سلام مچھلی شہری: آج پھر یہ کہہ رہا ہوں، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۹۶

(۲) اڑتی ہے موج صبح میں یوں نسترن کی بات، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۰۲

(۳) اس بار، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء)

۱۲۰

(۴) بتا اے نگارِ چمن زارِ گیتی، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۳۱

(۵) خواب، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۵۲

(۶) خود کو اب پُوج رہا ہوں شاید، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۸ء) ۱۷۸

(۷) شکستِ تخیل، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸۰-۱۸۱

(۸) کون کہتا ہے، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۵۰

(۹) کیا کریں، حالات کے ہاتھوں ہی کچھ مجبور رہیں، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۳۴

(۱۰) مسلسل خامشی ہے، دل میں اب نغمہ نہیں کوئی، ۹۳-۹۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۷۷

(۱۱) مگر آپ بھی اپنے جلووں سے کہہ دیں، ۳۳-۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۷۹

(۱۲) ہوا زمانے کی ساقی! بدل تو سکتی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۵

(۱۳) یہ ابر و باد یہ طوفان، یہ اندھیری رات، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۵

سلیم، اصغر: غبار سا ہے سرِ شاخسار کہتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۲

(۲) گلشن گلشن شعلۂ گل کی، زلفِ صبا کی بات چلی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۲

سلیم، سلیم واحد: بن کھلے حبیب کوئی کلی مرجھائی، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۷۹

(۲) رُوح کی شعلہ مزاجی کا مداوا کچھ تو ہو، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۹۳

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۳

سلیم، وحیدالدین، گریباں سے ترے کس نے نکالا صبحِ خنداں کو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰۲

(۲) مُدّت ہوئی ہے مدحِ حسیناں کیے ہُوئے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰۲

سلیم احمد، ترک ان سے رسم و راہِ ملاقات ہو گئی، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۹۷

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۰

(۲) غمِ جاں سے رہے وقفِ نالہ و فریاد، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۹۰

(۳) مانے تو کس کی دیوانہ مانے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۰

سلیمان، نواب سلیمان شکوہ: ساقیا! ہے یہ جام کا عالم، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۵

سندباد جہازی: جہاں رمضان رہتا تھا، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۲۲۴-۲۲۴

سوامی مارہروی: بھگوان تو ان میں کوئی نہیں، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۳۲

(۲) کیا خوب یہ انجام ہے، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۸۸۰

(۳) گھونگھٹ اوٹ، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۸۱

(۴) ہماری ہی بلّی ہمیں سے میاؤں، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۷۰

سوچہ مو: برف کا گالا، ترجمہ از ابن انشا، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۵۲

سودا، محمد رفیع: باتیں کدھر گئیں وُہ تیری بھول بھالیاں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱

(۲) جوں غنچہ تو چمن میں بندِ قبا کھولے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲

(۳) دل! مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹

(۴) ساون کے بادلوں کی طرح بھرے ہوئے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳

(۵) نہ غنچے گُل کے کھلتے ہیں، نہ نرگس کی کھلیں کلیاں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۰

(۶) غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۱

(۷) گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۰

(۸) گُل پھینکے ہیں اوروں کی طرف، بلکہ ثمر بھی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲

(۹) مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹

(۱۰) نسیم ہے ترے کُوچے میں اور صبا بھی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳

سوز، میر: یہ تیر اعشق کب کا آشنا تھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۷۲

(۲) مری جان جاتی ہے، یارو! سنبھالو!، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۷۲

سہیل، اقبال احمد: عرش بریں بھی اس کے مقابل نہیں رہا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۳۵۷

سیف، سیف الدین: ایک ایک گھڑی شمار کی ہے ۱۹۰-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۵۳

(۲) بڑے خطرے میں ہے حُسنِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴۰

(۳) جیسے بھی ہو نزع کا یہ ہنگام گزارو سو جاؤ، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۲۹

(۴) دلوں کو توڑنے والو! تمہیں کسی سے کیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۸

(۵) راہ آسان ہو گئی ہو گی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۹

(۶) غمِ خزاں کی تلافی بہار میں بھی نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۸

(۷) قریب موت کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۹

(۸) کیا منزلِ غم سمٹ گئی ہے، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۹۲

(۹) ہر اک چلن میں اسی مہرباں سے ملتی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴۰

سیماب اکبر آبادی، سید عاشق حسین: جو در پردہ انہیں جلوہ نمائی کی نہ خُو ہوتی، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۵۹

——— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۵۱

(۲) اب تو یہ حال ہے نظر سوگوار کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۵

(۳) برباد حسنِ ظن سے مآلِ وفا نہ ہو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۸

(۴) جتنے ستم کئے تھے کسی نے عتاب میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۶

(۵) جنوں پہنچا بیاباں میں، بہار آئی گلستاں میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۷

(۶) چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۹

(۷) دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۷

(۸) رات کا جانا وداعِ شیشہ و پیمانہ تھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۵

(۹) طولِ رہِ حیات سے گھبرا رہا ہوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۸

(۱۰) کیوں ہنسی تو اے اجل! فانی اگر سمجھا مجھے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۹

(۱۱) نامہ گیا کوئی نہ کوئی نامہ بر گیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷۶

ش

شاد، حکیم سید محمد غازی پوری: بلبل کو پھر چمن میں لگا لائی بوئے گل، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۶

شاد، سرکشن پرشاد: بادۂ خم خانۂ توحید کا مے نوش ہوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۵

شاد، نرشیش کمار: ایک حادثہ (چار نظمیں)، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۹۷-۲۰۰

ان نظموں کے نام درج ذیل ہیں،

(i) فریاد (ii) محرومی (iii) جبر صبر (iv) گم شدہ والد کے نام

(۲) رنگا رنگ، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۸۲

(۳) شام وعدہ کا ڈھل گیا سایا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۳۷

شاد امرتسری: آخری آدمی، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۹۰

(۲) ترا خط پڑھ کے مرے دل میں یہ بات آئی ہے، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۱۲

(۳) گناہوں کی ندی، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۲۱

(۴) مفت کی رقابت، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۳۵

شاد عارفی: آدمی کی انگلی میں پھانس بھی کھٹکتی ہے، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۷۰

(۲) آئیے خون کو پارا سمجھیں، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۸۱

(۳) اپنی تقدیر کو پیٹے جو پریشاں ہے کوئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲۲

(۴) اپنے جی میں ٹھان لیں گے آپ، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۲۸

(۵) ان کے ڈر سے کہ جنہیں فرصتِ نظارہ ہے، ۸۱-۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۳۷

(۶) اور تو کیا یہ نمک خوار سیاست دیں گے، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۶۰

(۷) بقول غالب ہوا کیا ہے جو حشر دہقاں کے لہو کا، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۷۴

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲۰

(۸) بنا پائی نہ ذرّے کو نگینا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲۰

(۹) پتہ پتہ جبکہ تاراج خزاں ہو جائے گا، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۵۶

(۱۰) پھول پھول چہروں سے مدھ بھرے غزالوں سے، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۸۷

(۱۱) جب نظر بچی اس کی، میں نے اس کو دیکھا ہے، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۲۸

(۱۲) جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۷۸

(۱۳) جو ہیں آج یہ شاخسانے کہاں تھے، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۷۰

(۱۴) چاہتے ہیں گھر بتوں کے دل میں ہم، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۴۳

(۱۵) چشم پاداش میں کافی ہے مسلماں ہونا، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۷۵

(۱۶) چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں، ۴۱-۴۲،

غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲۱

(۱۷) ستمگر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۷۰

(۱۸) شادِ مغموم جو مسرور نظر پڑتا ہے، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۰۳

(۱۹) شباب و خلوت کی بات اچھی تو ہے مگر آج کل نہ کٹئے، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۸۹

(۲۰) صبر کرنا چاہتے اے دل، مگر، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۰۱

(۲۱) صحرا کو گلستاں کہتا ہوں بجلی کو تجلی کہتا ہوں، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۷۵

(۲۲) قدم سنبھل کے بڑھاؤ کہ روشنی کم ہے، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۰۴-۲۰۸

(۲۳) قطعات، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۴۴

(۲۴) کام جو آج نہ ہو پائے وہ کل ہو نہ سکے، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۰۷

(۲۵) کھری باتیں باندازِ سخن کہہ دوں تو کیا ہوگا، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۹۱

——— ۷۹-۸۰، ادبِ عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۹۷

(۲۶) لااے ساقی تیری جے ہو، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۹۲

(۲۷) مشکل سے اس بت کی قسمیں، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۸۹-۲۹۴

(۲۸) منزلیں اشعار کے چلنے میں آساں ہوگئیں، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۹۳

(۲۹) موج کو آپ کنارا سمجھیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲۱

(۳۰) نظامِ نو سے ڈراؤ کہ روشنی کم ہے، ۳۳-۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۷۲

(۳۱) وہ جو دعویٰ کریں، وہ جو پیدا کریں، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۲۴

(۳۲) ہم سے وہ دادِ وفا چاہے گا، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۱۳

(۳۳) ہونٹوں پر محسوس ہوتی ہے آنکھوں سے معدوم رہی ہے، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۰۰

(۳۴) یہ سجدہ ہے کہ تجدیدِ وفا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲۲

شاد عظیم آبادی: اسیرِ جسم ہوں، میعادِ قید لامعلوم، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۰

(۲) ایک ستم اور لاکھ ادائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۳

(۳) تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۱

(۴) جہاں تک ہو بسر کر زندگی عالی خیالوں میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۲

(۵) دل تو بدنام ہے اس عمر سے کیا اس کا گلہ کہتے آتی ہے حیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۹

(۶) ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں،

نایاب ہیں ہم، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۰
(۷) کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰۹
(۸) کہاں یہ تاب کہ چکھ چکھ کے، یا گرا کے پیوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۱
(۹) نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱۳

شاذ تمکنت: باوفا، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۷۵
(۲) پاسِ آداب سے یا حسنِ مروت سے ملے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۷۴
(۳) پتھراؤ کی چوکھ برکھائیں، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۲۷-۲۲۸
(۴) پیاسا ہُوں ریگ زار میں دریا دکھائی دے، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۲۹
(۵) جس طرف جاؤں اُدھر عالمِ تنہائی ہے، ۱۰۵، سالنامہ، دُوسرا حصّہ (اپریل - جُون ۱۹۶۶ء) ۴۲۲
(۶) چاندنی راتوں میں پیڑوں کا گھنیرا سایہ، ۳-۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۶۰
(۷) چشمِ پُرآب میں کچھ یُوں ترا پیکر اترے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۵
(۸) دردِ مشترک، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۶
(۹) سحر و شام مری دور کی آہٹ جیسے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۲۳
(۱۰) سوانح عمری، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۱۴
(۱۱) ظلمت سے پرے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۷۱
(۱۲) غضب ہے یاد تری یوں خراب حال نہ کر، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۲۴
(۱۳) کسی کا خون ہو، سینہ لہو لہو میرا، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل — جُون ۱۹۶۶ء) ۴۲۵
(۱۴) مریم نغمہ، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۳۷
(۱۵) نکہت آسودہ، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۱۴
(۱۶) وُہ کون ہے کہ جس کی وحشت پر سنتے ہیں کہ جنگل روتا ہے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۷۲
(۱۷) وہ نیاز و ناز کے مرحلے نگہ و سخن سے چلے گئے، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۶۷

شارق میرٹھی: ان کو جب دیکھا ہُوا اپنا یہ حال، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۳۵

شاعر، آغا: چلے گا نہیں مجھ پر فقرا تمہارا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۲
(۲) یہ کیسے بال کھولے آئے، کیوں صورت بنی غم کی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جُون ۱۹۵۴ء) ۳۱۲

شاعر، حمایت علی: اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو!'
۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۲۱
(۲) ادھوری کہانی، ۷۷-۷۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۱۰-۱۱۱
(۳) پندارِ زہد ہو کہ غرور برہمنی، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۱۸
(۴) تعبیر، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) - ۱۹
(۵) جب تک زمیں پہ رینگتے سائے رہیں گے ہم، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶۰
(۶) دلاسہ، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۷۸
(۷) سہرا ہے، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۵۱
(۸) سکوتِ مضطرب، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸۴
(۹) شیشے کے صنم، پتھر کے صنم، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۵۶
(۱۰) متاعِ دردِ ملی، سوزِ جاوداں نہ ملا، ۷۳-۷۴، (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۵۷
(۱۱) نالۂ غم شعلۂ اثر چاہیے، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۸۳
شاعر، میر کلو: بھول کر بھی ادھر نگاہ نہ کی، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۹۳
شاعر لکھنوی: آنسو شعلوں میں ڈھل رہے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۶
(۲) اب کہاں وہ تری زلفوں کی شکن کی باتیں، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۳۰
(۳) اب کے اس رنگ سے کچھ یادِ چمن آئی ہے، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸۲
(۴) اپنی طلب کا نام ڈبونے کیوں جائیں میخانے تک، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۳۲
(۵) اپنے ہی فاصلے نظر میں ہیں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۱۷
(۶) احساس بہت کچھ ہوتا ہے، عرفان بہت کم ہوتا ہے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۵۲
(۷) اک تبسم سے بھی جو کم ٹھہرے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۵۸
(۸) اک تبسم سے ہم نے روگ لیے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۱۹
(۹) اک اک پل اک ایک برس ہے رُوٹھ کے، ان کے جانے سے، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۱۲
(۱۰) اک دھواں سا ہے ماہ و انجم تک، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۸۳
(۱۱) ان کا غم بھی نہ رہا پاس تو پھر کیا ہوگا، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۸۴
(۱۲) پیار کی خوشبو پھیل گئی تو ہوتی ہے رسوائی بھی، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۱۱
(۱۳) جب اُٹھتی ہیں وہ مبہم سی نگاہیں، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۰۷

(۱۴) جب بھی کوئی افسانہ چھڑا ان کی ادا تک بات گئی، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۱۲

(۱۵) جبس طاری ہے مسلسل کیسا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۳۳

(۱۶) جو بھی آیا غمِ دنیا کی طرح، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۲۲۳

(۱۷) جو زخم دل کے سمائے نہ ظرفِ نشتر میں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۱۵

(۱۸) جو غم حبیب سے دور تھے وہ خود اپنی آگ میں جل گئے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۶

(۱۹) جہل کو علم کا معیار سمجھ لیتے ہیں، ۱۰۵، سالنامہ دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۱۸

(۲۰) چاہا بھی تو لب کہاں ہلے ہیں، ۵۱ - ۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۸۹

(۲۱) حاصل بندگی شام و سحر ہوتا ہے، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۰۴

(۲۲) خبر نہیں کہ گزر جائیں کتنے خوابوں سے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۱۴

(۲۳) خندۂ گل میں کسی زخم کی گہرائی ہے، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۹۰

(۲۴) خواب سے آنکھ وہ مل کر جاگے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۳۴

(۲۵) خود کو جو اہلِ نظر اہلِ وفا کہتے ہیں، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۹۷

(۲۶) خوشبو بن کر ہیں آوارہ، آنسو بن کر جلتے ہیں، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۱۱

(۲۷) خوشبو ہوں نہ میں کوئی ہوا ہوں، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۴۱

(۲۸) دار تک آئے حریم لب و رخسار سے لوگ، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۵۱

(۲۹) دشتِ امکاں میں تمنا گم ہے، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۴۷

(۳۰) دل میں تھے زخمِ تمنا کتنے، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۴۸

(۳۱) صحرا کی بے آب زمیں پر ایک چمن تیار کیا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۳۵

(۳۲) عشق جاگ اٹھتا ہے یادِ لب و رخسار کے بعد، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸۲

(۳۳) عقل جب تک جنوں شناس رہی، ۵۵ - ۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۱۸

(۳۴) غم اگر جزوِ رگِ جاں نہیں ہونے پاتا، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۴۹

(۳۵) فسردہ رنگِ چمن ہے ذرا نکھار تو ہو، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۵۹

(۳۶) کبھی تو زخم دیا، لے گئی قرار کبھی، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۰۳

(۳۷) کرم کسی کا تھا مرگِ ناگہاں کی طرح، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۱۶

(۳۸) کیا غم جو لہو میں تر گئے ہم، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۶۳

(۳۹) کہیں تو عشق کی آوارگی کو رنگ ملے ، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۵۰

(۴۰) لب پہ آنا تھا نہ آنکھوں سے رواں ہونا تھا ' ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۳۴

(۴۱) مجھے اب اعتبار غم نہیں ہے ، ۹۶ ، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۰۵

(۴۲) مدتوں آ نہ سکے چشمِ خریدار میں ہم ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۴۲

(۴۳) نفس نفس پہ نیا سوزِ آگہی رکھنا ، ۱۲۹ ، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۱۳

(۴۴) وہ تیغِ ناز کہ ہے برق شعلہ رو کی طرح ، ۱۰۵ ، سالنامہ ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۱۷

(۴۵) وہ نظر ملتفت جو کم کم ہے ، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۵۱

(۴۶) وہی خلش ہے وہی اپنے دل کی تنہائی ، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۱۴

(۴۷) وہی مزاج مشیت کا رُخ بدلتے ہیں ، ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۶۹

(۴۸) ہزار تیرہ شبی کے فریب کھائے ہیں ، ۳۱ - ۳۲ (مئی ، جون ۱۹۵۳ء) ۸۶

(۴۹) ہم اہلِ قلم ہیں ، ۱۰۵ ، سالنامہ ، تیسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۹۲ - ۱۱۹۴

(۵۰) ہمیں سے ہے طلب جان و تن سمجھتے ہیں ، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۵۰

(۵۱) ہنسی لبوں پہ ہے ، دل میں شگفتگی تو نہیں ، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۰۰

(۵۲) ہو سکی کس سے ادا عرضِ ہُنر کی قیمت ، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۵۰

(۵۳) ہوا کو اور بھی کچھ تیز کر گئے ہیں لوگ ، ۱۲۹ ، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۱۲

(۵۴) یہ دُھوپ چھاؤں ہے کیا چیز کوئی سمجھائے ، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر ، نومبر ۱۹۵۳ء) ۸۵

شاہد ، خواجہ حمید : اب کیا دُعا کریں کہ شعورِ نظر ہے ، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۹۵

شاہد ، مجید : فضاؤں پہ تعطل سا ہے طاری ، ۲۹ - ۳۰ ، پنج سالہ نمبر (فروری ، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۱۶

شاہد شیدائی : سوئمبر ، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۳۶

شاہین ، جاوید : ہاں یاد ہے شبوں کا وہ منظر بجھا ہُوا ، ۱۰۵ ، سالنامہ ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۶۰

شباب ، حسین باندی بنارسی : مے کشی کا لطف تنہائی میں کیا ، کچھ بھی نہیں ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۴۵۲

شبلی نعمانی : تیس دن کے لیے ترکِ مے و ساقی کر لوں ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰۶

(۲) یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰۶

شرر ، مولوی عبدالحلیم لکھنوی : کیا سہل سمجھے ہو ، کہیں دھبا چھٹا نہ ہو ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۷

شرف، سید سادات حسین، ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا، کہیں لالہ، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۸۱

شعری بھوپالی، غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۲۳

——— ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۷۶۹

شعلہ، بنواری لال، ہے عشق میں ابرو کے جو کاہیدہ تن اپنا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۵۵

شفق عماد پوری، دل تڑپ جائے نہ کیوں سُن کر فغان اہلِ درد، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۷

شفقت کاظمی، بیگانے سے ملے ہیں جب ملے ہیں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۸۹

(۲) ترا خیال مجھے راس آئے گا کہ نہیں، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۵۲

(۳) ترے حضور جو لب پہ نہ آسکا ہوگا، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۷

(۴) تصویرِ اضطراب سراپا بنا ہوا، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۰۸

(۵) تیرے ہر جور پہ یاں شکرِ خدا ہے اے دوست، ۸۳ - ۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۲۲

(۶) جانے کب وہ بہار آئی تھی، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۴۰

(۷) جب کبھی تیری شکایت کی ہے، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۱۰

(۸) حدودِ کون و مکاں سے گزر گیا بھی میں، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۲۳

(۹) ختم ہے اب مرا افسانہ بھی، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۷

(۱۰) خوش ہو کے سہہ رہا ہوں زمانے کے غم ابھی، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۱۵

(۱۱) شکوہ تو کوئی تیرے جہاں سے نہ تھا مجھے، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۱۹

(۱۲) کب تک کوئی آسرا لگاتے، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۱۰۱

(۱۳) کس راہ پہ ہیں رواں دواں ہم، ۸۱ - ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۴۵

(۱۴) لالہ و گل سے پیار کیا کرتے، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۳۲

(۱۵) مشکل تھا جو اپنے غم کا چارا، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۹۱

(۱۶) ملتفت کب نگاہِ یار ہوئی، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۲۲

(۱۷) وہ حادثہ جو ترے بعد ہم پہ گزرا ہے، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۱۵

(۱۸) ہر گھڑی کربِ مسلسل میں کٹی جاتی ہے، ۸۱ - ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۴۵

(۱۹) ہم کو ہر چند مطلب نہ تھا آپ سے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۶۲

(۲۰) ہمارے حال پہ کسی دن جفا نہیں کرتے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون

۱۹۶۶ء) ۳۸۸
(۲۱) ہمارے حال پہ ہے اور بے محابا ہے، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۰۶
(۲۲) یُوں تو کب اُن کو نہ ہم یاد آئے، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۹۳
(۲۳) یُوں ختم کر چکے وہ رہ و رسم دوستی، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۷۲

شفیق، پچھمی نرائن: شمع پر پروانہ جل کر راکھ ہو، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۸۷

شکیب جلالی، پاداش، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۱۸
(۲) جلتے صحراؤں میں پھیلا ہوتا، ۱۰۲، (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۱۷
(۳) حرف جو اُس زباں سے نکلا، ۱۰۴، (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۴۶
(۴) رباعیات، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۸۶
(۵) زنجیر کی جھنکار کو سنگیت میں ڈالا، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۹۸
(۶) کیا کہئے کہ اب اس کی صدا تک نہیں آتی، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۷۱
(۷) میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۶۰
(۸) وہ کون ہے جو تمہارا سراغ پا نہ سکا، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۲۵
(۹) غازی کا ترانہ، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل۔ جون ۱۹۶۶ء) ۱۲۰۰-۱۲۰۱

شکیل بدایونی: پھر اٹھی دل میں اک موجِ شباب آہستہ آہستہ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۴
(۲) لطیف پردوں سے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۵
(۳) مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۴
(۴) مری زندگی ہے ظالم ترے غم سے آشکارا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۳
(۵) نہ اب وہ آنکھوں میں برہمی ہے نہ اب شمامتھے پہ بل رہا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۵
(۶) ہم ہیں اور ان کی خوشی ہے آج کل، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۳

شمس الحسن، نواب: گزار دی ہے محبت میں زندگی میں نے، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۸۰

شمس منیری، پروفیسر حافظ شمس الدین: میرے غم الم کو نہ پوچھیے مجھے چین ہے نہ قرار ہے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۲۲

شمس مینائی، شیخ عبدالرحمن امرتسری: سناؤں کیا کسی کو میں سنے گا کوئی میری کیا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۸

شمیم حنفی: ہم ہیں پریت نگر کے باسی، ہم سے رسم وفا نکلی، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۳۲

شہیدی، کرامت علی : جی چاہے گا جس کو ا سے چاہا نہ کریں گے، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۴

(۲) ہزار مرتبہ دیکھا ستم جُدائی کا ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۴

شیدا ، حکیم اجمل خاں : کچھ بات ہی تھی ایسی کہ تھامے جگر گئے، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۴۰۸

شیدا ، رام رچھپال سنگھ دہلوی : قیامت ڈھائیں گے رفتار سے اصلا نہ مانیں گے ، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۸

شیریں ، بیگا جان : سنتا ہے کون کس سے کہوں ماجرائے دل، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۴۵۱

شیریں ، نواب شاہجہاں بیگم : خالق ہے خدائے سحر و شام ہمارا ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۷

شیفتہ ، محمد مصطفیٰ خاں : اُٹھے نہ چھوڑ کے ہم آستانِ بادہ فروش ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۴

(۲) بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی جون ۱۹۵۴ء) ۷۸

(۳) جفا و جور کا اس سے گلا کیا ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۴

(۴) سحر گلے جو وہ گلگشتِ گلستاں کے لیے ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۸

(۵) شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۷

(۶) کچھ درد ہے مطربوں کی لَے میں ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۵

(۷) کیونکر مجھے خطا رقم کریں گے ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۷

(۸) گر مجو شی ہے، مگر فرق شرارت میں نہیں ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۵

(۹) مت چھیڑ کہ یار سے جُدا ہوں ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۶

(۱۰) ہے گونہ گونہ شک ابھی عفوِ گناہ میں ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۶

ص

صابر ، مرزا قادر بخش : پہلے نہ اڑایا کسی بے کس کے جگر کو ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۵

(۲) جو دل کو محبت کے مزے آئے ہوئے ہیں ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۵

صابر کنجاہی : آج پھر ان کی گلی میں آ گئے ، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۹۲

صادق ، آغا : اب تشنگی کہنہ مٹا کیوں نہیں دیتے ، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۹۷

(۲) تعبیر، ۶۱ - ۶۲ ، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۹۲

(۳) جور سحر و شام تو برداشت نہ ہوگا ، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۰۷

(۴) رُتِ چمن پہ نکھار آج نہیں کل سہی، ۶۷ - ۶۸،
دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۳۳
(۵) سینا کو ہے غرورِ ذرا سامنے تو آ، ۷۷ - ۷۸،
خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸۸
(۶) شاعرِ ابہام سے، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۲۷
(۷) غلط ہے دہر میں رسم ستم رانی نہ تھی پہلے، ۹۷
(مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۲۵
(۸) لاہور نامہ، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء)
۲۷۷
(۹) نزعِ دیر و حرم سے نجات کیسے ملے، ۹۵ (اکتوبر
۱۹۶۲ء) ۲۲۱
صادق نسیم: اداس اداس سرِ ساغر و سبو بھی ہیں، ۹۷ (مارچ
۱۹۶۳ء) ۱۲۱
(۲) اس احتساب میں دونوں کی جگ ہنسائی نہ ہو،
۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۷۱
(۳) بہ رنگ تیغ کنارہ کشی بھی کرتے ہیں، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۴۳
(۴) بھول ہی کی نہیں ہے یار غزل، ۱۲۹،
عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۷۰
(۵) تری نگاہ میں اندازِ دلبری کچھ ہے، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۴۳
(۶) شہرِ طلب میں آج عجب حادثہ ہوا، ۹۶، سالنامہ
(جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۳۰
(۷) کچھ ایسی دل میں ہوئیں آ کے دُوریاں آباد، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۴۲
(۸) مشیتوں کے نگہباں ہیں آپ بھی ہم بھی، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۴۲
(۹) نہاں سکوت کے پردے میں بھی صدا ہے کوئی،
۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۶۹
صبا، لالہ کانجی مل: سحر جب بسترِ راحت سے وہ رشکِ قمر
اٹھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۷۰۹
صبا اکبر آبادی: جو دیکھیے تو کرم عشق پہ ذرا بھی نہیں، ۸۷
(فروری ۱۹۶۱ء) ۱۰۶
صبا لکھنوی: تیری طرف سے دل اے جان جان اٹھا نہ سکے،
۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۶
(۲) واعظ کے میں ضرور ڈرانے سے ڈر گیا، ۴۱-
۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۶
صدق جائسی، کیا کرے چشم غلط انداز بے تقصیر ہے، غزل
نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم
(اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۷۰
صدیق کلیم: اپنے پیاروں پر جو گزری، آنا جانا بھول گئے،
۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۳۲
(۲) اجنبی راہگذر، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء)
۲۳۱
(۳) امن اور جنگ، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۲۸
(۴) اندھیارا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء)
۲۲۹
(۵) تنہائی، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۸۶-۱۸۷
(۶) جان پہچان، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۳۱
(۷) دکھ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء)
۲۲۸

سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۴۳
(۲) گو خاک ہوں، غبار نہیں اس کی راہ کا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۴۴

ض

ضمیر اظہر: دل ہے غم کے بوجھ سے چور، ۱۰۱، (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۷۳

ضمیر جعفری، سید: بہ عشقش دل بریدن، جان تپیدن آرزو دارم، ۱۱۵، (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۱۸
(۲) دل والوں کی بات چلی ہے، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۳۰
(۳) ماڈرن غزل، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۴۲۵
(۴) یہ کس بازار میں بکنے کی خاطر آگیا ہوں میں، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۰۲

ضمیر جعفری (مترجم): پوٹھوار کی پھوار از محمد شاہ، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۰۸ - ۵۱۱
(۲) ولایتی زعفران (۳۶ نظمیں) ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۵۱۷ - ۵۴۵

ضیاء، میر ضیاء الدین: دل رُبا ہے مرا، بڑا گستاخ، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۱۰

ضیا جالندھری: چھیڑی بھی جو رسم و راہ کی بات، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۵۹
(۲) کیا سروکار اب کسی سے مجھے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۵۹

ضیا جعفری، سید عنایت علی شاہ: فضا میں پھیلتے جاتے ہیں رات کے سائے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۹

ط

طارق، غلام رسول: آپ ہی ناخدا رہا ہوں میں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۵۷
(۲) عشق میں جو بھی در بدر ہوگا، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۲۸
(۳) یارا نہیں جن میں دشمنی کا، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۹۰

طالب باغپتی، محمد لطافت علی خاں: پہلے تو آفتاب بنایا شباب نے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۹۸

طالب بدایونی، دل سے ترا خیال بُھلایا نہ جائے گا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۴

طاہر، جعفر، عرصۂ ظلمتِ حیات کٹے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۷
(۲) کوئے حرم سے نکل ہے کوئے بتاں کی راہ، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۷

طاہر، فرخ آبادی: اب کیا ملیں حسینوں سے ہم گوشہ گیر ہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۱۱

ظ

ظفر احمد: آپ کہیں تو گلشن ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۳
(۲) آج کیا گزر گئی دلوں پر، ۴۱ - ۴۲ (مئی، جون

۱۹۵۳ء) ۹۶

(۳) اپنے ہی کسی سائے سے ٹکرایا ہوں پھر بھی ، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۸

(۴) احمد ظفر کسی پہ بھروسہ نہ کیجئے ، ۸۳ - ۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۲۹

(۵) اُڑنے سے پیشتر ، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۳۲

(۶) اور کیا میرے لیے عرصۂ محشر ہوگا ، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۳۴

(۷) ایک عورت کے نام ۲۹۰ - ۳۰ ، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۱۰

(۸) تقاضے ، ۱۳۲ ، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۲۱

(۹) چمن میں پھول لہراتے رہیں گے ، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۰۹

(۱۰) رات کے سینے میں یہ چاند کا جادو کیا ہے ، ۶۷ - ۶۸ ، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۴۵

(۱۱) رات ہے اور اندھیاری رات ، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۹۱

(۱۲) زہر کو مے نہ کہوں ، مے کو گوارا نہ کہوں ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۷۰

(۱۳) سر بالیں ، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱) ۱۱۶

(۱۴) سدراں دی موت (پنجابی) ، ۵۵ - ۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۲۸

(۱۵) شب کی تنہائی میں دیکھے ہیں کچھ ایسے منظر، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۱۰۷

(۱۶) فلک پہ چاند نہیں ، کوئی ابر پارہ نہیں ، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۳۳

(۱۷) کائنات ذات کا مسافر، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۹

(۱۸) گھر میں لڑائیوں کے سوا اور کچھ نہیں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۹

(۱۹) مانا کہ ابھی صبح کے آثار نہیں ہیں ، ۲۷ - ۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۳۷

(۲۰) موسم ہجر کے نام ، ۱۲۹ ، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۶۱

(۲۱) میوزیم ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۸

(۲۲) ویرانے کی ایک شام ، ۱۲۹ ، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۶۰

(۲۳) یوں زمانے میں مرا جسم بکھر جائے گا ، ۱۲۴ ، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۷۱

ظفر، یوسف : اس انقلاب دہر کی کچھ تو خبر ملے ، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۵۷

(۲) تعمیرِ زندگی کو نمایاں کیا گیا ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۴

(۳) یارو! ہر غم غمِ یاراں ہے قریب آجاؤ ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۴

(۴) میراث ، ۲۳ - ۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۴۶ - ۱۴۹

(۵) میراث ، ۷۹ - ۸۰ ، ادب عالیہ نمبر

اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۹۸ - ۷۰۱

ظفر اقبال، دل میں جو زہر تھا آنکھوں سے ہویدا نہ ہوا، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۴۶

(۲) دیکھتا ہے وہ مجھ پر مہربان کتنا ہے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۷

(۳) سرسوں، خواب، ہوا، تصویر، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۶

(۴) کتنے رنگوں سے بے خبر گزرے، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۹۱

ظفر، سراج الدین، اُٹھو زمانے کے آشوب کا ازالہ کریں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۲

(۲) بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۳

(۳) یار تھا، گلزار تھا، مے تھی، فضا تھی، میں نہ تھا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۱

(۴) بہار آئی ہے، بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۲

(۵) پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۱

(۶) تری جو پازیب، سر کا جھومر، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۳

(۷) جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہِ سوزاں کو، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۲

(۸) درِ میخانہ سے دیوارِ چمن تک پہنچے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۲

(۹) دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا، نہ رہا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۶۹

(۱۰) کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۰

(۱۱) غم ہرگز درِ دل سے ٹَل کرایا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۰

(۱۲) دیا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۶۹

ظہیر صدیقی، شورشِ دہر سے ہے ارض و سما کی قیمت، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۳۳

ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر: نقوش (رسولؐ نمبر)، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۷ - ۶۴۸

ظہیر دہلوی، ساقیا! مر کے اٹھیں گے ترے مے خانے سے، ۴۱ - ۴۲ غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۰

(۲) وہ نیرنگِ الفت کو کیا جانتا ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹۰

ظہیر کاشمیری: آج کا کھیل، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۱۱۸۶

(۲) آمدِ رفتگاں، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۷۹

(۳) اپنے پائیں باغ کو دیکھ کر، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۸۱

(۴) اب صاحبِ دوراں آتے ہیں، اب صاحبِ میداں

ع

(مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۰۶

(۸) خوں فشاں دستِ صبا دیکھا ہے، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۵۶

(۹) سب کے جلوے نظر سے گزرے ہیں، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۷۳

(۱۰) غمِ دوراں غمِ جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۸۳

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۰۱

(۱۱) کاروانِ گل و ریحاں گزرے، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۲۷

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۰۱

(۱۲) کہو بتوں سے کہ ہم طبع سادہ رکھتے ہیں، ۲۹-۳۰ (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۷۳

(۱۳) مے ہو ساغر میں کہ خوں رات گزر جائے گی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹۹

(۱۴) ہوائے تندِ پر افشاں ہے دیکھئے کیا ہو، ۳۳-۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۶۰

(۱۵) یہ کیا طلسم ہے دنیا پہ بار گزری ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۰۰

(۱۶) یہی تھا وقت تری محفلِ طرب کے لیے، ۹۱-۹۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۹۰

عابد حشری، فسردہ جادہ و منزل اداس راہگزار، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۸۵

عابد شاہجہانپوری، عابد حسین: راز عالم سے آشنا تھی نظر، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۰

عاجز، عارف اللّٰہ دین خاں: عرق جب اس پری کے چہرۂ پُر نور سے ٹپکے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۱

عارف، حکیم نواب جان خاں، ملتفت کب نگاہ ناز نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۲

عارف، منظور: تھی کبھی، اب مگر وہ چاہ نہیں، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۹۳

عارف عبد المتین، ایک کہانی، ایک انسان، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۹۵

(۲) ترے بازوؤں کا سہارا تو لے لوں مگر ان میں بھی رچ گئی ہے تھکن، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۲

(۳) میری سوچ لرز اٹھی ہے دیکھ کے پیار کا یہ عالم، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۶۱

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۶۲

عاصی کرنالی، میں بھی پابندِ وفا ہوں مجھ پہ بھی بیداد ہو، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۵

عالم، نواب بادشاہ محل: مجھ سے آزردہ، میرا یار رہے آج، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۸

عالم اکبر آبادی: مان لیا مغرور نہیں ہے، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۶۳

عبدالمجید بھٹی: اٹھے گرے چلمن، وہ نہاں ہوں کرمیاں اور ، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۲۶۵

(۲) بے مدعا جھکا ہے کبھی کوئی سر کہاں ، ۱۰۵ ، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۸۰

(۳) پھولی شام کی لالی ، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۴

(۴) حاصل عمرِ رواں وُہ ایک پل ، ۱۰۵ ، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۸۱

(۵) رقابت ، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۰۷

(۶) ستم نواز نگاہوں کی داستاں معلوم ، ۲۹ - ۳۰ ، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۹۷

(۷) فراز تمنا ، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۸۳-۸۴

(۸) نوازشِ حسن پر کی بھی تو کیا کی ، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۵

(۹) یکتائی ، ۱۰۶ ، خاص نمبر (اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۶۴

عبرت، اکبر حسین موہانی، دل ہے نہ نشان بے دلی کا ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۲

عبرت، محمد تبارک علی صدیقی، گو میسر تھا پھُولوں کا سایا ، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۱

عدم، عبدالحمید، آپ کی آنکھ اگر آج گلابی ہوگی ، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۲۲

(۲) اَگرٹ ، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۸۳

(۳) اک جُوئے شیر سے مفتوح - کدھر ہوتی ہے ، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۴۲

(۴) ان کی جو بھی بات ہے ، ۲۹-۳۰ ، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۸۱

(۵) اُن مست انکھڑیوں کو کنول کہہ گیا ہوں میں ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۶

(۶) ایک دلکش زہر ہے لبریز پیمانے کا نام ، ۱۰۵ ، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۶۳

(۷) ترا جمال بھی ہرچند اک ستارا ہے ، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۷۷

(۸) بات اب کچھ سمجھ میں آتی ہے ، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۶۹

(۹) بڑی صدا ، ۶۱-۶۲ ، سالنامہ (جنوری ، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۶۷

(۱۰) بعض چیزوں کا تصرف ہی بجا ہوتا ہے ، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۴۸

(۱۱) پسِ پردہ آب انگور کیا ہے ، ۸۱ - ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۳۴

(۱۲) پھولوں کی ٹہنیوں پہ نشیمن بنائیے ، ۴۱ - ۴۲ ، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۷

(۱۳) تری چشمِ جواں آئینۂ انوار ہے ساقی ! ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۴۶

(۱۴) توفیق ہو تو تازہ ستارے تراش کر ،

۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۰۳
(۱۵) جس سمت بھی چمن میں وہ غنچہ دہن گیا، ۶۷-۶۸، ۹۰ دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۲۰
(۱۶) جس کو کہتے ہیں قیامت تری رفتار تو ہے، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۷۱
(۱۷) جس نے دیکھی جناب کی صورت، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۰۸
(۱۸) جہاں بھی اس مہ جبیں کے عہدِ شباب کی بات ہو رہی ہے، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۶۶
(۱۹) جو تیرے رازداں تھے بڑے معتبر ملے، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۶۶
(۲۰) حسن اک موزوں ادا کا نام ہے، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۴۶
(۲۱) خم کدہ، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۴۰
(۲۲) ڈبونے کا ارادہ کر رہے ہیں، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۲۴
(۲۳) رو حیں جب — زلفِ یار ہوتی ہے، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۴۰
(۲۴) زباں پر آپ کا نام آ رہا ہے، ۷۹-۸۰، ادبِ عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۸۰ء) ۹۸۱
(۲۵) زلفِ برہم سنبھال کر چلئے، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۵۵
(۲۶) ساز، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۲۳
(۲۷) ساقی کے گیسوؤں کی ہوا کھا رہا ہوں میں، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۶۷
(۲۸) سماں جواں ہو، گیسو کھلیں، شراب چلے، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۲۰
(۲۹) شام ہوتی ہے دیا جلتا ہے میخانے کا، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۹۷
(۳۰) شہرِ خوباں، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۷۶
(۳۱) عہدِ مستی ہے لوگ کہتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۵
(۳۲) غمِ محبت ستا رہا ہے، غمِ زمانہ مسل رہا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۶
(۳۳) قبروں کی محبت، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۶۲
(۳۴) قلب و جاں میں — نہ جاگزیں ہوتے، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۳۹
(۳۵) کبھی تو ایسا بھی دستورِ خوشگوار چلے، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۲۱
(۳۶) کبھی وہ چاند ستاروں کے ساتھ رہتے ہیں، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۹۲
(۳۷) کرتی ہے جب وہ آنکھ — حکایت سرائیاں، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۴۱
(۳۸) گماں نہ تھا کہ تجھے — اس طرح ستاؤں گا، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۳۸
(۳۹) مستی ضرورتوں کی جوانی کا نام ہے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۸۲
(۴۰) موسمِ گل ہے پرستاں نظر آتا ہے مجھے،

۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۶۲

(۴۱) میکدہ تھا چاندنی تھی میں نہ تھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۵

(۴۲) میکدے کا تیز پانی اور ہے، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۱۷

(۴۳) نزاع دیر و کعبہ بڑھ گئی ہے، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۱۷

(۴۴) نشاطِ عشق کی جنت کو آتش خانہ کہتے ہیں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۶۱

(۴۵) نوروز، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۸۰

(۴۶) نہ کہہ ذکر اپنی عنایات کا، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۸۷

(۴۷) نیاز و صدق سے لبریز با وفا سجدے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۴۷

(۴۸) وہ لمحہ جب صنم میرے قریں تھا، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۲۵

(۴۹) ہے عقل یوں ہراس و گماں سے بھری ہوئی، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۸۲

(۵۰) ہے یوں ہجوم غنچہ و گل صحن باغ میں، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۶۸

(۵۱) یہ الگ بات ہے ساقی کہ مجھے ہوش نہیں، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۷۷

(۵۲) یہ کیسی سرگوشئ ازل سازِ دل کے پردے جلا رہی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۷

عذرا حیدر: اندیشہ، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۱۵

عرش ملسیانی: دلِ فسردہ پہ سو بار تازگی آئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۷

(۲) ہر صورت سے ہر عنواں سے تخریبِ گلستاں دیکھ چکے، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۶۴

(۳) یہ دورِ خرد ہے دورِ جنوں، اس دور میں جینا مشکل ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۷

عرشی، امتیاز علی: تمہاری مہربانی ہم پہ گرچہ کم نہیں ہوتی، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۹۵

(۲) درد بڑھتا نہیں جب تم سے تو درماں ہی سہی، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۷۲

(۳) دیوانِ غالب کا ایک نادر انتخاب، ۱۱۳، غالب نمبر، حصہ دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء) ۳۱۳-۳۲۶

(۴) کون گلشن میں رہے نرگسِ حیراں کی طرح، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۰۴

(۵) گفتگوئے بہار، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۱۱

عرشی رامپوری: ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۶۹

——— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۷۸

(۳) دمِ جاودانہ غزل ہی تو ہے، ۵۷ - ۵۸
(جون ۱۹۵۶ء) ۱۵۴

(۴) منٹو کا پیغام، ۵۱ - ۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء)
۱۹۲

(۵) رنگ کہاں سایہ سا ہے، غزل نمبر (ترمیم و
اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء)
۴۷۹

عظیم مرتضیٰ، ترا خیال بھی ہے، وضعِ غم کا پاس بھی ہے،
۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۴

(۲) کچھ بھی ہو مرا حال نمایاں تو نہیں ہے، ۴۱ -
۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۴

عظیم، مرزا عظیم بیگ: کل چشمِ خوں فشاں سے گلزار پیرہن تھا،
۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۱۳

علی احمد جلیلی، اچھی معاملت یہ مرے ساتھ کی گئی، ۱۲۹، عصری
ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۶۶

(۲) وقت کے لب پہ تبسم جو اُبھر آیا ہے، ۱۲۹،
عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۶۵

علیم، عبیداللہ: خوش وہ دور کہ جب تجھ سے رسم و راہ نہ تھی،
۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۳۲

عمر انصاری: راس ہی نہیں آتا دل کو کوئی غم تنہا، ۸۰ (مئی
۱۹۶۱ء) ۱۰۳

عندلیب شادانی: انکشاف، ۵۱ - ۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء)
۱۶۳ - ۱۶۴

(۲) تکمیل، ۳۳ - ۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء)
۶۱

(۳) جہاں عہدِ تمنا ختم ہو جائے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر
(مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۱

(۴) کوئی ادا شناسِ محبت ہمیں بتائے، ۷۹
- ۸۰، ادبِ عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۷۷
—— ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۳۳۱

(۵) مرے پاس آج بھی ہیں تیری کتنی یادگاریں،
۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۹۹

(۶) میری مہتاب! مرے حجلۂ ارماں کی عروس،
۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون
۱۹۶۶ء) ۳۵۴

(۷) وہ الم کشوں کا ملنا، وہ نشاط و غم کے سائے،
۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۶۶

عیش، جان محمد خان غوری فیروزپوری: ہم یوں تڑپ رہے ہیں
ترے آستاں سے دُور، غزل نمبر (ترمیم و
اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء)
۵۱۰

عیش ٹونکی، چراغ طور، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر -
دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۷۰

(۲) زباں پہ کچھ ہے اشارا ہے کچھ گناہوں کا، ۹۷
(مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۲۲

عیشی، طالب علی خاں لکھنوی: جلا دے طُور او سوزِ نہانی!
غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم
(اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۸۵

غ

غافل، منور خاں، آ کے سجادہ نشیں قیس ہُوا میرے بعد،
غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم

(ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۲۹

(۱۰) جبیں کا چاند بنوں، آنکھ کا ستارا بنوں، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۸

(۱۱) جفا میں عکسِ وفا ہے جو آزمائے کوئی، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۱۱

(۱۲) حدِ نظر کو جان کے منزل گرم سفر ہیں ہم، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۲۶

(۱۳) دھرتی سے رشتہ مت توڑو، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۲۵

(۱۴) زخمِ احساس، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۱۰

(۱۵) سراب، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۹۱

(۱۶) سراب، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۱۴

(۱۷) شہرِ خموشاں، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۰۴

(۱۸) شیشہ ہے نہ مے ہے نہ کوئی جام قفس میں، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۳۹

(۱۹) طلوع و غروب، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۱۲ - ۳۱۴

(۲۰) ظلمتوں کا مہیب ہالہ ہے، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۹۵

(۲۱) عشق و ہوس، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۶۱

(۲۲) قطعِ رہِ ظلمات کریں، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۰۲

(۲۳) کرے گا کوئی بغاوت حیات سے کیسے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۲۰

(۲۴) ماضی، حال، مستقبل، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۳۴

(۲۵) مل گئے انھیں شاید نقشِ پا ہواؤں کے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۲۸

(۲۶) میراث، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۸۳

(۲۷) نفرت، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۱۶

(۲۸) نقد و نظر، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۳۵

(۲۹) نیا زاویہ، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۰۰

(۳۰) واپسی، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۲۶ - ۴۲۷

(۳۱) ہمزاد، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸۵

(۳۲) یہی ہے دورِ غمِ عاشقی تو کیا ہوگا، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۳۸

———— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۲

فانی بدایونی، شوکت علی، آپ سے شرحِ آرزو تو کریں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۷

(۲) اس کشمکشِ ہستی میں کوئی راحت نہ ملی، جو غم نہ ہُوئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۸

(۳) پھر وہ اندازِ نظر یاد آیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴۵

(۴) تہِ خنجر بھی جو بسمل نہیں ہونے پاتے، ۴۱

۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۱

(۱۱) چار دن کی سہی بہت ہے میاں، ۱۰۵، سالنامہ دُوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۴۰

(۱۲) چند اشعار، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۷۹ء) ۱۶۸

(۱۳) حدیثِ حسن، ۵۷ - ۵۸ (جُون ۱۹۵۶ء) ۱۳۴-۱۳۶

(۱۴) خرمی کو بھی غم صفات کریں، ۵۷ - ۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۳۹

(۱۵) دکانِ سخن، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۰۲-۱۰۴

(۱۶) دنیا دنیا عالم عالم تھے اک روز یہی ویرانے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۴

(۱۷) رباعیات، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۹۶-۹۷

(۱۸) رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پہ آئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۴

(۱۹) زہے آب و گِل کی کیمیا، ہے چمن کہ معجزۂ نمو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۳

(۲۰) سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنّا بھی نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۲

(۲۱) شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۲

(۲۲) عشق وہ راز چھپاؤں تو چھپا بھی نہ سکوں، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۴۷

(۲۳) فراق کے خطوط، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۰۲

(۲۴) فرزانگی بڑھی تو سراسر خوشی گھٹی، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۱۹۶

(۲۵) قندِ پارسی، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۴۶

(۲۶) قندِ ہندی، ۶۳-۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۴۷

(۲۷) کبھی یہ نگاہِ کرم تری مجھے لے لے دامنِ ناز میں، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۸۲

(۲۸) گزرے ہوئے زمانے یُوں یاد آرہے ہیں، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۲۴

(۲۹) مجھے گنوا کے اپنے جَور کرتے ہو پشیماں کیا، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۶۸-۱۶۹

(۳۰) مری نوا سے جل اُٹھے ہیں بحر و بر پہ چراغ، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۵

(۳۱) مرے فسردہ دل کی نہ پُوچھ طرفہ کاریاں، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۷۰

(۳۲) مطرب سے کہو، آج اس انداز سے گائے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۳

——— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۳۸

(۳۳) میں ہوں فقیرِ بے نوا سلطنتِ جہاں نہ دے، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۵۴-۵۵

(۸) دانشور کہلاتے ہیں اب فکر و نظر سے عاری لوگ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۴۸

(۹) ذکر میرا ہے تو کچھ طنز کے پہلو بھی سہی، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۵۳

(۱۰) رہتے خاموش جفائیں سہہ کے، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۲۸

(۱۱) زخموں کی بہار یہ اشکوں کی چاندنی، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۶۹

(۱۲) زمیں پہ پھیلا ہوا آسمان کس کا ہے، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۳۴

(۱۳) سب کو خوابوں کے نہ ایوان میں رکھو، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۴ء) ۳۹۳

(۱۴) سنبھالے پلکوں پہ قندیلِ جاں اکیلا ہوں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۲۶

(۱۵) کون ترسے مذاق خوشی کے لیے، ۶۷۔۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۳۶

(۱۶) کسی کی اک نگہِ التفات بھی رکھ دو، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۵۱

(۱۷) کاش اُسی کے ساتھ کٹے یہ دن نغمے کا رات غزل کی، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۷۰

(۱۸) مری متاعِ قلم، دولتِ ہنر لے جا، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۵۲

(۱۹) مے برسے، ساغر چھلکے، جس جانب چشمِ یار پھرے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۷۲

(۲۰) میرا قلم، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۸۷

(۲۱) میرے دشتِ سخن کے جوان آہو کو، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۶۸

(۲۲) میں نے پلکوں پہ سجایا نہیں آنسو کی طرح، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل۔ جون ۱۹۶۶ء)

(۲۳) ہم تو خیر ہیں جیون بیری خوار ہوئے معتوب ہوئے، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۰۹

(۲۴) ہم نے دیکھا نہ تھا موسم کوئی ایسا سرسبز، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۲۴

(۲۵) یہ حسیں لب، یہ سیاہ زلفیں، یہ پیاری آنکھیں، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۹

فضلی، فضل احمد کریم، آرزوئے دل نہ بڑھنی تھی مگر بڑھتی گئی، ۸۳۔۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۱۶

(۲) آغازِ شباب شب ہے پیارے، ۴۱۔۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۷

(۳) اب وہ مہکی ہوئی سی رات نہیں، ۴۱۔۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۸

(۴) تمھیں اک نہیں جانِ ستاں اور بھی ہیں، ۳۳۔۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۷۷

(۵) بہار آئی گل افشانی کے دن ہیں، ۴۱۔۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۶

(۶) پھر ایسے خیالات آنے لگے ہیں، ۴۱۔۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۷

(۷) تحفۂ خونِ جگر، درد کی سوغات کے ساتھ، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۰۵

(۸) تعلق تو نہیں ان کو رہا مجھ سے، مگر اب بھی، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۱۷

(۱۷) قطعہ، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء)
۳۸۴

(۱۸) کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک راہ دکھلاؤ گے،
۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۶۸

(۱۹) کچھ محتسبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء)
۱۱۸

(۲۰) کم بیک افریقا، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء)
۶

(۲۱) کئی بار اس کا دامن بھر دیا حُسنِ دو عالم سے،
۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۱۸۸

(۲۲) لینن گراڈ کا گورستان، ۱۲۲، سالنامہ
(جنوری ۱۹۷۷ء) ۲

(۲۳) نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا،
۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۸۴

(۲۴) واسوخت، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء)
۵

(۲۵) یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں، ۷۹-
۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۴۸

(۲۶) یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجات دل کا عالم،
۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۲۲۵

(۲۷) یہ خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا،
۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۳

(۲۸) یہ فصل امیدوں کی ہمدم، ۵۱-۵۲ (جولائی
۱۹۵۵ء) ۷

(۲۹) یہ موسم گل گرچہ طرب خیز بہت ہے، ۱۲۰،
(جنوری ۱۹۶۷ء) ۳۵۸

(۳۰) یہاں سے شہر کو دیکھو، ۱۰۵، سالنامہ،
دوسرا حصہ (اپریل، جون ۱۹۶۶ء) ۳۳۹

فیض، میر شمس الدین: حرم میں، دَیر میں جب کوئی رو برو آیا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)
طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۹۰

فیضی، سیّد: چہار شنبہ مبارک از ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ،
۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۴۸۱-۴۸۲

ق

قائم چاند پوری: رکھتا ہے جو تو صفائے عارض، ۴۱-
۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۷۳

(۲) ہو گر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت،
۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۷۳

قبول، مرزا مہدی علی خاں: یہ عشق ایسا نہیں جس کی حرارت دور ہو دل سے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)
طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۷۷

قتیل شفائی: اب تو میکدے کی بھی شام بھول جاتا ہوں،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۸۸

(۲) اب کیا بھلا چھیڑے کوئی نغمہ گل و گلزار کا،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۶

(۳) اک بار جو تک لے اسے تکتا ہی چلا جائے،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۴

(۴) اگرچہ بزم میں درد آشنا بھی کہتا ہے،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۹

(۵) اندیشۂ ارباب حرم ساتھ رہے گا، ۱۴

۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۵۴ ۱۹ء) ۲۴۶
(۶) اندیشہ ہائے دُور و دراز، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۳۹
(۷) انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جُدائی کی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴۴
(۸) اے پیارے لوگو! مسجدے میں جاکے مانگو دعا یہ خدا سے، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۰۵
(۹) اسے کاش تجھے ایسا اک زخمِ جُدائی دُوں، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۱
(۱۰) باقی ہیں جو ورق انہیں سادہ ہی چھوڑ دوں، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۸۵ ۱۹ء) ۴۹۲
(۱۱) تیار ہا ہے ضمیر اپنی چشمِ حیراں کو، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۳۰
(۱۲) بھٹکے مرا خیال، مجھے راستہ دکھا، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۷۵
(۱۳) پھُولوں کی اداسی کو چھپا جاتی ہے خوشبو، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۹۰
(۱۴) پھُولوں میں بھی تیری ہمیں خوشبو نہ ملے تو ؟، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۷
(۱۵) پہلے تو وہی دشمن، پھر اس کی ادا دشمن، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۸۹
(۱۶) پہلے مزاجِ راہگذر جان جائیے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴۴
(۱۷) پیار کی راہ میں ایسے بھی مقام آتے ہیں، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۶۴
(۱۸) تشبیہات، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۹۴
(۱۹) تمہارے حسن کو حاصل غرور میرا ہے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۵
(۲۰) تین نظمیں، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۸۱
(۲۱) جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۷۴
(۲۲) جب بھی دیکھے مری دُنیا میں اندھیرا سورج، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۷
(۲۳) جب بھی کہتا ہُوں کوئی تازہ غزل تیرے لیے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۳
(۲۴) جب محبّت کی تجھے معصومیت مل جائے گی، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۳
(۲۵) جسے ہم صاف پہچانیں وہی منظر نہیں ملتا، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۵
(۲۶) چڑھتے ہُوئے سُورج کی ضیا تیرا بدن ہے، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۷۴
(۲۷) چمن کی آبرو بن کر صبا کے ساتھ چلتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴۶
(۲۸) حدودِ جلوۂ کون و مکاں میں رہتے ہیں، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۷۳
(۲۹) خرد کے نام جنوں کا پیام لے کے چلے، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۸۳
——— ۷۹-۸۰، ادبِ عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۸۵
(۳۰) دشمن، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۰۰
(۳۱) دل کو غمِ حیات گوارا ہے ان دنوں، ۴۱-

۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴۵
(۳۲) دل کی اداسیوں کا سبب تم سے کیا کہیں،
۵۷ - ۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۴۴
(۳۳) دلہن، ۲۹ - ۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری،
مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۸۲
(۳۴) دنیا اگر جلے تو ذرا مسکرا سکوں، ۱۰۱
(نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۳۴
(۳۵) دنیا مری آباد ہے جس راحتِ جاں سے،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۱
(۳۶) دھڑکا، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۳۵
(۳۷) ڈگر ڈگر کو سجاتے، نگر نگر میں رہے، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۸
(۳۸) رات لگا تھا پیار کا میلہ، نکلا تھا پونم کا چاند،
۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۷۴
(۳۹) رباعیات، ۶۱ - ۶۲، سالنامہ (جنوری،
فروری ۱۹۵۷ء) ۱۷۴
(۴۰) رباعیات، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء)
۴۸۵ - ۴۸۷
(۴۱) رسم شبستان طرب، ۶۷ - ۶۸، دس
سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۲۲
(۴۲) رقص کرنے کا ملا حکم جو دریاؤں میں، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۶
(۴۳) سایۂ زلفِ سیہ فام کہاں تک پہنچے،
۳۱ - ۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۸۴
(۴۴) سجا کے اپنی ہی آنکھیں ہزار چہروں پر،
۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۲۳
(۴۵) سسکیاں لیتی ہوئی غمگیں ہواؤ چپ رہو،
۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۲۲
(۴۶) سینے میں حسرتوں کی جلن چاہتا نہیں، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۲
(۴۷) سناٹا، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۲۴۴
(۴۸) صدمے جھیلوں، جان پہ کھیلوں اس سے
مجھے انکار نہیں ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر
(مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۴۵
(۴۹) عجیب لوگ، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۹۵
(۵۰) عرصۂ شوق میں دل کی یہی تقدیر سہی،
۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۸۸
(۵۱) غم ہجر سے نہ دل کو کبھی ہمکنار کرنا، ۱۳۲،
سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۰
(۵۲) فسردگی کا مداوا کریں تو کیسے کریں، ۹۱
(دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۶۷
(۵۳) فن اور بھوک، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء)
۹۵
(۵۴) کہسار کی منہ زوری ندی بن کے بہی تھی،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۰۰
(۵۵) گستاخ ہواؤں کی شکایت نہ کیا کر،
۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۹۰
(۵۶) گیت، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر -
دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۹۶
(۵۷) گیت، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۴۹
(۵۸) گیت، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء)
۱۷۵

۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۱۷

(۶) رینگتے لمحوں کا خوف، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۸۲

(۷) زہرِ اجل ہے چشمۂ حیواں ترے بغیر، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۷

(۸) فرق پھر کچھ بھی میانِ حق و باطل نہ رہے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۸۳

(۹) فطرت کا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے، ۶۷ – ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۴۲

(۱۰) کب زمانے کی اداؤں کا گلہ کرتے ہیں، ۶۷ – ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۴۲

(۱۱) کوئی صدا ابھی دے تو پلٹ کر نہ دیکھنا، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۸۴

(۱۲) کیا غم ہے جو شمعیں بجھنے لگیں، کیا غم ہے جو تارے ڈوب گئے، ۸۱-۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۴۴

(۱۳) کیا کیا نہ بھنور سینۂ گرداب میں آئے، ۱۳۳، (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۵۱

(۱۴) گرتے ہوئے جب میں نے ترا نام لیا ہے، ۷۳ – ۷۴، (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۶۴

(۱۵) طاق و برہمن نہ تھے دیر و حرم نہ تھے، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۱۶

(۱۶) نامحرم، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۸۱

(۱۷) یہی نہیں کہ ہمارے ہی پاؤں اکھڑے ہیں،

۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۵۰

کیف، حکیم ہاشم جان: منزل ہے سفر میں مری، یا میں ہوں سفر، ۴۱ – ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۳۸

کیف احمد صدیقی: دل میں جو سوز ہے وہ کسی پر عیاں نہیں، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۹۶

(۲) زندگی زہر بھی، امرت سے بھری پیالی بھی، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر – دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۹۳

(۳) گلوں کو موت کی نیند آگئی ہے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۹۱

(۴) میرے فقیرِ دل کی جیسے بددعا ملے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۹۶

(۵) یہ کس کی یاد خراماں ہوئی صبا کی طرح، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل – جون ۱۹۶۶ء) ۴۶۵

کیفی، پنڈت برج موہن دتاتریہ: حسن عشق میں ہے یا عشق حسن میں مضمر، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۲۱

(۲) عشق ہی عشق ہو، عاشق ہو نہ معشوق جہاں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۲۱

کیفی چڑیاکوٹی، مرے دامن پہ جو میری نظر سے گرنے والے ہیں، ۳۳-۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۶۵

(۲) ہوئی تھیں پست جب دم ہمتیں جوشِ اسیراں کی،

ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۹

(۷) اس لیے نہیں کہ دُعا بے اثر گئی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۳

(۸) اسد ملتانی، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۲

(۹) انجام گل، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۶۵ - ۲۶۶

(۱۰) اے دل! حریصِ لذتِ ذوقِ نظر مشو، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۷۲

(۱۱) ایک مفلوج دوست سے، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۱۶

(۱۲) بابائے اردو مولوی عبدالحق (رباعی)، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۲

(۱۳) بادِ بہاری چلی، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۷۲ - ۲۷۳

(۱۴) بشر کے ساتھ غم ہی غم نہیں ہے، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۶۴

(۱۵) بگڑا خیال گیسوئے شبگوں سے کام اور، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۵

(۱۶) بُوئے گُل، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۳۶۴

(۱۷) بہ تقریب یوم کشتی (رباعیات)، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۴

(۱۸) کچھ پچھتے، ملتا جو کوئی رازدانِ زندگی، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۵

(۱۹) پہلو میں دل کے موت کا دھڑکا لگا دیا، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۷۸

(۲۰) تضمین شعر جامی، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۵

(۲۱) تضمین شعر میر عثمان علی خاں، سابق نظام دکن، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۰

(۲۲) تضمین غزل بہاریہ مرزا غالب، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۴

(۲۳) جی کر تری یاد کے سہارے، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۷

(۲۴) حضرت جوش ملیح آبادی کے دہلی تشریف لانے پر، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۶

(۲۵) حضرت خواجہ امیر خسرو دہلوی، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۳

(۲۶) درمنع شکار، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۶۵

(۲۷) دریائے سندھ کی یاد، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۶۷ - ۲۶۸

(۲۸) دعا، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۰

(۲۹) دعائیں مانگیے کیا ترکِ آرزو کے لیے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۶۸

(۳۰) دل جب سے تغافل نے ترے توڑ دیا ہے، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۸

(۳۱) دلکش میں دُور کے نظارے، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۷

(۳۲) دو شعر، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۵

(۳۳) رباعیات، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء)

۳۴۵
(۳۴) رباعیات، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۸۳
- ۲۸۵

(۳۵) رہے کس بزم کے قابل بھلا ہم، ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۶

(۳۶) زباں پہ لذتِ دردِ محبت کا بیاں کیوں ہو،
۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون
۱۹۶۶ء) ۴۶۹

(۳۷) ساحلِ امن و اماں کو یم بہ یم عصیانِ ماست،
۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون
۱۹۶۶ء) ۴۷۱

(۳۸) سالک مرحوم کی برسی پر (قطعہ) ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۲

(۳۹) شہر سے ایک طرف دُور بہت، ۱۰۸ (ستمبر
۱۹۶۷ء) ۲۴۴

(۴۰) عبث انساں مصائب میں ہراساں
ہو کے رہتا ہے، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۷

(۴۱) فضاؤں پہ زمین بارِ گراں معلوم ہوتی ہے،
۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۸۱

(۴۲) قطعات، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۳

(۴۳) قطعات، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۵

(۴۴) کاوشوں سے اماں ملے نہ ملے، ۴۱-۴۲،
غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۲۳

(۴۵) کاہشوں سے اماں ملے نہ ملے، ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۷۹

(۴۶) کس طرح تا در جانانہ ہم، ۱۰۸ (ستمبر
۱۹۶۷ء) ۲۸۲

(۴۷) کہیں دنیا میں ایسی بے بسی دیکھی نہیں جاتی،
۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۸۰

(۴۸) کیا کرتے شکوہ دردِ نہاں کا کسی سے،
۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون
۱۹۶۶ء) ۴۷۰

(۴۹) گو اس سے اضطراب میں ہے جانِ
زندگی، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۷۹

(۵۰) مدعائے زندگی آسائشِ تن تو نہیں، ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۸

(۵۱) ملتِ اسلامیہ کا ذوقِ سخن، ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۹

(۵۲) مولانا ابوالکلام آزاد کی پہلی برسی، ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۱

(۵۳) مولانا ابوالکلام آزاد کی دوسری برسی،
۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۱

(۵۴) میں سنا رہا تھوں ان کو غمِ ہجر کا فسانہ،
۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون
۱۹۶۶ء) ۴۷۰

(۵۵) نادم حضورِ جلوۂ جانانہ بودہ ایم، ۱۰۸
(ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۶

(۵۶) نورجہاں کا مزار، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء)
۲۶۲ - ۲۶۳

(۵۷) نہ سوز و ساز کے پیری میں چھیڑ افسانے،
۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون
۱۹۶۶ء) ۴۶۸

(۵۸) وادیٔ غم، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۷۰
(۵۹) وادیٔ نشاط، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۶۹
(۶۰) وہی ارمان جیتے جی جو مشکل سے نکلتے ہیں، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۴۶
(۶۱) ہلالِ عید، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۶۰ - ۲۶۱
(۶۲) ہیں خواہم وفادارِ تو باشم، ۱۰۵، سالنامہ دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۷۱
(۶۳) یاد مژگانت شب ہجراں بحسرت می کنم، ۱۰۸، (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۵۶
(۶۴) یادِ نگہِ ناز کے شرابِ دوام است، ۱۰۵، سالنامہ دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۷۲
(۶۵) یہی جرمِ محبت کی سزا ہے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۶۹

محسن، محمد محسن: دل مرادِ البستہ ہر تارِ زلفِ یار ہے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۷۳

محسن احسان: سمجھا کے رکھ دے یہ کوشش بہت ہوا کی تھی، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۴۷
(۲) تکریم خم و سبو بہت ہے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۴۶
(۳) روشنیاں بدن بدن تیرے مرے لہو سے ہیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۰
(۴) سائے کی امید تھی تاریکیاں پھیلا گیا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۵۹
(۵) سرِ شکبِ خوں سرِ مژگاں کبھی پروئے نہ تھے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۱
(۶) عقل کہتی ہے کوئی ڈھونڈ مفر کی صورت، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۲
(۷) لفظ کاغذ پہ لکھا بار اذیت اترا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۴۹
(۸) مجھ پہ سورج کا ہے کچھ قرض چکانے دینا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۴۸
(۹) وہی خواب آنکھوں میں ڈال دے جو نشاطِ شامِ وصال دے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۳۷
(۱۰) یہ عروج رت ہے زوال کی، یہ زوال دن ہیں کمال کے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۳۸

محسن بھوپالی: زخم خوردہ تو اسی کا تھا سپر کیا لیتا، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۳۶
(۲) غلط تھے وعدے مگر میں یقین رکھتا تھا، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۰۶
(۳) وقت کے تقاضوں کو اس طرح بھی سمجھا کر، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۳۵

محشر بدایونی: سکوت کیسا جب اس طرح روح جلنے لگے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۵۵

محشر، مرزا کاظم حسین لکھنوی: دیر تک اُٹھ نہ سکا داں سے وہ دیوانۂ دوست، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰۴

(فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۹۲

(۴) پورب دیس کی ناری، ۳۳-۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۹۷

(۵) ٹھاکر صاحب، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۲۵

مدنی، حامد عزیز: آبادی کے دائرے، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۰۴-۱۰۶

(۲) اے عروسِ سخن، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۰۱

(۳) جرم، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۰۳

(۴) کوئی شاخ آشنا، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۰۷-۱۰۸

(۵) معذرت، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۰۲

مدہوش، سنت پرشاد: عشق کی رو میں کچھ اس طرح سے بہہ جاتے ہیں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۹۹

مراد شاہ، پیر: یہاں ہجر میں کوئی دم دیکھتے ہیں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۰

مروت، صغیر علی: کیوں تو نے وا کیا تھا بندِ قبا چمن میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۲۰

مسحور: سید دلبر حسن، اقبال، ۱۲۲ ا، اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۲۸۳

مسرور کاکوروی، شیخ میر بخش: دن وصل کے، رنجِ شبِ غم بھول گئے ہیں، غزل نمبر (ترمیم اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۸۶

مسعود حسن، ڈاکٹر: ابھی چمن میں کوئی فتنہ کار باقی ہے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۶۸

مشتری، قمر جان لکھنوی: مے ہے، گلزار ہے، ساقی ہے، گھٹا چھائی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۹

مصحف اقبال توصیفی: چاند نے اپنا دیپ جلایا، شام بجھی ویرانے میں، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۲۳

(۲) رائگاں، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۸۸

مصحفی، شیخ غلام ہمدانی: آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بے تاب سا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹

(۲) جی جائے گا رائگاں کسی کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰

(۳) خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۲

(۴) خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۲

(۵) سرِ شام اس نے منہ سے جو رُخِ نقاب اُلٹا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۹

(۶) سو سو طرح کا حادثہ تجھ پر گزر چکا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰

(۷) گر اس منہ سے برقع کبھی کھل گیا،

ملاّ، آنند نرائن، آہٹ، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۶۵

(۲) پتھر بھی پگھلتا ہے اپنا تو یہ ایمان ہے، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۸۸

(۳) پھر ان گردوں نشینوں کو زمیں کی بات کہنے دے، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۰۷

(۴) ترکِ ہر رسم کرو وجہ یہ کافی تو نہ تھی، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۰۶

(۵) تنظیمِ چمن کے عزم وہ سب وہ قول وہ پیماں بھول گئے، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۹۷

(۶) جن پاک نفس انسانوں میں کردار کی عظمت ہوتی ہے، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۹۸

(۷) جنوں کا دور ہے کس کس کو جائیں سمجھانے، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۹۶

(۸) چھائی سی دلوں کی دنیا پر اِس صبحِ خرد میں شام بھی ہے، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۱۹۸

(۹) چھپ کے دنیا سے سوادِ دلِ خاموش میں آ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۵

(۱۰) خود اپنی چشمِ تر ہی کو بنا لیتے ہیں جام اکثر، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۶۳

(۱۱) خورشید گہن سے چھوٹ چکا بدلی سے رہائی باقی ہے، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۵۸

(۱۲) دشتِ ظلمت میں ہے وہیں پہ ابھی، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۰۰

(۱۳) دل حرفِ ستائش سے یہ دشنام نہیں ہے، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۶۰

(۱۴) دل کی دل کو خبر نہیں ملتی، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۹۷

(۱۵) دوبارہ پائمالی، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۶۶

(۱۶) رفتہ رفتہ ایک آہنگ فغاں بنتا گیا، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۵۶

(۱۷) روشنی صبح کی ڈوبے ہوئے تاروں میں نہیں، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۵۷

(۱۸) زیست تاروں کی رہگذر بھی نہیں، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۸۹

(۱۹) ساحل نہ سزا دے مجھ کو کہ میں آسودۂ طوفاں ہو بھی چکا، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۰۵

(۲۰) ستم اکثر بہ عنوانِ کرم ایجاد ہوتا ہے، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۶۷

(۲۱) سنبھال ساقیِ محفل اب اپنے پیمانے، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۸۰

—— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۷۴

(۲۲) شبِ دنیا کا نیا جب بھی نظام آیا ہے، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۵۹

(۲۳) شب کی تاریکی تو ہاں کم ہے مگر کافی نہیں، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۰۲

(۲۴) صدائے دل ہی کو آوازۂ جہاں نہ کہو، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۵۴

(۲۵) طوفانِ دل ہے اب آرمیدہ، ۷۷-۷۸،

خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۰۴

(۲۶) علم وجاہ و زور و زر کچھ بھی نہ دیکھا جائے ہے، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۵۳

(۲۷) غزل سے خطاب، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۲۸

(۲۸) قطعات، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۶۴

(۲۹) کرب میں پھر ہے مادر عالم، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۶۲

(۳۰) کتنی کرنیں جو افق پر نور کا بنتی تھیں جال، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۶۳

(۳۱) کیوں نہ ہو ذکر محبت کا مرے نام کے ساتھ، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۹۹

(۳۲) گل کام نہ دے گی تری ناکردہ گناہی، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۰۳

(۳۳) مریم ثانی، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۶۷-۱۶۹

(۳۴) ملے گی سب کو مے سنتے ہیں محفل میں خبر آئی، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۵۵

(۳۵) نگاہ و دل کا افسانہ قریب اختتام آیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۵

(۳۶) نگاہیں پھیر لینے کا اگر دل کو شعار آئے، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۵۲

(۳۷) وہ چارۂ ستم روزگار کر نہ سکے، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۹۸

(۳۸) ہر لب پہ شعلہ نوائی ہے لیکن دل سوزاں کہتے ہیں، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۶۱

(۳۹) ہموار کیا یوں گلشن بھی ویرانے بناکر چھوڑ دئے، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۰۱

(۴۰) یوں نظر پہ پلکوں کے چھائے ہیں گھنے سائے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۲۹

ملّا دو پیازہ، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۲۴۳-۲۴۴

ملک، عبدالرشید، پیشکش بحضور اقبال، ۱۲۲ و اقبال نمبر (نومبر ۱۹۷۷ء) ۲۹۲

ممتاز: بہت دعوے کیے ہیں آگہی نے، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۳۲

(۲) عشق نے ظلم وہ ڈھایا ہے کہ جی جانے ہے، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۳۳

ممتاز، حافظ فضلو: ہزار مرتبہ دیکھا ستم جُدائی کا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۷۳

ممتاز حسین، سیّد: ایڈیٹر چاند کے نام، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۳۶۲-۳۶۴

ممتاز مرزا، بیگم: خوش نامیاں ہماری سر دار تک گئیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۴۹

(۲) دل کو صحرائے تمنّا سے گزر جانے دو، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۵۱

(۳) سواد شام کے منظر بڑے سہانے لگے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۵۰

(جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۹۵
(۵) جب تو مری نگاہ میں آکر مچل گیا ، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۲۶
(۶) حسن کا دان لٹانے والے! اک نظر ہم پر بھی ٹھیرے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۸ء) ۲۸۱
(۷) گیت ، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۱۰۴
(۸) لالہ و گل کی آنکھ تر دیکھی ، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۶۴
(۹) نکلتے تھے کیا سوچ کے دل میں دیوانے ویرانے سے ، ۱۰۶ ، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۹۲
(۱۰) ہر روز ہی دن بھر کے جھمیلوں سے نمٹ کے ، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۹۸
(۱۱) وصل کی شب بھی غمیں بیٹھے ہیں ، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۲۷
(۱۲) ہوگا کیا چاند نگر سوچتے ہیں ، ۱۰۵ ، سالنامہ دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۴۶۲
منظر ایوبی : ہر اک خلوص کا پیکر ہو، آشناؤں میں ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۵۶
منظر مفتی : زندگی شور ہے تماشا ہے ، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۲۰۲
منظور ، چودھری منظور احمد : کل قیس کے لب پر تھی اب میری زبانی ہے ، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۶
منظور عارف : عذرا ، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۹۰
منیب الرحمٰن : اگر ..... ، ۱۰۵ ، سالنامہ ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۵۲
(۲) ایک نظم ، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۹۱
(۳) خون بہا ، ۱۰۵ ، سالنامہ ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۵۳
(۴) قطرہ ، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۹۵
منیر سراج : دل سے اب تو نقشِ یادِ رفتگاں بھی مٹ گیا ، ۱۲۴ ، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۸۳
(۲) وہی ستارہ جو بجھ گیا ہم سفر تھا میرا ، ۱۲۴ ، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۸۲
منیر ، سید اسمٰعیل حسین شکوہ آبادی : آمد تصور بت بیداد گر کی ہے ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۴۲۳
منیر نیازی : اشارے ، ۶۱-۶۲ ، سالنامہ (جنوری ، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۸۸
(۲) بھوتوں کی بستی ، ۳-۴-۷ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۶۳
(۳) درخت بارش میں بھیگتے ہیں ، ۱۳۲ ، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۴۷۵
(۴) دن ڈھلے ، ۲۹-۳۰ ، پنج سالہ نمبر (فروری ، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۱۲
(۵) دو گیت ، ۲۷-۲۸ (نومبر ، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۱۷
(۶) دوری ، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۲۴
(۷) شراپ ، ۶۷-۶۸ ، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۳۰
(۸) میرے دشمن کی موت ، ۸۴ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۱۰
(۹) طلسم خیال ، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۶۸

غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۴

(۶) دیوان میر (نسخۂ محمود آباد مخطوطہ ۱۲۰۳ھ بہ حیاتِ میر) مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ۱۲۵، میر تقی میر نمبر ۱ (اکتوبر ۱۹۸۰ء) ۱۷۷-۴۶۵

(۷) دیوان میر تقی (فارسی)، ۱۳۱، میر تقی میر نمبر ۳ (اگست ۱۹۸۳ء) ۲۸۸-۴۶۲

(۸) دیوان میر (فارسی)، مرتبہ ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی، ۱۳۱، میر تقی میر نمبر ۳ (اگست ۱۹۸۳ء) ۳۵-۲۲۷

(۹) عمر بھر ہم رہے شرابی سے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷

(۱۰) غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۵

(۱۱) فقیرانہ آئے صدا کر چلے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۷

(۱۲) میر کے ہم مضمون فارسی اردو شعر، منتخب کردہ مسعود حسن رضوی ادیب، ۱۳۱، میر تقی میر نمبر ۳ (اگست ۱۹۸۳ء) ۲۲۹-۲۳۸

(۱۳) نہ گیا خیالِ زلفِ سیہ جفا شعاراں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶

(۱۴) ہستی اپنی حباب کی سی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۸

(۱۵) یارو! مجھے معاف رکھو، مَیں نشے میں ہوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۹

میرا جی: ایک گیت، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۶۲

(۲) غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۷

———— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۶۳

(۳) گیت، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۲۱

(۴) ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا، بیٹھ اکیلے رونا ہوگا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۳۷

میکش اکبر آبادی: ادھر سے کون یہ گزرا ترا خیال لیے، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۷۳

(۲) اک اضطرابِ مسلسل کی دل کو خوشی ہے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۴۷

(۳) تیری محفل سے کچھ اس حال میں ہم آتے ہیں، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۸۸

(۴) جنگ میں بھی اک صلح کا پہلو، صلح میں بھی اک جنگ کی آن، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۰۳

(۵) حسن ہی حسن ہے ہستی میں رعنائی ہی رعنائی، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۴۹

(۶) رات اس محفل کا عالم کیا کہوں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۶۲

(۷) سچ بتا اہلِ چمن کو میں کبھی یاد آیا؟، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۷۹

(۸) سحرِ چمن میں گلوں کی ہنسی بھی کام آئی، ۸۱-۸۲،

(جون ۱۹۶۰ء) ۱۳۶
(۹) کچھ سمجھا کسی نے کچھ کسی نے، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۸۰
(۱۰) کس کس طرح سے زینتِ کون و مکاں رہے، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۰۴
(۱۱) کلائی اس کی دلوں کی طرح دھڑک بھی گئی، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۹۸
(۱۲) مجھے چمن میں جو آتی ہے عمرِ رفتہ یاد، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۶۹
(۱۳) مجھے قسم ہے تری اس حسین کملا پہ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۲۴
(۱۴) مرے غم کے لیے اس بزم میں فرصت کہاں پیدا، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۰۶
(۱۵) وضع کا پاس کہاں تک کرتے ہم تو پھر دیوانے تھے، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۱۲
——— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۴۷۶
(۱۶) یہ جہاں ایک نظر، اور نظر کچھ بھی نہیں، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۵۰
(۱۷) یہ رنگ و نور بھلا کب کسی کے ہاتھ آئے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۶۰

مینائی، ادریس احمد: طریق سروری سیکھا ہے طغرل سے نہ سنجر سے، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۰۱

ن

نامعلوم: سناٹا، ۸۰ (مئی ۱۹۶۱ء) ۲۴۳-۲۴۵

ناز، نور جہاں: طے نیم جاں کا آج بھی جھگڑا نہ ہو سکا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۵۳
ناسخ، امام بخش: اس ابر میں یار سے جُدا ہوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۳
(۲) تو مجھ سے ہو ہم کنار قاصد، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۰
(۳) دل میں پوشیدہ تپِ عشقِ بتاں رکھتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۱
(۴) روز ہے گرمیٔ بازار ترے کوچے میں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۲
(۵) رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۳
(۶) ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۹
(۷) سب ہمارے لیے زنجیر لیے پھرتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۱
(۸) کیوں دکھائی اے فلک! بے یار صبح، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۰
(۹) مجھ کو اب ساقیٔ گلفام سے کچھ کام نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۸۲
(۱۰) مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغ ہجراں کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۷۹
ناصر زیدی: اپنا اندازِ سخن سب سے جُدا رکھتے ہیں، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۶۸
(۲) تجھ کو یہ وہم ہے کہ وہ تیری نظر میں ہیں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۹۲

(۳) جب کبھی شعلۂ غم سلسلہ جنباں ہوگا، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۳۶۸

(۴) ہم عجب سلسلۂ سیر و سفر رکھتے ہیں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۹۱

ناصر شہزاد: بیتے کئی جنم، کٹیں صدیاں، برس گنے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۹۳

(۲) حسرتِ عہدِ وفا باقی ہے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۹۲

(۳) دھیان کس سرسوتی کا لاگا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۹۲

(۴) ذہن نہیں کوئی — مدعا کیسا، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۳۲

(۵) مصطفےٰ زیدی، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۳۱

ناصر کاظمی: آہ پھر نغمہ بنا چاہتی ہے، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۷۶

(۲) حسن کہتا ہے اک نظر دیکھو کر، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۷۹

(۳) خواب میں رات ہم نے کیا دیکھا، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۳۴

(۴) دن پھر آتے ہیں باغ میں گل کے، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۵۸

(۵) دور رس تیرہ خاکداں سے دور، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۹۳

(۶) رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۸۰

(۷) زہر غم آ چلا ہے راس بہت، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۱۸۷

(۸) سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۰

(۹) سر مقتل بھی صدا دی ہم نے، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۹۵

(۱۰) سفرِ منزلِ شب یاد نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۰

(۱۱) عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۳۲

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۹

(۱۲) کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۷۵

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۱

(۱۳) کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۶۱

(۱۴) کہاں گئے وہ سخنور جو میرِ محفل تھے، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۰۸

(۱۵) ممکن نہیں متاعِ سخن مجھ سے چھین لے، ۵۵-۵۶ (مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۱۷

(۱۶) وا ہوا پھر درِ میخانہ گل، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۹۲

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۵۹

——— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۷۰۴

(۱۷) ہرادا آپ رواں کی لہر ہے ، ۳۲-۳۴ (اگست ، ستمبر ۱۹۵۴ء) ۵
ناطق گلاؤ ٹھوی: ڈھونڈتی ہے اضطراب شوق کی دنیا مجھے ، ۴۱-۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۶
(۲) کیا ارادے ہیں وحشت دل کے ، ۴۱-۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۶
ناطق لکھنوی ، حکیم سعید احمد کھجی: امان دل پر داغ مایوسی نہیں آیا ، ۴۱-۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۵
(۲) کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا در رہے ، ۴۱-۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۱۵
ناظم ، میر ناظر حسین لکھنوی: نور کا تیرے ازل سے آفتاب آئینہ تھا ، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۶
ناظم ، نواب محمد یوسف علی خاں: یہ نے کہا کہ دعوٰی الفت مگر کہ غلط ، ۴۱-۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۲۳
نثار ، محمد امان: کیا جامۂ پھلکاری اس گل کی پھبن کا تھا ، ۴۱-۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۲۵
نثار احمد فاروقی: اللہ نہ استا بھی کوئی مجبور محبت ہو جائے ، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۰ء) ۲۰۴
(۲) طالعوں میں لکھی تھیں رسوائیاں ، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۰ء) ۲۰۵
(۳) ہائے در د مجبوری خود ہی ہو گیا کم بھی ، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۰ء) ۲۰۶

نثار احمد فاروقی (مرتب) : بیاض غالب ، ۱۱۳ ، غالب نمبر ، حصہ دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء) ۹-۳۱۲
نثار جلالی ، شدتِ غم سے یہاں ضبط کا یارا بھی نہیں ، ۱۰۵ ، سالنامہ ، دوسرا حصہ (اپریل ، جون ۱۹۶۶ء) ۴۶۱
نجم آفندی: ہستی کوئی ایسی بھی ہے انسان کے سوا اور ، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۶۱
نجم نقوی: نرجی بھلتا ہے کچھ غم سے نہ دل کو احساس ہے خوشی کا ، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۸۵
نجیب اسلم: اُدھر کچھ اجالے ، اُدھر چند سائے ، ۱۰۲ ، (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۳۶
نخشب جارچوی: کوئی کس طرح رازِ الفت چھپائے ، ۴۱-۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۲۸
ندرت ، شبیب احمد میرٹھی ، نالۂ دل کی صدا ، دیوار میں ہے ، در میں ہے ، ۴۱-۴۲ ، غزل نمبر (مئی ، جون ۱۹۵۴ء) ۳۲۵
ندیم ، شاعر ، آخری داؤ ، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۱۲۲
(۲) اعتراف ، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۵۹-۳۶۰
(۳) پہرے ، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۶۳
(۴) جاگتا سوتا موسم ، ۹۶ ، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۲۱
(۵) جب چراغوں کی لویں سوتی ہیں ، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۶۲

(۶) رخصت، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۶۱
(۷) روشنی کے پاتو، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۸۳
(۸) لتا منگیشکر، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء)
۱۳۰-۱۳۱

ندیم قاسمی، احمد: آگیا راس شکستوں کا شمار آخر کار، ۹۰
(اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۱۹
(۲) آج کی شب تم نہ آپائے، مگر اچھا ہوا، ۱۰۲
(مئی ۱۹۶۵ء) ۱۹۹
(۳) آنے والے منظروں کی نذر، ۱۲۲، سالنامہ
(جنوری ۱۹۷۷ء) ۶
(۴) اپنی آنکھوں میں بسالی تری حیرت میں نے،
۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۷۹
(۵) حسن تخلیق، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۲۱
(۶) اضداد، ۳۱-۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۷۶
(۷) افریقہ، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۶۹
(۸) افق تہاں ہے تو حدِ نظر کا ذکر کریں، ۴۱-
۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۲
(۹) اہلِ ثروت پر خدا نے مجھے سبقت دے دی،
۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۷
(۱۰) ایک صدا، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۴۲-۱۴۳
(۱۱) ایک کہانی، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ
(اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۳۴۷
(۱۲) ایک منظر، ۶۹-۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء)
۱۸۶
(۱۳) بارش، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر
۱۹۵۹ء) ۱۶۱

(۱۴) بگاڑ ہو کہ بناؤ، عجیب ترے سبھاؤ، ۴۱-
۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۳
(۱۵) بہار جب بھی چمن میں دیئے جلاتی ہے،
۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء)
۲۳۴
(۱۶) پھر بھیانک تیرگی میں آئے، ۴۱-۴۲،
غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۴
(۱۷) پھول ہیں گلشن میں کچھ خوابیدہ کچھ بیدار سے،
۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۱۹۳
(۱۸) پھولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہوا دیکھوں، ۹۴
(جولائی ۱۹۶۲ء) ۹۵
(۱۹) تو بہ عنوانِ حیا یاد آیا، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء)
۹۵
(۲۰) تیری محفل میں مداوا نہیں تنہائی کا، ۷۳-۷۴
(مئی ۱۹۵۹ء) ۱۳۵
(۲۱) تین نامکمل غزلیں، ۶۱-۶۲، سالنامہ
(جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۶۱
(۲۲) ثبوت حق، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء)
۱۷۴
(۲۳) جدید انسان، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء)
۱۱۸
(۲۴) جس ذوق جستجو میں اترا ہوں آسماں سے،
۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۸۶
(۲۵) جنگل، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۲۴
(۲۶) حسن گریزاں، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۳۱
(۲۷) خود فریبی کے کتنے نکل آتے ہیں پہلو، ۵۷

۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۹۰

(۵۶) مجھے دُکھ یہ ہے کہ بہار میں بھی طیور بے پر و بال ہیں، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۳۸۷

(۵۷) محبت، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۲۶

(۵۸) مختصر نظمیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۷۵

(۵۹) مروں، تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں،

(۶۰) مری شکست، ۲۷ - ۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۰۰ - ۱۰۱

(۶۱) مرے سبو میں مری زیست کا لہو تو نہیں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۲

(۶۲) مشرق و مغرب، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۳۱۲ - ۳۱۴

(۶۳) میں آپ اپنا جواب اور آپ اپنی نظیر، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۷۷

(۶۴) میں اس فریب ہی میں رہا مبتلا سدا، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۶۸

(۶۵) میں زندۂ جاوید باندازِ دگر ہوں، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۷۰

(۶۶) میں کب سے گوش بر آواز ہوں پکارو بھی، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۳۳

(۶۷) نارسائی کی قسم، اتنا سمجھ میں آیا، ۸۱ - ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۳۰

(۶۸) نذرِ فن کارانِ وطن، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۸۸

(۶۹) نغمۂ انساں، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۸۰

(۷۰) وہی نقش روبرو ہے، وہی عکس چارسو ہے، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۰۳

(۷۱) ہجر و وصال، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۱۹۲

(۷۲) ہوا، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۱۶

(۷۳) ہوائے شب تو نہ تھی، صرف خشک پتے تھے، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۷۲

(۷۴) یہ عجب شب ہے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۳۳

(۷۵) یہ ستارے، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۷۸

(۷۶) یہاں سے وہاں تک، ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۵۷

(۷۷) یوں تمہارا طرزِ مجبوبی تو معصومانہ تھا، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۲۷

(۷۸) یُوں تو کہنے کو ہے بدن بھی یہی، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰) ۲۱۷

نازک، زینت بیگم، کوچہ میں کوئی سسکے، کوئی در پہ مرے ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۵۰

نزاکت، بسکہ رہتا ہے یار آنکھوں میں، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۴۸

نسیم، حمید، محبت جادہ ہے منزل نہیں ہے، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۳۹

نسیم، دیا شنکر، حبب ہو چکی شراب، تو میں مست مر گیا، ۴۱ - ۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۷

(۲) غم نہ بن کر خود غرض ہو جائیے، ۴۱ - ۴۲،

(۱۶) ریزہ ریزہ، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۵۹
(۱۷) سترھویں کا چاند، ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء)
۱۰۷-۱۰۹
(۱۸) سحر سے پہلے، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر
(فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۱۹۸-۲۰۰
(۱۹) شاہراہیں پابرید راہگیروں سی لگیں، ۱۱۵،
(دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۱۶
(۲۰) شکارِ گردشِ لیل و نہار وہ بھی تھے، ۱۲۴،
سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۱۸
(۲۱) غروب، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری فروری
۱۹۵۷ء) ۱۸۳
(۲۲) غمِ جہاں، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۰۶
(۲۳) فرار، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۴۷
(۲۴) کب سے ویراں ہے زیست کی محفل، ۵۷
-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء) ۱۵۱
(۲۵) کٹہرے میں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ
(اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۰۱-۳۰۲
(۲۶) مجھے قیام نہیں ہے، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء)
۱۹۶
(۲۷) موجۂ غم کو تمنا کا سمندر کہہ کر، ۱۰۵،
سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء)
۳۰۳
(۲۸) نہ سو سکا ہوں نہ شب جاگ کر گزاری ہے،
۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۱۴
(۲۹) ہتھیلیوں پہ لیے اپنے سر گئے ہیں لوگ،
۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۳۷

(۳۰) ہر گھڑی قیامت تھی، یہ نہ پوچھ کب گزری،
۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء)
۱۸۲
(۳۱) میرا شہر، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء)
۱۰۸-۱۰۹
(۳۲) نہ جانے ہم انہیں کیسے گذار آئے ہیں،
۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۸۴

نظر، قیوم، آل برشگال، ۵۷-۵۸ (جون ۱۹۵۶ء)
۱۵۰
(۲) اِس شہر ریت آلود میں، ۱۲۹، عصری ادب
نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۲۱-۴۲۲
(۳) اس کے گیسو، ۱۲۹، عصری ادب نمبر
(ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۱۹-۴۲۰
(۴) بکھرے گیسو اڑتی تانیں، ۱۲۹، عصری
ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۴۲۳-۴۲۴
(۵) تبدیلی، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء)
۱۰۵
(۶) حاصلِ زیست ہی سہی جلنا، ۱۰۵، سالنامہ،
دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۹۱
(۷) رخصت، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء)
۸۶
(۸) شہر آشوب، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-
دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۴۹-۲۵۱
(۹) غلط کہ حسن کو لاکھوں اداشناس ملیں، ۱۰۷،
(مئی ۱۹۶۷ء) ۱۵۷
(۱۰) کیا اس سے سوا ہو زندگی میں، ۱۰۵،

سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء)
۳۹۰

(۱۱) کیوں بیٹھ گئے غبار سے ہم، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۶

(۱۲) ماتھے پہ ٹیکا صندل کا اب دل کے کارن رہتا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۴۶

(۱۳) مختصر یہ کہ وُہ تھے جانِ ستم، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۰۳

(۱۴) نہ سہی کوئی نہ تجھ سا ملتا، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۲۱

(۱۵) واپسی، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۴۸

(۱۶) ہر طرف اٹھیں گے ہنگامے بہت، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۲۱۹

(۱۷) یہ پھول، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۷۰۳

نظر حیدر آبادی: حضورِ دوست غزل خواں ہوئے ہیں جب بھی ہم، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۷۶

(۲) ساقی بکنار و جام بکف، رقصاں و گل افشاں ملتے ہیں، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۲۰۶

نظر لکھنوی، نوبت رائے: کاروبارِ عشق کی کثرت کبھی ایسی نہ تھی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۲۶

نظم طباطبائی، علی حیدر: یہ آہِ بے اثر کیا ہو، یہ نخلِ بے ثمر کیا ہو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰۱

(۲) کسی سے بس کہ امید کشود کار نہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۰۱

نظیر، اصغر حسین خاں: تاریخ میں جب تک مرا افسانہ رہے گا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۳

نظیر اکبر آبادی: تاب اس کے دیکھنے کی نہ لائے چلے گئے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۵۳

(۲) جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۵۳

(۳) دُور سے آئے تھے ساقی، سُن کے میخانے کو ہم، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۵۱

(۴) کبھو دیکھوں نہ سنبل باغ کو میں، مجھے اس خم زلفِ دوتا کی قسم، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۵۰

(۵) کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشکِ چمن، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۵۱

(۶) کلالِ گردوں اگر جہاں میں، جو خاک میری کو جام کرتا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۵۰

(۷) کیوں نہ ہو بام پہ وہ جلوہ نما تیسرے دن، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۵۲

(۸) لیتا ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۵۲

(۹) ملا آج وُہ مجھ کو چنچل چھبیلا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۹

——— ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۳۷۱

(۵) ایک اجنبی لڑکی، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۷۳

(۶) ایک حادثہ، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۲۰۶-۲۰۷

(۷) بال بکھراتے ہوئے کوئی دل کے حرم سے نکلا، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۱۹۷

(۸) ایک ہی شہر میں، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۱۲-۱۱۳

(۹) بے کل سا ہو گیا ہوں، ہواؤں کے شور سے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۵۲

(۱۰) تجھے مشہور ہونا تھا مجھے بدنام ہونا تھا، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۸۸

(۱۱) تم سے بچھڑے تو کہیں دل کو لگایا ہی نہیں، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۵۷

(۱۲) تم گلشن گلشن ہنستے رہو ہم شبنم شبنم روئیں گے، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۴۵

(۱۳) تمام رات ہوا چیختی رہی بن میں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۳۹۷

(۱۴) جگمگ جگمگ اس کی آنکھیں میرا سینہ جلتا تھا، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۱۳

(۱۵) جنم جنم کے ساتھی، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۱۷۷

(۱۶) چڑھتے سورج کی پجاری دنیا، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۹۱

(۱۷) چھلکنے لگا ہے ترانغم بہت، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۸۵

(۱۸) دل کے صحرا میں کوئی آس کا جگنو بھی نہیں، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۰۹

(۱۹) روح چٹخی ہوئی جسم در کا ہوا، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۹۰

(۲۰) ریشم کی تلوار، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۹۴

(۲۱) زخموں کا اک باغ ہے جس میں رونے کی تنہائی ہے، ۷۳-۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۱۵۶

(۲۲) زلزلہ آیا وہ دل میں وقت کی رفتار سے، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۲-۱۶۳

(۲۳) زندگی میرے تلون سے وفا مانگتی ہے، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۹۶

(۲۴) سرو ہی، سنگ وہی، لذتِ آزار وہی، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۸۹

(۲۵) سرحد، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۰۵

(۲۶) سلگ رہی ہے تری چشم التفات ابھی، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۸۴

(۲۷) سنگِ دشنام کو گوہر جانا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۶۷

(۲۸) شاخ شاخ پہ موسم گل نے گجرے سے لٹکائے تھے، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۱۳۷

(۲۹) شہر یاروں کے غضب سے نہیں ڈرتے یارو!

(۲) کوئی نہ چاہنے والا تھا حسن رُسوا کا، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۸۹

وزیر لکھنوی، چلا ہے او دلِ راحت طلب! شادماں ہو کر، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۵

(۲) سر مرا کاٹ کر پچھتایئے گا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۸۵

وسیم، سید محمد عسکری خیر آبادی، تیر آئیں دل میں اک دن کے لئے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۰۱

وفا، پنڈت میلارام: التفاتِ عام ہے وجہ پریشانی مجھے، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۳

وفا، حکیم عبد الہادی علی خاں رام پوری: پھر رگِ شعلۂ جاں سوز میں نشتر گزرا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۲۲۸

وفا، محمود عالم: ٹھہر جا اے دلِ مضطر ذرا آہ و فغاں کر لوں، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۲۱

وفا، نول رائے: عارض پہ تمہارے یہ پسینا، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۴۹۱

وقار خلیل: آرزو نے نگرِ یار سے آگے نہ بڑھی، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۹۶

(۲) یُوں بھی جینے کی تمنا میں جیا جائے ہے، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۲۲۲

ولا، مظہر علی، ہرگز نہ گریں اس سے اشک اثر آلودہ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۴۲۹

ولی: سید شاہ ولی الرحمٰن کاکوی (بہاری): حسن صبیح ہے غضب قہر ہے گیسوئے دراز، غزل نمبر (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)، طبع چہارم (اکتوبر ۱۹۸۵ء) ۵۱۹

ولی دکنی، محمد ولی اللہ: ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۲

(۲) جسے عشق کا تیر کاری لگے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۲

(۳) خوب رو خوب کام کرتے ہیں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱

(۴) سرودِ عیش گاویں ہم، اگر وہ عشق ساز آوے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳

(۵) صنم میرا سخن سوں آشنا ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۳

(۶) فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہُوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰

(۷) کیا مجھ عشق کوں ظالم نے آب آہستہ آہستہ، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۱

(۸) میں تجھے آیا ہوں ایماں بُوجھ کر، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹

(۹) میں عاشقی میں تب سوں افسانہ ہو رہا ہُوں، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۰

(۱۰) یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۹

(مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۴

(۶) رنگ لاتی ہے آخر ایک جنبشِ لب کیا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۱

(۷) کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۴

(۸) لذتِ زندگی مبارکباد، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۲

(۹) مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۰

(۱۰) مزاج آپ کا دنیا سے کچھ کشیدہ سہی، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۳

(۱۱) ہنوز زندگی تلخ کا مزا نہ ملا، ۴۱-۴۲، غزل نمبر (مئی، جون ۱۹۵۴ء) ۱۶۰

یوسف جمال انصاری: آج ہوائے صبح بہاراں لے کر آئی کس کا سلام، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۱۱۳

(۲) اے جانِ جاں، جانِ جہاں، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۶۹ء) ۲۲۶

(۳) برسوں عشق و جنوں کے ہاتھوں جیب و دامن چاک ہوئے، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۳۱

(۴) بکھرا آگئی، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۱۶۹

(۵) پھر تشنۂ شوق سازِ جاں ہے، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۱۳۹

(۶) حسن و صہبا سے دل ہوا جو گداز، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۱۲۴

(۷) زخم کھلتے ہوئے درد چمکا ہوا، ۱۰۵، سالنامہ دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۴۳۲

(۸) سسکیاں بھرتی ہوئی موسمِ گل کی ہوا، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۹۸

(۹) کان وہ گونج کی جھنکار پہ دھرتا ہی نہیں، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۳۷۸

(۱۰) کس کو سُدھ بدھ ہے تن من کی، کس کو ہے اپنا چاؤ یہاں، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۱۷

(۱۱) کسی اور جنم کا سپنا ہے وہ تیرے میرے پیار کی بات، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۷۰

(۱۲) گل و شبنم ہوں، ترا خون پسینہ جیسے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۹۶

(۱۳) میں تو سمجھا تھا ترے فیضِ نظر سے زندگی، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۵۲

(۱۴) یک گونہ بیخودی بھی کہاں ہے شراب میں، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۶ء) ۲۷۸

شخصیات (بشمول آپ بیتی)

(اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۱۲۱۷ — ۱۲۲۵

اثر لکھنوی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم، مرتبہ احراز نقوی (جون ۱۹۶۴ء) ۱۳۷۲ — ۱۳۷۵

(۲) ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، ۵۹ — ۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۹۴۹ — ۹۵۰

احتشام حسین: جوش ملیح آبادی، ۴۷ — ۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۶۱۶ — ۶۲۴

(۲) ڈاکٹر سید احتشام حسین، ۵۹ — ۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۱۰۴۵ — ۱۰۵۱

احراز نقوی (مرتب): آپ بیتی اثر لکھنوی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۳۷۲ — ۱۳۷۵

احسن فاروقی، ڈاکٹر: صاحبِ طرز شخصیت نگار، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۱۴۸ — ۱۵۵

احسن مارہروی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۴۰۶ — ۱۴۰۷

احمد سرہندی، امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ: آپ بیتی (اپنے مکتوبات کی روشنی میں)، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۳۲۴ — ۳۳۰

احمد سعید (مترجم): آپ بیتی جان کیٹس (اپنے خطوط کی روشنی میں)، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۹۷۳ — ۹۸۳

(۲) آپ بیتی جارج برنارڈ شا، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۸۳۱ — ۱۸۳۴

احمد شجاع، حکیم: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۰۴۶ — ۱۰۵۸

احمد فاروقی، ڈاکٹر خواجہ: مولانا حامد حسن قادری، ۴۷ — ۴۸، شخصیات نمبر (جنوری ۱۹۵۵ء) ۲۸۰ — ۲۸۴

اختر، پنڈت ہری چند: جوش ملسیانی، ۵۹ — ۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۹۵۱ — ۹۵۵

اختر، جاں نثار: مہندر ناتھ، ایک یاد، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۴۵۶ — ۴۵۹

اختر، محمد خالد: شفیق الرحمٰن، ۴۷ — ۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۴۴۸ — ۴۵۸

اختر، واجد علی شاہ: آپ بیتی، تلخیص از نثار احمد فاروقی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اوّل (جون ۱۹۶۴ء) ۲۲۹ — ۲۴۸

اختر، علی اختر: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۳۴۵

اختر انصاری دہلوی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۲۹۴ — ۱۳۰۲

اختر اورینوی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۰۹۷ — ۱۱۰۱

اختر جہاں: شوکت تھانوی، جب قاضی جی ہوتے، ۹۰، شوکت نمبر (ستمبر ۱۹۶۳ء) ۵۶۶ — ۵۶۹

اختر شیرانی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۴۲۸ — ۱۴۲۹

اخلاق حسین، بیگم: چودھری محمد علی ردولوی، ۴۷ — ۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۳۵۴ — ۳۵۸

ب

بہادر علی حسینی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۳۸۲

بیج ناتھ، جج: آپ بیتی، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۵۷۰ - ۵۷۱

بیدل، عبدالقادر: آپ بیتی، تلخیص از نورالحسن انصاری، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۴۴۱ - ۴۴۴

بیدی، راجندر سنگھ: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۶۶۷ - ۱۶۷۴

پ

پرکاش پنڈت: دیوندر ستیارتھی، ۴۷ - ۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۴۳۶ - ۴۴۰

پریم چند: آپ بیتی، مرتبہ عظیم الشان صدیقی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۱۸۳ - ۲۰۸

پریم ناتھ در: غلام عباس، ۴۷ - ۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۶۵۵ - ۶۵۷

پیغامات (پطرس — پروفیسر احمد شاہ بخاری کی وفات پر) ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۶۳۲ - ۶۳۴

اس میں جن کے پیغامات درج ہیں، ان کے نام درج ذیل ہیں: خلیفہ عبدالحکیم، حفیظ جالندھری، خواجہ منظور حسین اور سید عابد علی عابد۔

ت

تاثیر، بیگم: ڈاکٹر تاثیر، ۴۷ - ۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۵۸۵ - ۵۸۸

تاج، سید امتیاز علی: شوکت تھانوی، ۹۹، شوکت نمبر (ستمبر ۱۹۶۳ء) ۵۰۳ - ۵۱۰

تاجور نجیب آبادی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۴۵۰ - ۱۴۵۴

تبسم، صوفی غلام مصطفےٰ: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۰۹۳ - ۱۰۹۶

(۲) پطرس، ۴۷ - ۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۶۰۹ - ۶۱۵

(۳) پطرس بخاری مرحوم، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۷۹ - ۸۸

تسلیم لکھنوی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۵۰۳

تمکین کاظمی: حیدر آباد کی چند شخصیتیں، ۵۹ - ۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۱۲۳۷ - ۱۳۱۱

تیمور گورگانی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۸۵۳ - ۸۶۰

ٹ

ٹراٹسکی: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۶۰۰ - ۱۶۲۳

ٹیگور، رابندر ناتھ: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۶۷۹ - ۱۶۸۲

ث

ثاقب کانپوری: دیا نرائن نگم، ۵۹ - ۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۸۳۷ - ۸۴۲

ثاقب لکھنوی، میرزا: آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۴۷۱ - ۱۴۷۲

ج

ز

س

شرر، محمد عبدالحلیم : آپ بیتی، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۵۶۴-۵۶۵

شروانی، محمد حبیب الرحمٰن خاں : آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۶۴۸-۱۶۵۵

شکیب، نجم الدین : پنڈت برج نرائن چکبست، ۵۹-۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۸۲۴-۸۲۸

شکیلہ اختر : آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۲۵۲-۱۲۵۷

(۲) اختر اورینوی، ۵۹-۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۱۰۷۲-۱۰۸۵

شمس تبریز خاں (مرتب) : آپ بیتی شیخ الاسلام حسین احمد مدنی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۶۴-۲۷۶

شمس الدین خواجہ : عشرت لکھنوی، ۵۹-۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۱۴۲۹-۱۴۳۲

شمس تبریز خاں (مرتب) : آپ بیتی مولانا عبیداللہ سندھی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۴۲۰-۱۴۲۷

شمیم، مظفر حسین : منٹو مر گیا، منٹو زندہ ہے، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۶ء) ۲۱۳-۲۱۸

شوق قدوائی، احمد علی : آپ بیتی، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۵۶۶-۵۶۷

شورش کاشمیری، آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۲۱۱-۱۲۱۷

(۲) چودھری افضل حق، ۵۹-۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۸۵۴-۸۵۸

(۳) حمید نظامی، ۵۹-۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۱۲۲۶-۱۲۲۹

(۴) عطاء اللہ شاہ بخاری، ۵۹-۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۱۲۱۴-۱۲۱۶

(۵) ظفر علی خاں، ۴۷-۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۵۹۵-۶۰۳

(۶) ظفر علی خاں، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۴۴۴-۴۵۳

شوکت تھانوی : آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۶۴۴-۱۶۵۴

(۲) اے۔ ایس۔ بی، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۶۹-۷۲

(۳) حجاب امتیاز علی، ۴۷-۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۶۵۸-۶۶۰

(۴) سید امتیاز علی تاج، ۵۹-۶۰، شخصیات نمبر ۲ (اکتوبر ۱۹۵۶ء) ۹۹۱-۹۹۴

(۵) لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں، ۴۷-۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۵۳۲-۵۴۸

(۶) میری سرگزشت، ۹۹، شوکت نمبر (ستمبر ۱۹۶۳ء) ۷-۸

شوکت سبزواری : آپ بیتی، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ دوم (جون ۱۹۶۴ء) ۱۱۵۰-۱۱۶۱

(۲) عندلیب شادانی، ۴۷-۴۸، شخصیات نمبر ۱ (جنوری ۱۹۵۵ء) ۳۵۹-۳۶۵

شوکیہ تھانوی : پیارے ابا شوکت تھانوی، ۹۹، شوکت نمبر (ستمبر ۱۹۶۳ء) ۴۶۰-۴۶۲

ع

گ

ل

م

ن

مکاتیب

مکاتیب

ا

آرزو، رضا بلگرامی: ایک خط بنام نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵ ـــ ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۷۹۶ ـ ۷۹۷

آرزو، مختار الدین احمد: ایک خط بنام خلیل الرحمٰن اعظمی، ۶۵ ـ ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۰۰۲ ـ ۱۰۰۴

(۲) ایک خط بنام ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۶۴ ـــ ۴۶۶

آرزو لکھنوی: ایک خط، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۳۱

(۲) ایک خط بنام محمد علی خان اثر، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۶۵ ـ ۵۶۶

(۳) ایک خط بنام مولانا صفی لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۴۷

(۴) ایک عکسی خط، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۷۸

(۵) ۵ خطوط بنام محمد علی خان اثر رامپوری، سید مسعود حسن رضوی اور شفا گوالیاری، ۶۵ ـ ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۶۸۱ ـ ۶۸۴

(۶) ۴ خطوط بنام محمد علی خان اثر، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۶۲ ـ ۵۶۴

آزاد، ابوالکلام: ایک خط بنام اختر جمال، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۲۵

(۲) ایک خط بنام بیگم حسرت موہانی، ۶۵ ـ ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۹۷۰ ـ ۹۷۱

(۳) ایک خط بنام مالک اخبار دار السلطنت، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۷۶ ـــ ۴۷۷

(۴) ایک عکسی خط بنام اختر جمال، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۵

(۵) ۵ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۴ ـ ۳۶

(۶) ۵ خطوط بنام نواب سید علی حسن خان، سید افتخار عالم، مالک رام، مولوی عبدالرزاق کانپوری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل ـ مئی ۱۹۶۸ء) ۳۹۱ ـ ۳۹۴

آزاد، اظہر علی: ایک خط بنام منشی محمد دین فوق، ۶۵ ـ ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۷۹۵ ـ ۷۹۶

اثر لکھنوی: ایک خط بنام محمد طفیل، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۳۷۲ - ۳۷۵

(۲) ایک خط بنام محمد طفیل، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۶

(۳) ایک خط بنام اختر انصاری دہلوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۰۶ - ۵۰۷

(۴) ایک خط بنام عطا آصفی، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۱۰۰۰-۱۰۰۱

(۵) ایک خط بنام مولانا صفی لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۴۸

(۶) ایک عکسی خط بنام شفقت کاظمی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۹۳

(۷) ۳ خطوط بنام ڈاکٹر احراز نقوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۰۰ - ۵۰۵

(۸) ۲ خطوط بنام کسریٰ منہاس، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۱۰-۴۱۱

اجمل خاں، حکیم: ۲۸ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۴-۳۳

(۲) ۶ خطوط بنام نواب وقار الملک، نواب محسن الملک، مولانا شوکت علی، غلام رسول مہر، نواب سید علی حسن اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۳۸۶ - ۳۸۹

احتشام حسین، سید: ایک خط بنام اختر انصاری دہلوی، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۱۰

(۲) ایک خط بنام جگن ناتھ آزاد، ۱۰۸، (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۳۵

(۳) ایک خط بنام ممتاز شیریں، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۱۰۰۵ - ۱۰۰۶

(۴) ایک خط بنام نادم سیتاپوری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۵۳ - ۴۵۴

احسن فاروقی، محمد: ایک خط بنام محمد طفیل، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸

احسن مارہروی: ایک خط بنام محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۷۱

(۲) ایک خط بنام مسعود حسن رضوی ادیب، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۵۰

(۳) ۲۶ خطوط بنام مولوی بشیر الدین، محمد دین فوق، محمد اظہار الحسن، دل شاہجہانپوری، منشی مہیش پرشاد اور سید الطاف بریلوی ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۴۳۵ - ۴۵۴

احمد، خواجہ: ۲ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۳۳ - ۲۳۵

احمد جمال پاشا: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۰۶ - ۶۰۷

احمد حسین: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۷۳ - ۲۷۴

ادیب، سید مسعود حسن رضوی: ۲۹ خطوط بنام امتیاز علی عرشی اور مولوی ضیاء احمد بدایونی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۳۸ - ۲۵۳

(۲) ایک خط بنام ڈاکٹر سید عبداللہ، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۹۹۰ — ۹۹۱

(۳) ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۱۳

(۴) ۴ خطوط بنام نادم سیتاپوری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۴۶ - ۴۴۸

(۵) ۲ خطوط بنام کسریٰ منہاس، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۱۳ - ۴۱۵

ادیب سہارنپوری: ایک خط بنام احسن اللہ خاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۴۴ - ۵۴۵

اسعد گیلانی، سید: ۲ خطوط بنام محمد طفیل، ۱۳۰، رسول نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۶ - ۶۳۷

اسلم، ایم: ایک خط بنام اختر جمال، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۴۱ - ۵۴۳

اسلم جیراجپوری: ایک خط بنام عبدالعزیز کمال، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۹۵

(۲) خطوط بنام پروفیسر محمد مسلم، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۹۱۸

(۳) ۱۷ خطوط بنام پروفیسر مسلم عظیم آبادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۴۹ - ۴۵۷

(۴) ایک عکسی خط بنام پروفیسر مسلم عظیم آبادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۸۷

اسماعیل خاں، محمد: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۶۵

اسمٰعیل غزنوی، مولوی: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۷۳

(۲) ۲ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۸۷

اشفاق احمد: ۴ خطوط بنام واجدہ تبسم، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۲۶

آشفتہ لکھنوی: ایک خط بنام نادم سیتاپوری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۹۱

اشک، اوپندر ناتھ: ایک خط بنام ممتاز شیریں ۹۷، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۲۶ - ۵۲۷

(۲) ایک خط بنام ممتاز شیریں، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۰۲۰ — ۱۰۲۱

اشہر لکھنوی، پروفیسر آغا: ایک خط بنام ظریف لکھنوی۔ ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۷۹

اصغر گونڈوی: ۲ خطوط بنام عبدالماجد دریا بادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۸۳ - ۴۸۵

(۳) ایک خط بنام محمد یوسف قیصر، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۴۵-۳۴۶

(۴) ایک عکسی خط بنام آرزو لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۶۱

(۵) ۲ خطوط بنام منشی محمد الدین فوق اور مولوی بشیر الدین، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۰۳-۶۰۴

(۶) ۱۶ خطوط بنام مولوی بشیر الدین، محمد دین فوق، نواب سید علی حسن اور نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۹۹-۲۰۴

اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۳۰، رسول نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۵۱

اکبر الدین صدیقی، محمد: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۳۰، رسول نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۴-۶۴۵

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، مولانا: ۳ خطوط بنام منشی محمد دین فوق، الطاف علی بریلوی اور غلام رسول مہر، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۳۵-۸۳۷

اکرام علی، سید: ایک خط بنام عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۷۸

الٰہی بخش، محمد: ایک خط بنام سرسید احمد خاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۵۲

الفت پاشا، سید: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۷۲

الیاس برنی، محمد: ایک خط بنام شاہ حسین پھلواری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۸۰

امداد، سید عنایت حسین: ۲ خطوط بنام کسریٰ منہاس، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۰۱-۴۰۳

امیر حسین، سید: دو خطوط بنام سرسید احمد خاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۵۴-۱۵۵

امیر علی رضوی، جسٹس: ایک خط بنام سید خورشید علی، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء)

(۲) ایک خط بنام سید عباس حسن فصاحت، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۰۱-۸۰۲

امیر مینائی: ایک خط بنام دل شاہجہانپوری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۴۱

(۲) ایک عکسی خط بنام دل شاہجہانپوری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۴۶

(۳) ۳ خطوط بنام مولوی محمد نعیم الحق آزاد، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۲۳-۴۲۵

(۴) ۱۴ خطوط بنام منشی محمد عسکری وسیم، مرزا داغ دہلوی، دل شاہجہان پوری، منشی امتیاز احمد خاں اور احسن مارہروی، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۲۴-۱۲۹

(۵) ۲ خطوط بنام مختار شاہجہان پوری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۳۶-۳۳۷

ب

پ

ت

خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۷۴
(۴) ایک خط بنام محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۷۱-۵۷۲
(۵) ایک عکسی خط بنام مولانا صفی لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۸۲
(۶) ۷ خطوط بنام مولوی اظہار الحسن، میکش اکبر آبادی، مولوی ضیا احمد بدایونی، رضی احمد بدایونی، طاہر فاروقی اور شہناز ہاشمی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۰۵-۴۰۹

جلال لکھنوی: ۲ خطوط بنام نواب وقار الملک اور شاہ زین الدین ۶۵۰-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۱۸۰-۱۸۱

جلیس، ابراہیم: ایک خط بنام اختر انصاری دہلوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۱۴

جلیل مانکپوری: ایک خط بنام حسرت موہانی، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۸۱۰-۸۱۱
(۲) ایک خط بنام محمد علی خاں اثر، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۶۵.
(۳) ۷۶ خطوط بنام سید نور الحسن، حبیب الرحمٰن شروانی، حکیم برہم، راجہ شمشیر بہادر انگر، سید ریاض احمد ریاض، مرزا محمد عسکری، محمد یوسف نفیس، دل شاہجہانپوری، مولوی حامد علی، صفدر مرزاپوری، قاضی ظہور الدین ظہیر، محمد امین شیدا، سید تراب علی جمیل، مولوی مظہر علی نور، مسعود حسن مسعود، مولوی حفیظ الدین عنصر، عبد الوحید وحید، قاضی احمد علی صابری، ریاض الحسن سحر، مولوی عبد الغفور شرر، محمد ابراہیم ماہر القادری، جماعت علی الفت، افتخار علی جگر بسوانی، پنڈت رادھے بہاری لال مصرا، راجہ نرسنگ راج عالی، تصدق حسن صدق جائسی، محمد اسماعیل عالی، مجید العالم یاس، غلام حسین آفاق، ظہور الحسن ناظم، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، مولوی مقبول حسین، چودھری نبی جان، مولانا ابو الشرف مجددی، محمد یوسف خاں رام پور، مس اسماعیل حجاب، کسری منہاس، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۴۴-۳۷۹

جمیل مظہری: ایک خط بنام جگن ناتھ آزاد، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۳۷

جناح، محمد علی: ایک خط بنام حاتم علوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۲
(۲) ایک خط بنام راجندر پرشاد، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۰
(۳) ایک خط بنام حکیم محمد جمیل خاں (عکسی انگریزی میں)، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۲
(۴) ایک خط (انگریزی)، بنام حاتم علوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۸
(۵) ایک خط (انگریزی) بنام راجندر پرشاد، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۳

۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء)
۱۶-۲۴

(۶) ۱۰ خطوط بنام نواب سید علی حسن، غلام رسول مہر، مولانا شوکت علی، مولوی محمود احمد عباسی، غلام بھیک نیرنگ، اکبر الملک بہادر، مولوی محمد عرفان اور نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۳۳۶-
۳۳۹

جیلانی بانو: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۳

چ

چرچل، سرونسٹن: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۱۸

چھبیلے لال گوسوامی: ایک خط بنام عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء)
۴۸-۴۹

ح

حالی، الطاف حسین: ایک خط بنام محمد علی مہمان، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء)
۴۲۸-۴۲۹

(۲) ایک خط بنام نواب وقار الملک، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۱۴

(۳) ایک عکسی خط بنام نواب وقار الملک، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۱
-۴۲

(۴) ۳ خطوط بنام محسن الملک اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں، ۷۹، ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء)
۵۹۴-۵۹۵

(۵) ۲۶ خطوط بنام نواب محسن الملک، مولوی عبدالرحیم خاں، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، نواب سید علی حسن، مولوی بشیر الدین، عبداللہ حسینی حریف، مولوی قمر علی، سید افتخار عالم اور نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۳۷-۱۴۸

حامد حسن قادری: ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو، ایک خط بنام محمد طفیل ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۲۰۴-
۲۰۷

(۲) ایک عکسی خط بنام شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء)
۸۹

(۳) ایک خط بنام نثار احمد فاروقی، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۹۹۲
-۹۹۴

(۴) ۱۳ خطوط بنام امتیاز علی عرشی، ظہیر الدین علوی، ظہیر احمد صدیقی، ضیا احمد بدایونی، اثر رامپوری، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، محسن اثر، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۶۴-۴۷۴

حامد علی خاں: ۴ خطوط بنام شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء)
۳۶۹-۳۷۲

(۲) ایک خط بنام مولانا صفی لکھنوی، ۱۰۹،

خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۴۶

حامد علی، مولوی: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۷۴-۱۷۵

حامد میاں خاں: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۱۸

حبیب اللہ، نواب: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۶۲

حبیب الرحمٰن شروانی: ایک خط بنام سید مخدوم عالم، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۱۰-۶۱۳

(۲) ۴ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۱۱-۲۱۲

(۳) ایک خط بنام نواب وقار الملک، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۲۲

(۴) ایک عکسی خط بنام نواب وقار الملک، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۶۴-۶۵

(۵) ۲ خطوط بنام مولانا ظفر احمد عثمانی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۱۳-۴۱۹

(۶) ۱۲ خطوط بنام محمد دین فوق، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۸۲-۸۸۸

(۷) ۸۵ خطوط بنام سید مخدوم عالم، مولانا حالی، نواب وقار الملک، نواب رفعت یار جنگ، نواب سید علی حسن، علامہ عبدالعزیز میمن، ڈاکٹر محی الدین زور، مفتی شیر علی، نصیر الدین ہاشمی، ضیاء احمد بدایونی، امتیاز علی عرشی، نواب شمس الحسن، ڈاکٹر سید محمود، کیفی چڑیاکوٹی، مالک رام، غلام یزدانی، طاہر فاروقی، ہمایوں مرزا اور نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۲۶۲-۲۹۲

حجاب امتیاز علی: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۰۸-۶۰۹

(۲) ایک خط بنام محمود الحسن صدیقی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۴۳-۵۴۴

(۳) ایک خط بنام بیگم فصیح اللہ، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۰۲۵-۱۰۲۶

حسرت، چراغ حسن: ایک خط بنام خدیجہ مستور، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۰۲

(۲) ۴ خطوط بنام عبدالمجید سالک اور محمد ایوب اولیاء، ۶۵-۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۷۷۴-۷۷۷

حسرت موہانی: ۸ خطوط بنام شفقت کاظمی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۳۹-۴۴۲

(۲) ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹

خ

(۳) ایک خط بنام ہاجرہ مسرور، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۰۳ - ۵۰۵

خط، سیکرٹری آریہ سماج، لکھنؤ، بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۴

خلیق الزمان، چودھری، بڑا سانحہ، ۹۹، شوکت نمبر (ستمبر ۱۹۶۳ء) ۳۳۹

خورشید الحسن: ایک خط بنام محمود الحسن صدیقی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۰۸ - ۳۰۹

خیال عظیم آبادی، نصیر حسین خاں: ایک خط بنام پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۲۰ - ۶۲۳

(۲) ۱۰ خطوط بنام انوار احمد، پروفیسر محمد مسلم، مہاراجہ کشن پرشاد اور مسعود حسن رضوی، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۴۷۲ - ۴۷۸

(۳) ایک خط بنام پروفیسر مسلم عظیم آبادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۵۸

(۴) ایک عکسی خط بنام مولانا صفی لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۷

(۵) ۲ خطوط بنام پروفیسر اشہر لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۴۶ - ۳۴۷

خیر الانام خاں، مولوی: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۳۶

د

داغ دہلوی: ایک خط بنام محمد نعیم الحق آزاد، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۲۱ - ۴۲۲

(۲) ایک عکسی خط بنام نواب وقار الملک، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۴ - ۴۵

(۳) ۴ خطوط بنام نواب حسن علی خاں اور لقمان الدولہ دل، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۳۰ - ۱۳۱

(۴) ۴ خطوط بنام نواب وقار الملک، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۱۵ - ۳۱۶

(۵) ۲ خطوط بنام نواب حسن علی خاں، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۵۹۱

داؤد رہبر: ایک خط بنام جگن ناتھ آزاد، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۳۹ - ۲۴۰

داؤد غزنوی، مولانا: ۳ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۸۸

دل شاہجہانپوری: ایک عکسی خط بنام دل محمد فضا، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۸۴

(۲) ۸ خطوط بنام دل محمد فضا اور ضیا احمد بدایونی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۹۴ - ۴۹۹

(۳) ۶ خطوط بنام کسریٰ منہاس، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۹۳ - ۳۹۸

دیا نرائن نگم: ایک خط بنام احسن مارہروی، ۷۹ - ۸۰،

ڈ

ذ

ر

۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۶۴ - ۲۶۵

شاہد لطیف : ۲ خطوط بنام اختر انصاری دہلوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۰۷ - ۵۰۹

شبلی نعمانی : ۸ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۸۹ - ۱۹۲

(۲) ایک عکسی خط ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۳

(۳) ۱۵ خطوط بنام سید ممتاز علی اور نواب وقار الملک، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء)

(۴) ۳ خطوط بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور نواب علی حسن، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۰۱ - ۶۰۳

(۵) ۴۴ خطوط بنام مفتی شبیر علی، مولوی بشیر الدین، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، مولوی عبدالحق، نواب سید علی حسین خاں، وقار الملک، سید ہمایوں مرزا اور سید افتخار عالم، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۸۲ - ۱۹۸

شرر، عبدالحلیم : ۱۵ خطوط بنام ام محسنہ، ام فاطمہ، صدیق حسن اور حکیم محمد سراج الحق، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۱۴ - ۲۴۸

(۲) ایک عکسی خط بنام محمد صدیق حسن، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۷۳

(۳) ۱۰ خطوط بنام حبیب الرحمٰن شروانی، سید ہمایوں مرزا، نواب سید علی حسن، مولوی سید ممتاز علی، احسن مارہروی، مہاراجہ کشن پرشاد، ڈاکٹر محی الدین زور اور نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۲۱۴ - ۲۲۰

(۴) ۲ خطوط بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور نواب سید علی حسن، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۶۰۴ - ۶۰۶

شعیب قریشی : ۵ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۰۴ - ۱۰۵

(۲) ۴ خطوط بنام مولانا محمد عرفان، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۸۰ - ۴۸۲

شفق عماد پوری : ایک خط بنام کیفی چڑیا کوٹی، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۳۴

شمس الہدیٰ : ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۷۰

شمیم، شیو نرائن : ۳ خطوط بنام منشی محمد دین فوق، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۲۰ - ۸۲۱

شورش کاشمیری : ایک خط بنام تاجور نجیب آبادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۵۷

شوق، احمد علی : ایک خط بنام مولانا صفی لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۴۴

(۲) ایک عکسی خط بنام قیصر بھوپالی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۷۲

شوق، قدوائی، احمد علی : ۱۳ خطوط بنام افسر صدیقی امروہی،

۲۴۲ - ۲۴۳

عبدالغفار، قاضی: ۲۰ خطوط بنام پروفیسر محمد مسلم، مولانا عبدالماجد دریابادی، عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، مختارالدین آرزو، نصیرالدین ہاشمی، عبدالقادر دسنوی، وحید احمد خاں، شہاب الدین دسنوی، حمیدہ سلطان، مولانا محمد عرفان اور سید الطاف علی بریلوی، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۵ - ۳۱

عبدالغفار قاضی، ایک خط بنام اختر انصاری دہلوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۰۶

(۲) ایک خط بنام پروفیسر مسلم عظیم آبادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۷ - ۴

(۳) ایک عکسی خط بنام پروفیسر مسلم عظیم آبادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۷۶ - ۷۷

عبدالغفار، محمد: ایک خط بنام نادم سیتاپوری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۹۲

عبدالقادر، سر: ایک خط بنام مشتاق احمد خاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۶۸

(۲) ایک عکسی خط بنام نواب وقار الملک، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۶۲ - ۶۳

(۳) ۳۳ خطوط بنام مولوی بشیر الدین، مولوی حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر اقبال، مولانا عبدالعزیز، سید ہمایوں مرزا، ڈاکٹر محی الدین زور، صوفی غیرت قادری، بشیر النساء بیگم، آغا صادق، تمکین کاظمی، نصیر الدین ہاشمی اور نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۳۱۸ - ۳۳۵

(۴) ۲ خطوط بنام نواب وقار الملک، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۲۲ - ۳۲۴

عبدالقادر سروری: ایک خط بنام ممتاز شیریں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۲۲ - ۵۲۳

عبدالقادر قصوری، مولوی: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۲۳

عبدالقدوس ہاشمی: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۳۸

عبدالقدیر بدایونی، محمد: ۱۷ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۷۶ - ۱۸۲

عبدالقوی دسنوی، پروفیسر: ۲ خطوط بنام محمد طفیل، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۴۸ - ۶۵۱

عبدالماجد بدایونی، مولانا: ایک خط بنام شاہ حسین میاں پھلواری، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۳۸

(۲) ایک خط بنام جگن ناتھ آزاد، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۳۳

(۳) ایک خط بنام شاہ غلام حسین، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۷۸

(۴) ایک خط بنام ضیاء الدین احمد بدایونی،

۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۱۱
-۵۱۲

(۲) ایک خط بنام ممتاز شیریں، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۰۰۷

عنایت اللہ، مولوی: ایک خط بنام شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۲۴ - ۸۲۵

غ

غالب، اسد اللہ خاں: ۸ خطوط بنام چودھری عبد الغفور سرور، ذکی دہلوی، نواب امین الدین خاں، عزیز اللہ شاہ عزیز، نواب علاء الدین خاں علائی اور نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۰۵ - ۱۱۱

(۲) ۸ خطوط بنام چودھری عبد الغفور سرور، ذکی دہلوی، نواب امین الدین احمد خاں، عزیز اللہ شاہ عزیز اور نامعلوم مکتوب الیہ، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۵۷۷ - ۵۸۲

(۳) ۱۸ خطوط بنام قاضی عبد الجمیل جنون بریلوی و نجف علی خاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۶۵ - ۷۵

(۴) ۱۸ عکسی خطوط بنام قاضی عبد الجمیل خاں و جنون بریلوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱ - ۲۰

(۵) ایک خط بنام محمد عباس رفعت، ۱۱۳، غالب نمبر، حصہ دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء) ۳۳۶ - ۳۳۷

(۶) ۲ خطوط، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۲۰ - ۴۲۱

(۷) غالب کے سات فارسی خطوط (مکتوب الیہ کی بیاض سے)، تعارف و ترجمہ از سید وزیر الحسن عابدی، ۱۱۳، غالب نمبر، حصہ دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء) ۳۵۲ - ۳۷۱

غلام حسنین کنتوری، مولوی: ۵ خطوط بنام حبیب الرحمٰن شروانی اور سید افتخار عالم، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۶۱ - ۸۶۵

غلام السیدین: ایک خط بنام جگن ناتھ آزاد، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۳۴

(۲) ایک خط بنام زہرہ بلقیس، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۹۸۵ - ۹۸۶

(۳) ۳ خطوط بنام مولانا تاجور نجیب آبادی، صالحہ عابد حسین اور ڈاکٹر عابد حسین، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۲۸ - ۳۳۱

غلام عباس: ایک خط بنام محمد طفیل، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر، (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۴

(۲) ایک خط بنام ممتاز شیریں، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۰۱۴

(۳) ایک خط بنام ممتاز شیریں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۲۷ - ۵۲۸

غلام عباس، چودھری: ایک عکسی خط بنام محمود الحسن صدیقی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۷۹

ف

ق

ک

۱۹۶۸ء) ۱۲۲

کرشن، مہاشہ (ایڈیٹر پرتاپ): ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۹ - ۵۰

کرشن چندر: ایک خط بنام صمد شاہین، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۰۱۱ - ۱۰۱۲

(۲) ۲ خطوط بنام اختر جمال، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۳۹ - ۵۴۰

(۳) ۲ خطوط بنام ممتاز شیریں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۱۵ - ۵۱۷

کرشنا کانت مالویہ: ایک خط بنام عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۵ - ۵۶

کرم علی، محمد: ایک خط بنام عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۲۸ - ۲۲۹

(۲) خطوط بنام مولوی محمد سلامت اللہ، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۲۸ - ۲۳۰

کریم بخش: ایک خط بنام سرسید احمد خاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۵۳

کشفی شاہ نظامی: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۲۶ - ۲۲۷

کشن پرشاد، سر: ۱۳ خطوط بنام عماد الملک، نصیر حسین خیال، خواجہ حسن نظامی اور سبے نظیر شاہ، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۳۷۱ - ۳۷۷

کشن پرشاد کول: ۲ خطوط بنام سید مسعود حسن رضوی ادیب اور نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۱۲ - ۸۱۳

کفایت اللہ، شیخ: ایک خط بنام سرسید احمد خاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۵۴

کفایت اللہ، مفتی محمد: ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۰۰

(۲) ۳ خطوط بنام غلام رسول مہر اور دل محمد فضا، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۵۷۶ - ۵۷۸

کمال الدین، خواجہ: ایک خط بنام نواب مشتاق احمد خاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۶۰

(۲) ۳ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۲۲ - ۲۲۴

کیفی برجموہن دتاتریہ: ۲۱ خطوط بنام محمد دین فوق، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، طاہر فاروقی، آغا محمد صادق، حبیب کیفوی، مختار الدین آرزو، شفا گوالیاری، دل محمد فضا اور امتیاز علی عرشی، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد اول (نومبر ۱۹۵۷ء) ۵۳۴ - ۵۴۲

۴۷۱ – ۴۷۲

(۲) ۳ خطوط بنام ممتاز شیریں، ۶۵ – ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۱۰۳۶ – ۱۰۳۷

منصور، فیض اللہ: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۵۳

منیر الزمان اسلام آبادی: ۱۲ خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۱۹۲ – ۲۰۱

منیر شکوہ آبادی: ایک خط بنام سید محمد نوح شہیر، ۶۵ – ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۷۹۷ – ۷۹۸

مودودی، ابوالاعلیٰ: ایک خط، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۶۸ – ۵۷۰

(۲) ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۳۸

مودودی، ابوالخیر: ایک خط بنام مولانا سلامت اللہ، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۴۲ – ۲۴۳

مہر، غلام رسول: تعارف خطوط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، خطوط نمبر، حصہ دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۶ – ۸

(۲) ایک خط بنام عبدالعزیز کمال، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۹۷ – ۵۹۹

(۳) ایک خط بنام مختار الدین آرزو، ۶۵ – ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۹۸۰ – ۹۸۱

۴۔ ایک خط بنام نادم سیتاپوری، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۵۱

۵۔ ایک خط بنام محمد طفیل، ۷۵ – ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۵

(۶) ۲۰ خطوط بنام امتیاز علی عرشی، مختار الدین آرزو اور خدیجہ مستور، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۷۵ – ۵۰۰

مہر علی شاہ، پیر: ایک خط بنام محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۷۰

(۲) ایک خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۱۸ – ۲۱۹

مہجور، غلام احمد: ۳ خطوط بنام منشی محمد دین فوق، ۶۵ – ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۸۱۴ – ۸۱۶

مہدی افادی: ۳ خطوط بنام حمد یوسف قیصر، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۳۵۷ – ۳۵۹

مہدی افادی، بیگم: ۲ خطوط بنام معین الدین، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۶۴ – ۵۶۵

مہدی بیگم: ۲ خطوط بنام دل محمد فصا، ۶۵ – ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر، ۱۹۵۷ء) ۹۱۹ – ۹۲۰

مہدی حسن: ایک خط بنام سید افتخار عالم، ۶۵ – ۶۶،

ن

و

خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۴۶

(۲) ایک عکسی خط بنام مولانا صفی لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۸۳

وحشت کلکتوی: ۱۲ خطوط بنام وفا راشدی، شفا گوالیاری اور طاہر فاروقی، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۶۱۵ - ۶۲۱

وحشی شاہجہان پوری، ظہور احمد: ایک خط بنام نامعلوم مکتوب الیہ، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۳۷ - ۸۳۸

وحید الدین، فقیر سید: ایک خط بنام جگن ناتھ آزاد، ۱۰۸، (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۳۸

وزیر آغا: ایک خط بنام محمد طفیل، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۸

وقار الملک، نواب دیکھئے مشتاق حسین، نواب وقار الملک

وصل بلگرامی: ایک خط بنام علامہ محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد دوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۷۸

ہ

ہاجرہ مسرور: ایک خط بنام نصیر الدین ہاشمی، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۱۰۲۶

(۲) ایک خط بنام واجدہ تبسم، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۳۰

ہاشم رضا، سید: ایک خط بنام محمد طفیل، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۵

ہاشمی فرید آبادی، سید: ۲ خطوط بنام نواب مشتاق محمد خاں، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۴۶۴ - ۴۶۷

ہرچرن چاولہ: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۶۱۴ - ۶۱۵

ہکسلے، الڈوس: ایک خط بنام محمد طفیل، ۱۰۰، آپ بیتی نمبر، حصہ اول (جون ۱۹۶۴ء) ۲۳

ہمایوں، محمد شاہ دین (جسٹس): ۶ خطوط بنام مولانا حالی، نواب محسن الملک اور محمد دین فوق، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۹۰۸ - ۹۱۱

ہوش بلگرامی: ایک خط بنام مہاراجہ کشن پرشاد، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۸۱۱ - ۸۱۲

ہیمر شولڈ: ایک خط بنام محمد طفیل، ۷۵ - ۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۰

یہ خط انگریزی میں ہے۔

ی

یگانہ چنگیزی، ایک عکسی خط بنام دوارکا داس شعلہ، ۱۰۹، خطوط نمبر، جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۹۲

(۲) ۱۵ خطوط بنام مولوی ضیا احمد، دل شاہجہانپوری، راغب مراد آبادی، رفیق احمد بدایونی اور مالک رام، ۶۵ - ۶۶، مکاتیب نمبر، جلد دوم (نومبر ۱۹۵۷ء) ۷۰۱ - ۷۱۴

(۳) ۲۳ خطوط بنام حیدر بیگ، دوارکا داس شعلہ، من موہن تلخ اور آغا جان، ۱۰۹، خطوط نمبر،

جلد اول (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۲۴۹ - ۲۵۷
(۴۴) ۲ خطوط بنام میکش اکبر آبادی، ۱۰۹، خطوط
نمبر، جلد سوم (اپریل، مئی ۱۹۶۸ء) ۵۵۸

یوسف حسین خاں: ایک خط بنام جگن ناتھ آزاد،
۱۰۸ (دستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۳۴

افسانے، ڈرامے

(بشمول ناولٹ)

افسانے، ڈرامے

نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۴۹۶ – ۵۰۷

احسن فاروقی، ڈاکٹر: آسیب کا محل، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۲۷۶ – ۲۸۴

(۲) اس میں کیا ہے؟ ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۲۵۰ – ۲۶۲

(۳) اندر سبھا، ۳۷ – ۳۸ (جنوری ۱۹۵۴ء) ۱۸۰ – ۱۹۰

(۴) اسے زرتُو، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل – جون ۱۹۶۶ء) ۶۹۱ – ۶۹۷

(۵) بڑا تعجب، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۴۲۸ – ۴۳۴

(۶) بس ایک آدھا گھنٹہ، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۷۱ – ۲۹۰

(۷) جاہلِ ناطق، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر – دسمبر ۱۹۶۶ء) ۳۵۵ – ۳۵۸

(۸) چڑیلیں، ۸۵ – ۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۲۶۵ – ۲۶۹

(۹) حسنِ زن، حسنِ ظن، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۴۸۷ – ۴۹۴

(۱۰) خُون اور انگلیاں، ۱۱۷ (مئی ۱۹۷۲ء) ۶۶ – ۷۷

(۱۱) دھوکے باز، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۵۵ – ۹۲

(۱۲) قصہ قدیم و جدید کا، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۵۷ – ۵۶۰

(۱۳) ہنسی آ گئی، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۵۵۰ – ۵۵۹

(۱۴) یہ آپ کی رائے ہوگی، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۳۱۷ – ۳۳۴

احمد، ل: افسانۂ حقیقت، ۸۵ – ۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۱۲۸ – ۱۳۲

(۲) بیوی، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل – جون ۱۹۶۶ء) ۴۹۴ – ۵۲۷

(۳) پھنپیٹ، ۵۳ – ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۲۸۳ – ۲۸۸

(۴) داستانِ آرزو، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۱۱۹ – ۱۳۱

(۵) صنم تراش کا خواب، ۴۵ – ۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۶۵ – ۷۲

(۶) صنم تراش کا خواب، ۷۹ – ۸۰، ادبِ عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۸۳۱ – ۸۳۹

(۷) محبت بھی ہوتی، ۳۹ – ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۸۹ – ۹۷

(۸) نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۷۴ – ۳۷۶

(۹) ہیروشیما کی ایک لڑکی، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۲۴۱ – ۲۵۷

احمد، ل (مترجم): پیغمبرِ اخلاق (روسی) از میکسم گورکی، ۲۵ – ۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۲۴۹ – ۲۵۸

(۲) صد سالہ سفر از ولادیمیر ٹینڈریاکوف، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۲۹۷ – ۳۸۲

۵۳۸ — ۵۸۹
(۳) سانپ، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۴۰۰ — ۴۰۷
(۴) شیش محل، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء)
۵۵۸ — ۵۶۸
(۵) محبت کی جیت، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۳۹۹ —
۴۱۵
(۶) وصیت، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۳۹۴ — ۴۱۰
(۷) ہیرے کی چوری، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر ۔ دسمبر
۱۹۶۶ء) ۳۰۳ — ۳۲۰
حمد شریف: آدم کی تلاش، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۱۹۳ —
۱۹۷
(۲) اترن، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۵۴۵
— ۵۵۲
(۳) البیلے، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۲۲ — ۱۳۰
(۴) انتشار، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۲۳۲ — ۲۳۷
(۵) بے آباد جزیرے، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء)
۱۲۸ — ۱۶۵
(۶) جیجا بھائی، ۷۳ — ۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۳۱۰
— ۳۱۵
(۷) چن ماہی کا کھوہ، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء)
۲۸۱ — ۲۸۹
(۸) دو لکیریں (ناولٹ)، ۸۵ — ۸۶، افسانہ نمبر
(نومبر ۱۹۶۰ء) ۳۵۶ — ۴۲۷
(۹) دوسرا جنم، ۱۱۷ (مئی ۱۹۷۲ء) ۳۱۱ —
۳۱۴
(۱۰) راج دلارے، ۸۱ — ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء)
۲۳۷ — ۲۴۹
(۱۱) راجہ رانی، ۸۰ (فروری ۱۹۶۱ء) ۲۹۰ —
۲۹۸
(۱۲) رگِ سنگ، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۱۶۴ —
۱۶۸
(۱۳) رنگوں کا ڈبہ، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ
(اپریل ۔ جون ۱۹۶۶ء) ۱۰۸۳ — ۱۰۹۰
(۱۴) ریت کی دیوار، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء)
۲۳۱ — ۲۳۴
(۱۵) گھر میں اجنبی، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۰۹ —
۵۱۷
(۱۶) ماں، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۴۲۷ —
۴۳۳
(۱۷) مولوی غلام رسول، ۶۹ — ۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء)
۱۳۳ — ۱۳۹
احمد عباس، خواجہ: الف لیلہ ۱۹۵۶ء، یعنی پتھر کی سیج پر
ایک ہزار راتیں، ۵۷ — ۵۸ (جون ۱۹۵۶ء)
۸۴ — ۹۷
(۲) چاکلیٹ اور وقت، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۵۵
— ۱۶۳
(۳) چوراہا، ۶۹ — ۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۲۴
— ۳۳
(۴) دانے کی کہانی، ۸۵ — ۸۶، افسانہ نمبر
(نومبر ۱۹۶۰ء) ۶۳۰ — ۶۴۲
(۵) دو ہاتھ، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء)
۲۲۳ — ۲۴۰

(۳) پارو، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۴۳۶ - ۴۷۱
(۴) پرانی جڑیں، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۴۵۸ - ۴۶۹
(۵) تیس برس، ۶۹ - ۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۲۶ - ۱۳۲
(۶) چیر کے درخت، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۴۴۲ - ۴۵۸
(۷) چیونٹی اور ہنس راج، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۳۲۶ - ۳۳۱
(۸) حوا بیسویں صدی میں، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۲۳۵ - ۲۵۸
(۹) ڈائن، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۵۷۳ - ۵۸۹
(۱۰) راکھی، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۱۷۵ - ۱۹۱
(۱۱) سالگرہ کا کیک، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۶۹۱ - ۶۹۵
(۱۲) سنڈریلا، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۳۰۴ - ۳۱۶
(۱۳) کنواری، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۳۵۶ - ۳۸۲
(۱۴) گڑیوں کی نمائش، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۲۶۳ - ۲۷۲
(۱۵) گلدانی، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۱۷۲ - ۱۸۰
(۱۶) ہے تلخیِ ایام، ۱۰۵، سالنامہ، تیسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۱۰۶۱ - ۱۰۸۲
(۱۷) وراثت، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۱۸۱ - ۱۹۵

اختر حسین رائے پوری: مجھے جانے دو، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۵۶۹ - ۵۷۳

اختر ریاض الدین: ہوائی، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۳۶۵ - ۳۸۶

ادیب، میرزا: اجالوں کی گود میں، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۴۲۴ - ۴۵۱
(۲) ایک منزل کئی راستے، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۵۸۹ - ۶۲۶
(۳) خون اور انگلیاں، ۱۱۷ (مئی ۱۹۷۲ء) ۲۸۰ - ۳۰۰
(۴) دالان، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۶۷۰ - ۶۸۵
(۵) دردن تیرگی، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۳۹۷ - ۴۰۲
(۶) راکھ میں آگ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۹۳ - ۱۱۵
(۷) چند یادیں، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۸ - ۲۳
(۸) سزا، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء) ۲۴۶ - ۲۵۴
(۹) طوفان (موجودہ چین کا ایک شاہکار ڈراما)، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۶۸۹ - ۶۹۶
(۱۰) مائی پہاتاں، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر

۳۹۳

(۴) بینگن کا پودا، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۶۲۶-۶۲۹

(۵) پلنگ، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصّہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۵۲۸-۵۳۷

(۶) تبیا، ۳۳-۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۸۹-۱۲۰

(۷) تلون، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۲۱۲-۲۴۸

(۸) واسطے، ۸۵-۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۱۱۴-۱۲۷

اطہر لفٹننٹ کرنل: چاند اور محاذ، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۴ء) ۴۵۰-۴۵۶

اعجاز حسین بٹالوی: اس کی بیوی، اس کا خاوند، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۲۱۳-۲۱۸

(۲) جیل کے اندر جیل کے باہر، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۴۵۲-۴۶۲

(۳) دس پیسے میں بارہ، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۳۳۵-۳۴۳

اعظم کریوی: پریم کی چوڑیاں، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۳۱۵-۳۲۱

افسر، حامد اللہ: زندگی کا جوگ، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۳۴۱-۳۴۴

افضل حق، چودھری: نود پشیماں، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۲۰۹-۲۱۶

اقبال متین: زمین کا درد، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۴۵۰-۴۵۷

الطاف فاطمہ: ریشم کا کویا، ۱۱۷ (مئی ۱۹۷۲ء) ۳۰۱-۳۱۰

(۲) کریش کورس، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۴۶۳-۴۶۷

(۳) موجِ خون، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۲۹۶-۳۱۲

امجد حسین: تنکے کا سہارا، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۵-۲۰

امر سنگھ: آپٹکس، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۸۵-۹۶

(۲) آخری تنکا، ۸۵-۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۲۶۹-۲۸۴

(۳) اڑان اپنی اپنی، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۵۲۲-۵۴۴

(۴) بے جان گھڑیاں، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۷۳۳-۷۳۷

(۵) تھوہر، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۲۸۷-۲۹۸

(۶) میرا کی ماں، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۴۹۹-۵۰۸

امرت رائے: لاشیں، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۱۸-۵۲۰

انتظار حسین: آخری آدمی، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۱۲۷-۱۳۲

(۲) اجودھیا، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۹۳۸-۹۴۴

(۳) پلیٹ فارم، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۲۰۹ - ۲۱۹

(۴) پسماندگان، ۲۵-۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۱۴۵-۱۵۴

(۵) دیولا، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۹۴-۱۰۰

(۶) سیکنڈ راؤنڈ، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۴۵۸-۴۶۷

(۷) کٹا ہوا ڈبہ، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۹۰-۹۶

(۸) کچی بتولی، ۳۷-۳۸ (جنوری ۱۹۵۴ء) ۳۷۰-۳۷۸

(۹) مایا، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر: فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۳۶۰-۳۶۵

(۱۰) مجمع، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۹۲-۱۰۳

انتظار حسین (مترجم)، ایک ریل کا حادثہ (جرمنی) از ٹامس مان، ۲۵-۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۲۶۵-۲۷۱

انشاء، انشاءاللہ خاں: رانی کیتکی، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۹-۲۴

انوار احمد زئی: رنگ محل، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۴۳۰-۴۳۲

انوار حسن ہاشمی: چھبیس اور ایک از میکسم گورکی، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۴۱-۱۵۱

نور: خون، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء)

۶۸۰-۶۸۶

(۲) سفید جھوٹ، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۲۹-۵۷

(۳) کب ہوگا سویرا، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۲۵۸-۲۷۵

(۴) نقصان، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۳۲۱-۳۴۹

انور، سید، دفعہ ۱۴۴، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۱۸۹-۱۹۶

(۲) قربانی کا بکرا، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۲۵۷-۲۶۲

(۳) مقدس مریم، ۱۱۷ (مئی ۱۹۷۲ء) ۲۴۰-۲۷۹

انور سجاد: آج-۱۸، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۶۸۸-۶۹۰

(۲) نہ مرنے والا، ۸۵-۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۴۶۴-۴۷۰

(۳) کارڈیک دمہ، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۵۰۳-۵۰۶

(۴) ہوا کے دوش پر، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۶۵-۱۷۱

انور عظیم: اجنبی فاصلے، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۴۰۳-۴۲۹

(۲) ڈھلان، ۳۳-۳۴ (اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۱۴۷-۱۶۰

(۳) لڑھکتی چٹان، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر

پ

۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۲۲۹-۲۸۰

(۴) مارخائیم از آر۔ ایل اسٹیونسن، ۷۵-۷۶ (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۱۶۱-۱۶۴

ت

تاج، امتیاز علی، اصفہان کے تکبند، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۵-۱۸

(۲) اصفہان کے تکبند (ایک ریڈیائی تمثیل) ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۱۱۱-۱۱۲۶

(۳) تلی پھٹ گئی، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۵۷۹-۶۰۰

(۴) کہ عالم دوبارہ نیست، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۳۶۳-۳۷۰

تسنیم سلیم چھتاری: اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا، ۳۷-۳۸ (جنوری ۱۹۵۴ء) ۱۰۸-۱۳۰

(۲) ٹوٹ گیا اک تارا، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۷۷۳-۷۹۱

(۳) چارہ گر، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۹۳-۱۱۸

(۴) چارہ گر، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۹۳۵-۹۶۶

(۵) حسن انتخاب، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۹۶-۳۰۸

(۶) حیاتِ نو، ۲۵-۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۴۵-۶۳

تیرتھ رام فیروزپوری، ہڈیوں کا پنجر، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۱۸۴-۱۸۸

ٹ

ٹامس مان، ایک ریل کا حادثہ (جرمنی)، ترجمہ از انتظار حسین، ۲۵-۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۲۶۵-۲۷۱

ٹیگور: چترا، ترجمہ از حبیب اشعر، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۳۹۰-۴۰۱

ث

ثریا سلطانہ، سیدہ: زندہ لاش، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۳۳-۱۴۰

ج

جاوید اقبال: ہیلو، ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۱۲۷-۱۱۵۳

جاویدہ اخلاق: ایک تصویر، ایک پتھر، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۳۴۹-۳۶۸

(۲) دریے کا قیدی، ۸۵-۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۴۴۳-۴۴۹

(۳) سمندر کی لہریں، ۸۳-۸۴ (اگست ۱۹۶۰ء) ۲۱۷-۲۲۴

جلیس ابراہیم، بدچلن عورت، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۱۹۰-۱۹۹

(۲) ذلیل پیشہ، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۶۷-۷۵

(۳) زرد چہرے، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۷۵۹-۷۶۴

(۴) گوری عورت، کالا مرد، ۳۷-۳۸ (جنوری

۱۹۵۴ء) ۱۷۰ – ۱۷۹

جمیل قدوائی: بلی کے بچے، ۵۳ – ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۱۶۸ – ۱۷۱

جمیل الزمان: بہنا، ۶۱ – ۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۰۳ – ۱۰۶

(۲) لفٹ، ۶۹ – ۷۰ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) ۱۱۷ – ۱۲۰

جمیلہ ہاشمی: آہوئے آوارہ، ۱۱۹، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۷۴ء) ۲۰۴ – ۲۲۸

(۲) ثمر مورتی، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۶۷۴ – ۶۸۷

(۳) جادو نگری، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۳۰۷ – ۳۱۴

(۴) زہر کا رنگ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۶ – ۵۴

(۵) نگار وطن، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۲۲۹ – ۲۳۴

جینیت کھتری، ڈاکٹر: خون کا رشتہ (گجراتی)، ترجمہ از غلام حسین مصطفیٰ، ۲۵ – ۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۲۱۲ – ۲۲۰

جوان، کاظم علی و للو لال: سنگھاسن بتیسی، ۵۳ – ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۶۰ – ۶۴

جوشش، سلطان حیدر: طوق آدم، ۵۳ – ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۲۴۶ – ۲۵۲

جوگندر پال: باہر کے بھیتر، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۳۱۷ – ۳۲۳

(۲) بھوک پریت، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۱۹۲ – ۱۹۸

(۳) پاتال، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۳۴۴ – ۳۴۸

(۴) خود غرض، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۲۶۲ ۲۹۶

(۵) درگور، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۳۰۹ – ۳۱۸

(۶) رنگوں کا بھرم، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۴۳۹ – ۴۵۰

(۷) سواریاں، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۳۲۰ – ۳۲۵

(۸) سیارے، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۳۵۲

(۹) غروب، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۴۷۶ – ۴۸۲

(۱۰) کلب ٹائم، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر-دسمبر ۱۹۶۶ء) ۴۷۸ – ۴۹۰

(۱۱) کھارا پانی، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۲۰۳ – ۲۰۸

(۱۲) کھلونے، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۱۵ – ۱۱۹

(۱۳) مٹی کا ادراک، ۱۲۰ (مئی ۱۹۶۵ء) ۳۹۱ – ۳۹۶

(۱۴) ہوم میکرز، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۲۱۸ – ۲۳۱

چ

ح

(۳) بادل، ۸۵ - ۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۱۳۳ - ۱۳۷

(۴) چٹان، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۴۱۸ - ۴۲۷

(۵) خاندانی تصویر، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۱۱۹ - ۱۲۶

(۶) دو سورج، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۳۷۳ - ۳۷۴

(۷) سُو کھے پتے، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۷۷ - ۳۹۹

(۸) صنوبر کے سائے، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۴۰۳ - ۴۰۷

(۹) فرشتے ہی فرشتے، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۴۳۴ - ۴۳۷

(۱۰) یا دن شرے کا سٹیشن، ۶۱ - ۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۵۶ - ۶۴

(۱۱) یہ حادثے، ۲۵ - ۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۱۲۰ - ۱۲۵

(۱۲) یہ حادثے، ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۸۵۳ - ۸۵۹

حسرت، چراغ حسن: پربت کی بیٹی، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۲۲۰ - ۲۲۶

حسن عسکری: حرامجادی، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۵۸۵ - ۵۹۵

حسن علی خاں کشمیری، جعفر علی خاں و شدید الدین خاں: الف لیلہ، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۷۴ - ۹۲

حسن نظامی، خواجہ: شہزادے کا دربار میں گھسنا، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۱۹۴ - ۱۹۶

حشمی، جلیل: تیسرے سورج نے دیکھا، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۲۰۳ - ۲۰۷

(۲) دل کی روشنی (منظوم افسانہ) ۸۷ (فروری ۱۹۶۱ء) ۲۷۱ - ۲۸۹

حفیظ احسن: آخری نذرانہ، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۷۲۶ - ۷۳۴

(۲) کہ بس پاک ہو گئے، ۱۱۵ (دسمبر ۱۹۷۰ء) ۳۶۱ - ۳۷۱

(۳) گلاب کی قلم، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۱۲۰ - ۱۳۸

(۴) معانقہ، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۴۲۰ - ۴۲۴

(۵) یقین، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۷۳۵ - ۷۴۱

حفیظ رومانی: ضرورت ہے، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۴۲۰ - ۴۲۶

حمید اسے: پھول سو گئے، ۴۳ - ۴۴، مع ضمیمہ غزل نمبر (جولائی، اگست ۱۹۵۴ء) ۶۰ - ۷۰

(۲) پھول گرتے ہیں، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۱۹ - ۱۴۰

(۳) تاریک صلیب اور زرد چاند، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۱۷۸ - ۱۹۱

(۴) ڈاچی والیا، ۲۳ - ۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۱۰۱ - ۱۱۴

(۵) راون کے دیس میں، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر

خ

(۶) دھرتی، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۴۵۱ - ۴۵۵

(۷) رسٹ واچ، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۳۱۳ - ۳۱۹

(۸) روشنی کے آنچل، ۸۵ - ۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۲۷۰ - ۲۷۸

(۹) سرحد کی بیوی، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء) ۲۹۶ - ۳۰۲

(۱۰) گزرے لمحوں کی چاپ، ۱۱۴ (جولائی ۱۹۷۰ء) ۱۵۹ - ۱۷۱

(۱۱) مرد، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۱۶۹ - ۱۷۴

رامانند ساگر: آب حیات، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۸۴۲ - ۸۴۹

راہی، قیوم: حصار، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۶ء) ۵۰۷ - ۵۱۸

رتن سنگھ: آخری خواہش، ۸۹ (اگست ۱۹۶۱ء) ۲۲۸ - ۲۳۰

(۲) ایک لمحے کا خدا، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۳۳۲ - ۳۳۴

(۳) باپ، ۸۵ - ۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۴۲۸ - ۴۳۲

(۴) تھکے ہوئے لمحے، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء) ۲۳۸ - ۲۴۲

(۵) دھوپ بیمار ہے، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۲۶۹ - ۲۷۱

(۶) شام کے ساتھی، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۴۵۶ - ۴۵۸

(۷) غم ایک عمر کا، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۸۳۰ - ۸۳۱

(۸) مریم، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۰۷ - ۱۱۱

(۹) ہزاروں سال لمبی رات، ۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۵۰۷ - ۵۰۸

رحیم گُل: پچانس، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۲۵۴ - ۲۵۹

(۲) طوفان، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۶۶۰ - ۶۶۶

رُسوا، مرزا محمد ہادی: شریف زادہ، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۱۲۱ - ۱۳۰

رستے، ہائنز: خدائی فیصلہ، ترجمہ از منیر الدین احمد، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۸۰۳ - ۸۰۵

رشید احمد صدیقی: میر مرحوم عجب بھاکوٹی، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۲۳۸ - ۲۴۱

رشید جہاں: دلی کی سیر، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۴۷۱ - ۴۷۲

(۲) نئی مصیبتیں، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۵۸۱ - ۵۸۴

رضیہ فصیح احمد: پچھتاوا، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۴۸۹ - ۴۹۲

(۲) خود غرض، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۳۳۳ - ۳۴۰

(۳) لینڈ سلائیڈ، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر

۱۹۵۵ء) ۹۵۳ - ۹۵۶

سرور، رجب علی بیگ: فسانۂ عجائب، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۶۹ - ۷۳

سعدیہ نسیم: مجھے جلنے دو، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۲۸۱ - ۲۹۸

اسلام مچھلی شہری، توشب آفریدی چراغ آفریدم، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۲۹۳ - ۳۰۹

(۲) شکنتلا، ۴۵ - ۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء) ۳۵ - ۵۱

سلمان سعید: ابو، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۲۵۷ - ۲۶۰

سلمیٰ صدیقی: ایک تھا لڑکا، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۲۷۳ - ۲۸۶

(۲) بھروسہ، ۹۷ (مارچ ۱۹۶۳ء) ۱۷۷ - ۱۹۱

(۳) مٹی کے دیئے، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۶ء) ۴۶۴ - ۴۷۲

(۴) نامہ بر، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۱۳۲ - ۱۳۷

سلمیٰ عنایت: ڈوب ڈوب کے ابھری ناؤ، ۹۰ (اکتوبر ۱۹۶۱ء) ۲۳۴ - ۲۶۲

سلیم اختر، ڈاکٹر: بھن پھول، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۲۲۰ - ۲۳۴

(۲) ضبط کی دیوار، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء) ۳۲۳ - ۳۶۰

(۳) کانا چور، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۹۰ - ۱۰۳

سہیل عظیم آبادی: الاؤ، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۳۵ - ۴۴

(۲) بھابھی جان، ۳۷ - ۳۸ (جنوری ۱۹۵۴ء) ۱۳۱ - ۱۳۶

ش

شاد، عرفان علی: ڈوبتے ابھرتے اجالے، ۱۱۷ (مئی ۱۹۷۲ء) ۳۱۵ - ۳۲۱

شاہد احمد دہلوی: چور، ۲۱ - ۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۷۶ - ۸۵

شاہد احمد دہلوی (مترجم): درخت از ایلی نیئر مارجیون، ۳۱ - ۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۹۷ - ۱۱۸

(۲) کلیمن جارو کی برف (امریکی) از ارنسٹ ہمینگوے، ۲۵ - ۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۳۲۱ - ۳۴۰

(۳) مردے از جیمس جوئس، ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۱۳۱ - ۱۶۵

شاہد حمید: تنہا گرستن (انگریزی) از کیتھرائن مینفیلڈ، ۲۵ - ۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۲۵۹ - ۲۶۴

شرر لکھنوی، عبدالحلیم: دل دنیا، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۱۱۸ - ۱۲۰

شرون کمار ورما (مترجم): چاچا (بنگالی)، ۳۱ - ۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء) ۱۸۳ - ۱۹۰

(۲) ریت کی دیوار (بنگالی) از پربودھ کمار سانیال، ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۱۶۶ - ۱۸۳

(۳) ہیرے کی انگوٹھی (بنگالی) از نریندر متر، ۲۵ - ۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء)

ص

ض

ط

ظ

ع

کرتار سنگھ: اسے سٹڈی ان بورڈم، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۴۵۹ - ۴۶۲

کرشن چندر: آدھے گھنٹے کا خدا، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۲۸۹ - ۲۹۸

(۲) ایک دوست کی موت، ۹۶، سالنامہ (جنوری ۱۹۶۳ء) ۳۳۷ - ۳۴۹

(۳) پانی کا درخت، ۲۹ - ۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری، مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۴۹ - ۲۵۸

(۴) پرتو، ۶۷ - ۶۸، دس سالہ نمبر (جون ۱۹۵۸ء) ۱۱ - ۱۸

——— ۷۹ - ۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۷۲۸ - ۷۳۵

(۵) پیاسا، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۵۳ - ۲۷۸

(۶) تائی ایسری، ۸۵ - ۸۶، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۰ء) ۶۴ - ۷۶

(۷) ٹھنڈا کوٹھا، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۲۹ - ۱۳۶

(۸) جوگی، ۹۱ (دسمبر ۱۹۶۱ء) ۵ - ۱۲

(۹) دانی، ۹۵ (اکتوبر ۱۹۶۲ء) ۵ - ۱۶

(۱۰) زندگی کے موڑ پر، ۵۳ - ۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۴۷۸ - ۵۰۰

(۱۱) سرتاج، ۹۳ (مئی ۱۹۶۲ء) ۵ - ۱۶

(۱۲) سو روپے، ۱۹ - ۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۵ - ۱۰

(۱۳) شہزادہ، ۸۸ (مئی ۱۹۶۱ء) ۱۰۵ - ۱۱۸

(۱۴) قمیص، ترجمہ از اسلم شیخ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء) ۷ - ۱۲

(۱۵) کتے کی موت، ۴۳ - ۴۴، مع ضمیمہ غزل نمبر (جولائی، اگست ۱۹۵۴ء) ۲۱ - ۳۵

(۱۶) کوکھ کی کونپل، ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۱۳۷ - ۱۴۳

(۱۷) کوئی مسافر، کوئی منتظر، ۲۵ - ۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۳۴۱ - ۳۴۹

(۱۸) گفتگو، ۳۹ - ۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۸۱ - ۸۸

(۱۹) بولی، ۸۱ - ۸۲ (جون ۱۹۶۰ء) ۱۸۹ - ۱۹۴

(۲۰) مسکرانے والیاں، ۷۷ - ۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۹ - ۱۳

(۲۱) نیا گھر، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۱۱۷ - ۱۳۲

(۲۲) گل مہر، ۶۳ - ۶۴ (جون ۱۹۵۷ء) ۵ - ۹

کشمیری لال ذاکر دیکھئے ذاکر، کشمیری لال

کوثر چاندپوری، انجام بخیر، ۱۰۶، خاص نمبر (اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۶ء) ۴۶۱ - ۴۶۳

(۲) ید بیضا، ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۳۹۷ - ۴۰۲

کھانڈیکر، وی۔ ایس، خلش (مرہٹی)، ترجمہ از نذیر احمد، ۳۵ - ۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۲۰۷ - ۲۲۶

گ

گالز وردی، جان: سیب کا درخت، ترجمہ از پطرس،

۸۵-۸۸
ممتاز شیریں (مترجم)، ایک پرانی کہانی (کنٹری) از ماستی
وینکٹیش آئینگار، ۲۵-۲۶، افسانہ نمبر
(ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۳۰۸-۳۲۰
ممتاز مفتی: آپا، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء)
۵۵۳-۵۶۰
——— ۱۰۲ (مئی ۱۹۶۵ء) ۲۹۰-۲۹۳
(۲) افسر، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء) ۱۹۴
-۲۰۳
(۳) اَن پورنی، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر
۱۹۸۲ء) ۶۲۷-۶۳۴
(۴) اُونی اللہ، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۲۱-
۳۶
——— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل
۱۹۶۰ء) ۸۴۰-۸۵۲
(۵) ایلینز، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۱۵۵-
۱۶۳
(۶) پرانی شراب نئی بوتل، ۱۲۴، سالنامہ
(جنوری ۱۹۷۹ء) ۲۴-۳۳
(۷) چارگوشت، ۴۵، ۴۶ (ستمبر، اکتوبر
۱۹۵۴ء) ۵۲-۶۰
(۸) دھند، ۶۷-۶۸، دس سالہ نمبر (جون
۱۹۵۸ء) ۱۲۲-۱۳۷
(۹) ریت کا تودا، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء)
۴۱-۴۷
(۱۰) روغنی پتلے، ۱۲۲، سالنامہ (جنوری
۱۹۷۷ء) ۲۲۷-۲۳۸
(۱۱) ثریا، ۵۱-۵۲ (جولائی ۱۹۵۵ء) ۶۴
-۷۱
(۱۲) صرف آپ کے لیے، ۳۵-۳۶ (اکتوبر،
نومبر ۱۹۵۳ء) ۱۳۰-۱۳۹
(۱۳) عورتیں ہی عورتیں، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء)
۲۳۳-۲۴۵
(۱۴) عینی اور عفریت، ۱۳۲، سالنامہ (جون
۱۹۸۵ء) ۳۶۶-۳۷۴
(۱۵) کند، ۱۰۷ (مئی ۱۹۶۷ء) ۲۴۲-
۲۶۱
(۱۶) گڑیا گھر، ۴۳-۴۴، مع ضمیمہ غزل نمبر
(جولائی، اگست ۱۹۵۴ء) ۴۰-۴۷
(۱۷) گھر کی عزت، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء)
۱۱۱-۱۱۶
(۱۸) لوک ریت، ۹۳ (مئی ۱۹۶۲ء) ۱۷-۷۹
——— ۱۲۲، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۷ء) ۴۲۱
-۴۷۸
(۱۹) لٹی کا پل، ۲۵-۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر،
اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۸۴-۹۲
(۲۰) میرا گھر، ۲۹-۳۰، پنج سالہ نمبر (فروری،
مارچ ۱۹۵۳ء) ۲۷۷-۲۸۵
(۲۱) وقار محل کا سایہ، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی
۱۹۷۳ء) ۳۹۷-۴۰۶
(۲۲) وہ، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری ۱۹۷۹ء)
۴۲-۴۸

منٹو، سعادت حسن، آمنہ، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۲۸-۳۲

(۲) اس منجدھار میں، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۱۷۷-۲۰۱

(۳) افشائے راز، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۲۳-۲۷

(۴) انارکلی، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۸۹-۹۲

(۵) ایک زاہدہ، ایک فاحشہ، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۷۴-۷۸

(۶) بابو گوپی ناتھ، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۱۵۳-۱۶۲

(۷) بارش، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۱۹-۲۲

(۸) بائی بائی، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۷-۹

(۹) بجلی پہلوان، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۷۱-۷۳

(۱۰) بدتمیزی، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۵۱-۵۵

(۱۱) بڈھا کھوسٹ، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۸۴-۸۸

(۱۲) بس اسٹینڈ، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۴۱-۴۴

(۱۳) بلونت سنگھ مجیٹھیا، ۳۵-۳۶ (اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء) ۱۱۵-۱۲۲

(۱۴) بیگن، ۴۳-۴۴، مع ضمیمہ غزل نمبر (جولائی، اگست ۱۹۵۴ء) ۳۶-۳۹

(۱۵) پشاور سے لاہور تک، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۶۶-۷۰

(۱۶) پھسپھسی کہانی، ۳۹-۴۰ (مارچ ۱۹۵۴ء) ۱۰۳-۱۱۰

(۱۷) تصویر، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۳۳-۳۶

(۱۸) تعلیمی فلم، ۱۹-۲۰ (اپریل ۱۹۵۱ء) ۱۴۱-۱۴۷

(۱۹) ٹوبہ ٹیک سنگھ، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۱۷۲-۱۷۶

(۲۰) جان محمد، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۱۵-۱۸

(۲۱) چور (غیر مطبوعہ)، ۶۱-۶۲، سالنامہ (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ۱۵۲-۱۵۶

(۲۲) حماقت، ۲۷-۲۸ (نومبر، دسمبر ۱۹۵۲ء) ۱۷۱-۱۷۴

(۲۳) خدا کی قسم، ۲۳-۲۴ (جولائی ۱۹۵۲ء) ۷۵-۷۸

(۲۴) خودکشی، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء) ۶۱-۶۵

(۲۵) راجو، ۱۰۷-۱۱۰، افسانہ نمبر (نومبر ۱۹۶۸ء) ۲۰۸-۲۱۲

(۲۶) سرمہ، ۱۰۵، سالنامہ، دوسرا حصہ (اپریل-جون ۱۹۶۶ء) ۴۷۳-۴۷۶

(۲۷) سڑک کے کنارے، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء)
۱۰۴-۱۰۷
(۲۸) سیاہ حاشیے، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر
(۱۹۵۵ء) ۱۰۰-۱۰۲
(۲۹) شادی، ۳۷-۳۸، افسانہ نمبر (جنوری
۱۹۵۴ء) ۲۴-۳۲
(۳۰) شہید ساز، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر
(۱۹۵۵ء) ۲۰۹-۲۱۳
(۳۱) شیدا، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۵۵ ۱۹ء)
۷۹-۸۳
(۳۲) قادر اقصائی، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر
(۱۹۵۵ء) ۵۶-۶۰
(۳۳) کالی شلوار، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر
(۱۹۵۵ء) ۱۶۳-۱۷۱
(۳۴) کالی کلی، ۸۵-۸۶، افسانہ نمبر (نومبر
۱۹۶۰ء) ۷۷-۸۰
(۳۵) لمحیشن ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء)
۹۳-۹۹
(۳۶) مائی جنتے، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر
(۱۹۵۵ء) ۱۰-۱۴
(۳۷) محمودہ، ۳۳-۳۴ (اگست، ستمبر
۱۹۵۳ء) ۱۲۱-۱۲۶
(۳۸) ملاوٹ، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء)
۳۷-۴۰
(۳۹) ممد بھائی، ۲۵-۲۶، افسانہ نمبر (ستمبر،
اکتوبر ۱۹۵۲ء) ۶۴-۷۶

(۴۰) ممی، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء)
۱۳۰-۱۵۲
(۴۱) منٹو، ۴۵-۴۶ (ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۴ء)
۶۱-۶۴
(۴۲) منٹو کے خطوط، ۹۴ (جولائی ۱۹۶۲ء)
۱۴۹-۱۵۵
(۴۳) موذیل، ۲۱-۲۲ (مئی ۱۹۵۲ء) ۱۳-
۲۶
——— ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء)
۱۱۶-۱۲۹
——— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل
۱۹۶۰ء) ۷۵۹-۷۷۴
(۴۴) نعیمہ، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء)
۴۵-۵۰
(۴۵) نیا قانون، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء)
۲۰۲-۲۰۸
——— ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر
۱۹۵۵ء) ۵۰۱-۵۰۷
(۴۶) ہتک، ۴۹-۵۰، منٹو نمبر (۱۹۵۵ء)
۱۰۳-۱۱۵
منصور احمد (مترجم): کیڈور کا مصور، ۵۳-۵۴،
افسانہ نمبر (دسمبر ۵۵ ۱۹ء) ۱۶۳-۱۶۷
منشا یاد: ببول سے لپٹی ہوئی بیل، ۱۳۳ (ستمبر ۱۹۸۶ء)
۲۶۸-۲۷۲
منصور قیصر: شاہ دولہ کے چوہے ۱۳۳ (ستمبر
۱۹۸۶ء) ۲۷۷-۲۸۰

خاکے، طنز و مزاح

خاکے، طنز و مزاح

۱۹۷۷ء) ۵۶۴ — ۵۷۰

(۲) پائیڈ پائپر، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۳۵۹ — ۳۶۵

پطرس : اب اور تب، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۰۸ — ۳۰۹

(۲) اخبار میں ضرورت ہے، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۲۹۸ — ۳۰۰

(۳) بچے، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۰۶-۳۰۷

(۴) پطرس کے مضامین (مکمل کتاب)، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۴۷۳-۵۳۴

اس کتاب کے مندرجات مع صفحہ آغاز ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

اظہارِ عقیدت ۴۷۳، دیباچہ ۴۷۴، ہاسٹل میں پڑھنا ۴۷۵، سویرے جو کل آنکھ میری کھلی ۴۸۴، کتے ۴۹۰، اردو کی آخری کتاب ۴۹۳، میں ایک میاں ہوں ۴۹۵، مرید پور کا پیر ۵۰۱، انجام بخیر ۵۰۸، سینما کا عشق ۵۱۳، بلبل اور میں ۵۱۷، مرحوم کی یاد میں ۵۲۰، لاہور کا جغرافیہ ۵۳۱

(۵) دوست کے نام، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۳۰۱ — ۳۰۵

——— ۷۹-۸۰، ادب عالیہ نمبر (اپریل ۱۹۶۰ء) ۱۱۶۲ — ۱۱۶۶

(۶) رونا رلانا، ۷۵-۷۶، پطرس نمبر (ستمبر ۱۹۵۹ء) ۶۰۰ — ۶۰۱

(۷) میں ایک میاں ہوں، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۵۲۱ — ۵۲۶

پنجاب پنچ، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۲۳۴ — ۲۳۵

ت

تاج، امتیاز علی، چچا چھکن نے تصویر ٹانگی، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۸۶۵ — ۸۶۷

تاجور نجیب آبادی: گھریلو مشاعرہ، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۴۹۶-۴۹۹

تمکین کاظمی: ہم نہیں پیٹے، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۵۱۶ — ۵۲۰

ث

ثاقبہ رحیم الدین: عشق ثقافت، ۱۲۹، عصری ادب نمبر (ستمبر ۱۹۸۲ء) ۳۴۱ — ۳۴۶

ج

جالندھر پنچ، ہندوستان کا نیلام، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۲۴۷

جلیس، ابراہیم: دماغ چاٹنے والے، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۶۱۷-۶۲۳

جگناتھ پرشاد، ایچ: دکن پنچ، ہندی اور مغربی ناٹکوں کی امتیازی خصوصیات، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۲۵۱-۲۵۲

جمال الدین، ابو محمد سید: ہم بھی اخبار جاری کریں گے، ۷۱-۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری

ص

ض

ل

م

نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۴۰۶ - ۴۱۲
محمود ہاشمی: رالف رسل، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء)
۲۹۹ - ۳۰۴
مختار زمن، لینڈ لارڈ، ۱۱۷ (مئی ۱۹۷۲ء) ۱۷۱ - ۱۷۴
مسعود مفتی: بہادر، ۱۰۴ (جنوری ۱۹۶۶ء) ۳۸۳ -
۳۹۴
مسعود قریشی: احرام تلے، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۳۴۹
- ۳۵۳
مظفر علی سید (مترجم): گُتّا اور بیل از ایوان کریلوف،
۷۱ - ۷۲، طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری
۱۹۵۹ء) ۱۷۷ - ۱۸۳
ملّا رموزی: لندھن کا عنابی دربار، ۷۱ - ۷۲، طنز و مزاح
نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۵۶۷ - ۵۶۹
ممتاز حسین عثمانی: منطق آرا بیگم بنام مسٹر چرچل، ۷۱ - ۷۲،
طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۳۶۵
- ۳۶۸
ممتاز مفتی: ادب ادیب، ۱۱۹، افسانہ نمبر (ستمبر ۱۹۷۴ء)
۵۶۰ - ۵۷۰
(۲) جلتا بجھتا دیا، ۱۲۴، سالنامہ (جنوری
۱۹۷۹ء) ۳۴ - ۴۲
(۳) داستان گو اور اشفاق احمد، ۱۱۷ (مئی
۱۹۷۲ء) ۵۱ - ۶۵
(۴) سٹاپ آرٹسٹ، ۹۶، سالنامہ (جنوری
۱۹۶۳ء) ۲۶۳ - ۲۷۳
(۵) سعادت حسن منٹو، ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۳۵۸
- ۳۶۰
(۶) شخصیت نگار کی تلاش، ۱۱۲ (اگست ۱۹۶۹ء)
۱۴۲ - ۱۴۷
(۷) شہرِ بے مثال، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۵۵۰
- ۵۵۶
(۸) غنڈا، ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء)
۱۹۱ - ۲۱۰
(۹) قدرت اللہ اور ممتاز مفتی، ۱۱۰، افسانہ نمبر
(نومبر ۱۹۶۸ء) ۱۳۴ - ۱۴۸
(۱۰) لوک تماشا، ۱۲۰ (جنوری ۱۹۷۶ء) ۲۹۴
- ۳۱۲
(۱۱) مردانہ ڈبے کی زنانہ سواریاں، ۱۱۷ (مئی
۱۹۷۲ء) ۳۵۹ - ۳۶۱
منظور الٰہی: میرا دوست، میرا بھائی، ۱۲۲، سالنامہ
(جنوری ۱۹۷۷ء) ۵۴۶ - ۵۵۳
منٹو، سعادت حسن: پانچواں مقدمہ (غیر مطبوعہ) ۵۵ - ۵۶
(مارچ ۱۹۵۶ء) ۱۵۵ - ۱۵۹
(۲) چچا سام کے نام دوسرا خط، ۳۳ - ۳۴
(اگست، ستمبر ۱۹۵۳ء) ۸۱ - ۸۴
(۳) سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، ۷۱ - ۷۲،
طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء)
۶۰۹ - ۶۱۳
(۴) وہ لڑکی، ۳۱ - ۳۲ (مئی، جون ۱۹۵۳ء)
۱۹۲ - ۱۹۶
منظور الٰہی: گزر گئے دن، ۷۳ - ۷۴ (مئی ۱۹۵۹ء) ۳۴۳
- ۳۴۷
مہدی افادی: حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک، ۷۱ - ۷۲،
طنز و مزاح نمبر (جنوری، فروری ۱۹۵۹ء) ۴۴۷
- ۴۵۷

سمپوزیم

سمپوزیم

اردو افسانے میں روایت اور تجربہ، ۳۷-۳۸ (جنوری ۱۹۵۴ء) ۴۶۵-۵۰۱

اس میں حصہ لینے والے: سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، حمید اختر اور شوکت تھانوی۔

اردو افسانے میں روایت اور تجربہ (مذاکرہ)، ۵۳-۵۴، افسانہ نمبر (دسمبر ۱۹۵۵ء) ۱۰۲۷-۱۰۶۲

حصہ لینے والے: سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، شوکت تھانوی اور حمید اختر۔

اردو غزل کا مستقبل، ۴۳-۴۴، مع ضمیمہ غزل نمبر (جولائی، اگست ۱۹۵۴ء) ۲۳۳-۲۴۷

حصہ لینے والے: عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سبط حسن، سید وقار عظیم، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، احسان دانش، حامد علی خاں، چراغ حسن حسرت، احمد ندیم قاسمی، حفیظ جالندھری اور حبیب اشعر۔

جنگ فورم کے تحت ایک خصوصی نشست کی روداد (رسول نمبر کے متعلق)، ۱۳۰، رسول نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۷۳-۶۷۸

حصہ لینے والے: ضیا شاہد، حسن رضوی، آغا سہیل، اسعد گیلانی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، سید محمد متین ہاشمی۔

سلیم اختر، ڈاکٹر: خاکہ نگاری، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۵۲-۶۳

شرکاء بحث: احمد ندیم قاسمی، آغا سہیل، تحسین فراقی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور محمد طفیل۔

سہیل، ڈاکٹر آغا: افسانہ، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) ۳۴-۵۱

شرکاء بحث: محمد طفیل، جیلانی کامران، آغا سہیل، سلیم اختر، ڈاکٹر وحید قریشی، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی۔

کیا موجودہ ادب رُو بہ تنزل ہے؟ ' افسانہ، ۷۷-۷۸، خاص نمبر (دسمبر ۱۹۵۹ء) ۲۸۰-۳۰۴

حصہ لینے والوں کے نام مع صفحات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

قرۃ العین حیدر ۲۸۰-۲۹۶، کرشن چندر ۲۹۶-۲۹۷، عصمت چغتائی ۲۹۷-۲۹۹، خواجہ احمد عباس ۲۹۹-۳۰۰، خدیجہ مستور ۳۰۴-

حصہ لینے والے: عبدالسلام خورشید، وحید قریشی، صادق حسین اور مدیر نقوش۔

وحید قریشی، ڈاکٹر: عصری تنقید، ۱۳۲، سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء)

۸ - ۲۳

اس مذاکرے میں شرکاءِ بحث: ڈاکٹر وحید قریشی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، اشفاق احمد، جیلانی کامران اور محمد طفیل۔

رپورتاژ

رپورتاژ

سفرنامہ

سفرنامہ

انٹرویو

اِنٹرویو

جوگندر پال: جوگندر پال سے ایک ادبی جھڑپ، ۱۰۵، سالنامہ' دوسرا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۷۳۸ - ۷۴۵

سوالات اسد اللہ غالب کے، جوابات محمد طفیل کے (رسولؐ نمبر کے بارے میں)' ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۶۹ - ۶۷۲

شاد، نریش کمار: گفتگو، ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۱۷۳ - ۱۸۰

شوق، سمت پرکاش (مرتب): بات چیت فراق گورکھپوری' ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۷۸ - ۸۳

فراق گورکھپوری: آواز میری گیسوئے شب کھول رہی ہے' ۹۸ (جون ۱۹۶۳ء) ۳۹۵ - ۴۰۱
اس میں ادبی مسائل پر فراق گورکھپوری سے بات چیت کی گئی ہے حصہ لینے والوں کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں: امیر عارفی اور سمت پرکاش شوق۔

فراق گورکھپوری: بات چیت، ۱۰۳ (ستمبر ۱۹۶۵ء) ۲۳۵ - ۲۳۹
بات چیت سمت پرکاش شوق نے کی۔
(۲) بات چیت، سمت پرکاش شوق، ۱۰۵، سالنامہ، پہلا حصہ (اپریل - جون ۱۹۶۶ء) ۷۸ - ۸۳

کرشن چندر: افسانوں کی بات چلی (انٹرویو)' ۱۰۱ (نومبر ۱۹۶۴ء) ۱۶۱ - ۱۶۴
یہ انٹرویو امیر عارفی نے لیا۔

محمد طفیل سے گفتگو، سوالات حسن رضوی (رسولؐ نمبر کے بارے میں)' ۱۳۰، رسولؐ نمبر، جلد ۱۳ (جنوری ۱۹۸۵ء) ۶۷۹ - ۶۸۲

ممتاز شیریں: آئینہ خانہ (انٹرویو)' ۱۱۸، سالنامہ (جولائی ۱۹۷۳ء)

فاروقی، نثار احمد: بات چیت (انٹرویو)' ۱۰۸ (ستمبر ۱۹۶۷ء) ۱۶۶ - ۱۷۲

متفرقات

متفرقات



نقوش

محمد طفیل نمبر

- نقوش کا ہر ایک شمارہ ایک عہد آفریں دستاویز
- نقوش کا محمد طفیل نمبر اُردو ادب

کی اس نہدروایت میں ایک اور سنگِ میل